صلی اللہ علیہ وسلم
محاضرات سیرت
ڈاکٹر محمود احمد غازی
www.KitaboSunnat.com

محاضراتِ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

297.63 Mahmood Ahmad Ghazi, Dr.
Mahazraat-e-Seerat / Dr. Mahmood Ahmad Ghazi.-Lahore: Al-Faisal Nashran, 2009.
756p

1. Seerat I. Title Card

ISBN 969-503-514-2

اشاعت اول ...... مئی 2007ء

اشاعت سوم ...... ستمبر 2009ء

محمد فیصل نے

آر۔ آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/550 روپے

AI-FAISAL NASHRAN

Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست

(پہلا خطبہ)

(دوسرا خطبہ)

(ساتواں خطبہ)

(آٹھواں خطبہ)

(نواں خطبہ)

(دسواں خطبہ)

(گیارہواں خطبہ)

(بارہواں خطبہ)

۔☆۔

پیش لفظ

زیر نظر کتاب سلسلہ محاضرات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس سے قبل محاضراتِ قرآنی' محاضراتِ حدیث اور محاضراتِ فقہ کے نام سے تین جلدیں پیش کی جا چکی ہیں۔ خالق کائنات کا یہ بے پایاں فضل و کرم ہے کہ اس نے نہ صرف یہ توفیق اور صلاحیت ارزانی فرمائی بلکہ اس سلسلہ محاضرات کو اس کے علمی معیار اور اس کے حقیر مؤلف کی اہلیت اور اوقات سے کہیں بڑھ کر مقبولیت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے' قارئین کے لئے مفید اور مؤلف کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔

زیر نظر کتاب سیرت سے نہیں علم سیرت سے بحث کرتی ہے۔ سیرت پر اُردو زبان میں سینکڑوں کیا معنی ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ سیرت کے اس کتب خانے میں درجنوں کتابیں تاریخ سیرت میں نمایاں ترین جگہ پانے کی مستحق ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ تاہم ہماری زبان میں تاریخ سیرت' تدوین سیرت اور مناہج سیرت پر مواد نسبتاً کمیاب ہے۔ اُردو دان قارئین سیرت کی بنیادی معلومات اور اہم وقائع سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا کافی سامان ہماری زبان میں موجود ہے۔ لیکن سیرت کا یہ علم کن کن مراحل سے گزرا' کن کن مقاصد کے پیش نظر سیرت نگاروں نے یہ سارا لٹریچر مرتب کیا اس پر اُردو زبان میں مواد کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

مزید براں بعض مغربی مصنفین نے سیرت کے ابتدائی مصادر و مآخذ کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا ہے اور ابتدائی سیرت نگاروں کی کاوشوں کی علمی حیثیت کے بارے میں سوالات اٹھائے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ مغرب سے آنے والی ہر رطب و یابس تحریر کو تحقیق کا بے مثل نمونہ سمجھتا ہے۔ اس طبقے کے بارے میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے آج سے اسی نوے سال پیشتر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔ فطرت کی یہ پستی آج انتہاؤں کو چھوتی محسوس ہوتی ہے۔ اب اس کے اثرات قرآن مجید' حدیث رسول' فقہ اسلامی اور سیرت پاک کے ذخائر پر عدم اعتماد کی صورتوں میں سامنے آنے لگے ہیں۔ ان حالات میں فن سیرت کی ابتدائی تدوین' تاریخ

ارتقاء اور مناہج پر گفتگو کرنے کی ضرورت اور اہمیت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے بارہ محاضرات یا خطبات میں سے تقریباً نصف کا تعلق فن سیرت کی تاریخ اور تدوین سے ہے۔ ان محاضرات میں کوشش کی گئی ہے کہ مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی مسترشدین کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور اُلجھنوں کو دور کیا جائے۔ دو محاضرات کا موضوع ریاستِ مدینہ اور معاشرت مدینہ ہے۔ ریاست مدینہ پر گفتگو آج کے سیاق و سباق میں ناگزیر محسوس ہوتی ہے۔ آج دنیائے اسلام ایک شدید کشمکش کی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اور ملی خمیر اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی نقشہ کشی اپنی تہذیبی روایات کی روشنی میں کریں۔ دنیائے اسلام میں جا بجا اسی کوشش کے مختلف النوع مظاہر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کوششوں کی کامیابی کے لئے ایک مجتہدانہ اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ اساسیاتِ اسلام سے گہری واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ امام دار الہجرت امام مالک ابن انسؒ کے یہ سنہرے الفاظ حرز جان بنانے کے لائق ہیں جن میں آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے بعد کے معاملات و مسائل کے حل کا وہی طریقہ اور اسلوب کارگر ہوگا جو ابتدا میں کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس لئے ریاستِ مدینہ اور معاشرت مدینہ کے مطالعہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ریاستِ مدینہ اور معاشرتِ مدینہ پر گفتگو کے بعد سیرت کے دو اہم پہلوؤں' کلامیاتِ سیرت اور فقہیاتِ سیرت' پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ آج سیرت پاک کے جن پہلوؤں کو محل نظر ٹھہرایا جا رہا ہے ان کا تعلق انہی دو پہلوؤں سے ہے۔ آج سیرت رسول (علیہ السلام) پر مشرق و مغرب میں عائد کئے جانے والے بیشتر اعتراضات کا تعلق انہی دو میدانوں سے ہے۔ آخر میں دور جدید میں مطالعہ سیرت کے رجحانات کا ایک عمومی جائزہ لے کر مستقبل میں مطالعہ سیرت کی ممکنہ جہتوں کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

یہ محاضرات مختصر یادداشتوں کی بنیاد پر زبانی دیئے گئے تھے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے سابق سربراہ اور میرے انتہائی محترم بزرگ اور کرم فرما جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے از راہ خورد نوازی اور علم دوستی یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ یہ محاضرات ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے شعبہ مطالعہ سیرت کے زیر اہتمام پیش کئے

جائیں' چنانچہ ڈاکٹر صاحب محترم نے ۲۴ جولائی ۲۰۰۶ء سے لے کر ۵ اگست ۲۰۰۶ء تک روزانہ نماز عصر سے نماز عشاء تک ان محاضرات کا انتظام فرمایا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد سے خواتین و حضرات کی بڑی تعداد نے تشریف لا کر ناچیز مقرر کی عزت افزائی فرمائی۔ ان محاضرات کی ریکارڈنگ کا کام انتہائی اہتمام اور ذاتی دلچسپی سے جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر' ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی نے کیا۔ جناب احسان حقانی نے حسب سابق ان گزارشات کو صوتی تسجیل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ اب یہ گزارشات ضروری ایڈیٹنگ کے بعد پیش خدمت ہیں۔ میں ادارہ الفیصل ناشران کے سربراہ جناب محمد فیصل صاحب اور ان کے مشیر خاص جناب سید قاسم محمود صاحب کا شکرگزار ہوں جن کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ سلسلہ قارئین تک پہنچ رہا ہے۔

میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان' ان کے رفقاء' دعوۃ اکیڈمی کے سربراہ جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر' ان کے رفقاء' جناب محمد فیصل اور جناب سید قاسم محمود کے ساتھ ساتھ ان تمام خواتین و حضرات کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے ان محفلوں میں شرکت فرمائی۔ جن نامور شخصیتوں نے ان بارہ اجلاسوں کی صدارت فرما کر ناچیز مقرر کو عزت بخشی وہ بھی میری طرف سے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ خاص طور جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی کا دلی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے محاضرات کے اس پورے سلسلے میں پابندی سے شرکت فرمائی۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے یہ سلسلہ ممکن ہوا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ناچیز مؤلف کے ساتھ ساتھ اس سلسلے کی محرک اولین میری مرحومہ بہن محترمہ عذرا نسیم فاروقی کو اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں جن کے اصرار اور خواہش پر یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی' یعنی محاضرات عقیدہ و ایمانیات ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جلد سے جلد اس کو مکمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے

محمود احمد غازی

اسلام آباد

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

پہلا خطبہ

مطالعہ سیرت کی ضرورت و اہمیت

پہلا خطبہ

مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم وعلىٰ اله واصحابه اجمعين

قابل احترام جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،

قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان

برادران محترم،

خواہران مکرم

میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ توفیق عطاء فرمائی کہ سیرت پاک کے انتہائی مقدس اور متبرک علم کے بارے میں کچھ گزارشات ایک ترتیب اور تسلسل کے ساتھ پیش کرسکوں۔ ان گزارشات میں سیرت النبی کے نہیں بلکہ علم سیرت کے بعض اہم اور ضروری پہلوؤں پر گزارشات کا پروگرام ہے۔

علم سیرت کب اور کیوں شروع ہوا، کیسے شروع ہوا، اس کی ضرورت اور اہمیت کیوں محسوس کی گئی۔ پھر ابتدائی طور پر اس کی تدوین کن خطوط پر ہوئی۔ کن کن حضرات نے اس کی تدوین میں حصہ لیا۔ کن کن مناہج اور اسالیب سے کام لے کر سیرت نگاروں نے سیرت کا یہ سارا ذخیرہ تیار کیا۔ ان موضوعات پر ایک ترتیب سے گفتگو کرنے کا پروگرام ہے۔

درمیان میں دو موضوعات ریاست مدینہ منورہ پر بھی گفتگو میں شامل ہوں گے۔ ریاست مدینہ منورہ پر گفتگو کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ ریاست مدینہ کا آغاز ہی

دراصل اسلامی تہذیب اور تمدن اور امت مسلمہ کا آغاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے نئے اسلامی کیلنڈر کے لئے جو نقطہ آغاز منتخب کیا وہ کوئی اور واقعہ نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری اور آپؐ کے دست مبارک سے اسلامی معاشرہ اور اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

اس ریاست کے بنیادی خصائص کیا تھے؟ یہ ریاست کن خطوط پر قائم ہوئی؟ اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس ریاست نے بنیادی طور پر کن ذمہ داریوں کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیا۔ اس موضوع پر دو الگ الگ نشستوں میں گزارشات پیش کی جائیں گی۔

آخر میں برصغیر میں علم سیرت، دور جدید میں علم سیرت اور علم سیرت کا آئندہ مطالعہ اور مستقبل کی جہتوں کے بارے میں بعض گزارشات پیش کرنے کا ان شاء اللہ موقع ملے گا۔ مضامین کی یہ تقسیم صرف سہولت کی خاطر ہے۔ ان مضامین کو مذکورہ بالا ترتیب سے بیان کرنے کے باوجود ایک حد تک تکرار ناگزیر ہے۔ بہت سے عظیم سیرت نگار ایسے ہیں جن کا تذکرہ ابتدائی گفتگو میں بھی آئے گا، نامور سیرت نگاروں میں بھی ان کا نام اور کام شامل ہوگا، ان کے تذکرہ کے بغیر منہج اور اسلوب کی بات بھی مکمل نہیں ہوگی، ان کا تذکرہ ریاست مدینہ کی تاسیس اور تشکیل میں بھی بار بار آئے گا۔ اس لئے کسی حد تک تکرار اس سلسلہ گفتگو میں ناگزیر ہے۔

جب ہم مطالعہ سیرت کی ضرورت اور اہمیت پر بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو مختلف ضرورتیں یا دو مختلف اہمیتیں ہوتی ہیں۔ ضرورت واہمیت کی ایک سطح مسلمانوں کے لئے اور ایک دوسری سطح غیر مسلموں کے لئے ہے۔ مسلمان جن اسباب اور محرکات کی بنیاد پر سیرت النبی کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی نوعیت اور ہے، جبکہ غیر مسلم جب سیرت النبی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے اسباب اور محرکات دوسرے ہوتے ہیں۔ پھر مسلمانوں میں مختلف لوگوں کی ضروریات اور ذہنی سطح کے لحاظ سے سیرت النبی کے مطالعہ، ضرورت اور اس کی اہمیت کی الگ الگ سطحیں ہیں۔ عامۃ الناس کی سطح اور ہے، تعلیم یافتہ افراد کی سطح اور ہے اور متخصصین کی سطح اور ہے۔

پھر جب ہم اہمیت کی بات کرتے ہیں تو دور جدید میں سیرت کی اہمیت کے بعض نئے

پہلو اور بعض نئی جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سیرت کے مطالعہ کی تہذیبی اہمیت بھی ہے، بین الاقوامی اہمیت بھی ہے، سیرت کے مطالعہ کی علمی اور تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اس کی وجہ سے دور جدید کو، چاہے وہ مسلمانوں پر مشتمل ہو یا غیر مسلموں پر، سیرت کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

سیرت ایک لامتناہی اور متلاطم سمندر ہے۔ علم سیرت محض ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قوم، ایک ملت اور ایک الٰہی پیغام کے آغاز اور ارتقاء کی ایک انتہائی اہم، انتہائی دلچسپ اور انتہائی مفید داستان ہے۔ سیرت ایک ایسا دریائے متلاطم ہے جس کے درہائے ناسفتہ لامتناہی ہیں۔ ایک مغربی مستشرق نے، کسی دوست نے نہیں بلکہ ایک دشمن نے، یہ اعتراف کیا تھا کہ آنحضورﷺ کے سیرت نگاروں کا سلسلہ لامتناہی ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت اور باعث شرف ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ ایک طویل حدیث میں ایک اہم وصف ارشاد فرمایا تھا، وہ ارشاد جس کو سیدنا علیؓ بن ابی طالب نے روایت کیا ہے اور محدث طبرانی نے اس کی تخریج کی ہے۔ اس حدیث میں حضورﷺ نے قرآن پاک کے دس بارہ اوصاف بیان فرمائے۔ ان میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ '**لاتنقضی عجائبه**'، یعنی قرآن مجید کے عجائب وغرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید سے ہمیشہ نئے نئے مطالب اور نئے نئے معانی نکلتے چلے جائیں گے اور ہر آنے والا دن قرآن پاک کے حقائق اور معارف کی ایک نئی دنیا لے کر آئے گا۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم قرآنی ہر دور میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے بطن میں ابھی کتنے عوالم قرآنی پنہاں ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کتنے مناظر اور مشاہد انسانوں کے سامنے آئیں گے۔ اسی طرح صاحب قرآن کی سیرت اور ارشادات میں پنہاں حقائق ومعارف بھی۔ کم ازکم ہم محدود انسانوں کی بساط کے لحاظ سے۔ لامتناہی ہیں۔

ابھی ہمارے عزیز دوست نے علامہ اقبال کی جو نعت پڑھی اس میں علامہ نے ایک بہت ہی لطیف بات ارشاد فرمائی ہے:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، ترا وجود الکتاب

یہ شاعرانہ انداز کا کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ تراوجود الکتاب وہی بات ہے جو سیدۃ عائشہ صدیقہؓ نے فرمائی تھی۔ آپؓ سے ایک بار کسی نے پوچھا تھا کہ: اماں جان! رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کی تفصیل آپ بتاسکتی ہیں؟ آپؓ جواباً نے فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ پوچھنے والے عرض کیا: جی ہاں پڑھا ہے۔ ارشاد ہوا: کان خلقه القرآن، آپ کے اخلاق عین قرآن تھے۔ یعنی وہی کچھ تھے جو قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید اگر قرآن صامت یعنی خاموش قرآن ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود گرامی قرآن ناطق ہے۔ اگر قرآن صامت کے عجائب وغرائب لامتناہی ہیں تو قرآن ناطق کے عجائب وغرائب کیسے متناہی ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی لامتناہی ہیں۔

اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ سیرت نگاروں کا ایک سیلاب نما سلسلہ ہے جو پہلی صدی ہجری سے آج تک بغیر کسی تعطل کے چلا آرہا ہے اور ہر سیرت نگار کو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید ابھی تو صرف کام کا آغاز ہوا ہے، اور ابھی تو ایک نئی دنیا موجود ہے جس کو سر کرنا ہے۔ ابھی تو تحقیق کا ایک نیا ہفت خواں سامنے آیا ہے جس کو عبور کرنا ہے۔ علم سیرت کی یہ روز افزوں وسعت خود اپنی جگہ ذات رسالت مآب ﷺ کا ایک معجزہ ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناسفتہ در رگ تاک است

یہ احساس ہر اُس سیرت نگار یا علم سیرت کے طالب علم کو ہوتا ہے جو کسی پہلو سے سنجیدہ تحقیق کی خاطر ذخائر سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔

سیرت کے لغوی معنی تو 'طریقہ کار' یا 'چلنے کی رفتار اور انداز' کے ہیں۔ عربی زبان میں فِعلَہ کے وزن پر جو مصدر آتا ہے اس کے معنی کسی کام کا طریقہ یا کسی کام کو اختیار کرنے کے انداز اور اسلوب کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سیرت کے لفظی معنی بھی 'چلنے کا طریقہ' کے ہیں۔ اسی معنی کی توسیع کے طور پر عربی زبان میں سیرت کے معنی کسی کا طرز زندگی (Life Style) یا زندگی گزارنے کا اسلوب بھی ہیں۔ جلد ہی سیرت کا لفظ ذات رسالت مآب ﷺ کے ساتھ قریب قریب مخصوص ہوگیا، اور آج دنیا کی تمام مسلم زبانوں اور بہت سی غیر مسلم زبانوں میں بھی سیرت کا لفظ سرکار دو عالم ﷺ کی مبارک زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

انگریزی زبان کی لغات اور قوامیس میں بھی اب یہ لفظ شامل ہو گیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں آغاز میں سیرت کا لفظ صرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ عربی زبان میں حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے لئے سیرت کے لفظ کا استعمال بعد میں شروع ہوا ہے جس کی تفصیل کل کی گفتگو میں سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین کے ہاں سیرت کا مفہوم اور ہے، متاخرین کے ہاں سیرت کا مفہوم اور ہے، جبکہ غیر مسلم مصنفین کے ہاں سیرت کا مفہوم کچھ اور سمجھا جاتا ہے۔

اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کا لفظ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اُس طرز عمل کے لئے استعمال کیا گیا جو آپؐ نے غیر مسلموں سے معاملہ کرنے میں اور جنگوں میں یا صلح اور معاہدات کے معاملات میں اپنایا۔ قدیم مفسرین، فقہاء، محدثین اور سیرت نگاروں نے سیرت کے لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور محقق اور قاموس نگار قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنی مشہور کتاب 'کشاف اصطلاح الفنون' میں سیرت کی لغوی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے 'ثم غلبت فی الشرع علی طریقۃ المسلمین فی المعاملۃ مع الکافرین والباغین وغیرھما من المستأمنین والمرتدین واھل الذمۃ' یعنی شریعت کی اصطلاح میں اس لفظ کا زیادہ استعمال مسلمانوں کے اس طریقہ کار پر ہوتا ہے جو وہ کفار، غیر مسلم محاربین، مسلمان باغی، مرتدین، اہل ذمہ اور دوسروں سے معاملہ اور طریق کار کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔ یہی بات فتح القدیر میں فقیہ کمال بن ہمام نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں 'سیر' سے مراد وہ طریقہ ہے جو کفار سے جنگ وغیرہ میں اپنایا جائے۔ یہ ایک پہلو سے تاریخ اسلام کا مضمون ہے، دوسرے پہلو سے اسلامی قانون اور فقہ کا مضمون ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو بہت سی دوسری اقوام سے واسطہ پیش آیا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کے دور میں بڑے بڑے علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے۔ بڑی بڑی اقوام اسلام میں داخل ہوئیں۔ بہت سی دوسری اقوام کے ساتھ جنگ اور صلح کے معاہدات کرنے پڑے۔ ان تمام معاملات میں مسلمانوں کو

قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آئی کہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ، تفصیلی قوانین اور احکام وہدایات ان کے سامنے ہوں۔ یہ اسوۂ حسنہ رسول اللہ ﷺ کے ان غزوات ہی سے حاصل ہوسکتا تھا جو رسول اللہ ﷺ نے وقتاً فوقتاً مختلف دشمنوں کے خلاف فرمائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف اقوام اور قبائل سے معاہدات بھی کیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ بھی معاہدے ہوئے۔ اور پھر غیر مسلموں میں مشرکین، یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی معاہدے ہوئے، نومسلموں کو بھی مراعات دی گئیں۔ ان کے لئے منشور اور چارٹر جاری کئے گئے۔ ان سب چیزوں کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے ایک نئے قانون اور نظام کی تشکیل کی۔ اس کے لئے سیرت اور 'سیر' کی اصطلاح استعمال کی گئی جو انسانی تاریخ میں پہلا بین الاقوامی قانون ہے۔ مغربی دنیا آج ہیوگو گروشیس (Hugo Grotius) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم قرار دیتی ہے جس نے سترہویں صدی عیسوی میں قانون بین الاقوام پر پہلی باقاعدہ کتاب لکھی تھی۔ لیکن گروشیس سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے فقہائے اسلام نے ان قوانین کی تدوین اور ترتیب کا کام شروع کردیا تھا اور ہیوگو گروشیس کی پیدائش سے 860 سال پہلے امام محمد بن حسن شیبانی بین الاقوامی قانون پر تین کتابیں لکھ چکے تھے۔ یہ تینوں کتب آج موجود ہیں۔ ان میں ایک کا انگریزی اور دوسری کا فرانسیسی اور ترکی ترجمہ بھی موجود ہے۔ یہ کتابیں اور ان جیسی بہت سی دوسری کتابیں جو فقہائے اسلام نے دوسری تیسری صدی اور بعد کی صدیوں میں لکھیں ان میں رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کی بنیاد پر دنیا کو ایک نیا قانون دیا گیا ہے۔ اس قانون کی تدوین اور ترتیب دوسری صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے پہلے کرلی گئی اور اس پر متعدد مبسوط اور مفصل کتابیں لکھی گئیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں۔

جیسے جیسے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے بارے میں یہ معلومات جمع ہوتی گئیں ان کی تدوین کا کام بھی ہوتا گیا۔ تدوین کی تاریخ پر تفصیلی گفتگو کل ہوگی۔ لیکن یہاں اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معلومات کے دو حصے یا دو پہلو نمایاں ہوتے گئے۔ ایک حصہ وہ تھا جس کی اہمیت کا تاریخی پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ اس حصہ میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بارے میں مختلف واقعات کو ترتیب سے جمع کیا گیا تھا۔ یہ حصہ مغازی کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرا پہلو یا حصہ وہ تھا جس میں قانون کا پہلو نمایاں تھا۔ جس میں فقہی

رہنمائی اور ہدایات زیادہ نمایاں تھیں وہ سیرت یا سیر کے نام سے نمایاں ہوگیا اور اس کو الگ کتابوں اور مجموعوں کی شکل میں فقہائے اسلام نے جمع کیا۔ چنانچہ پہلی صدی کی کتابوں میں سیر اور سیرت کا لفظ ان دونوں مفاہیم میں ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیرت میں وہ ساری چیزیں شامل ہوتی گئیں جن کا حضور اکرمؐ کی حیات مبارکہ سے براہ راست تعلق تھا۔ سیرت نگاروں کے نزدیک براہ راست تعلق کا جو مطلب تھا، میں اس کی طرف اشارہ ابھی کرتا ہوں، لیکن آگے بڑھنے سے پہلے فن سیرت کی ایک ایسی تعریف سنتے جایئے جو ایک ایسے شخص نے کی، جو اپنے زمانے میں پورے برصغیر میں صف اول کا عالم، محدث، فقیہ اور محقق تھا۔ برصغیر سے مراد برما، بنگلہ دیش، پاکستان، بھارت، افغانستان اور کئی ایک دوسرے چھوٹے چھوٹے ملک تھے اور فن سیرت بھی مکمل طور پر ترقی پاکر اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا۔ میری مراد برصغیر کے مشہور عالم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے ہے۔

انہوں نے اپنی کتاب 'عجالہ نافعہ' میں جہاں علم حدیث اور علوم سیرت کی تفصیل بیان کی ہے وہاں سیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'آنچہ متعلق بہ وجود پیغمبر ﷺ وصحابہ کرام وآل عظام است، واز ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات، آں را سیرت گویند'۔ کہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی سے جو کچھ بھی متعلق ہے، آپؐ کے صحابہ کرام، اہل بیت اور آل عظام سے جو بھی چیز تعلق رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے لے کر اور آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے تک، ان سب کی تفصیل کو اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کہتے ہیں۔

سیرت یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رویہ اور طریقہ کار گویا قرآن مجید پر عمل کرنے کا طریقہ کار ہے۔ اگر قرآن صامت اللہ کی کتاب ہے اور انسانوں کے عمل کرنے کے لئے ہے، تو اس پر عمل کرنے کا طریقہ کار بھی انسانوں کے سامنے آنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے محض نظری ہدایت پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اپنی رحمت کاملہ اور فضل عمیم سے ایک عملی نمونہ بھی بھیجا جس کو آج ہم سیرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ کار اور قرآن مجسم کا رویہ۔ جو قرآن نے کہا وہ حضورؐ نے کیا۔ اور جو حضورؐ نے کیا وہ قرآن نے کہا۔ ان دونوں میں گہری

نسبت پائی جاتی ہے۔ بلکہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ جو حضورؐ نے چاہا وہ قرآن نے کہا۔ اس کی مثالیں بھی خود قرآن پاک میں موجود ہیں۔ 'قد نریٰ تقلب وجھک فی السماء' حضورؐ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میرے دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا بنایا ہوا بیت اللہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبلہ قرار پا جائے۔ قرآن پاک نے اس خواہش کو بھی ریکارڈ کر دیا۔ حالانکہ اس کے بغیر بھی تحویل قبلہ کی یہ بات ہو سکتی تھی اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ لیکن قرآن پاک میں یہ وضاحت کیا جانا کہ ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرے کا بار بار اٹھنا دیکھتے تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ تحویل قبلہ کے باب میں حضورﷺ کی خواہش کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا تھا۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ خالص قانونی ضروریات کی خاطر، فقہائے اسلام نے بالخصوص اور محدثین نے بالعموم مغازی کی تفصیلات جمع کیں اور حضورﷺ کے ان تمام غزوات اور مہمات میں جو چیزیں قانونی اہمیت کی حامل تھیں، ان کو الگ کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ چنانچہ عروہ بن زبیرؒ اور موسیٰ بن ابی عقبہ کی تحریروں کی طرح ابتدائی دور کی کتابیں مغازی بھی کہلائیں اور سیر بھی۔ کسی نے ان کتابوں کو مغازی اور کسی نے سیر کے نام سے یاد کیا۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ سیرت اور مغازی کی کتابیں الگ الگ ہوتی گئیں۔ مغازی کا انداز تاریخی قرار پایا اور سیر کا انداز قانونی قرار پایا۔ پھر مغازی میں حیات مبارکہ کے دیگر پہلوؤں کی تفصیلات بھی شامل ہوتی گئیں۔ اس کا نام کہیں علم سیرت و مغازی رکھا گیا، کہیں علم مغازی و سیر رکھا گیا۔ بالآخر اس کا نام علم سیرت قرار پایا اور مغازی اس کا ایک شعبہ بن گیا۔

آج علم سیرت ایک ایسا وسیع تر جامع علم ہے جس کے بہت سے حصے اور شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ مغازی اور رسول اللہﷺ کے غزوات اور مہمات کی تفصیلات بھی ہیں۔ غزوہ کے لفظ سے یہ نہ سمجھئے گا کہ مغازی سے مراد رسول اللہﷺ کی صرف وہ مہمات ہیں جن میں کوئی عسکری یا حربی مقصد پیش نظر تھا، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اصطلاحاً غزوہ سے مراد ہر وہ مہم ہے جو مدینہ سے باہر رسول اللہ کی قیادت میں اختیار کی گئی ہو۔ چاہے رسول اللہﷺ اس میں جنگ کی نیت سے باہر تشریف لے گئے ہوں یا کسی اور نیت سے تشریف لے گئے ہوں۔ ان سب کے لئے عمومی طور پر غزوہ یا مغازی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شروع

شروع میں، ہجرت کے ابتدائی مہینوں میں بہت سی مہمات ایسی ہوئی ہیں کہ جن میں رسول اللہ ﷺ کا مقصد جنگ نہیں تھا، بلکہ مختلف قبائل سے دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا، مختلف قبائل سے مختلف نوعیت کے معاہدات کرنا اور ایک طرح سے خیر سگالی کے وفود کی ترسیل تھی۔ لیکن محدثین اور سیرت نگاروں نے ان مہمات کو بھی غزوہ کے لفظ سے یاد کیا ہے جن میں سفارتی اور غیر عسکری مہمات بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر غزوہ ابواء کا ذکر ملتا ہے جو بدر سے پہلے کی ایک مہم ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کا مقصد کوئی جنگ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس غزوہ یا مہم کا مقصد بنی ضمرہ نام کے ایک قبیلہ کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا، ان سے خیر سگالی کے تعلقات قائم کرنا اور ماضی کے ان تعلقات کا احیا پیش نظر تھا جو ہجرت سے پہلے سے رسول اللہ ﷺ اور بنی ضمرہ کے درمیان موجود تھے۔ بنی ضمرہ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ہجرت سے پہلے سے تعلقات چلے آرہے تھے، ان تعلقات کا احیا اور ان کو مزید پختہ بنانا مقصود تھا۔

انہی دنوں میں ایک غزوہ ذوالعشیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کا بھی کوئی حربی یا عسکری مقصد نہیں تھا بلکہ قبیلہ بنو مدلج، جو عرب میں کھوجیوں کا قبیلہ تھا، اس سے تعلقات قائم کرنا مقصود تھا۔ ہجرت کے واقعہ میں آپ کو یاد ہوگا کہ سراقہ جو اس قبیلے کا سردار تھا، حضور کا پیچھا کرنے کی نیت سے نکلا تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ منورہ کے قریب، مکہ اور مدینہ کے راستے میں آباد تھا۔ سراقہ نے سنا تھا کہ قریش نے سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا ہے۔ وہ چونکہ کھوجی تھا اس لئے اس نے حضور علیہ السلام کے راستہ کا فوراً پتہ چلا لیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مختصر قافلہ تک پہنچ گیا، لیکن مقصود حاصل نہیں کر سکا۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو مدینہ منورہ کے قریب آباد تھا۔ اسی وقت سے رسول اللہ ﷺ کے سراقہ سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ سراقہ ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے ان کو ایک پروانہ امن بھی لکھ کر دے دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ تحریر سیدنا ابوبکر صدیق نے تحریر فرمائی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر صدیق کے خادم جو سفر ہجرت میں ہمراہ تھے) نے لکھی تھی، دونوں صورتوں میں حضور اکرمؐ کی طرف سے ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی گئی اور یوں بنی مدلج کے سردار کے ساتھ حضورؐ کا ایک ذاتی تعلق قائم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بنو مدلج کے خلاف حضور کا کسی عسکری مہم کا کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس قبیلہ طرف مہم بھیجنے کا مقصد صرف دوستی اور بھائی چارے کو فروغ

دینا تھا۔

پھر بنی ضمرہ اور بنی مدلج بڑے بڑے اور اہم قبائل تھے۔ ان قبائل کے خلاف ملٹری ایکشن کے لئے پچاس یا سو آدمیوں کو لے جانا ویسے بھی ناقابل فہم ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے تفصیل سے عرض کی کہ سیرت نگار غزوہ کی اصطلاح مہم کے لئے استعمال کرتے ہیں، کسی ایسی مہم یا expedition کے لئے، جو براہ راست حضور کی سربراہی کا شرف رکھتی ہو، اس کے لئے غزوہ کی اصطلاح استعمال کی گئی اور اگر کسی اور صحابی کو سربراہی سونپی گئی ہو تو اس کے لئے سریہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ غزوات کی تعداد واقدی اور ابن اسحاق نے ستائیس بیان کی ہے جس سے بہت سے سیرت نگاروں نے اتفاق کیا ہے۔ سرایا کی تعداد سب ملا کر ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ بڑے بڑے سرایا کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔ چھوٹے چھوٹے سرایا ستر کے قریب تھے۔

مغازی اب علم سیرت کا ایک شعبہ ہے، علم سیرت ایک وسیع کینوس رکھتا ہے۔ اس وسیع کینوس کی وضاحت کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پورے اسلامی تمدن اور تاریخ کے مرحلۂ آغاز اور رسول اللہ ﷺ کے پورے پیغمبرانہ کیریر کا ایک لینڈ اسکیپ۔ اس لینڈ اسکیپ میں وہ سب کچھ شامل ہے جس کا اسلام اور رسول اللہ کی سیرت مبارکہ سے کوئی تعلق ہو۔ اس میں مغازی کا تذکرہ بھی ہے۔ اس میں سیرت پاک کے دوران وقوع پانے والے اہم واقعات بھی ہیں۔ اس میں رسول اللہ کا ذاتی طرز عمل اور سنتیں بھی ہیں جن کو سنن زوائد کے نام سے یاد کیا گیا۔ ان میں ان قبائل کا تذکرہ بھی ہے جن سے رسول اللہ کا تعلق رہا۔ قبیلہ قریش جو رسول اللہ کا اپنا قبیلہ تھا۔ پھر اس کی شاخیں، پھر شاخوں کی شاخیں۔ ان میں سے ہر قبیلے کے ساتھ حضور کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا۔ یا حضور کا اپنا تعلق رہا، یا آپؐ کے والد کا تعلق رہا، یا دادا کا، یا والدہ کا۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ عرب میں جتنے اہم اور بڑے بڑے قبائل تھے اور جو بھی قبیلے قبائل عرب کی تاریخ اور تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام رکھتے تھے، ان سب میں رسول اللہ ﷺ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی نہ کوئی رشتہ داری پائی جاتی تھی۔ سیرت اور صدر اسلام کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عربوں میں نسب ناموں کو بہت اہتمام سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ یہ

عرب قبیلہ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے غلاموں، اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد رکھتا تھا۔ اس دلچسپی کی وجہ سے علم انساب کے نام سے ایک علم وجود میں آیا۔ اس علم کی وجہ سے عرب قبائل کی آپس کی رشتہ داریوں کی تفصیلات محفوظ ہوگئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت تھی، ایک تکوینی مشیت تھی کہ بہت پہلے سے اس کا بندوبست ہو رہا تھا کہ رسول اللہ کے آباواجداد نے مختلف قبائل سے جو تعلقات قائم کئے ان کی تفصیلات جمع ہو ہوکر محفوظ ہوتی رہیں۔ اب ان قبائل کی تفصیل، ان تعلقات کی نشاندہی، ان تعلقات کے اثرات، ان کا پس منظر، یہ سب خود علم سیرت کا ایک نیا میدان ہے جس پر ابھی کام کا آغاز ہی ہوا ہے۔

پھر حضور اکرمؐ کی ازواج مطہرات کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا۔ عرب کے جتنے بڑے بڑے قبائل تھے، مدینہ منورہ اور اس کے قرب وجوار میں، مکہ مکرمہ اور اس کے قرب وجوار میں، ان سب قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ذاتی اور شخصی نوعیت کے تعلقات قائم فرمائے۔ ان تعلقات کا مقصد دعوت اسلام کے کام کو فروغ دینا اور دعوت اسلام کی مہم میں ان تعلقات کے اثرات کو استعمال کرنا تھا۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ سے نکاح فرمایا تو اس کے بعد ابوسفیان نے اسلام کے خلاف کسی مہم کی قیادت نہیں کی۔ عَرب کے معاشرہ میں کوئی شخص اپنے داماد کے خلاف فوج لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ عربوں کی قبائلی روایات اور معاشرتی اقدار اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ کوئی شخص اپنی ہی بیٹی کے سسرال کے خلاف تلوار لے کر نکل کھڑا ہو۔ یہ مقاصد تھے جو مختلف قبائل میں ازدواجی رشتے قائم کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی اولاد مبارکہ، آل کی تفصیلات ہیں۔ یہ بھی سیرت کا ایک اہم باب ہیں۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس معاشرت اور معیشت کا قیام فرمایا، جو انتظامات اور ادارے قائم فرمائے، جو وثائق اور دستاویزات حضور نے مرتب کرائیں جن کا متن حضور علیہ السلام کے زمانے سے آج تک محفوظ چلا آرہا ہے ان کو لکھنے والوں نے الگ الگ کتابوں میں مرتب کیا ہے۔ پھر حضور کے خصائل، شمائل، خصائص اور فضائل وہ چیزیں ہیں جن پر سیرت کی ہر بڑی کتاب مشتمل ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ سیرت بس اسی کا نام ہے۔ علمائے کرام اور محققین ومدوّنین سیرت

نے یہ کوشش کی کہ ہر وہ چیز، جس کا حضور ﷺ کی ذات گرامی سے ذرہ برابر کا بھی تعلق ہے۔ بے شک کوئی براہ راست تعلق نہ ہو، لیکن تھوڑا سا تعلق بھی ہو۔ تو اس کو بھی سیرت کے مطالعہ کے دائرہ میں لایا جائے۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں جن کا کوئی اثر حضور کے پیغام کو سمجھنے پر نہیں پڑتا ان کو بھی مدوّن کرلیا گیا۔ اگر وہ معلومات نہ بھی ہوتیں تو بھی شاید علم سیرت کی وسعت اور اہمیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی، لیکن سیرت نگاروں کی ذاتی محبت، ذاتی عقیدت اور غیر معمولی احترام اور اہتمام نے وہ چیزیں بھی مرتب کرائیں۔ یہ غیر معمولی محبت اور احترام صحابہ کرام کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ ہر مسلمان اس بات کو جانتا ہے اور گناہ گار سے گناہ گار ترین مسلمان کو بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ ذات رسالت مآب ﷺ کے لئے عقیدت واحترام اور عظمت کے کون سے جذبات واحساسات ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں پنہاں ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہے۔ مغربی مستشرقین اکثر اس چیز سے ناواقف ہوتے ہیں اور انہوں نے کبھی اس غیر معمولی اور بے نظیر و بے مثل محبت وعقیدت کا احساس ہی نہیں کیا جو مسلمانوں کے دلوں میں فروزاں رہتی ہے۔ بڑا گھسا پٹا سا مصرعہ ہے جو کسی دوسرے سیاق وسباق میں کہا گیا تھا لیکن مستشرقین پر ضرور صادق آتا ہے:

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔

ایک مستشرق نے پوری کتاب اس پر لکھ ڈالی کہ رسول اللہ ﷺ کا جو تصور قدیم سیرت نگاروں کے ذہنوں میں تھا، وہ تو محض ایک قبائل رہنما اور ایک مصلح کا تھا۔ لیکن بعد کی نسلوں نے محمد ﷺ کی ذات کو آئیڈیلائز کیا اور ان کی شخصیت پر عقیدت مندی کی ایک تہہ بٹھا دی۔ اس کی پوری کتاب کا مقصد ہی یہ سمجھانا ہے کہ Real Muhammad، Idealized Muhammad، اور Idolized Muhammad میں بڑا فرق ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ مسلمانوں نے نہ کوئی چیز آئیڈیلائز کی نہ آئڈلائز کی۔ پھر اس نے اس فرضی عمل کے مختلف مراحل گنوانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ وہ عشق رسول کے اس گہرے جذبہ کا ادراک ہی نہیں کرسکتا جو ہر مسلمان کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا کوئی اندازہ کسی غیر مسلم کو ہو ہی نہیں سکتا، جب تک کہ اس کو مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا حقیقی ادراک اور علم نہ ہو۔

شروع شروع میں یعنی دوسری صدی ہجری کے وسط تک سیرت کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں آئیں۔ جوں جوں یہ سارا مواد مرتب ہو ہو کر متداول ہوتا گیا اور لوگوں کے لئے دستیاب ہوتا گیا ویسے ویسے بعد میں آنے والوں کے لئے آسان ہوتا گیا کہ اس سارے مواد کو یکجا کریں۔ آٹھویں دسویں صدی ہجری تک آتے آتے سیرت کی کتابیں دس دس، بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ جلدوں میں لکھی جانے لگیں۔ یہ جو کتابیں بارہ جلدوں اور یا پندرہ جلدوں میں لکھی گئیں، ان میں سے بہت سی مطبوعہ طور پر دستیاب ہیں اور اسی ہال کے اوپر کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو سیرت نگاروں اور محدثین نے جمع کی ہیں اور جن کا ان کے مصنف کی نظر میں حضور ﷺ کی ذات مبارکہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا۔

یہ تمام چیزیں جو ابھی میں نے بیان کیں وہ تو یقیناً سیرت کا لازمی حصہ ہیں۔ ان امور کے علاوہ مختلف قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعلقات کا مطالعہ بھی سیرت کا ایک ضروری اور اہم مضمون ہے، جن اصحاب کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا وہ بھی سیرت کا مضمون ہے۔ خدام، عمال اور کارندگان حکومت، قاضی، مفتی، یہ سب تو لازماً سیرت کا حصہ ہے ہی، لیکن یہ تفصیلات کہ حضور ﷺ نے کن کن سواریوں کو سواری کا شرف عطا فرمایا۔ آپ کے استعمال میں گھوڑے کتنے تھے، اونٹنیاں کتنی تھیں، ان معلومات کو بھی سیرت نگاروں نے جمع کیا ہے۔ ان معلومات کی فراہمی میں دینی ذوق اور علمی دیانت کے ساتھ ساتھ حضور کی ذات گرامی سے گہری محبت، یہ تینوں باتیں بیک وقت کارفرما ہیں۔

حضور کی ذات مبارکہ سے صحابہ کرام کی محبت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلی مرتبہ سرکاری انتظام میں امیر حج کے طور پر زیارت بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ امیر حج بن کر آپؓ روانہ ہو چکے تھے اور کئی منزلیں طے کر چکے تھے کہ بعد میں سورۃ براۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو معاہدے گزشتہ سال فتح مکہ کے بعد مشرکین کے ساتھ کئے گئے ہیں وہ چار مہینے کا نوٹس دے کر ختم کر دیئے جائیں۔ اس کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مناسب سمجھا کہ چونکہ تمام قبائل حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچ رہے ہیں ہوں گے تو اگر حج کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے تو زیادہ مفید رہے گا اور سب کو

معاہدات کی منسوخی کا علم ہو جائے گا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو سواری کے لئے اپنی اونٹنی دے دی اور یہ آیات دے کر حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے بھیجا۔ تمام سیرت نگاروں اور مورخین نے یہ بات لکھی ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالبؓ تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے تا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکہ پہنچنے سے پہلے پہلے ان سے مل لیں۔ صحابہ کرامؓ نے جب اُس اونٹنی کی آواز سنی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اونٹنی تھی۔ 'جدعاء' اُس اونٹنی کا نام تھا، کیونکہ اس کے کان کٹے ہوئے تھے اور جدعاء کے معنی کٹے ہوئے کانوں والی اونٹنی کے ہیں۔ جب جدعاء کی آواز سنی تو صحابہ کرام تڑپ اٹھے، حضورؐ کی یاد آ گئی۔ بہت سوں نے سمجھا کہ حضورؐ تشریف لے آئے ہیں۔ جس نے اتنی محبت سے اور ایسی نظر سے معاملات کو دیکھا ہو اور چیزیں جمع کی ہوں اس کے ذوق وشوق کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے والے کہتے رہیں گے اور اپنا نامۂ اعمال مزید سیاہ کرتے رہیں گے کہ حضورؐ کی شخصیت پر عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کی layer اور سطح بٹھا دی وغیرہ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کے جانوروں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اونٹنیوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ حضورؐ نے اگر کوئی بکری اپنے گھر میں رکھی تو اس کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ وہ بکری کس نے دی تھی، کس سے خریدی تھی، کس گھر میں تھی، کتنا دودھ دیا کرتی تھی۔ حضورؐ کے پاس اسلحہ کونسا تھا، آپؐ نے جن گھروں اور حجروں میں رہائش اختیار فرمائی، ان کی پیمائش اور دیگر تفصیل کیا تھی۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی معلوم ہوتا تو سیرت کے علم اور پیغام پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن ایک بے مثال جذبہ اور ایک بے پایاں ذوق وشوق تھا جس کے نتیجہ میں یہ معلومات جمع کی گئیں۔

چند سال پہلے پنجاب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب علم نے، جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، کئی سال کی محنت سے تین کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب اس موضوع پر ہے کہ ازواج مطہرات کے حجرات کہاں کہاں واقع تھے، ان کا رقبہ کتنا تھا؟ کیسے بنے ہوئے تھے؟ پرانی کتابیں لے کر ایک ایک چیز کو ہاتھ سے ناپا۔ مثلاً اگر لکھا ہوا ہے کہ دس ہاتھ کا تھا تو دس ہاتھ سے ناپ کر نشاندہی کی ہے اور 'بیوت النبی' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ چیزیں آج تک چلی آ رہی ہیں اور یہ سب سیرت مبارکہ کا حصہ ہیں۔

یہ ساری معلومات ایک اعتبار سے حدیث کا حصہ ہیں اور ایک اعتبار سے سیرت کا حصہ ہیں۔ محدثین اور سیرت نگار دونوں حضرات نے ان معلومات سے اعتنا کیا ہے۔ لیکن محدثین کا اصل زور اور اہتمام رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپؐ کے افعال واعمال اور تقریرات پر اس اعتبار سے ہے کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ کونسی چیز سنت کا حصہ ہے اور کونسی چیز سنت کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس سیرت نگاروں کا زور اس پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرزِ عمل، شخصیت مبارکہ اور رویہ کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں علوم کے مضامین ومباحث میں بڑا تداخل پایا جاتا ہے۔ بہت سے موضوعات ہیں جو حدیث کا حصہ بھی ہیں اور سیرت کا بھی۔ کچھ موضوعات ہیں جو صرف حدیث کا حصہ ہیں اور سیرت کا حصہ نہیں ہیں۔ کچھ موضوعات صرف سیرت کا حصہ ہیں اور حدیث کا حصہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی ہر بڑی کتاب سیرت کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں سیرت کے بارے میں بنیادی معلومات موجود نہ ہوں اور وہ سارے بنیادی مسائل اور مباحث جن سے علم سیرت کا بڑا حصہ عبارت ہے وہاں دستیاب نہ ہوں۔ یوں علم سیرت کا اساسی ڈھانچہ علم حدیث کی بنیاد پر محدثین نے انتہائی چھان پھٹک کے بعد ایک ایک راوی کی تحقیق اور جرح کے بعد مرتب کر دیا۔

چنانچہ حدیث میں اصل بحث اقوال وافعال رسول پر ہے اور ذات وشمائل رسول ضمناً زیر بحث آتے ہیں۔ سیرت میں ذات وشمائل رسول اصلاً زیر بحث آتے ہیں۔ اور اقوال وافعال پر ضمناً اور تبعاً بحث ہوتی ہے۔ پھر جو چیز ذات رسالت مآب سے جتنا قریب ہے اتنا ہی وہ سیرت کے اصل اور صمیم میں شامل ہے۔ جو چیز جتنی قریب ہے وہ سیرت کے لُب (core) میں شامل ہے اور جتنی کوئی چیز ذات رسالت مآب سے دور ہے اتنی ہی سیرت کے لُب سے بھی دور اور حاشی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سیرت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ اس لئے کہ سعادت دارین رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی رہنمائی اور ہدایت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے لئے سعادت کا طالب ہے، اپنا خیر خواہ ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت، آپ کی سیرت اور آپ کے معاملات سے آگاہی حاصل

کرنے کا پابند اور مکلّف ہے۔ یہ بات انہوں نے زادالمعاد میں لکھی ہے۔

مطالعہ سیرت کی ضرورت مسلمانوں کے لئے کیوں ہے؟ اس پر شاید زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ ایک مسلمان حضور ﷺ کی ذات کو قانون اور شریعت کا ماخذ سمجھتا ہے۔ یہ بات مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت ہی میں نجات ہے 'وان تطیعوہ تھتدوا'۔ ہدایت کا ذریعہ صرف اور صرف اطاعت نبوی ہے۔ اگر کسی مسلمان کے لئے کوئی اسوہ حسنہ ہے تو وہ صرف رسول اللہ کی ذات گرامی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اگر ہوسکتی ہے تو صرف اور صرف رسول اللہ کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کی اطاعت کا کوئی اور ذریعہ یا راستہ نہیں ہے۔

اسوہ حسنہ کا انگریزی ترجمہ Role Model رول ماڈل یا بہترین رول ماڈل یا واحد رول ماڈل ہوسکتا ہے۔ مسلمان کے لئے اگر کوئی رول ماڈل ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اس رول ماڈل کی تفصیلات تین ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید، جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ ارشاد ہم نے سنا کہ 'کان خلقہ القران'، آپؐ کے اخلاق وہی تھے جو قرآن پاک میں تحریر ہیں۔ دوسرا ماخذ حدیث وسنت کے وہ ذخائر ہیں جن کے جمع کرنے اور مدون کرنے پر ہزاروں انسانوں نے اپنی زندگیوں کے سالہا سال اور شب و روز قربان کئے۔ تیسرا بڑا ماخذ ہے سیرت مبارکہ اور آپؐ کے وہ شمائل وخصائل جن کا تذکرہ کرنے اور سننے کی سعادت آئندہ گیارہ دنوں میں ان شاء اللہ ہم سب حاصل کریں گے۔

آج کا دور ایک عالمگیریت کا دور ہے اور دنیا ایک عالمگیر نظام کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ کچھ لوگ بدنیتی سے عالمگیریت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کی زبان سے جب عالمگیریت کا لفظ سننے میں آتا ہے تو سیدنا علیؓ بن ابی طالب کا یہ جملہ بے اختیار یاد آتا ہے 'کلمة حق ارید بها الباطل'، بات تو صحیح ہے لیکن نیت اور مقصد غلط ہے۔ بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر سیدنا علی بن ابی طالب یہ جملہ ارشاد نہ فرماتے تو شاید اس طرح کی شرارتوں کی معنویت کا صحیح اندازہ نہ ہوتا۔ بعض اوقات ایک حق بات کہی جاتی ہے اور آپ اس کی تردید نہیں کرسکتے، اس کو غلط نہیں کہہ سکتے، لیکن کہنے والے کی نیت منفی ہوتی ہے اور وہ

اس کو اپنے منفی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔یہی کیفیت آج عالمگیر یت کی ہے جس کے نام پر آج مختلف طاقتیں مختلف مقاصد اور محرکات کے تحت اپنے اپنے اہداف کو پورا کر رہی ہیں۔لیکن اس کے باوجود عالمگیریت ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس کے تقاضوں کو سمجھنا چاہئے۔

عالمگیریت کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں انسانی مساوات کے اصول کی تکمیل کی جائے۔اگر انسانی مساوات نہ ہو۔کچھ انسان برتر اور کچھ کم تر ہوں۔تو پھر اس طرح کا ایک عالمگیر انسانی معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا جس طرح کے دعوے کئے جارہے ہیں۔اگر دنیا برتر اور کم تر انسانوں میں منقسم ہوتو ان کے درمیان شدید قسم کی کشمکش جاری رہے گی اور جب کشمکش جاری ہو تو عالمگیریت قائم نہیں ہوسکتی۔عالمگیریت کا لازمی تقاضا ہے کہ انسانی مساوات کے اصولوں کو تسلیم کیا جائے اور نہ صرف تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر عمل بھی کیا جائے۔

دوسری چیز جو عالمگیریت کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عدل وانصاف کے اصولوں کو تسلیم کیا جائے اور ہر انسان کو برابری کی سطح پر عدل وانصاف تک رسائی کا حق دیا جائے۔یہ بھی مساوات کا ایک لازمی تقاضا ہے۔تیسری چیز یہ ہے کہ ہر انسان کو برابری کی سطح پر امن وسکون حاصل ہو۔اگر معاشرہ میں امن وسکون سب کے لئے یکساں نہیں ہے۔کچھ انسان امن میں ہوں اور کچھ مسلسل بدامنی کا شکار ہوں تو پھر بھی عالمگیریت قائم نہیں ہوسکتی۔کسی ایک طبقے یا کسی ایک گروہ کی فرمان روائی تو قائم ہوسکتی ہے اور ماضی میں بھی قائم ہوتی رہی ہے۔ماضی میں بھی زبردستوں نے زیردستوں کو اپنی آقائی کے تلے روندا ہے اور آئندہ بھی روندیں گے۔ لیکن اگر ماضی کے کسی منفی رجحان کو ختم کرنا مقصود ہے اور واقعتاً انسانی مساوات کی بنیاد پر عالمگیریت کا قیام مقصود ہے تو پھر امن وسکون تمام انسانوں کو یکساں طور پر حاصل ہونا چاہئے۔

چوتھی چیز جو عالمگیریت کے لئے ضروری ہے وہ علم کے تمام شعبوں تک تمام انسانوں کی یکساں رسائی ہے۔ہزار ہا سال سے انسانوں نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ وہ مفید علم جس کا مارکیٹ میں چلن ہو اور بازار میں جس کی طلب ہو،تو اُس علم پر بندشیں عائد کی جائیں۔اس پر اجارہ داریاں قائم کردی جائیں اور عام انسانوں یا کم تر انسانوں کو اس علم کے حصول سے منع کردیا جائے۔ایک زمانہ تھا کہ مذہبی علم کی بنیاد پر سیادت اور قیادت ملتی تھی تو مذہبی علم کے لئے

طبقے مقرر تھے۔ بنی لاوی میں تورات کا علم ہوگا اور ان کے علاوہ کسی کو تورات کا علم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ برہمن کو مذہبی علم حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ برہمن کے علاوہ کسی کو علم حاصل کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ غیر برہمن اگر مذہبی علم کا کوئی جزو سن بھی لے تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ یہ اجارداریاں علم پر قائم تھیں اور آج بھی ہیں۔ آج بھی مغربی جامعات کے بعض شعبوں میں مسلمانوں کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ بعض شعبوں میں مشرقی ممالک کے طلبہ کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ پھر کچھ شعبے ہیں جہاں مسلمانوں کو کسب فیض کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ اور شعبے ہیں جہاں مخصوص ممالک کے مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ علم پر اجارہ داری کی ایک نئی شکل ہے۔ آج اگر برتری اور قیادت ایک خاص علم سے حاصل ہوتی ہے تو کمزوروں اور زیردستوں کے لئے اس علم کا راستہ بند کردیا جائے۔ جب تک یہ سلسلہ رہے گا، انسانی مساوات قائم نہیں ہوسکتی۔ جب تک مساوات قائم نہیں ہوگی، عالمگیریت کا حق ادا نہیں ہوگا۔

پانچویں اور آخری شرط یہ ہے کہ تمام انسانوں سے معاملہ تہذیب وتمدن اور اخلاق کی بنیاد پر کیا جائے۔ تہذیب کو تمام انسانوں کی مشترکہ کاوش اور مشترکہ بازیافت سمجھا جائے۔ اگر تہذیب کی بنیاد پر دوسری اقوام کو کم تر سمجھا جائے، تہذیب کی بنیاد پر دوسری اقوام کو غلام بنایا جائے، تہذیبوں کی کشمکش کے نام پر بعض تہذیبوں کی برتری قائم کی جائے اور بعض علاقوں اور بعض نسلوں کی برتری کو کمزور شواہد اور خود ساختہ دلائل کی بنیاد پر انسانوں کے دماغوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے تو پھر اس صورت میں عالمگیریت قائم نہیں ہوسکتی۔

اگر یہ پانچ اصول عالمگیریت کے قیام کے لئے ناگزیر ہیں تو پھر ایسی عالمگیریت کا واحد نمونہ اگر کسی نے پیش کیا ہے تو وہ صرف اسلام نے اور پیغامبر اسلام سرکار دو عالم نے پیش کیا ہے۔ جس میں مساوات انسانی کا اصول مکمل طور پر کارفرما تھا۔ عدل وانصاف سب کے لئے تھا، عدل وانصاف ہر انسان کے لئے تھا، علم ہر ایک کا حق ہی نہیں بلکہ فریضہ بھی تھا، اور تہذیب واخلاق سب انسانوں کی مشترکہ میراث تھی۔ 'انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق'، میرا تو مقصد بعثت ہی مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ علم ہر انسان اور ہر شخص کے لئے محض حق نہیں بلکہ ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ امن وسکون ایسا ہونا چاہئے کہ ایک خاتون

حضر موت سے اٹھے اور تن تنہا بعلبک تک تنہا چلی جائے، وہی بعلبک جہاں آج کل بمباری ہورہی ہے اور تباہی پھیل رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سونا ہو اور کوئی اس کو تنگ کرنے والا نہ ہو۔ یہ معیار ہے امن وسکون کا۔

عدل وانصاف کا معیار یہ ہے کہ بڑے اور چھوٹے میں، مغربی اور مشرقی میں اور عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہ ہو۔ یہاں تک کہ فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کے جرم میں لائی جائیں تو ان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ مساوات انسانی ایسی کہ بادشاہ اور گدا، خلیفہ اور غلام ایک سطح پر ہوں۔ اگر ایک دن خلیفہ کی سواری کا دن ہو تو خلیفہ سوار ہو اور اگلا دن غلام کی سواری کا دن ہو تو غلام سوار ہو۔

عالمگیریت کو فروغ دینے اور اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لئے اگر کسی شخصیت کی زندگی صحیح رہنمائی دے سکتی ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اور ممالک کو جن مشکلات ومصائب سے واسطہ رہا ہے، ان میں ایک اہم مشکل قوموں کی باہمی عصبیت national prejudices کا مسئلہ ہے۔ دوسری چیز دولت مندوں اور غریبوں، پیٹ بھروں اور بھوکوں کے درمیان کشمکش۔ ماضی میں انسانیت کو جتنی مشکلات پیش آئیں، جتنی جنگیں ہوئیں اور جتنا خون بہا ہے وہ شاید نانوے فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ انہی دو وجوہات کی بنا پر بہا ہے۔

سرکار دوعالم ﷺ نے جب اپنے کام کا آغاز کیا تو قبائل عرب میں یہ دونوں مشکلات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ قومی عصبیت تو قومی سطح پر ہوتی ہے جو بہر حال ایک بڑی سطح ہے، عربوں میں تو قبائل کی بنیاد پر شدید عصبیتیں موجود تھیں۔ قبیلوں میں پھر مزید ذیلی شعبوں اور شاخوں کے درمیان عصبیتیں پائی جاتی تھیں۔ آپ نے سنا ہوگا رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے میں، آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے سے چند مہینے پہلے قبیلہ بنی حنیفہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جو جزیرہ عرب کے وسط میں واقع کے علاقہ میں آباد تھا۔

عرب قبائل کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک گروپ ربیعہ قبائل اور دوسرا مضری قبائل

کہلاتا تھا۔ رسول اللہ کے قبیلہ قریش کا تعلق مضری قبائل سے تھا۔ ربیعہ قبائل سے اکثر وبیشتر ان قبائل کا تعلق تھا جو جزیرہ عرب کے وسط میں آباد تھے۔ ان دونوں قبائلی گروہوں کے درمیان کشاکش اور عصبیت کی فضا رہتی تھی۔ جب مسیلمہ نبوت کا دعوی کیا تو ربیعہ قبائل کے خاصے لوگ بڑی تعداد میں مسیلمہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کے زمانے میں ان کے خلاف جنگ کی گئی جو کئی دن یا شاید کئی ہفتے جاری رہی۔ جنگ کا انداز یہ ہوتا تھا کہ تمام دن جنگ ہوتی تھی اور جب شام ہو جاتی تو جنگ روک دی جاتی تھی۔ فریقین اپنے اپنے کیمپ میں واپس چلے جاتے تھے۔ ایک دن جنگ کے دوران مسلمان اپنے کیمپ میں تھے۔ مسیلمہ کے ماننے والے اپنے کیمپ میں تھے۔ بعض مسلمان رات کے وقت شاید چہل قدمی کے لئے اپنے کیمپ سے نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسیلمہ کے کیمپ سے بھی کچھ لوگ ٹہلنے کے لئے نکلے ہوئے ہیں۔ وہ قریب پہنچے تو انہوں نے سلام دعا کی۔ ایک صحابی نے مسیلمہ کے حامیوں میں ایک شخص کو غور سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا تمہارا یہ نام ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ صحابی نے پوچھا کہ کیا تم وہ نہیں ہو جو بنی حنیفہ کے اسّی رکنی وفد میں مدینہ آئے تھے اور حضورؐ نے تم سب کو فلاں مکان میں ٹھہرایا تھا؟ اس نے کہا ہاں میں وہی ہوں۔ صحابی نے پوچھا تو پھر کیا تم ایمان نہیں لائے تھے؟ اس نے کہا کہ بالکل ایمان لایا تھا۔ صحابی نے پھر پوچھا کہ کیا اب تمہیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر کوئی شک ہو گیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں مجھے اب بھی کوئی شک نہیں۔ صحابی نے پوچھا کہ تم حضورؐ کو نبی مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں مانتا ہوں۔ پوچھا گیا کہ تو پھر تم مسیلمہ کی نبوت پر ایمان لائے ہو؟ اس نے کہا نہیں، میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اس پر صحابی رسول نے پوچھا کہ پھر بندہ خدا! مسلمانوں سے جنگ کیوں کر رہے ہو؟

اس سوال کے جواب میں اس شخص نے جو کچھ کہا وہ بڑی عجیب بات تھی۔ لیکن اُس دور کے ماحول کو سمجھنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ اس نے کہا کہ 'خدا کی قسم ربیعہ کا جھوٹا مجھے مضر کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔' یہ قبائلی عصبیت تھی جس سے رسول اللہ کو واسطہ پڑا تھا۔

جہاں تک بھوکوں اور پیٹ بھروں کا تعلق ہے تو ان کی کشمکش سے تو پورے عرب کی جاہلی شاعری بھری پڑی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اس کشمکش کے ضمن میں اپنے کارنامے بیان نہ کئے ہوں۔ صعلوک کے معنی کنگال کے ہیں اور وہاں صعالیک کی ایک پوری

قوم یا نسل ہوا کرتی تھی۔ پوری نسل کا لقب ہی کنگال تھا اور ان کا کام ہی لوٹ مار کرنا تھا۔ وہ لوٹ مار اور قتل وغارت کے ذریعے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ان صعا لکہ میں سے شنفری کے نام سے ایک بڑا مشہور کنگال گزرا ہے۔ وہ بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ

وایـمـت نسـوانـاً وایتـمـت الـدة

وعـدت کـمـا ابـدأت والیـل ألیـل

'میں رات کو نکلتا ہوں تو کتنی ہی عورتوں کو بیوہ اور کتنے ہی بچوں کو یتیم کر دیتا ہوں اور تاریکی ختم نہیں ہونے پاتی کہ میں واپس آجاتا ہوں' یہ ان کنگالوں کا فخریہ اظہار ہے جن کا پیشہ یہ تھا کہ لوٹ مار کر کے اپنی روزی حاصل کریں۔ جاہلی ادب کے بعض متخصصین نے ان صعالیک اور کنگالوں کے کلام کا خصوصی مطالعہ بھی کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔

ان حالات میں جہاں عصبیت کا یہ حال ہو اور بھوکوں اور پیٹ بھروں کے درمیان کشمکش کا یہ حال ہو، رسول اللہ ﷺ نے کیسے اس مسئلہ کو حل کیا؟ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں انسانوں کی مدون تاریخ (recorded history) میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ان دونوں اقسام کی مشکلات کو، جو اپنی انتہا پر تھیں، یوں دیکھتے دیکھتے حل کر دیا گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان پہاڑوں جیسی مشکلات کو آپؐ نے کامیابی سے حل کر دیا۔ کس طرح حل فرمایا اور کس طرح باہم متصادم قبائل اور گروہوں کو باہم شیر وشکر بنایا۔ اس راز کو جاننے کے لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

پھر غیر مسلموں کے لئے ایک بات ہمیشہ دلچسپی اور حیرت کا موجب رہی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام ہر دور میں، خاص طور پر نبوت کے تئیس اور مدینہ منورہ کے دس سال سمیت پچھلے چودہ سو چالیس سالوں میں پھیلنے کے لحاظ سے تیز رفتار ترین مذہب ہے۔ ماضی اور حال میں کوئی بھی مذہب اتنی تیز رفتاری کے ساتھ نہیں پھیلا۔ اس وقت بھی اسلام تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جن ادوار میں مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور عسکری اعتبار سے شکست ہوئی، ان ادوار میں اسلام زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلا۔ اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک زمانہ سقوط بغداد کے فوراً بعد کے دور کو بتایا جاتا ہے۔ جب تاتاریوں نے منگولیا سے نکل کر مصر تک کا علاقہ تاراج کر دیا تھا اور ہزاروں

بستیاں برباد کر کے لاکھوں انسانوں کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ بڑے بڑے اکابر اسلام اس ہنگامے میں شہید کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن کثیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس دور میں لوگوں کی زبان پر اکثر یہ جملہ سننے میں آتا تھا: 'اذا قيل لك ان التتار انهزموا فلاتصدق'، اگر کوئی تم سے کہے کہ تارتاریوں کو شکست ہوگئی تو تسلیم نہ کرو۔ گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور بات تھی۔

جب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی اور بربادی کا یہ سارا کام ہوگیا اور دنیائے اسلام کو تاتاریوں کی افراتفری سے ذرا سکون ملا تو اتنی تیزی سے اسلام پھیلا ہے کہ اتنی تیزی سے نہ پہلے پھیلا تھا اور نہ بعد میں کئی سو سال تک اس کی مثال مل سکی۔ بعد میں وہی تاتاری جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا، کتب خانے تباہ و برباد کیے اور ایسی تباہی پھیلائی کہ دجلہ و فرات کا پانی سیاہ ہوگیا، وہی تاتاری اسلام میں داخل ہوگئے۔ خود مغربی مصنفین نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ سیاسی اسلام اور مذہبی اسلام مغرب کی اصطلاحات ہیں ہماری اصطلاحات نہیں ہیں۔ مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ سیاسی اسلام اور مذہبی اسلام دونوں پھیلنے کے اعتبار سے یکساں نہیں رہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جب سیاسی اسلام کو غلبہ حاصل ہو تو مذہبی اسلام کو بھی غلبہ حاصل ہوا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ سیاسی اسلام کو شکست ہوئی ہو تو مذہبی اسلام کو بھی زوال ہوگیا ہو۔ بلکہ بارہا اس کے برعکس ہوا ہے۔ یہ کئی مغربی مصنفین نے تسلیم کیا ہے۔

خود آج امریکہ اور یورپ میں قبول اسلام کی جو رفتار ہے اس سے بھی اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جو لوگ وہاں سے آتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ 9/11 کے واقعات کے بعد اسلامی کتب کی اشاعت اور قبول اسلام کی رفتار پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اسلامی کتب کی اشاعت ہزاروں گنا بڑھ گئی ہے۔ کئی سال تو ایسے گزرے کہ کتابوں کی دکانوں پر قرآن پاک کا ترجمہ دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ ادھر کاپیاں آئیں اور اُدھر نکلیں۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں کے دوران قرآن پاک کے تراجم کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔ اس منفرد حقیقت کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کا مطالعہ اس کے اصل مآخذ اور مصادر سے کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا قوت ہے، وہ کیا روح اور اسپرٹ ہے جو اسلام کو اس تیزی سے پھیلا رہی ہے کہ ان ساری مشکلات کے باوجود اسلام کے پھیلاؤ اور توسیع کا جو مدّ

ہے، وہ کمزور نہیں پڑا۔ مدّ اسلامی چڑھتا ہی جارہا ہے۔ دعوت کے میدان میں مدا سلامی ہمیشہ آگے کی طرف رہا ہے۔ سیاسی اور عسکری جذر سے دعوتی مدّ کبھی بھی متاثر نہیں ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا ایک پہلو اور ہے جس نے بہت سے غیر مسلموں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماضی اور حال میں ایسے لوگ تو بے شمار ہوتے رہے ہیں جو کسی ایک شعبہ زندگی میں قیادت کررہے ہوں اور کسی ایک شعبہ میں قیادت کے نتیجہ میں انہوں نے کامیابی حاصل کی ہو۔ لیکن ایسی مثال کوئی نہیں کہ ایک شخص نے بالکل شروع اور آغاز سے کسی نئی چیز کا تصور دیا ہو، نئے انقلاب کی نوید دی ہو، نیا وژن دیا ہو، زندگی کے ہر گوشے میں تبدیلی اور اصلاح کی نوید سنائی ہو، ایک بھرپور تبدیلی اور اصلاح کا پیغام دیا ہو، پھر اس بھرپور اصلاح اور تبدیلی کو اپنی زندگی ہی میں آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں مکمل کرکے دکھا دیا ہو۔ (مدینہ منورہ سے باہر توسیع کا عمل سنہ ۲ ہجری میں غزدۂ بدر کے بعد شروع ہوا اور سنہ ۹ ہجری میں تبوک کی مہم میں تکمیل کو پہنچا۔ سنہ ۱۰ھ میں خطبۂ حجۃ الوداع کے ذریعہ اس تکمیل کا اعلان کردیا گیا۔) اور جو رول ماڈل دنیا کے سامنے پیش کیا ہو وہ زندگی کے ہر گوشے کے لئے اسی طرح سے معنویت رکھتا ہو جس طرح کی معنویت روز آغاز سے رکھتا تھا۔ سیرت مبارکہ کی یہ جامعیت ہی اس کو ایک انفرادیت عطا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا ایک جامع رول ماڈل ہونا ایک ایسی منفرد چیز ہے جو دنیا میں کسی اور شخصیت کو حاصل نہیں ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام اولوالعزم رسولوں کو یہ چیز حاصل تھی۔ لیکن آج ان کی تعلیمات اور سیرت کے بارے میں معلومات محفوظ نہیں ہیں۔ اس لئے آج ان کی دستیاب سیرت کے حوالے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ آج کوئی رول ماڈل موجود نہیں ہے۔

پھر تاریخ عالم اور خود مغربی مصنفین کے اعتراف کے مطابق انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انسان اگر کوئی شخص کہلاسکتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ دنیا میں کوئی اور انسان اپنی کامیابی کی کمیت اور کیفیت، گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے حضور علیہ السلام کی نسبت ہزارویں حصے میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ انسانی تاریخ کے دوسرے نامور اور

کامیاب لوگوں کے اثرات یا تو کسی خاص علاقے تک محدود ہیں، یا کسی خاص دور تک محدود ہیں، یا کسی خاص فن اور کسی ایک میدان تک محدود ہیں۔ ایسے اثرات جو ہر علاقے اور ہر قوم میں موجود ہوں، ہر زبان بولنے والوں میں پائے جاتے ہوں، ہر تہذیب وتمدن اور ہر براعظم میں ہوں، زندگی کے ہر پہلو میں ہوں، ایسی مثال حضورﷺ کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اسی لئے انصاف پسند مشرقی اور مغربی مصنفین رسول اللہﷺ کو تاریخ اسلامی کی منفرد ترین شخصیت کہتے ہیں جو انسانی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔

یہاں میں مائیکل ہارٹ کا حوالہ نہیں دوں گا جس نے حضورﷺ کو سو عظیم انسانوں میں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ لیکن میں اس کا حوالہ اس کے بعد والے نام کے لئے دینا چاہوں گا۔ اس نے نمبر دو پر آئزک نیوٹن یا اسحاق نیوٹن کو رکھا ہے۔ نیوٹن بلاشبہ بہت بڑا آدمی تھا اور سائنس کے میدان میں اس کا کارنامہ بہت بڑا ہے۔ لیکن جو آدمی میری طرح سائنس کا طالب علم نہ ہو، اور دنیا کے چھ ارب انسانوں میں کتنے انسان سائنس کے طالب علم ہیں؟ کتنے ہیں جنہوں نے نیوٹن کا نام بھی سنا ہو، ان کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے۔ پھر سائنس کہاں سے کہاں چلی گئی۔ اگر اسحاق نیوٹن تاریخ کا دوسرا بڑا آدمی ہے تو پہیہ ایجاد کرنے والا اُس سے بھی بڑا آدمی ہونا چاہئے۔ آخر پہیے کی ایجاد انسانی تہذیب وتمدن کی توسیع وتشکیل میں اس کام سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو نیوٹن نے کیا تھا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ چونکہ نیوٹن کا تعلق دنیائے مغرب سے تھا اور مغرب سے جو چیز وابستہ ہو، دنیا اس کو بہت اونچی اور بے مثال چیز سمجھتی ہے اس لئے اسحاق نیوٹن کا نام انہوں نے نمبر دو پر لکھ دیا۔ ورنہ بظاہر اپنی اہمیت اور اپنی تاثیر کی وسعت کے اعتبار سے وہ اس درجہ کا انسان نہیں ہے کہ اس کا نام رسول اللہﷺ کے بعد دوسرے نمبر پر رکھا جاسکے۔

ان سب سے قطع نظر کر کے کم سے کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کا اگر کوئی معیار ہو اور کسی بھی غیر مسلم سے کہا جائے کہ پوری تاریخ انسانی کا جائزہ لے کر وہ انصاف سے یہ بتائے کہ کم سے کم وسائل میں زیادہ سے زیادہ کامیابی کس انسان نے حاصل کی۔ اگر دیانت داری سے کوئی شخص مطالعہ کرنا چاہے تو رسول اللہﷺ کے اسم گرامی کے علاوہ کوئی اور نام ذہن ودل اور حاشیہ خیال میں آ ہی نہیں سکتا۔

دنیا میں یقیناً بڑے بڑے فاتحین گزرے ہیں۔ بڑے بڑے قانون دہندگان بھی گزرے ہیں، جسٹینین گزرا ہے جس کا کوڈ بڑا مشہور ہے۔ سلطنتوں اور ریاستوں کے بانی گزرے ہیں۔ معلمین اخلاق اور تزکیہ نفس کرنے والے بھی گزرے ہیں۔ اجتماعی مصلحین بھی گزرے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے پاس یا تو پہلے سے ایک روایت اور ذخیرہ موجود تھا۔ جسٹینین کے اپنے پاس قانون کا ذخیرہ یا اس کا ذاتی علم کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے خود تو اپنا کوڈ نہیں لکھا۔ اس نے پہلے سے موجود ان قوانین کو مدون کرا دیا جو اس سے پہلے سے تحریری اور غیر تحریری دونوں صورتوں میں موجود تھے اور ہزار سال سے ان پر عمل ہو رہا تھا۔ جسٹینین کے کہنے سے وہ قوانین یک جا مرتب کر کے لکھوا دیئے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی کارنامہ جسٹینین کا نہیں ہے، کیوں کہ روما میں ایک ہزار سال پہلے سے جو قوانین چلے آرہے تھے جن میں سے بہت سے پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے ان سب کو یکجا کر کے کوڈیفائی کروا دیا گیا۔ یوں جسٹینین بہت بڑا آدمی ہو گیا۔

اب ذرا جسٹینین کے قانون کا رسول اللہ ﷺ کی عطا فرمودہ شریعت سے موازنہ کریں۔ عرب میں قانون کا کوئی تصور نہیں تھا۔ قانون کے نام پر ایک صفحہ بلکہ ایک جملہ بھی کہیں لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ عرب میں قانون سازی یا قانون پر عمل درآمد کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے ایسا قانون عطا فرمایا کہ دنیا سے حضور کے تشریف لے کے بعد پندرہ سال کے اندر اندر دنیا کے تین براعظموں میں وہ قانون پھیل گیا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں مسلمان ہمارے برصغیر میں پہنچے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں اسپین میں مسلمانوں کی آبادی وجود میں آ گئی تھی۔ تین براعظموں میں اسلام کا پیغام حضرت عثمان کے زمانے میں پہنچ گیا تھا۔ اور یہ تمام آبادیاں اسلامی قانون پر عمل کر رہی تھیں۔ اُس حکومت میں جو سیدنا عثمان غنیؓ کی تھی، آج اس میں ایک درجن سے زیادہ مسلمان حکومتیں ہیں۔ ان سب کا نظام اور قانون شریعت کے مطابق چل رہا تھا۔ جسٹینین کے قانون کو اتنی وسعت اور وقعت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

عظیم فاتحین کی مثالیں دیکھ لیں، بانیان مذاہب کی مثالیں دیکھ لیں۔ معلمین اخلاق کی مثالیں دیکھ لیں۔ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر تصورات و نظریات کا ایک ذخیرہ موجود

تھا۔ ایک پس منظر موجود تھا جس کی بنیاد پر تعمیر کرنا آسان تھا۔ بالکل آغاز سے تعمیر ہو، یہ کارنامہ حضورؐ کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔ یہاں قریب قریب عدم سے ہر چیز کا آغاز ہوا۔ یہ وسائل تھے اور کامیابی آپ کے سامنے ہے، جس کچھ اندازہ آئندہ گیارہ دنوں کی گفتگو میں ہو جائے گا۔

رسول اللہ کے سیرت نگار کے لئے ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ آپؐ کی حیات مبارکہ، اقوال وارشادات، پیغام اور کارناموں کے بارے میں معلومات اتنے وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک جگہ سمیٹنا اور ان کی بنیاد پر ایک مرتب اور جامع تصویر پیش کرنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے۔ ہر سیرت نگار کے سامنے ایک بہت بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ اس ذخیرہ معلومات کو کیسے سمیٹا جائے اور کیسے مرتب کیا جائے۔ اس موضوع پر مناہج پر گفتگو کے دوران بات ہوگی تو اس مشکل کا اندازہ بھی ہوگا کہ جب معلومات سیرت کو مرتب انداز میں جمع کیا جائے اس سے کیا مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اگر الگ الگ موضوعات کے مطابق معلومات جمع کی جائیں تو اس سے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔

گویا یہاں معلومات کی وسعت اور فراوانی کی وجہ سے مشکل پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے بانیان مذاہب اور انبیاء کے سیرت نگاروں کے سامنے مسئلہ قلت معلومات کا ہوتا ہے۔ معلومات ہی موجود نہیں ہوتیں۔ کوئی چھوٹا سا سوال کرنا چاہے۔ جس طرح کے سوالات حضورؐ کے بارے میں کئے جاتے ہیں، اور مغربی مستشرقین آئے دن یہ سوالات دہراتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات دوسری مشہور شخصیات کے بارہ میں کئے جائیں تو ان کے نام لیواؤں کو پہلے ہی قدم پر ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان شخصیات کے بارے میں عام سے سوالات کا جواب ملنا بھی ممکن نہیں۔ مثلاً سیدنا عیسیٰ بن مریم کس طرح کا لباس پہنتے تھے۔ آج اگر کوئی ان کی پیروی میں اُن جیسا لباس پہننا چاہے، ان جیسا کھانا کھانا چاہے، تو ان سوالات کا کوئی جواب دستیاب نہیں۔ چاروں انجیلوں میں جو کچھ ہے ان سے کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ بہت ابتدائی، متفرق، منتشر قسم کی معلومات ملتی ہیں۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو سب سے زیادہ recent پیغمبر ہیں ان کی کیفیت ہے۔ جو ایک ایسی قوم میں آئے جو بڑی متمدن تھی۔ جن کے پیروکاروں میں بڑے بڑے تمدن قائم کرنے والے لوگ موجود تھے۔ جو ایسی قوم میں بھیجے گئے جہاں یونانیوں کے علوم وفنون کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ جہاں عقلیات

کا بڑا چرچا تھا۔ وہاں پر بھی سیرت نگار معلومات کی قلت سے پریشان ہو جاتے ہیں۔

معلومات کی اس قلت کی وجہ سے خود عیسائیوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ عیسیٰ بن مریم کوئی شخصیت تھے بھی یا محض وہمی اور دیو مالائی وجود رکھتے ہیں۔ جیسا کہ برٹرینڈ رسل اور کئی دوسرے مغربی اہل علم کا خیال ہے۔ یہی بات متعدد مغربی مؤلفین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بھی کہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی تاریخی شخصیت نہیں تھے بلکہ ان کا وجود محض دیو مالائی کہانی ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اور مضامین لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس شک کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان شخصیات کے بارے میں معلومات کی سخت کمی ہے۔ لیکن اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کہہ سکا کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت تاریخی اعتبار سے ثابت شخصیت نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کی اِس اہم ترین شخصیت سے واقفیت کے لئے اور اس شخصیت کا فہم حاصل کرنے کے لئے مطالعہ سیرت ناگزیر ہے۔

پس تاریخ مذاہب میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہی واحد تاریخی شخصیت ہے۔ اس وقت دنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں ان میں سے کسی کے موسس کی شخصیت کا وجود بھی تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔ خالص تاریخی شرائط کے مطابق کسی ایک کی شخصیت بھی تاریخ لحاظ سے ثابت شدہ نہیں ہے۔ خود ان کے ماننے والوں کو بھی یہ یقین نہیں ہے کہ واقعی اس نام کی کوئی شخصیت موجود بھی تھی کہ نہیں تھی۔ اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ حضور ﷺ ہر پہلو سے تاریخ کی سرچ لائٹ میں ہیں، جس کا ہر ہر گوشہ نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن ہے۔ لہٰذا اسوہ حسنہ کو جس کو ہم آج کل کے محاورہ میں قرآن اِن ایکشن یا قرآن اِن پریکٹس کہہ سکتے ہیں، دیکھنے کے لئے اور قرآن صامت کو سمجھنے کے لئے قرآن ناطق کی عظیم شخصیت کو دیکھنا پڑے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان تمام کامیابیوں اور عظمتوں کے باوجود کسی اوریجنلٹی کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ خود حضورؐ کے سچا ہونے اور نبی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ تھوڑی سی کامیابی سے انسان کا ذہن بھٹک جاتا ہے اور دماغ بہک جاتا ہے۔ معمولی کامیابی بھی مل جائے تو انسان ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ لیکن اپنی ہر کامیابی، ہر پیغام اور ہر چیز کے بارے میں بار بار یہ

اعلان کرنا کہ یہ اسی سلسلہ کا ایک تسلسل ہے جو خالق کائنات نے روز آغاز سے شروع کر دیا تھا، یہ انہی انبیا کی تعلیم کا تسلسل ہے جو ماضی میں آتے رہے ہیں۔ میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا۔ نہ میں بطور نبی کے کوئی نیا ہوں، نہ میرا پیغام کوئی نیا پیغام ہے، اور نہ ہی میں کوئی نئی چیز لے کر آیا ہوں۔ میں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے چلے آنے والے پیغام الٰہی، اللہ کی شریعت اور دین کو لے کر آیا ہوں۔ میرا کام صرف ان دو چیزوں کی تکمیل ہے۔ ایک مکارم اخلاق کا تصور دوسرے تصور دین کی تکمیل۔ مکارم اخلاق سے مراد محض اخلاقیات نہیں ہے۔ بلکہ مکارم اخلاق سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کو کسی مادی اساس کی بنیاد پر، کسی عقلی اساس کی بنیاد پر یا کسی مفاداتی اساس کی بنیاد پر قائم ہونے کی بجائے خالصتاً اخلاقی اور روحانی اصولوں پر قائم ہونا چاہئے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔

انسانوں میں معلمین اخلاق نے ہزاروں بار اخلاق کی تعلیم دی۔ سینکڑوں معلمین اخلاق کے خیالات قلم بند کئے گئے۔ درجنوں معلمین اخلاق کے خیالات کی بنیاد پر اخلاقیات کے نظریئے اور فلسفے مرتب ہوئے۔ لیکن تکمیل اخلاق اگر کسی شخصیت کے ہاتھوں ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ اس طرح کہ ایک ایسا نظام معاشرت ومعیشت اور نظام سیاست واجتماع قائم ہو کہ جس میں بنیادی اساس اخلاق اور روحانیات ہوں۔ جس میں اساسی اور بنیادی عامل اور محرک کوئی مادی مفاد نہ ہو بلکہ روحانی اور اخلاقی بہتری ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن پاک کے الفاظ میں نعمت کے لفظ سے یاد کیا گیا (**واتممت علیکم نعمتی**) اور جس کو حضور ﷺ نے اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرار دیا۔

علم حدیث وسیرت کے باہمی تعلق کے بارے میں میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ ابتدا میں حدیث اور سیرت دونوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک رہیں اور آج بھی بہت سے موضوعات مشترک ہیں۔ لیکن ایک چیز ان دونوں کا پوری انسانی تہذیب اور سارے انسانی تمدن کے لئے contribution ہے۔ علم سیرت اور حدیث نے علم تاریخ کو جنم دیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی کے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے اس کو بیان کیا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا میں تاریخ کا تصور کیا تھا اور مسلمانوں کے بعد دنیا میں تاریخ کا کیا تصور رائج ہو گیا ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے تاریخ نویسی کے کونسے معیارات مقرر کئے ہیں جن

تک آج انسان نہیں پہنچ سکا۔

یہ عجیب بات ہے کہ مشرقی اور مغربی ناقدین اسلام سیرت نگاروں پر تنقید کرتے ہیں۔ مورخین اسلام کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کسی نے آج تک ہیروڈوٹس سے نہیں پوچھا کہ آپ نے جو تاریخ لکھی ہے اس کے ذرائع ومصادر کیا ہیں۔ ہیروڈوٹس نام کا کوئی آدمی تھا بھی کہ نہیں تھا۔ اگر تھا تو کہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کو جو معلومات ملیں وہ کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اس کے بیانات کہاں تک سچ اور کہاں تک جھوٹ ہیں۔ کسی نے یہ سوالات نہیں پوچھے۔ دنیا کے مشرقی اور مغربی اہل علم آنکھیں بند کر کے اس کے دعاوی اور بے دلیل بیانات کو مانتے ہیں۔ آج کے مغرب زدہ مسلمان شاید قرآن کو اتنا نہیں مانتے جتنا کہ اہل مغرب ہیروڈوٹس کو مانتے ہیں۔

کسی نے نہیں پوچھا کہ مہابھارت میں جو قصے لکھے گئے ہیں وہ سچ ہیں کہ جھوٹ ہیں۔ دنیا میں بسنے والا ہر ہندو ہر چیز قدیم اور اچھی چیز کو بھارت سے منسوب کرتا ہے۔ آپ پچھلے پچیس تیس سالوں کے دوران سامنے آنے والی ہندو مصنفین کی کتابیں پڑھیں تو روئے زمین پر ایسی کوئی چیز نہیں جس کا آپ تصور کر سکتے ہوں اور اس کو انہوں نے قدیم بھارت کے ساتھ منسوب نہ کر دیا ہو۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ مہابھارت کس نے لکھی تھی۔ کب لکھی تھی۔ اس کے مآخذ کیا تھے، مصادر کیا تھے۔ اس کے پاس یہ معلومات کہاں سے آئیں۔ کوئی اس چیز کو چیلنج نہیں کرتا۔ میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر سوال کرتا ہوں۔ کیا افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کی تحریروں کو حدیث وسیرت تو درکنار موضوع احادیث کے معیار پر بھی پرکھا جاسکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ تنقیدی سوالات صرف قرآن اور سیرت کے بارہ میں ہی کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ بہت سے مغربی مصنفین کے دل ودماغ پر اسلام کے خلاف تعصب کا زبردست داغ لگا ہوا ہے اس کے علاوہ کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم سیرت اور علم حدیث نے ہی دنیا کو پہلی بار علم تاریخ کے اصولوں سے روشناس کرایا۔ علم سیرت ہی نے حقائق اور افسانوں کے درمیان فرق کرنا سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑے بڑے محدثین نے ہی سب سے پہلے تاریخ پر قلم اٹھایا۔

حدیث اور سیرت کے متخصصین ہی تاریخ پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے ہیں۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر لکھی۔ امام ترمذی نے تاریخ پر کتاب لکھی، امام ابن کثیر نے سیرت پر بھی لکھا اور تاریخ پر بھی کتاب لکھی، ابن جریر طبری نے حدیث پر، سیرت پر اور تاریخ پر لکھا، وہ قرآن کے مفسر بھی تھے، مورخ بھی تھے اور اسلامی تاریخ کی پہلی بڑی کتاب تاریخ کے مولف بھی تھے اور فقیہ بھی تھے۔ گویا علم تاریخ کا آغاز ارباب سیرت اور محدثین کی گود میں ہوا۔ اس لئے مسلمانوں میں تاریخ کی جو نہج پیدا ہوئی، جو اسلوب مسلمانوں میں سامنے آیا، اس میں محدثین کی احتیاط پسندی، ارباب سیر کی جزئیات نگاری دونوں چیزیں شامل ہیں۔

ارباب سیرت کی دلچسپی یہ تھی کہ سیرت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جزئیات کو جمع کریں۔ محدثین کی بڑی دلچسپی یہ تھی کہ انسانی تصور میں احتیاط کی جو انتہا ہوسکتی ہے اس کا خیال رکھا جائے اور جس بیان یا واقعہ کے بارہ میں ذرہ برابر شبہ کا امکان ہو اس کو نظر انداز کردیا جائے۔ ان دونوں چیزوں کو جمع کرکے مورخین اسلام میں بہت سے حضرات نے تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ پھر قرآن نے علم تاریخ کو عالمگیریت سے آشنا کیا۔ اسلام سے پہلے کی قوموں کی تاریخ پر تو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ فلاں قبیلہ کی تاریخ، فلاں ملک اور فلاں قوم کی تاریخ۔ لیکن قرآن ایسی کتاب ہے جس نے مختلف اقوام کا تذکرہ کیا اور پوری انسانیت کے نشیب وفراز کو اور پوری انسانیت کے عروج وزوال کو اپنا موضوع قرار دیا۔ انسانوں کا عروج کن اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ کن محرکات کی بنیاد پر قوموں کا عروج یا زوال ہوتا ہے۔ یہ باتیں پہلی مرتبہ قرآن حکیم نے مورخین کے سامنے رکھیں جن سے مورخین اور سیرت نگاروں نے کام لیا اور علم تاریخ کو ایک نئی اور عالمگیر جہت عطا کی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دراصل مدوّن اور مستند تاریخ کا آغاز ہی حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہوا۔ آپؐ سے پہلے کی تاریخ نویسی خرافات، اساطیر اور غیر مرتب مواد پر مشتمل ہے۔

سیرت نگاروں نے جب رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھنی شروع کی تو آپ کی نبوت کی تصدیق اور تائید کے مسئلہ کو بھی اٹھایا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل کیا ہیں۔ اس سے دلائل نبوت کے نام سے ایک الگ فن پیدا ہوا۔ دلائل نبوت میں معجزات کی تفصیل بھی ہے اور حضورؐ کے خصائص کی بحث بھی ہے۔ پھر خود نبوت کیا ہے اور اسلام میں نبوت کا تصور کیا ہے۔

قرآن میں نبوت کے بارے میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ کیا ہے۔ جب نبوت پر بات کریں گے تو وحی پر بات ناگزیر ہوگی۔ وحی پر بات ہوگی تو ذرائع علم پر بھی بات ہوگی اور وہ شعبہ علم وحکمت زیر بحث آئے گا جس کو آج کل Epistymology کہتے ہیں۔ اپسٹمالوجی کیا ہے، ذرائع علم کیا ہیں، نبوت کیا ہے، علم حضوری اور علم حصولی کیا ہے۔ یہ مسائل سب سے پہلے محدثین اور سیرت نگاروں نے اٹھائے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں اور جس کے بارے میں ایک الگ گفتگو میں بات ہوگی۔

اب مختصر طور ایک دو اہم امور کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ مطالعہ سیرت کی اہمیت غیر مسلموں کے لئے کیا ہے۔ مطالعہ سیرت کی ضرورت پر تو بات ہوگئی، لیکن اس کے علاوہ اہمیت بھی ہے۔ بعض اوقات کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ضرورت ہوتی ہے۔ پیاس لگی ہو تو اس وقت پانی کی اہمیت نہیں، لیکن ضرورت بہت ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت اور چیز ہے اہمیت اور چیز ہے۔

پہلے مطالعہ سیرت کی تہذیبی اہمیت پر بات کرتے ہیں۔ اگر تہذیبوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ایک چیز بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے جو تہذیب قائم کی، وہ ایک جامع الحضارات تہذیب ہے۔ وہ تمام تہذیبوں کی جامع ہے۔ گویا تمام تہذیبوں کی روح اور خلاصہ اسلامی تہذیب میں آ گیا ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے بھی اسلامی تہذیب مجمع الحضارات ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں تہذیبوں کی جغرافیائی اہمیت پر بہت تفصیل سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کا مرکز جغرافیائی اعتبار سے زمین کا مرکز ہے۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو 'ناف زمین' کہا جاتا ہے۔ روئے زمین کے مرکز میں اسلامی تہذیب ہے اور جہاں جہاں اسلامی تہذیب کی پہنچ ہے وہاں سے خانہ کعبہ تک روئے زمین کے ہر علاقے کا فاصلہ تقریباً یکساں ہے۔ یہ اسلام کے جامع الحضارات ہونے کا ایک اہم ثبوت ہے۔

تہذیبوں کی تاریخ میں یہ بات بہت اہم اور قابل توجہ ہے کہ ماضی میں جتنی تہذیبیں پیدا ہوئیں یا اسلام کے قیام کے وقت جو تہذیبیں موجود تھیں وہ عموماً مذہبی تہذیبیں تھیں۔ ان کی اساس مذہبی پیغام پر تھی۔ وہ بابلیوں کی تہذیب ہو، بازنطینیوں کی ہو، رومنوں کی ہو، ہندوؤں اور ایرانیوں کی پارسی تہذہب ہو، ان ساری تہذیبوں کی اساس کسی نہ کسی مذہبی پیغام پر

تھی۔ مذہبی پیغاموں میں سے اکثر وبیشتر ایسے ہیں کہ جن کی اساس اور آغاز کوئی آسمانی مذہب یا آسمانی پیغام ہے۔ کسی نہ کسی نبی تک جا کر وہ منتہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایرانیوں کی آتش پرست تہذیب پر بھی تھوڑا سا غور کیا جائے تو وہ بعض ایسی شخصیات تک جا کر منتہی ہوتی ہے جن کے بارے بہت سے محققین کا خیال ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز تھے۔ مثلاً زرتشت جن سے بہت سے مذہبی عقائد منسوب ہیں۔ ان کے نبی ہونے کا امکان متعدد اہل علم نے ظاہر کیا ہے۔ خود صابئین جو ایران ایک بڑی قوم تھی، وہ بھی ایک مذہبی روایت کے پیرو تھے اور ایک آسمانی مذہب سے ان کا تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو وہی حیثیت دے دی جو اہل کتاب کو دی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کے حیات مبارکہ کے آخری ایام میں بعض ایسے علاقے فتح ہوئے جہاں صابئین بھی رہتے تھے تو صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے ان کی مذہبی اور قانونی حیثیت کے بارے میں پوچھا، جنوبی عرب میں باذان حضورؐ کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے حضور سے پوچھا کہ یہاں صابئین کے نام سے ایک قوم بستی ہے، میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ آپؐ نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا جس کا متن حدیث وسیرت کی کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔ اس میں آپؐ نے فرمایا کہ **سنوبھم سنة اھل الکتاب**، یعنی ان کے ساتھ وہی معاملہ رکھو جو اہل کتاب کے ساتھ رکھتے ہو۔ **غیر ناکحی نسائھم ولا آکلی ذبائحھم**، ان کا ذبیحہ نہ کھاؤ اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، بقیہ معاملات میں ان کے ساتھ وہی سلوک جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ ساری تہذیبیں مختلف آسمانی مذاہب کے زیر اثر قائم ہوئیں۔ آسمانی مذاہب کو قرآن پاک نے تسلیم کیا۔ قرآن پاک نے خود کو نہ صرف ان کا مصدق قرار دیا بلکہ مھیمن بھی قرار دیا 'ومھیمنا علیه' کہ قرآن ان پر مھیمن ہے یعنی ان کا محافظ اور ان پر حاوی ہے۔ کس طرح حاوی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کریں تو مختلف انبیاء کا تذکرہ ملتا ہے۔ کسی ایک پیغمبر کا تذکرہ کرتے وقت ان کی کسی ایک صفت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے، دوسرے کی دوسری صفت نمایاں طور پر پیش کی گئی ہے، تیسرے کی تیسری صفت نمایاں ہے۔ کسی میں صبر کی کیفیت نمایاں ہے، کسی میں کلمہ حق اور جہاد کی، کسی میں زہد اور تقویٰ کی نمایاں ہے۔ کسی میں بادشاہت کا قیام اور اس کی شان وشوکت نمایاں ہے۔ کسی میں بین الاقوامیت نمایاں ہے۔ اسلام کے پیغام اور

پیغمبر اسلام میں یہ ساری صفات یکجا موجود ہیں۔ بین الاقوامیت بھی ہے، استغنا اور زہد بھی ہے، عالمگیریت بھی ہے، صبر، جہاد اور کلمہ حق بھی ہے اور وہ ساری صفات جو قرآن کے بیان کردہ 26 انبیا میں انفرادی طور پر پائی جاتی ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں یکجا طور پر موجود ہیں۔ پھر بقیہ آسمانی کتابوں کی جو خصوصیات ہیں، مثلاً کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا قانون بڑا سخت ہے اور قانون کے احکام شدید ہیں۔ اس لئے کہ اُس قوم کو اسی طرح کے قانون کی ضرورت تھی۔ کسی کتاب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں قانون کی روح پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور قانون کی برتر اخلاقی اساس کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلق مع اللہ کو زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناجاتیں کر کے اللہ کے حضور کے بندگی کے احساس کو نمایاں کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں یہ ساری چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ قرآن پاک میں سخت احکام بھی ہیں۔ نالائقوں کے لئے احکام سخت ہی ہونے چاہئیں۔ قرآن پاک میں مناجاتیں بھی ہیں۔ قرآن پاک اور اس کے پیغمبر نے جو مناجات اور دعائیں سکھائی ہیں اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم اور کوئی روایت نہیں کر سکتی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے، دعوۃ اکیڈمی نے شائع کی تھی، سیرت النبی دعاؤں کے آئینے میں، اس میں مولانا نے یہ سمجھایا ہے کہ دعاؤں کی کیا حیثیت ہے اور دعاؤں سے سیرت النبی پر کس طرح روشنی پڑتی ہے۔ دعاؤں کے ذریعے حضورؐ کی شخصیت کو کیسے دیکھا جائے۔ دلچسپ اور چھوٹی سی کتاب ہے۔ یہ ساری چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر ان پیغاموں کی روح قرآن پاک میں موجود ہے۔ جن پیغاموں پر یہ تہذیبیں قائم تھیں ان کی روح قرآن پاک میں موجود ہے تو قرآن پاک سے جو تہذیب ابھرے گی وہ ساری تہذیبوں کی جامع ہی قرار پائے گی۔

قرآن پاک اپنے بارے ایک اور خصوصیت کا بار بار تذکرہ کرتا ہے، جو مغربی مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آئی۔ قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ میں آسمانی وحی کا تسلسل ہوں۔ یہ سب تورات، زبور اور انجیل آسمانی کتابیں تھیں۔ میں بھی ایک آسمانی لیکن آخری اور حتمی کتاب ہوں۔ ہر مستشرق شکایت کرتا ہے کہ جب مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ کو آئیڈیلائز کرنا

شروع کیا تو آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح پیش کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ کی طرح پیش کرنے کی کوشش کی۔

ایک محدثین ہی کیا، یہ تو سب مسلمان روز اول سے کہتے آئے ہیں۔ خود قرآن بھی کہتا ہے اور رسول اللہ نے بھی بارہا یہی فرمایا کہ میں انہی کا پیروکار ہوں اور انہی کے پیغام کو لے کر چلنے والا ہوں۔ قرآن پاک بہت سے پیغمبروں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے۔ ان سب پیغمبروں کو وہ رول ماڈل قرار دیتا ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے جو ہر مسلمان کے رگ وپے میں رچی بسی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی تہذیب جامع الحضارات ہے۔

جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے اسلامی تہذیب مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ان تمام آسمانی پیغامات کی جامع ہے جن کی بنیاد پر تہذیبیں قائم ہوئیں۔ اسلام تمام قدیم آسمانی مذاہب کا تسلسل ہے، اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کی جو تہذیبیں ہیں اور اسلام سے بعد کی جو تہذیبیں ہیں ان سب کے درمیان اگر کوئی نقطۂ وصل ہے تو وہ اسلامی تہذیب ہے۔ اس نقطہ وصل ہونے کو بعض مغربی مصنفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اگر اسلامی تہذیب نہ ہوتی تو جدید تہذیبوں کا ربط ماضی کی تہذیبوں سے نہیں ہوسکتا تھا۔ اسلام نہ ہوتا تو ماضی کی تہذیبوں کا ورثہ جدید تہذیبوں کو منتقل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ایک علمی حقیقت ہے جس کو بہت سے غیر مسلم مؤرخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے اور بڑے عالمانہ اشارے اس جانب کیے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا تہذیبی کردار کیا ہے۔ تہذیبی کردار یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب درمیان میں نہ ہوتی تو جدید تہذیبیں وجود میں نہ آسکتی تھیں۔ اس تہذیب کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے ہوا۔ اس کی اساس مدینہ منورہ ہے۔ اس کی اساس وہ تہذیب وثقافت ہے جو ہجرت کے بعد قائم ہوئی۔ اس لئے اس تہذیب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے۔

مطالعہ سیرت کی ایک اور اہمیت علمی اہمیت ہے۔ اسلام ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ اس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ اس نئی تہذیب کی اساس جن چیزوں پر تھی ان میں سے عالمگیریت اور مساوات بشر کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ تیسری اہم چیز وہ علمی ا فکری تبدیلی ہے جو

انسانی سطح پر اسلام کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی۔ یہ تبدیلی اپنے غیر معمولی نتائج وثمرات کے اعتبار سے انسان کی علمی اور فکری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ شاید انسان کی فکری تاریخ میں یہ ایک نقطہ تحول ہے۔ ایک Turning point ہے کہ قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ عقل اور نقل کے درمیان ایک توازن قائم کیا۔ ماضی میں یا تو عقل پر زور تھا اور نقل کو لوگوں نے سرے سے بھلا دیا تھا۔ یونانیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کچھ اور لوگوں نے نقل پر ہی سارا زور دیا اور عقل کو بالکل بھلا دیا۔ ہندوؤں کی مثال ہمارے اپنے پڑوس میں ہے۔ اس لئے نہ کوئی دیرپا، متوازن، متکامل اور قابل عمل نظام مجرد عقل کی بنیاد پر کھڑا ہوسکتا ہے نہ مجرد نقل کی بنیاد پر۔ اسلام نے پہلی مرتبہ نقل اور عقل کے درمیان ایک توازن پیدا کر دیا۔

حضور ﷺ نے ایک خالص بدوی معاشرہ کو ایک ایسا عاقلانہ، عالمانہ اور مہذب معاشرہ بنا دیا جو عقل اور نقل دونوں کے تقاضوں کو لے کر کامیابی سے چلا اور دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا۔ افتراق رنگ ونسل اور تمیز رنگ وخوں کو ختم کر کے ایک ایسی مساوات بشری قائم کر دی جس سے بڑھ کر نمونہ آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ اس مساوات بشری کا ایک مظہر وہ ہدایات بھی ہیں کہ ایک ناک کٹا حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو تو اس کی اُسی طرح پیروی کرو جس طرح ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کرتے ہو۔ یہ بات دنیا آج تک حاصل نہیں کر سکی۔ آج بھی دنیا میں سارے دعوؤں کے باوجود کچھ لوگوں کو ساری دنیا کے مقابلہ میں ویٹو حاصل ہے، کچھ لوگ بہ نسبت اوروں کے زیادہ مساوات رکھتے ہیں۔

ایک بڑی بنیادی اور امتیازی عطا جو علمی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید کا حقیقی مفہوم لوگوں کی رگ وپے میں اس طرح سے جاگزیں کر دیا کہ بڑی سے بڑی گمراہی، بڑی سے بڑی مصیبت اہل ایمان کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ یہ نہ اسلام سے پہلے ہوا اور نہ بعد میں ہوا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ توحید محض ایک doctrinal issue ہے۔ بقول علامہ اقبال یہ محض علم کلام کا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ قوت کا نام ہے۔ توحید جب تک ایک زندہ قوت تھی اس نے مسلمانوں کو متحرک رکھا۔ اس زندہ قوت کے مظاہر، ثمرات اور برکات اتنے بے شمار ہیں کہ ان پر گفتگو کرنے کے لئے

ایک الگ نشست کی ضرورت ہوگی۔لیکن ایک چھوٹی سی مثال میں عرض کرتا ہوں۔اسلام سے پہلے بہت ساری اقوام میں ایک بہت بڑی گمراہی پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں میں یہ گمراہی آج بھی پائی جاتی ہے۔یہ چونکہ ہمارے پڑوس کا قصہ ہے اس لئے آپ شاید زیادہ واقف ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک گمراہی یہ پائی جاتی ہے اور ماضی میں اور قوموں میں بھی پائی جاتی تھی کہ ہر وہ قوت جو کائنات میں نافع اور ضار ہے وہ الوہیت کے عناصر رکھتی ہے۔گویا نفع اور ضرر دونوں الوہی خصائص ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی جانور کسی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ یقیناً الوہی صفات رکھتا ہے۔کسی دریا کے پانی سے لوگ متمتع ہورہے ہیں تو وہ دریا الوہی صفات رکھتا ہے۔کسی درخت کی چھاؤں اور پھل سے لوگ غذا اور دوا حاصل کرتے ہیں تو وہ درخت الوہی صفات رکھتا ہے۔اس طرح بہت سے دیویاں اور دیوتا وجود میں آگئے۔

یونانیوں کو علم وفن کی بہت اونچی معراج پر فائز بتایا جاتا ہے۔اہل مغرب کی نظر میں علم وحکمت کا ہر موتی یونان کی کان سے نکلتا ہے۔وہاں بھی ہر چیز کا الگ الگ دیوتا ہے۔آج کل دنیا میں بہت ساری اصطلاحات مروج ہیں جو سب یونانی دیوتاؤں کے نام ہیں۔ہمارے ہاں دکانوں کے نام انہی یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے جاتے ہیں۔اسکولوں کے نام یونانی دیوتاؤں کے نام پر رکھے جاتے ہیں، یہ سب جانے بوجھے بغیر ہوتا ہے۔دیکھا دیکھی بہت سے مغربی الفاظ اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ان میں بہت سارے الفاظ یونانی ہیں،اور یہ سب دیوتاؤں کے نام ہیں۔آگ کا دیوتا الگ ہے،کھیلوں کا دیوتا الگ ہے،فلاں کا دیوتا الگ ہے،فلاں کا دیوتا الگ ہے۔یہ سارے دیوی دیوتا ہمارے ہاں بھی آج تک کم ازکم ناموں کی حد تک معروف ہیں۔

یہ تصور کیوں پیدا ہوا؟ اگر یہ تصور ہو کہ ہر وہ چیز جو نافع اور ضار ہے وہ دیوتا ہے۔تو تحقیق کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔دیوتا کو کوئی کاٹ چھانٹ کر تحقیق نہیں کرتا۔دیوتا تحقیق کا موضوع نہیں ہوتے۔وہ احترام کا مرکز ہوتے ہیں۔احترام اور تحقیق انسان کے مزاج کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اگر آپ میڈیکل سائنس کے طالب علم ہوں اور اگر آپ کو کسی لاش کی چیر پھاڑ کرنی ہو تو آپ کر لیں گے۔لیکن اگر آپ کی والدہ کا انتقال ہوا ہو تو آپ کبھی بھی ان کی میت کی چیر پھاڑ پر آمادہ نہیں ہوسکتے،اس لئے کہ ان کی ذات سے احترام اور

عقیدت وابستہ ہے۔ کسی دوسرے انسان کی لاش کی چیر پھاڑ کے لئے آپ تیار ہو جائیں گے، کیونکہ وہاں احترام اور عقیدت وابستہ نہیں ہے۔ جہاں احترام اور عقیدت ہو وہاں تحقیق نہیں ہوتی۔ اگر گنگا اور جمنا دیویاں ہیں تو ان پر تحقیق نہیں ہوسکتی۔ اگر بادل دیوتا ہے تو اس پر بھی تحقیق نہیں ہوسکتی۔ چانداور سورج اگر دیوتا ہیں تو ان پر تحقیق نہیں ہوسکتی۔ تحقیق تو ان پر ہوسکتی ہے جس کو توڑ پھوڑ کر آپ استعمال کر سکتے ہوں۔

قرآن پاک نے جب توحید سکھائی تو یہ بھی بتایا کہ 'خلق لکم مافی الارض جمیعا'، جو کچھ ہے تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا۔ 'سخّر لکم مافی الارض جمیعا'۔ جو کچھ ہے وہ تمہارے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ اس کو دیکھو، توڑو، چیرو پھاڑو اور اپنے مقصد کے لئے استعمال کرو۔ اس لئے میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ علوم وفنون کی تحقیق اور اس میدان میں ایک نئے دور کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی تعلیم اور توحید کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اگر توحید کی یہ دعوت نہ ہوتی اور اس میں اتنی شدت، جامعیت اور گہرائی نہ ہوتی تو تحقیق کے وہ راستے نہیں کھل سکتے تھے جو بعد میں کھل گئے۔

یہ تو مطالعہ سیرت کی عمومی علمی اہمیت تھی۔ اب دور جدید کے لئے مطالعہ سیرت کی اہمیت پر چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔ دور جدید سے مراد ان گزارشات کے سیاق وسباق میں بیسویں صدی کے آغاز بلکہ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر آج تک کا دور ہے۔ اس دور میں مختلف مغربی قوتوں کو دنیائے اسلام میں فکری، تہذیبی اور ثقافتی بالادستی حاصل ہوئی۔ ان گزارشات میں آج کل کی بالادست قوتوں سے مراد مغربی طاقتوں کی کارفرما قوتیں ہیں۔

امرواقعہ یہ ہے کہ دنیائے مشرق ومغرب آج مسلمانوں کے درپے ہے۔ مسلمانوں کو نہ مشرق میں چین ہے نہ مغرب میں۔ دنیا کی ہر طاقت اس وقت مسلمانوں کی بدخواہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی امرواقعہ ہے کہ مسلمانوں کو نظرانداز کر کے دنیا کے حال یا مستقبل کے بارہ میں کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ مشرق والے مسلمانوں سے کلی طور پر صرف نظر کر کے کچھ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مغرب والے مسلمانوں کے علی الرغم کچھ کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے لئے دنیائے اسلام سے معاملہ کئے بغیر کوئی چارہ کار رہے ہی نہیں۔ نہ ایک ارب بیس کروڑ کی اس قوم کو مٹایا جاسکتا ہے۔ نہ اس کے بغیر زندہ رہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر معاملات چلائے

جاسکتے ہیں۔ گزشتہ ڈھائی تین سو برس سے کہیں دباؤ ڈال کر، کہیں طاقت کا بے محابا استعمال کر کے اور کہیں نظر انداز کر کے محض سازشوں کے ذریعے معاملات چلانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہو پارہی ہے۔ اس سارے دباؤ اور سازشوں کے باوجود یہ ایک ایسا پیغام ہے جو تیزی سے پھیل رہا ہے۔ جو شخص بھی اسلام کا نیک نیتی سے مطالعہ کرتا ہے وہ اس کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔

میں ذاتی طور پر کئی ایسے مغربی حضرات سے واقف ہوں جنہوں نے کسی منفی نیت اور مخالفانہ اور منفی عزائم کے ساتھ اسلام کے مطالعہ کا آغاز کیا۔ لیکن اس منفی نیت کے باوجود اسلام کے پیغام نے ان کو اس طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ ہم سے بہتر مسلمان بن گئے۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے۔ اس امر واقعہ کے باوجود یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنا آپ اہل مغرب یا دیگر غیر مسلموں کے سامنے کس طرح پیش کرنا چاہئے۔

آج کل کے مسلمانوں کو موقع بے موقع حکومت اور ریاست کی بہت یاد آتی ہے۔۔ ریاست اور حکومت اسلام کی ضرورت تو ہے، لیکن اسلام کا مقصد نہیں۔ اسلام میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے خالص دینی اور مذہبی تعلیم رہی۔ پھر اخلاقی تربیت ہوئی، پھر اسلامی معاشرت وجود میں آئی، پھر اسلامی تہذیب وجود میں آئی اور پھر اُس اسلامی تہذیب کی حفاظت کے لئے ریاست اور حکومت کی ضرورت پیش آئی۔ آج مسلمان اپنے احیاء اور نشأت ثانیہ کے کام کو ریاست کے قیام سے شروع کرنا چاہتے ہیں، جبکہ اسلامی تہذیب مرجھا چکی ہے۔ اسلامی معاشرت کمزور پڑ چکی ہے، اسلامی اخلاق نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دین و مذہب سے لوگوں کی وابستگی صرف جذباتی حد تک رہ گئی ہے۔ چنانچہ جب مسلمان ابتداء کی بجائے انتہا سے نشأت ثانیہ کے اس عمل کا آغاز کرنا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کے لئے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی اس کو ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر جو مسلمانوں کا ملی ضمیر اور اجتماعی خمیر ہے اس کی بنیاد مذہب ہے۔ بظاہر کوئی مسلمان کتنا ہی سیکولر اور لا مذہب معلوم ہو، لیکن اس کا ضمیر اور خمیر مذہب ہی کی اساس سے اٹھا ہے۔ اس کی مذہبی اساس کبھی نہ کبھی سامنے آجاتی ہے اور اس کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے مغرب اور مشرق کی طاقتوں کے لئے ناگزیر ہے کہ دنیائے اسلام کے مزاج اور ضمیر اور خمیر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ان کی اساس کا مطالعہ

کریں۔ اساس اور بنیاد تین چیزیں ہیں یعنی قرآن مجید، سنت اور سیرت۔ اس اساس اور بنیاد کے مطالعہ کے بغیر مسلمانوں کے ساتھ کوئی بھی معاملہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اب مغرب میں سیرت کا مطالعہ سنجیدگی سے ہونے لگا ہے۔ پرانے تعصبات ایک ایک کرکے ختم ہورہے ہیں یا کم ازکم کمزور پڑرہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ احساس ہوچلا ہے کہ پرانے تعصبات کا علمی اعتبار سے دفاع نہیں کیا جاسکتا اور صدیوں پرانے مستعمرانہ تصورات کو باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لئے اب مغرب کے انصاف پسند محققین زیادہ حقیقی اور زیادہ بہتر مطالعہ کی طرف آرہے ہیں۔

آخری بات یہ کہ مطالعہ سیرت دنیا کی ایک روحانی ضرورت بھی ہے۔ روحانیات کے معاملہ میں ہر مذہب میں بنیادی سوال یہ رہا ہے کہ 'جز' چاہتا ہے کہ وہ 'کل' کی طرف لوٹ جائے۔ فرد اپنے خالق اور مالک کی طرف رجوع کرنے یا تائب ہونے کا رجحان رکھتا ہے اور اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کو آپ وصال کے نام سے یاد کریں یا لقا کے نام سے، ہر مذہب میں یہ سوال موجود ہے اور اس کا جواب دینے کی بھی ہر مذہب نے کوشش کی ہے۔ اسلام میں رب العلمین کی طرف رجوع اور اس سے ملاقات کی تعلیم موجود ہے۔ توبہ، انابت اور رجوع الی اللہ اسی کے مظاہر ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں لقاء کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ 'مسن احب لقاء الله احب الله لقائه'۔ لیکن جز کے کل کی طرف لوٹنے کی شکل کیا ہوگی؟ اس کی بنیادی اور سب سے پہلی منزل ذات باری سے تعلق اور محبت ہے۔ یہی روحانی شخصیات کا ہدف رہا ہے کہ انسانوں کے دلوں میں ذات باری تعالیٰ کی محبت اور تعلق کی بنیاد کو مضبوط بنایا جائے۔ جو جتنا زیادہ مضبوط بنا سکا اتنا ہی زیادہ روحانی معاشرہ وجود میں لاسکا۔ بہت سے فلسفے اور نظریئے اسی بنیاد پر سامنے آئے کہ ذات باری سے تعلق اور محبت کی اساس کو کیسے گہرا کیا جائے۔ دنیا کے مختلف مذاہب واسطوں اور مظاہر کی تلاش میں رہے۔ کوئی بتوں کے ذریعے، کوئی صفات کے ذریعے اور کوئی کسی اور ذریعے سے ذات باری تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات کہ ذات رسالت مآب کا اتباع کامل اور آپ کی ذات گرامی سے محبت ذات باری تعالیٰ سے محبت کا ایک مظہر ہے ('قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی')، اسلام کی ساری روحانی تعلیم کا اصل الاصول ہے۔ حضور ﷺ کا اتباع، ذات باری تعالیٰ سے محبت کا واحد طریقہ

اور واحد ثبوت ہے۔ یہ ایک ایسی کنجی ہے جو قرآن پاک نے روحانی کامیابی کے لئے دی ہے اور جو سیرت کے مطالعہ کو انسانوں کے لئے ناگزیر کرتی ہے۔

سیرت کے مطالعہ کی اہمیت اور ضرورت پر ان مختصر اشارات کے ساتھ میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ کل ان شاء اللہ علم سیرت کے عمومی تعارف پر گفتگو ہوگی۔ اس پر کئی اہم باتیں آج بھی آگئیں، لیکن سیرت اتنا وسیع میدان ہے کہ اس کے لئے اس سے زیادہ بھرپور تعارف کی ضرورت ہے۔ کل کی گفتگو سے اندازہ ہوگا کہ سیرت کا spectrum یا کینوس کتنا وسیع ہے۔ بلکہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ ایک پورا لینڈ اسکیپ ہے تو کل کی گفتگو میں اس لینڈ سکیپ کو سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

-☆-

سوال و جواب

عالمگیریت اور سیرت نبوی کے حوالہ سے آپ نے کئی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ کیا تفصیلی مطالعہ کے لئے آپ کوئی کتاب تجویز کریں گے؟

کوئی متعین کتاب تو اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے جو خاص سیرت نبوی اور عالمگیریت کے حوالہ سے لکھی گئی ہو۔ لیکن اسلام میں عالمگیریت کے حوالے سے کئی لوگوں نے اچھی تحریریں لکھی ہیں۔ خاص طور پر آٹھ دس سال پہلے مشہور امریکی یہودی دانشور سموئیل ہن ٹنگٹن کی کتاب چھپنے کے بعد سے کئی تحریریں اس موضوع پر سامنے آئی ہیں۔ وہ شاید آپ کے لئے مفید ہوں۔

☆

آپ نے فرمایا کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے چاہا وہ قرآن میں بیان ہوا اور جو قرآن نے بیان کیا وہ آپؐ نے کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حضرت ابو طالب کی مغفرت یا ان کے قبول اسلام کی بہت خواہش تھی۔ کیا قرآن پاک میں اس کا کوئی بیان ہے کہ حضرت ابو طالب نے اسلام قبول کیا یا نہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے شاید منطق نہیں پڑھی۔ منطق کا اصول یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ کلیہ نہیں ہوتی بلکہ سالبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ یعنی جب اس طرح کا کوئی بیان دیا جاتا ہے جو عمومی بیان ہو اور اس میں کوئی مثبت بات کہی گئی ہو تو اس کی نقیض میں عمومی منفی بیان

ضروری نہیں ہے۔وہ جزوی طور پر بھی اگر منفی ہو تو اس کی نقیض ہوسکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی خواہش تو یہ تھی کہ پوری انسانیت مسلمان ہو جائے۔آپؐ کے بارے میں تو خود قرآن کے اندر یہ گواہی موجود ہے کہ 'لعلک باخع نفسک ان لایکونوا مومنین' یعنی آپؐ اس غم میں اپنے آپ کو فنا کیئے دے رہے ہیں کہ لوگ مسلمان نہیں ہورہے ہیں۔اس لئے اللہ تعالیٰ کی جو عمومی حکمت اور مشیت ہے اس کے حساب سے کوئی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا۔ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ 'انک لاتھدی من احببت'، کہ تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے، کیونکہ ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

جناب ابوطالب کے قبول اسلام کے بارے میں مسلمانوں میں دو نقطہ نظر ہیں۔ایک نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اپنی وفات سے چند لمحے قبل اسلام قبول کرلیا تھا۔دوسرے نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔یہ تاریخ کا مسئلہ ہے عقیدہ یا دین کا مسئلہ نہیں ہے۔

☆

کیا جملہ موضوعات پر آپ کا بیان تحریری صورت میں بانٹا جا سکتا ہے؟

میں نے کوئی تحریری بیان تیار نہیں کیا ہے۔یہ مختصر نوٹس ہیں جن کی بنیاد پر زبانی گفتگو کی گئی ہے۔اس وقت تک تو ان موضوعات پر کوئی تحریر لکھی ہوئی نہیں ہے۔پروگرام یہ ہے کہ یہ ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈ سے نقل ہوگی اور پھر اس پر ضروری نظر ثانی ہوگی تو اس وقت یہ تحریری طور پر دستیاب ہوسکے گی۔ان شاءاللہ۔

مطالعہ سیرت کی اہمیت قابل عمل اور آسان ہونے کے حوالہ سے کوئی مثال بیان فرمائیں۔

سیرت کا یقیناً یہ ایک اہم پہلو ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت قابل عمل بھی ہے اور آسان

بھی ہے۔آپؐ نے اپنی شریعت کے بارے میں ایک بار فرمایا تھا کہ میں ایک آسان اور سیدھی شریعت لے کر آیا ہوں۔اس پر عمل درآمد کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ابھی ایک دوست ڈاکٹر سجاد صاحب نے ایک مثال یاد دلائی کہ حضورﷺ سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان میں اللہ کی عبادت کے لئے یہ ضروری ہوتا تھا کہ کسی گرجا، کنیسہ یا عبادت گاہ میں جا کر ہی عبادت کی جائے۔اب بھی مختلف اقوام میں عبادت کے لئے عبادت گاہ کا ہونا لازمی ہے اور جب تک خاص rituals نہ ہوں اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔اسلام نے اس طرح کی کوئی قید یا شرط نہیں رکھی۔پوری روئے زمین کو مسجد قرار دے دیا گیا ہے۔آپ کہیں بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔یہ اس حقیقت کی ایک مثال ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے اور حضورﷺ کی سیرت پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔

☆

> سیرت النبی پر بات کرنے والے ہجرت مدینہ ہی سے شروع کرتے ہیں۔آپ نے بھی انہی کے قدموں پر چلتے ہوئے ابتدا کی۔سوال یہ ہے کہ حیات نبی کا جو حصہ مکہ میں گزرا ہے اس کو مکی دور سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور اسی سے ابتدا ہونی چاہئے۔

یہ واضح کردوں کہ خطبات کے اس سلسلہ میں علم سیرت پر گفتگو ہوگی۔اس لئے میں تاریخی ترتیب سے سیرت کے واقعات کو اس طرح بیان نہیں کروں گا جس طرح سیرت کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ گفتگو سیرت پر نہیں بلکہ علم سیرت پر ہے۔سیرت کے اس علم پر گفتگو مقصود ہے جس کو مسلمانوں نے مدون کیا اور ہم تک پہنچایا۔میں یہ فرض کرکے یہ گفتگو کررہا ہوں کہ سیرت کے عمومی واقعات سے سب حاضرین وسامعین واقف ہیں اس لئے اُن پر گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ سیرت کا ایک اہم حصہ حضورؐ کی مکی زندگی ہے۔لیکن مکی زندگی دراصل مدنی زندگی کے لئے تیاری تھی۔مدنی زندگی ہی شریعت، معاشرت، حکومت،

تہذیب اور ہر چیز کی اساس ہے۔ مکی زندگی کی حیثیت بنیاد کی ہے جبکہ مدنی زندگی کی حیثیت عمارت کی ہے۔ عمارت بنیاد کے بغیر نہیں بنتی۔ لیکن جب بن جاتی ہے تو بنیاد نظروں کے سامنے نہیں ہوتی۔ عمارت سامنے ہوتی ہے۔

☆

آپ نے خالص مذہبی تعلیم کو پہلے نقطہ نظر کے طور پر پیش کیا۔ پھر اخلاقی تعلیم پھر تہذیب اور پھر ان سب کی حفاظت کے لئے ریاست۔ ہم بہ حیثیت خواتین اپنے گھروں میں اس ترتیب کو کس طرح نافذ کر سکتی ہیں؟

آپ اس ترتیب کو اس طرح نافذ کریں کہ آپ اپنے بچوں، اپنے قرب و جوار اور جہاں جہاں آپ کے اثرات ہیں وہاں دینی تعلیم دیں۔ جب آپ اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کو دینی تعلیم دیں گی تو اس کے نتائج اور اثرات ان کے اخلاق پر ہوں گے، پھر اخلاق کے نتیجے میں معاشرت وجود میں آئے گی۔ جب معاشرت وجود میں آئے گی تو تہذیب وجود میں آئے گی اور جب تہذیب وجود میں آئے گی تو ریاست اور حکومت پر اس کے اثرات پیدا ہوں گے۔ یوں مسلمانوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر خود بخود وجود میں آ جائے گی۔

☆

آپ نے فرمایا کہ مغربی حلقوں میں اسلام کے خلاف موجود پرانی عصبیتیں کمزور پڑ رہی ہیں۔ اس کی کچھ مزید وضاحت فرمائیں گے؟

اس موضوع پر ایک دن الگ سے ایک گفتگو ہوگی، لیکن اگر آپ اس کا جائزہ لیں کہ مغربی مصنفین نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیا کیا کہا ہے اور اس سارے لٹریچر کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیں تو وہ بات واضح ہو جائے گی جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ مغربی مصنفین آج سے چھ سات سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک میں انتہائی گستاخانہ کلمات

بولا کرتے تھے۔ ایسے کلمات جن کو میں آپ کے سامنے دہرا نہیں سکتا۔ سبّ وشتم کا یہ نامبارک مشغلہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں ایک ایسا زمانہ آیا کہ یورپ میں سیرت کے مآخذ چھپنے شروع ہوئے۔ اُن میں ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے اسلام کے اساسی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا، اس کے بعد انہوں نے غیر اخلاقی انداز کو تو چھوڑ دیا لیکن رسول اللہ ﷺ کو ایک سیاسی (نعوذ باللہ) موقع پرست کے طور پر پیش کرنا شروع کیا اور یہ بتایا کہ آپ کا مقصد اپنی قوم کو سیاسی اقتدار دلانا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا بھی جواب دیا اور خود سیرت کے لٹریچر سے بھی اس کی تردید ہوگئی۔ پھر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضور ؐ نبی تو تھے لیکن صرف عرب کے لئے تھے پوری دنیا کے لئے نہیں تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ اسلام کے حق میں اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کی تائید میں کتابیں آنے لگیں۔ مثلاً آج سے سو پچاس سال پہلے مغرب میں اسلامی نقطہ نظر کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی جاتی تھی۔ پہلی کتاب سید امیر علی نے لکھی۔ اس پر بھی میں بات کروں گا۔ اس کے علاوہ کوئی کتاب تائید میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن آج خود مغربی اور عیسائی مصنفین اور دوسرے لوگ سیرت پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اتنی قابل اعتراض نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کتابوں میں سو فیصد مسلمانوں کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اب اتنا ہوگیا ہے کہ ہمارے نقطہ نظر سے ایسی قابل قبول چیزیں آنی شروع ہوگئی ہیں جن کی تعداد درجنوں میں نہیں بلکہ سینکڑوں میں ہے۔ ایک خاتون جو امریکی یا برطانوی ہیں، مجھے ملک کا نام یاد نہیں، لیکن وہ کافی عرصہ ایران میں رہیں، اس نے مغرب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں Perceptions کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تحریروں میں حضور ﷺ کا تصور کیا رہا ہے۔ اس نے یہ ساری تفصیل بتائی ہے اور آخر میں کہا کہ اب مغربی مصنفین میں ایک ہمدردانہ رویہ پیدا ہوا ہے جو اتنا زہر آلود نہیں ہے جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔

☆

بعض احادیث کے بارے میں علماء کا خیال ہے کہ یہ حدیثیں
خود بنائی گئی ہیں اور حقیقی نہیں ہیں۔ کچھ احادیث کو علماء

درست قرار دیتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایسی صورت حال میں کیا
کرنا چاہئے؟

احادیث کا جو بے مثال اور وسیع ذخیرہ آج ہمارے پاس موجود ہے وہ آج نہیں بلکہ تیرہ سو سال پہلے مرتب ہوا تھا۔ اور پچھلے تیرہ سو سال کے دوران ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اہل علم اس پر غور کرتے آ رہے ہیں۔ جتنی بھی احادیث ہیں ان کی اتنی چھان پھٹک ہو چکی ہے کہ اس سے زیادہ چھان پھٹک کا تصور بھی ممکن نہیں۔ جو صحیح اور مستند احادیث ہیں ان کو بھی الگ کر دیا گیا ہے۔ جو نسبتاً کمزور ہیں لیکن صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہیں وہ بھی الگ ہو گئی ہیں اور جو بالکل کمزور اور غلط ہیں وہ بھی معلوم اور متعین ہیں۔ بہت سے حضرات نے غلط اور موضوع احادیث کے الگ مجموعے بھی مرتب کر دیئے ہیں تا کہ ایک ہی نظر میں واضح ہو جائے کہ یہ صحیح احادیث نہیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہمیشہ موجود رہے گا۔ مثلاً میری تحقیق میں ان میں سے کچھ احادیث قابل قبول ہوں گی۔ آپ کی تحقیق میں قابل قبول نہیں ہوں گی۔ اس اختلاف سے کوئی فرق اس لئے نہیں پڑتا کہ سیرت کا جو اصل core اور بنیادی ڈھانچہ ہے اس کی اساس قرآن پاک، صحیح احادیث اور مستند روایات پر ہے۔ جو بنیادی احادیث ہیں وہ سب متفق علیہ ہیں اور ان کی صحت کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جزوی طور پر اگر کوئی اختلاف ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ ان کو مانیں تو بھی فرق نہیں پڑے گا اور نہ ماننے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

مثال کے طور پر جب رسول اللہ ﷺ اپنے بچپن میں حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں قیام فرماتے تھے تو روایات میں آتا ہے کہ شق صدر کا واقعہ ہوا۔ اب شق صدر سے مراد مجازی معنوں میں شق صدر ہے یا اس سے مراد کوئی physical شق صدر ہے، تو اس پر اختلاف رہا ہے۔ جو لوگ زیادہ عقلیت پسند ہیں وہ physical شق صدر کو نہیں مانتے اور اس کو شرح صدر قسم کی ایک چیز سمجھتے ہیں۔ جو حضرات نبوت اور معجزات کے پہلو کو زیادہ نمایاں رکھتے ہیں وہ اس کو physical معنوں میں شق صدر مانتے ہیں۔ اب ان دونوں چیزوں میں

آپ جس کو بھی درست مانیں اس کو اختیار کرلیں۔ اس سے فی نفسہ اس اصل حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ وہ شق صدر ہو یا شرح صدر ہو، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ حق کے لئے کھول دیا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نبوت کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے حضورؐ کی تربیت بچپن سے ہو رہی تھی۔ اس پر دونوں تعبیریں متفق ہیں۔

☆

سیاسی اور عسکری اعتبار سے جب مشکل وقت ہوتا ہے تو اسلام زیادہ تیزی سے پھیلتا ہے۔ اس کی محرکات اور وجوہات کیا ہیں؟

اس کے محرکات اور وجوہات بظاہر یہ معلوم ہوتے ہیں کہ جب ملت مسلمہ کو سیاسی طور پر مشکل پیش آتی ہے اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مسلمان خود بخود اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مسلمانوں میں مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ایک مزاج ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اس لئے وہ سیرت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کو جب کامیابی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو ان کی زندگی کے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو پہلے ان کے علم میں نہیں ہوتے۔ دور سے جب آدمی معاملہ کرتا ہے تو اور بات ہوتی ہے اور جب قریب آتا ہے تو بہت سے دوسرے پہلو سامنے آتے ہیں۔ جب اسلام کے نئے اور مثبت پہلو سامنے آتے ہیں تو مخالفین بھی مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جب مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یوں بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے یہ بیان کیا تھا (اور یہ بیان حضور ﷺ کے پیغام پر بھی صادق آتا ہے۔) کہ جب کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کو پہلی مرتبہ دیکھتا تھا یا دور سے دیکھتا تھا تو اس پر ایک رعب اور خوف کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ جب کسی کو حضور علیہ السلام کے ساتھ قریب رہنے اور مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو پھر حضور کی محبت میں اضافہ

ہوتا تھا۔ جو جتنا قریب ہوتا تھا اتنا ہی حضور کی محبت میں غرق ہوتا تھا۔ یہی حال حضور کے پیغام کا ہے کہ جو لوگ دور سے دیکھتے ہیں اور سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کرتے ہیں وہ کسی پرانی عصبیت کی وجہ سے قریب نہیں آتے۔ لیکن جب قریب آتے ہیں اور براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو بہت سے ایسے پہلو سامنے آجاتے ہیں جن سے وہ پہلے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

☆

آپ نے بہترین اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جو اصول بیان کئے، یعنی پہلے تعلیم، پھر تربیت، پھر تہذیب۔ ہم اتنے لیٹ ہو گئے ہیں کہ اب کیا بہترین راستہ ہو سکتا ہے؟

ہم بالکل لیٹ نہیں ہوئے۔ آپ اسلامی تعلیم سے شروع کریں، تہذیب اور معاشرت خود بخود آجائے گی۔ مسلمانوں میں کوئی بھی چیز مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے۔ اسلامی تہذیب بھی مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے، نہ ہی اسلامی تعلیم مکمل طور پر معدوم ہے اور نہ ہی اسلامی ثقافت سرے سے ناپید ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن کہیں دھندلا گئی ہیں، کہیں کمزور پڑ گئی ہیں۔ جب آپ تربیت اور تعلیم کا کام شروع کریں گے تو جو چیزیں دھندلا گئی ہیں ان پر پڑا ہوا غبار اتر جائے گا اور وہ صاف ہو کر سامنے آجائیں گی۔

☆

علمی حلقے مطالعہ سیرت کے ذرائع سے واقف ہوتے ہیں۔ عوامی حلقوں کے لئے آپ سیرت کی کونسی کتاب تجویز کرتے ہیں؟

آپ دعوۃ اکیڈمی کی مطبوعات کی فہرست دیکھ لیں۔ اس میں سیرت پر بچوں، بڑوں اور خواتین کے لئے سیرت پر کتابیں موجود ہیں، جس کتاب سے آپ کو دلچسپی ہو وہ لے سکتے ہیں۔

☆

سیرت طیبہ پر کتابیں مختلف ادوار میں لکھی گئیں۔ تاریخ اسلام میں بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سیرت کی کتابیں لکھوائیں تاکہ عوام پر حکمرانی میں آسانی ہو۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی تاریخ بادشاہوں سے بھری پڑی ہے جس میں یہ سب کچھ ہوا۔ آج کے دور میں بھی سرکاری مولوی موجود ہیں جو بادشاہوں کی مرضی کے مطابق سیرت النبی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ایک شخص سیرت النبی کو کس طرح سمجھ سکتا ہے؟

کم از کم میں نے سیرت کی جن کتب کا مطالعہ کیا ہے ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں مصنف نے بادشاہوں کے مفادات کے مطابق کچھ لکھا ہو۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ حضرت عائشہ کے بھانجے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ سیرت پر پہلا کام انہوں نے کیا اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کسی بادشاہ کے مفاد کی خاطر سیرت کی تفصیلات مرتب نہیں کیں۔ سیرت پر قدیم ترین کتاب ابن ہشام کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن ہشام بنی عباس کے دور میں یہ کتاب لکھ رہے تھے۔ بنی عباس کی کمزوریاں انہوں نے بیان کر دی ہیں۔ ان کو چھپایا نہیں۔ طبری نے بھی بنو عباس کے دور میں کتاب لکھی اور یہ بھی لکھا کہ بنو عباس کے جد امجد غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے۔ گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کو باندھا گیا تھا اور باندھنے والوں نے اتنا کس کر باندھا کہ وہ کراہ رہے تھے اور حضورؐ کو ان کے کراہنے سے تکلیف ہو رہی تھی اور آپ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ یہ باتیں بنو عباس کے دور میں لکھی گئیں۔

میرے خیال میں یہ محض مغربی پروپیگنڈہ ہے۔ وہ تو حدیث، سنت اور فقہ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ بادشاہوں نے مرتب کروائی تھی۔ آج تک کوئی بھی یہ وضاحت نہ کر سکا کہ فقہ کا کون سا حکم کون سے بادشاہ کے مفاد کی خاطر لکھا گیا۔ جن فقہا نے فقہ کو مرتب کیا ان کا تو کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے تو سرکاری عہدے ٹھکرائے۔ امام ابوحنیفہ نے کوئی

سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام جعفر صادق پانچوں بڑے فقہا تھے اور آج ان سب کی فقہوں کی پیروی ہورہی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی سرکاری عہدہ نہیں رکھتا تھا۔ ان میں سے کس فقیہ نے سرکاری عہدے کے لئے فقہ کے مسائل گھڑے؟

سیرت کے باب میں بھی ایسا ہی ہوا کہ یہ حکمرانوں اور حکومتوں سے بالکل آزاد ماحول میں لکھی گئی۔ میرے خیال میں یہ بات کہ سیرت النبی پر کتابیں حکمرانوں نے اپنے مفاد کی خاطر لکھوائیں، بالکل غلط ہے اور یہ مغربی مصنفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ سیرت کے روشن پہلوؤں سے اتنے مرعوب ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے پاس یہ فخر موجود رہے۔ پہلے پہل انہوں نے قرآن کا انکار کیا۔ جب پچاسوں سال کی کوششوں کے باوجود قرآن کو غلط ثابت نہ کرسکے تو حدیث کی کمزوریاں تلاش کرنے کی مہم پر لگ گئے۔ حدیث کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں اور لکھا کہ یہ تو حضورؐ کے ڈھائی تین چار سو سال بعد کے لوگوں نے کہانیاں سن کر جمع کیں۔ جب دلائل سے یہ بات غلط ثابت ہوگئی تو فقہ کے پیچھے پڑ گئے کہ فقہ یا تو رومن لاء سے ماخوذ ہے، ورنہ محض جعلی ہے۔ لیکن جب یہ بات بھی غلط ثابت ہوگئی تو دوسری چیزوں کے پیچھے پڑ گئے۔ سیرت کے بارے میں بھی ہزار برس سے کہہ رہے ہیں اور ہر سو دو سو سال بعد ان کے بیان میں تبدیلی آجاتی ہے۔

مثال کے طور پر این میری شمل نے کتاب لکھی ہے Muhammad: The Messanger of Allah، یہ کتاب کوئی بیس پچیس سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ ولیم میور کی کتاب سے اس کا تقابلی مطالعہ کریں جو آج سے 120 سال پہلے لکھی گئی تھی، تو آپ کو زمین اور آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آخر این میری شمل بھی مسلمان نہیں تھیں، عیسائی تھیں۔ لیکن اسلامی مصادر و مآخذ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کے نتیجہ میں اتنی بڑی تبدیلی اور بہتری آئی۔ شمل کی کتاب میں کوئی بات بھی بظاہر قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اسلوب کے بارہ میں آپ بات کریں کہ ایسا ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ان کی اس کتاب کے مندرجات میں ایسی کوئی غلط بات نہیں ہے۔

☆

غزوہ سے مراد raiding کے ہیں، خیر سگالی کے وفود یا قبائل
کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لئے مہمات کو غزوات
میں شامل کرنا اس ٹرم کے مترادف نظر نہیں آتا؟

ممکن ہے لغوی اعتبار سے ایسا ہی ہو، لیکن تمام محدثین اور سیرت نگاروں نے غزوات کے باب میں مہمات کو بھی شامل کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی کتاب 'صحیح بخاری' میں 'کتاب المغازی والجہاد' میں ان مہمات کا بھی ذکر ہے جو انتہائی پُرامن تھیں۔ اسی میں صلح حدیبیہ کا بھی ذکر ہے، تبلیغی مہمات کا ذکر بھی ہے، بئیر معونہ کے جو 70 شہدا تھے اور تبلیغی مشن پر جا رہے تھے، ان کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے۔ عربی زبان میں تغلیب کا اصول ہے کہ اگر ایک سے زائد چیزوں کا ذکر کرنا ہو اور ان میں سے ایک چیز کسی ایک وقت میں نمایاں ہو تو دونوں کے لئے اس لفظ کو بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً ظہرین عصر اور ظہر کی نماز کے لئے اور مغربین مغرب اور عشا کی نماز کے لئے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عمرین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو کہتے ہیں۔ تو تغلیباً اگر تمام مہمات کے لئے غزوات کا لفظ استعمال ہو تو ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ پھر ویسے بھی اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا۔ لامشاحة في الاصطلاح۔ ہر شخص کو اپنی اصطلاح وضع کرنے کا اختیار ہے۔ اگر محدثین اور سیرت نگاروں نے یہ اصطلاح وضع کی اور اس کے مطابق کتابیں مرتب کیں تو میرے خیال میں ہمیں اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

☆

دوسرا خطبہ

سیرت اور علوم سیرت

ایک تعارف، ایک جائزہ

دوسرا خطبہ

سیرت اور علوم سیرت
ایک تعارف، ایک جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قابل احترام جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب،
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،
ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی
قابل احترام امیر البحر جناب افتخار احمد سروہی،
برادران محترم!
خواہران مکرم!

کل کی گفتگو کا موضوع تھا: مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت۔ اس میں ضمنی طور پر لفظ سیرت کے لغوی معنی اور فنی تعریف بھی سامنے آئی۔ سیرت کے بعض اہم موضوعات کی طرف بھی مختصر سا اشارہ کیا گیا۔ آج اسی چیز کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا مقصود ہے۔ سیرتُ کے موضوعات، ان کی جامعیت اور وسعت، اہم علوم سیرت اور نمایاں موضوعات سیرت آج کی گفتگو کے موضوعات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مصادر علم سیرت کی طرف بھی اختصار کے ساتھ اشارہ کیا جائے گا۔

علوم سیرت اور موضوعات سیرت پر گفتگو کرنے سے پہلے اگر ہم مختصراً اپنے ذہن میں وہ بات تازہ کرلیں جس کی طرف کل اشارہ کیا گیا تھا کہ تمام بانیان مذاہب اور مؤسسین ادیان میں رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری پوری سرچ لائٹ میں دنیائے انسانیت کے سامنے ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ کی تاریخیت اور حقیقی شخصیت کے بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کرسکتا۔ حضور علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آنے والے بہت سے بانیان مذاہب کے وجود کے بارے میں خود ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں کے حلقوں میں بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کے نام سے آج جو مجموعے ہمارے سامنے موجود ہیں وہ ان مقدس شخصیات کی حیات طیبہ، سوانح اور خدمات کے بارے میں یا تو تقریباً خاموش ہیں یا بہت ہی سرسری اور متضاد معلومات پر مشتمل ہیں۔ وہ معلومات جو ان کتابوں سے ان عظیم الشان انبیاء اور معلمین انسانیت کے بارے میں ملتی ہیں وہ انتہائی اجمالی اور سطحی ہیں۔ اس کے مقابلے میں حضور علیہ السلام کے حیات طیبہ پر آپ کی اپنی حیات مبارکہ کے دور سے لے کر آج تک مسلسل نہ صرف غور وخوض کیا جارہا ہے، اور لکھا جارہا ہے، نہ صرف اپنے بلکہ اپنے اور پرائے دونوں داد تحقیق دے رہے ہیں، معلومات اور مصادر کی فراوانی اور توسیع کی کیفیت یہ ہے کہ سیرت کے نام پر آج پورے پورے کتب خانے قائم ہیں۔ سیرت کے نام پر ادارے اور مسندیں قائم ہیں۔ سیرت کے مختلف موضوعات پر تحقیق اور مطالعہ کا فریضہ انجام دیا جارہا ہے۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ جس کو آج ہم علم سیرت کہتے ہیں۔ اس کو آغاز میں مغازی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مغازی کے بارے میں تفصیلات جمع کرنے کا مقصد تاریخی بھی تھا اور قانونی بھی۔ دونوں ضروریات کے تحت مغازی کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔ جیسے جیسے یہ معلومات وسعت پذیر ہوتی گئیں ان کو کتابوں اور تحریری مجموعوں کی صورت میں مرتب کیا جاتا رہا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے بقیہ گوشوں کے بارے میں بھی صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد میں آنے والے علمائے کرام اور محققین امت معلومات فراہم کرتے رہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات مقدسہ کے علاوہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات، آپ کی سنت، آپ کے تحریر فرمائے ہوئے مکاتیب، وثائق اور دستاویزات، پھر آپ کے آباؤ اجداد اور خاندان، خاندان سے آگے بڑھ کر آپ کے قبیلے اور دوسرے رشتہ دار اور متعلقہ قبائل کے انساب، رشتہ داریاں، پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شمائل یعنی عادات مبارکہ، خصائل، پھر آپ سے بڑھ کر صحابہ کرام اور صحابہ کرام کے طبقات کے بارہ میں معلومات اور تفصیلات کی ایک کہکشاں تھی جو صحابہ اور تابعین نے فراہم کر دی۔

اس وجہ سے طبقات کا ایک نیا فن وجود میں آیا جس کا آغاز صحابہ کرام کے حالات جمع کرنے سے ہوا۔ صحابہ کرام کے حالات جمع کئے گئے۔ صحابہ کرام کے مختلف طبقات تجویز کئے گئے۔ طبقہ کے لفظ کو یہاں اردو زبان کے لفظ طبقہ کے معنوں میں نہ سمجھئے گا۔ طبقہ عربی زبان میں پیڑھی کہتے ہیں، یعنی زمانے کے اعتبار سے مختلف طبقے۔ طبقات صحابہ کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل اور اخلاق کے بارے میں علم حدیث سے معلومات حاصل کی گئیں۔

ان امور کے ساتھ ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کی بحث سیرت کا ایک اہم باب قرار پائی۔ اور معجزات سے دلائل نبوت، پھر دلائل نبوت سے وہ مسائل جن کا تعلق کلامیات سے ہے، علوم سیرت کا حصہ بنے۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ موضوع پھیلتا چلا گیا۔ اب سیرت کی جتنی بنیادی کتابیں اور امہات کتب ہیں ان میں ایک انتہائی وسیع سلسلہ موضوعات ہے جن سے سیرت نگار بحث کرتا ہے۔

نمونے کے طور پر میں نے صرف ایک متوسط حجم کی کتاب کے عنوانات نوٹ کئے ہیں۔ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ عام متوسط کتابوں کے عنوانات کی وسعت اور پھیلاؤ کس حد تک ہے۔ ساتویں آٹھویں صدی ہجری کے ایک عربی سیرت نگار کی کتاب کے عنوانات ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا خاندان،

آپ کا قبیلہ،

آپؐ کے فضائل،

معجزات،

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ میں مسلمانوں پر جن آداب اور حقوق کا فریضہ

عائد ہوتا ہے،

آپ ﷺ کی اولاد مبارکہ،

آپ کی جدات (یعنی دادیاں)،

آپ کے ننھیالی رشتہ دار،

آپ کی نانیاں،

آپ کے خادم،

آپ کی خادمائیں،

جن معزز اور محترم خواتین نے آپ ﷺ کی پرورش کی اور دودھ پلایا،

آپ کی عادات،

آپ ﷺ کے خصائل،

آپ ﷺ کے اخلاق،

ازواج مطہرات،

آپ ﷺ کے غلام،

آپ ﷺ کا اسلحہ،

آپ ﷺ کے جانور۔

ان موضوعات کی حیثیت ظاہر ہے کہ ضمنی مباحث کی ہے۔ اصل مباحث میں سے اہم ترین یہ ہیں:

وقائع سیرت،

مغازی اور مہمات،

سنن زوائد،

تبلیغ دین،

قبائل سے روابط،

معاہدات،

معیشت و تجارت،

قانون وشریعت،

انتظامات واوارات،

وثائق ودستاویزات،

آپؐ کے سفراء اور عمال،

آپؐ کے صحابہ،

آپ کے عسکری انتظامات،

شہر مدینہ کا بندوبست،

ازواج مطہرات کے گھروں کا نظم ونسق،

وغیرہ وغیرہ۔

سیرت نگاروں کا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے اور قدیم سے قدیم سیرت نگاروں نے بھی اس بات کا اہتمام کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی سیرت مرتب کی جائے تو آغاز آپ کے خاندان اور آباؤ اجداد سے کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عروہ بن زبیرؓ سے لے کر آج کے سیرت نگاروں تک، تقریباً تمام مصنفین اور مولفین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ کا بیان آپؐ کے جد امجد معد بن عدنان سے شروع کیا ہے اور معد بن عدنان کے خاندان کا پس منظر اور ان کے اجداد کے بارے میں بیان کرتے ہوئے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر سے بات شروع کی ہے۔

یہ بات کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تعلق نسل ابراہیمی سے ہے، یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور یہ کہ آپ کا سلسلہ نسب معد بن عدنان تک قطعی اور یقینی ہے، یہ بات قریب قریب تمام سیرت نگار بلا استثنا بیان کرتے آئے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعض مغربی مصنفین، جن میں سب سے نمایاں نام سر ولیم میور کا ہے، اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ شاید یہ بات ان کو گوارا نہیں ہوئی کہ جس طرح بنی اسحاق میں انبیا کا سلسلہ چلا آرہا تھا، اسی طرح کا ایک سلسلہ، بلکہ خاتم السلاسل بنی اسماعیل میں سامنے آئے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے بنی اسماعیل کو بھی وہ

شرف اور اعزاز حاصل ہو جو بنی اسحاق کو حاصل ہوا تھا۔ وجہ یہ ہو یا کوئی اور، لیکن کئی مغربی مصنفین نے اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ مغربی مصنفین کے اس انکار کی وجہ سے یہ بات اور بھی اہم ہوگئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان اور آپ کے سلسلہ نسب پر ازسرنو تحقیق کی جائے اور یہ بات پورے تاریخی دلائل سے ایک بار پھر واضح کی جائے کہ رسول اللہ ﷺ کا نسل ابراہیمی میں ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ جو بات محققین روز اول سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں، اور جو عرب میں روز روشن کی طرح واضح تھی، جس میں مسلمانوں کو کبھی بھی کوئی تامل یا تردد نہیں ہوا اس کو مزید تاکید اور تحقیق کے ساتھ بیان کرنے کی آج پھر ضرورت ہے اور تمام ممکنہ اور دستیاب دلائل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

اجداد نبی یعنی رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد میں سے متعدد نامور شخصیات گزری ہیں جن کے اثرات عربوں کی تاریخ پر بہت گہرے ہیں۔ قیدار بن اسماعیلؑ کی اولاد میں ۳۷ پشت کے بعد عدنان ایک بہت ہی نمایاں اور صاحب عزم شخصیت تھے۔ ان کے نمایاں ترین ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان تک ہمارے اسماعیلی عربوں کا نسب نامہ پورے اہتمام سے محفوظ کیا گیا۔ عدنان کے بعد مکہ اور بیت اللہ کی تولیت پر بنی جرہم قابض ہو گئے جو حضرت اسماعیلؑ کے سسرالی تھے اور یوں یہ عدنان کے ماموؤں کا خاندان تھا۔

بنو جرہم نے ۲۰۷ء کے لگ بھگ بنی عدنان کو مکہ سے نکال دیا۔ اس لئے کہ انہوں نے بت پرستی میں بنو جرہم کا ساتھ نہ دیا تھا۔ یہ سلسلہ دو سو سال سے زائد جاری رہا۔ ۴۴۰ء کے لگ بھگ قصیٰ نے پھر مکہ پر قبضہ بحال کرایا اور بنی جرہم کو نکالا۔ یہ واقعات عربوں کے بچے بچے کی زبان پر تھے اور ہر قبیلہ میں فخر ومباہات سے بیان کئے جاتے تھے۔

سر ولیم میور نے ان سب حقائق کو نظر انداز کر کے نہ صرف بنی اسماعیل کی تحقیق کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض مزید متعصب اور بے انصاف لوگوں نے کچھ ایسی چیزوں کا بھی انکار کیا جس سے ہر مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی ساٹھ ستر سال پہلے تک مانوس تھے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان عرب کے انتہائی معتبر، محترم اور قابل ذکر خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی نسل میں سے بنی اسماعیل کو چنا۔ بنی اسماعیل میں سے قریش کو چنا۔ قریش میں

خاندان بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھے منتخب کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ بات ایک ایسے معاشرے میں ایک ایسے طبقے کے سامنے ارشاد فرما رہے تھے جہاں انساب کی تفصیلات معلوم کرنا اور یاد رکھنا لوگوں خاندانی مشاغل اور پیشے میں شامل تھا۔ جہاں اس موضوع پر کوئی کمزور یا متنازعہ بات کرنا ممکن نہیں تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جناب عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے شہری ریاست کے سربراہ تھے۔ ان سے قبل ان کے والد جناب ہاشم اور جد امجد جناب قصی مکہ کی سرداری اس شان سے کر چکے تھے کہ عرب کے چپہ چپہ پر ان کا تذکرہ تھا۔ اگر مکہ مکرمہ کی شہری ریاست کے سربراہ کا خاندان اعلیٰ خاندان نہیں ہوگا تو پھر کس کا خاندان اعلیٰ ہوگا۔ قبائلی معاشروں میں آج بھی قبیلہ کی سربراہی کسی کمزور یا کمتر خاندان کے فرد کو نہیں دی جاتی۔ اس زمانہ میں تو خاندانی وجاہت ہی قبائل کی سربراہی کے لئے سب سے پہلی اور سب سے بنیادی شرط سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ان سب چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈی ایس مارگولیتھ نے ان تمام حقائق کا بلا دلیل انکار کر ڈالا۔ میرے لئے اس کے الفاظ دہرانا بہت تکلیف دہ ہے۔ تاہم میں بہت مشکل سے وہ انگریزی لفظ دہراتا ہوں، جس سے اس کا نقطہ نظر سامنے آجائے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ کا تعلق low birth سے تھا۔ یعنی آپ کا خاندان نسلی اعتبار سے کم تر درجے کا خاندان تھا۔ اب یہ بات ایک مسلمان کے لئے، جو سیرت کے پورے ذخیرے سے واقف ہو اور اسلامی لٹریچر پر جس کی نظر ہو، بڑے اچنبھے کی بات ہے اور حقائق کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کے بارے میں عربوں کی علم الانساب میں دلچسپی کی وجہ سے بہت سی روایات محفوظ ہیں جن کو علمائے انساب اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عرب میں چونکہ نسب کی تفصیلات محفوظ رکھنے کا رواج تھا۔ اس لئے تمام قابل ذکر قبائل کے نسب نامے محفوظ تھے۔ وہاں افراد اور خاندانوں کے ہی نہیں بلکہ اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ وہاں یہ بات بڑی غیر مانوس اور ناقابل تصور تھی کہ کسی شخص کا نسب معلوم اور متعین نہ ہو۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پیچھے کئی پشتوں تک ایک ایک نام پوری طرح معلوم اور ان میں ہر ایک کا سلسلۂ نسب ہر طرح محفوظ تھا۔ ان افراد اور شخصیات کے بارے میں سیرت نگاروں اور ماہرین انساب نے بہت سی

ضروری معلومات جمع کی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے معد بن عدنان تک اپنے نسب نامہ کی تصدیق فرمائی۔ کئی بار رسول اللہ ﷺ نے اپنے نسب نامہ کی تصدیق فرمائی۔ آپؐ نے جب اپنے نسب کے بارے میں ارشاد فرمایا تو اپنے اور اپنے والد جناب عبداللہ اور دادا جناب عبدالمطلب سے لے کر معد بن عدنان تک بیان فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ 'کذب النسابون'، یعنی اس کے بعد کی جو پشتیں ہیں ان کے بارے میں ماہرین انساب کی معلومات درست نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آگے کے نسب ناموں میں بہت سے نام ماہرین انساب نے چھوڑ دیئے۔ بہت سے ناموں کے بارے میں التباس اور اختلاف ہے۔ تاہم یہ حقیقت عرب میں کبھی بھی باعث اختلاف نہیں رہی کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا اور معد بن عدنان بنی اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجداد میں سے ایک مشہور شخصیت کعب بن لوئی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے ہم عصر تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں سے ان کی ملاقات کی طرف بھی کچھ اشارے ملتے ہیں۔ چونکہ یہ سب حضرات تجارت پیشہ تھے اور اس سلسلہ میں مختلف علاقوں میں جاتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ بات نہ صرف بعید از امکان نہیں، بلکہ ہر طرح قرین قیاس ہے کہ جناب کعب بن لوئی بعض ایسے علاقوں میں تشریف لے گئے ہوں جہاں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوارئین موجود تھے اور اُن سے اِن کی ملاقات ہوئی ہو۔

قریش کے قبائل اور خاندانوں کے بارے میں سیرت نگاروں اور ماہرین انساب نے جو تفصیلات محفوظ رکھی ہیں وہ محض حضورؐ یا آپؐ کے دادا کے زمانے کی نہیں ہیں، بلکہ کئی کئی پشتوں سے وہ تفصیلات موجود ہیں۔ قبائل قریش کے آپس کے روابط کے بارہ میں بھی ضروری تفصیلات محفوظ ہیں۔ اِن قبائل اور برادریوں میں آپس میں اگر کوئی اختلاف ہوا تو اس کی تفصیلات اور اسباب بھی موجود ہیں اور اگر کہیں اتفاق رائے ہوا تو اس کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔

قبائل قریش میں وہ کون لوگ تھے جو مطیبین کہلاتے تھے۔ کون لوگ تھے جو احناف کہلاتے تھے۔ قبائل قریش میں کون لوگ تھے جو قریش الظواہر کہلاتے تھے اور کون سے قبائل

تھے جو قریش البطاح کہلاتے تھے۔ یہ سارے قبائل وہ تھے جن میں آپس کے معاہدے اور دوستیاں بھی تھیں اور آپس میں تعلقات بھی تھے۔ ان معاہدوں اور دوستیوں کا تعلق نہ صرف باہمی تعاون اور قبائلی تقسیم کار سے تھا، بلکہ ان میں بہت سے معاہدوں کا تعلق عام آدمی کی فلاح و بہبود، مظلوموں کی حمایت، بے گھر اور بے سہارا لوگوں کی امداد سے بھی تھا۔ عرب میں اس نوعیت کے معاہدے بھی عام تھے جن کا مقصد کمزوروں کی مدد اور مظلوموں کی حمایت تھا۔ اس طرح کے بعض معاہدات کا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ 'ما کان من حلف فی الجاھلیۃ فان الاسلام لم یزدہ الا شدۃ' جاہلیت کے زمانے میں جتنے بھی حلف اور معاہدے رہے ہیں اسلام میں ان کو نظر انداز یا ختم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو مزید بہتر اور پختہ بنایا جائے گا۔ یعنی اسلام کے آنے کے بعد دوستی اور تعاون کے ان معاہدوں کی شدت اور intensity میں اضافہ تو ہوسکتا ہے کمی نہیں ہوسکتی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جد امجد جناب ہاشم بن عبد مناف کے بارے میں تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں قریش کے سردار تھے، بلکہ آج کل کی اصطلاح کے مطابق شہری ریاست مکہ کے چانسلر تھے۔ وہ ایک طرف مکہ کی شہری ریاست کے سربراہ تھے تو دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان یعنی بنوہاشم میں بیت اللہ کی نگہداشت کا جو منصب چلا آرہا تھا، اس پر بھی فائز تھے۔ یوں ان کی ذاتی اور خصوصی ذمہ داری حجاج کی دیکھ بھال بھی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکومت مکہ میں وزیر اعظم بلکہ صدر ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے وزیر حج بھی تھے۔ شہری ریاست مکہ میں وزیر حج کا منصب خاندانی طور پر جناب ہاشم بن عبد مناف کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے زمانے سے حضرت عباس بن عبد المطلب کے زمانے تک یہ کیفیت رہی کہ یہ حضرات اپنی جیب سے اور اپنے ذاتی وسائل سے حجاج کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جناب ہاشم کا لقب ہاشم اسی لئے پڑا تھا کہ وہ حجاج کرام کی مہمانداری اپنی جیب سے کیا کرتے تھے۔ لفظ ہاشم کا مطلب ہے روٹی توڑ کر ثرید بنانے والا۔ وہ تمام حجاج کرام کو اپنی جیب سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ان کے حکم سے روٹیاں توڑ کر ثرید بنایا جاتا تھا اور تمام حجاج کو کھلایا جاتا تھا۔ ثرید عرب میں اعلیٰ قسم کا لذیذ اور عمدہ کھانا سمجھا جاتا تھا۔ گویا جتنے حجاج کرام آتے تھے وہ مکہ میں قیام کے دوران جناب ہاشم بن

عبد مناف کے ذاتی مہمان ہوتے تھے۔ اس روایت کو حضرت عباس بن عبد المطلب نے بھی نبھایا۔ وہ بھی بڑے پیمانے پر حجاج کرام کی دعوت اور خدمت کیا کرتے تھے۔

جناب ہاشم کے بعد ان کے صاحبزادے جناب عبد المطلب اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ وہ ایک طویل عرصہ مکہ کے شہری ریاست کے سربراہ رہے۔ ابرہہ نے جب مکہ پر حملہ کا ارادہ کیا اس وقت جناب عبد المطلب ہی مکہ کے سردار تھے۔ ہاشم کو چند سال ہی مکہ کی سربراہی کا موقع ملا اور نسبتاً کم سنی میں فوت ہو گئے۔ ہاشم کے برعکس جناب عبد المطلب کی عمر نہایت طویل ہوئی۔ وہ بہ اختلاف روایات 90 سے لے کر 108 سال کی عمر تک حیات رہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاید ستر سال یا اس سے بھی زیادہ مکہ مکرمہ کی شہری ریاست کے سربراہ رہے ہوں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کی ان تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا خاندان عرب کے نامور ترین اور محترم ترین خاندانوں میں سے ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علم انساب نے اس خاندان کے بارہ میں بہت سی تفصیلات محفوظ رکھی ہیں۔ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کے براہ راست آباؤ اجداد بلکہ آباؤ اجداد کے قریبی رشتہ دار وا قارب، پھر جہاں جہاں ان آباؤ اجداد کی شادیاں ہوئیں، ان کے سسرالی رشتہ داروں اور ان کی نانیوں اور دادیوں سب کے بارے میں محققین نے الگ الگ تفصیلات جمع کی ہیں۔ لوگوں نے ان کے بارے میں کتابیں بھی لکھیں۔

سیرت نگاروں نے جب سیرت نگاری کا سلسلہ شروع کیا تو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کی لفظی تصویر کشی پر بھی توجہ کی۔ اس زمانے میں عرب میں مصور نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی تصویر سازی اسلام کے مزاج کے خلاف تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بیت اللہ میں عبادت کی خاطر جن مقدس شخصیات کی تصویریں لگائی گئی تھیں آپؐ نے ان کو ہٹایا۔ اس لئے حضورؐ کی تصویر تو کوئی نہیں بنا سکتا تھا اور اگر کوئی مصور ہوتا بھی تو شاید حضور ﷺ کے جمال جہاں آرا کی شبیہ نہ بنا سکتا۔

لیکن کم و بیش ایک درجن سے زائد صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کو بعد والوں کے لئے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک تو سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں

جو پیدائش سے لے کر تیس بتیس سال کی عمر تک حضورؐ کی خدمت میں شب وروز رہے۔ دوسرے آپؐ کے سوتیلے بیٹے ہند بن ابی ہالہ ہیں جن کے بارے حضرت حسنؓ نے ارشاد فرمایا کہ 'کان وصافاً لحلیة رسول الله ﷺ'، کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ وہ حضرات جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلیہ مبارکہ کو بیان کیا ان کی تعداد پندرہ کے قریب ہے۔ ان کی روایات مختلف کتب سیرت میں موجود ہیں۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ صحابہ کرام تو بہت بڑی تعداد میں تھے، ان ہزاروں میں سے صرف پندرہ صحابہ نے کیوں حلیہ مبارکہ بیان فرمایا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوسکتی ہے کہ اکابر صحابہ کرام کے مخاطبین میں سے بیشتر تو وہ تھے جن کی آنکھیں خود دیدار جمال سے مشرف ہوچکی تھیں۔ ان کے سامنے حضور اکرمؐ کا حلیہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حلیہ مبارکہ بیان کرنے کے مواقع زیادہ تر ان صحابہ کرام کو ملے جن کو تابعین کے زمانے تک زندہ رہنے کا موقع ملا۔ وہ تابعین کے مجمع میں حلیہ مبارکہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور چھوٹی سی وجہ جو ایک اور صحابی کی زبان سے سامنے آتی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ تابعین میں سے کسی نے ایک صحابی، غالباً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے پوچھا کہ کیا آپ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارکہ بیان کرسکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تابعی نے حیرت سے پوچھا کہ آپ کبھی حضور کی محفل میں نہیں بیٹھے تھے کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں، لیکن جب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا تو مخالفت کی وجہ سے کبھی رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کو پوری توجہ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ اور جب اسلام قبول کرلیا تو آپؐ کا رعب اور جلال اتنا غیر معمولی تھا کہ کبھی نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ حلیہ مبارکہ کو بیان کرنے والے صحابہ کی تعداد کا کم ہونا اس وجہ سے بھی ہو۔

جن صحابہ کرام سے حضور ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بارہ میں کتب حدیث میں روایات موجود ہیں ان میں درج ذیل حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب

۲۔ حضرت انس بن مالک

۳۔ حضرت ابو ہریرہ

۴۔ حضرت براء بن عازب

۵۔ حضرت عائشہ صدیقہ

۶۔ حضرت ابوجحیفہ

۷۔ حضرت جابر بن سمرہ

۸۔ حضرت عبداللہ بن عباس

۹۔ حضرت مُعرض بن معیقیب

۱۰۔ حضرت ابوالطفیل

۱۱۔ حضرت عدّاء بن خالد

۱۲۔ حضرت خُریم بن فاتک

۱۳۔ حضرت حکیم بن حزام

۱۴۔ حضرت ام معبد

۱۵۔ حضرت ہند بن ابی ہالہ

وغیرہ وغیرہ

اگر آپ اجازت دیں تو میں ہند بن ابی ہالہ کی طویل روایت سے چند جملے نقل کردوں۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔اس کے مختلف ٹکڑوں کو امام ترمذی نے شمائل ترمذی میں مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔شمائل ترمذی حضورؐ کے شمائل پر پہلی کتاب ہے جو ایک بڑے محدث نے مرتب کی ہے۔اس میں حضورؐ علیہ السلام کے حلیہ مبارکہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔چونکہ یہ علم سیرت کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔اس لئے اس کے چند ٹکڑے آپ کی سامنے پیش کرتا ہوں۔عربی الفاظ کے بجائے ان کا اردو ترجمہ پڑھتا ہوں۔

حضرت حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے، جو رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بہت زیادہ بیان کرنے والے تھے، یہ عرض کیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مجھ سے بیان فرمائیں۔ ہند بن ابی ہالہ نے فرمایا: 'رسول اللہ ﷺ اپنی ذات والا صفات کے اعتبار سے بھی شاندار تھے اور دوسروں کی نظروں میں بھی بڑے جچنے والے تھے۔آپ کا چہرہ مبارک ماہ بدر کی طرح چمکتا تھا۔آپ کا قد کسی متوسط قد والے سے کسی

قدر طویل اور بہت لمبے انسان سے نسبتاً کم تھا۔ سر اعتدال کے ساتھ بڑا تھا۔ سر کے بال کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ اگر اتفاقاً مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ تکلف سے مانگ نکالنے کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا رنگ نہایت چمکدار، پیشانی کشادہ، ابرو خمدار، باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جدا جدا تھے۔ دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو کسی ناگواری کے وقت ابھر جاتی تھی۔ ناک بلندی کی طرف مائل تھی۔ اس پر ایک چمک اور نور محسوس ہوتا تھا۔ پہلی بار دیکھنے والا آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا، لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا کہ یہ حسن اور چمک کی وجہ سے نسبتاً زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے ورنہ فی نفسہٖ اتنی بلند نہیں تھی جتنی معلوم ہوتی تھی۔ آپ کی داڑھی بھرپور اور گنجان تھی۔ آنکھ کی پتلی نہایت سیاہ تھی۔ رخسار ہموار اور ہلکے تھے۔ آپ کا دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا، یعنی تنگ نہ تھا۔ دندان مبارک باریک اور آبدار تھے۔ سامنے کے دانتوں میں ہلکا ہلکا سا فاصلہ بھی تھا۔ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لکیر تھی۔ گردن ایسی خوبصورت اور قدرے لمبی تھی جیسے مورتی کی گردن صاف اور تراشی ہوئی ہوتی ہے۔ رنگ میں چاندی کی طرح صاف اور خوبصورت تھی۔ آپ کے اعضا نہایت معتدل اور پُر گوشت تھے۔ بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ پیٹ اور سینہ ہموار تھا۔ سینہ فراخ اور کشادہ تھا۔ دونوں مونڈھوں کے درمیان فاصلہ قدرے زیادہ تھا۔ جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور مضبوط تھیں۔ بدن کے وہ حصے جو عموماً کپڑوں سے باہر رہتے تھے وہ بھی نہایت روشن اور چمکدار تھے۔ بدن پر چھاتیوں کے بالائی حصے کے علاوہ بال نہیں تھے۔ البتہ دونوں بازوؤں، کندھوں اور سینے کے بالائی حصے پر بال تھے۔ کلائیاں دراز تھیں۔ ہتھیلیاں فراخ اور پر گوشت تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں۔ آپ کے تلوے قدرے گہرے اور قدم ہموار تھے۔ جب آپ چلتے تو قوت کے ساتھ قدم اٹھاتے اور ذرا آگے کو جھک کر چلتے۔ قدم مبارک زمین پر آہستہ لیکن جم کر پڑتا۔ آپ تیز رفتار تھے اور کشادہ قدم رکھتے۔ جب آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا بلندی سے پستی کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے توجہ فرماتے۔ نظریں عموماً نیچی رہتیں۔ آپ کی نگاہیں آسمان کی نسبت عموماً زمین کی طرف زیادہ مائل رہتیں۔ آپ کی عادت شریفہ عموماً گوشہ چشم سے دیکھنے کی تھی۔ صحابہ کرام کو چلتے وقت اپنے سے آگے رکھتے تھے اور خود پیچھے رہتے تھے۔ جس سے ملتے اس کو سلام کرنے

میں پہلے کرتے۔ آپ زبان کے سچے اور طبیعت کے نرم خو تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا۔ جو آپ کے ساتھ جتنا زیادہ رہتا وہ آپ کی محبت میں اتنا ہی پختہ ہو جاتا۔ آپ اکثر و بیشتر گہری سوچ میں رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم آپ کو مسلسل کھائے جا رہا ہے۔۔۔"

یہ ایک طویل روایت ہے جس کے چند ٹکڑے میں نے پیش کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے حلیہ مبارکہ کے بارے میں کس طرح کی معلومات جمع کی ہیں۔ یہ شمائل کا ایک شعبہ ہے۔ شمائل کے بارے میں یوں تو تمام سیرت نگاروں نے تفصیل بیان کی ہے۔ لیکن اس میں تقدم اور اولیت کا شرف امام ترمذی کو حاصل ہے جنہوں نے شمائل ترمذی کے نام سے کتاب لکھی اور آج اس کا اردو، انگریزی، فارسی اور غالباً ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں شمائل ترمذی کے ایک سے زائد ترجمے ہوئے ہیں۔ شمائل پر عربی زبان میں ایک سو سے زائد کتابیں موجود ہیں، لیکن شمائل رسول پر پہلی کتاب لکھنے کا لازوال شرف امام ترمذی کو حاصل ہے۔

شمائل کے بعد سیرت کا جو دوسرا میدان سامنے آیا وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات اور وہ تقاریر ہیں جو آپ نے مختلف مواقع پر ارشاد فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ افصح العرب تھے۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا جو معیار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور خطبات میں ہے، آج تک عربی زبان کا کوئی بھی خطیب اور ادیب اس بلند معیار تک نہیں پہنچ سکا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو افصح العرب قرار دیا اور اس کے اسباب بھی بیان فرمائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کتب تاریخ و سیرت کے علاوہ کتب حدیث میں بھی جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ سیرت نگاروں نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کو جمع کیا ہے۔ اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کے ایک درجن سے زائد مجموعے موجود ہیں، جن کو دیکھ کر خطبات نبوی کی بنیادی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ ان خطبات میں جو اہم خطبات ہیں ان میں سب سے پہلے خطبہ صفا ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خاندان کو دعوت دی اور قریش کے اہم ترین افراد کو جمع کر کے کوہ صفا سے ان کو خطاب فرمایا۔ دوسرے اہم خطبات

میں فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کا ارشاد کردہ خطبہ ہے۔ خطبہ تبوک ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ادارہ تحقیقات اسلامی نے شائع کیا ہے۔ پھر خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ جو انسانی تاریخ میں انسانی حقوق کا سب سے پہلا اور سب سے جامع منشور اعظم ہے۔ اس سے پہلے انسانی حقوق کے بارے میں اتنی تفصیل کے ساتھ کسی بھی منشور یا دستاویز میں وہ تفاصیل اور ہدایات نہیں ملتیں جو خطبہ حجۃ الوداع میں ملتی ہیں۔ پھر حضور نے اپنی وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے خطبات میں ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان تمام خطبات میں سب سے زیادہ اہمیت یقیناً خطبہ حجۃ الوداع کو حاصل ہے۔ اس پر دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں مواد اور تحریریں موجود ہیں۔ خود اردو زبان میں اس خطبہ پر ایک سے زائد کتب لکھی گئی ہیں۔ ان کتب میں اس خطبہ کے مکمل متن کے علاوہ اس کے مندرجات، اس میں دیئے گئے اصول اور قواعد کی تحقیق اور تنقید اور انسانی حقوق کا جو بین الاقوامی چارٹر ہے، اس پر مختلف انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ کئی غیر مسلم مصنفین اور اہل علم نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو صحابہ کرام یقیناً اس کو نہایت توجہ اور خاموشی سے سماعت فرماتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو انتہائی وضاحت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات ارشاد فرماتے۔ جو اہم نکات ہوتے ان کی تکرار بھی فرماتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ خطبہ ارشاد فرماتے وقت دست مبارک اور انگلیوں سے بھی اشارہ فرماتے تھے۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی نکتہ پر زور دینا چاہتے تھے تو بائیں دست مبارک کو سیدھا کر کے دائیں دست مبارک کے انگوٹھے سے اشارہ فرماتے تھے کہ یہ بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ اُس وقت ڈائس اور روسٹرم کا رواج تو نہیں تھا جس طرح کہ آج جب کوئی مقرر کسی نقطہ پر زور دینا چاہتا ہے تو روسٹرم پر مکا مار کر زور دیتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کسی نکتہ پر جب زور دینا چاہتے تھے تو بائیں دست مبارک کی ہتھیلی پر دائیں دست مبارک کے انگوٹھے سے زور ڈالتے تھے۔ بہت سے سیرت نگاروں اور محدثین نے حضورؐ کے خطبے اور تقریر کے انداز کو نقل کیا ہے تو یہ تفصیل بیان کی ہے۔ یوں یہ بھی حدیث مسلسل ہے جس میں راویان حدیث نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے اشارہ کرنے کا یہ نقشہ بیان کیا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشبیک سے (یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر) ایک بات کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے ایک بار تین چار قسم کے گناہوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ جب انسان یہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکل جاتا ہے اور جب توبہ کرتا ہے تو دوبارہ اس کے دل میں ایمان اس طرح داخل ہوتا ہے۔ روایت کرنے والے صحابی نے فرمایا کہ 'فشبک بین اصابعہ' یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر آپؐ نے اس طرح بتایا۔ اب یہ نقل بھی صحابہ کے زمانے سے آج تک ہوتی چلی آ رہی ہے اور اس حدیث کو بیان کرنے والا ہر شخص تشبیک کے اس عمل کو کر کے بتاتا ہے۔ یہ عمل بھی حدیث کا حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر کوئی نقش بنا کر بھی دکھایا۔ ایک موقع پر آپ نے چھڑی سے ریت پر نقش بنا کر ارشاد فرمایا کہ راہ راست ایسی ہوتی ہے اور صراط مستقیم اس طرح ہے اور گمراہی کے راستے دونوں طرف اس طرح نکلتے ہیں۔ اس بات کو آپ نے ایک نقشے کی مدد سے ارشاد فرمایا۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ مثالیں دے کر بھی بات بیان فرمایا کرتے تھے۔ امثال النبی پر لوگوں نے الگ سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔

حضور کا طریقہ تھا۔ اور قرآن پاک کا بھی یہی طریقہ ہے۔ کہ پہلے ایک بات کو اجمالاً بیان فرماتے تھے۔ اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل بیان فرماتے تھے۔ پھر آپ کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ استفہام کے طریقے سے بات ارشاد فرماتے تھے۔ پہلے ایک بات سوالیہ انداز میں سامعین کے سامنے رکھتے تھے اور جب سامعین متوجہ ہو جاتے تھے اور ان کے ذہن اس پر غور شروع کر دیتے تھے تو پھر حضورؐ اس کا جواب خود عنایت فرما دیتے تھے۔ یوں وہ مسئلہ لوگوں کے ذہن کے قریب ہو جاتا تھا اور فوراً ان کی سمجھ میں بات آ جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؐ مخاطبین کے مختلف درجات کے لحاظ سے ان کو الگ الگ خطاب فرماتے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب کوئی نئی وحی آتی تھی یا آپ کوئی نئی بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے تو پہلے مردوں کے مجمع میں بیان فرماتے تھے۔ پھر اس کو عورتوں کے مجمع میں بیان فرماتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کوئی بات بچوں کے مجمع میں بھی ارشاد فرمائی۔ یہ سارے پہلو وہ ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات اور ارشادات پر غور کرنے والوں

نے دریافت کئے ہیں۔ حضور کے خطبات پر غور کرنے سے یہ خصائص اور نمایاں پہلو خود بخود سامنے آتے ہیں۔

اردو زبان میں خطبات نبوی کا ایک ایسا ضخیم مجموعہ موجود ہے جس سے بڑا اور جس سے زیادہ جامع مجموعہ عربی کے علاوہ شاید کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔ مولانا محمد محدث جوناگڑھی، جن کا اردو ترجمہ قرآن پاک سعودی حکومت نے حال ہی میں شائع کیا ہے اور بڑے پیمانے پر تقسیم کیا ہے، انہوں نے خطبات محمدی کے عنوان سے آں حضور علیہ السلام کے خطبات ایک بہت ہی مفصل اور ضخیم کتاب میں جمع کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے خطبات نبوی کو ایک نئی ترتیب سے بیان کیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس ترتیب پر شرح صدر نہیں ہے۔ تاہم یہ خطبات نبوی کا ایک بہت جامع مجموعہ بن گیا ہے جو اردو زبان میں دستیاب ہے۔

خطبات کے بعد پھر ایک نیا فن سیرت میں سامنے آیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے املا کردہ وثائق اور دستاویزات ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف دستاویزات تیار کرائیں۔ اپنے معاصر فرمانرواؤں کو خطوط تحریر فرمائے۔ ان دعوتی خطوط میں سے 104 کے لگ بھگ خطوط کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان تبلیغی اور دعوتی خطوط کے علاوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انتظامی معاملات کے بارے میں بھی اپنے لوگوں اور کارندوں کو خطوط تحریر فرمائے۔ کچھ اور حضرات کے لئے آپ نے دستاویزات تیار کرائیں۔ ان دستاویزات ومکاتیب کے کئی مجموعے عربی زبان میں موجود ہیں۔ ان میں جو جامع ترین مجموعے ہیں ان میں سے ایک ہمارے برصغیر کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے تیار کیا ہے جن کے نام پر ہماری لائبریری موسوم ہے۔ 'الوثائق السیاسیة فی العهد النبوی و الخلافة الراشدة'۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے کے کئی سو ایسے وثائق کو جمع کیا گیا ہے جن کی کوئی سفارتی یا سیاسی اہمیت ہے۔ اس گراں قدر مجموعہ میں مختلف انداز کے وثائق اور دستاویزات شامل ہیں۔ بہت سے قبائل کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاہدے فرمائے۔ بہت سے قبائل کے ساتھ پہلے سے موجود تعلقات اور معاہدات کی تجدید فرمائی۔ دعوت وتبلیغ کے لئے معاصر فرمانرواؤں اور بہت سے با اثر سرداروں کو خطوط بھی لکھے۔ عمال کے تقرر کے موقع پر آپ نے جو تقرر نامے جاری کئے، وہ بھی سب موجود ہیں۔ بعض

عمال کو تحریری طور پر ہدایات جاری فرمائیں کہ جب اپنی ذمہ داریاں انجام دو تو ان ہدایات پر عمل کرو۔ ان میں سے ایک بڑی اہم دستاویز وہ ہے جو آپ نے یمن کے ایک علاقہ کے گورنر عمرو بن حزمؓ جو کہ ایک نوجوان صحابی تھے، عطا فرمائی تھی۔ آپ نے ان کو گورنر بنا کر بھیجا۔ یمن کے علاقہ جُند کا ذمہ دار بنایا۔ وہاں ان کو اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے لئے مفصل ہدایات تحریری طور پر عطا فرمائی گئیں۔ حضرت عمرو بن حزمؓ کو دی گئی یہ دستاویز سارے ذخیرہ دستاویزات نبوی میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس میں بہت سے فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

بہت سی دستاویزات وہ ہیں جن کے ذریعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض قبائل کو امان عطا فرمائی۔ ان دستاویزات کی اصل تعداد ممکن ہے بہت زیادہ ہو۔ ایسی بہت سی دستاویزات موجود ہیں۔ کچھ لوگوں کو عطایا اور زمین الاٹ کرنے کی ہدایات جاری فرمائیں۔ المزینہ قبیلہ کے سربراہ بلال بن حارث المزنی ایک مشہور صحابی ہیں، ان کو حضورؐ نے ایک زمین الاٹ کی، بعد میں صحابہ کرام کے مشورہ سے ان سے وہ زمین واپس لے لی۔ اس الاٹمنٹ اور اس کی تنسیخ دونوں کی دستاویزات موجود ہیں۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کچھ شخصی خطوط بھی لکھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ متفرق دستاویزات ہیں۔ یہ ان دستاویزات کی نوعیت ہے جو وثائق کے نام سے سیرت کا حصہ ہے اور سیرت نگاروں نے ان سے کام لیا ہے۔

یہ دستاویزات کتب حدیث میں بھی مذکور ہیں۔ ان میں سے کئی صحیح بخاری میں بھی ہیں۔ مثلاً قیصر روم کے نام جو نامہ مبارک لکھا گیا تھا اس کا متن صحیح بخاری میں موجود ہے۔ حدیث کی کئی دوسری کتابوں میں بھی ہے۔ کتب حدیث کے ساتھ ساتھ سیرت کی جن بنیادی کتابوں میں ان دستاویزات کو نقل کیا گیا ہے ان میں طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، فتوح البلدان، کتاب الاموال، سیرت ابن ہشام اور امام ابو یوسف کی کتاب الخراج شامل ہیں۔ ان دستاویزات کی ایک تاریخی اہمیت تو بلاشبہ ہے ہی، تاریخ اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کی ایک قانونی اور فقہی اہمیت بھی ہے۔ اس لئے کہ یہ احادیث کا حصہ ہیں جو اسلامی شریعت میں ماخذ قانون اور مصدر فقہ ہیں۔

جن قبائل کے پاس اس طرح کی دستاویزات پائی جاتی تھیں اس قبیلے کو ایک تقدس اور

احترام بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہے کہ بعض لوگوں نے جعلی دستاویزات بھی تیار کیں۔ ان جعلی دستاویزات کا محدثین نے پتہ چلایا۔ بعد کے زمانے میں اس طرح کی کئی جعلی دستاویزات سامنے آئیں۔ ایک دستاویز بعض یہودیوں نے غالباً خلیفہ ہارون الرشید کو پیش کی۔ اس کے بارہ میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ دستاویز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے فلاں صحابی نے تیار کی تھی جس کے ذریعے یہودیوں کو بعض حقوق اور مراعات دی گئی تھیں۔ خلیفہ ہارون الرشید نے مشہور فقیہ اور محدث امام اوزاعی کو وہ دستاویز دکھا کر ان کی رائے مانگی۔ امام اوزاعی نے اس پر صرف ایک نظر ڈال کر کہا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ خلیفہ نے حیرت سے پوچھا کہ آپ ایک نظر میں کیسے اس کو جعلی قرار دے سکتے ہیں۔ امام اوزاعی نے بتایا کہ اس دستاویز پر جن لوگوں کے نام بطور گواہ درج ہیں ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد بن معاذؓ دونوں کا ذکر ہے۔ حضرت معاویہؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی حضرت سعد بن معاذؓ شہید ہو چکے تھے۔ چونکہ یہ دونوں ایک دستاویز کے گواہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ دستاویز جعلی ہے۔

اس طرح کی اور بھی کئی ایک مثالیں ہیں۔ مثلاً ایک اور دستاویز پانچویں صدی ہجری میں سامنے آئی۔ خلیفہ وقت نے مشہور مورخ اور محدث علامہ ابن الجوزی کو مامور کیا کہ اس کا جائزہ لیں۔ انہوں نے بھی معائنہ کرنے کے فوراً بعد کہا کہ یہ جعلی ہے اور ثبوت میں ایسے ہی دلائل پیش کئے تھے۔

برصغیر کو ایک شرف اور فخر یہ بھی حاصل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دستاویزات اور مکاتیب پر پہلی کتاب ہمارے پاکستان کے ایک محقق اور سیرت نگار نے لکھی تھی۔ یہ بزرگ شیخ ابوجعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی تھے۔ دیبل بعض لوگوں کے خیال میں کراچی کا پرانا نام تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ٹھٹہ کے قریب کسی بستی کا نام تھا۔ بہر حال یہ سندھ ہی کی کوئی بستی تھی اور علامہ ابوجعفر دیبلی سندھ ہی کے کسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے مکاتیب نبوی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ مکاتیب نبوی پر قدیم ترین کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ بھی ہمارے ایک فاضل دوست ڈاکٹر عبدالشہید صاحب نعمانی نے شائع کیا ہے اور آج کل دستیاب ہے۔ ابوجعفر الدیبلی کے علاوہ جس سیرت نگار نے مکاتیب

نبوی پر ٹھوس کام کیا اور بہت سے مکاتیب جمع کیے وہ دسویں صدی ہجری کے شامی مؤرخ اور محقق محمد بن علی ابن طولون ہیں۔ انہوں نے 'اعلام السائلین عن کتب سیّد المرسلین' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔

یہ بات کہنے کی یقیناً ضرورت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب اور دستاویزات انتہائی محترم، مقدس اور متبرک یادگار سمجھی جاتی تھیں۔ تاریخ نے بھی اس کو محفوظ رکھا ہے اور یہ روایت کئی جگہوں پر بیان ہوئی ہیں کہ فلاں قبیلہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی فلاں دستاویز موجود تھی اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ ابن حزم جن کو حضورؐ نے یمن کے ایک علاقہ کا گورنر بنا کر بھیجا تھا اور ان کو ایک دستاویز بھی لکھ کر دی تھی۔ وہ دستاویز ان کے خاندان میں محفوظ چلی آتی تھی۔ ان کے خاندان کے لوگ نسلاً بعد نسلٍ نہ صرف اس کی حفاظت کرتے تھے بلکہ اس کو زبانی یاد رکھتے تھے اور لوگوں کو زیارت کے لئے بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ ابن حزم نے اکیس مکاتیب پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر رکھی تھی جو ان کو بہت عزیز تھی۔ یہ کتاب انہوں نے زبانی یاد کر لی تھی۔

مکتوبات نبوی اور وثائق نبوی کی روایت کرنے والے اور جمع کرنے والے کئی حضرات اور بھی ہیں۔ مشہور مؤرخ علامہ علی بن محمد المدائنی نے بھی رسائل النبی کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اردو زبان میں بھی مکتوبات نبوی کے کئی مجموعے موجود ہیں۔ خود ابوجعفر دیبلی کی کتاب کا ترجمہ ہمارے دوست اور میرے ہم سبق ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی نے کیا ہے جو کراچی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے پروفیسر ہیں۔ یہ ترجمہ چھپا ہوا موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرتب کردہ الوثائق السیاسیۃ کا اردو ترجمہ 'سیاسی وثیقہ جات' کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ ایک اور کتاب ہندوستان کے ایک عالم مولانا سید محبوب رضوی نے 'مکتوبات نبوی' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ بھی لاہور، کراچی اور دہلی سے کئی بار چھپی ہے۔ اس میں 94 مکتوبات اور وثائق شامل ہیں۔ ان میں سے بہت مکتوبات اور وثائق کا پس منظر بھی دیا گیا ہے۔ اکثر و بیشتر وثائق ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

جب وثائق اور دستاویزات کی بات آتی ہے تو ان کے لکھنے اور لکھوانے والوں کی بات بھی آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے کاتبین کی اور وثائق نویسوں اور دستاویزات تحریر کرنے والوں

کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ مکہ مکرمہ میں بھی موجود تھی۔ مکہ مکرمہ میں یہ حضرات عموماً وحی کی کتابت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور کاتبان وحی کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد کاتبان دو قسم کے ہو گئے۔ ایک کاتبان وحی تھے۔ یہ نسبتاً سینئر حضرات تھے۔ دوسرے حضرات نسبتاً کمسن اور نوجوان تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جو عام دستاویزات کے کاتبین تھے۔ کچھ وہ حضرات تھے جو دونوں کی کتابت میں بلائے جاتے تھے۔ ان سب کی تعداد مجموعی طور پر چالیس پچاس سے لے کر ستر اسّی کے درمیان تھی۔ بعض حضرات نے ان خوش نصیب لوگوں پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے حالات الگ سے جمع کئے ہیں۔ یہ بھی سیرت کا حصہ ہے۔

کاتبان وحی کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سیّدنا عثمان بن عفان اور سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان میں بہت نمایاں رہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ جب کوئی نئی وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے ان دونوں کو بلاتے تھے۔ اگر یہ دونوں دستیاب نہ ہوں تو پھر حضرت ابیؓ بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا جاتا تھا۔ زید بن ثابت مدینہ منورہ کے کُتابِ وحی میں بھی اور دستاویزات لکھنے والوں میں بھی سب سے نمایاں تھے اور رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین لوگوں میں تھے۔

جن حضرات نے کاتبین دربار رسالت کے بارے میں معلومات جمع کر کے کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک بزرگ علامہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن علی ابن حدیدہ الانصاری تھے۔ ان کی کتاب **المصباح المضئ فی کُتّاب النبی الاُمّی ورسله الٰی ملوک الاض من عربی و عجمی** ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر کاتبان دربار رسالت کے بارے میں معلومات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں کاتبان وحی اور وثیقہ نویس صحابہ کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں دربار رسالت کے سفراء کا ذکر ہے۔ ایک اور مورخ عمر بن شبہ تھے جن کی تاریخی روایات سے بہت سے قدیم مورخین، بالخصوص امام ابن جریر طبری نے بہت استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی کاتبان وحی پر ایک الگ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے حوالے قدیم مورخین اور سیرت نگاروں کے یہاں تفصیل سے ملتے ہیں۔ ایک اور بزرگ محمد بن سلامہ القضاعی تھے۔ انہوں نے بھی کاتبان وحی پر اور کاتبان دربار رسالت پر کتاب

لکھی تھی۔

ان موضوعات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے متعلق اور آپؐ کے اپنے شخصی معاملات کے بارے میں جتنی معلومات جمع ہوسکتی تھی وہ تابعین نے صحابہ کرام سے حاصل کر کے جمع کیں۔ بعض ایسی چیزوں کے بارے میں بھی معلومات جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا جن کی شاید سیرت یا سیرت کے پیغام کو سمجھنے میں اتنی اہمیت نہ ہو۔ ان میں سے دو مثالیں میں عرض کرتا ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نعلین مبارک کے بارہ میں معلومات بھی سیرت نگاروں کی دلچسپی کا موضوع رہی ہیں۔ حضور ﷺ جوتا پہنتے تھے۔ ہر شخص جوتا پہنتا ہے۔ لباس پہنتا ہے۔ لیکن حضور ﷺ کا نعل مبارک کس طرح کا ہوتا تھا۔ اس کی شکل کیسی ہوتی تھی۔ یہ بھی سیرت نگاروں کی دلچسپی کا مضمون بنا۔ ایک مشہور سیرت نگار نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے نعلین مبارک پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ ان میں سے چند ایک کے نام میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ایک بزرگ محمد بن عیسی المقری کی کتاب 'قرۃ العینین فی تحقیق امر النعلین' ہے۔ ایک اور بزرگ تھے وہ بھی مقری تھے، ابوالعباس المقری التلمسانی، یعنی مراکش کے شہر تلمسان کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب ہے 'النفحات العنبریۃ فی وصف نعلی خیر البریۃ'۔ یہ کتاب بظاہر مفصل اور طویل ہوگی۔ عربی زبان میں اس کی کئی تلخیصیں تیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک تلخیص ہمارے برصغیر کے ایک بزرگ علامہ رضی الدین ابوالخیر عبدالمجید الہندی نے تیار کی۔ اس کے بارے میں ایک صاحب نے بیان کیا ہے کہ یہ تلخیص ہندوستان میں تیار کی گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ پڑھا ہے۔ ایک اور تلخیص 'فتح المتعال فی مدح خیر النعال' کے نام سے تیار کی ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ تلخیص انہوں نے روضہ اقدس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کی جانب بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس لئے کہ نعلین مبارک کے بارے میں لکھنا تھا۔ تو قدم کی سمت میں بیٹھ کر انہوں نے یہ تلخیص تیار کرنا مناسب سمجھا۔ اردو زبان میں بھی ایک چھوٹا سا رسالہ مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ہے جس میں نعلین مبارک کا وصف اور شبیہ بھی دی گئی تھی اور کچھ اور تفصیل بھی بیان کی گئی تھی۔

طب نبوی

رسول اللہ ﷺ اللہ کے نبی اور ترجمان تھے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا حضورؐ کی اصل ذمہ داری تھی۔ ہدایت ربانی اور وحی الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً ایسے بہت سے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا جو براہ راست رسالت اور نبوت کے فریضے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن آپ نے ایک بزرگ اور روحانی باپ کی حیثیت سے لوگوں پر شفقت اور مہربانی فرمائی اور ان امور کے بارہ میں رہنمائی عطا فرمانا پسند فرمایا۔ جو براہ راست آپ کے پیغمبرانہ فرائض میں شامل نہ تھے۔ ان میں سے ایک چیز طب نبوی بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ ظاہر ہے کہ طبیب یا حکیم تو نہیں تھے۔ وہ ارواح اور قلوب کا علاج کرنے آئے تھے ابدان کا علاج کرنے نہیں آئے تھے۔ آپ علیہ السلام طبیب ابدان واجسام نہیں، طبیب ارواح وقلوب اور طبیب نفوس تھے۔ لیکن طب ابدان کے بارے میں بھی آپ نے وقتاً فوقتاً اظہار خیال فرمایا۔ آپؐ کے زمانہ میں عرب میں جو طبی تجربات تھے آپ ان سے خوب واقف تھے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کی رہنمائی میں آپؐ نے حفظان صحت کے اصول بیان فرمائے۔ طاعون اور وباؤں کے بارہ میں ہدایات عطاء فرمائیں۔

طب نبوی کے موضوع پر فقہیات سیرت کے باب میں ذرا تفصیل سے بات ہوگی کہ طب کے بارے میں حضور کے ارشادات کی فقہی حیثیت کیا ہے اور ایک مسلمان کا رویہ ان کے بارے میں کیا ہونا چاہئے۔ جن سیرت نگاروں نے طب نبوی کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ انہوں نے عقیدت کے جذبہ سے یہ کام کیا اور صرف عربی زبان میں اس پر کم از کم پچیس کتابیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے سیرت کی ایک کتابیات تیار کی ہے۔ اس میں طب نبوی پر عربی زبان کی پچیس کتب کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو زبان کا دامن بھی اس موضوع سے خالی نہیں۔ ہمارے وطن پاکستان کے ایک ماہر طب ڈاکٹر خالد غزنوی نے 'طب نبوی اور جدید سائنس' کے نام سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ بھی سیرت کا ایک جزدی حصہ کہلائی جاسکتی ہے۔ سیرت کے عمومی دائرے سے اس کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

لوک سیرت

جہاں سیرت پر تحقیقی اور عالمانہ کام ہوئے وہاں سیرت پر عوامی انداز میں بھی کام ہوئے۔ اگر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم اس کو 'لوک سیرت' بھی کہہ سکتے ہیں۔ لوک سیرت پر مسلمان اہل قلم قدیم زمانے سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس کو سیرت کے بنیادی حقائق سے واقف کرایا جائے اور سیرت پر ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے تیار کرائے جائیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت، آپ کی فضیلت اور بزرگی لوگوں کے سامنے آجائے۔ لوک سیرت کا ایک بڑا اہم نمونہ میلاد نامے اور موالید بھی ہیں۔ میلاد نامہ اگر چہ نام کے اعتبار سے صرف میلاد نامہ ہے لیکن اس میں صرف ولادت رسول کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ ولادت مبارکہ کے ساتھ حضور کے معجزات اور حضور کی ولادت سے پہلے ہونے والی بشارتیں، جس کو صوفیاء کی زبان میں ارہاصات کہتے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ ارہاص سے مراد کسی عظیم روحانی شخصیت کی ولادت سے پہلے بعض ایسے شواہد جو اہل روحانیت اور اہل کشف کے سامنے آنے لگیں، ان چیزوں کو ارہاص کہتے ہیں۔ پھر حضورؐ کے بچپن، رضاعت اور ابتدائی تربیت کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔ یہ کتب موالید کب سے لکھی جانی شروع ہوئیں؟ اس کے بارے میں تعین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ لیکن پانچویں صدی ہجری سے موالید پر کتابیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس وقت سے آج تک تقریباً تمام اسلامی زبانوں میں میلاد نامے لکھے جارہے ہیں۔

تعلیمات سیرت

سیرت کا ایک اہم شعبہ تعلیمات سیرت بھی ہے۔ تعلیمات سیرت سے مراد سیرت سے متعلق وہ معلومات یا وہ شعبے ہیں جن کا تعلق علم کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم سے ہے۔ تعلیم اور تعلیمات سے متعلق سیرت میں جو مواد ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو براہ راست شریعت کا حصہ ہے۔ یوں تو سیرت مبارکہ ساری کی ساری شریعت ہے، لیکن سیرت پاک کا ایک تو وہ حصہ ہے جو قرآن پاک اور احادیث میں آیا ہے۔ اس کو ہم

اسلام کا تصور علم اور تصور تعلیم یا تعلیم کے بارے میں اسلام کے احکام کہہ سکتے ہیں۔ یہ براہ راست اور بلا واسطہ تو صرف شریعت کا حصہ ہے سیرت کا نہیں، لیکن بالواسطہ طور پر یہ سیرت کا بھی حصہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ براہ راست سیرت کا حصہ نہیں، بلکہ براہ راست علم حدیث کا حصہ ہے۔

دوسری چیز جو سیرت اور احادیث دونوں کا حصہ ہے، وہ معلم کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کا اپنا کردار ہے۔ آپؐ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ 'انما بعث معلماً' میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ نے معلم کائنات اور معلم انسانیت کی حیثیت سے اس فریضے کو کس طرح انجام دیا۔ اس کے بارے میں اہل علم نے بہت کام کیا ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے ایک محقق استاذ اور ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر فضل الٰہی نے بھی ایک جامع کتاب 'النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام معلماً' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور سعودی عرب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے وہ تمام احادیث اور سیرت کی معلومات جمع کردی ہیں جن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کیفیت تعلیم، اسلوب تعلیم اور طرز تعلیم کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

تعلیمات سیرت کا تیسرا حصہ وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ان انتظامی فیصلوں سے بحث کرتا ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم کے بارے میں کیے۔ تعلیم کی نشر واشاعت کے بارے میں آپؐ نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے قبل مکہ مکرمہ میں کیا کیا؟ پھر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں کیا کیا؟ کیسے تعلیم کو عام کیا؟ کیسے کیسے انتظامات فرمائے؟ کیا اقدامات کیے؟ کس قسم کے ادارے قائم فرمائے؟ یہ سب تفصیلات براہ راست علم سیرت کا حصہ ہیں۔ ان موضوعات پر ریاست مدینہ کی معیشت ومعاشرت کے موضوع پر بحث کے دوران گفتگو ہوگی۔

روحانیات سیرت

سیرت کا ایک اہم میدان روحانیات سیرت ہے۔ اس سے مراد بنیادی طور پر تو تزکیہ نفوس کے سلسلہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دی ہوئی ہدایات ہیں۔ یہ ہدایات شریعت،

حدیث اور سنت کا حصہ ہیں لیکن سیرت کے باب میں بھی ان کا تذکرہ آتا ہے۔ سیرت کے موضوع سے براہ راست تعلق تزکیۂ نفس کے ان اقدامات کا ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمائے۔ لوگوں کی روحانی پاکیزگی اور تربیت کے لئے کیا کچھ کیا۔ لوگوں کے اخلاق کی تربیت کس طرح فرمائی۔ لوگوں کی غلط عادات، غلط رواجات اور غلط رویوں کو کیسے دور فرمایا۔ اس کا مطالعہ روحانیات سیرت کے ضمن میں آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہل علم روحانیات سیرت پر غور کرتے گئے اور ان تفصیلات کو سیرت کی کتابوں میں مدوّن کرتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ تمام روحانی پاکیزگیوں کا سرچشمہ ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے مسلمانوں میں روحانیات کی ہر شمع روشن ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اہل روحانیت نے اس پر خاص توجہ دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعائیں اور مناجاتیں جو روحانیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ان کو لوگوں نے جمع کیا ہے۔ اس پر سینکڑوں کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ آپ کتابیات سیرت وحدیث پر نظر ڈالیں تو وہ مجموعے جو دعاؤں کے بارے میں مختلف صدیوں کے اہل علم اور صاحبان دل نے مرتب کئے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں میں نکلے گی۔ بہرحال یہ موضوع روحانیات سیرت کا ایک بہت اہم باب ہے۔ اس پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں مجموعے تیار کئے گئے ہیں اور ہر دور میں مختلف رجحانات کے لوگ اپنی اپنی پسند کے مجموعے تیار کرتے چلے آرہے ہیں۔

روحانیات سیرت کی اس صنف کا، یعنی ادعیہ نبوی یا مناجات نبوی اور دعوات نبوی پر کام کا آغاز محدثین کرام کے زمانے سے ہی ہوگیا تھا۔ صحابہ کرام نے بہت ساری دعائیں یاد کیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کو دعائیں یاد کروائیں۔ ایک صحابی کو حضور علیہ السلام نے ایک دعا یاد کروائی تھی۔ اس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'ونبیک الذی ارسلت'، جب اگلے دن اُن صحابی سے اس دعا کو سنا تو انہوں نے کہا کہ 'ورسولک الذی ارسلت'، تو آپؐ نے از راہ مذاق اُن صحابی کا کان مروڑا اور کہا کہ کیا میں نے یہی کہا تھا۔ اب صحابی کو اصل الفاظ یاد آئے کہ آپؐ نے 'ونبیک الذی ارسلت' فرمایا تھا۔ بعد میں وہ صحابی جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ حضور ﷺ نے میرا کان مروڑ کر فرمایا تھا کہ کیا میں نے یہی کہا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ آپؐ جو الفاظ سکھاتے تھے، اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ صحابہ کرام کو وہ الفاظ بالکل اسی طرح یاد رہیں اور صحابہ ان کو اسی طرح یاد رکھیں۔

دعاؤں کی نقل و روایت بھی دوسری احادیث کی طرح بالمعنیٰ نہیں بلکہ باللفظ ہوئی ہے۔

روحانیات سیرت کا ایک اہم عنوان تصوف کے وہ سلسلے ہیں جو چند صحابہ کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتے ہیں۔ اس پر لوگوں نے الگ سے کتب لکھیں۔ سلسلہ ہائے تصوف کی انتہاء حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی تک ہونی بیان کی جاتی ہے۔ ہمارے برصغیر میں تصوف کا ایک بڑا سلسلہ سلسلۂ نقشبندیہ حضرت ابوبکر صدیق کے واسطے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتا ہے۔ بقیہ سلسلوں میں کئی بڑے بڑے سلسلے سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے واسطے سے حضور تک پہنچائے جاتے ہیں۔ ایک آدھ سلسلہ اور بھی ہے جو دوسرے صحابہ مثلاً حضرت ابیّ بن کعبؓ یا حضرت ابوذر غفاریؓ کے واسطے سے حضور تک پہنچتا ہے۔ روحانی سلسلوں کی یہ تاریخ اور حضور تک اس کی سند کا معاملہ خود روحانیات سیرت کا ایک بہت اہم میدان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک بڑی ہی لطیف بات فرمائی۔ آپؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانشینی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خلافت ظاہرہ کہلاتی ہے اور دوسری خلافت باطنہ کہلاتی ہے۔ خلافت ظاہرہ تو وہ ہے جہاں ظاہری معاملات اور دنیاوی انتظامات چلانے کے لئے حضور کی جانشینی کا بندوبست کیا گیا۔ یہ جانشینی تو جناب صدیق اکبرؓ کو حاصل ہوئی۔ حضورؐ کے جانشین کے طور پر انہوں نے جنگیں بھی کروائیں۔ فوجیں بھی بھیجیں۔ ریاست سے متعلق بقیہ انتظامات بھی کئے۔ لیکن جو خلافت باطنہ اور حضورؐ کی حقیقی جانشینی اور حقیقی خلافت ہے وہ روحانی تربیت، تزکیہ نفس، دین کی تعلیم اور روحانی پاکیزگی کے کام میں حضور کی جانشینی اور نیابت سے عبارت ہے۔ اس جانشینی میں تمام کبار صحابہ حضورؐ کے بلا واسطہ خلیفہ ہوئے۔ سیدنا صدیق اکبر سمیت تمام اکابر صحابہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بلا واسطہ خلفا ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خلافت باطنہ کی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں تمام صحابہ حضور کے خلیفہ بلافصل ہیں۔ کچھ صحابہ کو خلافت کے زیادہ تقاضے انجام دینے کا موقع ملا۔ کچھ صحابہ کو نسبتاً کم موقع ملا۔

پھر جب اہل علم نے، بالخصوص ارباب تصوف اور اساطین روحانیات نے، اس پر غور شروع کیا تو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کو تصوف کی اصطلاحات میں بیان

کرنا شروع کیا۔ نورِ محمدی، حقیقت محمدیہ، برزخ کبریٰ، یہ تصوف کے بڑے بڑے موضوعات اور میدان ہیں۔ ان پر اکابر صوفیاء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الفِ ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ محی الدین بن عربیؒ، ان سب حضرات نے روحانیات سیرت کو ایک الگ فن بنا دیا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس فن کو عام طور پر اس کو اس لئے بیان نہیں کیا جاتا کہ اکثر سیرت نگار اس فن کے مرد میدان نہیں تھے۔ اس لئے سیرت کی کتابوں میں عموماً اس کا تذکرہ نہیں ہوتا، لیکن سیرت کی بعض کتابوں میں یہ تذکرہ اجمال کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتابوں میں اس بات تذکرہ ہے۔ اسی طرح سے کئی اور سیرت نگاروں نے ان مضامین کو اپنی کتابوں میں اٹھایا ہے۔

روحانیات سیرت کا ایک اہم موضوع یہ بھی تھا کہ روحانیت انبیاء کا تقابلی مشاہدہ کیا جائے۔ بعض سیرت نگاروں نے مختلف انبیا علیہم السلام کی روحانیت اور رسول اللہ ﷺ کی روحانیت کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں عملی تجربہ ہی کی بنیاد پر بات کی جاسکتی ہے، اس نازک موضوع پر محض علم اور روایت کی بنیاد پر بات نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے میں مزید تفصیل میں نہیں جاسکتا کہ روحانیت انبیاء سے ان کی کیا مراد ہے۔ حقیقت موسوی، حقیقت عیسوی اور حقیقت محمدی وغیرہ سے کیا مراد ہے۔ یہ ایک الگ میدان ہے جس پر لوگوں نے ہزارہا صفحات لکھے ہیں۔ خاص طور پر شیخ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اس پورے میدان میں شاید سب سے اعلیٰ ترین کتاب ہے۔

ان تمام مضامین کا خلاصہ اور شیخ محی الدین بن عربی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو کچھ لکھا اس کو علامہ اقبالؒ نے ایک بلیغ انگریزی جملے میں سمو دیا ہے۔ وہ جملہ بیان کر کے میں روحانیات سیرت کا مضمون ختم کرتا ہوں۔ علامہ اقبال نے غالباً یہ ساری کتابیں پڑھی ہوں گی۔ فتوحات مکیہ تو یقیناً پڑھی تھی، شیخ عبدالحق کی کتابیں بھی دیکھی ہوں گی۔ علامہ نے لکھا تھا کہ

All the previous prophets were Muhammad in the making.

ادبیات سیرت

روحانیات سیرت کے بعد ایک اہم مضمون ادبیات سیرت کا ہے۔اس سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات اور مکاتیب کا ادبی اعتبار سے جائزہ ہے۔ادبیات سیرت میں اُس زمانے کے ادباء اور ماہرین ادب نے یہ جائزہ لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا عربی زبان پر، عربی زبان کے اسالیب، ساخت، طریق ادا اور طرز بیان پر کیا اثر پڑا ہے۔خود اس کی خوبیاں کیا ہیں۔فصاحت و بلاغت کے کون کون سے نکتے وہاں سے نکلتے ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عربی زبان کو کون کون سے نئے اسالیب عطا فرمائے۔حضور نے عربی زبان کو کیا کیا رونق بخشی۔ یہ ساری چیزیں ادبیات سیرت کا حصہ کہلا سکتی ہیں۔اس میں قدیم ترین مواد جو ملتا ہے وہ غالباً جاحظ کے ہاں ملتا ہے جس نے 'البیان و التبیین' میں ایک طویل اور مفصل باب رسول اللہ ﷺ کی ادبیات، زباندانی اور فصاحت و بلاغت کے بارے میں وقف کیا ہے۔

ادبیات سیرت میں ہم منظوم سیرت کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔منظوم سیرت کا طریقہ کار بہت شروع سے چلا آرہا ہے۔ ابن ہشام کی منظوم سیرت کا میں آگے چل کر تذکرہ کروں گا۔اس کو کئی لوگوں نے نظم کیا۔ابن ہشام کے مضامین کو عربی نظم میں بیان کیا۔پھر عربی نظم میں جب واقعات کو بیان کرنے کی روایت چل پڑی، تو فارسی نظم میں بھی کئی واقعات بیان کئے گئے۔بعض لوگوں نے اردو زبان میں بھی سیرت کے واقعات کا منظوم بیان کیا۔ ہماری اردو زبان کا دامن بھی اس سے الحمد للہ خالی نہیں ہے۔حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا 'شاہنامہ اسلام' منظوم سیرت ہی کا ایک نمونہ ہے۔

مدائح نبوی

یہ بھی ادبیات سیرت یا منظوم سیرت کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔صحابہ کرام کے زمانے سے ہی مدائح نبوی کا رواج چلا آرہا ہے۔ بلکہ صحابہ کرام کے زمانے سے پہلے سے چلا آرہا ہے۔بعض اشعار جناب عبد المطلب سے بھی منسوب ہیں۔ جب عبد المطلب کا انتقال

ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر آٹھ سال تھی۔ لیکن اس وقت بھی جناب عبدالمطلب نے ایک موقع پر بعض شعر کہے تھے جو سیرت ابن ہشام وغیرہ میں نقل ہیں۔ جناب ابوطالب نے بھی حضور کے بارے میں کچھ شعر کہے تھے جن میں سے ایک شعر بہت مقبول ومشہور ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه

ثمال الیتامی عصمة للارامل

وہ گورا چٹا مکھڑا جس کا نام لے کر بادلوں سے بارش برسانے کی دعا کی جاتی ہے۔ جو یتیموں کا ٹھکانا اور بیواؤں کا سہارا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیقؓ بیمار تھے۔ آپؓ کا بالکل آخری وقت تھا۔ غشی کی کیفیت تھی اور اس کے بعد انتقال ہوگیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور والد کے بستر مرگ پر ہونے کے موقع پر غم کی جو کیفیت ہوتی ہے تو اس کیفیت میں انہوں نے یہ شعر پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوراً آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ یہ شعر حضورؐ کے لئے ہے کسی اور کے لئے نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد پھر غشی کا دورہ طاری ہوگیا۔

جناب ابوطالب کا کہا ہوا یہ شعر اُس وقت سے ہی صحابہ کرام میں بہت مشہور تھا۔ اس وقت سے آج تک ہر شاعر اور ہر ادیب اپنی مقدور اور بساط کے مطابق منظوم خراج عقیدت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارک کو پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ فارسی اور اردو زبان کا دامن اس بارے میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اس میں اگر کوئی لسانی عصبیت کارفرما نہ سمجھی جائے تو میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اردو اور فارسی کا دامن نعتیہ کلام اور منظوم سیرت کے معاملہ میں عربی سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

اجتماعیات سیرت

اس سے مراد یہ ہے کہ سیرت نبوی کا مطالعہ اجتماعیات کے نقطہ نظر سے کیا جائے۔ اس کو ہم سیرت نبوی کا اجتماعی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ اس کو sociology of Sirah بھی کہا جا سکتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ سیرت پاک کے مواد کا مطالعہ اس نئے انداز سے کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ کے بہت سے اقدامات اور فیصلوں کا اجتماعی پس منظر کیا تھا۔ اس زمانے کا سوشیالوجیکل پس منظر کیا تھا۔ کس ماحول اور کس پس منظر میں حضور یہ کام کر رہے تھے۔ یہ پس منظر بہت سی چیزوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مدینہ منورہ میں اجتماعیت کس رنگ کی تھی۔ خاندان اور قبائل کون کونسے آباد تھے۔ ان کے آپس میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ مدینہ کی زندگی اور معاشرت کیا تھی۔ مکہ کی شہری ریاست کیا تھی۔ مختلف قبائل میں آپس کا تعلق اور لین دین کس انداز کا تھا۔ یہ سیرت کا ایک پہلو ہے اور اتنا اہم پہلو ہے کہ اس کو سمجھے بغیر سیرت کے بہت سے معاملات کو سمجھنا بہت دشوار ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی بات ضمناً عرض کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی نجاشی کے دربار میں کوئی خط بھیجا تو حضرت عمرو بن امیہ الضمری ؓ کے ہاتھ بھیجا۔ ان کے بارے میں یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جب حضورؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو پہلی بار نجاشی کے دربار میں بھیجا تو اُس وقت تک وہ اسلام نہیں لائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا تعلق اور دوستی قبول اسلام سے پہلے سے تھی۔ بعد میں کئی مواقع پر وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نامہ مبارک لے کر نجاشی کے دربار میں گئے۔

عام طور پر محدثین اور سیرت نگاروں نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ عمرو بن امیہ کو خاص طور پر اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا جاتا رہا۔ کسی نے نہیں سوچا کہ اس انتخاب کی بھی کوئی خاص وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بعد میں اہل علم نے اس پر غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ نجاشی جو رسول اللہ ﷺ کا ہم عصر تھا۔ جب وہ اپنے باپ کا جانشین بنا اور اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ خاصا کم سن تھا۔ اس کے کسی اور عزیز نے، جو رشتہ میں اس کا چچا ہوتا تھا، سازش کر کے اس کو اقتدار سے محروم کر دیا اور اس کے قتل کے درپے ہو گیا۔ نجاشی جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور بنی ضمرہ میں اپنے کسی دوست کے یہاں آکر پناہ لے لی۔ اس کا بچپن وہیں گزرا۔ عمرو بن امیہ الضمری بھی اسی سردار کے بیٹے تھے جس کے ہاں کم سن نجاشی نے پناہ لی تھی اور وہ اسی نجاشی کے ہم عمر تھے اور بچپن میں نجاشی کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دونوں دوست مل کر شکار کے لئے جایا کرتے تھے اور کافی عرصہ یعنی اندازاً دس بارہ سال تک ایک ساتھ رہے۔ پھر مصر کے حالات بدلے۔ غاصب حاکم کو مصر کے لوگوں نے نکال دیا اور اصل وارث کو بلا کر دوبارہ تخت نشین کرایا۔ اب

رسول اللہ ﷺ کا عمرو بن امیہ کو نجاشی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجنا سمجھ میں آتا ہے کہ پیش نظر کیا تھا اور اس میں کیا حکمت تھی۔ اس طرح کی بہت سی حکمتیں اجتماعیات سیرت کے مطالعہ سے سامنے آجاتی ہیں۔

اجتماعیات سیرت کے ضمن میں ضروری ہے کہ عرب کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ عرب کے بازاروں اور تجارتی میلوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ عرب کے میلوں اور بازاروں کے رواج کو جانے بغیر آپؐ کی بہت سی اصلاحات کی معنویت کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔ اسی طرح قبائلی سیاست اور قبائلی تعصب کی تفصیلات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔

نفسیات سیرت

قدیم مفسرین، سیرت نگار اور محدثین اس فن میں زیادہ اور براہ راست تو دلچسپی نہیں رکھتے تھے، لیکن انہوں نے بعض ایسے اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بات ارشاد فرمائی اس کے پیچھے حکمت کیا تھی۔ مخاطبین کے ذہن میں کیا خیالات اور تصورات تھے جن کی وجہ سے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ پھر تبلیغ اور دعوت میں مخاطب کے ذہن اور مزاج کو ذہن میں رکھنے کی خاطر حضور نے کیا کیا چیزیں پیش نظر رکھیں۔ کن باتوں کا حضور نے خیال رکھا۔

اس ضمن میں تدریج ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو احکام دیئے وہ تدریج کے ساتھ دیئے۔ اگر پہلے دن یہ کہا جاتا کہ فلاں کام نہ کرو، اور فلاں فلاں کام بھی نہ کرو تو شاید لوگ اس پر اتنی آسانی سے تیار نہ ہوتے۔ پرانی عادتوں اور رواجات کو اچانک تبدیل کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اور تدریج کے ساتھ آنے والی تبدیلی زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور زیادہ گہری بھی ہوتی ہے۔ یہ خود نفسیات کا ایک نکتہ ہے کہ لوگوں کے مزاج، لوگوں کی عادات اور خصائل کو اچانک تبدیل کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ماضی سے یکدم اور قطعیت کے ساتھ قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ بیشتر لوگ ماضی سے اچانک لاتعلق نہیں ہو پاتے۔

بعض اوقات ماضی کی کسی چیز کے ساتھ اتنی گہری وابستگی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کو چھوڑنے پر تیار بھی ہو تو تب بھی اس کا امکان موجود رہتا کہ اس کو پورے طور پر نہ چھوڑا جا سکے۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی یادیں وابستہ ہوتی ہیں کہ یہ خطرہ بدستور موجود ہوتا ہے کہ پھر وہ چیز لوگوں میں دوبارہ آ جائے۔ مثال کے طور پر شراب نوشی عربوں میں بہت عام تھی۔ ہر عرب شراب نوشی پر بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ عرب شاعری اس سے بھری پڑی ہے اور اس کو کوئی بری بات نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا تو تدریج کے ساتھ حرام قرار دیا۔ تدریج سے تو ہم سب واقف ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک مرحلہ ایسا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسی چیزوں کی بھی ممانعت فرما دی جو دراصل اسلام میں حرام نہیں تھیں، لیکن ان کے ساتھ شراب کی یاد وابستہ تھی۔ عرب میں شراب بنانے کے مختلف طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ بڑا سا کدو لے کر اس کو خشک کر دیتے تھے۔ اس میں پھر کھجور یا انگور کا رس بھر کر لٹکا دیا جاتا تھا۔ وہ رات کو ہوا لگتے رہنے سے ٹھنڈا بھی ہو جاتا تھا، خمیر بھی پیدا ہو جاتا تھا اور اس طرح شراب بھی بن جاتی تھی۔ کدو میں شراب محفوظ بھی رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ فارسی میں کدو کا لفظ شراب کے برتن کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے:

خانقاہوں میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

تو کدو وہی چیز ہے جس میں شراب رکھی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ سے صحیح بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے کہ ایک قبیلہ جو شراب نوشی میں بڑا نمایاں تھا۔ اس کو آپؐ نے بعض خاص ہدایات بھی دیں۔ باقی کسی قبیلہ کے بارے میں حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا۔ صرف اس خاص قبیلے کے لئے فرمایا کہ میں تمہیں فلاں فلاں باتوں کا حکم دیتا ہوں، فلاں فلاں چیزوں سے روکتا ہوں 'وانھاکم عن الحنتم والنقیر والمزفت والدباء'۔ یعنی آپؐ نے اس قبیلہ کو ان چار قسم کے برتنوں سے منع کیا۔ یہ چاروں برتن یا چیزیں وہی تھیں جو شراب بنانے میں کام آتی ہیں۔ اس کے بعد جب شراب کی عادت ختم ہو گئی اور عرب سے یہ رواج ختم ہو گیا پھر اس ممانعت کی بھی ضرورت نہیں رہی اور یہ ممانعت ختم کر دی گئی۔ صحیح بخاری کی کتاب الاشربہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ اب یہ حرمت ختم ہو گئی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے مخالفین کی مخالفت کی شدت کو کم کرنے کے لئے ان کے مزاج اور نفسیات کا لحاظ رکھا اور ایسے اقدامات فرمائے کہ مخالفین کی مخالفت کی شدت میں کمی آجائے۔ ابوسفیانؓ کی صاحبزادی سے حضور نے شادی کرلی اور اس کے بعد ابوسفیان کبھی بھی حضور کے مقابلے میں نہیں آئے۔ پھر حضور نے جوارشاد فرمایا تھا کہ 'من دخل دار ابی سفیان فھو آمن'، جوکوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا وہ بھی امن سے ہوگا۔ یہ بھی ایک ایسی چیز تھی کہ مکہ کے سردار کے گھر کو امن کا گھر قرار دینے سے عام لوگ بہت گہرا اثر لیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں اور دعوت اسلامی کے لئے ناگزیر تھا کہ ایسا کیا جائے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کسی فیصلہ یا اقدام سے خطرہ ہوتا تھا کہ اس کا ردعمل نامناسب یا غیر مفید ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے بڑے تحمل کے ساتھ لوگوں کے مزاج کے مطابق فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہورہے تھے تو آپ کا پروگرام مکہ مکرمہ کو پرامن طور قبضہ میں لینا تھا اور فوجی کاروائی کرنا مقصد نہیں تھا۔ آپ نے واضح طور پر ہدایت دی تھی کہ جب تک کفار مکہ کی طرف سے مزاحمت نہ ہو تلوار نہ اٹھائی جائی۔ ایک موقع پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے تلوار اٹھائی تو حضور نے اس کے بارے میں سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ جب مسلمان مکہ میں داخل ہورہے تھے اور قبضہ کا عمل مکمل نہیں ہوا تھا تو قبیلہ خزرج کے سردار اور اسلامی فوج کے ایک اہم دستہ کے سربراہ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے، جو انصاری صحابہ میں بہت ہی ممتاز مقام کے حامل تھے۔ وہ اتنے بڑے سردار اور اتنے بڑے انسان تھے کہ انصار نے خلافت نبوت کے لئے ان کا نام پیش کیا تھا۔

انہوں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت کسی موقع پر زور بیان میں کہہ دیا کہ 'الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الحرمة'، یعنی آج کا دن جنگ کا دن ہے اور آج ساری حرمتیں ختم ہوجائیں گی اور ہر قسم کی حرمت کو حلال قرار دیا جائے گا۔ اب خطرہ تھا کہ اگر اسلامی فوج کے کچھ لوگ اس جنگی جذبہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں اور ہتھیار استعمال کریں تو پتہ نہیں کہ کیا صورت حال پیدا ہو۔ کسی نے حضور کو اطلاع دی کہ سعد بن عبادہؓ یہ کہہ رہے ہیں۔ اب سعد بن

عبادہ کو اس موقع پر کمان سے سبکدوش کرنا حکمت عملی کے خلاف تھا۔ کیونکہ عین میدان جنگ میں کمان کو تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔ پھر سعد بن عبادہ جیسے بڑے آدمی کو، جو مزاجاً بھی کچھ حساس تھے اور طبیعت کے بھی ذرا تیز تھے، ان کو ہٹانا مناسب نہیں تھا۔ لیکن ان کو ہٹائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس صورت حال میں آپؐ نے فرمایا کہ سعد بن عبادہ سے علم لے کر ان کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دو۔ ظاہر ہے کوئی باپ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانے پر کیسے ناراض ہوسکتا ہے۔ کوئی قبیلہ اس پر اعتراض نہیں کرسکتا تھا، کہ ان کے سردار کے بیٹے ہی کے ہاتھ میں کمان دی گئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی لطیف اقدام تھا۔ اس سے مقصد بھی حاصل ہوگیا اور کسی منفی ردعمل کے امکانات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کو یہ خدشہ ہوتا تھا کہ کسی صحابی یا کسی اور کے دل میں کسی طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو۔ ایک چھوٹے سے واقعہ کی مثال دیتا ہوں۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں اعتکاف فرماتے تھے۔ اعتکاف کے دوران ازواج سے تعلق یا میل جول اعتکاف کے قواعد کے خلاف ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہ کسی غرض سے - کھانا دینے یا کوئی کپڑا دینے کے لئے - حضور کے پاس مسجد نبوی میں آئیں۔ اب عشاء کے بعد رات کا وقت تھا۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو حضور مسجد کے دروازے میں کھڑے ہوگئے تاکہ وہ بے خوف جاسکیں اور تنہائی کی وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ ابھی وہ مسجد سے نکلی نہیں تھیں کہ دو انصاری صحابہ کرام مسجد کی گلی کے نکڑ سے گزر رہے تھے۔ وہ حضور کو رات کے اندھیرے میں اس طرح دیکھ کر ٹھٹکے۔ آپؐ نے دونوں کو آواز دی کہ ادھر آؤ۔ وہ دونوں آگئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'انما هي صفية بنت حيي '، یہ صفیہ بنت حیی ہیں، یعنی کوئی غیر خاتون نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ ہمارے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوسکتی۔ آپؐ نے فرمایا 'لا ان الشيطان يجري من الانسان مجرى الدم ' شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے دل میں یہ بدگمانی ڈال دیتا کہ رات کے وقت یہ کون خاتون ہے جو اعتکاف کے موقع پر تنہا میرے پاس آئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ وضاحت ضروری سمجھی۔ اس سے پتہ چلا کہ انسانی نفس میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور خیالات پیدا ہوسکتے

ہیں۔ان کو دور کرنا اور سمجھنا بہت ضروری ہے۔

دلائل نبوت

نفسیات سیرت کے بعد کچھ اور ضمنی موضوعات ہیں جو ارباب سیرت نے بیان کئے ہیں۔ان میں سے ایک اہم موضوع دلائل نبوت ہے۔یہ دراصل علم کلام کا مضمون ہے،لیکن اس کا سیرت سے بھی گہرا تعلق ہے۔یوں یہ موضوع کلام اور سیرت دونوں کی گویا سرحد پر واقع ہے۔ان میں کچھ حصہ کلامیات کا ہے اور کچھ حصہ سیرت کا ہے۔دلائل نبوت کے ضمن میں معجزات کا بیان بھی بہت تفصیل سے کیا جاتا ہے۔کچھ حضرات نے جب سیرت پر کتابیں لکھیں تو دلائل نبوت پر الگ ابواب بنائے۔ان ابواب میں معجزات اور معجزات کے بہت سے پہلوؤں کا ذکر کیا جس سے معجزہ کی مزید وضاحت اور حضورؐ کی نبوت کی مزید تائید ہوتی تھی۔پھر اس شعبہ میں بتدریج بعض کلامی اور علمی مباحث بھی شامل ہوتے گئے،مثلاً یہ بحث کہ معجزہ کیا ہے،نبوت کیا ہے،وحی کیا ہے اور وحی اور دوسرے ذرائع علم میں فرق کیا ہے۔یہ وہ بحثیں ہیں جو دلائل نبوت کہلاتی ہیں۔دلائل نبوت پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔دلائل نبوت کے موضوع پر ایک سیرت نگار نے عربی زبان کی تیس کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس موضوع پر فارسی میں بھی کتابیں ہیں۔اردو کا دامن بھی خالی نہیں ہے۔وہ اس کے علاوہ ہے۔

جغرافیہ سیرت

دلائل نبوت کے بعد ایک اہم موضوع جغرافیہ سیرت کا ہے۔جس جغرافیائی ماحول میں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور جہاں یہ سارا کام ہو رہا تھا۔وہ علاقہ کیا تھا۔اس کا جغرافیہ کیا تھا۔اس میں شہر کون سے تھے۔ان موضوعات پر بہت سے حضرات نے کتابیں لکھیں۔عربی زبان میں اس موضوع پر کم از کم ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔اردو میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب 'ارض القرآن' ہے جو ابھی تک اردو زبان میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی منفرد اور بہترین کتاب ہے۔کتاب کے مستند ہونے کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی کا نام ہی کافی ہے۔افسوس کہ ہماری نئی نسل کو ماضی قریب کے بزرگوں سے بھی واقفیت نہیں

ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی پاکستان میں اسلامی قوانین و شریعت کے نفاذ کے لئے قائم ہونے والے سب سے پہلے ریاستی ادارہ کے سب سے پہلے سربراہ تھے۔ یہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب اور موجود سربراہ جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب موجود ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی صاحب ان دونوں حضرات کے پیش رو تھے، کیونکہ وہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے پہلے سربراہ تھے اور تعلیمات اسلامیہ بورڈ بھی اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا جس کے لئے آج کل اسلامی نظریاتی کونسل کام کر رہی ہے۔

جغرافیہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے دائل میں ابن حائک ہمدانی نے 'صفۃ جزیرۃ العرب' کے نام سے لکھی۔ یہ 1819ء میں لائیڈن میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں عرب کا علاقہ، جغرافیہ، اقوام، قبائل، راستے، پہاڑ، تالاب، ان سب چیزوں کا بیان ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر ان علاقوں کا بیان بڑا اہم ہے جہاں کوئی غزوہ ہوا یا کوئی خاص واقعہ پیش آیا۔ یا رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص قبیلہ کے ساتھ کوئی معاملہ فرمایا اور اُس قبیلہ کو ایسی کوئی خاص مراعات عطا فرمائیں جو اوروں کو نہیں دی گئیں۔ ایسے قبائل کا جغرافیہ خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو یہ مراعات کیوں دی گئیں اور باقیوں کو کیوں نہیں دی گئیں۔ جغرافیہ سیرت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض قبائل کو عطا کی جانے والی مراعات کا علاقائی اور مقامی پس منظر کیا تھا۔

ایک اور اہم کتاب **'معجم ما استعجم'** ہے جو پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔ یہ ادب کی کتاب بھی ہے اور لغت کی کتاب بھی ہے، لیکن بنیادی طور پر جغرافیۂ سیرت اور جغرافیہ قرآن پر ہے۔ عرب کا جغرافیہ جس حد تک مصنف کے علم میں آیا انہوں نے بیان کیا۔ بقیہ کتابوں کی تفصیل میں چھوڑ دیتا ہوں۔ کوئی آٹھ دس کتابیں ہیں جو عام طور پر دستیاب ہیں اور ان میں عرب کا جغرافیہ، صوبوں، دیہاتوں اور معدنیات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ ان کتابوں میں قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

۱۔　ابن فقیہ الھمدانی (ف ۲۹۰ھ)

کتاب البلدان، مکہ، طائف، مدینہ، یمامہ اور یمن کا ذکر ہے۔

۲۔　الاصطخری (ف ۳۴۰ھ)

المسالک والممالک۔ دنیا کے جغرافیہ کے بارے میں ہے۔ عرب کے بارہ میں بھی ضروری اور اہم معلومات دی ہیں۔

۳۔ ابن حوقل (۳۶۲ھ)

کتاب المسالک والممالک۔ باب اول عرب کا جغرافیہ تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

۴۔ بشاری (۳۷۵ھ)

احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ عرب کے صوبوں، دیہاتوں، معدنیات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

۵۔ ابوالفداء:

تقویم البلدان۔ عرب کی ۴۲ آبادیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ایک بہت عمدہ کتاب، جو قدیم ترین تو نہیں ہے لیکن جامع ترین کتاب ضرور ہے وہ یاقوت حموی کی لکھی ہوئی 'معجم البلدان' ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ بھی لکھی ہے۔ جتنے بھی بعد کے لکھنے والے ہیں انہوں نے یاقوت کی کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ یاقوت کے سامنے ساری قدیم کتابیں موجود تھیں۔ اس لئے ان کی اس کتاب میں ساری معلومات یکجا ہوگئی ہیں۔ یاقوت کے بعد کی کتابوں میں ازرقی کی اخبار مکہ بھی ہے جس میں مکہ کے جغرافیہ کا تذکرہ ہے۔ سمہودی کی وفاء الوفاء ہے جس میں مدینہ منورہ کا جغرافیہ ہے۔ ہمارے پاکستان کے ایک محقق مولانا عبدالغنی الیاس نے بیوت النبی، مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کے جغرافیہ اور محل وقوع پر دو تین کتابیں لکھی ہیں، یہ اس موضوع پر تازہ ترین تحریر ہے۔ جغرافیہ سیرت کے ضمن میں گزشتہ صدی کے ایک اہم محقق کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ برادر ملک سعودی عرب کے شیخ حمد الجاسر تھے جن کا رسالہ العرب اس قسم کی تحقیقات کے لئے وقف تھا۔

یہ تو جغرافیہ پر سیرت کے بارے میں وہ معلومات تھیں جو واقعاتی نوعیت کی ہیں کہ فی الواقع سیرت کا جغرافیہ کیا تھا۔ لیکن جغرافیہ کی بنیاد پر واقعات سیرت کا مطالعہ، جس کو آج کل Geo-politics کہتے ہیں۔ یہ بھی ارباب سیرت کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا اور انہوں نے سیرت کے مختلف واقعات کے جغرافیائی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر

مشہور مصنف اور فقیہ امام سرخسی نے ایک جگہ بڑا لطیف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر میں باہم کیا تعلق ہے۔ انہوں نے دونوں کے جغرافیہ کو سامنے رکھ کر بیان کیا ہے کہ اس وقت مدینہ منورہ دو دشمنوں کے درمیان واقع تھا، دونوں سے کھلی کھلی جنگ تھی، اور دونوں کے ساتھ ایک شدید فوجی معرکہ درپیش تھا۔ جنوب کی سمت میں قریش مکہ تھے اور شمال کی سمت میں یہود تھے۔ دونوں کا آپس میں مسلمانوں کے خلاف گہرا تعلق اور معاہدہ تھا اور دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ جب احزاب کی جنگ ہوئی تو یہودیوں نے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا۔ ان کو فنڈز بھی دیئے اور وسائل بھی دیئے۔ بعد میں بھی دونوں کے درمیان روابط رہے جن سے سیرت نگار اور طلبائے سیرت واقف ہیں۔ ان دونوں طاقتور اور بااثر دشمنوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا مدینہ منورہ کے لئے آسان نہ تھا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ان میں سے ایک دشمن کو غیر جانبدار کر دیا جائے۔

صلح حدیبیہ کی بظاہر نامناسب شرائط کا مقصد یہ تھا کہ قریش غیر جانبدار ہو جائیں اور کسی بیرونی دشمن سے جنگ صورت میں اُس دشمن کا ساتھ نہ دیں۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو باقی جو بھی شرائط وہ رکھنا چاہیں وہ رکھ دیں۔ اسی لئے معاہدہ میں درج بہت سی شرائط صحابہ کرام کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ یہاں تک حضرت عمر فاروقؓ نے کہا 'لماذا نعطی الدنیة فی دیننا' ہم دین کے بارے میں نرمی اور بزدلی کیوں دکھائیں۔ اب یہ بات غالباً حضور اکرمؐ ہر کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بس یہی فرمایا کہ نہیں، اسی میں کامیابی ہے۔ جب سورۃ فتح نازل ہوئی تو حضور اکرمؐ نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو بلایا اور کہا کہ یہ سورۃ فتح نازل ہوئی ہے سنو۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا یہ فتح مبین ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا 'ای واللہ' خدا کی قسم یہ فتح مبین ہے۔ بعد میں حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جب اس معاہدہ کی حکمتیں سامنے آنے لگیں تو مجھے تب اندازہ ہوا کہ کتنی یہ بڑی فتح مبین ہے۔

خود قریش اور حضورؐ کے تعلقات کے حوالے سے قرآن مجید نے 'رحلة الشتاء والصیف' کا ذکر کیا ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بھی عرب کا جغرافیہ سمجھنا ضروری ہے۔ یہ وہ بنیادی مضامین ہیں جو سیرت نگاروں نے گزشتہ چودہ سو سالوں میں وقفہ وقفہ سے بیان کیے ہیں۔ میں نے صرف اہم چیزیں بیان کی ہیں اور جزوی تفاصیل چھوڑ دی ہیں۔ وہ

آئندہ دس دنوں کی گفتگوؤں میں ضمناً آجائیں گی۔

مصادر سیرت

سیرت نگاروں نے جب سیرت کا علم مرتب کرنا چاہا تو سب سے پہلے کن مصادر کو سامنے رکھا۔ ان مصادر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے، تاکہ مستند اور غیر مستند وقائع ومعلومات کا فیصلہ کیا جاسکے۔ یوں تو مصادر علم سیرت کے معاملہ کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ہے، لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے اس مسئلہ نے مزید اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اس لئے کہ مغربی مستشرقین کی خاصی بڑی تعداد مصادر سیرت کے بارہ میں شک وشبہ کا اظہار کرتی رہی ہے۔

مصادر سیرت کی فہرست تو خاصی لمبی ہے لیکن میں صرف دس مصادر کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

۱: سیرت کا سب سے اہم مصدر خود قرآن پاک ہے۔ قرآن پاک میں سیرت کے تمام اہم واقعات کی ضروری تفصیلات صراحتاً اور اشارۃً دونوں طرح بیان کی گئی ہیں اور واقعاتی تفصیلات سے بڑھ کر قرآن پاک میں ان پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ تبصرہ بھی ان واقعات کو سمجھنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہجرت کا واقعہ ہو۔ معراج اور اسراء کا واقعہ ہو۔ کفار مکہ کی مخالفت اور ان کے اعتراضات ہوں یا حضور اکرمؐ کے جوابات ہوں۔ ہجرت میں کیا کیا مراحل آئے۔ غار میں پناہ گزین ہوئے۔ غزوہ بدر ہوا۔ احد ہوا۔ غزوہ خندق، قریظہ، غزوہ تبوک۔ ان میں سے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس پر قرآن پاک میں تبصرہ نہ کیا گیا ہو اور اس تبصرہ سے ان واقعات کی بنیادی اور ضروری تفصیلات کی طرف واضح اشارے نہ ملتے ہوں۔ اس لئے ہر سیرت نگار کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ براہ راست قرآن پاک سے رجوع کرے اور قرآن پاک کی روشنی میں سیرت کے واقعات کو دیکھے۔ ہر مستند اور قابل اعتماد سیرت نگار نے قرآن مجید کو اساسی ماخذ کے طور پر سامنے رکھا ہے۔

۲: سیرت نگاری کا دوسرا اہم مصدر احادیث صحیحہ اور ثابتہ ہیں۔ صحیح بخاری اور مسلم سے لے کر صحیح احادیث کے تمام مجموعوں میں جو مستند احادیث ہیں ان میں سیرت کے بارے میں اہم ترین واقعات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سیرت کا بنیادی حصہ، یعنی core اور وقائع

سیرت کا بنیادی ڈھانچہ، ان دونوں ماخذوں سے مکمل طور پر مرتب ہو جاتا ہے۔

بعض اہل علم نے صحیحین کی بنیاد پر سیرت کے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ بعض نے صحیحین کے ساتھ بقیہ کتابوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ اور قرآن اور حدیث کی بنیاد پر سیرت کے مجموعے مرتب کئے۔ ایسے مجموعوں میں انہوں نے صرف قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کا حوالہ دیا ہے۔ کسی سیرت نگار کا حوالہ نہیں دیا۔ اس طرح کے کام کا ایک بہت اہم فائدہ یہ ہوا کہ اس سے سیرت نگاروں کی بہت سی تحقیقات کی تائید ہو گئی۔ احادیث کی بنیاد پر مرتب کی جانے والی ان کتابوں میں اور بقیہ سیرت نگاروں کی تفصیلات میں بنیادی طور پر کوئی فرق سامنے نہیں آیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ سیرت کے جو اصل وقائع اور اساسی مسائل و معلومات ہیں وہ ساری کی ساری کتب حدیث اور احادیث صحیحہ سے مل جاتی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے کسی محقق نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری سے سیرت سے متعلق مواد نکال کر یکجا کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ فتح الباری صحیح بخاری کی مشہور ترین شرح ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری جس پایہ کی کتاب ہے اس کی اس درجہ کی شرح نہیں لکھی گئی اور اس معیار کی شرح لکھنا مسلمانوں پر قرض ہے۔ ابن خلدون کا انتقال 707 ہجری میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد حافظ ابن حجر کو یہ شرح لکھنے کی توفیق ہوئی۔ جب انہوں نے یہ شرح لکھ دی تو ہر شخص نے بے ساختہ کہا کہ جس فریضہ یا حق کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا وہ فریضہ حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے ادا کر دیا ہے۔ فتح الباری کی عظمت اور مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہر دور میں بخاری کی مقبول ترین شرح رہی ہے۔ اس کے حوالہ سے وہ مشہور حدیث بھی بیان کی جاتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ 'لا ھجرۃ بعد الفتح'۔ حضور ﷺ نے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کو لازمی قرار دیا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ ہر مسلمان کا مدینہ کی طرف ہجرت کرنا لازمی ہے، تاکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ 'لا ہجرۃ بعد الفتح'۔ اب فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ بعض محدثین نے یہ حدیث فتح الباری کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے کہا کہ 'لا ھجرۃ بعد الفتح'۔ فتح الباری کے بعد علم حدیث کے لئے ہجرت کی ضرورت نہیں۔ یہ کتاب اتنے اونچے درجہ

کی ہے۔

اس فاضلانہ اور مایہ ناز کتاب بلکہ موسوعہ میں انہوں نے صحیح بخاری کی متعلقہ احادیث کی شرح کرتے ہوئے بقیہ صحیح احادیث کے جو جو حوالے دیئے ہیں اور جو جو مسائل اٹھائے ہیں۔ ان سب کو مرتب نے فتح الباری سے نکال کر نئی ترتیب سے جمع کر دیا ہے اور تین جلدوں پر مشتمل سیرت کی ایک کتاب مرتب کر دی ہے جو تمام تر کتب حدیث کی بنیاد پر ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ ماہر حدیث کی مرتب کردہ ہے۔ اس کے بارے میں ابن خلدون اور باقی لوگوں کا بیان آپ نے ابھی سن لیا۔

یوں تو حدیث کی ساری ہی کتابیں۔ اپنے اپنے درجۂ استناد کے مطابق۔ معلومات سیرت کے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں وقیع مواد پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک قابل اعتماد بھی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱: مسند امام احمد، جو مستند احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ ہے اور تقریباً تیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ مسلمان اہل علم کے بارہ میں تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن کئی مغربی اہل علم نے اس کا حرف حرف پڑھا اور اس سے سیرت کا مواد چھان کر الگ کیا۔

۲: السنن الکبریٰ، امام بیہقی کی یہ ضخیم کتاب جو دس بارہ جلدوں میں ہے اب ہر جگہ متداول ہے۔ امام بیہقی خود بھی بہت بڑے محدث اور بڑے بڑے محدثین کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

۳: مصنّف عبدالرزاق۔ یہ امام عبدالرزاق بھی بہت بڑے محدث تھے۔ ان کی یہ کتاب بہت مفصل اور جامع ہے۔ احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال وآثار کا بہت اہم ماخذ ہے۔ ان کی کتاب کئی بار چھپی ہے۔ حال ہی میں غالباً ۲۶ جلدوں میں نئی تحقیق کے ساتھ آئی ہے۔

۴: مصنّف ابن ابی شیبہ: یہ بھی عبدالرزاق کی مصنّف کی طرح بہت جامع اور مبسوط کتاب ہے اور معلومات کا خزانہ۔ یہ ابوبکر بن ابی شیبہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۵: المعجم الکبیر، امام طبرانی کی یہ معجم دس بارہ جلدوں میں چھپی ہے اور عام دستیاب ہے۔

۶: مجمع الزوائد، علامہ ہیثمی کی یہ کتاب گو ثانوی ماخذ ہے اور قدیم مصادر کی بنیاد پر ہے، لیکن عام طور پر اس کو مستند مانا جاتا ہے۔

کتب حدیث کے ساتھ ساتھ سیرت کا ایک بہت اہم اور ضروری ماخذ کتب فقہ بھی ہیں۔ بالخصوص دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران لکھی جانے والی فقہ کی وہ کتابیں جن میں بڑی تعداد میں روایات واحادیث پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حدیث اور فقہ آہستہ آہستہ دو الگ الگ تخصصات کے طور پر سامنے آرہے تھے۔ فقہ اور حدیث کی بالکل الگ الگ کتابیں تو ذرا بعد میں (غالباً چوتھی صدی ہجری سے) آنی شروع ہوئیں، لیکن ابتدائی دو صدیاں (دوسری اور تیسری صدی) ان دونوں علوم کے امتزاج اور پھر تدریجی امتیاز کی صدیاں تھیں۔

اس دوران فقہ کی جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں خاصا بڑا حصہ احادیث وروایات کا پایا جاتا ہے۔ ان احادیث وروایات میں سیرت کی بہت سی اہم معلومات موجود ہیں۔ فقہ کی ان کتابوں میں وہ کتابیں نسبتہً زیادہ اہم ہیں جو مالیات اور دوسرے انتظامی امور پر لکھی گئیں۔ مثلاً درج ذیل کتب:

کتاب الخراج، امام ابو یوسف

کتاب الاموال، یحیٰی بن آدم

کتاب الاموال، ابوعبید

کتاب الاموال، ابن زنجویہ

کتاب الاموال، ابونصر داؤدی

۳: سیرت کا تیسرا اور سب سے اہم ماخذ ومصدر کتب سیرت اور مغازی ہیں، جس کے بارے میں تفصیلی بات کل ہوگی۔ کتب سیرت اور مغازی میں بعض بنیادی کتابیں ہیں۔ بعض بہت بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بعض کتابیں کمزور ہیں۔ بعض کے بارے میں مورخین اور محدثین کی رائے ہے کہ ان میں بہت کچھ رطب ویابس بھی موجود ہے۔ اس لئے ان میں سے صحیح کتابوں کا درجہ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

۴: چوتھا درجہ حدیث کے ان مجموعوں کا ہے جو محدثین کی نظروں میں بہت اونچے

مجموعے نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حدیث کی کتب کے تین اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کے چار مجموعے قرار دیئے ہیں۔ سب سے پہلے مجموعہ الف یا کیٹیگری اے کی کتب ہیں جن کے بارے میں شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ کتابیں حدیث کے صحیح ترین مجموعے ہیں۔ اس کیٹیگری میں انہوں نے تین کتابوں کے نام لئے ہیں یعنی موطاء امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ پھر درجہ دوم میں انہوں نے پانچ کتابیں رکھی ہیں۔ صحاح ستہ کی بقیہ چار کتابیں اور پانچویں مسند امام احمد۔ درجہ سوم میں انہوں نے حدیث کی بقیہ مشہور کتابیں رکھی ہیں۔ چوتھے درجہ میں انہوں نے حدیث کی وہ کتابیں رکھی ہیں جن میں رطب ویابس کی بھرمار ہے اور جو کسی بھی اعتبار سے استناد کے لائق نہیں ہیں۔ اس لئے جو بقیہ کتابیں ہیں ان کا درجہ چوتھا ہونا چاہئے۔

پانچواں مصدر و ماخذ کتب تاریخ کا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

چھٹا مصدر و ماخذ کتب ادب ہیں، صدر اسلام میں اور اس سے پہلے بھی یہ رواج تھا کہ عربی زبان میں ادبیات کے اعلیٰ ترین نمونوں کو محفوظ رکھا جائے۔ اسلام سے پہلے قبائلی تفاخر کے جذبہ سے یہ چیزیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے بڑے بڑے اور نامور شعراء کے قصائد اور خطباء کی تقریریں وغیرہ محفوظ رکھا کرتا تھا۔ قبیلہ کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ قصائد رہتے تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد ظاہر ہے کہ ان نمونوں کی حفاظت کا اصل اور بنیادی مقصد قرآن پاک کی زبان کی حفاظت، قرآن پاک کی اسالیب کو سمجھنے میں مدد اور قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کا اندازہ کرنا قرار پایا۔ اس لئے اسلام کے بعد بہت سے حضرات نے اپنی زندگی کا ایک بڑا اور بنیادی ہدف یہ قرار دیا کہ اسلام سے پہلے کے اور فوراً بعد کے عربی ادب کے ذخائر، تقریریں، خطابت، کہانت، نظم اور شاعری کو محفوظ کیا جائے۔ خود صحابہ کرام کو اس کام میں بڑی دلچسپی تھی۔ سیدنا عمر فاروقؓ کو اس چیز کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ خود عربی زبان وادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے زمانے میں لوگوں کو تلقین اور ہدایت کی کہ اپنے بچوں کو شعروادب ضرور سکھاؤ 'فان الشعر دیوان العرب'، اس لئے کہ شعر عرب کی تاریخ کا مجموعہ ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی شعروادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن صحابہ کرام

میں شعر و ادب سے سب سے زیادہ دلچسپی رکھنے والے حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ وہ قرآن فہمی میں عربی ادب سے بہت مدد لیا کرتے تھے۔ عربی ادب سے یہ اعتنا بقیہ صحابہ کرام میں اتنی گہرائی کے ساتھ نہیں ملتا۔ ایک مرتبہ ایک مشہور خارجی سردار نافع بن ازرق کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مکالمہ ہوا۔ اس نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پاک کے بارے میں دو سو سوالات کئے۔ اس موقع پر شاگردوں کا حلقہ کتاب قلم ہاتھوں میں لئے موجود تھا۔ نافع بن ازرق سوالات کرتے گئے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جوابات دیتے گئے۔ یہ سارے جوابات لکھے گئے اور ان پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر لی گئی جس کا امام بخاری نے بھی جا بجا حوالہ دیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے اور علامہ جلال الدین سیوطی نے پوری کی پوری کتاب تھوڑے سے فرق کے ساتھ اپنی کتاب الاتقان میں محفوظ کر لی ہے۔

کتب ادب کی ترتیب و تدوین کا یہ اہتمام گویا صحابہ کرام کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن کتب ادب میں جو مواد ہے وہ سیرت کے اصل اور بنیادی حقائق کے بارہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس مواد میں بہت سی ایسی جزوی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں جن سے سیرت کے متعدد اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یوں تو ادب کی کتابیں جو سیرت کے مطالعہ میں کام آ سکتی ہیں بے شمار ہیں، تاہم ان میں سے میں صرف دو کتابوں کا حوالہ دوں گا۔ یہ دونوں کتب نہ تو براہ راست سیرت پر ہیں اور نہ ان کے مرتبین نے ان کو سیرت کے واقعات کے نقطہ نظر سے لکھا تھا۔ ان کتابوں میں سیرت کے بارہ میں براہ راست معلومات اول تو ہیں نہیں، اور اگر ہیں بھی تو ظاہر ہے ان سے سیرت کے بارے میں براہ راست معلومات لینا کبھی بھی مناسب یا درست نہیں سمجھا گیا۔ ان دو کتابوں میں بھی زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا کتاب تیس جلدوں میں ابوالفرج اصفہانی کی کتاب 'کتاب الاغانی' ہے۔ اس میں عرب کے گویوں اور بھانڈوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کی ایسی کوئی علمی یا دینی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن جب مصنف عرب کے گویوں اور گانے والوں کا تذکرہ کرتا ہے تو جگہ جگہ ان کے قبائل کا تذکرہ بھی کرتا ہے کہ فلاں قبیلے کے گویئے نے فلاں قبیلہ کے خلاف یہ ہجو لکھی۔ لکھنے کی وجہ بھی تحریر کی ہے۔ اس طرح کی جزوی معلومات جو قبائلیات، اجتماعیات اور ہام معاشرتی معاملات کے بارے میں ہیں کتاب میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، اس کتاب میں موجود ہیں۔ بہت سی قیمتی معلومات ادب

کی ایسی دوسری کتب سے بھی مل جاتی ہیں۔ اسی طرح سے بعض کتابیں ایسی ہیں جن سے عرب کے تجارتی میلوں کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ عکاظ کے میلے میں تشریف لے جاتے تھے۔ تبلیغ اسلام کرتے تھے۔ قرآن پاک کی طرف دعوت دیتے تھے۔ پھر حضور نے بعض مواقع پر بعض صحابہ کرام کو بھی تبلیغ کے لئے ان میلوں میں بھیجا، کیوں بھیجا، کس میلے میں بھیجا۔ یہ سب معلومات چاہے فی نفسہ اہم نہ ہوں، لیکن یہ سب معلومات ایسی ہیں کہ بعض خلاؤں کو پر کرنے میں جزوی طور پر کام آتی ہیں۔ بشرطیکہ کہ جو خلا پر کیا جاتا ہے وہ بقیہ مستند کتابوں کے مطابق ہو۔

کتب جغرافیہ کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس طرح لغت کی کتابوں میں بھی معلومات سیرت کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جب لغت نگاروں نے یا عربی قاموس نویسوں نے عربی لغت کے مجموعے تیار کئے تو بعض مشکل الفاظ کی شرح میں انہوں نے بعض ایسے واقعات بھی بیان کئے، یا وہ تفصیلات بھی بیان کر دیں جن کا تعلق سیرت سے تھا۔

مثلاً 'لسان العرب' عربی لغت کی بڑی مشہور کتاب ہے۔ بارہ، پندرہ سے لیکر بیس اور پچیس تک جلدوں میں کئی کئی بار چھپی ہے۔ اس میں جگہ جگہ سیرت کے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ کوئی لفظ ہے جس میں کسی قبیلے کا نام ہے تو اس لفظ کی تشریح کے ضمن میں اس قبیلہ کی تفصیل دے دی گئی ہے۔ کوئی لفظ ہے جو کسی نبوی دستاویز میں آیا ہے تو اس دستاویز کا پس منظر دے دیا گیا ہے۔ کوئی لفظ ایسا ہے جو کسی مشہور حدیث میں آیا ہے تو اس حدیث کا پورا سیاق وسباق بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ادب اور لغت کی کتابوں میں بکھرا ہوا مواد بہت مفید اور قیمتی ہے اور سیرت نگاروں نے ان معلومات کو استعمال کیا ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

پھر کتب رجال بھی سیرت کا اہم ماخذ رہی ہیں۔ یعنی محدثین جب حدیث کا فن مرتب کر رہے تھے تو حدیث کے راویوں کے حالات بھی جمع کرتے جاتے تھے۔ راویوں کے حالات جمع کرنے کے اس طویل اور جاں گسل عمل میں سب سے پہلے صحابہ کرام کے حالات جمع کئے گئے۔ اس طرح صحابہ کرام کے تذکرے مرتب ہوئے۔ پھر تابعین اور تبع تابعین کے تذکروں پر کتابیں مرتب ہوئیں۔ ان تذکروں میں جابجا اور کثرت سے ایسی معلومات بھی ملتی ہیں جو سیرت سے متعلق ہیں اور ان سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثال

کے طور پر کسی راوی کے بارے میں تذکرہ آیا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور ان کے دادا فلاں غزوہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ شریک تھے۔ فلاں صاحب کے والد فلاں موقع پر فلاں واقعہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ اس طرح رجال کے تذکرے تابعین اور تبع تابعین کے حالات سے بھی سیرت کے بارہ میں معلومات ملتی ہیں۔

یہ کتابیں ہمارے نزدیک تو مستند ہیں۔ ہر مسلمان ان کو مستند مانتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں استناد کا ایک معیار ہے۔ جس کی بنیاد پر معلومات کو پرکھا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ رجال اور تذکرہ کی یہ کتابیں استناد کے ایک معیار پر نہیں ہیں۔ جو درجہ قرآن پاک کا ہے وہ کسی اور کتاب کا نہیں ہوسکتا۔ جو درجہ مستند کتب حدیث کا ہے وہ بقیہ کتب کا نہیں ہوسکتا۔ جو کتابیں ارباب سیر کے متفق نقطہ نظر کے مطابق ہیں وہ سیرت کی دوسری کتابوں سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔ اس لئے کہ جو درجہ متفق علیہ مسائل کا ہے وہ درجہ بقیہ مختلف فیہ مسائل کا نہیں ہوسکتا۔ حدیث کے جو غیر مستند مجموعے ہیں ان میں چھان پھٹک کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی ہے۔ ان میں ہر دور میں صحیح اور سقیم میں فرق کیا گیا۔ ہر دور میں یہ بحث سامنے آئی کہ یہ روایت قابل قبول ہے یا نا قابل قبول ہے۔ اس لئے یہ بات ہر دور کے مسلمانوں میں قریب قریب طے شدہ رہی ہے کہ ہر روایت یکساں طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ مسلمان اہل علم نے روایات کے اخذ وقبول کے اصول مقرر کئے ہیں۔ اب یہ بات کہ ان سب اصولوں کو نظر انداز کر کے اُن تمام مجموعوں کو نظر انداز کر دیا جائے جن کی ترتیب وتدوین میں اہل علم نے زندگیاں کھپائی ہیں اور ان کو بیک جنبش قلم غیر تاریخی اور غیر مستند ثابت کیا جائے، یہ سراسر ایک غیر علمی اور بے بنیاد بات معلوم ہوتی ہے۔

آج مغربی ناقدین سیرت کے بہت سے بلکہ تقریباً تمام مجموعوں کو غیر مستند قرار دیتے ہیں۔ ایک بڑی دلیل جو وہ کئی دہائیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ ساری روایات زبانی ہیں اور سیرت نگاروں نے سنی سنائی باتیں نقل کر دی ہیں۔ حالانکہ یہ بات اب تحقیق کے ساتھ ثابت کی جا چکی ہے کہ سیرت کی روایات زبانی روایات پر مبنی نہیں ہیں۔ اس کی تحقیق بھی ہو چکی ہے اور ثبوت بھی دیئے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر فواد سیزگن نے اس پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس پر لکھا ہے۔ اور بھی بہت سے محققین نے اس پر لکھا ہے کہ یہ

ساری روایات زبانی نہیں تھیں بلکہ زبانی اور تحریری دونوں طرح کی روایات بہت تحقیق، احتیاط اور اہتمام سے محفوظ کی گئی تھیں۔

یہ بات مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی تلامذہ اور عقیدت مند پیروکار بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں میں بعض چیزوں کو حفظ کرنے کی روایت آج تک چلی آ رہی ہے۔ ہماری آج کی اس محفل میں بھی کم سے ایک درجن حفاظ قرآن موجود ہوں گے۔ ایسے بے شمار لوگ مسلمانوں میں آج بھی موجود ہیں جن کو حدیث کی کتابیں زبانی یاد ہیں۔ میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو حدیث کی کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی یاد ہیں۔ متون یاد کرنے والے آج جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ کسی کو فقہ کا متن یاد ہے، کسی کو منطق کا متن یاد ہے، کسی کو کوئی متن یاد ہے، کسی کو کوئی اور متن یاد ہے۔ دراصل مسلمانوں میں زبانی یادداشت کا رواج اتنا زیادہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ اس روایت کو نظر انداز کر دینا اور ان تحریری ذخائر کو بھی جو حضور کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں ان کو نظر انداز کرنا اور یک طرفہ طور پر یہ کہے جانا کہ یہ سارا ذخیرہ غیر مستند ہے، یہ محض تحکم اور ضد بلکہ محض عناد اور جہل مرکب ہے، اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہو سکتا۔

یہاں میرا خیال تھا کہ قرآن پاک میں سیرت کے جو اہم واقعات بیان ہوئے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کروں گا، لیکن وقت تنگ ہے اس لئے ان مثالوں سے صرف نظر کرتا ہوں۔ سیرت کے جو واقعات قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں ان کو جمع کرنے اور مرتب کرنے کا کام کئی لوگوں نے کیا ہے۔ اس میں ایک بہت ہی قیمتی کام تو شاید شام یا لبنان کے عالم دکتور محمد عزت دروزہ نے عربی میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'عصر النبی' میں بڑے فاضلانہ انداز سے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اور قرآن پاک کی تمام آیات کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ سیرت کا پورا نقشہ اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی ساری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ ایک اور کام ہمارے برصغیر کے ایک صاحب ڈاکٹر لقمان اعظمی نے کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے جو پاکستان میں بھی کئی بار چھپا ہے۔ انہوں نے اسی موضوع پر قاہرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے کہ قرآن پاک میں سیرت کے واقعات کیسے بیان ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ کے معاشرہ اور مدینہ منورہ کے ماحول کے بارے میں قرآن میں

کیا آیا ہے۔

کل میں نے تذکرہ کیا تھا کہ کتب حدیث اور کتب سیرت میں بعض جگہ تداخل ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ وہ صرف حدیث کا موضوع ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جو صرف سیرت کا موضوع ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو علم حدیث اور علم سیرت دونوں کا موضوع ہیں۔ محدثین کا معیار تحقیق اور پیمانہ احتیاط بہت اونچا اور غیر معمولی ہے، جبکہ ارباب سیر اور تاریخ نگاروں کا معیار تحقیق اتنا اونچا نہیں ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیرت کا اگر کوئی واقعہ ایسا ہو کہ محدثین اور سیرت نگاروں میں اس کے بارہ میں کوئی اختلاف ہو تو کس کی بات کو ترجیح دینی چاہئے۔ جہاں تک شریعت کے احکام، عقائد اور دین کی تعلیم کا تعلق ہے تو ان معاملات میں تو بالاتفاق تمام اہل علم کا فیصلہ ہے کہ ان امور میں ارباب حدیث کی تحقیق کو ترجیح دینی چاہئے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر کوئی چیز خالص سیرت کے واقعہ سے متعلق ہے جس سے کوئی حکم شرعی یا حکم فقہی یا عقیدہ کا کوئی پہلو ثابت نہیں ہوتا اور اس میں ارباب حدیث اور سیرت نگاروں میں اختلاف ہو تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے امور میں ارباب سیرت کی رائے کو ترجیح دینی چاہئے، جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے امور میں بھی ارباب حدیث ہی کی تحقیق کو ترجیح دینی چاہئے۔ یہ اختلاف اکثر رہتا ہے اور کتب حدیث میں اس کا تذکرہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

مثلاً اس نوعیت کا اختلاف کہ غزوات میں کون سا غزوہ پہلے ہوا اور کون سا بعد میں ہوا۔ یا مثلاً یہ سوال کہ کوئی خاص واقعہ کسی خاص غزوہ میں پیش آیا یا کسی اور غزوہ میں پیش آیا۔ اس طرح کے اختلافات محدثین اور ارباب سیر کے مابین موجود ہیں کہ فلاں غزوہ جو ہوا تھا تو وہ فلاں واقعہ سے شروع ہوا تھا یا فلاں واقعہ سے۔ یا یہ کہ کوئی واقعہ ایک مرتبہ پیش آیا تھا یا دو مرتبہ۔ مثال کے طور پر لیلۃ التعریس کا واقعہ مشہور ہے۔ تعریس عربی زبان میں صبح کی نماز سے پہلے نصف شب کے بعد کے وقت سو جانے کو کہتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا کہ قافلے رات کے پہلے حصہ میں سفر کرتے تھے اور نصف شب کے بعد آرام کے لئے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ اس پڑاؤ اور آرام کو تعریس کہا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ لمبا سفر تھا۔ سب

لوگ تھکے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے نماز فجر سے کچھ پہلے پڑاؤ کرنے اور ذرا آرام کرنے کا فیصلہ کیا، اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم جاگتے رہنا اور فجر کے وقت ہمیں جگا دینا۔ یہ ہدایات دے کر سب سو گئے۔ سیدنا بلالؓ بھی تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور وہ بھی سو گئے اور یوں سب سوتے رہ گئے اور فجر کی نماز کا وقت نکل گیا۔ حضورؐ کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی کرنیں نکل آئیں اور لوگوں کے چہروں پر پڑیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ فَفَزِعَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 'یعنی آپؐ پریشانی اور گھبراہٹ میں اٹھے اور پوچھا کہ یا بلال، یہ کیا ہوا؟ حضرت بلال نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ، جس نے آپ کو سُلایا، اس نے مجھے بھی سلا دیا۔

اس واقعہ کی تفصیلات حدیث کے لٹریچر میں لیلۃ التعریس کے عنوان سے ملتی ہیں۔ اس سے فقہا نے بہت سے احکام نکالے ہیں اور محدثین نے اس کی تفصیلات سے بحث کی ہے۔ اب یہ لیلۃ التعریس ایک مرتبہ ہوئی یا دو مرتبہ ہوئی۔ اگر ایک مرتبہ ہوئی تو کس غزوہ یا سفر سے واپسی پر ہوئی، اور اگر دو مرتبہ ہوئی تو کس کس غزوہ سے واپسی پر ہوئی۔ اس پر بعض اوقات علم حدیث اور علم سیرت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ اس کو ترجیح دیتے ہیں کچھ اُس کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ سیرت کا ایک بڑا ماخذ تاریخ بھی ہے۔ بعض مغربی اہل علم کا کہنا ہے کہ عربوں میں تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا، یہ بات درست ہے۔ اس کے برعکس بہت سے محققین کا اصرار ہے کہ عربوں میں تاریخ کا رواج تھا، یہ بات بھی درست ہے۔ دونوں باتیں درست ہیں۔ تاریخ نویسی کا رواج اس اعتبار سے نہیں تھا کہ کوئی مرتب اور مدون تاریخ نویسی عربوں میں رائج نہیں تھی۔ لیکن اپنے بزرگوں کے ماضی کے واقعات سے واقف ہونا، ان کی تفصیلات کو محفوظ رکھنا اور ان سے اعتنا کرنے کا رواج عربوں میں یقیناً تھا۔ خاص طور پر دو ادارے ایسے تھے جن میں یہ معلومات ناگزیر تھیں۔ ایک ادارہ منافرہ کے نام سے تھا۔ منافرہ سے مراد یہ تھی کہ جب دو عرب قبائل میں اختلاف ہو جاتا تھا کہ کون سا قبیلہ افضل ہے۔ یا قبائل کی سرداری میں دو افراد کے درمیان مقابلہ ہو جاتا تھا تو یہ سوال کہ ان دونوں دعویداروں میں سے کس کو ترجیح دی جائے، اہم سوال سمجھا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر ترجیح

کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوتا تھا کہ کس کے اباواجداد کی خدمات زیادہ تھیں۔ کس کا خاندان خدمت میں زیادہ پیش پیش تھا۔ کس کے اباواجداد کی صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ جب یہ مرحلہ پیش آتا تھا تو پھر آباواجداد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان معلومات کی بنیاد پر سربراہ منافرہ تنازعہ کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔

اس ادارہ کو منافرہ کہا جاتا تھا۔ منافرہ کا یہ ادارہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آرہا تھا اور جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چوتھے دادا جناب عبد مناف کا انتقال ہوا تو ان کی جانشینی پر ان کے دو بیٹوں میں اختلاف ہوا۔ جناب ہاشم کا دعویٰ تھا کہ میں زیادہ حقدار ہوں اور ان کے بڑے بھائی عبد شمس کا دعویٰ تھا کہ میں زیادہ حقدار ہوں۔ اب ان دو بھائیوں میں جو ایک بہت بڑے باپ کے بیٹے تھے، مکہ کی سرداری کے بارے میں اختلاف ہوا۔ اس موقعہ پر حسب روایت حضرت عمر فاروق کے دادا کو حکم بنا دیا گیا، کیونکہ منافرہ کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ انہوں نے تفصیل سے دونوں کا موقف سنا اور جناب ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ مکہ کی سرداری کے حقدار جناب ہاشم ہیں۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ یوں منافرہ کے لئے ضروری تھا کہ قبائل کے حالات اور اکابر کی خدمات کے بارے میں معلومات جمع کی جائیں۔ اس لئے یہ معلومات جمع ہوتی تھیں اور عرب قبائل اس سے نامانوس نہیں تھے۔

اسی طرح کا دوسرا بڑا ادارہ 'ایام' کے نام سے تھا۔ ایام العرب کے نام سے ایک الگ فن موجود تھا۔ عربوں میں قدیم قبائل کے کارنامے اور خاص طور پر جنگوں میں فتوحات کے تذکرے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے۔ ایام العرب پر اس وقت بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ ایک بڑی ضخیم کتاب آج سے کوئی پچاس سال پہلے ایک مصری عالم نے مرتب کی تھی۔ اس میں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب ایام کا تذکرہ موجود ہے۔ یوم بعاث، یوم فجار، یوم ذی قار، یہ بڑی بڑی جنگیں تھیں۔ یہ صرف جنگیں نہیں تھیں جو ایام العرب کا موضوع تھیں بلکہ اور بھی بہت سے معرکے تھے جن کی وجہ سے کوئی قبیلہ باعزت یا زیادہ کامیاب قرار پاتا تھا۔ یہ معلومات عربوں میں جمع ہوتی تھیں اور نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہتی تھیں۔ اس لئے ان حقائق کی بنیاد پر ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ سے شغف کسی حد تک عربوں میں موجود تھا۔

پھر ان دونوں اداروں سے بڑھ کر علم انساب کے بارے میں عربوں میں جو اہتمام تھا

وہ بڑا غیر معمولی تھا۔ عرب خصوصی اہتمام کے ساتھ انساب کے بارے میں معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایام العرب، مخالف قبائل کی شکست اور مظالم کی روداد یں، اپنے قبیلہ کی فتوحات کا فخریہ بیان اور ان سب کو نسل درنسل بیان کرنے کی روایت، یہ تینوں چیزیں عرب میں چلی آ رہی تھیں۔ جب یہ چیزیں جمع ہو رہی تھیں تو حضور کے خاندان کے بارے میں بھی ان سب عنوانات کے تحت ضروری اور اہم معلومات خود بخود جمع ہو رہی تھیں۔ جناب ہاشم اور جناب عبدمناف کے بارے میں بھی یہ ساری معلومات جمع ہو رہی تھیں۔ قصی اور دوسری تمام شخصیات کے بارے میں بھی جمع ہو رہی تھیں۔ جن مورخین کی کتابوں میں یہ معلومات ملتی ہیں ان میں ابن حبیب بہت نمایاں ہیں۔ ان کی دو کتابیں کتاب المحبر اور کتاب المنمق آج سے ساٹھ ستر سال قبل حیدر آباد دکن میں چھپی تھیں۔ ان دونوں کتابوں سے بہت سی قیمتی معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔

جن حضرات نے علم انساب پر لکھا ہے ان میں حضرت مصعب بن زبیرؓ حضرت عائشہ کے نواسے تھے اور ان کو صحابہ تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ حضور کے خاندان ہی کے فرد تھے۔ انہوں نے انساب کے بارے میں معلومات جمع کیں۔

جن لوگوں نے تاریخ مرتب کی ان میں قدیم ترین حضرات میں سے ایک مؤرخ خلیفہ بن خیاط بھی ہیں جن کی تاریخ چھپی ہوئی موجود ہے۔ یہ خلیفہ بن خیاط مستند ترین مؤرخین میں سے شمار ہوتے ہیں۔ امام بخاری کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ ان کے مستند ہونے پر حضرات محدثین بھی متفق ہیں۔

دیگر قابل ذکر مورخین میں ابوحنیفہ دینوری، امام ابن جریر طبری کے علاوہ یعقوبی اور مسعودی بھی نمایاں ہیں۔ اگرچہ یعقوبی اور مسعودی کا درجہ استناد اور ان دونوں کے بیانات کی ثقاہت ہمیشہ محل نظر رہی ہے۔ طبری کے ہاں سیرت پر بہت قیمتی مواد موجود ہے۔ طبری نے مکمل سند اور حوالوں کے ساتھ ہر بات کہی ہے اور حوالوں کی تحقیق کا کام قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔

مؤرخین میں سب سے مستند، جیسا کہ عرض کیا گیا، خلیفہ بن خیاط ہیں۔ ان کی کتاب کا ابتدائی حصہ سیرت پر مشتمل ہے۔ ان کے مآخذ میں امام بیہقی، امام بقی بن مخلد اور امام لیث بن سعد جیسے صف اوّل کے محدثین کے علاوہ بیشتر نامور سیرت نگار شامل ہیں۔ مثلاً:

۱۔ محمد بن اسحاق

۲۔ وہب بن جریر حازم

۳۔ ابو معشر السندی

۴۔ علی بن محمد المدائنی

۵۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ

۶۔ عبد الملک الاصمعی

۷۔ ابو داؤد طیالسی

۸۔ عبد الرحمٰن بن مہدی

۹۔ ابو نعیم الفضل بن دکین

۱۰۔ محمد بن عمر الواقدی

ازرقی کی اخبار مکہ کا اور سمہودی کی وفاء الوفاء کا میں نے پہلے ہی تذکرہ کیا ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ پر دو مشہور کتابیں ہیں اور سیرت کے بارہ میں بہت اہم مواد پر مشتمل ہیں۔ ازرقی تو غالباً تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں جبکہ سمہودی بعد کے ہیں۔ عمر بن شبہ مشہور مورخ ہیں۔ طبری کے بے شمار حوالے عمر بن شبہ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی کتاب 'اخبار المدینہ المنورہ' حال ہی میں چھپی ہے۔ تمام قدیم مورخین کی کتب میں اس کے حوالے موجود ہیں۔ اس کتاب کے انہوں تین حصے قرار دیئے ہیں۔ پہلا حصہ ہے مدینہ منورہ حضور کے عہد میں، دوسرا حصہ ہے مدینہ منورہ حضرت عمر کے عہد میں اور تیسرا حصہ ہے مدینہ منورہ حضرت عثمان کے عہد میں۔

انساب کے بارے میں زیادہ مفصل گفتگو کا وقت نہیں رہا ہے۔ اس پر بہت سی مستند کتابیں موجود ہیں۔ ہمارے مغربی محققین علم انساب کے بارے میں بھی شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمیں اس کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ جو لوگ قرآن کے بارے میں شک کرتے ہیں تو اگر وہ انساب کے بارے میں بھی شک کریں تو کونسے حرج کی بات ہے۔ عربوں میں نسب سے دلچسپی اسلام سے بہت پہلے سے رہی ہے۔ ہر قبیلہ میں انساب کے ماہرین ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا محض دھونس اور عناد ہے۔ عربوں میں

آج بھی نسب ناموں کو ریکارڈ کرنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ بلکہ دنیائے عرب سے باہر بھی عربی النسل خانوادوں میں شجروں کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ برصغیر، ایران، ترکی، حتی کہ مشرق بعید میں پائے جانے والے عربی النسل خاندانوں میں انساب سے دلچسپی آج بھی نظر آتی ہے۔ صحابہ کرام میں بہت سے حضرات انساب کے ماہر تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں آتا ہے کہ 'کان انسب العرب' کہ وہ عرب میں علم انساب کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

اس موضوع پر جو قدیم ترین مصنفین ہیں ان میں بلاذری، زبیر بن بکار، سمعانی اور ابن حزم شامل ہیں۔ ان حضرات کی کتابوں میں ایک بلاذری کی انساب الاشراف ہے۔ اس کی پہلی جلد چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا پہلا حصہ مدنی دور سے بحث کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے جب سپاہیوں، فوجیوں اور دیگر مجاہدین کی تنخواہوں کے لئے دیوان مرتب فرمایا تھا تو اس کو قبائل کی بنیاد پر مرتب فرمایا تھا۔ انہوں نے جو تنخواہیں متعین فرمائی تھیں، تو وہ حضور سے قربت کی بنیاد پر متعین فرمائی تھیں۔ آں جناب نے طے کیا تھا کہ جو مجاہد حضور کے جتنے زیادہ قریب ہوگا اس کو اتنی زیادہ تنخواہیں ملیں گی۔ اس موقع پر آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ پہلے اپنا نام لکھیں۔ آپؓ نے جواب دیا کہ 'تیری ماں تجھے روئے! میں رسول اللہ ﷺ کے خاندان کو سب سے پہلے لکھوں گا، اس طرح انہوں نے سب سے پہلے حضور کے خاندان کو لکھا۔ پھر جو خاندان حضور کے خاندان کے جتنا قریب تھا اس کے لوگوں کے نام اسی ترتیب سے درج کئے گئے۔ جب ان کے اپنے قبیلے کا نمبر آیا تو کسی نے کہا کہ اب تو اپنا نام پہلے لکھیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے قبیلے میں جو شخص سب سے پہلے اسلام لایا تھا پہلے اس کا نام لکھا جائے گا۔ پھر جس ترتیب سے میں اسلام لایا تھا اسی کے مطابق میرا نام بھی لکھ دیا جائے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں انساب کا علم اتنا عام اور واضح تھا کہ انہوں نے انساب کی بنیاد پر دیوان تیار کیا اور تمام صحابہ کے سامنے تیار کیا اور ان سب کی مشترکہ معلومات انہوں نے اس میں استعمال فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انساب کے بارہ میں معلومات جمع کرنے کا سیرت نگاروں نے اتنا ہی اہتمام کیا جتنا سیرت کے دیگر مصادر کے بارہ میں نظر آتا ہے۔ بلاذری اور سمعانی جیسے مورخین

کے علاوہ ابن حزم جیسے فقیہ نے بھی انساب کی تحقیق کو اپنا میدان بنایا اور دستیاب معلومات کو مدوّن کیا۔ ان کے علاوہ مشہور مؤرخ اور سیرت نگار ہشام بن محمد الکلبی نے بھی محمد بن حبیب کی کتاب جمہرۃ النسب کی روایت کی۔ ہشام کا شمار خود تو زیادہ مستند اور قابل اعتماد راویوں میں نہیں ہوتا، لیکن ان کے استاذ محمد بن حبیب کو عموماً غیر مستند نہیں سمجھا گیا۔ جمہرۃ النسب ایک اعتبار سے ان دونوں فضلاء کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ یہ کتاب دو بار چھپی ہے۔ ایک ایڈیشن تین جلدوں میں محمود فردوس العظم کی تحقیق سے چھپا ہے۔

انساب کے اس ذخیرہ میں بلاذری کی انساب الاشراف کو سب سے معتبر اور مستند مانا جاتا ہے۔ بلاذری کے انساب کی پہلی جلد چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سیرت اور متعلقات سیرت پر قیمتی مواد موجود ہے۔ بلاذری کے مصادر اور اساتذہ میں امام شعبی اور امام زہری جیسے جید محدثین کے ساتھ ساتھ واقدی اور ابن اسحاق جیسے نامور سیرت نگار بھی شامل ہیں۔ زہری کی روایات بلاذری کے ہاں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اس سے بھی بلاذری کی ثقاہت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سیرت کے اس سارے ذخیرے پر کتابیات بھی شروع سے مرتب ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ کتابیات سیرت پر سب سے پہلا کام ابن ندیم نے کیا تھا۔ ابن ندیم نے الفہرست میں بہت سی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ واقدی کی انہوں نے چوبیس کتابیں بیان کی ہیں۔ حال ہی میں کتابیات سیرت پر دو اہم کتابیں آئی ہیں۔ ایک ڈاکٹر صلاح الدین منجد کی ہے جو بڑی ضخیم ہے اور اس کے بارہ ابواب یا اقسام ہیں۔ انہوں نے ہر قسم سے متعلق الگ الگ ابواب میں تفصیل بیان کی ہے اور موضوع وار کتابوں کی نشان دہی کی ہے جو کتب مخطوطہ ہیں اور جو مطبوعہ ہیں وہ سب بیان کی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تفصیل کتاب غالباً ایک ایرانی عالم عبدالجبار الرفاہی نے فراہم کی ہے۔ ان کی ایک بہت مفصل اور ضخیم کتاب تہران میں چھپی ہے۔ گیارہ جلدوں میں ہے اور گیارہویں جلد کا جو آخری اندراج ہے وہ 29 ہزار 7 سو 94 ہے۔ اس سے زیادہ میں ان کتب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆

سوال و جواب

آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا کہ حضور خواتین سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اس کا طریقہ کار کیا ہوتا تھا؟ کیا حضور عورتوں کے سامنے آ کر خطاب فرمایا کرتے تھے یا کوئی اور انداز تھا۔

حضور ﷺ خود خواتین کے سامنے آ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ خواتین مسجد نبوی میں بھی تشریف لایا کرتی تھیں اور خواتین کا الگ اجتماع بھی حضور منعقد فرمایا کرتے تھے اور وہاں جا کر خواتین کے سامنے ضروری امور پر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان میں سے تقریباً سب حجاب کے اسلامی آداب کی پابندی کے ساتھ ہی آتی تھیں۔ صحابہ کرام کے زمانہ سے ہی یہ بات محل اختلاف ہے کہ خواتین کے لئے چہرے کا پردہ لازمی ہے کہ نہیں۔ بعض صحابہ کرام کا خیال تھا کہ چہرہ کا پردہ لازمی ہے اور بعض کا خیال تھا کہ چہرہ کا پردہ لازمی نہیں ہے۔ ان دونوں کا مستند اور مستدل وہی واقعات ہیں جو حضور کے زمانے میں پیش آئے۔

☆

شمائل اور انساب پر اردو میں چند مشہور اور مکمل کتب کے نام بتادیں۔

رسول اللہ ﷺ کے شمائل پر اردو میں جو کتاب مشہور ہے وہ امام ترمذی کی کتاب الشمائل النبویہ کا اردو ترجمہ ہے جو کئی لوگوں نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ اردو میں اس کتاب کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک مشہور شرح جو کئی بار اردو ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے۔ وہ مولانا

محمد ذکریا کاندھلوی شیخ الحدیث کے قلم سے ہے۔ انساب نبی پر اردو میں کوئی کتاب میں نے نہیں دیکھی۔ البتہ عربی میں کئی کتابیں ہیں۔ میری انتہائی محدود معلومات کی حد تک انساب کی کسی کتاب کا اردو ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔

☆

> جب بھی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں دنیاوی ترقی کی بات ہوتی ہے، فخر کے لئے ہمارے پاس ماضی کے سوا شاید کچھ نہیں بچتا۔ مسلمانوں کی مادی اور ذہنی مغلوبیت کو دور کرنے کے لئے موجودہ دنیائے علوم وفنون کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کیا حال ہی میں کوئی اجتماعی یا انفرادی اور منظم اور جامع کوشش کی جارہی ہے؟ مزید یہ کہ ایک فرد کے لئے یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی جامعیت اور ابدیت کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ثابت کرے؟

میرے خیال میں یہ کام ایک ملی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ اس لئے یہ اہم کام اداروں کو بھی کرنا چاہیے اور افراد کو بھی کرنا چاہئے۔ علامہ اقبال نے آج سے ستر اسی سال پہلے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے 1925 میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط میں لکھا تھا کہ اس وقت مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے۔ جو شخص زمانہ حال کے jurisprudence پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہ بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم اور شاید اسلام کا مجدد ہوگا۔ اس لئے خواہ ایک فرد یہ کام کرے، یا بہت سے افراد مل کر یہ کام کریں، کام یہ بہت اہم ہے اور اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے بہت سے لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ اس میں پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ اب دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔

☆

آپ نے سلاسل تصوف کی سند کو نبی کریم ﷺ تک متصل کیا
ہے اس کی مزید وضاحت فرما دیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ کرام میں روحانی اعتبار سے ہر صحابی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خلیفہ بلافصل ہے اس میں تو کسی سند کی ضرورت نہیں۔ ایک صحابی کی صحابیت اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ تعلیم دین اور تزکیہ نفوس میں حضور کا جانشین ہو۔ ساری کتب حدیث اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کی رہنمائی کو آگے دوسروں تک پہنچایا اور حضور کی تربیت کے نتائج کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔

جہاں تک صوفیانہ سلسلوں کے تاریخی طور پر مستند ہونے کا تعلق ہے تو یہ واقعی ایک محل نظر بات ہے اور اس پر ماضی میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ بعض حضرات بڑے شدّ ومد سے اس کے منکر ہیں۔ اور اس انکار کے لئے وزنی تاریخی دلائل رکھتے ہیں۔ ان حضرات میں بیشتر وہ لوگ ہیں جو سرے سے تصوف کے بھی منکر ہیں اس لئے ان کے انکار کا وزن ذرا کم ہو جاتا ہے۔ بعض دیگر حضرات بڑے شدومد کے ساتھ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب سلسلے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے متصل ہیں۔ ان قائلین میں بیشتر وہ ہیں جو تصوف کی تمام روایات کو بلا ردّ وقدح قبول کرتے ہیں۔ یوں ان کی تائید بھی ہلکی قرار پاتی ہے۔ متوازن رائے دنوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے۔ میں کوئی خاص رائے نہیں دینا چاہتا۔ لیکن یہ بات میں ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات تصوف کے سلسلوں سے وابستہ رہے ہیں وہ امت کے انتہائی قابل احترام اور معتمد ترین حضرات تھے۔ وہ ایسے بلند پایہ لوگ تھے جن کا نام سن کر سر کو احتراماً خم کرنا پڑتا ہے۔ کون سا مسلمان ہے جو مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی اور ان کے پائے کے دوسرے بزرگوں کے احترام میں کسی سے پیچھے رہنا گوارا کرے گا۔

ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

علامہ اقبال نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

He was the the greatest religious genius of

Muslim India.

برصغیر کے امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی تصوف کے سلسلوں سے وابستہ تھے۔ یہ بڑے بڑے حضرات جو ان سلسلوں کی سند کو مستند مانتے ہیں تو یقیناً اس کی کوئی بنیاد ہوگی۔ میں نے خود کوئی تحقیق نہیں کی اس لئے میں خود ان سلسلوں کی سند بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆

جن دستاویزات کا آپ نے ذکر کیا ہے کیا وہ محفوظ ہیں؟

جی ہاں، وہ دستاویزات محفوظ ہیں۔ ان کا کچھ حصہ تو امام ابوعبید کی کتاب 'کتاب الاموال' میں درج ہے۔ کچھ حصہ طبقات ابن سعد میں اور کچھ حصہ حدیث کی متفرق کتابوں میں ہے۔ کچھ حصہ بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے۔ ان تمام کتابوں سے جمع کر کے اہل علم و تحقیق نے وثائق نبوی کے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے لکھے ہوئے چھ وثائق اپنی اصلی شکل میں بھی موجود ہیں۔ ان پر ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے فرانسیسی زبان میں ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے جس میں ان سب کے بارے میں مستند اور تاریخی معلومات پر مشتمل قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔

☆

کل آپ نے فرمایا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا۔ آج کے لیکچر میں آپ نے منافرہ کا ذکر کیا ہے جو ایک قسم کا قانون ہے۔

منافرہ کوئی مدوّن قانون نہیں تھا۔ آپ اس کو ایک رواج کہہ سکتے ہیں۔ کل جب میں نے کہا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا تو میری مراد یہ تھی کہ جزیرۂ عرب کے علاقوں میں مدون اور مرتب قانون کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ایسے قانون کی جو پورے عرب کے علاقوں کے لئے مشترکہ طور پر قابل قبول ہو۔ جیسے جسٹینین کا کوڈ تھا جو پوری رومن سلطنت کے لئے ایک مشترک قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ یا دنیا کے کچھ دوسرے حصہ میں اور طرح کے مدوّن

قوانین تھے، ایسا کوئی قانون عرب میں نہیں تھا۔ عرب میں مختلف قبائل کے اپنے اپنے رواجات تھے۔ منافرہ کا رواج قبیلہ قریش اور اس کے موالی میں تھا۔ اس کو اول تو قانون نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ محض ایک رواج تھا۔ اگر اس کو قانون کہا بھی جائے تو یہ مرتب اور مدون نہیں تھا۔ پھر بھی اگر اس کو قانون قرار دینے پر اصرار کیا جائے تو پورے عرب کے لئے نہیں تھا۔ عرب کے بیشتر علاقوں میں اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے میری کل کی بات کی آج کی گفتگو سے تردید نہیں ہوتی۔

☆

آپ نے خلافت کی جو اقسام بقلم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بیان کی ہیں، میرے علم کے مطابق وہ تین ہیں۔ آپ نے صرف دو کا ذکر کیا ہے۔ تیسری اگر کوئی ہے تو بھی بتادیں۔

میرے علم میں تیسری قسم کوئی نہیں ہے۔ میں نے خلافت کی دو ہی قسموں کا ذکر سنا ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء میں خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ دو ہی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کتاب میں تیسری قسم کا ذکر کیا ہو تو وہ میرے علم میں نہیں۔ آپ مجھے بتادیجئے۔ میری یہ ناواقفیت دور اور علم کی کمی پوری ہو جائے گی۔

☆

رسول کریم ﷺ کی داڑھی مبارک کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔ کیا آپ مہندی لگایا کرتے تھے؟

جی ہاں، حضور ﷺ بھی کبھی، خاص طور پر گرمی کے شدید موسم میں، سر اور داڑھی کے بالوں پر مہندی لگایا کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ آپ کی داڑھی کی مقدار کتنی تھی، اس کا کسی روایت میں کوئی متعین سائز نہیں ملتا۔ صحابہ کرام صرف اتنی بات روایت کرتے ہیں کہ 'کان کث اللحیہ'، یعنی آپ کی گھنی داڑھی تھی۔

☆

آپ نے ازرقی کی اخبار مکہ کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خانہ کعبہ میں بتوں کو گرا رہے تھے اور وہاں سے تصویروں کو مٹا رہے تھے تو حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی جو تصویریں وہاں پر کندہ یا آویزاں تھیں، آپؐ نے صحابہ کو ان کے مٹانے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ میں نے استنبول میں ازرقی کا اصل نسخہ دیکھا ہے اس میں روایت موجود ہے۔ اس روایت کے بارے میں بتائیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ علم الانساب کی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا جائے کیونکہ اہل مغرب کے ہاں اس طرح کا مستند ذخیرہ بائبل کے بارے میں بھی نہیں ہے۔

انساب کی کتابوں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی میری ناچیز رائے میں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ مغرب کے جو اہل علم سیرت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ عربی جانتے ہیں۔ خود انہوں نے عربی کی بہت سی کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ اس لئے ایسی چیزیں ان کو پہلے ہی سے دستیاب ہیں اور وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ انساب کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ عام لوگوں کے لئے شاید مفید نہ ہو، اس لئے کہ علم انساب کی کتابوں کا اسلوب عام قارئین کی دلچسپی کی چیز نہیں ہے۔ وہ متخصصین کی دلچسپی کی چیز ہے۔

ازرقی کی اس روایت کے بارے میں میں نے کوئی تحقیق نہیں کی اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض لوگ سختی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ازرقی نے صحیح لکھا ہے۔ میں نے کہہ سکتا کہ حضور نے واقعی ایسا کیا یا نہیں کیا۔ لیکن ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور مسلمانوں کے دور عروج میں کبھی بھی اس فن کی عام حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

خصائص نبوی کو ائمہ سیر کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں؟

خصائص نبوی پر کلامیات سیرت میں بات ہوگی۔ اس سے مراد بعض وہ چیزیں ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہیں۔ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے 'خالصةً لک من دون المومنین'، یہ بات آپ کے لئے خاص ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ اس طرح کی چیزوں پر لوگوں نے علمی انداز میں بھی بات کی ہے اور کلامی اور فلسفیانہ انداز میں بھی بات کی ہے۔ اس پر ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر بات ہوگی۔

☆

سیرت نگاروں کا ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ حضور کا دوسرے انبیاء کے ساتھ تقابل کر کے حضور کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ اس بارے میں بعض مفکرین کی رائے یہ ہے کہ یہ عمل ناپسندیدہ ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

واقعی عمل تو یہ ناپسندیدہ ہی ہے۔ حضور نے اس سے منع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے حضرت یونسؑ بن متیٰؑ پر حضور کو فضیلت دی تھی تو آپ نے منع فرما دیا تھا اور ایسا کرنے کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ اس لئے صحابہ کرام اس طرح کے موازنے نہیں کیا کرتے تھے، ہمیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ صفات جو قرآن پاک یا مستند احادیث میں آئی ہیں ان کو بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس سے اگر بالواسطہ طور پر دوسرے انبیا کے مقابلہ میں آپ کی فضیلت ثابت ہو جاتی ہے تو غالباً اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

☆

آپ نے ہند بن ابی ہالہ کی جو روایت بیان کی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ راہ چلتے وقت اپنے اصحاب کو آگے رکھتے تھے اور خود پیچھے رہتے تھے۔ جب کہ قرآن میں سورۃ الحجرات میں آیا ہے کہ 'لا تقدموا بین یدی اللہ

ورسولہ'۔

لا تقدموا سے physical تقدم مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور کے آگے زیادہ بڑبڑ نہ کرو، زیادہ بولومت اور حضور کے آگے اپنی بات نہ کہو، بلکہ ان کی بات سنو۔ یعنی جسمانی طور پر آگے پیچھے ہونا مراد نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نماز پڑھائی۔ حضور نے آ کر پیچھے نیت باندھی۔ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نماز پڑھا رہے تھے اور حضور پیچھے تھے۔ قافلوں میں حضور جایا کرتے تھے تو کچھ لوگ آگے ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے۔ دنیا میں جو بھی ہوگا تو کوئی اس کے آگے ہوگا کوئی پیچھے ہوگا۔ یہ حضور کی زندگی میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک اضافی بات ہے کہ آپ آگے پیچھے کس کو کہتے ہیں۔ اگر مغرب کو آگے کہتے ہیں تو پوری دنیائے مغرب حضور کے آگے کھڑی ہے۔ اس لئے لا تقدموا کا محض لغوی مفہوم یہاں مراد نہیں ہے۔

☆

آپ نے ظاہری اور باطنی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے تمام صحابہ کے بارے میں فرمایا کہ ان کو باطنی خلافت عطا ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ باطنی خلافت حضرت علیؓ کو عطا ہوئی۔

اگر حضور نے باطنی خلافت کی کوئی خاص تعلیم حضرت علی کو دی ہو اور کچھ اور خاص خاص صحابہ کو بھی دی ہو تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ تھا کہ لوگوں کو ان کی استطاعت اور اہلیت کے مطابق دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو تعلیم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کو دی تھی وہ عام بدوی صحابہ کو نہیں دی۔ عام بدوی صحابہ کو چند باتیں بتانے پر اکتفا فرمایا۔ خاص صحابہ کو خاص باتیں بتائیں۔ کچھ صحابہ کو آئندہ آنے والے فتنوں کے بارے میں بتایا اور ان کی بہت سی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جبکہ دوسرے صحابہ کو یہ تفصیلات نہیں بتائیں۔ مثال کے طور پر حضرت حذیفہ بن الیمان کو آپ نے

منافقین کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کے علم میں فتن کی بعض احادیث تھی جو عام لوگوں کے علم میں نہیں تھیں۔ اس کی خصوصی تربیت اور تعلیم سے بقیہ صحابہ کی خلافت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

☆

سیرت کا وہ کون سا پہلو یا کون سا مطالعہ ہے جو سیرت کلچر کی تشکیل وترتیب کو واضح کرتا ہے؟ معاشرہ کا وہ پہلو جس میں تفریح اور آرٹ کی اہمیت ہے، سیرت میں اس تذکرہ کس عنوان کے تحت کرنا چاہئے؟

سیرت میں اجتماعیات کی جو عام باتیں ہوں گی اس میں تفریح کا تذکرہ بھی آئے گا۔ محدثین نے تذکرہ کیا ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تفریح میں حصہ لیا کرتے تھے۔ حضور نے گھوڑ دوڑ کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ کشتی کے مقابلے بھی دیکھے ہیں۔ اُس زمانے کے عام رواج کے مطابق صحابہ شعروشاعری کا ذکر کر رہے ہوتے تھے تو حضور اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ صحابہ پرانے واقعات بیان کر رہے ہوتے تھے تو حضور اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اس لئے یہ چیز اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اگر کوئی مفید بات یا اچھی چیز کسی علاقہ میں رائج ہے اور شریعت کے خلاف نہیں ہے تو اس میں حصہ لینا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے مقامی ثقافتوں کی وہ تمام چیزیں جن میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو ان کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو شریعت سے متعارض سمجھا گیا ہو، یا ان کا تعلق یا رشتہ کسی غیر اسلامی روایت سے ملتا ہو، جیسے ہمارے ہاں ہندوانہ روایات کی کئی چیزیں مروج ہوگئی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے۔

☆

آپ نے اپنے خطاب میں بعض دستاویزات کا حضور سے غلط منسوب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح بعض نوادرات بھی حضور سے منسوب ہیں۔ مثلاً لاہور کی بادشاہی مسجد میں

حضور کے نعلین مبارک یا موئے مبارک۔ ان کی نسبت کس حد تک درست ہے؟

لاہور کے نعلین مبارک کی تاریخی حیثیت بارے میں تو مجھے علم نہیں۔ غالباً وہ چوری بھی ہو گئے تھے جو ابھی تک بازیاب نہیں ہوئے۔ لیکن موئے مبارک کے اکثر نمونے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اور تمام محدثین نے لکھا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے خط بنوایا تو دور دراز سے آنے والے صحابہ کرام نے آپ کے موئے مبارک آپس میں بانٹ لئے تھے۔ جب حضور نے صحابہ کی دلچسپی دیکھی تو خود بھی موئے مبارک صحابہ کرام کو عطا فرمائے۔ جب نائی نے حضور کے سر مبارک کے ایک طرف استرا پھیرا تو حضور نے دست مبارک میں بھر کر اس طرف کے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرما دئے اور جب نائی نے دوسری طرف سے کاٹا تو دوسری طرف کے لوگوں کو عطا فرما دیئے۔ جب اتنے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرمائے گئے دیا تو صاف ظاہر ہے کہ موئے مبارک بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر بات ہے جس کے پاس حضور علیہ السلام کا موئے مبارک ہوگا تو اس نے ضائع نہیں کیا ہوگا۔ مسلمانوں میں آثار رسول کی اتنی بے توقیری کبھی بھی نہیں ہوئی کہ کسی خاندان میں موئے مبارک ہو اور اس نے ضائع کر دیا ہو۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں موئے مبارک پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔

دوسرے تبرکات اور آثار نبویؐ کو تاریخی طور پر ثابت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان کا وہ استناد تو نہیں ہے جو قرآن پاک یا احادیث کا ہے۔ لیکن حضور سے جو چیز منسوب ہے اس سے محبت اور احترام کا تعلق رکھنا چاہئے۔ اگر کوئی چیز واقعی حضور ﷺ کی ہے تو پھر تو واجب الاحترام ہے ہی، لیکن اگر نہیں ہے تو بھی حضور سے منسوب ہونے کی وجہ سے اس کا احترام ہونا چاہئے۔ توہین اور بے اعتنائی کا رویہ میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔

-☆-

تیسرا خطبہ

علم سیرت

آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع

تیسرا خطبہ

علم سیرت

آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم وعلیٰ اله و اصحابه اجمعین

قابل احترام جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
محترم جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان،
سربراہ، ادارہ تحقیقات اسلامی،
برادران معظم،
خواہران محترم!

آج کی گزارشات کا عنوان ہے: 'علم سیرت: آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع'۔ گزشتہ دو دنوں کی نشستوں میں علم سیرت کی ضرورت واہمیت، علم سیرت کے مضامین اور مندرجات کی وسعت کے بارے میں گزارشات پیش کی گئیں۔ آج کی گفتگو میں جو موضوعات زیر بحث آئیں گے ان میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ علم سیرت کی ابتدا کس طرح ہوئی، علم سیرت کے آغاز میں کس کس شخصیت نے، کن کن محدثین، کن کن سیرت نگاروں اور اہل علم نے حصہ لیا اور کس طرح اس عظیم الشان علم کی داغ بیل ڈالی گئی جس کا ایک مختصر سا منظر کل کی گفتگو میں پیش کیا گیا۔ اگر علم سیرت کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ علم سیرت اب تک سات مختلف مدارج و مراحل سے گزرا ہے اور اب آٹھویں مرحلہ یا آٹھویں درجہ میں

داخلہ کے لئے تیار ہے۔

تدوین سیرت کا سب سے پہلا مرحلہ معلومات اور ڈیٹا کی جمع اور فراہمی کا مسئلہ تھا۔ اس مرحلہ کا اصل اور بنیادی ہدف یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات بابرکات کے بارے میں تمام متعلقہ معلومات کو جمع کرلیا جائے، ان کو ضائع ہونے یا فراموش ہونے سے محفوظ کرلیا جائے اور آئندہ آنے والی نسلوں تک اس کو پہنچا دیا جائے۔ اس مرحلہ کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ تو وہ تھا جو اللہ رب العزت کی حکمت بالغہ اور تکوینی حکم سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت سے بہت پہلے شروع ہوگیا تھا۔ کل ہم نے علم الانساب کے تعارف میں دیکھا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجداد، آپ کے خاندان، آپ کی امہات، آپ کی دادیوں اور نانیوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یقیناً اُن لوگوں کے علم میں جو یہ معلومات جمع کر رہے تھے، کہیں دور دور بھی یہ خیال نہیں تھا کہ یہ معلومات کس کی خاطر جمع کی جارہی ہیں۔ یہ ڈیٹا کس کی وجہ سے جمع کیا جارہا ہے۔ کس کے جمال کو سامنے لانا مقصود ہے کہ یہ سارے پردے ایک ایک کرکے ہٹائے جارہے ہیں۔ لیکن یہ ساری معلومات انہی حضرات کے ہاتھوں جمع ہوئیں جن کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ یہ کام کیوں کر رہے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک جاری رہا۔ اسی پہلے مرحلے کے دوسرے حصہ کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے فوراً بعد شروع ہوا۔ اور جب تک صحابہ کرام اس دنیا میں موجود رہے، اُس وقت تک یہ مرحلہ بھی موجود رہا۔ آخری صحابی کا انتقال کب ہوا، اس کے بارے میں محدثین میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ عام طور پر محدثین کا اتفاق ہے کہ 105 یا 106 ہجری میں آخری صحابی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کے ذریعے آنے والی معلومات کا راستہ بند ہوگیا۔

پھر تدوین سیرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کو ہم دورِ تدوین وترتیب کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ذریعے جو معلومات آئی تھیں، اور پہلے سے جو معلومات حضورؐ کے خاندان، جغرافیہ عرب، اور آپؐ کے قبیلے اور برادری کے بارے میں دستیاب تھیں۔ ان سب کو اس طرح سے موضوع وار مرتب کرنے کا کام کرلیا

جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا وہ نقشہ مکمل طور پر دنیا کے سامنے آجائے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ تدوین وترتیب کا یہ مرحلہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مکمل ہوا۔ اندازاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرحلہ 210 ہجری کے لگ بھگ ختم ہوگیا۔ محدثین نے تابعین کا آخری زمانہ 170 اور 175 کے قریب قرار دیا ہے اور تبع تابعین کا آخری دور 210 اور 215 ہجری کے قریب قرار دیا ہے۔ گویا 210 اور 215 ہجری کے درمیان یہ مرحلہ بھی ختم ہوگیا۔ جو جو مجموعے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ہاتھوں مرتب ہونے تھے، وہ اس دور میں مرتب ہوگئے۔ وہ سارا ذخیرہ معلومات محفوظ ہوگیا۔ اب اس وقیع اور قیمتی ذخیرہ معلومات کے ضائع ہونے کا خدشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

تیسرا دور جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تصنیف وتالیف کا دور ہے۔ یہ سن 200 ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا اور کم بیش اگلے 200 سال تک جاری رہا۔ 400 ہجری تک یہ مرحلہ بھی تقریباً مکمل ہوگیا۔ اس دور میں پہلے دونوں ادوار، بالخصوص دوسرے دور سے آنے والے تمام چھوٹے بڑے مجموعوں کو جمع کر کے مفصل اور مکمل کتابیں تیار کی گئیں۔ سیرت کو ایک باقاعدہ علم کے طور پر منظم اور مرتب کیا گیا۔ اور وہ ذخیرہ ہم تک پہنچ گیا۔

اس دور کی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب جو انتہائی قابل ذکر ہے وہ علامہ عبدالملک بن ہشام کی کتاب کا وہ نسخہ ہے جو انہوں نے ابن اسحاق کے کام کی بنیاد پر تیار کیا۔ یہ تیسری صدی ہجری کے آغاز کا کام ہے۔ ترتیب وتدوین کا یہ مرحلہ اگلے دو سو سال تک جاری رہا۔

چوتھا مرحلہ جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سن 400 سے شروع ہوا، اور آئندہ مزید دو سو سال تک جاری رہا، اس کو مرحلۂ استیعاب واستقصاء کہہ سکتے ہیں۔ یعنی سیرت سے متعلق تمام بلاواسطہ معلومات کا مکمل سروے اور استیعاب واستقصاء۔ واضح رہے کہ سیرت کے بارہ میں علم حدیث اور سیرت کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی بہت سی قیمتی معلومات موجود تھیں۔ مختلف علوم وفنون میں منتشر طور پر یہ معلومات موجود تھیں، کچھ معلومات علم تفسیر میں تھیں، کچھ علم حدیث میں تھیں، کچھ مورخین مرتب کررہے تھے۔ کچھ معلومات لغت نویس مرتب کررہے تھے۔ کچھ معلومات جغرافیہ نویسوں کے پاس تھیں۔ ان سب کو جمع کر کے اور پچھلے دو ادوار میں مرتب کردہ

سیرت کے چھوٹے مجموعوں میں دستیاب مواد کو از سر نو کنگھال کر بڑے بڑے مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ یہ دور سیرت مبارکہ پر بڑی بڑی کتابوں کا دور ہے۔ اس دور میں چھ چھ، آٹھ آٹھ اور دس دس جلدوں پر مشتمل ضخیم اور جامع کتابیں لکھی گئیں جن میں بہت سی کتابیں آج ہمارے پاس مطبوعہ اور بعض مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔

پانچواں دور جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً 600 ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا اور آج سے کم وبیش ڈیڑھ دوسو سال پہلے تک جاری رہا۔ یہ تجزیہ، مطالعہ اور تشعیب یعنی diversification کا زمانہ ہے۔ اس دور میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مطالعے سامنے آئے۔ کل عرض کیا گیا تھا کہ کتاب النبی، وثائق النبی، رسول اللہ ﷺ کے دور کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے بارے میں، صحابہ کرام کے الگ الگ طبقات اور مجموعوں پر سارا کام تقریباً اسی دور میں ہوا۔ سیرت کے بارہ میں دستیاب تمام معلومات اور جزئیات کو اہل علم، محدثین اور سیرت نگاروں نے اس طرح منقح کر دیا کہ ایک ایک پہلو الگ الگ ہمارے سامنے آ گیا۔

چھٹا دور انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوا۔ تقریباً 1280ء کے لگ بھگ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ، علوم سیرت میں تجدید کا زمانہ آیا۔ سیرت پر ایک نئے انداز سے غور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سیرت کے بارے میں مغربی دانشوروں نے وسیع پیمانہ پر زور وشور سے اظہار خیال کیا۔ بہت سے سوالات ایسے اٹھائے جو پہلے گزرے ہوئے مسلمان سیرت نگاروں کے سامنے نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے انداز سے سیرت پر کام کر رہے تھے۔ جو شخص اپنا سمجھ کر سیرت پر کام کرے گا اس کا انداز اور ہوگا۔ جو پرائی نظر سے دیکھے گا اس کا انداز اور ہوگا۔ جو مسلمانوں کے اندر بیٹھ کر لکھے گا اس کا انداز مختلف ہوگا اور جو باہر سے دیکھ کر لکھے گا اس کا انداز دوسرا ہوگا۔ پھر موافقانہ اور مخالفانہ نظروں سے دیکھنے سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بدنیتی سے دیکھنے والا اور طرح کے سوالات اٹھائے گا۔ نیک نیتی سے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں اور طرح کے سوالات پیدا ہوں گے۔ جو محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھے گا اس کی کیفیت ہی اور ہوگی۔ اور جو دشمنی کی نظر سے دیکھے گا اور کمزوریوں کی تلاش میں مطالعہ کرے گا وہ اور طرح کے مسائل میں الجھ جائے گا۔ ان اسباب کی بنا پر مغربی مصنفین نے بہت سے سوالات

اٹھائے۔ بعض سوالات حقیقی تھے اور بظاہر علمی انداز کے تھے۔ ایسے سوالات کا جواب سیرت نگاروں، محدثین اور اہل علم نے دیا اور سیرت کے فن کو ایک نئی جہت یعنی dimension سے روشناس کیا۔ ان نئی نئی جہتوں کے ساتھ ساتھ مغربی اہل علم کی طرف سے بہت سے اعتراضات بھی کئے گئے اور شبہات کا بھی اظہار کیا گیا جن کا مسلمان محققین اور سیرت نگاروں کی طرف سے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ جب تک اس کے سامنے کوئی شبہ یا سوال پیش نہ کیا جائے، بہت سی سادہ حقیقتوں پر بھی وہ غور نہیں کر پاتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ یا تاریخ کا کوئی حادثہ سامنے ہوتا ہے۔ مورخین اس کو بیان کرتے رہتے ہیں۔ بہت بعد میں کہیں جا کر لوگ اس پر کوئی خاص سوال اٹھاتے ہیں تو پھر اس کے جواب پر غور شروع ہوتا ہے اور دستیاب مواد کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے تجدید سیرت کے اس دور میں مغربی مستشرقین نے بہت سے سوالات اٹھائے۔ ان سوالات کی روشنی میں سیرت کے علم کو ایک نئی جہت دینے میں بڑی مدد ملی۔

دور حاضر کا آغاز کب سے ہوا، یہ تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ دراصل دور حاضر کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ جس کو زمانہ موجود کہتے ہیں وہ ایک غیر حقیقی چیز ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ زمانہ یا ماضی ہوتا ہے یا مستقبل ہوتا ہے۔ حال سے مراد وہ باریک فرضی خط ہے جو ماضی کو مستقبل سے جدا کرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے کی چیز ماضی ہے اور ایک لمحہ بعد آنے والا وقت مستقبل ہے۔ ان کے درمیان جو باریک فرضی خط ہے وہ حال ہے۔ اس لئے زمانہ حال جس کو کہتے ہیں وہ محض ایک مجازی بات ہے۔ اس میں ماضی قریب اور مستقبل قریب کو ملا کر ایک فرضی اور عارضی چیز بنالی جاتی ہے جس کو زمانہ حال کہا جاتا ہے۔ لہٰذا درحقیقت زمانہ حال کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لئے زمانہ حال پر جب سیرت النبی کے حوالے سے بات کی جائے تو ماضی قریب میں جو کچھ ہوا اور مستقبل قریب میں جو کچھ ہونے کی امید ہے اس کو زمانہ حال سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

آئندہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں یعنی foreseeable future میں علم سیرت کو کون کون سے مسائل اور چیلنجز درپیش ہیں۔ آئندہ کن موضوعات پر کام ہونے کا اور کس

طرح کے سوالات اٹھائے جانے کا امکان ہے۔ مسلمان اہل علم اور سیرت سے دلچسپی اور شغف رکھنے والوں کو کن مسائل کی جواب دہی اور تحقیق کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس پر ان شاء اللہ آخری گفتگو میں بات ہوگی۔

یہ ادوار بہت ہی متعین اور حتمی طور پر طے شدہ نہیں ہیں۔ ان میں خاصا تداخل پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں دور 200 میں ختم ہوگیا اور فلاں دور 600 میں ختم ہوگیا، یہ شاید قطعیت کے ساتھ درست نہ ہوگا۔ 200ھ سے کچھ معاملات آگے جاچکے ہوں گے۔ بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ دور سنہ ڈیڑھ سو ہجری سے شروع ہوا ہوگا، بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ 210 میں شروع ہوا ہوگا۔ لیکن ایک عمومی اندازہ کرنے کے لئے یہ حد بندیاں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

کل میں نے اشارۃً عرض کیا تھا کہ اپنے اکابر اور اپنے اسلاف کے کارناموں میں دلچسپی لینا اور ان کو محفوظ رکھنا، خاص طور پر آئندہ نسلوں میں اعتماد پیدا کرنا عرب میں ایک طویل عرصہ سے مروج تھا۔ یہ وہ چیز تھی جس کو ایام العرب کہتے تھے۔ ہر عرب قبیلہ اس طرح کے ایام سے متعلق اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں اور ان کی یادداشتوں کو محفوظ رکھتا تھا۔ ہر بڑے بڑے قبیلے کے ایام مشہور ہیں۔ ربیعہ کے ایام مشہور ہیں۔ مضریوں کے بہت سے ایام مشہور ہیں۔ شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے قبائل کے مشہور واقعات اور ایام کی تفصیلات عربی ادب میں اور تاریخ کی قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔ جہاں ہر قبیلہ اپنی کامیابیوں کی تفصیلات محفوظ رکھتا تھا اور بیان کرتا تھا۔ وہاں ان کارناموں کے دوران یا ان پر تبصرہ کرنے کے لئے جو شعر اور قصائد کہے گئے، وہ بھی ان کا حصہ تھے اور وہ بھی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے قبائل کی شکست اور ناکامیوں کی تفصیلات بھی محفوظ رکھی جاتی تھیں تاکہ آئندہ اس قبیلہ کے خلاف اقدام کرنے میں ان سے مدد ملے۔ جو کردار آج صحافت ادا کرتی ہے کہ جس کو اٹھانا ہو اس کو اٹھاتی ہے اور جس کو گرانا ہو اس کو گراسکتی ہے۔ ذرائع ابلاغ جس کو شہرت دینا چاہتے ہوں ان کو شہرت ملتی ہے اور جن کے بارے میں منفی رائے قائم کروانی ہو تو ان کے بارے میں ذرائع ابلاغ منفی رائے بھی قائم کراسکتے ہیں۔ اُس زمانے میں بڑی حد تک یہ کردار شاعر ادا کرتے تھے۔ ہر بڑے قبیلے کا ایک شاعر ہوتا تھا۔ اُس قبیلے کے

ایام اُس کے شاعر کی زبان سے قصائد کی صورت میں ادا ہوتے تھے۔ قبیلے کا بچہ بچہ ان قصائد کو یاد رکھتا تھا۔ اور وہ قصائد ہر فخریہ موقع پر بیان کئے جاتے تھے۔

اسی طرح سے صحابہ کرام نے اس رواج اور طریقہ کار کو سامنے رکھتے ہوئے، جس کو ہم ایام النبی کہہ سکتے ہیں، یا ایام الرسول، اس کے بارے میں تفصیلات جمع کیں۔ ان کو محفوظ رکھا۔ ان ایام کے بارے میں شاعر صحابہ نے جو قصائد لکھے تھے وہ سب کے سب سیرت نگاروں نے محفوظ رکھے ہیں۔ سیدنا حسان بن ثابت شاعر دربار رسالت کہلاتے ہیں، ان کے قصائد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کے قصائد ہیں۔ حضرت کعب بن مالکؓ بھی نامور شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے قصائد ہیں۔ اسی طرح جو صحابہ شاعر نہیں تھے، وہ بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، ان سب کے شعر محفوظ ہیں اور قدیم کتب سیرت میں بیان ہوئے ہیں۔

ایسے شعرا بھی تھے جو پہلے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور بعد میں قبول اسلام کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور حمایت میں سامنے آئے۔ ان کے دونوں ادوار کے نمونے محفوظ ہیں۔ حضرت کعب بن زہیر جو اپنے مشہور قصیدہ 'قصیدہ بانت سعاد' کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے دور کا کلام معروف اور مشہور ہے۔ دوسرے دور کا کلام بھی محفوظ اور مشہور ہے۔ مشہور شاعر اور قبائلی سردار ابوسفیانؓ بن الحارث جن کا تذکرہ کتب حدیث میں بہت آتا ہے، ان کا کلام بھی محفوظ ہے۔ بہت سے طلبہ ان کو ابوسفیان بن حرب، حضرت معاویہؓ کے والد سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ بچپن میں حضور کے انتہائی قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے بہت محبت تھی۔ لیکن اعلان نبوت کے بعد کسی وجہ سے پیغام کو قبول نہیں کر پائے۔ مخالفت میں بہت دور چلے گئے اور زبانی، جسمانی، مالی ہر طرح سے حضور کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ مخالفت میں جتنا کلام ابوسفیان کی زبان سے ادا ہوا، اتنا کلام شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ بعد میں ایک موقع پر فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا اور پھر حضور کی محبت اور عقیدت میں کسی اور صحابی سے پیچھے نہیں رہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ جب غزوہ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور حضورؐ

کے ساتھ چند ہی لوگ رہ سکے، ان میں سے ایک نام ابوسفیانؓ کا بھی آتا ہے۔ وہ یہی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے جس جان نثاری سے حضور کا دفاع کیا، اس کے بارہ میں کسی نے کہا، مجھے یاد نہیں کہ یہ حدیث ہے یا کسی صحابی کا قول ہے، لیکن اس موقع پر کہا گیا کہ 'ابوسفیان نے پچھلی ساری کسر پوری کر دی'۔ یہ واقعات تھے جو صحابہ کرام نے سب سے پہلے محفوظ رکھے۔ جن صحابہ کرام کی زبان سے محفوظ ہوئے، وہ شاعر بھی تھے اور ماضی میں ایام العرب میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے۔

کل کی گزارشات میں عرض کیا گیا تھا کہ سیرت پاک کے مصادر اور بنیادی مآخذ میں قرآن پاک بھی شامل ہے۔ قرآن پاک کی تدوین اور جمع بھی ایک طرح سے سیرت کی جمع اور تدوین کے مترادف ہے۔ جب قرآن پاک جمع ہو رہا تھا اور اس کو مدون کیا جا رہا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ سیرت بھی مدون ہو رہی تھی۔ قرآن پاک میں سیرت کے تمام اہم واقعات، خاص طور پر ہجرت سے لے کر حضور ﷺ کے آخری غزوہ یعنی غزوہ تبوک تک ہر اہم واقعہ پر قرآن پاک میں تفصیلی تبصرہ موجود ہے۔ مکی دور میں کفار مکہ نے جو اعتراضات کئے، جو سوالات کئے، جو شبہات کئے، ان سوالات کا جواب بھی ہے، شبہات کی وضاحت بھی ہے، غلط فہمیوں اور الجھنوں کی تردید بھی ہے۔ اس طرح سے مکی دور گویا دعوت اسلامی کے نظری پہلوؤں کو اور مدنی دور دعوت اسلامی کے عملی پہلوؤں کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔ قرآن پاک سے مثالیں دی جائیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ لیکن مثال کے طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ بدر کے واقعات قرآن پاک کی سورۃ انفال میں موجود ہیں، **'کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقاً من المومنین لکارھون'**۔ اسی طرح سے غزوہ بدر پر پورا تبصرہ سورۃ انفال میں موجود ہے۔ ہجرت کے واقعات سورۃ توبہ کے ایک حصہ میں بیان ہوئے ہیں۔ غزوہ تبوک پر تبصرہ سورۃ توبہ کے ایک حصہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں منافقین کے وجود، ان کی سازشیں اور کرتوت تمام چیزوں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ منافقین نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے کے لئے جو مسجد بنائی، مسجد ضرار، جس کو حضورؐ کے حکم سے گرا دیا گیا، یہ واقعہ قرآن پاک میں مسجد ضرار کے نام کی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ظاہر ہے قرآن پاک کی تدوین کے ساتھ ساتھ یہ سارے معاملات بھی مدون ہو گئے۔

یہ تدوین سیرت کا پہلا مرحلہ تھا۔ قرآن پاک کی تدوین کی مزید تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اختصار کے ساتھ دو تین اشارے کئے جاسکتے ہیں۔ قرآن پاک شاید پہلی اور یقیناً آخری مذہبی کتاب ہے جس کو اس کے نزول کے ساتھ ساتھ نہ صرف ضبط تحریر میں لایا گیا بلکہ اس کے سینکڑوں اور ہزاروں نسخے بیک وقت تیار ہوئے اور اُس کو سینکڑوں اور ہزاروں صحابہ کرام نے اسی وقت زبانی یاد کرنا شروع کیا۔ زبانی یاد کرنے کی روایت تو یقیناً آج بھی کسی قوم میں موجود نہیں ہے۔ آج بھی کسی قوم میں مذہبی کتابوں کے حفاظ نہیں پائے جاتے۔ صرف قرآن پاک کے حفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن پاک جس طرح سے لکھا گیا اس طرح سے کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہوئی تختیاں دے دیں۔ 'فاخذ الالواح' انہوں نے وہ تختیاں لے لی اور اپنی قوم کو دے دیں۔ یہ تختیاں طویل عرصہ تک ایک تابوت میں محفوظ رہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ وہ تابوت جب ایک جنگ میں گم ہو گیا تو تورات بھی گم ہو گئی۔ اس کے بعد سے آج تک اصلی تختیوں پر لکھی ہوئی تورات نہیں ملی۔ اس واقعہ کے کئی سو سال بعد ایک بزرگ نے، جو ہمارے عقیدہ کے مطابق پیغمبر تھے، لیکن یہودی ان کو پیغمبر نہیں مانتے، ربی کہتے ہیں۔ ان بزرگ نے بقول یہودیوں کے اپنی یادداشت سے تورات لکھ دی۔ ہم مان لیتے ہیں کہ صحیح لکھ دی ہوگی۔ یہ ایک معجزہ ہی ہوگا اگر انہوں نے اپنی یادداشت سے صحیح لکھ دی ہو۔ لیکن وہ جو لکھ دی تھی وہ بھی بعد میں آگے جا کر ایک دوسری جنگ میں ضائع ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی ربی یا نبی ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے پوری تورات اپنی یادداشت سے لکھی ہو۔ اس کے بعد تورات کے نام سے جو کچھ بھی ہے وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس کے پورے مندرجات کو جوں کا توں کلام الٰہی ماننا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام پر اخلاقی نوعیت کے الزامات ہیں۔ ان الزامات میں نعوذ باللہ قتل، بدکاری اور اغوا کے الزامات بھی شامل ہیں۔ اس تورات میں یہ بھی ہے کہ جب موسیٰ مر گیا تو سڑک کے کنارے ایک چٹان کے نیچے اس کو دفن کر دیا گیا، چنانچہ فلاں جگہ دائیں طرف موسیٰ کی قبر ہے۔ یہ کتاب یقیناً وہ کتاب نہیں ہو سکتی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی کیونکہ اس میں ان کی قبر کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے انتقال کا قصہ بھی بیان ہوا۔ یہی کیفیت دوسری کتابوں کی

بھی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کو لکھوایا ہی نہیں۔ ان کا پیغام زبانی ہی چلتا رہا۔ انہوں نے پیغام کو زبانی طور پر پہنچانے پر اکتفا کیا۔ یہی حال بقیہ کتابوں کا ہے۔ اس لئے قرآن مجید پہلی اور آخری کتاب ہے جو اپنے نزول کے ساتھ ساتھ لکھی گئی اور لکھوائی گئی۔ مکہ کے روز آغاز سے ہی اس کو لکھوایا جانا شروع کر دیا گیا۔ ایک واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر فاروق جب قبول اسلام کے دن غصہ کے عالم میں اپنی بہن کے گھر گئے۔ وہاں ان کو اندر سے ایک آواز سنائی دی جس کو سننے کے بعد وہ مزید غصہ کے عالم میں اندر پہنچے۔ وہاں ایک صحابی حضرت خباب بن ارتؓ کاغذ کا ایک پرزہ لئے ہوئے سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات حضرت عمر کی بہن اور بہنوئی کو پڑھا رہے تھے۔ بہن نے وہ وہ کاغذ یا جس چیز پر بھی وہ آیات لکھی ہوئی تھیں، اس کو اپنے گھٹنے کے نیچے رکھ لیا۔ حضرت خباب ایک دوسرے کمرے میں چھپ گئے اور حضرت عمرؓ کو اندر بلا لیا گیا۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور سے ہی مکہ مکرمہ کے انتہائی مشکل دور میں اور انتہائی پریشانی کے زمانے میں بھی اس بات کا اہتمام تھا کہ جیسے جیسے قرآن پاک کی آیات نازل ہوتی جائیں ان کو لکھا جائے۔ ان کو گھر گھر پہنچا دیا جائے اور ایک معلم ہر گھر میں جا کر اس جز کی تعلیم دے دے اور تحریری ذخیرہ بھی فراہم کر دے۔ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہلی اوپن یونیورسٹی تھی جس میں یونٹ بھی لکھے جا رہے تھے۔ طلبہ کو درسی یونٹ بھی فراہم کئے جا رہے تھے اور ایک موبائل معلم لوگوں کے گھروں میں جا کر مختلف اوقات میں ان کو قرآن پاک پڑھاتا بھی تھا۔ مکی دور تک تو یہ طریقہ رہا۔ مدنی دور میں پھر سرکاری سطح پر انتظام ہوا۔ رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے اجزا نازل ہو چکے ہوتے تھے، ان کو سنایا کرتے تھے اور ان دوبارہ مرتب کراتے تھے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ 'وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهي تملی علیهم بکرة واصیلا'۔ مفہوم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کہتے ہیں کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ان کو صبح شام پڑھ کر سنایا جاتا ہے اور اکتتبہا یعنی یہ لوگوں سے لکھواتے ہیں۔ یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی تھی رسول اللہ ﷺ اس کو

بلا کر لکھوا دیا کرتے تھے۔ اور جس صحابی کے پاس لکھنے کا جو بھی ذریعہ ہوتا تھا وہ اس کے حساب سے اس کو لکھ دیا کرتے تھے۔ کاغذ پر بھی، رق پر، جانوروں کی جھلیوں پر، لکڑی اور پتھر کی تختیوں، پتوں پر اور اونٹ کے کندھے کی ہڈی سے بنی ہوئی تختی پر۔ پھر جب کوئی سورۃ مکمل ہو جاتی تھی تو رسول اللہ ﷺ ہدایت فرمادیا کرتے تھے کہ وہ سارے اجزا لے آؤ۔ صحابہ وہ سارے اجزا لا کر اور پڑھ کر سناتے تھے اور اب حضورؐ ان کو بتاتے کہ اس سورت کی آیات کی ترتیب یہ ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت کی ایک روایت ہے 'کنا نولف القرآن من الرقاع عند رسول الله ﷺ'، کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہ سارے پرزے اور پرچے لے جایا کرتے تھے اور قرآن پاک کو اس کے ترتیب کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ یہ نظام حضور کے زمانے میں جاری رہا۔ رمضان کا مہینہ جب آتا تھا تو رسول اللہ ﷺ قرآن پاک کا ایک خاص دور کیا کرتے تھے، جس کا صحیح بخاری میں تذکرہ ہے۔ صحابہ کرام کو بلایا جاتا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ ہوتا تھا وہ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی تصدیق فرماتے اور جہاں غلطی ہوتی اس کی اصلاح فرماتے۔ پھر حضورؐ پڑھتے تھے اور صحابہ کرام اپنے لکھے ہوئے نسخوں میں اصلاح کیا کرتے تھے۔ اسی طرح حضور اور جبرئیل امین کے درمیان بھی ایک دور ہوا کرتا تھا۔ جب آخری رمضان تھا تو جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ حضور کا دور دو مرتبہ ہوا۔ حضور نے حضرت ابوبکر صدیق کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ اس مرتبہ جبرئیل نے میرے ساتھ دو مرتبہ قرآن کا دور کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا آخری رمضان ہے۔ اس کے بعد شاید یہ موقع نہیں آئے گا۔ وہ رمضان واقعی آخری رمضان ثابت ہوا۔

اس تھوڑی سی تفصیل سے، جو بہت اختصار کے ساتھ میں نے پیش کی، پتہ چلا کہ قرآن پاک جس میں سیرت کے بارے میں تبصرے اور معلومات بھی شامل تھیں، رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے مکمل طور پر مرتب ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام میں سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو ترتیب کے ساتھ مکمل طور پر زبانی یاد تھا اور سینکڑوں اور ہزاروں صحابہ کرام ایسے تھے جن کو جزوی طور پر بغیر ترتیب کے یاد تھا۔ سینکڑوں صحابہ کرام ایسے تھے جن کے پاس یہ سارے اجزا لکھے ہوئے موجود تھے۔ چنانچہ کسی صحابی کے بارے میں ملتا ہے کہ میرے

پاس صندوق میں یہ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ کسی کے بارے میں ملتا ہے کہ میں نے ان سب اجزا کو ایک تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔ کسی کے بارے میں ملتا ہے کہ میں نے یہ سب چیزیں ایک الماری میں محفوظ کی تھیں۔ کاغذ کے پرزے، لکڑی اور پتھر کی تختیاں یہ سب محفوظ تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے جارہے تھے تو قرآن پاک کی یہ صورت حال تھی کہ لاکھوں صحابہ کرام کو جزوی طور پر قرآن پاک یاد تھا۔ ہزاروں کو مکمل طور پر یاد تھا۔ ہزاروں کے پاس تحریری صورت میں غیر مرتب صورت میں موجود تھا۔ بہت سے صحابہ کرام ایسے تھے جن کے پاس تحریری صورت میں مکمل طور پر مرتب موجود تھا۔ انہوں نے اس کو ترتیب دے دیا تھا۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی۔ ان میں 700 صحابہ کرام ایسے تھے جو قرآن پاک کے حافظ تھے۔ حفاظ صحابہ کی اس شہادت سے حضرت عمر فاروق کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر حفاظ صحابہ اس طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کی ترتیب کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوجائے۔ اس لئے کہ ہر ایک کے پاس قرآن پاک کے اجزا سارے کے سارے تحریری طور پر تو محفوظ ہیں۔ ہزاروں صحابہ کرام قرآن کے حفاظ بھی موجود ہیں۔ لیکن اگر حفاظ ایک ایک کرکے دنیا سے چلے گئے تو آئندہ آنے والوں کو یہ التباس پیدا ہوسکتا ہے کہ قرآن کی ترتیب کیا ہے۔ ایک تھیلے میں سب سورتیں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں سورۃ الفاتحہ پہلے ہے، بقرہ پہلے ہے یا آل عمران پہلے ہے؟۔ یہ بعد میں آنے والے غیر حفاظ کو کون بتائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں آنے والا کوئی آل عمران کو پہلے لکھ دے اور بقرہ کو بعد میں لکھے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ سورۃ العلق پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے اس کو پہلے لکھنا چاہئے اور بقیہ سورتوں کو بعد میں لکھنا چاہئے۔ تو ترتیب بدلنے کا پورا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت عمر فاروق نے مشورہ دیا۔ صدیق اکبر نے اس کو تسلیم کیا اور قرآن پاک کا ایک سرکاری نسخہ موجودہ ترتیب کے ساتھ یعنی ترتیب تلاوت کے ساتھ، جس ترتیب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے، جس ترتیب سے آپؐ نے ہر سال دور کیا، جس ترتیب سے صحابہ کرام نے یاد کیا، اس ترتیب سے اس کو مرتب کروادیا گیا اور مسجد میں نبوی میں رکھ دیا گیا۔ صحابہ کرام اپنے طور پر بھی نسخے تیار کرتے رہے۔ بہت سے صحابہ کرام کے اپنے نسخے تھے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بعض صحابہ نے اپنی یادداشت سے نسخے لکھے ہیں۔ بعض نے اپنی یادداشت میں کسی لفظ کے معنی بھی لکھے تھے۔ بعض نے بین السطور میں مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے تھے۔ بعض صحابہ نے اپنی یادداشت والے نسخوں میں کچھ اور معلومات بھی لکھی تھیں۔ کچھ صحابہ کرام نے وہ چیزیں جو ان کو بہت یاد تھیں ان کو لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً اپنی یادداشت کے لئے لکھے جانے والے نسخہ میں بعض صحابہ نے سورۃ فاتحہ نہیں لکھی۔ کچھ صحابہ کو آخری دو سورتیں یاد تھیں، انہوں نے ان کو لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نسخہ میں یہ سورتیں نہیں تھیں۔ ان کا ایک ذاتی نسخہ تھا جس میں انہوں نے سورۃ الفاتحہ اور آخری دو سورتوں کو لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ انہوں نے اپنی یادداشت کے لئے دعائے قنوت لکھی تھی۔ اب اس کا امکان موجود تھا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کا نسخہ ان کے ورثا کے پاس جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی غلط فہمی کا فوری طور پر تو کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لئے کہ وہ تابعین کی نسل تھی۔ تبع تابعین کی نسل میں بھی کسی غلط فہمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں اگر وہ نسخہ کسی مستشرق کی نظر میں آ جاتا تو وہ زمین و آسمان ایک کر دیتا کہ دیکھو! قرآن کے بارے میں محفوظ ہونے کا بڑا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دیکھئے اس نسخہ میں تین سورتیں کم ہیں اور ایک ایسی سورۃ موجود ہے جو مسلمانوں نے قرآن کے سرکاری نسخوں سے نکال دی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے یہ طے کیا کہ جس جس کے پاس قرآن مجید کا جو نسخہ لکھا ہوا ہے وہ سب ضبط کر کے ضائع کر دیا جائے۔ بظاہر یہ فیصلہ بڑا سخت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے ایسا ہی کیا، اور تمام نسخے ضبط کر کے ضائع کرا دیئے اور حکم دیا کہ آئندہ قرآن مجید کے جو بھی نسخے لکھے جائیں وہ اس نسخہ اور اس کے ہجا کے مطابق لکھے جائیں جو اب سرکاری طور پر تیار کرائے گئے ہیں۔ صحابہ کرام کے اتفاق رائے سے حضرت عثمان غنیؓ نے یہ بھی طے کیا کہ قرآن پاک کی ہجا میں اس نسخہ کی پیروی کی جائے جو حضرت زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں لکھا تھا۔ آج تک مشرق و مغرب میں قرآن پاک کے تمام نسخے اسی ہجا کے مطابق لکھے جاتے ہیں جس ہجا کے مطابق حضورؐ کے کاتب خاص حضرت زید بن ثابت نے حضورؐ کی زندگی میں بھی قرآن کی کتابت کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں

قرآن کا مکمل نسخہ تیار کیا۔ اُس میں اور عربی زبان کے ہجا میں کہیں کہیں فرق ہے۔ لیکن قرآن پاک لکھا جاتا ہے تو اُس ہجا کے مطابق، اور اگر عربی کی عام عبارت کوئی لکھتا ہے تو دوسری ہجا کے مطابق لکھتا ہے۔ کتاب کا لفظ قرآن پاک میں بہت سی جگہوں پر ک ت ب اور ت پر کھڑا زبر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ عربی زبان یا اردو اور فارسی میں کتاب کا لفظ لکھیں تو ک ت ب کے ساتھ نہیں بلکہ ت الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ رحمان کا لفظ قرآن پاک میں میم پر کھڑے زبر کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ بعض جگہ کوئی ایک حرف رہ گیا جس کے رہ جانے کی وجہ معلوم نہیں۔ 'وکذالک ننجی المومنین' سترھویں پارے میں ہے۔ اُس میں آپ دیکھیں ایک ہی نون ہے۔ ہمارے جیسے کم سمجھ لوگوں کے لئے کاتبوں نے ایک چھوٹا سا نون الگ سے لکھا ہوتا ہے جو بین السطور لکھا جاتا ہے، متن میں نہیں لکھا جاتا۔ لکھا ہوا ایک نون ہے لیکن پڑھے جاتے ہیں دو نون، 'وکذالک نجی المومنین'۔ ستائیسویں پارے کے شروع میں میں ایک جگہ ہے کہ 'والسماء بنینھا باییدٍ' اس میں دو 'ے' ہیں۔ لیکن پڑھی جاتی ہے ایک 'ے'۔ اس لئے کہ حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھا تھا۔ کیوں لکھا تھا، اس کے بارے میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے جو یہاں غیر ضروری ہے۔ لیکن ان دو مثالوں سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن پاک کے ہجا کے بارے میں بھی خاص طرز املا کی پیروی کی گئی۔ اس طرز املاء سے ایک لفظی یا حرفی انحراف کو بھی جائز نہیں سمجھا گیا اور اس کی سو فیصد پیروی کی گئی۔ گویا سیرت کا جو پہلا، اولین اور بنیادی ماخذ ہے وہ مکمل طور پر ہمارے سامنے آ گیا اور اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ مذہبیات، دینیات، قانون اور فکر و فلسفہ کی پرانی تاریخ میں کوئی چیز بھی اتنی ثقاہت کے ساتھ محفوظ نہیں کی گئی۔ جس چیز کو لاکھوں کروڑوں لوگ زبانی یاد کر لیں اس سے زیادہ تحفظ کسی چیز کا نہیں ہو سکتا۔

سیرت کا دوسرا مصدر ہم نے احادیث صحیحہ کا بیان کیا تھا۔ حدیث کی تدوین کی تاریخ بھی ایک اعتبار سے سیرت کی تدوین کی تاریخ ہے۔ حدیث کی ہر کتاب میں سیرت پاک سے متعلق مستند اور ضروری مواد موجود ہے۔

علم حدیث مسلمانوں میں روز اول سے ایک انتہائی محترم، مقدس اور مقبول علم رہا ہے۔ ہر دور کی سعید ترین روحوں اور بہترین دماغوں نے علم حدیث کی خدمت کی ہے۔ ابھی گزشتہ

چند سالوں کے دوران اردن کے ایک سرکاری ادارے نے اسلامی مخطوطات کی ایک بہت بڑی اور بہت جامع اور مکمل فہرست شائع کی ہے۔ اس ضمن میں علم حدیث کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ان فہرستوں میں صحیح بخاری ہی کے اس وقت تک دستیاب مخطوطات پر ایک مکمل جلد ہے۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں صحیح بخاری کے چھ، سات اور آٹھ آٹھ سو سالوں اور ایک ہزار سال پرانے کئی ہزار نسخے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ جس سے یہ بات بالکل واضح اور ثابت ہو جاتی ہے کہ حدیث کی مستند ترین کتابیں دنیا کے ہر علاقے میں، ہر زمانے میں اور دنیائے اسلام کے ہر شہر میں لکھی گئیں، وہ متداول اور محفوظ رہیں اور ان میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کو میں بطور مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ اس میں امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو اسلام کی دعوت کیسے دی۔ اس باب میں امام بخاری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکمرانوں کے نام جو خطوط لکھے ان میں قیصر روم کے نام لکھا جانے والا خط یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبدالله ورسوله الى هرقل عظيم الروم

اما بعد

سلام على من اتبع الهدى

امابعد فانى ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم، يوتك الله اجرك مرتين، فان توليت فعليك اثم اليريسيين..................

والسلام على من اتبع الهدى

محمد رسول الله

یہ متن امام بخاری نے بیان کیا ہے۔ آج سے کم و بیش ڈیڑھ پونے دو سو سال پہلے اس نامہ مبارک کا اصل متن دریافت ہوا جس پر بہت سے مغربی اور مشرقی ماہرین نے غور کیا۔ اس پر ہزاروں گفتگوئیں ہوئی، مختلف جگہوں پر بحثیں ہوئیں۔ کتابوں میں اس کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا۔ اس دریافت شدہ نامہ مبارک میں اور صحیح بخاری کے اس متن میں ذرہ

برابر فرق نہیں ہے۔ ایک حرف کا بھی فرق نہیں ہے۔ دونوں کے یہی الفاظ ہیں اور یہی متن ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔ اس طرح علم حدیث جو سیرت کا دوسرا سب سے بڑا اور محفوظ ترین ماخذ ہے وہ محفوظ ہے۔

ضمناً ایک چھوٹی سی بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، جس کو مغربی مستشرقین بار بار بیان کرتے رہتے ہیں اور ہمارے ہاں بہت سے لوگ اس فضول اور غیر علمی بات کو بغیر سوچے سمجھے دہراتے رہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ احادیث چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئیں۔ مغربی مصنفین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جس طرح ہر قوم میں کچھ افسانے اور داستانیں مشہور ہوتی ہیں مسلمانوں میں بھی مشہور تھیں۔ محدثین نے ان مشہور قصوں اور کہانیوں کو سنا اور علم حدیث کے نام سے جمع کر دیا۔ یہ محدثین کی کاوشوں کے بارے میں بہت سے مغربی مستشرقین نے لکھا ہے۔ کچھ لوگ دنیائے اسلام میں بھی اس بات کو دہراتے ہیں۔ اس پر پچھلے سو سالوں کے دوران اتنی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ غور ہوا ہے کہ تدوین حدیث کے ایک ایک پہلو پر لوگوں نے درجنوں کتابیں تیار کی ہیں۔ اس خدمت میں بھی ایک بار پھر برصغیر کے اہل علم نے اساسی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کے اہل علم نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ علم حدیث کی سند اور ثقاہت کن بنیادوں پر قائم ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور محقق اور عالم مولانا مناظر حسن گیلانی نے سب سے پہلے تدوین حدیث پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے وہ بنیادیں وضع کیں جن پر آئندہ پچاس سالوں میں کم و بیش ایک درجن محققین نے وقیع کام کیا اور اس بے بنیاد اور جاہلانہ دعویٰ کے تار و پود بکھیر دیئے۔ ان حضرات نے علم حدیث کی تاریخ پر غور کیا اور تحقیق کر کے یہ ثابت کیا کہ صحابہ کرام کے زمانے میں ہی حدیث کی تدوین کا کام خاصا آگے بڑھ چکا تھا۔ صحابہ کرام کے دست مبارک کے تحریر کردہ احادیث کے کم از کم اڑتالیس مجموعوں کا تذکرہ کتب حدیث میں موجود ہے۔ تابعین نے جو مجموعے مرتب کئے ان میں سے جن مجموعوں کی قدیم مآخذ میں نشاندہی ہوتی ہے، کتب حدیث اور سیرت میں، ان کی تعداد ڈھائی سو ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے تابعین کے مرتب کئے ہوئے سات مجموعوں کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے، ان کو ایڈٹ کیا ہے، ان کا انگریزی ترجمہ کیا، انگریزی میں مقدمہ لکھا ہے اور وہ کتاب 'کتاب السرد والفرد' کے نام سے اسلام آباد میں شائع ہو

چکی ہے۔

اس سے پہلے صحابی رسول حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ ان کے شاگرد ہمام بن منبہ نے مرتب کیا تھا وہ نسخہ دریافت ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس کو ایڈٹ کیا۔ انگریزی، اردو، فرانسیسی، جرمن اور دیگر کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ وہ نسخہ بھی آج مطبوعہ موجود ہے۔ ترکی کے ایک انتہائی بالغ نظر اور دور جدید کے صف اول کے محققین میں سے ایک محقق ڈاکٹر فواد سیزگن ہیں، جو جرمنی میں رہتے ہیں، اور جرمن زبان میں انہوں نے اسلامی موضوعات پر انتہائی عالمانہ کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کے مصادر و مآخذ پر ایک کتاب لکھی تھی اور صحیح بخاری کے مآخذ کے بارے میں انہوں نے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا اور جس کا کوئی جواب کسی مغربی مستشرق کے پاس نہیں تھا کہ صحیح بخاری میں جو کچھ مواد شامل ہے وہ نہ صرف سارے کا سارا مستند ترین زبانی روایت کے ساتھ امام بخاری تک پہنچا بلکہ اس میں ہر روایت کے پیچھے مسلسل تحریری ذخائر بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ عبدالرزاق صنعانی امام بخاری کے رواۃ میں شامل تھے۔ وہ امام بخاری کے اساتذہ کے استاذ تھے۔ امام بخاری نے بہت سی روایت عبدالرزاق سے لیں۔ عبدالرزاق کی اپنی کتاب موجود تھی جو اس وقت تک نہیں چھپی تھی اور اب چھپ گئی ہے۔ وہ ساری احادیث جو امام بخاری نے عبدالرزاق کے توسط سے لی ہیں وہ جوں کی توں مصنف عبدالرزاق میں موجود ہیں۔ عبدالرزاق کے استاد تھے معمر بن راشد ازدی۔ ان کی کتاب جامع اُس وقت نہیں چھپی تھی اب چھپ گئی ہے۔ اس میں وہ تمام احادیث جو عبدالرزاق نے معمر بن راشد سے لی ہیں وہ سب جوں کی توں موجود ہیں۔ معمر کے سامنے جو ذخائر موجود تھے ان میں سے بعض چھپ گئے ہیں جن میں وہ احادیث موجود ہیں۔ گویا ایک ایک مرحلے پر زبانی روایتیں درجنوں اساتذہ، تابعین اور تبع تابعین کی موجود تھیں۔ اور ان میں سے ہر روایت کے پیچھے ہر محدث کے پاس تحریری ذخائر اور تحریری سند بھی موجود تھی۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں کئی صحابہ کرام تھے جو حضور کی اجازت سے احادیث لکھنے کا کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ ان کا مزار مبارک مصر میں ہے۔ وہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے

ہیں۔ یہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور والد محترم سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضور کی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ لکھا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، حضور کبھی مزاج کی کیفیت میں ہوں گے، کبھی غصے میں ہوں گے، اس لئے ہر چیز لکھنا شاید درست نہ ہو۔ انہوں نے حضور سے عرض کیا کہ بعض لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'جو سنو وہ لکھ لو، کیونکہ میری اس زبان سے حق کے علاوہ کوئی چیز نہیں نکلتی'۔ چنانچہ وہ حضور علیہ السلام کے ارشادات کو آپ ہی کی مجلس میں سن سن کر لکھا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ محفوظ ہے اور علم حدیث کے طلبہ اس سے خوب مانوس ہیں۔ طلبہ حدیث نے بعض احادیث کی سند پڑھی ہوگی 'عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده عن النبی ﷺ' یہ وہی مجموعہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی احادیث عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور اپنے پردادا سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے پردادا سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں۔ یہ پورے کا پورا مجموعہ امام احمد کی مسند میں موجود ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مجموعہ، یعنی 'الصحیفہ الصادقہ' یوں تو احادیث کے بہت سے موضوعات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں خالص سیرت نبوی سے متعلق بھی اہم مواد موجود ہے۔ چنانچہ دستور مدینہ، غزوات نبوی، فتح مکہ اور حجۃ الوداع جیسے اہم وقائع سیرت کے بارہ میں اس مجموعہ میں معلومات ملتی ہیں۔

اسی طرح سے خود حضرت ابو ہریرہ اپنے دست مبارک سے احادیث لکھا کرتے تھے۔ وہ حضور سے جتنی احادیث سنتے تھے گھر جا کر لکھ لیا کرتے تھے۔ نہ صرف لکھا کرتے تھے بلکہ جب تک زندہ رہے اس مجموعے کی تلاوت کرتے رہتے تھے، اس کو یاد کرتے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنی یادداشت کو اس تحریری ذخیرہ کی روشنی میں چیک کرتے رہتے تھے۔ ایک زمانے میں مروان بن حکم مدینہ کے گورنر بن کر آئے۔ انہوں نے کئی بار حضرت ابو ہریرہ کے درس میں شرکت کی۔ کافی عرصہ بعد جب وہ خلیفہ ہو گئے اور اپنے زمانہ خلافت میں حج کرنے آئے تو پھر حضرت ابو ہریرہ کے درس میں گئے۔ ان کو خیال آیا کہ اب حضرت ابو ہریرہ عمر رسیدہ ہو گئے ہیں اور اپنی یادداشت سے احادیث سناتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کو صحیح یاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔ انہوں نے خفیہ طور پر ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ میرے پیچھے بیٹھو اور جو کچھ

ابو ہریرہ کہیں، وہ لکھتے جاؤ۔ مروان بن حکم دمشق واپس چلے گئے۔ دو ڈھائی سال کے بعد پھر آنا ہوا تو اپنے کاتب کو ساتھ لائے اور حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ میں آپؓ سے فلاں فلاں احادیث سننا چاہتا ہوں۔ کاتب سے کہا کہ دیکھتے رہنا۔ حضرت ابو ہریرہ نے زبانی سنانا شروع کر دیا اور کاتب پیچھے بیٹھ کر اپنی تحریر دیکھتا رہا۔ جب حضرت ابو ہریرہ پورا سنا چکے تو کاتب نے تصدیق کی کہ جو کچھ سنایا ہے وہ وہی ہے جو کئی سال قبل ان سے سن کر لکھا گیا تھا۔ مروان نے فرط جذبات سے ان کی پیشانی چوم لی اور کہا کہ میں نے آج سے تین چار سال پہلے آپ سے جو احادیث سنی تھیں ان میں اور آج سنی ہوئی احادیث میں ایک لفظ اور ایک حرف کا بھی فرق نہیں پایا، نہ اس میں کوئی کمی ہے اور نہ بیشی۔ یہی میں چیک کرنا چاہتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ کیا آپ کو یہ شک ہے کہ ابو ہریرہ حضور کے بارے میں غلط باتیں بیان کرے گا۔ مروان سے کہا کہ چلو میرے ساتھ۔ چنانچہ اسی وقت اٹھے اور خلیفہ کو اپنے گھر لے جا کر ایک کمرے میں موجود بڑے بڑے تحریری ذخائر دکھائے اور کہا کہ یہ میرے تحریری ذخائر ہیں۔ یہ حضور کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں روزانہ ان میں سے ایک جز کو یاد کرتا ہوں اور دہراتا ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جس دن مجھے پتہ چلا کہ میری یادداشت جواب دے رہی ہے میں اسی دن حدیث سنانا بند کر دوں گا۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ کی سنت کو جس اہتمام اور محبت سے جمع کیا ہے۔ پھر جس بالغ نظری سے تابعین اور تبع تابعین نے اس فن کو ترقی دی اس کی وجہ سے علم حدیث اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ اس طرح کے معمولی شبہات اور معمولی شکوک ان بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکتے۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کوئی ڈھائی سو کے قریب دستاویزات کا املا کرایا۔ دو ڈھائی سو دستاویزات تو وہ ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔ ممکن ہے اس سے زیادہ ہوں۔ آج ہمارے پاس ڈھائی سو دستاویزات کا متن موجود ہے۔ گویا یہ بھی علم حدیث کا ایک اہم حصہ ہے۔ حدیث وہ ارشاد یا کلام ہے جو حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے، جو کام کیا ہو یا صحابہ کرام نے ان کے سامنے کوئی کام کیا ہو اور حضور نے ان کو منع نہ کیا ہو۔ لہٰذا ان دستاویزات میں سے ہر دستاویز ایک حدیث ہے۔ یہ چھ نامہ ہائے مبارک جن کی اصل موجود

ہے، یہ بھی احادیث ہیں جو لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جتنے لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں ان سب کے نام لکھ کر مجھے دو۔ 'اکتبوا الی من تلفظ بالاسلام'۔ یہ اسلام میں مردم شماری کی پہلی مثال تھی۔ صحابہ کرام کہتے ہیں کہ ہم نے تین ہزار مردوں کی فہرست بنا کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دی، غالباً مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے تین چار سال بعد کا واقعہ ہوگا کہ حضور کے حکم سے تمام صحابہ کرام کی فہرست تیار کی گئی۔ یہ بھی حضور کے زمانے میں حدیث کو مرتب کرنے کا اور سیرت کے واقعات کو لکھنے کی ایک مثال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کا ذکر ہے۔ بعض نے کہا کہ دونوں مواقع پر ایسا ہوا۔ یمن سے آئے ہوئے ایک صحابی ابوشاہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ خطبہ میرے لئے لکھوا دیں، اس میں بہت قیمتی باتیں ہیں۔ صحیح بخاری میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا 'اکتبوا لابی شاہ'۔ ابوشاہ کو لکھ کر دے دو۔ صحابہ کرام نے حضور کے حکم سے ابوشاہ کے لئے ایک یا دونوں خطبے لکھ دیئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بعض منشور بھی جاری فرمائے۔ کل میں نے عمرو بن حزم کے نام لکھے ہوئے ایک منشور کا ذکر کیا تھا جس کا متن آج موجود ہے۔ حضرت علی کو جب یمن بھیجا تو ان کو ایک دستاویز لکھ کر دی۔ وہ بھی موجود ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض وفود جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ خاص طور پر ۹ھ میں جس کو عام الوفود کہتے ہیں۔ عرب قبائل نے بڑی تعداد میں آکر اسلام قبول کیا۔ ان میں سے کئی عرب قبائل نے واپس جا کر اپنی ملاقاتوں کی روداد یں لکھیں۔ وہ روداد یں طبقات ابن سعد میں موجود ہیں۔ کئی دوسرے مورخین نے بھی ان رودادوں کو محفوظ کیا ہے۔

تدوین حدیث کے بارے میں مزید تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہ چند مثالیں اس بات کی ہیں کہ حدیث جو سیرت کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، اس کی تفصیلات رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے ضبط تحریر میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ تابعین کے زمانے میں ڈھائی سو تابعین نے تحریری مجموعے تیار کئے جن کا تذکرہ ملتا ہے۔ تبع تابعین کے دور کے مجموعے تو بڑی تعداد میں پہلے ہی سے ہمارے پاس موجود تھے۔ اب تابعین کے مجموعے بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔

تیسرا مرحلہ یا تیسرے مرحلے کا پہلا اسٹیج تدوین سیرت کا ہے۔ سیرت کے واقعات کی تفصیلات صحابہ کرام اور تابعین نے جمع کرنا شروع کر دیں اور ان کو محفوظ کرنا شروع کیا۔ یہ تفصیلات قرآن پاک اور حدیث میں آئی ہوئی چیزوں کے علاوہ ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے مستشرقین اور منکرین حدیث بار بار یہ بات دہراتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کے علاوہ باقی چیزوں کے لکھنے کی ممانعت کی تھی۔ اس مضمون کی بعض احادیث بھی موجود ہیں۔ وہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا لکھا جانا یا رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کا ضبط تحریر میں لایا جانا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جن حضرات نے ایسا کیا انہوں نے فرمان نبوی کو نظر انداز کر کے یہ کام حضور کی منشا کے خلاف کیا اور ایسی چیز اسلام میں داخل کر دی جس سے حضور نے منع کیا تھا۔ یہ لایعنی بات منکرین حدیث پاکستان میں بھی اور بیرون ملک بھی بہت کثرت سے کہتے رہتے ہیں۔

ابھی میں نے تدوین حدیث کی مثالیں آپ کے سامنے بیان کیں۔ حضور کی موجودگی میں صحابہ کرام کے تحریری ذخائر موجود تھے۔ حضور کی اجازت سے صحابہ کرام آپ کے ارشادات گرامی کو لکھ رہے تھے۔ اس لئے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ حضور ﷺ نے جس چیز کی ممانعت کی تھی وہ حدیث کی تدوین تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس چیز کی ممانعت فرمائی تھی وہ دو طرح کی تھی۔ ایک تو ممانعت کی یہ بات ان صحابہ کرام کے لئے تھی جو وحی کے کاتبین تھے۔ حضور علیہ السلام نے انہیں منع کیا کہ تم قرآن کے علاوہ کچھ مت لکھو۔ 'لاتکتبوا عنی غیر القرآن' یہ حدیث کے الفاظ ہیں کہ مجھ سے سن کر قرآن کے علاوہ کچھ اور مت لکھو۔ یہ بات آپؐ نے اس لئے ارشاد فرمائی کہ یہ خطرہ موجود تھا کہ کاتبان وحی مثلاً حضرت زید بن ثابت کے اپنے ذخائر میں اگر ان کے دست مبارک سے لکھی ہوئی کوئی چیز قرآن کے علاوہ ہوئی تو ان کے بعد آنے والوں میں کسی کو یہ التباس ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ نوشتہ بھی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی قرآن ہو سکتا ہے۔ تو پہلی ممانعت تو حضور نے کتّاب وحی کے لئے فرمائی۔ یعنی کاتبین وحی اپنے ہاتھ سے وحی کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کوئی اور چیز نہیں لکھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور

مت لکھو۔ ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ' اور اگر کسی نے کوئی اور چیز لکھی ہے تو اس کو مٹا دے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ صحابہ کرام حضور سے قرآن پاک سنتے تھے تو جہاں قرآن پاک کی آیات لکھ لیا کرتے تھے وہاں اس کے معانی بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ کسی لفظ کے معنی پوچھتے تھے تو معنی بھی ساتھ ہی ساتھ وہیں لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور سے پوچھا کہ جس صلوٰۃ وسطیٰ کا ذکر قرآن میں ہے 'حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ' تو اس سے کیا مراد ہے۔ حضور نے فرمایا کہ یہاں صلاۃ وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔ حضرت عائشہ نے صلوٰۃ الوسطیٰ کے نیچے لکھ دیا 'صلوٰۃ العصر'۔ تاکہ ان کو یاد رہے۔ کاتبان وحی کے لئے اس چیز کی ممانعت کر دی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ جب قرآن پاک لکھیں تو اس کے علاوہ کچھ مت لکھیں اور اگر لکھا ہو تو اس کو مٹا دیں۔ اس لئے کہ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے سے التباس پیدا ہو سکتا ہے۔ اس ممانعت کا اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں ہے۔ علم حدیث جس انداز سے خود حدیث سے اور قرآن پاک سے ثابت ہے اگر میں اس کی مزید تفصیل میں جاؤں گا تو بات لمبی ہو جائے گی۔

صحیفہ صادقہ کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جو چیزیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لکھوائی گئیں اور وہ علم حدیث کا بھی جز ہیں اور سیرت کا جز بھی ہیں اور ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں اہم ترین چیز میثاق مدینہ ہے جس کو حضور کے حکم سے صحابہ کرام نے لکھا۔ اس کا مکمل متن سیرت کی کتابوں میں اور احادیث کی بعض کتابوں میں موجود ہے، جبکہ حدیث کی قریب قریب تمام کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ صحیح بخاری سمیت ہر کتاب حدیث میں اس تحریر کا تذکرہ ہے جو حضور نے لکھوائی تھی۔ اس کا متن بعض کتابوں میں مکمل اور بعض میں نامکمل موجود ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو سیرت کے ایک اہم ترین واقعہ سے متعلق ہے۔ یہ دستاویز جو یقیناً بہت سی احادیث پر مشتمل ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں لکھی گئی۔

جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور صحابہ کرام کا زمانہ آیا تو قرآن پاک تو مدون ہو گیا۔ احادیث کی تدوین کا کام بھی شروع ہو گیا۔ صحابہ کرام میں سے سینکڑوں حضرات نے اپنی زندگیاں اس کام کے لئے وقف کر دیں کہ حضور سے جو رہنمائی ملی ہے اس کو عامۃ الناس تک پہنچایا جائے۔ صحابہ کرام میں سے ہر ایک کے حلقے میں سینکڑوں اور ہزاروں تابعین

کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ وہ ان سے ہدایات اور رہنمائی لیا کرتے تھے۔ اس طرح سے علم حدیث کے سارے ذخائر تابعین تک منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ جو صحابہ کرام علم حدیث کے ذخائر تابعین تک پہنچا رہے تھے وہ خود بھی درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی صحابہ کرام ایسے تھے جنہوں نے عام مضامین حدیث کی بجائے خاص اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ سیرت کے موضوعات پر توجہ دی اور سیرت کے موضوعات کے درس و تدریس کا مشغلہ اپنایا۔

حضرت براء بن عازب مشہور انصاری صحابی ہیں۔ ان کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ صرف مغازی اور سیرت کے بارے میں املا کرایا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد ابواسحاق السبیعی ہیں۔ انہوں نے ان سے روایات لیں اور ان کے سارے مجموعے کو مرتب کیا۔ حضرت براء بن عازب اپنا ذخیرہ معلومات املا کرایا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے طلبہ ان کے مجموعۂ احادیث و سیرت کے واقعات کو لکھتے تھے۔ ان شاگردوں میں ابواسحاق بھی شامل تھے۔ اس طرح سے حضرت براء بن عازب کے پاس علم سیرت کے جو کچھ ذخائر تھے وہ ان کے شاگرد ابواسحاق کے پاس آ گئے۔ امام بخاری کی صحیح بخاری میں مغازی اور سیرت کے بارے میں درجنوں روایات ایسی ہیں جو براء بن عازب اور ابواسحاق کی روایت سے منقول ہیں۔ گویا براء بن عازب نے جو روایات بیان کی تھیں اور جو ابواسحاق تک پہنچی تھیں وہ درجہ بدرجہ امام بخاری تک پہنچ گئیں، اور امام بخاری نے ان کو اپنی کتاب میں محفوظ کر لیا۔

یہ جو مستشرقین اور انکے مشرقی عقیدت مند کہتے ہیں کہ علم حدیث کا سارا ذخیرہ چوتھی صدی ہجری میں لکھا گیا ان کی غلط فہمیوں کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ احادیث کے جو بڑے بڑے مجموعے امت میں مقبول ہوئے وہ زیادہ تر تیسری اور کچھ چوتھی صدی ہجری کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں، یا شاید بھلا دیتے ہیں، کہ زیادہ مکمل اور زیادہ بہتر کام جلدی مقبول ہو جاتا ہے اور کم درجہ کے یا ابتدائی مرحلہ کے کام سے لوگوں کو مستغنی کر دیتا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی کتابیں اس لئے مقبول ہوئیں کہ کہ چوتھی صدی ہجری تک وہ سارا مواد ایک ایک کر کے سامنے آ گیا تھا جو پہلی اور دوسری صدی میں مدوّن ہوا تھا۔ حضرت براءبن عازب کا مجموعہ تو ظاہر ہے کہ دو چار سو روایات پر مشتمل ہوگا۔ ان

واقعات پر مبنی ہوگا جو انہوں نے خود دیکھے۔ لیکن بعد میں آنے والے تابعین نے حضرت براء کی معلومات بھی لیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ سے آنے والی معلومات بھی لیں۔ بقیہ صحابہ سے بھی معلومات لیں اور ان کو یکجا کر دیا۔ تو ایک تابعی کے پاس ایک صحابی کی بجائے دس صحابہ کے مجموعے آگئے۔ تبع تابعی کے پاس بیس صحابہ کے مجموعے آگئے۔ تبع تابعین کے بعد جو لوگ آئے ان کے پاس اور زیادہ معلومات جمع ہوگئیں۔ یوں جب امام بخاری اور ان کے معاصرین کا زمانہ آیا تو یہ استیعاب اور استقصاء کا زمانہ تھا۔ استیعاب اور استقصاء کی وجہ سے حدیث کے زیادہ بہتر، زیادہ جامع اور زیادہ مکمل مجموعے سامنے آگئے۔ ان مجموعوں نے لوگوں کو بقیہ مجموعوں سے مستغنی کر دیا۔ یوں بقیہ مجموعوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یعنی اگر کسی کے پاس صحیح بخاری موجود ہو تو اس کو یہ بیس بیس تیس تیس احادیث کے چھوٹے چھوٹے مجموعے رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ چھوٹے مجموعوں کی تاریخی اہمیت تو اپنی جگہ برقرار رہی۔ لیکن عام درسی اور تصنیفی ضروریات کے لئے بڑے مجموعوں نے لوگوں کو چھوٹے مجموعوں سے مستغنی کر دیا۔ جس طرح آج ہر جگہ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن سو پچاس سال بعد شاید ان کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ ایک سی ڈی پر کئی کئی کتابیں دستیاب ہوں گی۔ اب آگے چل کر اگر کوئی یہ کہے کہ جناب سی ڈی پر احادیث کی کتابیں تو بیسویں صدی میں مرتب ہوئی ہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ یہ بات غلط ہوگی کیونکہ اکیسویں صدی کی سی ڈیوں پر جو کچھ مواد فراہم ہوگا وہ پچھلی صدیوں میں ہونے والے کام کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ امام بخاری، امام ترمذی اور امام مسلم، یہ حضرات جو مجموعے مرتب کر رہے تھے، یہ انہی تحریری اور زبانی ذخائر کی بنیاد پر مرتب کر رہے تھے جو ان تک پہنچے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں واضح طور پر یہ بات آئی ہے کہ وہ مختلف علوم کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس پہلے صحابی تھے جن کا لقب ترجمان القرآن تھا۔ ان کے وقت کا ایک حصہ عربی زبان وادب کے لئے مقرر تھا۔ وہ عربی زبان وادب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کے وقت کا ایک حصہ تفسیر کے لئے مقرر تھا جس میں وہ تفسیر پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مقررہ وقت میں وہ حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ ایک خاص وقت میں وہ مغازی پڑھایا کرتے تھے اور غزوات اور سیرت کے بارے میں جو معلومات ان کو ملیں

وہ معلومات تابعین تک پہنچایا کرتے تھے۔ غزوات اور سیرت کے بارے میں ان کی جو اپنی یادداشتیں اور نوٹس تھے وہ مقدار میں اتنا زیادہ تھے کہ لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ 'و کان عندہ حمل بعیر' ، ان کے پاس ایک اونٹ کے وزن کے برابر یادداشتیں تھیں۔ مجھے حتمی طور پر یہ معلوم نہیں کہ ایک اونٹ کتنا وزن اٹھاتا ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ پچیس من کے قریب وزن ایک اونٹ اٹھاتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے نوٹس کئی من وزن کے کاغذات اور یادداشتوں پر مشتمل ضرور ہوتے ہوں گے۔ آپ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ تشریف لے جایا کرتے تھے تو آپ کی یادداشتیں ایک اونٹ پر لاد کر لے جائی جاتی تھیں۔ اس ذخیرے میں کیا کیا تھا، یہ ہم نہیں جانتے۔ تاہم جو بھی حضرت عبداللہ بن عباس کا علم تھا وہ عربی زبان وادب، یعنی قرآن کے لغوی پہلو کے بارے میں ہو، مغازی اور سیرت کے بارے میں ہو، یا احادیث کے بارے میں ہو، وہ اتنا تھا کہ ایک اونٹ سے کم پر اس کو اٹھایا نہیں جاسکتا تھا۔

علم حدیث اور علم مغازی شروع میں ایک ہی علم یا فن کا حصہ تھے اور محدثین اور اصحاب سیر دونوں کی یکساں دلچسپی کے موضوعات تھے۔ صحابہ کرام جو احادیث بیان کیا کرتے تھے وہ مغازی کے باب میں بھی بیان کرتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دونوں علم ترقی کرکے الگ الگ ہوتے گئے۔ علم حدیث الگ اور علم مغازی الگ ہوتا گیا۔ دونوں میں تخصص بھی الگ الگ نمایاں طور پر سامنے آ گیا۔ کچھ لوگ مغازی کے متخصص قرار پائے اور کچھ لوگ علم حدیث کے متخصص بن گئے۔ پھر مغازی کا مطالعہ دو پہلوؤں سے ہونے لگا۔ کچھ لوگوں نے مغازی کا مطالعہ واقعات اور تاریخ کے نقطہ نظر سے کیا۔ کچھ حضرات نے مغازی کا مطالعہ اسلام کے قانون جنگ وصلح کے ماخذ کے طور پر کیا۔ اسلام کا بین الاقوامی قانون اوّل اوّل مغازی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا ارشادات فرمائے۔ لوگوں سے معاملہ کیسے کیا۔ کس طرح سے اپنی جنگوں کو منظم کیا۔ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ معاہدے کئے تو کیسے کئے اور ان کی پاسداری کی تو کیسے کی۔ کچھ لوگ ان موضوعات میں دلچسپی لینے لگے۔ اس لئے پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے شروع سے یہ دو الگ الگ فن بن گئے۔ ایک علم سِیَر کہلایا جس کو آپ اسلام کا بین الاقوامی قانون کہہ سکتے

ہیں، اور دوسرا علم مغازی کہلایا جو گویا سیرت کا ایک شعبہ بنا۔ بعد میں پھر مغازی میں اور موضوعات بھی شامل ہو گئے اور اس کو علم سیرت کے نام سے یاد کیا گیا۔

صحابہ کرام میں کم سے کم ایک درجن حضرات ایسے تھے جن کی خاص دلچسپی اور ذوق یہ تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے حضور علیہ السلام کی جنگوں اور مہمات کے بارے میں معلومات بیان کیا کرتے تھے۔ کل میں کوئی بارہ یا پندرہ صحابہ کرام کے نام بیان کر چکا ہوں جو رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارکہ بیان کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے کچھ صحابہ کرام میں سیرت، حضور کی ذات اور شمائل مبارکہ کے بارے میں تخصص کا رجحان پیدا ہوا۔ تابعین میں سے جن حضرات نے اس معاملہ بہت دلچسپی لی اور ان معلومات کو صحابہ کرام سے حاصل کیا ان میں تو یوں تو کئی بزرگوں کے نام آتے ہیں، لیکن ان میں دو بزرگ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کا تعلق دو بڑے صحابہ کرام سے ہے۔ ایک حضرت ابان بن عثمان ہیں جو حضرت عثمان غنی ذوالنورین کے صاحبزادے ہیں۔ یہ مغازی کے خصوصی متخصص تھے اور انہوں نے مغازی کے بارے میں مختلف صحابہ کرام سے معلومات جمع کیں اور مغازی کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو مغازی ابان بن عثمان کہلاتا تھا۔ یہ اپنے طلبہ کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے اور ان کو اپنے اس مجموعے کا املا بھی کرایا کرتے تھے۔ ان کے طلبہ اس کتاب کے نسخے تیار کیا کرتے تھے۔

تابعین میں دوسرا مشہور اور نمایاں نام بلکہ غالباً سب سے زیادہ نمایاں نام حضرت عروہ بن زبیر کا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ انہوں نے علم سیرت اور مغازی کے بارے میں ایک مجموعہ مرتب کیا۔ وہ مجموعہ تحریری بھی تھا اور اپنے طلبہ کو وہ پڑھایا بھی کرتے تھے۔ اس تحریری مجموعہ کی تیاری میں بعض خلفا نے بھی دلچسپی لی اور بعض دوسرے حضرات نے بھی ان سے درخواست کی کہ وہ مجموعہ ان کے لئے بھی مرتب کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا یہ مجموعہ ایک سے زائد مرتبہ مرتب کیا۔ انہوں نے خود اپنے دست مبارک سے جو نسخہ لکھا تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں کو جو چیزیں املا کرائی تھیں وہ محفوظ ہیں۔ ان کے شاگردوں کا لکھا ہوا مجموعہ مشہور مؤرخین اسلام طبری، ابن سعد اور واقدی تک پہنچا۔ ان سب مؤرخین نے اس سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس کے مندرجات کو اپنی اپنی کتابوں میں

سمو یا۔ آج سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی نے ان ساری کتابوں سے عروہ بن زبیر کی اس کتاب کے سارے حوالوں کو جمع کر کے مغازی عروہ بن زبیر کے نام سے ایک کتاب مرتب کر دی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس طرح حضرت عروہ بن زبیر کی معلومات کا سارا ذخیرہ یکجا جمع ہو گیا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ان کے ذخیرہ معلومات کا خاصا حصہ دریافت ہو کر یکجا ہو گیا ہے اور آج مطبوعہ موجود ہے۔ میں اس کی طرف ابھی دوبارہ بھی آتا ہوں۔

تابعین میں مزید تین ایسے نام ہمارے پاس موجود ہیں جنہوں نے سیرت اور مغازی کے بارے میں صحابہ کرام سے آنے والی معلومات کے ذخائر کو مرتب اور منظم کرنے میں بہت نمایاں دلچسپی لی اور قابل ذکر کام کیا۔ ان میں سے ایک وہب بن منبہ (متوفی ۱۲۸ھ) ہیں۔ یہ انہی ہمام بن منبہ کے چھوٹے بھائی ہیں جو حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد تھے جن کا تدوین حدیث کے ضمن میں ذکر آ چکا ہے۔ یہ دونوں بھائی حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد تھے۔ ہمام بن منبہ نے احادیث مرتب کیں۔ وہب بن منبہ نے سیرت اور مغازی کی روایات جمع کیں۔ ان کی اس کتاب کا ایک نسخہ جو ان کی وفات کے سو سال بعد ۲۲۸ھ میں لکھا گیا تھا جرمنی کے ایک کتب خانہ میں موجود بتایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہجرت کے واقعات اہتمام سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے مشہور تابعی جنہوں نے تدوین سیرت میں نمایاں کام کیا شرحبیل بن سعد تھے۔ آخری تابعی محمد بن شہاب زہری تھے جو امام مالک سمیت بہت سے بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ سیرت کی ان ابتدائی تالیفات میں جو تابعین کے قلم سے ہیں ایک تابعی سلیمان بن طرخان (المتوفی ۱۴۳ھ) کی کتاب 'السیرۃ الصحیحۃ' کا ذکر بھی کیا جانا چاہئے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ مشہور مستشرق فان کریمر نے اس کا متن مغازی واقدی کے آخر میں لگا دیکھا۔ اس نے ان دونوں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

تابعین میں ان پانچ حضرات کے ساتھ ساتھ ایک اور انتہائی محبوب اور ایک انتہائی قابل احترام نام ایک اور تابعی حضرت امام علی بن حسین زین العابدین کا ہے۔ انہوں نے اپنی یادداشت کے لئے سیر و مغازی کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ ان کے بارے میں واقدی نے بھی صراحت کی ہے اور علامہ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایۃ میں بھی صراحت کی ہے کہ

امام زین العابدین نے اپنی یادداشت کے لئے سیرت اور مغازی کے موضوعات پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور جس طرح سے وہ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے اسی طرح اُس سیرت و مغازی کے مجموعہ کی بھی تلاوت کیا کرتے تھے۔ غالباً یا تو امام زین العابدین کے کوئی باقاعدہ شاگرد نہیں تھے، اگر تھے تو انہوں نے یہ نسخہ دوسروں تک نہیں پہنچایا، یا اگر پہنچایا تھا تو بعد والوں تک نہیں پہنچا۔ اس لئے کتب سیرت میں امام زین العابدین کی اس یادداشت کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ تدوین سیرت میں سب سے نمایاں نام حضرت عروہ بن زبیر کا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر ایک طویل عرصہ تک اپنی خالہ جان حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس رہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس جتنا کچھ ذخیرہ علم ہوگا اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عروہ بن زبیر نے اس کو سن سن کر، لکھ لکھ کر اور زبانی یاد کر کر کے محفوظ کرلیا۔ اپنی خالہ جان کے انتقال سے چند سال پہلے انہوں نے اپنے کسی دوست سے یہ کہا کہ خالہ کے پاس علم کا جتنا ذخیرہ تھا وہ سب کا سب میں نے محفوظ کرلیا ہے۔ اب ان کے جانے سے کم سے کم یہ خطرہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ان کا علم بھی چلا جائے گا۔

اپنی خالہ کے علاوہ ان کی والدہ محترمہ یعنی حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ خود بھی ابتدائی مکی دور سے صحابیہ تھیں۔ ہجرت کے واقعات میں براہ راست شریک تھیں۔ ہجرت کا سارا سفر ان کے سامنے ہوا اور اس سارے عمل کی تیاری و تکمیل میں ان کا حصہ اور کردار بہت اہم تھا۔ اس لئے سیرت کے یہ واقعات اُن سے بڑھ کر کون بیان کرسکتا تھا۔ ان کے والد حضرت زبیر بن العوامؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے جو روز اول سے اسلام صف اول کے جاں نثاروں میں سے تھے۔ یہ سب تو حضرت عروہ بن زبیرؒ کے اپنے ہی گھر کے لوگ تھے۔ ان حضرات کے علاوہ متعدد صحابہ کرام سے بھی انہوں نے بطور خاص کسب فیض کیا۔ ان میں سیدنا علی بن ابی طالبؓ، حضرت سعید بن زید، حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی، حضرت اسامہ بن زید، حضرت ابوہریرہ، میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری، ام المؤمنین حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ بن عباس ترجمان القرآن، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے زیادہ متبع سنت اور کوئی نہیں تھا۔ یہ سب حضرت عروہ کے اساتذہ تھے۔

امام زہری جو محدثین میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں اور حضرت عروہ بن زبیر کے شاگردوں میں سے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ 'کان عروۃ بحرا لاتکدرہ الدلاء'، یعنی عروہ ایک ایسا سمندر ہیں جس سے جتنا چاہو پانی نکالو، گدلا نہیں ہوتا'۔ یعنی ان کی معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ نہ وہ پرانی ہوتی ہیں اور نہ ان میں تکرار ہوتی ہے۔ جب بھی کسب فیض کے لئے کچھ پوچھا گیا تو ان سے کوئی نئی معلومات ملیں۔ مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی کی ایک کتاب ہے تہذیب التہذیب، جو صحابہ کرام اور دیگر راویان حدیث کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عروہ بن زبیر کے بارے میں لکھا ہے کہ روایت، مغازی اور سیرت کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات بڑے بڑے صحابہ کرام بھی ان سے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں معاملہ کیا تھا اور کس طرح پیش آیا تھا، یا سیرت کا فلاں واقعہ کیسے ہوا تھا۔

حضرت عروہ بن زبیر صرف حدیث، سیرت اور مغازی کے عالم نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے۔ فقہائے سبعہ کا نام ہم سب نے سنا ہے۔ ایک زمانے میں مدینہ منورہ کے سات بڑے فقہا مشہور تھے جو فقہائے سبعہ کہلاتے تھے۔ جس زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ منورہ میں گورنر تھے تو انہوں نے ان فقہائے سبعہ کو اپنا مشیر خاص اور شوریٰ قرار دیا تھا اور ان کے مشورے سے ہر اہم کام کیا کرتے تھے۔ ان فقہائے سبعہ میں حضرت عروہ بن زبیر بھی شامل تھے۔

ایک طرف تو حضرت عروہ بن زبیر خود بھی یہ کام کر رہے تھے اور جو ذخیرہ ان کو اپنے والدین سے، اپنے خاندان اور دوسرے صحابہ سے ملا تھا وہ اس کو اپنے شاگردوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ دوسری طرف حضرت عروہ کے شاگردوں میں سے متعدد حضرات نے اس کام پر خصوصی توجہ دی۔ امام زہری ان کے شاگردوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے حضرات نے بھی ان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ زیادہ مفصل انداز میں ان معلومات کو آگے کی نسلوں کو دے سکیں۔ جس زمانے میں مروان بن حکم مدینہ منورہ کے گورنر تھے تو ان کی ایک خاص دلچسپی یہ تھی کہ وہ مختلف صحابہ کرام اور تابعین سے معلومات کو جمع کرنے اور فراہم کرنے کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار حضرت عروہ بن زبیر سے بھی یہ کام

کرنے کے لئے کہا۔ ایک مشہور صحابی حضرت حکیم بن حزام، جو رسول اللہ ﷺ کے قبل از اسلام کے دوست تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ جب شعب بنی ہاشم میں حضور کے پورے خاندان کو صحابہ کے ساتھ محصور کر دیا گیا تھا۔ تو قریش کے وہ لوگ جو اسلام نہیں لائے تھے لیکن درپردہ مسلمانوں کی مدد کیا کرتے تھے اور جن کی کوشش سے بعد میں وہ ظالمانہ معاہدہ ختم کیا گیا تو ان میں حضرت حکیم بن حزام بھی شامل تھے۔ حکیم بن حزام کے پاس بھی غزوات کے بارے میں بہت کچھ معلومات تھیں۔ جن غزوات کے بارے میں انہوں نے دوسروں سے سنا اور بعد میں جن غزوات میں وہ خود شریک ہوئے۔ ان کے بارہ میں تفصیلات کو محفوظ رکھنے کا وہ خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ مروان بن حکم نے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنی ان معلومات کو ایک جگہ مرتب کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ معلومات مرتب کرلیں۔

مروان بن حکم کے علاوہ ان علوم کو جمع کرنے میں جس اموی خلیفہ کا بہت زیادہ حصہ ہے وہ مروان کے صاحبزادے عبدالملک بن مروان ہیں۔ عبدالملک بن مروان خود ایک بہت ہی صاحب علم انسان تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے انتقال کے وقت ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد فتاویٰ کے لئے کس سے رجوع کیا جائے؟ انہوں نے فرمایا کہ عبدالملک بن مروان سے رجوع کیا جائے۔

عبدالملک بن مروان علمی اور دینی اعتبار سے اس درجہ اور مقام و مرتبہ کے انسان تھے کہ امام مالک نے موطا میں کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا عبدالملک کے طرز عمل کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل علم نے عبدالملک بن مروان کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالک نے عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو سنت کی ایک دلیل قرار دیا۔ عبدالملک بن مروان نے عروہ بن زبیر کو سیرت سے متعلق متعدد تفصیلات اور کئی ایک معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کا مشورہ دیا۔ نہ صرف تحریر کرنے کا مشورہ دیا بلکہ وہ وقتاً فوقتاً کچھ معاملات کے بارہ میں سوالات حضرت عروہ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ عبدالملک کے خطوط اور عروہ کے جوابات آج بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالات و جوابات امام طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔ کئی ایک واقدی اور ابن سعد نے بھی نقل کئے ہیں اور کئی

دوسرے مورخین نے بھی اس خط وکتابت کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سوالات وجوابات پوری سند کے ساتھ طبری میں موجود ہیں۔ میں صرف مثال کے طور پر طبری کا ایک حوالہ دیتا ہوں۔ اپنی پوری سند بیان کرنے کے بعد طبری نقل کرتے ہیں کہ 'عن عروہ انہ کتب الی عبدالملک بن مروان 'عروہ نے عبدالملک بن مروان کو یہ لکھا' اما بعد فانک کتبت الیّ تسئلنی عن خالد بن الولید' آپ نے مجھے خط لکھا ہے اور خالد بن ولید کے بارے میں یہ پوچھا ہے کہ 'ھل اغار یوم الفتح' کیا ان کے دستے نے فتح مکہ کے موقع پر حملہ کر دیا تھا' ، 'وبامر من اغار' ، اور اگر حملہ کیا تھا تو کس کے حکم سے کیا تھا۔ پھر حضرت عروہ نے اس سوال کا پورا جواب دیا ہے۔

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ آپ نے یہ پوچھا کہ حضرت خدیجہؓ کی تاریخ وفات کیا ہے۔ اس کا جواب انہوں نے دیا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت عروہ کے والد حضرت زبیر بن العوام حضرت خدیجہ کے سگے بھتیجے تھے۔ گویا والد کی پھوپی کے بارے میں مستند معلومات بھتیجے کے بیٹے سے ہی مل سکتی تھیں۔ اسی طرح سے ابن سعد، طبری اور واقدی کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو عبدالملک کے بھیجے ہوئے سوالات اور ان کے لکھے ہوئے بہت سے استفسارات کا تذکرہ ملتا ہے اور حضرت عروہ بن زبیر نے ان کے جو جوابات دیئے ان کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے جو کتاب تالیف کی ہے اس میں یہ سارے دستاویزی واقعات اور ثبوت ان تمام کتابوں سے نقل کر کے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مغازی حضرت عروہ بن زبیر کے نام سے جو کتاب مطبوعہ موجود ہے، جو 1980 میں ریاض میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے چھپی ہے، یہ اس وقت سیرت ایک قدیم ترین کتاب ہے جو سیرت پر الگ سے لکھی گئی ہے۔ اس کے براہ راست راوی عروہ بن زبیر ہیں جو اپنی خالہ، والدہ سے اور اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر معرکہ اور ہر مہم میں شریک رہے۔

اگرچہ اس وقت تک سیرت کی عام طور پر دستیاب اور متداول کتابوں کے ذریعے سیرت کے بارے میں جو معلومات دستیاب نہیں تھیں عروہ کی اس کتاب کے چھپنے سے ان میں سے کوئی نئی بات ہمارے سامنے نہیں آئی۔ لیکن اس کتاب کے چھپ جانے سے یہ تصدیق

ضرور ہوئی کہ عروہ نے صحابہ کرام کے فوراً بعد تدوین سیرت کے پہلے مرحلے میں جو معلومات اگلی نسل تک پہنچائی تھیں وہ پوری صحت کے ساتھ پہنچائی تھیں۔ اور پورے دیانت دارانہ وثوق کے ساتھ جو باتیں آپ نے دوسروں تک پہنچائی تھیں وہ جوں کی توں اس کتاب میں دستیاب ہیں۔

حضرت عروہ بن زبیر کی اس کتاب کا بہت سے قدیم مصنفین نے ذکر کیا ہے۔ مثلاً واقدی کا یہ بیان ملتا ہے کہ عروہ ابن زبیر مغازی پر کتاب لکھنے والے پہلے مصنف ہیں۔ ھو اول من صنف المغازی۔ ممکن ہے یہاں صنف سے مراد مغازی کی کلاسیفیکیشن بھی ہو۔ ابن ندیم نے بھی عروہ کی کتاب المغازی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے شاگرد ابوالاسود اس کتاب کا ایک نسخہ لے کر مصر چلے گئے تھے اور وہاں اس کتاب کی روایت کیا کرتے تھے۔ یوں جلد ہی ان کی تحقیقات ایشیا سے نکل کر افریقہ تک جا پہنچیں۔

عروہ کی روایات کی یہی مقبولیت اور اہمیت تھی جس کے پیش نظر صحاح ستہ کی ہر کتاب میں ان کے اس مجموعہ کی روایات نظر آتی ہیں۔ تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ بعض اوقات صحابہ کرام بھی سیرت اور مغازی کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے عروہ بن زبیر سے رجوع کیا کرتے تھے۔ تابعین میں سے عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان الانصاری کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کے دادا صحابی تھے۔ بدر، احد اور دوسرے تمام غزوات میں شریک رہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ 'شھد المشاھد کلھا'، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات اور معرکوں میں شریک رہے۔ یہ وہی صحابی ہیں جن کی آنکھ غزوہ احد میں نکل پڑی تھی اور چہرے پر لٹک آئی تھی۔ حضرت قتادہ فوراً حضور کے پاس آئے اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! دیکھیں میری آنکھ باہر نکل آئی ہے، اب کیا کروں۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک سے آنکھ کو اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ شاید کچھ پڑھ کر پھونکا بھی اور کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کی وہ آنکھ نہ صرف بالکل ٹھیک ہوگئی، بلکہ پھر دوسری آنکھ کے مقابلہ میں زیادہ بینا اور زیادہ صحت مند رہی اور اخیر تک اس آنکھ میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ان کے صاحبزادے عمر بن قتادہ تھے جنہوں نے اپنے والد سے مغازی کی روایات اور تفصیلات حاصل کیں۔ ان کو مرتب کیا اور اپنے صاحبزادے عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان الانصاری تک پہنچایا۔ عاصم کے بارے میں

محدثین نے لکھا ہے کہ کان راویۃ للعلم '، وہ علم کی بہت زیادہ روایت کرنے والے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے' ولہ علم بالمغازی والسیر 'ان کے پاس مغازی اور سیرت کا بہت زیادہ علم تھا۔ ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ روزانہ دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھ کر مغازی اور سیرت کا درس دیا کریں، لوگوں کو اس کی تعلیم دیا کریں، چنانچہ انہوں نے یہ کام کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پہلی سیرت چیئر قائم کی اور عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان الانصاری کو اس چیئر پر مقرر کیا جو خلیفہ وقت کے کہنے پر وہاں سیرت اور مغازی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

عام طور پر محدثین، سیرت نگار اور مورخین یہ لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ سیرت نگاری میں سب سے پہلا کام حضرت امام زہری نے کیا تھا۔ یقیناً ایک زمانے تک اہل علم کے حلقوں میں یہی خیال تھا کہ امام زہری پہلے آدمی ہیں جنہوں نے سیرت اور مغازی پر کتاب لکھی۔ چنانچہ ان کی ایک کتاب مشاہد النبی کا کئی لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ امام سخاوی نے بھی الاعلان بالتوبیخ میں یہ بات کہی ہے۔ لیکن اب حضرت عروہ بن زبیر کی کتاب دستیاب ہونے کے بعد، حضرت ابان بن عثمان کی مرویات کے تحریری طور پر مرتب ہونے کی اطلاع کے بعد اور عاصم بن عمر بن قتادہ کی کتاب کے مرتب ہونے کے علم کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ امام زہری پہلے مصنف ہیں۔ امام زہری بہت بڑے محدث تھے، بڑے عالم تھے، ارباب سیر وحدیث میں سے تھے۔ لیکن سیرت نگاری میں ان کو اولیت کا مقام حاصل نہیں تھا۔ ان کا شمار نسبتاً جونیئر تابعین میں تھا۔ سینئر تابعین ان سے پہلے سیرت کے موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ لہٰذا قدیم مصنفین نے جو لکھا ہے کہ اسلام میں سیرت کی پہلی کتاب امام زہری نے لکھی ہے تو یہ بیان اُس وقت تک کی معلومات کی روشنی میں تو درست تھا۔ لیکن اب نئی اور تازہ ترین معلومات کے لحاظ سے درست نہیں۔ اِس وقت کی تازہ ترین تحقیقات کی رُو سے قدیم ترین سیرت نگار حضرت عروہ بن زبیر ہیں جن کے بارے میں کئی لوگوں نے کہا کہ وہ ایسا سمندر ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ ان کے ایک اور شاگرد نے لکھا ہے کہ میں جب بھی ان کے پاس گیا تو میں نے ان کے پاس ایک نیا علم اور نئی معلومات پائیں۔

حضرت عروہ ہی کے ہم عصر ایک اور تابعی عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ تھے۔ یہ بھی صحابی

زادے تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ اشعر الفقھا، یعنی اپنے زمانے کے فقہا میں سب سے بڑے شاعر اور افقہ الشعرا، یعنی اپنے زمانے کے شعرا میں سب سے بڑے فقیہ۔ یہ عبیداللہ بن عبداللہ بھی مدینہ کے سات شہرۂ آفاق فقہاء میں سے شمار ہوتے تھے اور قرآن، حدیث، سیرت، انساب، زبان و ادب کے میدانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ حضرت عروہ بن زبیر کی طرح انہوں نے بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ اور دوسرے متعدد صحابہ کرام سے کسب فیض کیا۔

عروہ اور عبیداللہ کے جہاں اساتذہ مشترک ہیں وہاں کئی تلامذہ بھی مشترک ہیں۔ ان دونوں کے مشترک تلامذہ میں امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری کا نام علم سیرت کی تاریخ میں بہت نمایاں ہے۔

اگرچہ اب امام زہری تازہ ترین معلومات کے مطابق پہلے سیرت نگار نہیں ہیں۔ لیکن ان کا درجہ، کارنامہ، مقام اور مرتبہ بہت اونچا ہے۔ علم سیرت کی تدوین اور ترویج میں ان کو ایک ہمزہ وصل کی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر کی روایات امام زہری تک پہنچیں۔ ابان بن عثمان، عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان الانصاری کی روایات بھی ان تک پہنچیں۔ انہوں نے ان تمام روایات کو جمع کر کے ایک بڑا ذخیرہ مرتب کیا۔ اس اعتبار سے پہلی ضخیم یا پہلی مفصل کتاب ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام زہری نے مرتب کی۔ لیکن وہ دوسرے شاگردوں کے ذریعے ہم تک آئی۔ براہ راست نہیں آئی۔ وہ معلومات ان کے تلامذہ کے ذریعے ہم تک آئیں۔ ان کے تلامذہ نے جو معلومات آگے بہم پہنچائیں وہ محدثین اور سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں میں مرتب کر لیں۔

امام زہری نے اپنے زمانے میں تمام بڑے بڑے تابعین سے کسب فیض کیا۔ صحابہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے دلچسپی کے میدان علم حدیث اور قرآن کے ساتھ ساتھ سیرت اور مغازی بھی تھے۔ وہ طویل عرصہ تک مدینہ منورہ میں رہے۔ امام مالک نے بھی ان سے کسب فیض کیا۔ امام مالک امام زہری کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان کی موطا میں امام زہری کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ امام زہری اپنے وقت کو اس طرح صرف کرتے تھے کہ گھر گھر جا کر پوچھتے تھے کہ تمہارے گھر میں کوئی بزرگ زندہ ہیں۔ ان سے ملاقات کرتے تھے۔

ان سے کہتے تھے کہ آپ نے اپنے والد سے فلاں غزوہ کے بارے میں کیا سنا ہے، فلاں غزوہ کے بارے میں کیا سنا ہے۔ حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین سے پردہ کے پیچھے سے غزوات کی تفصیلات پوچھتے تھے۔ یوں خواتین، مردوں اور عورتوں سے الگ الگ جا کر معلومات جمع کرتے جاتے تھے۔

امام زہری کی معلومات میں وسعت اور گہرائی بلا کی تھی۔ امام لیث بن سعد کا کہنا ہے کہ میں نے زہری سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ وہ جس فن پر بھی بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسی کے متخصص ہیں۔

امام زہری کی معلومات کی وسعت اور روانی کو دیکھ کر ایک بار خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو یہ خیال ہوا کہ امام زہری حافظہ سے احادیث بیان کرتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا حافظہ قابل اعتماد ہے کہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ سے احادیث سننا چاہتا ہوں۔ خلیفہ وقت احادیث سننے کے لئے امام زہری کے حلقہ درس میں بیٹھ گئے اور چار سو احادیث کا املا لے کر چلے گئے۔ کافی عرصے کے بعد واپس مدینہ منورہ آنا ہوا تو پھر کہا کہ میں آپ سے فلاں فلاں موضوع پر احادیث سننا چاہتا ہوں۔ امام زہری نے دوبارہ وہ سب احادیث سنا دیں۔ انہوں نے احادیث سن کر ان کا موازنہ اپنی لکھی ہوئی احادیث سے کیا تو 'فوجده لم يغادر حرفاً' تو ان میں سے ایک حرف کا بھی فرق نہیں پایا۔ جو پہلے سنایا تھا وہی کچھ دوبارہ سنایا اور اس میں کوئی ردوبدل نہیں تھا۔

امام زہری کے تلامذہ میں یوں تو بے شمار لوگ ہیں۔ بڑے بڑے محدثین اور اکابر فقہا ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ امام لیث بن سعد جو امام شافعی اور امام مالک کے استاد ہیں وہ امام زہری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ سیرت کی حد تک ان کے تلامذہ میں تین نام بڑے نمایاں ہیں۔

ایک موسیٰ بن عقبہ،

دوسرے معمر بن راشد اور

تیسرے محمد بن اسحاق ہیں۔

محمد بن اسحاق کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان میں موسیٰ بن عقبہ اپنے وقت کے ایک

بہت بڑے محدث بھی تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کا اونچا مقام تھا۔ مغازی اور سیر میں بھی ان کا کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ موسیٰ بن عقبہ نے امام زہری کی روایات کو قلمبند کیا، نئے انداز سے ترتیب دی اور مدینہ منورہ میں ان کو ایک سند کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب کوئی امام مالک سے پوچھتا تھا کہ مغازی یا سیر کے بارے میں کس سے معلومات حاصل کریں تو امام مالک کہا کرتے تھے کہ علیکم بمغازی موسیٰ بن عقبہ فانه ثقه 'موسیٰ بن عقبہ سے مغازی کا علم حاصل کرو کیونکہ وہ مستند اور ثقہ آدمی ہیں۔ جرح و تعدیل کے اپنے زمانہ کے سب سے بڑے امام اور صف اول کے محدث امام یحیٰی بن معین بھی موسیٰ بن عقبہ کی اس کتاب کو سیرت کی سب سے مستند کتاب قرار دیا کرتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کے دو بھائی ابراہیم بن عقبہ اور محمد بن عقبہ تھے۔ یہ تینوں بھائی فقیہ اور محدث تھے اور ایک زمانے میں تینوں کا الگ الگ حلقہ درس مسجد نبوی میں لگا کرتا تھا۔

موسیٰ بن عقبہ کی مکمل کتاب تو ہم تک نہیں پہنچی لیکن اس کا ایک مخطوطہ پروشیا میں، جو پہلی جنگ عظیم سے پہلے یورپ کا ایک ملک تھا اور بعد میں فاتح طاقتوں نے اس کے حصے بخرے کرکے اس کے کچھ حصے جرمنی میں اور کچھ چیکوسلوواکیہ میں ضم کر دیئے۔ وہاں کے ایک کتب خانے میں اُس کا ایک حصہ موجود تھا۔ مشہور مستشرق ایڈورڈ زسخاؤ نے 1904 میں اس کو ایڈٹ کرکے شائع کر دیا تھا اور یہ اب عام طور پر کتب خانوں میں موجود ہے۔ ایک نامکمل نسخہ برلن میں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پروشیا کے نسخہ کی بنیاد پر چھپنے والے نسخہ اور برلن والے نسخہ میں کیا قدر مشترک ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کے ان مغازی کے علاوہ، جو چھپ گئے ہیں، ان کی روایات کا ایک بڑا حصہ طبقات ابن سعد میں جا بجا ملتا ہے۔ ابن سعد دو واسطوں سے موسیٰ بن عقبہ کے شاگرد ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ نے اپنے شاگردوں کو جو املا کرایا ہوگا وہ روایات ان کے شاگردوں کے ذریعے ابن سعد تک پہنچی ہوں گی۔

موسیٰ بن عقبہ کا ایک بڑا کارنامہ اور ہے جو آج تک چلا آرہا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ان کو یہ خیال آیا کہ اصحاب بدر کی مکمل فہرست بنائیں۔ قرآن پاک میں اصحاب بدر کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے اور صحابہ کرام میں ان کی فضیلت مشہور و معروف تھی۔ بعد کے صحابہ میں بدریین کا بڑا اونچا مقام تھا۔ یہاں تک کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اصحاب بدر کو ایک

انتخابی ادارہ یا الیکٹورل کالج کی حیثیت حاصل تھی۔خلفائے راشدین کا انتخاب اصحاب بدر ہی کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سیدنا حضرت علی بن ابی طالب سے لوگوں نے کہا کہ آپ خلیفہ بن جائیں تو آپ نے ان سے کہا کہ 'لیس ذالک الیکمْ'، یہ فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں نہیں ہے۔'انما ذالک الی اھل بدر'، یہ فیصلہ کرنے کا حق تو اہل بدر کو ہے۔'فمن رضی به اھل بدر فھو الخلیفه'، جس سے اہل بدر راضی ہوں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ اہل بدر کی اس اہمیت کی وجہ سے ضرورت تھی کہ ان کی مکمل اور مستند فہرست موجود ہو۔ایسی پہلی مکمل فہرست موسیٰ بن عقبہ نے بنائی جس کی امام مالک نے بھی تصدیق کی اور اس کو مستند قرار دیا۔

زہری کے شاگردوں میں دوسرا نمایاں نام معمر بن راشد (متوفی ۱۵۴ھ) کا ہے۔ وہ یمن کے رہنے والے تھے۔انہوں نے بھی مغازی پر ایک کتاب 'کتاب المغازی' کے نام سے لکھی تھی جس کا تذکرہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے۔معمر بن راشد کی اس کتاب کے اقتباسات طبری، واقدی، ابن سعد، بلاذری اور دوسرے اہل علم کے ہاں ملتے ہیں۔معمر بن راشد نے یوں تو بہت سے اہل علم سے کسب فیض کیا لیکن زیادہ استفادہ انہوں نے امام زہری کی روایات سے کیا ہے۔امام زہری کے پاس مغازی اور سیر کے بارے میں جو کچھ معلومات تھیں وہ سب معمر بن راشد کے پاس آگئیں جو انہوں نے مزید اضافوں کے ساتھ ایک کتاب المغازی کی شکل میں مرتب کر دیں۔

یحیٰ بن معین جو ایک مشہور محدث ہیں۔محدثین میں ان کا بہت اونچا مقام ہے اور اس اعتبار سے وہ بڑے اہم ہیں کہ جرح وتعدیل یعنی کسی راوی کو مستند یا غیر مستند قرار دینے کا جو فن ہے اس کے سب سے بڑے ماہر تھے اور اس سلسلہ میں ان کا شمار متشددین میں ہوتا تھا۔متشددین وہ لوگ تھے جو راویوں کو بہت سختی سے پرکھتے تھے اور ان کی رائے کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔اسی لئے یحیٰ بن معین کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جس راوی کو یحیٰ بن معین مستند قرار دے دیں تو پھر آنکھیں بند کر کے اس کو قبول کر لینا چاہئے۔امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ 'عضوا علیه بالنواجذ' کہ جس راوی کو یحیٰ بن معین قابل قبول قرار دے دیں اس کو دانتوں سے پکڑ لو۔اس لئے کہ اس کے بعد کسی اور کی تعدیل کی ضرورت نہیں۔یحیٰ بن معین

نے معمر بن راشد کے بارے میں تصدیق کی ہے کہ زہری کے تلامذہ میں معمر بن راشد مستند ترین ہیں اور ان کے پاس جو معلومات ہیں وہ ہم تک انتہائی استناد اور ثقاہت کے ساتھ پہنچی ہیں۔

معمر بن راشد کے شاگردوں میں بہت سے نامور حضرات شامل ہیں۔ لیکن سب سے نمایاں امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) کا نام ہے جو بڑے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے بھی ابن ندیم کے بقول ایک کتاب المغازی لکھی تھی۔ یہ اس بات کا ایک انتہائی اہم ثبوت ہے کہ سیرت کے ذخائر ہر دور میں تحریری طور پر بھی مدوّن ہو رہے تھے اور زبانی طور پر بھی روایت کئے جا رہے تھے۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ معمر بن راشد اور ان کے شاگردوں کے تحریری ذخائر بھی موجود ہیں۔ امام زہری کے تحریری ذخائر ان کے تلامذہ کو دستیاب تھے اور انہوں نے جن لوگوں سے کسب فیض کیا ان کے تحریری ذخائر کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ حکیم بن حزم براہ راست پڑھایا کرتے تھے، ان کے تحریری ذخائر ہیں، لہٰذا یہ تمام روایات و معلومات نہ صرف زبانی روایت بلکہ تحریری ذرائع سے بھی ہم تک پہنچی ہیں۔

شرحبیل بن سعد کا ابھی میں نے ذکر کیا۔ یہ تین بڑے نمایاں صحابہ یعنی زید بن ثابت، ابو ہریرہ اور ابوسعید خدری کے شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک کام یہ کیا تھا کہ انہوں نے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آنے والے مہاجر صحابہ کی فہرست بنانے کی طرف توجہ دی اور اس پر زور دیا۔ یعنی وہ صحابہ جو السابقون الاولون من المہاجرین میں شامل تھے۔ 'اول من دوّن قوائم المهاجرين من السابقين الاولين الى المدينه'۔ آپ نے ان لوگوں کی ایک فہرست بنائی۔ پھر بدر اور احد میں جن حضرات نے شرکت کی، ان سب کی انہوں نے ایک فہرست بنائی۔ یہ سب فہرستیں بنانے والے اور معلومات کو مرتب کرنے وہ لوگ ہیں جن کا شمار یا تو صغار تابعین میں ہے یا کبار تابعین میں ہے۔

امام زہری کے آخری شاگرد محمد بن اسحاق تھے۔ ابن اسحاق سیرت کے فن میں اتنا بڑا نام ہے کہ ان کے کارنامے نے بقیہ لوگوں کے کارناموں کو بھلا دیا۔ ابن اسحاق کے کام پر ایک جرمن مستشرق جوزف ہورووٹس نے 28-1927 کے لگ بھگ ایک کتاب لکھی تھی جس کا اردو اور عربی ترجمہ بھی موجود ہے۔ اس کتاب میں اس نے ابن اسحاق کے اس کام کا پورا پس

منظر اور ان کے اساتذہ اور مآخذ کے بارے میں تفصیل بیان کی ہے۔ کتاب اچھی ہے، معلومات بھی مستند ہیں۔ کہیں کہیں مغربی تعصب کی جھلک نظر آتی ہے لیکن کچھ زیادہ نہیں اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ابن اسحاق کے بارے میں اگر ہم کہیں کہ ان کو علوم سیرت میں اتنا ہی بڑا مقام حاصل ہے جو حکیم ارسطاطالیس کو منطق میں حاصل ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ ابن اسحاق نے تین ضخیم جلدوں پر مبنی ایک جامع کتاب سیرت پر لکھی تھی۔ ان تمام اصحاب سے، جن کا ابھی تذکرہ ہوا، انہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض کیا۔ ان سب کے تحریری ذخائر کو حاصل کیا۔ ان تمام مقامات اور علاقوں کو جا کر دیکھا۔ جن جن حضرات کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق شرکائے بدر کے خاندان سے ہے یا شرکائے احد یا فلاں واقعہ سے ان کا کوئی تعلق ہے تو یہ ان کے پسماندگان کے پاس جا کر ان سے معلومات جمع کرتے تھے اور پھر ان معلومات کا آپس میں مقابلہ کرتے تھے اور چیک کرتے تھے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں ہے۔ ان سب معلومات کی روشنی میں انہوں نے ایک کتاب مرتب کی جو جامع ترین اور مکمل کتاب ہے جو ایک اہم واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ابن اسحاق نے عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر لکھی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو۔ کیونکہ منصور نے امام مالک سے بھی درخواست کی تھی کہ آپ سنت کا ایک مجموعہ مرتب کریں۔ چنانچہ امام مالک نے موطا منصور کے کہنے پر لکھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ منصور کو یہ خیال ہوا ہو کہ مغازی اور سیرت پر بھی کوئی کتاب ہونی چاہئے اس لئے یہ بات بعید از امکان نہیں کہ ابن اسحاق نے یہ کتاب منصور ہی کے کہنے پر مرتب کی ہو۔

اس کتاب کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ کا نام 'کتاب المبتدأ' تھا۔ اس میں انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے جد امجد معد بن عدنان تک تمام اہم اور مشہور شخصیتوں کے بارہ میں جو معلومات ان کو ملی وہ انہوں نے مرتب کیں۔ ان معلومات کے بارے میں بعض محدثین اور کچھ محتاط اہل علم کا خیال تھا کہ کتاب کا یہ حصہ بہت غیر مستند ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اکثر و بیشتر ان معلومات پر مشتمل تھا جو یہودی اور عیسائی ذرائع سے ملی تھیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دلچسپی یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو تھی۔ اس

سے پہلے تاریخ انبیا کا سلسلہ یہودیوں اور مسلمانوں میں مشترک تھا۔ اس لئے ابن اسحاق نے یہودی اور عیسائی مصادر سے یہ معلومات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور اس طرح ابن اسحق کے اس کام پر بھی ایک حرف آیا اور اس کو محدثین کی نظر میں استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہوسکا جو بقیہ لوگوں کو حاصل تھا۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ المبعث کے نام سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے لے کر بلکہ آپ کے خاندان اور برادری کے تذکرہ سے لے کر آپ کی وفات تک اس دوسرے حصہ میں بحث کی گئی تھی۔ تیسرا حصہ مغازی تھا جس میں جنگوں کا الگ سے تفصیل سے بیان ہوا تھا۔ ابن اسحاق کی یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک مقبول رہی۔ اس کے نسخے ساتویں آٹھویں صدی ہجری تک بہت عام تھے۔ علامہ ابن اثیر الجزری (متوفی ۶۳۰ ھ) کے پاس بھی یہ کتاب موجود تھی۔ ان کی کتاب اسد الغابہ میں کثرت سے اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک ابن اثیر ہی کیا، تقریباً تمام سیرت نگاروں نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ اس کے مضامین کو اپنے مجموعوں میں شامل کیا۔ اس کے خلاصے لکھے۔ اس کی شرحیں لکھی گئیں۔ یہ کتاب بڑی دیانت داری سے لکھی گئی تھی۔ خود مغربی مصنفین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ الفرڈ گیام جس نے کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑی دیانت داری، صداقت اور غیر جانبداری سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے تقریباً پندرہ مختلف نسخوں (versions) کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ہر صاحب علم فقہ یا حدیث کی جو بھی کتاب مرتب کرتا تھا، اس کا املا اپنے طلبہ کو کراتا تھا۔ طلبہ اس کا املا لے کر اس کو یاد کرلیا کرتے تھے اور حفظ کیا کرتے تھے۔ ان طلبہ میں سے کچھ آگے چل کر علم میں مزید ترقی کر لیتے تھے۔ مزید ترقی کے بعد وہ اس مجموعے میں مزید اضافوں اور ترامیم کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ جہاں ان کو استاذ کی رائے سے اختلاف ہوتا تھا تو اس کا بھی ذکر کردیا کرتے تھے کہ یہاں ہمیں استاذ کی رائے سے اختلاف ہے۔ اُس زمانے میں علم کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتا تھا کہ ایک آدمی جس نے کچھ کہہ دیا یا لکھ دیا تو اس پر کاپی رائٹ کے تحت اس کی اجارہ داری قائم ہوجائے۔ کسی کو اس سے استفادہ کی اجازت نہ ہو، یہ اسلامی تہذیب کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لئے جو علم کسی استاد نے شاگردوں تک پہنچایا وہ

انسانیت کی مشترکہ میراث ہوتی تھی اور ہر شخص کو اس میں رائے دینے کا حق ہوتا تھا۔ خود امام مالک کی موطا کے پندرہ بیس نسخے ہیں۔ ایک نسخہ ان کے شاگرد امام محمد کا ہے۔ اس میں امام محمد نے اپنی رائے کے مطابق بہت سے اضافے کیے ہیں۔ جہاں جہاں ان کو امام مالک کی رائے سے اختلاف تھا اس کو بیان کیا۔ اپنے استاد امام ابوحنیفہ کے ارشادات بھی بیان کیے۔ وہ نسخہ اگرچہ موطاء امام مالک کا ہے لیکن موطائے امام محمد کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے کئی بڑی کتابیں ہیں جن کے ایک سے زیادہ نسخے یا ورژنز موجود ہیں۔ سیرت ابن اسحاق کے پندرہ ورژنز کا تذکرہ ملتا ہے اور قدیم مصنفین مثلاً طبری، واقدی، ابن سعد اور ازرقی وغیرہ کے ہاں اس کتاب کے اقتباسات یا روایتیں ہمیں ملتی ہیں۔

محمد بن اسحاق یوں تو امام زہری کے شاگرد تھے اور انہوں نے زیادہ تر کسب فیض امام زہری ہی سے کیا۔ لیکن امام زہری کے بعد دوسرے اکابر علمائے سیرت سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ ان میں ایک عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم بھی تھے۔ یہ عمرو بن حزم وہی ہیں جن کو یمن کے علاقے میں بھیجتے وقت حضور نے ایک دستاویز لکھ کر دی تھی۔ ان کے پاس وہ دستاویز اور حضور کے زمانے کی کئی دوسری مزید دستاویزات موجود تھیں۔ ان کے پوتے عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم تھے۔ یہ عبداللہ بھی بڑے عالم تھے اور محمد بن اسحاق نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان کے والد عالم، قاضی اور فقیہ تھے۔ دادا عابد و زاہد اور معروف صحابی تھے۔ یہ خانہ ہمہ آفتاب تھا۔ انہوں نے بھی ایک کتاب مغازی پر لکھی تھی لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچی۔

محمد بن اسحاق نے براہ راست صحابہ سے تو کسب فیض نہیں کیا تھا لیکن ان کو بعض صحابہ کرام کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بھی حضرت انس بن مالک کی زیارت کی تھی اور ان کو بھی تابعیت کا شرف حاصل ہے۔ ابن اسحاق اور امام ابوحنیفہ تقریباً معاصر تھے۔ امام صاحب کا انتقال 150ھ میں اور ابن اسحاق کا 151ھ میں ہوا۔ حضرت انس کا قیام عموماً مدینہ منورہ اور پھر دمشق اور بصرہ میں ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کرنے گیا تھا۔ حرم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک ہجوم ہے اور لوگ پروانہ وار لپک لپک کر اس ہجوم کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ والد نے کسی

سے پوچھ کر مجھے بتایا کہ صحابیٔ رسول حضرت انس بن مالک تشریف لائے ہیں اور لوگ ان کی زیارت کے لئے ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ میں بھی والد سے ہاتھ چھڑا کر لوگوں کی ٹانگوں میں سے راستہ بناتا ہوا دوڑا اور دیکھا کہ حضرت انس بن مالک کھڑے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث بیان فرما رہے تھے۔

ابن اسحاق کی کسی کتاب میں حضرت انس کی کوئی براہ راست روایت نہیں ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت انس سے براہ راست کوئی روایت نہیں سنی۔ لیکن جن تابعین سے انہوں نے کچھ کسب فیض کیا ان میں سعید بن مسیّب بھی شامل ہیں۔ جو سید التابعین کہلاتے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ کے تلامذہ میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ابن اسحاق نے حضرت ابان بن عثمان، عاصم بن محمد جو حضرت ابو بکر صدیق کے پوتے تھے، ان سے اور امام باقر سے بھی کسب فیض کیا۔ امام نافع اور اعرج جو امام مالک کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام نافع جو حضرت عبداللہ بن عمر کے خاص الخاص شاگرد تھے اور طویل عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ ان سب سے ابن اسحاق نے کسب فیض کیا۔ خود ابن اسحاق کے تلامذہ میں سے بڑے بڑے نام ہیں، ان میں امام یحیٰ بن سعید الانصاری، امام سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ اور امام شعبہ بن الحجاج جیسے کبار ائمہ حدیث شامل ہیں۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کا تذکرہ چھوڑ دیتا ہوں۔

محمد بن اسحاق نے سیرت اور مغازی کے بارے میں اتنی واقفیت بہم پہنچائی اور اپنے علم کو اتنا وسیع کیا کہ خود ان کے استاد امام زہری فرمایا کرتے تھے کہ '**ھذا اعلم الناس بھا**'، یعنی میرا یہ شاگرد اس مضمون کا سب سے بڑا عالم ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے کہ '**من اراد یتبحر فی المغازی فھو عیال علی ابن اسحاق**'۔ یعنی جو علم مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہے وہ ابن اسحاق کا ممنون احسان ہو کر رہے گا اور ان کے علم سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر کے مقدمہ میں دوسرے مشاہیر کے بھی بہت سے اقوال ابن اسحاق کے مقام و مرتبہ کے بارہ میں نقل کئے ہیں۔

علم و فضل کی اس وسعت اور گہرائی کے باوجود بعض محتاط محدثین نے ابن اسحاق کی روایات پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا۔ ان کے بارے میں محدثین کے تحفظات کے اسباب میں

سے پہلی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے یہود ونصاریٰ سے وہ روایات لے لیں جو سابقہ انبیا کے بارے میں تھیں اور ان روایات کو اپنی کتاب 'کتاب المبتدأ' میں شامل کرلیا۔ اب محدثین کا کہنا یہ تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمری لکھی جائے اور اس کے پس منظر، مقدمہ اور تمہید میں یہود ونصاریٰ کی روایات لی جائیں تو یہ بات قابل قبول نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا شمار انتہائی محتاط محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے صاحبزادے نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ ابن اسحاق کو غیر مستند سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ ابن اسحاق کے دین وایمان کے بارے میں کوئی تامل رکھتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر آپ ان کی روایت کیوں نہیں لیتے؟

محدثین کے انتہائی تقویٰ اور اونچے معیار کے لحاظ سے ابن اسحٰق کی دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ ہر راوی کا بیان الگ الگ نقل کرنے کے بجائے سب راویوں کی معلومات کو یکجا کر کے بیان کیا کرتے تھے۔ محدثین کا طریق کار یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو بیان کرتے وقت جن جن راویوں سے جو جو ارشادات سنے ہوتے تھے تو ان سب ناموں کی صراحت کے ساتھ پوری سند کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ مثلاً **قال حدثني عبدالرزاق، قال حدثني معمر، قال حدثني محمد بن شهاب الزهري، قال حدثني نافع قال حدثني عبدالله بن عمران النبي ﷺ قال**، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، یہاں کوئی ایک یا دو جملے بیان ہوئے ہوں گے۔ اب اس کے بعد اگر ایک جملہ اور ہے تو پھر آپ پوری سند بیان کریں۔ پھر تیسرا جملہ ہے تو پھر پوری سند بیان کریں۔ اب جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی تھی تو ان کی حد تک تو یہ اسلوب ٹھیک تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص سیرت کا کوئی واقعہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ ہجرت کیسے ہوئی تو اس کے لئے یہ انداز اختیار کرنا بہت مشکل ہوگا کہ ہر جملے پر یہ کہے کہ مجھ سے بیان کیا فلاں نے ، اور اس سے فلاں نے اور اس سے فلاں نے۔ کہ جب حضرت اسماء نے حضور کا ناشتہ دان باندھا تو اپنا پٹکا کھول کر اس کے دو حصے کر کے باندھ دیا۔ پھر کہے کہ مجھ سے بیان کیا فلاں نے ، فلاں سے فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے کہ انہوں نے دوسرے پٹکے سے دودھ کی مشک میں گرہ لگا دی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں، فلاں سے فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے کہ کھانا

لانے کی ذمہ داری عامر بن فہیرہ کی تھی۔ اب یہ سب تفصیلات ایسی ہیں کہ اس انداز بیان سے ان میں تسلسل نہیں رہ سکتا۔ نہ واقعہ مکمل طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ابن اسحاق نے زیادہ اور باقی لوگوں نے کم یہ کیا کہ آغاز میں انہوں نے یہ بتانے پر اکتفاء کیا کہ یہ روایات ہجرت کی ہیں اور یہ میں نے فلاں فلاں راویوں سے لی ہیں۔ یعنی بیان کرنے والے دس بارہ افراد کے نام ایک ساتھ بیان کئے ہیں اور پھر بتایا ہے کہ واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ محدثین کو اس پہ یہ اعتراض ہے کہ اس طرح بیان کرنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا جملہ کس راوی کا ہے، تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ اس بیان کا کون سا حصہ کم مستند ہے اور کون سا زیادہ۔ لہٰذا علم حدیث کے معیار کے مطابق یہ انداز روایت قابل قبول نہیں تھا۔ یہ پس منظر تھا جس میں ابن اسحاق اور آگے چل کر واقدی اور ابن سعد اور دوسرے بہت سے لوگ محدثین کے معیار سے فروتر قرار پائے۔

امام احمد بن حنبل کے بیٹے نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ابن اسحاق پر کیا اعتراض ہے۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ 'واللہ انی رأیتہ یحدث عن جماعۃ بالحدیث الواحد '، میں نے ان کو دیکھا کہ وہ بہت سے لوگوں سے ایک ہی واقعہ بیان کرتے ہیں، 'ولا یفصل کلام ذا من ذا '، اور اِس کی بات کو اُس کی بات سے الگ نہیں کرتے۔ اس لئے میں اعتماد نہیں کر سکتا کہ کون سا حصہ مستند ہے اور کون سا غیر مستند ہے۔

اس کے باوجود محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ابن اسحاق کے تقویٰ اور زہد کی وجہ سے ان کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے بیانات کو ان کے ان دو ''جرائم'' کی وجہ سے زیادہ قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ ابن اسحاق کے اس اسلوب روایت پر جن محدثین نے تحفظ کا اظہار کیا ہے ان میں واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے ائمہ حدیث شامل ہیں۔ امام مالک، امام نسائی، امام احمد، امام دارقطنی، امام بخاری، کے استاذ مکی بن ابراہیم اور ائمہ جرح وتعدیل امام یحیٰ بن سعید اور یحیٰ بن معین جیسے ماہرین فن نے ابن اسحاق کے اس اسلوب پر شدید تنقید کی ہے۔ تاہم امام احمد کا ارشاد تھا کہ ان کی بات مغازی وغیرہ میں تو قابل قبول ہے، لیکن حرام وحلال (فقہ وشریعت) کے باب میں نہیں۔ ابن سید الناس نے ان ساری تنقیدات کا جائزہ لے کر ابن اسحاق کا شد ومد سے جو دفاع کیا ہے وہ قابل دید ہے۔

تاہم محدثین کرام کی ان تمام تنقیدات کے باوجود امر واقعہ یہ ہے کہ علم سیرت وہی ہے جو ابن اسحاق اور ابن ہشام نے بیان کیا ہے۔ آج سیرت کے نام پر جو ذخیرہ ہے وہ ابن اسحاق اور ابن ہشام ہی کا بیان کیا ہوا ہے۔ ان کی تحقیق اور کام سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان بڑے بڑے ناقدین کے پہلو بہ پہلو ایسے مؤیدین کی بھی کمی نہیں جو ابن اسحاق کے کام کو مستند قرار دیتے ہیں۔ ان میں امام زہری، سفیان ثوری اور شعبہ جیسے متقدمین اور خطیب بغدادی جیسے متشدد متاخرین بھی شامل ہیں۔ ابن اسحاق بہت بڑے آدمی تھے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ان کی کتاب بہت ضخیم اور مفصل تھی جو ہم تک مکمل صورت میں نہیں پہنچی ہے۔

ان کی کتاب کا ایک نیا ایڈیشن عبدالملک بن ہشام نے تیار کیا جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے۔ ابن ہشام نے اس میں اضافے تو کئے ہیں لیکن بہت تھوڑے کئے ہیں۔ چونکہ زیادہ اعتراض کتاب کے پہلے حصے پر تھا اس لئے ابن ہشام نے اس کو حذف کر دیا۔ مبتداً والا حصہ انہوں نے نکال دیا اور حضرت اسماعیل کے بعد سے مختصر بیان کر کے معد بن عدنان اور پھر حضور کے قبیلہ قریش اور آپؐ کے دادا قصی پر آگئے جہاں سے نیچے کی معلومات سب مستند معلومات ہیں اور پھر پورے سیرت کے واقعات بیان کئے۔

دوسرا کام ابن ہشام نے یہ کیا کہ ابن اسحاق کی سیرت میں بہت سا شعری مواد بھی تھا جو خاصا محل نظر تھا۔ چونکہ ابن ہشام خود بہت بڑے ادیب اور عالم تھے اس لئے وہ اس شعری مواد پر رائے دے سکتے تھے۔ جبکہ ابن اسحاق اپنے تمام علم وفضل کے باوجود شعر وادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں رکھتے تھے۔ ان کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ جس شعر کو وہ لے رہے ہیں اس کا درجہ کیا ہے اور یہ اس آدمی کا ہے بھی یا نہیں، جس سے منسوب کیا جارہا ہے۔ انہوں نے ایسے بہت سے ایسے اشعار بھی درج کر لئے تھے جو مستند طور پر ثابت نہیں تھے۔ ابن ہشام خود بڑے نحوی تھے، ادیب اور عالم تھے۔ انہوں نے خود اپنی قوت فیصلہ سے کام لیتے ہوئے اس طرح کے غیر مستند قصائد نکال دیئے اور صرف مستند قصائد ہی کتاب میں باقی رکھے۔ ابن ہشام نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض چیزیں ایسی تھیں جو میں نے اس دور کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھیں۔ مثال کے طور پر ایک قبیلہ کے کوئی صاحب اسلام نہیں لائے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف بہت کچھ

کام کیا۔ ہجو لکھی اور حضور کی شان میں گستاخیاں کیں۔ بعد میں مسلمان ہوئے تو اب ان پرانی باتوں کو بیان کرنے کا کیا فائدہ۔ مثلاً عکرمہ بن ابی جہل بہت عرصہ اسلام کے خلاف کارفرما رہے اور بعد میں مسلمان ہوئے۔ بہت اچھے مسلمان ہوئے۔ اب عکرمہؓ کی ان باتوں کو بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ اس سے بلاوجہ کی بدمزگی ہی پیدا ہوگی۔ ان وجوہات کی بناء پر ابن ہشام نے کہا کہ میں نے وہ چیزیں نکال دیں۔ ان تین ترامیم کے ساتھ ابن ہشام نے اس کتاب کا نیا ورژن تیار کیا اور اس میں کچھ اضافے کئے۔ جو چیزیں غیر واضح تھیں یا کہیں مشکل الفاظ یا محاورات تھے تو ان کی وضاحت کی اور یوں ایک ایسی کتاب ہمارے سامنے آگئی جو سیرت کا سب سے پہلا، مستند، مقبول اور مستند اول ماخذ ہے جو آج ہر جگہ موجود ہے جس کا شاید دنیا کی ہر اہم زبان میں ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں ایک سے زائد تراجم موجود ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور بہت سی دوسری زبانوں میں تراجم موجود ہیں۔ ابن ہشام پر مزید تفصیلی تبصرہ سیرت کی کچھ اہم کتب کے ضمن میں آئے گا۔

ابتدائی تدوین سیرت پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ہمارے وطن پاکستان کے ایک صاحب علم سیرت نگار کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ یہ علامہ ابو معشر نجیح السندی (متوفی ۱۷۰ھ) ہیں۔ ان کے بارہ میں بھی آتا ہے کہ انہوں نے مغازی (یعنی علم سیرت) پر ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ کتاب تو دستیاب نہیں ہے، لیکن اس کے ٹکڑے واقدی اور ابن سعد کے ہاں ملتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے متعدد سیرت نگاروں کی طرح ابو معشر کا درجہ بھی علم حدیث میں زیادہ اونچا نہیں سمجھا جاتا، لیکن امام احمد جیسے بالغ نظر اور محتاط محدث ان کو بصیر فی المغازی (علم سیرت میں بصیرت رکھنے والا) قرار دیا کرتے تھے۔

-☆-

سوال و جواب

امام زہری کے بارے میں بہت سے لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات کہاں تک درست ہیں؟

میرے خیال میں امام محمد بن شہاب زہری اکابر اسلام میں سے ہیں۔ تمام بڑے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام مالک جیسے بڑے بڑے اور اہل تقویٰ لوگ شامل ہیں۔ اس لئے امام زہری کا مستند ہونا اور ایک امام حدیث ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ تاہم رائے اور اجتہاد کے معاملہ ہر آدمی کی تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو امام زہری کی کسی تحقیق سے اختلاف ہو تو اس اختلاف کو بیان کرنے کا آپ کو حق ہے۔ لیکن اگر کسی شخصیت کی کسی بات سے کوئی اختلاف ہو اور اس کے نتیجے میں اس شخص کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ناروا شکوک کا اظہار کیا جائے تو یہ مناسب رویہ نہیں ہے۔ اگر ان کے معاصر محدثین نے ان کو مستند سمجھا ہے تو آج کے کسی آدمی کے لئے ان کے بارے میں شک کا اظہار کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں۔

☆

آپ نے بتایا کہ میثاق مدینہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن ڈاکٹر اکرم ضیا عمری کی کتاب 'مدنی معاشرہ' ادارہ تحقیقات اسلامی نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ انہوں نے میثاق مدینہ پر بڑا کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی دستاویزات کی مکمل تفصیلی شقیں حدیث کی کسی مستند کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ صرف سیرت کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اکرم

ضیا عمری کا سوال ہے کہ اگر یہ میثاق اتنا ہی مشہور و معروف تھا
تو حدیث کی کسی کتاب میں اس کی تفصیل کیوں مذکور نہیں؟

جہاں تک حدیث کی کتابوں کا تعلق ہے تو متعدد کتابوں میں اس میثاق کا تذکرہ موجود ہے اور یہ بیان موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تحریر مرتب کی اور یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ سنن ابی داود میں یہ تذکرہ موجود ہے۔ حدیث کی کئی دوسری کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے جس سے یہ تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دستاویز مرتب کی تھی اور مدینہ کے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ جہاں تک اس کے مکمل متن کا تعلق ہے تو سیرت کے باب میں ابن ہشام کی کتاب اتنی ہی مستند ہے جتنی کہ حدیث کے معاملہ میں حدیث کی کوئی بھی کتاب۔ ابن ہشام نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ابوعبید نے کتاب الاموال میں اور ابن سعد نے طبقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب سیرت کی مستند کتابیں ہیں۔ اس لئے میثاق مدینہ شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

☆

مغربی محققین مسلمانوں کے مرتب کردہ مغازی اور حدیث
کے اتنے بڑے مجموعے کو غیر مستند کہتے ہیں۔ ان کے تعصب
کے علاوہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ اس میدان میں
تحقیق بھی کرتے ہیں۔ اس وجہ کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ
کیا جا سکتا ہے اور کیا کچھ کیا جا رہا ہے؟

مغربی محققین میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو پریسٹ یا پادری ہیں یا رہے ہیں۔ ان میں ایک گہرا مذہبی تعصب موجود ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو حکومتوں اور خاص طور پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ کچھ لوگ اور ہیں جن کی تعداد ماضی میں بہت کم تھی لیکن اب بڑھ گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خالص علمی اور تحقیقی ذوق سے کام کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے objectively تحقیقی انداز میں سیرت پر کام کیا ہے، ان کے رویہ میں

بڑی تبدیلی آئی ہے اور ان میں سے بہت سے اہل علم نے سیرت کے مآخذ کو مستند مانا ہے۔ ابھی میں نے جوزف ہورووٹس کی مثال دی جس نے ستر اسی سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں بڑے جامع اور غیر جانبدارانہ انداز میں اس بارے میں کلام کیا ہے اور ان مآخذ کے بارے میں رائے دی ہے۔ اسی طرح مآخذ کے بارے میں کئی لوگوں کا رویہ خاصا معتدل ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی آرہی ہے۔ مستشرقین کے تأمل اور شک کی ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے جس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہئے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں چوتھی پانچویں صدی ہجری کے بعد کے مصنفین نے سیرت کے نام پر بہت سا کمزور مواد اور رطب و یابس مسالہ جمع کر دیا ہے۔ بعض ایسی روایات جو بہت غیر مستند ہیں اور علم حدیث اور سیرت کے اصولوں کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہیں، وہ بہت کثرت سے سیرت کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے مغربی محققین کو سیرت کے تمام ذخائر پر شک کرنے کا موقع ملا۔

اگر خود مسلمان محققین معروضی طور پر اس سارے ذخیرے کا جائزہ لے کر رطب و یابس کو الگ الگ کر دیں تو جو غیر جانبدار اور معتدل مزاج مغربی مصنفین ہیں ان کے طرز عمل میں تبدیلی آجائے گی۔ جو متعصب مصنفین ہیں وہ تو پہلے بھی نہیں مانتے تھے، اب بھی نہیں مانیں گے۔

☆

جب ہزاروں صحابہ کرام کو قرآن یاد تھا تو 'لقد جاء کم رسول من انفسکم' کی ایک سند کیوں نہیں ملی جبکہ ہر آیت کے لئے دو اسناد ضروری تھیں۔

یہ بات آپ نے شاید جزوی طور پر سنی ہے۔ اگر تفصیل جاننا چاہیں تو میری کتاب 'محاضرات قرآنی' میں قرآن کی تدوین پر ایک الگ خطبہ ہے جس میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ میں پوری تفصیل یہاں بیان کروں گا تو بہت وقت لگے گا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے جو طریقہ کار وضع کیا تھا وہ یہ تھا کہ سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے ساتوں ارکان کو ہر آیت یاد ہونی چاہئے اور ان ساتوں ارکان کے وہ تحریری ذخائر جو

رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے، ان میں بھی ہر آیت موجود ہونی چاہئے۔ پھر ہر آیت کے دو دو گواہ لئے جائیں، جو حلفیہ بیان کے ساتھ یہ گواہی دیں کہ ہم نے یہ آیت حضور کو پڑھ کر سنائی تھی اور حضور نے اس کی تصدیق فرمائی تھی۔ پھر ہر گواہ کے ساتھ دو دستاویزی ثبوت بھی آئیں جس میں ہر دستاویز کے حق میں دو عدد گواہی دینے والے ہوں جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ کے حضور پیش کی گئی تھی اور آپؐ نے اس کی سماعت فرما کر اس کو درست قرار دیا تھا۔ اس آیت کے بارہ میں ایک دستاویز ایسی تھی جس کا صرف ایک گواہ تھا۔ باقی سب شہادتیں مکمل تھیں۔ یہ آیت سب صحابہ کو زبانی یاد تھی۔ سب لوگوں کے علم میں تھا کہ یہ آیت سورۃ التوبہ کے آخری حصہ میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ خلیفہ وقت نے ایک طریقہ کار مقرر کیا تھا اس لئے اس کے حق میں دو دستاویزی ثبوتوں میں سے ایک دستاویز کا ایک ہی گواہ تھا اور دوسرا نہیں تھا۔ یہ بات انہوں نے اس حدیث کی روشنی میں جو آپ کے علم میں ہے طے کر لی اور، اس دستاویز کو قبول کر لیا۔

آپ نے فرمایا کہ کاتبان وحی کو حدیث کے لکھنے سے منع کیا گیا تھا جبکہ حضرت علی کاتب وحی بھی تھے اور اپنا صحیفہ حدیث بھی رکھتے تھے۔

کتابت حدیث سے رسول اللہ ﷺ نے صرف شروع شروع میں منع کیا تھا، جب قرآن پاک کی اچھی طرح تدوین کا عمل مستحکم نہیں ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کو حضور کے دنیا سے تشریف لے جانے سے چند مہینے پہلے سن 10 ھ کے آغاز میں گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت قرآن پاک لکھا جا چکا تھا۔ بیشتر حصہ مرتب ہو چکا تھا۔ حضرت علی کے بارے میں یہ شبہ نہیں تھا کہ ان کو قرآن پاک کے بارے میں کوئی التباس ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صحیفہ حدیث ان کے پاس بالکل الگ تھا اور قرآن پاک کے کسی نسخے پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے اس روایت میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ امام مالک نے فرمایا کہ عبدالملک بن مروان سے سرزد ہونے والا کام سنت ہے کیونکہ وہ سنت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دور حکومت میں بہت سے کام ایسے ہوئے جو سنت کی صریح خلاف ورزی پر مبنی تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ پر سنگ باری اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت۔

یہ آپ امام مالک سے پوچھئے گا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو کیوں سنت قرار دیا۔ میں نے تو صرف ان کی رائے نقل کی ہے۔ یہ رائے موطا امام مالک میں موجود ہے جو حدیث کی مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اگر عبدالملک کے خلاف کوئی رائے یا شہادت اتنے ہی مستند ماخذ سے آپ کے پاس آئی ہو جتنا مستند موطا امام مالک ہے تو آپ کی رائے میں وزن ہوسکتا ہے۔ ورنہ علم حدیث اور علم تاریخ دونوں کے اصولوں کے تحت موطا امام مالک ہی کے بیان کو قبول کرنا چاہیئے۔

آپ نے فرمایا کہ ابوجعفر منصور نے امام مالک سے حدیث اور ابن اسحاق سے سیرت پر کام کرنے کی درخواست کی۔ اسلام کے ان دو اساسی علوم کے خدمت گزار نے امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر قید کی سزا دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خلفاء کے مخالفین بہت بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے خیال میں خلیفہ منصور امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر کوڑے لگواتا ہے، قید کرواتا ہے اور جبری مشقت کرواتا ہے۔ میرے خیال میں یہ واقعات صحیح نہیں ہیں۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ زیادتیوں کے جو واقعات بعض کتابوں میں بیان ہوئے ہیں وہ غلط ہیں اور میں تاریخی اعتبار سے ان کو درست نہیں مانتا۔ یہ بعد کے مصنفین نے منسوب

کئے ہیں۔ سختی صرف امام احمد بن حنبل پر ہوئی تھی۔ جس زمانے میں فقہی مسالک میں بہت زیادہ مباحثہ چلتا تھا تو امام احمد بن حنبل کے عقیدت مند اپنے امام کی بزرگی بیان کرنے کے لئے ان پر ہونے والے مظالم کی داستانیں بھی بیان کرتے ہوں گے۔ اس کے ردعمل میں بقیہ اماموں کے معتقدین نے بھی اپنے اماموں پر مظالم کی داستانیں بیان کرنا شروع کردی ہونگی۔ یہی داستانیں بعض متاخر تذکرہ نویسوں نے کتابوں میں نقل کردیں۔ قدیم مؤرخین کے بیانات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ نہ امام مالک کے ساتھ ہوا۔ امام مالک کا تو ان کے معاصر امراء اور خلفاء غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

☆

آپ نے ابن اسحاق کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں امام سہیلی نقل فرماتے ہیں کہ 'کان دجالا من الدجاجلة'۔ آپ اس کو کس تناظر سے دیکھتے ہیں؟

میں نے صاف طور پر عرض کیا ہے کہ ابن اسحاق کے بارے میں محدثین میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ابن اسحاق کو بعض محدث قابل قبول اور معتمد سمجھتے ہیں اور ان کی رائے اور بیانات کو قبول کرتے ہیں جبکہ بعض محدثین قبول نہیں کرتے۔ امام مالک بھی ان محدثین میں شامل تھے جو ابن اسحاق کے بارے میں تامل رکھتے تھے۔ یہ لفظ انہوں نے کہا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن امام مالک ان لوگوں میں سے تھے جو ابن اسحاق کی روایات کو قبول کرنے میں تامل کرتے تھے۔ بہت سے لوگ تامل نہیں کرتے تھے جن میں سے بعض کے اقوال میں نے بیان کئے۔ امام مالک کی رائے سرآنکھوں پر۔ لیکن ایسے حضرات بھی ہیں جو ابن اسحاق کی رائے کو قبول کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی میں نے مثالیں دی ہیں۔ پھر ابن اسحاق نے جو کچھ تفصیلات جمع کی ہیں اور جو ابن ہشام کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان میں سے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بقیہ کتب حدیث سے بنیادی طور پر مختلف ہو۔ تفصیلات اور جزئیات میں ابن اسحاق نے کچھ چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

☆

کیا اصول حدیث کی طرح سیرت نگاری کے بھی کچھ اصول
بیان کئے جاسکتے ہیں۔ ممکن ہو تو خدوخال بیان کیجئے۔

سیرت نگاری کے اصول بیان کئے جاسکتے ہیں اور لوگوں نے بیان بھی کئے ہیں۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا روایت قبول نہیں کرنی چاہئے جو قرآن پاک کی نص قطعی کے خلاف ہو۔ جو احادیث صحیح اور صحابہ کرام کے مقام ومرتبہ کے خلاف ہو۔ جو شان رسالت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ جو عربی زبان وادب اور اس کے معیار فصاحت کے خلاف ہو۔ جو مورخین اور ارباب سیرت کے متفقہ نقطہ نظر کے خلاف ہو۔ یہ اصول ہیں جن کی بنیاد پر بہت سے اہل علم نے سیرت کی کتابیں لکھی ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ان اصولوں کے بارے میں کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں نے ایسی چیزیں سیرت کے نام سے منسوب کردی ہیں جس کی وجہ سے مستشرقین کو اعتراضات کا موقع ملتا ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ بعض صحابہ کو یہ خوف تھا کہ حفاظ صحابہ کی
شہادت سے قرآنی سورتوں کی ترتیب کہیں بدل نہ جائے جبکہ
حضرت حذیفہ بن الیمان کو خوف تھا کہ حفاظ کی شہادت سے
قرآن کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

ترتیب کا گڑبڑ ہوجانا بھی قرآن کی اضاعت کے مترادف ہے۔ اگر قرآن اپنی اصلی شکل میں متفق علیہ موجود نہ ہو تو یہ بھی اضاعت کی ایک شکل ہے۔ قرآن کے متن کی اضاعت کا الحمدللہ کوئی امکان نہیں تھا۔ بڑی تعداد میں صحابہ کرام کو پورے کا پورا قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ جس چیز کا خدشہ تھا وہ ترتیب ہی کے بارے میں ہوسکتا تھا۔ آج بائبل کے درجنوں ورژن ملتے ہیں۔ مزید ورژن بھی دریافت ہو رہے ہیں۔ ابھی یہودا کا ورژن دریافت ہوا ہے۔ اس کے بارے میں آج کل بڑے مضامین آرہے ہیں۔ لوگ قرآن پاک کے بھی اس طرح کے ورژن نکال سکتے تھے۔ الحمدللہ صحابہ کرام کے بروقت اقدام سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور یہ خطرہ

ٹل گیا۔

☆

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک نسخہ کے علاوہ باقی سب نسخے جب ضائع کئے گئے تو اس کا طریقہ کیا تھا۔ کیا ان کو جلا دیا گیا یا دریا میں بہادیے گئے؟

حضرت عثمان کے دور میں یہ بہت آسان تھا کیونکہ قرآن مجید یا جو بھی تحریریں عرب میں لکھی جاتی تھیں وہ اکثر و بیشتر پارچمنٹ پر یا رق پر لکھی جاتی تھی۔ یہ جانوروں کی کھال کی جھلی ہوتی تھی۔ اس کو پروسیس کر کے کاغذ کی شکل میں بنا دیا جاتا تھا۔ آج کل بھی اس پر کافی کتابیں کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ تقریباً اُس طرح کا کاغذ ہوتا تھا جس طرح کا آج کل پیکنگ یا ریپنگ کا موٹا کاغذ ہوتا ہے۔ یہ بڑا مضبوط ہوتا تھا اور اس کو دھویا بھی جا سکتا تھا۔ جب حضرت عثمان نے حکم دیا تو بہت سے صحابہ کرام نے اس کو دھو دیا اور دھونے کے بعد اس مواد کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ری سائکلنگ کر کے دوسرے کاموں کے لئے استعمال کیا گیا۔ لیکن جہاں یہ ممکن نہیں تھا وہاں قدیم نوشتے نذر آتش کر دیئے گئے۔

☆

کیا عبدالملک کا علم، تقویٰ اور بزرگی خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اور بعد میں برابر ہے یا اس میں علما کا اختلاف ہے؟

میرے نزدیک تو دونوں صورتوں میں اس کا درجہ اور مقام و مرتبہ ایک ہی تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی وہ ایسا ہی تھا جیسے پہلے تھا۔ آپ کو اختلاف ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ دلائل اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر اس سے اختلاف کریں۔

☆

کیا صحابہ کرام جو آیات لکھا کرتے تھے وہ رسول اللہ کے دولت کدے میں اول سے آخر تک موجود تھیں یا نہیں؟

یہ نوشتے ان تمام صحابہ کرام کے پاس موجود تھے جو ان کو لکھا کرتے تھے۔ حضور کی ازواج مطہرات کے پاس اپنے اپنے نسخے ہوا کرتے تھے۔

☆

استیعاب اور استقصاء سے کیا مراد ہے؟

استیعاب سے مراد ہے comprehensive coverage یعنی ایک چیز کا مکمل طور پر فراہم کردینا، یا مکمل سروے کرلینا۔ استقصاء سے مراد ہے exhaustively کسی چیز کو جمع کرلینا۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب معلومات کو exhaust کرنے اور ان کا مکمل سروے کرکے فراہم کرنے کا کام ہی اصل اور بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

☆

کیا یہ بات درست ہے کہ بنی لاوی کے پاس لکھی ہوئی تورات تھی؟

بالکل درست ہے۔ جب تورات کی تختیاں لکھی ہوئی حضرت موسیٰ کو ملیں تو وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس تھیں اور بعد میں ان کے جانشینوں کے پاس آئیں۔ ان کا خاندان بنی لاوی کہلاتا ہے ان کے پاس تھیں لیکن جب ضائع ہوگئیں تو سب کی ضائع ہوگئیں۔

☆

ابن اسحاق کی جمع کردہ کتاب کا نام کیا تھا؟ کیا وہ موجود ہے؟

ابن اسحاق کی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔ جس حد تک وہ دستیاب ہے وہ سیرت ابن ہشام کی شکل میں ہے۔ اس کا ایک حصہ بعض مخطوطات کی شکل میں موجود تھا۔ ایک نامکمل مخطوطہ جامعہ قرویین فاس میں تھا جس کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم نے ایڈٹ کرکے شائع کرایا تھا۔ اس کے عربی اور اردو تراجم دستیاب ہیں۔ اردو ترجمہ نقوش کے سیرت نمبر میں شائع ہوا تھا۔

**سیرت کی موجودہ کتابوں میں الرحیق المختوم کافی مشہور ہے۔
اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟**

الرحیق المختوم بہت اچھی اور عمدہ کتاب ہے۔ آپ ضرور استفادہ کریں۔ بیسویں صدی میں جو بہترین کتابیں لکھی گئیں ان میں سے ایک الرحیق المختوم بھی ہے۔ یہ ایک عالمانہ اور مستند کتاب ہے۔

☆

حضرت زید بن ثابت نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن پاک لکھنے کا فریضہ انجام دیا، لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان کے دور میں ان سے مزید دو مرتبہ لکھوایا گیا۔ کیا انہوں نے پہلے جو لکھا تھا تو کیا اس میں کوئی کمی بیشی تھی یا بعد کے نسخے پہلے والے نسخے کی توسیع تھی؟

پتہ نہیں آپ نے میری بات سے کیا مطلب لیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت کو حضرت ابوبکر صدیق نے حکم دیا تھا کہ قرآن پاک کا ایک نسخہ ایسا تیار کر دیں جو اسی ترتیب کے مطابق ہو جس ترتیب کے مطابق رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ اور اس کو ایک جگہ کتابی شکل میں مصحف کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ حضرت زید بن ثابت نے وہ نسخہ مرتب کر دیا اور وہ کتابی شکل میں موجود رہا۔ بعد میں اسی نسخہ کی انہوں نے سات، پانچ یا گیارہ نقلیں کروائیں۔ بعض روایات میں پانچ کا ذکر ہے، بعض میں سات کا اور بعض میں گیارہ کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے ہی نسخہ کی نقلیں تیار کیں۔ اپنے ہاتھ کے خط سے، اسی hand writing میں، اسی ہجا کے ساتھ۔ یہ نقلیں مختلف علاقوں میں بھیجی گئیں جن میں سے چار نقلیں آج بھی موجود ہیں۔ الحمدللہ مجھے چاروں کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ ایک لندن کے برٹش میوزم میں ہے، دوسرا ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں ہے، تیسرا استنبول کے عجائب گھر توپ کاپی سرائے میں ہے اور چوتھا قاہرہ میں موجود ہے۔ تاشقند والے نسخہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ

نسخہ ہے کہ سیدنا عثمان غنی اپنی شہادت کے وقت اس کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس نسخے پر خون کے دھبے بھی بتائے جاتے ہیں، ممکن ہے یہ وہی نسخہ ہو۔

☆

امام سیوطی نے لکھا ہے کہ 'الجرح مقدم علی التعدیل'۔ ابن اسحاق پر جو جرح کی گئی وہ تعدیل پر مقدم ہے لہٰذا ابن اسحاق کو معتبر سمجھنا جائز نہیں۔

لیکن ہم سے اور آپ سے بڑے بڑے علماء نے ابن اسحاق کو معتبر سمجھا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ اصول تھا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مطلقاً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جرح مفسر تعدیل مفسر پر مقدم ہے، جرح غیر مفسر تعدیل مفسر پر مقدم نہیں ہے۔ جرح و تعدیل پر ہمارے برصغیر کے ایک بڑے عالم کی ایک بہت اچھی کتاب 'الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل' ہے۔ آپ اس کو پڑھیں۔ اس میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ خود امام ابو حاتم رازی کی کتاب جرح و تعدیل پر ہے جو کئی جلدوں میں چھپی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے ابن اسحاق پر جرح کی، مثلاً امام مالک کی جو جرح ابھی ایک دوست نے منسوب کی، پتہ نہیں یہ جرح ان کی ہے بھی کہ نہیں، لیکن امام مالک ابن اسحاق سے متفق نہیں تھے۔

جہاں تک میرے علم میں ہے امام مالک سے کوئی وجہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ابن اسحاق پر کیوں جرح کی۔ جن لوگوں نے ابن اسحاق کی تعدیل کی ہے وہ اپنی اس رائے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا تعدیل مفسر جرح غیر مفسر پر ترجیح رکھتی ہے۔

☆

چوتھا خطبہ

مناہج سیرت

سیرت نگاری کے مناہج اور اسالیب

چوتھا خطبہ

مناہج سیرت

سیرت نگاری کے مناہج اور اسالیب

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم و علیٰ اله و اصحابه اجمعین

قابلِ احترام صدر جلسہ جناب پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد صاحب

قابلِ احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب

محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی صاحب

برادران محترم،

خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا عنوان ہے 'مناہج سیرت یعنی سیرت نگاری کے مناہج و اسالیب'۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بات عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبوی پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اور کل ہم نے دیکھا کہ اس پر لکھنے والوں میں سب سے پہلے صحابہ کرام ہیں۔ حضرت براء بن عازبؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور دوسرے متعدد صحابہ کرام کے زمانے سے جو چیز لکھی جانی شروع ہوئی اور آج تک مسلسل لکھی جا رہی ہے۔ اس کی کمیت اور لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ لاکھوں صفحات لکھے گئے ہیں یا کروڑوں صفحات لکھے گئے ہیں۔ ہم قطعیت اور تیقن تو دور کی بات ہے محض اندازہ سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اس کے حبیب کی سیرت اور پیغام

کے بارہ میں کتنا اور کیا کچھ لکھا گیا ہے، کتنا لکھا جا رہا ہے اور آئندہ کتنا لکھا جائے گا۔ اس لئے اس سارے ذخیرے کو جو لامتناہی ہے، متعین اسالیب میں تقسیم کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر تحریر کو کسی متعین اسلوب، متعین منہج یا کسی واضح methodology کے تحت رکھا جاسکے۔

جب ہم منہج یا methodology کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ سیرت کے سارے تحریری ذخائر کو متعین مناہج کے ذیل میں درجہ بند کیا جا سکے گا اور مناہج کی حد بندی میں لایا جا سکے گا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو شخصیات نمایاں رہی ہیں جن کا کام بہت غیر معمولی ہے، ان میں بڑے بڑے مناہج اور نمایاں اور قابل ذکر اسالیب کون کون سے تھے، کس انداز اور کس اسلوب سے بڑے بڑے لوگوں نے سیرت نگاری کی۔ ان اسالیب کی تعداد جتنی بھی ہو، کتنے ہی غور سے ان اسالیب کو وضع کیا جائے، کتنے ہی اہتمام اور دقت نظر سے ان مناہج کو متعین کیا جائے، پھر بھی سیرت لٹریچر کا بہت بڑا حصہ ایسا رہے گا جو مناہج واسالیب کی ان حدود اور تعریفات سے باہر ہوگا۔ اس حصہ پر غور کر کے نئے اسالیب اور مناہج تجویز کرنے پڑیں گے۔ پھر بھی سیرت کا ایک ذخیرہ اس دائرے سے باہر رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مناہج اور اسالیب کا تعین جو بھی شخص کرے گا، وہ ایک فرد کرے یا بہت سے افراد کریں، وہ بہرحال محض چند افراد کی فہم وبصیرت کے مطابق موضوع کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش ہوگی۔

میں پہلے دن کی گفتگو ہی میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ سیرت النبی ایک ایسا لامتناہی سمندر ہے جس کی حدود، گہرائی اور گیرائی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن ناطق کی سیرت ہے۔ جیسا کہ قرآن صامت کے بارے میں فرمایا گیا کہ 'لا تنقضی عجائبہ'، اس کے عجائب وغرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے، اسی طرح سیرت کے بھی نئے نئے پہلو سامنے آتے جائیں گے اور سیرت کی عظمت اور معنویت کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ اس لئے تمہید کے طور پر یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ سیرت کے مناہج اور اسالیب کے بارے میں جو بھی گفتگو ہے وہ سیرت کے صرف ایک بڑے حصہ کے بارے میں ہو سکتی ہے۔ پورے سیرت کے ادب کے بارے میں نہیں ہو سکتی۔

دوسری بڑی اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ اسالیب متعین اور بہت واضح نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سیرت نگار نے پہلے اپنے ذہن میں کوئی اسلوب متعین کیا ہو اور اس اسلوب کی حد بندی کے اندر رہتے ہوئے انہوں نے سیرت مرتب کی ہو۔ اس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ جس شخصیت نے سیرت نگاری کے لئے قلم اٹھایا، ان کا اپنا پس منظر کیا تھا۔ اگر وہ محدث تھے تو علم حدیث کے اسالیب اور مناہج، اصول اور قواعد خود بخود ان کے سامنے رہے۔ اگر وہ مورخ تھے تو مورخین کے اصول ان کے سامنے ہوں گے۔ اگر وہ متکلم تھے تو علم کلام کے مسائل ان کے سامنے ہوں گے۔ اگر وہ کسی وہ اصلاحی اور تجدیدی تحریک کے قائد تھے تو ان کی سیرت نگاری میں اصلاح اور تجدید کے پہلو نمایاں ہوں گے۔ یہ صرف نمایاں ہونے کی حد تک ہے۔ اس کو بہت لگے بندھے معیار کے طور پر نہیں دیکھنا چاہئے۔

سیرت کے دستیاب ذخیرہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے سیرت نگاری کے جو بڑے بڑے اسالیب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

محدثانہ اسلوب

اس اسلوب میں ان شخصیات نے سیرت پر زیادہ کام کیا جو دراصل حدیث کے متخصص تھے اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ اور وقت علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں گزرا تھا۔ انہوں نے علم حدیث کے قواعد اور اصول کو سامنے رکھا۔ علم حدیث کے معیارات اور اصول وضوابط کے پیش نظر مواد کا انتخاب کیا، اس کو ترتیب دیا اور اس کے بعد سیرت کے واقعات و موضوعات کی ترتیب سے اس مواد کو مرتب کر کے جمع کر دیا۔ محدثین کی نظر میں سب سے بنیادی اور اصل چیز یہ ہے کہ جو چیز ذات رسالت مآب ﷺ سے منسوب کی جائے وہ ایک سو ایک فیصد یقینی ہو اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کی نسبت میں ذرہ برابر بھی کوئی تامل یا شک نہ کیا جا سکے۔ محدثین اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ جس راوی سے وہ روایت بیان کریں وہ براہ راست انہوں نے اپنی زبان سے سنی ہو۔ نہ صرف سنی ہو بلکہ سننے کی کیفیت معلوم اور واضح ہو۔ یہ کیفیت بھی محدثین بیان کرتے ہیں۔

جو لوگ حدیث کے طلبہ ہیں، وہ یہ جانتے ہیں جب کوئی محدث ایک حدیث بیان کرتا

ہے تو یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس کے شیخ جب حدیث بیان کر رہے تھے تو میں تنہا سننے والا تھا یا اور لوگ بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ بات بھی واضح کرنی ہوگی کہ میں پڑھ کر سنا رہا تھا اور وہ سن کر تصدیق کر رہے تھے یا وہ پڑھ کر سنا رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ یا کوئی اور پڑھ کر سنا رہا تھا اور محدث سن رہے تھے اور میں بھی وہاں موجود تھا۔ ان سب کے لئے الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ امام مسلم کی اصطلاحات سے جو لوگ واقف ہیں ان کو پتہ ہے کہ امام مسلم جب کہتے ہیں کہ حدثنا فلاں، مثلاً حدثنا قتیبہ بن سعید، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قتیبہ بن سعید پڑھ کر سنا رہے تھے اور میرے علاوہ بھی کئی لوگ موجود تھے اور وہ ہم سب کو سنا رہے تھے، کیونکہ حدثنا میں ضمیر منصوب جمع ہے۔ اگر وہ کہیں کہ حدثنی قتیبہ بن سعید، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تنہا وہاں موجود تھا اور قتیبہ بن سعید صرف مجھے پڑھ کر سنا رہے تھے۔ اگر امام مسلم کہیں کہ اخبرنا قتیبہ بن سعید، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، امام مسلم کے روبرو ایک ایک کر کے سب پڑھ رہے تھے اور امام مسلم سن سن کر اس کی تصدیق وتصویب فرماتے جاتے تھے، اور لوگ اپنی یادداشتوں میں نوٹ کر رہے تھے۔ اگر وہ کہیں کہ اخبرنی قتیبہ بن سعید، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں امام مسلم کے روبرو تنہا بیٹھا ہوا تھا، اور حدیث پڑھ کر ان کو سنا رہا تھا۔ وہ سن کر تصویب فرما رہے تھے۔ اگر وہ لکھیں کہ اخبرنا قتیبہ بن سعید قراۃً علیہ وانا اسمع، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی اور پڑھ رہا تھا، امام مسلم سن رہے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ بعد میں انہوں نے مجھے بھی اجازت دی کہ تم بھی اس کی روایت کرو۔

یہ تو پہلا مرحلہ ہوا۔ روایت حدیث کے آخر تک سارے مراحل میں یہی شرط پیش نظر ہوگی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ جس نے بیان کیا وہ کردار میں کیسا تھا؟ وہ انتہائی سچا انسان ہونا چاہئے۔ اس کے سچے اور کھرے انسان ہونے پر اتفاق رائے ہونا چاہئے۔ اس کی یادداشت محفوظ ہونی چاہئے۔ اس کے کردار اور شخصیت میں بلندی کا ایک خاص معیار ہونا چاہئے اور اخیر تک، یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ تک یہ بات اسی طرح درجہ بدرجہ نقل ہونی چاہئے۔ پھر جتنا لفظ جس راوی نے بولا ہے اس میں کسی رد وبدل کی گنجائش کا تصور بھی نہیں ہے۔ یہ محدثین کا معیار تھا۔ اب محدثین جب اپنے معیار پر احادیث یا روایات کا جائزہ لیتے تھے تو وہ تاریخی ضروریات یا مورخ کے تقاضوں کے مطابق روایت کا جائزہ نہیں

لیتے تھے۔ ان کو اس سے بحث نہیں ہوتی تھی کہ جو واقعہ زیر بحث ہے اس کی مکمل تصویر ان روایات سے بنی یا نہیں بنی۔ مکمل تصویر کا بننا یا نہ بننا ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بات کہی جارہی ہے وہ سو فیصد اور سولہ آنے کھری ہونی چاہئے۔ یہ محدثین کا اسلوب تھا۔

محدثین میں جن حضرات نے سیرت نگاری کا کام کیا، ان میں تمام بڑے اکابر محدثین شامل ہیں، اس اعتبار سے کہ حدیث کے ہر مجموعے میں سیرت سے متعلق الگ الگ ابواب موجود ہیں۔ جہاد کے ابواب ہیں، مغازی کے ابواب ہیں، سیرت کے ابواب ہیں، رسول اللہ ﷺ کے خاندان اور ازواج مطہرات سے متعلق ابواب ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں ابواب ہیں، ہجرت سے متعلق مباحث ہیں۔ یہ سارے مضامین محدثین نے مختلف ابواب کے تحت جمع کر دیئے ہیں۔

مستند کتب حدیث میں سیرت کے بارے میں جتنا ذخیرہ ہے اس کے بارے میں ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بالکل سو فیصد صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ اس لئے کہ مکمل صحت سند کے ساتھ یہ ساری معلومات ان کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مثلاً ہجرت کا واقعہ کیسے پیش آیا اور اس کی تمام تفصیلات آغاز سے انتہاء تک کیا ہیں۔ تو یہ آپ کی حدیث کی کسی کتاب میں یکجا نہیں ملے گا۔ کل میں نے مثال دی تھی کہ مثلاً اگر بہت ہی دھیان کریں گے تو اگر ایک واقعہ چار راویوں سے ملا ہو تو وہ چار احادیث الگ الگ بیان کریں گے۔ پھر ایک محدث کی نظر میں حدیثوں کی جو تعداد ہے وہ متن یا ٹیکسٹ کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک محدث مثلاً امام بخاری، ترمذی یا کسی اور کو یہ بات پتہ چلی ہو کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر نے اپنا پٹکا کھول کر اس کے دو حصے کر دیئے تھے۔ ایک سے ناشتہ دان باندھا تھا اور دوسرے سے دودھ کی مشک باندھی تھی۔ یہ بات ان کو چھ اساتذہ سے پہنچی ہو تو وہ اس کو چھ احادیث شمار کریں گے۔ اس کو چھ جگہ بیان کریں گے۔ امام مسلم کو آپ دیکھیں گے کہ وہ ایک ایک متن کو چار چار پانچ پانچ اور چھ چھ بار بیان کرتے ہیں تاکہ یہ بات پورے طور پر واضح ہو جائے کہ یہ بات میں نے مصر میں فلاں استاد سے سیکھی، نیشاپور میں فلاں استاد سے سیکھی، بغداد میں فلاں استاد سے سیکھی۔ اور یوں یہ بات اچھی طرح

ثابت ہو جائے کہ پوری دنیائے اسلام میں جو جید ترین اساتذہ احادیث بیان کر رہے تھے وہ اس واقعہ یا ارشاد نبوی کو انہی الفاظ میں اور انہی تفصیلات کے ساتھ بیان کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ محدث اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ ہر استاذ کے version کو پوری امانت سے جوں کا توں بیان کیا جائے اور دوسرے اساتذہ کے versions سے اس کو ملایا نہ جائے۔ امام بخاری، امام مسلم کسی کی بھی کتاب اٹھا کر دیکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ امام مسلم کے مثلاً دو اساتذہ تھے۔ ان دو اساتذہ کے بھی دو اساتذہ تھے اور ان دونوں اساتذہ کے ایک استاد مشترک ہوں۔ تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایک لفظ میں کہیں کوئی جزوی فرق واقع ہو جائے۔ مثلاً ایک استاد نے ایک لفظ کا کوئی دوسرا مترادف استعمال کیا۔ ایک واقعہ میں رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ دوسرے میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر بیٹھ گئے اور تشریف لے گئے۔ رسول اللہ اونٹنی پر روانہ ہو گئے۔ اردو زبان میں ایک مفہوم کے لئے یہ تینوں الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ امام مسلم یہ بات بھی پورے اہتمام سے بیان کریں گے کہ یہ الفاظ کون سے استاد کے ہیں اور کہیں گے کہ 'حدثني فلان و اللفظ له'۔ یہ لفظ یا یہ ورژن فلاں کا ہے۔

یہ محدثین کا اسلوب ہے اور محدثین کے اسلوب کے مطابق حدیث کے ذخائر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ حدیث کی ہر بڑی کتاب میں سیرت کے ابواب اسی انداز کے ہیں۔ اس انداز سے جو کتابیں لکھی گئیں وہ بقیہ سیرت نگاروں کے لئے سیرت نگاری کا ماخذ اور مصدر تو بنیں لیکن خود ان کو عامۃ الناس میں بطور کتاب سیرت کے زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حدیث کا استاد، طالب علم یا متخصص ہے وہ تو اس اسلوب سے مانوس ہے اور اس اسلوب کو پڑھنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کرتا۔ لیکن جو شخص اس اسلوب سے واقف نہیں ہے اس کے لئے جا بجا بہت سے ناموں کا بار بار آنا اور ان جزئیات کی بار بار تکرار اور ان کی جزوی تبدیلیوں کی بار بار نشاندہی کا عمل اس کو بعض اوقات ناگوار گزرتا ہے۔

مورخانہ اسلوب

محدثانہ اسلوب کے بعد جو دوسرا اسلوب پیدا ہوا وہ مورخانہ اسلوب ہے۔ مورخانہ اسلوب کا آغاز تو بہت پہلے ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ خود حضرت عروہ بن زبیر نے جب سیرت اور

مغازی کے واقعات کو جمع کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ وہ جب کسی واقعہ کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے تو ان ساری معلومات کو یکجا کر کے اور مرتب کر کے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ کل میں نے عرض کیا تھا کہ عبدالملک بن مروان نے ان سے بہت سے سوالات پوچھے۔ ہجرت کا معاملہ ان سے دریافت کیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات کی تاریخ کے بارے میں معلوم کیا۔ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے بارے میں ان سے پوچھا۔ انہوں نے جو جوابات دیئے وہ یکجا کر کے بعض محققین نے الگ سے شائع کر دیئے ہیں۔

ان جوابات میں ان کا انداز یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے، میرے پاس اس سلسلہ میں جو معلومات ہیں وہ فلاں راوی، فلاں، فلاں اور فلاں، یعنی آٹھ دس نام دے کر بتایا ہے کہ ان لوگوں سے مجھے یہ معلومات ملی ہیں اور ان ساری معلومات کا خلاصہ یہ ہے۔ پھر وہ تمام مطلوبہ معلومات کو ایک مرتب اور متکامل انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ بات ایک طرح کے ذاتی خطوط میں بیان ہو رہی تھی اس لئے محدثین کو اس پر اعتراض نہیں ہوا اور انہوں نے اس کو ناقابل قبول قرار نہیں دیا۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جو ایک ناگزیر ضرورت بھی تھی۔ جو شخص یہ جاننا چاہے۔ علمی ضرورت کی خاطر، کسی اور ضرورت یا محض دلچسپی کی خاطر۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کیسے فرمائی۔ مکہ مکرمہ سے روانگی سے لے کر اور مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت ابوایوب انصاری کے مکان میں ٹھہرنے تک کی پوری تفصیل وہ جاننا چاہے۔ اس کو اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی کہ درمیان میں راوی کون کون آتے ہیں، کتنے جز کا کون راوی ہے۔ اس کی دلچسپی اس میں ہوگی کہ پوری بات تفصیل سے اس کے سامنے آجائے۔ چنانچہ بعض اہل علم نے ہمت سے کام لے کر یہ کام کیا اور اس طرح کی مؤرخانہ تحریریں مرتب کیں۔ جن میں بعض کا میں ابھی ذکر کرتا ہوں۔

اس سے مورخانہ اسلوب پیدا ہوا اور اس اسلوب کو جن لوگوں نے اختیار کیا ان میں بہت سے نام قابل ذکر ہیں۔ کل ابن اسحاق کی بات ہوئی تھی۔ واقدی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ابن ہشام نے بھی یہ طرز اختیار کیا۔ کئی دوسرے حضرات نے یہ طرز اپنایا۔ شروع میں محدثین نے اس پر شدید نکیر کا اظہار کیا اور اس کو ناپسند فرمایا۔ امام احمدؒ کے بارے میں کل میں نے عرض کیا تھا کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو ابن اسحاق پر کیا اعتراض ہے تو انہوں نے

بھی یہی بات بیان فرمائی کہ مجھے ابن اسحاق پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ابن اسحاق روایات کو بیان کرنے کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ طریقہ درست نہیں۔ یہ احتیاط اور تقویٰ کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا انتہائی اونچا معیار تھا۔ لیکن آخر کار امت میں سیرت نگاری کے ضمن میں اسی طرز کو قبول عام حاصل ہوگیا کہ ایک مرتب انداز میں اور ایک systematic narrative کے انداز میں واقعات کو بیان کردیا جائے۔ یہ مورخانہ اسلوب تھا جس کے بانی حضرت عروہ بن زبیر کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس اسلوب کو سب سے پہلے انہوں نے شروع کیا۔ پھر دوسرے اصحاب مثلاً امام زہری نے، ابن اسحاق نے پھر آگے چل کر واقدی اور ابن سعد نے اس اسلوب کو مزید پروان چڑھایا اور تیسری صدی ہجری تک یہ طرز بیان ایک معروف اور متعارف اسلوب بن گیا۔ جن حضرات کو اس پر اعتراض تھا وہ بھی آہستہ آہستہ خاموش ہوگئے اور ان کا اعتراض بھی کمزور پڑ گیا، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جو باتیں مستند مآخذ کی بنیاد پر بیان کی جارہی ہیں اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے، اس لئے انہوں نے اپنے اعتراض پر بھی نظر ثانی کی ہوگی۔

مؤلفانہ اسلوب

مورخانہ اسلوب کے نتیجہ میں سیرت پر پے درپے کتابیں آنی شروع ہوگئیں۔ جب یہ کتابیں بڑی تعداد میں آگئیں تو پھر جلد ہی ایک تیسرا اسلوب سامنے آیا جس کو ہم مولفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ مولفانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے مختلف مآخذ اور کتب کو سامنے رکھ کر ایک تصنیفی انداز میں جس میں ایک مرتب، مربوط اور متکامل کتاب لکھی جاتی ہے سیرت پر کتابیں تیار کی جائیں۔ اس طرح سے کتابیں لکھنے کا رواج تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوگیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک سیرت کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اور اب جتنی کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں کے اسلوب کو آپ مولفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔

فقیہانہ اسلوب

اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا ایک فقیہانہ اسلوب بھی تھا۔ فقیہانہ اسلوب سے

مراد یہ ہے کہ کہ سیرت کے واقعات پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ ان سے کون کون سے فقہی احکام نکلتے ہیں۔ سیرت کے بہت سے واقعات، بالخصوص مغازی اور حضور کی مہمات کی جو تفصیل ہے وہ اسلامی قوانین کا ماخذ بھی ہے اور سنت کے بہت سے احکام بھی اس سے نکلتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ سیرت کے کون سے واقعہ سے سنت کا کون سا حکم نکلتا ہے، سیرت اور فقہ کی حدود مل جاتی ہیں۔ اس غرض کے لئے، یعنی سنت کے تعین کے لئے بعض جگہ سیرت کے واقعات کو بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ جب پہلی اور آخری مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حضور نے زندگی میں ایک ہی بار حج کیا۔ جب حج فرض ہوا تو آپؐ نے گورنر مکہ حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا۔ دوسری مرتبہ جناب صدیق اکبر امیر حج کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کی زندگی میں آخری سال جب حج کا موقع آیا تو آپ نے پہلی اور آخری بار حج فرمایا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر حضور ﷺ ایک سے زائد مرتبہ حج فرماتے تو ہر مسلمان کم سے کم دو حج کرنا چاہتا اور یہ ایک مشکل مسئلہ ہو جاتا۔ اس لئے حضور ﷺ نے ایک ہی حج پر اکتفا فرمایا۔

حضور ﷺ کے اس ایک حج کی تفصیلات بہت سے محدثین نے جمع کیں۔ صحابہ کرام نے بہت غور سے حضور ﷺ کے حج کو دیکھا۔ خود حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ 'خذوا عني مناسككم'، حج کے مناسک مجھ سے سیکھتے رہو۔ اس لئے صحابہ کرام ایک ایک چیز کو دیکھتے رہے اور اطاعت کرتے رہے۔ جن جن صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حج کو دیکھا، انہوں نے جس انداز سے سمجھا اس کو بیان کر دیا۔ یہ دیکھنے والے کے فہم پر بھی مبنی ہے۔ دیکھنے والے نے کس حصہ کو دیکھا۔ کس حصہ کو زیادہ غور سے دیکھا، کس حصہ کو کم غور سے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی خیمے میں آرام فرماتے ہوں گے۔ کبھی وہ صحابہ جو دیکھ رہے ہوتے تھے وہ خود کسی ضرورت کی وجہ سے موجود نہ ہوتے ہوں گے۔ ہر وقت چوبیس گھنٹے پورے سفر میں تمام صحابہ تو نہیں دیکھتے رہے ہوں گے۔ حتیٰ کہ امہات المومنین کو بھی یہ موقع نہیں ملا ہوگا کہ چوبیس گھنٹے حضور کو دیکھتی رہی ہوں گی۔ اس لئے جس نے جتنا حصہ دیکھا اس کی بنیاد پر انہوں نے ایک رائے قائم کی۔ جب یہ سارا مواد بعد کے لوگوں کو ملا، اور اس سے حج

کے تفصیلی احکام مرتب کیے جانے لگے تو جس کو جس انداز سے معلومات ملی تھیں اس نے اس انداز سے احکام کا استنباط کیا اور تفصیلات کو اسی انداز مدوّن کیا۔

مثلاً حج کی تین مشہور اقسام ہیں۔ حج افراد، حج قران اور حج تمتع۔ یہ عجیب بات ہے کہ صحابہ کرام میں کچھ کا خیال تھا کہ حضور نے حج افراد فرمایا۔ کچھ کا خیال تھا کہ حج قران فرمایا اور کچھ کا خیال تھا کہ حج تمتع فرمایا۔ جن فقہا نے اپنی تحقیق سے یہ رائے قائم کی کہ حضور کا حج حج قران تھا، جیسے امام ابوحنیفہ، تو انہوں نے حج قران کو افضل قرار دیا۔ جن فقہا کی تحقیق میں حضور نے حج افراد فرمایا جیسے امام احمد بن حنبل، انہوں نے حج افراد کو افضل قرار دیا۔ جن کی تحقیق یہ تھی کہ حضور نے حج تمتع فرمایا تو انہوں نے تمتع کو افضل قرار دیا، جیسے امام شافعی۔ اب یہ تحقیق کا اختلاف ہے۔ یہ سارے مباحث بیک وقت سیرت کے مباحث بھی ہیں۔ اس لئے کہ اس میں واقعاتی اعتبار سے حضور کے حج کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ یہ فقہی مسئلہ بھی ہے۔ حدیث کا مسئلہ بھی ہے کیوں کہ حج کے احکام سے متعلق احادیث بھی اس میں زیر بحث آتی ہیں۔ یہ سیرت نگاری کا فقیہانہ اسلوب ہے۔ اس پر خاصا کام ہوا ہے۔

متکلمانہ اسلوب

فقہیانہ اسلوب کے ساتھ ایک اور اسلوب بھی ہے جس کو ہم متکلمانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ علم کلام کے نقطہ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کو دیکھا جائے اور جو چیزیں علم کلام کے نقطہ نظر سے اہم ہیں وہ نمایاں کی جائیں۔ یہاں علم کلام سے مراد یہ گفتگو نہیں ہے جو ہم اور آپ دن رات کرتے ہیں، نہ اس سے مراد ادب کا کوئی شعبہ ہے، جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ کلام ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی وہ علم یا فن ہے جس میں اسلامی عقائد کو عقلی دلائل سے بیان کیا جائے اور دوسرے مذاہب کے عقائد پر عقلی انداز سے تنقید کی جائے اور عقلی دلائل کی بنیاد پر اسلامی عقائد کی برتری ثابت کی جائے۔

یہ فن علم کلام کہلاتا ہے۔ اس کا رواج بھی سب سے پہلے محدثین کے ہاں ہوا۔ محدثین نے پہلے پہل وہ سوالات اٹھائے جن کا تعلق علم کلام سے تھا۔ علم کلام میں سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی عقلی دلیل کیا ہے۔ یہاں علم کلام کا تعلق سیرت کے

ساتھ استوار ہوتا ہے۔ جب حضور کی نبوت پر عقلی دلیل کا مسئلہ آیا تو پھر معجزات کی بحث آئی۔ پھر معجزات کی واقعاتی تفصیلات کو جمع کرنے کی بات ہوئی۔ پھر معجزات کی تعداد پر بحث ہوئی۔ اس طرح یہ مسئلہ سیرت کا ایک بہت مہتم بالشان مسئلہ بن گیا۔ گویا سیرت اور کلام کا ایک ایسا مشترکہ مضمون سامنے آیا جس کو ہم متکلمانہ سیرت کہہ سکتے ہیں۔ یا کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں۔

ادیبانہ اسلوب

سیرت کا ایک اور اسلوب جو بعد میں سامنے آیا اس کو ہم ادیبانہ اسلوب سیرت کہہ سکتے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بعد میں سامنے آیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ محدثین اور مستند ارباب سیرت کی بارگاہ میں اس اسلوب کو پذیرائی نہیں مل سکی اور نہ مل سکتی تھی۔ جن حضرات نے آگے چل کر اس اسلوب کے تحت سیرت کی کتابیں لکھیں، اگر آج ائمہ محدثین زندہ ہوتے تو شاید ان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتے۔ ادیبانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کو خالص ادبی اسلوب نظم یا نثر میں مرتب کیا جائے۔ دراصل جب سیرت کے واقعات مرتب ہو گئے، مستند قرار پا گئے اور لوگوں تک پہنچ گئے تو بعض ادیب حضرات نے ان کو یا تو حکایت کے انداز میں یا نظم میں یا مکالمہ اور کہانی کے انداز میں بیان کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس میں وہ لوگ جو سیرت پر سنجیدہ کتابیں نہیں پڑھنا چاہتے ان کے لئے سیرت کے مواد میں ایسی ادبی چاشنی اور رنگ پیدا کر دیا جائے کہ غیر متخصص بھی سیرت کا مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ اسلوب سب سے پہلے فارسی میں پیدا ہوا۔ فارسی کے لٹریچر سے اردو میں آیا۔ عربی میں اس کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس اسلوب پر زیادہ کتابیں بہت بعد میں اور زیادہ تر اردو اور فارسی میں لکھی گئیں تو یہ درست ہوگا۔ ادیبانہ اسلوب میں کچھ کتابیں نظم میں ہیں اور کچھ نثر میں بھی ہیں۔ نظم کا آغاز پہلے ہوا، نثر کا آغاز بعد میں ہوا۔ ویسے بھی ہر زبان کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر زبان میں نظم کا آغاز پہلے ہوتا ہے اور نثر کا بعد میں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں بہت سے ادیبوں نے سیرت کے واقعات کو نظم کیا۔ ایک ایک ہزار شعروں پر مشتمل نظمیں لکھی گئیں، بلکہ دو دو اور تین تین ہزار اشعار پر مشتمل نظمیں اور قصائد ہیں جن میں حضور

ﷺ کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا گیا۔ کسی نے معجزات کو بیان کیا ہے۔ کسی نے بعض خاص غزوات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرانہ اسلوب

سیرت نگاری کا ایک اور اسلوب جو بہت بعد میں پیدا ہوا، وہ مناظرانہ اسلوب تھا۔ اس سے مراد وہ اسلوب تھا جو مسلمان مسالک یا مدارس فکر کے مابین مناظروں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ ان مناظروں کے نتیجے میں مسلمانوں میں مختلف رائے رکھنے والے لوگوں نے سیرت کے مختلف واقعات کی تعبیر اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کی۔ اس تعبیر میں اپنے نقطہ نظر کی تائید میں دلائل دیئے اور دوسروں کے نقطہ نظر پر تنقید کی۔ اس اسلوب پر تیسری چوتھی صدی ہجری کے بعد سے تھوڑا بہت کام تو ہر دور میں ہوتا رہا۔ لیکن زیادہ زور وشور سے برصغیر میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چیز سامنے آنا شروع ہوئی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ میں اس کو محض اتفاق نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی مناظرانہ تحریروں میں شدت برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں یہ مسائل بھی پیدا ہونے لگے اور ایسے ایسے مسائل اور سوالات اٹھائے گئے جو پچھلے بارہ سو سال میں نہیں اٹھائے گئے تھے۔ ہر فریق نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں قرآن پاک سے بھی استدلال کیا۔ یہ عمل نسبتاً محدود تھا۔ سیرت اور حدیث سے استدلال کی نوبت زیادہ آئی۔ اس کے نتیجے میں ایک مناظرانہ ادب سامنے آیا جس کی علمی حیثیت کے بارے میں تو سردست کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کا کم سے کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مناظرہ اور بحث میں حصہ لینے والے تمام فریقوں کے پیروکاروں کے حلقوں میں سیرت کے بہت سے واقعات معلوم اور متعارف ہوگئے۔ سیرت کے جس واقعہ سے کسی خاص بزرگ نے استدلال کیا تو کم سے کم ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں میں وہ واقعات مشہور ومعروف ہوگئے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر اس سارے مناظرانہ ہنگامہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سیرت کا علم نسبتاً زیادہ عام ہوگیا۔

یہ سیرت کے وہ بڑے بڑے اسالیب ہیں جو حضرت عروہ بن زبیر کے دور سے لے کر آج تک گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال میں ہمارے سامنے آئے۔ جب شروع شروع میں یعنی پہلی صدی ہجری میں حضرت عروہ بن زبیر کے کام سے مغازی کی تدوین کا آغاز ہوا تو گویا پہلی صدی ہجری میں اسلوب مورخین بھی سامنے آ گیا تھا اور اسلوب محدثین بھی سامنے آ گیا تھا۔ تابعین جب سیرت کے ذخائر کو جمع کر رہے تھے تو صحابہ سے معلومات حاصل کر کے جمع کر رہے تھے۔ اس زمانے کی جو تحریریں آج موجود ہیں وہ اسی محدثانہ یا مورخانہ انداز میں ہیں۔ یعنی دونوں انداز کی تحریریں موجود ہیں۔ عروہ کی تحریریں بھی ہیں جن کو مؤرخانہ اسلوب کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے بعض حضرات کی جو تحریریں محدثانہ اسلوب میں آج دستیاب ہیں ان میں محدثانہ اسلوب ہی کی پیروی کی گئی ہے کہ ہر واقعہ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ ہر راوی کا الگ الگ ذکر ہے اور روایت یا واقعہ کے جو جو حصے جہاں جہاں دستیاب ہیں سب کو جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔ اس کے برعکس مؤرخانہ اسلوب کے نمائندہ حضرات نے واقعہ کی تاریخی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو معاملہ ہوا ہے اس کی مکمل تصویر سامنے آ جائے اور جہاں جہاں خلا ہے اس خلا کو مختلف واقعات اور روایات سے پر کیا جائے۔ یہ مورخین کا اسلوب تھا۔ محدثین کا اصل ہدف صرف یہ تھا کہ جو روایات موجود ہیں ان کو جوں کا توں آگے تک پہنچا دیا جائے۔ تاریخی واقعہ کی تفصیل مکمل ہو یا نامکمل ہو، نقشہ مکمل ہو یا نامکمل رہے، یہ محدثین کی دلچسپی کا میدان نہیں تھا۔

اسلوب محدثین کے بڑے بڑے نمائندہ تو خود بڑے بڑے محدثین ہی ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں میں سیرت کا انتہائی غیر معمولی ذخیرہ موجود ہے۔ کل کسی دوست نے 'الرحیق المختوم' کے بارے میں سوال کیا تھا۔ الرحیق المختوم کے مصنف نے کوشش کی ہے کہ اپنی کتاب کے لئے بنیادی معلومات اور روایات بخاری اور مسلم سے لی جائیں۔ انہوں نے اصل مواد ان دو کتب سے لیا ہے اور پھر جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے وہاں دوسری کتب حدیث سے معلومات لی ہیں۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ کتاب اگرچہ محدثین کے فراہم کردہ مواد پر مبنی ہے، لیکن ان کا اسلوب مورخانہ ہے۔ اس طرح کی اور کتابیں بھی لوگوں نے لکھی ہیں۔

جن حضرات نے محدثانہ اسلوب کو اپنایا، ان کی اولین کوشش یہ تھی کہ روایت باللفظ کی مکمل پابندی کی جائے۔ روایت باللفظ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح راوی نے اپنے سے پہلے راوی سے سنا ہے اس میں کوئی لفظی تبدیلی کیے بغیر اس کو جوں کا توں آگے بیان کردے۔ یہ بات شروع ہی میں محدثین کے درمیان زیر بحث آئی کہ کیا کسی حدیث کی روایت میں روایت بالمعنیٰ کی اجازت ہے۔ کیا کسی حدیث کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ محدثین نے بالاتفاق رائے دی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے تھے وہی بیان کئے جائیں۔ محدثین نے صرف صحابہ کرام کی روایت کے بارہ میں ایک چیز کی اجازت دی کہ اگر کوئی صحابی کسی واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو اس کو قابل قبول سمجھا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے کا کوئی واقعہ، جس میں حضور ﷺ کا کوئی ارشاد موجود نہ ہو، وہاں روایت باللفظ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام کی سیرت کے کسی واقعہ کو کسی صحابی نے دیکھا اور اپنے الفاظ میں بیان کر دیا، تو ان کو اختیار ہے کہ وہ روایت باللفظ کی بجائے روایت بالمعنیٰ کا انداز اپنائیں۔ جب صحابی کی روایت تابعی کو مل جائے تو پھر تابعی کے لئے جائز نہیں کہ ان صحابی کی روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔ آپ حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں۔ ایک ایک صفحہ پر یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ لفظ فلاں استاد کا ہے اور یہ لفظ فلاں استاد کا ہے۔ یہاں تک احتیاط کی انتہا کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر احتیاط نہیں ہوسکتی۔ کہ مثال کے طور پر سفیان نام کے سفیان ثوری اور دوسرے سفیان بن عیینہ دو بڑے محدثین ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک استاد نے حدیث کی روایت کے ضمن میں بیان کیا ہوتا تھا کہ حدثنی سفیان، کہ مجھ سے یہ حدیث سفیان نے بیان کی۔ شاگرد کو تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے استاد کون سے سفیان ہیں۔ لیکن اگر کسی شیخ نے دونوں سفیانوں سے کسب فیض کیا ہو اور ان کا کوئی شاگرد آگے بیان کرے کہ حدثنی سفیان۔ تو یہ التباس ہوسکتا ہے کہ یہاں کون سے سفیان مراد ہیں۔ مثال کے طور پر محدث الف سند بیان کریں کہ حدثنی سفیان، تو ان کے شاگرد اور راوی محدث ب یہ نہیں کہیں گے کہ حدثنی سفیان بن عیینہ۔ اس لئے کہ اگر وہ کہیں گے کہ حدثنی سفیان بن عیینہ، تو یہ الفاظ تو استاذ کے نہیں ہوں گے۔ استاذ کے الفاظ تو صرف اتنے ہیں کہ حدثنی سفیان، تو ان کے شاگرد ان الفاظ میں یک طرفہ ترمیم کیسے

کر دیں۔ یہ جائز نہیں۔ وہ یہ بات واضح کرنے کے لئے کہ یہ سفیان بن عیینہ ہیں، کہیں گے کہ حدثنی سفیان وھوابن عیینہ۔ مجھ سے سفیان نے بیان کیا اور یہاں ابن عیینہ مراد ہیں۔ تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ یہ لفظ 'ابن عیینہ' جس کا اضافہ میں نے کیا ہے یہ استاد کی زبان سے نہیں نکلا تھا، میں نے یہ لفظ وضاحت کی خاطر بیان کیا ہے۔ جو قوم کسی کے نام کے مکمل اور نامکمل کرنے میں احتیاط کرتی ہو کہ استاد نے جزوی نام بولا تھا اور میں مکمل نام بتارہا ہوں تو یہ تکمیل استاد سے منسوب نہ کروں، وہ قوم رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ میں کس طرح تساہل سے کام لے سکتی ہے۔ اس لئے محدثین کے اسلوب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کسی لفظ کے بارے میں کوئی تردد کی گنجائش نہیں تھی۔

پھر خود رسول اللہ ﷺ نے بھی صحابہ کرام کو اس کی تربیت دی کہ وہ آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو جوں کا توں بیان کریں اور ان کی روایت بالمعنی سے احتراز کریں۔ چنانچہ بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو کوئی چیز سکھائی، کوئی دعا سکھائی، کوئی خطبہ لکھوانا چاہا۔ اس میں اگر کسی نے یادداشت کی کمی کی وجہ سے یا یہ سمجھ کر کہ دونوں لفظ ایک ہی مفہوم کے ہیں، کوئی دوسرا لفظ بول دیا تو حضور نے اس کی اصلاح اور وضاحت فرمائی، جس کی مثال میں پہلے دے چکا ہوں کہ ایک صحابی نے 'و نبیک الذی ارسلت' کی بجائے 'و رسولک الذی ارسلت' بول دیا تھا تو آپ نے ان کا کان پکڑ کر فرمایا تھا کہ کیا میں نے ایسا کہا تھا۔ گویا یہ اس بات کی یاددہانی تھی کہ جو لفظ سکھایا جائے اس کو اسی طرح یاد رکھا جائے۔ اس میں معنیٰ کی مشارکت کی وجہ سے ازخود کوئی ترمیم نہیں کرنی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ روایت باللفظ کی پابندی کی وجہ سے خود سیرت نگاروں اور مغازی نویسوں کے بیشتر بیانات اور عبارات میں بالکل ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ اگر ایک استاد سے دو راویوں نے حدیث لی ہے تو دونوں کے الفاظ بالکل ایک ہی ہوں گے۔ ان دونوں کے بیانات کو الگ الگ سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے تو ان دونوں میں ذرہ برابر فرق نہیں ملے گا۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ دونوں تابعین ہیں اور دونوں نے کئی صحابہ کرام سے کسب فیض کیا ہے۔ بعض صحابہ کرام دونوں کے اساتذہ ہیں۔ ان دونوں کے بیانات الگ الگ کتابوں میں منقول ہیں۔ دونوں کے بیانات اب الگ الگ

کتب میں بھی جمع ہو گئے ہیں۔ بقیہ سیرت نگاروں کے مقابلہ میں موسیٰ بن عقبہ کے بیانات کو محدثین کی نظر میں زیادہ استناد اور اعتماد حاصل تھا۔ اب جب کچھ لوگوں نے موسیٰ بن عقبہ اور عروہ بن زبیر کے بیانات کو الگ الگ جمع کر کے مرتب کر دیا اور اب ہم ان کا تقابل کرتے ہیں تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے کی ہو بہو نقل ہے۔ لفظ بہ لفظ ایک ہی روایت دونوں جگہ چلی آ رہی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں نے اپنے اساتذہ سے جو سیکھا وہ بعینہٖ اس کو ضبط تحریر میں لے آئے اور روایت باللفظ کے اصول کی مکمل پابندی کی۔

محدثین کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جو جو راوی ان کی ذات سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ تک درمیان میں آیا ہو، وہ پوری طرح سے اپنی حفظ میں، یادداشت میں جس کو محدثین ضبط کہتے ہیں، اپنے کردار میں، سچائی میں اور جن استاد سے روایت کر رہے ہیں ان سے ملاقات اور تلمذ میں یقینی اور قطعی درجہ رکھتا ہو۔ ان میں سے ہر چیز طے شدہ اور تاریخی طور پر ثابت شدہ ہو۔ ایسی حدیث محدثین کی نظر میں صحیح کہلاتی ہے۔ بعض جگہ ایسا ہوا کہ ان میں سے کسی ایک صفت میں کوئی راوی کمزور ہے۔ کسی کی یادداشت کمزور ہے۔ کسی کی یادداشت تو کمزور نہیں ہے لیکن کسی اور پہلو سے ان کے کسی معاملہ کو کمزور سمجھا گیا۔ تو جس حدیث یا روایت میں کوئی ایسے راوی آ گئے، جو کسی ایک اعتبار سے بھی کمزور ہو تو اس روایت کا درجہ گھٹ گیا۔ اب جو روایات موسیٰ بن عقبہ کی ہیں ان میں سے بعض کے راوی ایک بزرگ ہیں ابن لہیعہ، جو محدثین کی نظر میں کمزور ہیں۔ شروع میں جن محدثین تک ان کی روایات آئیں انہوں نے ان کو کمزور قرار دیا۔ موسیٰ بن عقبہ کی ذات اور ان کے حفظ وضبط میں تو کوئی تامل نہیں تھا، لیکن اس ایک راوی کی وجہ سے ان کی روایت کو بھی قبول کرنے میں تامل کیا گیا۔ محدثین کا یہ بھی اصول ہے کہ اگر کوئی روایت کسی ایک راوی کی وجہ سے کمزور قرار دی گئی ہو اور کسی دوسری روایت سے اس کی تائید ہو جائے تو پہلی روایت کی یہ کمزوری دور ہو جاتی ہے اور پھر اس کو کمزور نہیں کہا جاتا۔ اس کی علم اصول حدیث میں لمبی بحث ہے اور بہت سی اصطلاحات ہیں۔ میں حسن اور صحیح اور حسن لغیرہ اور صحیح لغیرہ کی فنی بحثوں میں نہیں جاتا۔ اب چونکہ عروہ اور موسیٰ بن عقبہ دونوں کی روایات بالکل ایک جیسی سامنے آ گئیں تو جن جن روایات میں، جو تعداد میں بہت تھوڑی تھیں، کوئی کمزوری تھی وہ کمزوری دور ہو جاتی ہے اور وہ اعتراض

جو بعض محدثین کی طرف سے تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عروہ بن زبیر بیک وقت اسلوب محدثین کے بھی پیروکار تھے اور اسلوب مورخین کے بھی۔ خاص طور پر جو تحریریں انہوں نے عبدالملک کے لئے لکھیں وہ مورخانہ اسلوب کا نمونہ ہیں، اور یہ اسلوب سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنایا۔ انہوں نے کسی خاص واقعہ کی ایک مکمل اور متکامل تصویر اپنے مکتوب الیہ کو بھیجی۔ عروہ بن زبیر کے بعد آہستہ آہستہ یہ اسلوب مورخین میں مقبول ہوتا گیا۔ بعض بڑے فقہا نے بھی کہیں نہ کہیں اس اسلوب کو ضرور استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام شافعی جہاں ایک بہت بڑے فقیہ ہیں وہاں ایک بہت بڑے محدث بھی ہیں۔ امام شافعی کی اپنی کتاب 'کتاب الام' استناد کے بہت اونچے درجے پر فائز ہے۔ پھر امام مالک کی روایت سے امام شافعی کے علاوہ بعد کے محدثین نے بھی بہت سی روایات نقل کی ہیں، مثلاً امام بیہقی نے۔ یہ خود مسلکاً شافعی تھے اور بہت بڑے محدث تھے۔ امام بیہقی آخری محدث ہیں جنہوں نے براہ راست روایت کر کے کوئی کتاب مرتب کی ہے۔ ان کا انتقال 458ھ میں ہوا۔ ان کے بعد کوئی ایسا محدث نہیں ہے جس نے براہ راست روایت کر کے رسول اللہ ﷺ کی احادیث مرتب کی ہوں۔ ان کے بعد آنے والے محدثین نے دوسرے مجموعوں کی بنیاد پر مجموعے مرتب کئے ہیں۔ براہ راست روایت کی بنیاد پر تدوین حدیث کا کام امام بیہقی کے بعد کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

امام بیہقی نے کئی مقامات پر امام شافعی کی روایت سے احادیث نقل کی ہیں۔ ان کا انداز یہی ہے اور یہ تاریخی اور سیرت کے واقعات سے متعلق ہے۔ میں ایک حوالہ مثال کے طور پر دینا چاہوں گا۔ امام شافعی کے حوالے سے امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ امام شافعی کہتے ہیں کہ 'اخبرنی غیر واحد من اہل العلم والصدق من اہل المدینہ ومکہ من قبائل قریش وغیرہم'، یعنی مجھ سے ایک سے زیادہ اہل علم نے جو سچائی کی وصف سے متصف تھے، جن کا تعلق مکہ اور مدینہ کے قریشی اور غیر قریشی قبائل سے تعلق رکھتے تھے، '**وکان بعضهم احسن اختصاصاً للحديث من بعض**'، ان میں سے کچھ حضرات علم حدیث سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے۔ '**وقد زاد بعضهم على بعضهم في الحديث**'، ان میں سے بعض نے اس حدیث کے حصے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بیان کئے ہیں۔ اس تمہید کے بعد آگے امام

شافعی اصل بات بیان کرتے ہیں، وہ یہ کہ سیدنا عمر نے جب دیوان مرتب کیا تو بنی ہاشم سے آغاز کیا اور پھر اس کی پوری تفصیل امام شافعی نے بیان کی ہے۔ اب یہ گویا امام شافعی جیسے بہت بڑے محدث اور بہت بڑے فقیہ صحابہ کے زمانے کا ایک تاریخی واقعہ بیان کر رہے ہیں کہ جب حضرت عمر فاروق نے دیوان مرتب کیا تو کیسے کیا۔ یہ صحابہ کرام کا اجتماعی طرز عمل ہے۔ سب صحابہ نے اجماع سے طے کیا۔ اجماع ماخذ قانون ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ماخذ شریعت ہے، لیکن امام شافعی اس کو واقعہ کو راویوں کا نام لئے بغیر بیان کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں نے بہت سے لوگوں سے معلومات جمع کیں، جن کے علم اور صداقت پر مجھے اعتماد ہے اور ان کی روایت کی بنیاد پر میں نے یہ واقعہ نقل کیا۔ یہ مثال اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جو اسلوب شروع میں مورخین نے اختیار کیا تھا اور جس پر ابتدا میں محدثین کو تامل تھا اور جس کے بارہ میں ان کے حلقہ میں شدید ملاحظات کا اظہار کیا گیا۔ وہ بتدریج مقبول ہوتا گیا۔ یہاں تک امام شافعی جیسے جیدترین علمائے حدیث نے بھی بالآخر اس کو اختیار کر لیا۔

اسلوب محدثین پر قابل ذکر کتابوں کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ میں کل کروں گا۔ لیکن ایک ضروری بات ابھی عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سیرت کے مصادر و مآخذ کے بارے میں محدثین نے یہ جو ملاحظات کی ہیں وہ ان کے صرف ایک پہلو کے بارہ میں ہیں۔ کل ایک دوست نے ابن اسحاق کے بارے میں امام مالک کا ایک تبصرہ بیان کیا تھا۔ اس طرح کے تبصرے مختلف محدثین نے مختلف سیرت نگاروں کے بارے میں کئے ہیں۔ امام احمد نے بھی کئے ہیں اور امام مالک نے بھی کئے ہیں۔ ہمارے مغربی محققین کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اس طرح کے یکطرفہ بیانات کو جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سیرت کے جتنے بھی مصادر ہیں وہ سب ناقابل اعتماد ہیں۔ 1980-81 میں غالباً جرمنی میں ایک باقاعدہ سیمینار ہوا تھا۔ اس کا موضوع ہی یہ تھا کہ حضور ﷺ کی سوانح عمری کے جو مصادر اور مآخذ ہیں وہ غیر مستند ہیں اور غیر مستند ماخذ کی موجودگی اور مستند مآخذ کی عدم موجودگی میں (نعوذ باللہ من ذالک) تاریخی اور حقیقی محمد کا پتہ کیسے چلایا جائے۔

اس لئے اس طرح کے ملاحظات کے بارے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کل میں

نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ جرح غیر مفسر قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ جرح اور تعدیل غیر مفسر اور تعدیل اور جرح مفسر دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک محدث کی رائے پر کسی راوی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ دینا مناسب نہیں ہے۔

ان تمام محدثین نے اپنی کتابوں میں جو مواد شامل کیا ہے وہ ہر اعتبار سے چھان پھٹک کر شامل کیا گیا ہے، آپ اس عقلی اعتبار سے دیکھ لیں، کہ کسی بیان کو جانچنے کے عقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں اور نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں۔ نقلی دلائل وہ ہیں جن کو علمائے حدیث نے اصول روایت کے نام سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے اصول کیا ہیں۔ اس کو آپ حدیث کا بیرونی نقد کہہ سکتے ہیں۔ پھر عقلی دلائل وہ ہیں جس کو اصول درایت کے نام سے بیان کیا ہے۔ جس کو آپ داخلی نقد حدیث کہہ سکتے ہیں۔ ایک حدیث کا بیرونی نقد ہے یعنی خارجی اور روایتی اعتبار سے اور دوسرا ہے حدیث کا داخلی نقد درایت کے اعتبار سے۔ دونوں اصولوں کی روشنی میں محدثین نے جو بیانات نقل کئے ہیں اور جو تمام کتب حدیث میں شامل ہیں۔ ان کی بنیاد پر لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی میں نے ہمارے شیخ ڈاکٹر صفی الرحمٰن مبارکپوری کی کتاب الرحیق المختوم کا ذکر کیا، یہ سب کی سب کتب حدیث سے ماخوذ ہے۔

پھر کتب حدیث میں سیرت سے متعلق جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان کا اہل علم نے الگ سے بھی مطالعہ کیا ہے۔ ایک دو ایسی کتابوں کا ابھی میں تذکرہ بھی کرتا ہوں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی جو صحیح بخاری کے بڑے شارحین میں سے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے شاید سب سے بڑے محدث تھے۔ ان کی کتاب میں سیرت کے مختلف مباحث پر جابجا گفتگو ہوئی ہے اور صرف روایت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر تو علم حدیث وروایت کی معراج پر تھے۔ انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں کی ہے جو اصول روایت اور اصول درایت پر پوری نہ اترتی ہو۔ ان کی اس پوری کتاب سے سیرت کا مواد نکال کر حال ہی میں ایک بزرگ نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ تین جلدوں کی یہ کتاب ایک جامع کتاب سیرت ہے جو حافظ ابن حجر کی کتاب فتح الباری سے ماخوذ اور مستخرج ہے۔ اس کتاب کو یقیناً حافظ ابن حجر نے بطور سیرت کے تو نہیں لکھا تھا، لیکن اس کا ایک ایک لفظ حافظ ابن حجر ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ ان کی کتابوں

سے استخراج کر کے اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ ان کے مباحث مکمل طور پر سامنے آ گئے۔ اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے گویا سیرت پر محدثانہ انداز سے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے جس طرح صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا ہے، جس کے پیش نظر یہ کہا گیا کہ لاہجرۃ بعد الفتح، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روایتی اور حدیث کے نقطۂ نظر سے سیرت کا حق بھی انہوں نے ادا کر دیا اور جو کچھ سیرت کے بارے میں علم حدیث کی روشنی میں کہا جا سکتا تھا وہ انہوں نے کہہ دیا ہے۔ یہ تھا سیرت کا قدیم ترین اور مستند ترین اسلوب جس نے سیرت کے تمام بنیادی مباحث کو محفوظ کر دیا۔ جس نے سیرت کی core متعین کر دی۔ اب اس میں جزوی تفصیلات تاریخ سے، ادب سے اور دیگر ذرائع سے اضافہ کی جا سکتی ہیں۔ جس کو ان ثانوی ذرائع سے آنے والے اُس مزید مواد سے اتفاق ہو تو وہ اضافہ کرے اور جس کو اتفاق نہ ہو وہ اضافہ نہ کرے۔ لیکن سیرت کے علم پر اس اضافی مواد کو نا قابل قبول سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

صرف ایک کتاب کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ اس موضوع پر قدیم ترین کتاب بھی ہے اور مستند ترین بھی۔ وہ امام ترمذی کی شمائل نبوی ہے۔ کتاب الشمائل سیرت نبوی کے اس خاص موضوع کی جامع اور مکمل کتاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک، آپؐ کے شخصی عادات وخصائل اور آپ کی ذاتی اور شخصی زندگی کے پہلو۔ یہ ان موضوعات پر سب سے قدیم، سب سے مقبول اور سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ غالباً دنیا کی ہر اہم زبان میں اس کے تراجم ہوئے ہیں۔ سب سے مشہور اردو ترجمہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا ہے۔ پہلی بار یہ آج سے تقریباً اسی نوے سال پہلے شائع ہوا تھا، بعد میں اس کے لاتعداد ایڈیشن نکلے۔ اور آج ہر جگہ دستیاب ہے۔

مسلم اسپین میں مسلمانوں کی روایت بہت مضبوط رہی ہے۔ بعض جید ترین اہل علم اسپین میں پیدا ہوئے۔ افسوس کہ اسپین میں مسلمانوں کے علمی ذخائر کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بعض بڑے بڑے محدثین اسپین میں پیدا ہوئے اور انہوں نے علم حدیث پر ایسا کام کیا تھا جو کسی اور نے نہیں کیا لیکن افسوس کہ وہ کام بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بقی بن مخلد ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے پورے

روئے زمین کے چھ چکر لگائے۔ روئے زمین سے مراد دنیائے اسلام تھا۔ یعنی دنیائے اسلام کے انتہائی مشرقی مقامات جو چین کی سرحد بلکہ کاشغر وغیرہ سے لے کر اسپین تک پھیلے ہوئے تھے، اس پورے علاقہ کے انہوں نے چھ چکر لگائے تھے۔ ظاہر ہے گھوڑے یا اونٹ کی پشت پر یا شاید کچھ مقامات پر پیدل بھی سفر کیا ہوگا۔ یہ سفر کتنے وقت میں کیا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس وسیع علاقہ میں موجود اہل علم سے استفادہ کر کے انہوں نے حدیث کی ایک کتاب مرتب کی تھی جس کے بارے میں تمام محدثین اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حدیث کی اُس جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی۔ وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ اسی طرح سے علم تفسیر کی بعض بہترین اور جید ترین ایسی کتابیں جو آج موجود ہیں اور تفسیری ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ وہ بھی اسپین میں مرتب ہوئیں۔ اسپین کے مشہور شہر قرطبہ کے امام قرطبی کی تفسیر پچیس تیس جلدوں میں بارہا چھپی ہے اور آج موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی ایک مکمل تفسیر ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے اور جن جن علوم وفنون سے مدد لی جا سکتی ہے وہ سارے کے سارے اس میں موجود ہیں۔ اسپین کی روایت کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ وہاں کی روایت بڑی مضبوط اور قوی تھی اور وہاں کی روایت میں کسی آدمی کے لئے اپنے آپ کو نمایاں کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ایک بہت بڑے محدث جن کے بارے میں خود اہل اندلس نے یہ کہا کہ 'ھو اعلم اھل المغرب'، کہ اہل مغرب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وہ اعلم اہل المغرب علامہ حافظ ابن عبد البر تھے۔ حافظ ابن عبد البر اپنے زمانے میں تذکرہ، تفسیر، سیرت اور اس طرح کے ہر فن میں اعلم اہل المغرب تھے۔ ان کی ایک کتاب موطاء امام مالک کی شرح ہے۔ موطا امام مالک کی شرح میں آج تک ان سے آگے کوئی نہیں جا سکا ہے۔ ان کا انتقال 463ھ میں ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک ایک ہزار سال ہونے کو ہیں۔ ان ایک ہزار سالوں میں آج تک کوئی ایک شخص بھی موطاء امام مالک کی شرح میں حافظ ابن عبد البر سے آگے نہیں گیا۔ انہوں نے موطاء امام مالک کی ایک شرح روایت کے نقطہ نظر سے لکھی اور دوسری فقہی نقطہ نظر سے لکھی تھی۔ یعنی موطاء امام مالک میں جو فقہی مسائل بیان ہوئے ہیں وہ کیا ہیں اور دوسری یہ کہ جو روایات ہیں، ان کے راوی کون کون ہیں، یوں علم اصول اور حدیث کے نقطہ نظر سے

جو مباحث ہیں وہ بیان کئے ہیں۔ دونوں کتابیں اپنے فن میں بہت اونچے درجے کی کتابوں میں سے ہیں۔ ایک کتاب کا نام ہے 'التمهيد لما في الموطا من الاثار والمسانيد' ہے اور دوسری کتاب کا نام 'الاستذكار لما في الموطا من مذاهب علماء الامصار'۔

حافظ ابن عبدالبر نے سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی جو ہمارے حساب سے اس دور میں آتی ہے جب تدوین وتالیف کا دور شروع ہو چکا تھا اور براہ راست روایت کا زمانہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت انہوں نے ایک کتاب لکھی۔ چونکہ خود بہت بڑے محدث تھے اس لئے انہوں نے تمام روایات سیرت کو جمع کیا۔ مغازی پر جو روایات اور لٹریچر تھا اس کو جمع کر کے علم حدیث کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔ جو چیز مستند ترین روایات کے معیار پر قابل قبول تھی وہ قبول کر لی اور جو چیز مستند ترین روایات کے ماحول میں قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی اس کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ خود محدث تھے۔ مورخ بھی تھے۔ صحابہ کے تذکرے پر قدیم ترین کتاب 'الاستيعاب في معرفة الاصحاب' انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے کئی ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ جمع کیا ہے۔ گویا تاریخ، تذکرہ اور رجال کے میدان کے آدمی بھی تھے۔ پرتگال کے ایک دوسرے شارح موطا قاضی ابوالولید الباجی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ 'لانظير له في علم الحديث في الاندلس'، کہ اندلس میں علم حدیث میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ خود موطا کے ایک شارح نے لکھا ہے۔

اسپین اور پرتگال کا ذکر کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو یاد دلایا جائے کہ اسپین اور پرتگال ماضی میں کیا تھے۔ پرتگال بھی اس زمانے میں اسپین کا ایک حصہ تھا۔ الباجی جہاں کے رہنے والے تھا وہ جگہ آج کل لزبن کے قریب ہے۔ ابوالولید الباجی بھی موطا کے شارح تھے اور قدیم ترین کتابوں میں ذکر ملتا ہے 'وقال الباجی'، باجی سے مراد یہی قاضی ابوالولید الباجی ہیں۔

جب قاضی عبدالبر نے یہ کتاب 'الدرر في اختصار المغازي والسير' لکھی تو یہ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب قرار پائی۔ عربی زبان میں کتابوں کے نام قافیہ اور خوبصورتی کے ساتھ رکھنے کا ایک رواج تھا۔ بعض نام بڑے لمبے بھی ہوتے تھے۔ کتاب کے

نام کا مفہوم ہے سیر اور مغازی کے اختصار سے بیان کئے گئے چند موتی۔ اس میں انہوں نے موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، عروہ بن زبیر، جتنے بھی لوگوں نے مغازی اور سیر پر کام کیا تھا، ان کے کام کو سامنے رکھا اور جائزہ لے کر ایک ایسی جامع کتاب لکھ دی جس کے بارے میں اہل علم نے کہا کہ اب سیر اور مغازی پر اس سے زیادہ مستند کتاب کوئی اور موجود نہیں ہے۔

اس میں مزید ایک اضافہ انہوں نے یہ کیا کہ جہاں جہاں صحابہ کرام کے نام نامکمل تھے ان کو مکمل کر دیا۔ بعض صحابہ کرام اپنے ناموں کی بجائے کنیت سے مشہور تھے۔ کہیں ان کی کنیت نہیں اور نام بیان ہوا ہے۔ کہیں والد کا نام بیان ہوا ہے۔ کہیں کسی نے کہا کہ فلاں صاحب نے کہا کہ میرے دادا نے یہ کہا تھا۔ اب وہ دادا کون تھے، ان کا نام کیا تھا اور صحابہ میں ان کا تذکرہ کہاں ملتا ہے۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو علم حدیث اور رجال پر گہری نظر رکھتا ہو۔ لہٰذا ایک تو انہوں نے یہ کام کیا کہ جہاں جہاں کسی بھی وجہ سے کوئی خلا رہ گیا تھا، اس کو انہوں نے پر کر دیا۔ معلومات کی کمی کو پورا کر دیا۔ جہاں کوئی بات احتیاط کے خلاف تھی اور قلم ضرورت سے آگے نکل گیا تھا، اس کو نکال دیا۔ چونکہ مآخذ ان کے سامنے تھے اس لئے مستند مآخذ سے کام لے کر انہوں نے جگہ جگہ اضافے بھی کئے اور خلا کو بھی پر کیا۔ انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی لکھیں جو آگے چل کر بڑی بحث اور تحقیق کا موضوع بنیں اور جن کے بارے میں بہت سی آراء وجود میں آئیں۔ میں خود کوئی رائے تو نہیں دے سکتا لیکن ایک چیز کا ذکر بطور مثال کرتا ہوں۔

عام طور پر مشہور ہے اور یہ بات بہت زیر بحث بھی آتی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کا حضورؐ کے ساتھ نکاح ہوا تو آپؓ کی عمر کیا تھی۔ اکثریت کا نقطہ نظر بالکل واضح اور متعین ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ آج کل کے کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے اور عمر زیادہ بتاتے ہیں۔ یہ بحث چلتی رہتی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام لانے والوں میں جو اولین اور ابتدائی لوگ تھے ان میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی شامل تھیں۔ اسلام تب معتبر ہوگا جب آدمی کم سے کم پانچ چھ سال کا تو ہو۔ تو اگر اولین مسلمانوں میں حضرت عائشہ کا نام شامل ہے اور ان کی عمر کم سے کم پانچ سال بھی مان لی جائے تو ہجرت کے موقع پر ان کی عمر کم سے کم اٹھارہ سال ہونی چاہئے۔ یہی بات آج کل کے بعض

محققین بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن اس طرح کے کچھ نکات حافظ ابن عبدالبر کے ہاں ملتے ہیں جن سے بعد میں آنے والے مباحث پر روشنی پڑتی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر کے بعد ایک دوسرے بزرگ جو علم حدیث میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں لیکن بطور محدث کے بہت کم اور سیرت نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ بھی اصلاً اندلس ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کو اسپین سے نکالا جا رہا تھا۔ بہت سے مسلمانوں کے ساتھ وہ بھی اسپین سے نکل کر مصر میں آباد ہوئے۔ ان کا لقب تھا ابن سیدالناس۔ یہ قاہرہ میں رہے۔ فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے۔ انہوں نے ایک کتاب 'عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر' لکھی۔ انہوں نے تین چیزیں جمع کیں۔ رسول اللہ ﷺ کے شمائل اور عادات مبارکہ کے بارے میں معلومات، سیرت کے اہم واقعات ،مغازی اور غزوات۔ ایک تو انہوں نے ان تینوں چیزوں کو یکجا کر دیا۔ ابن عبدالبر نے صرف سیرت اور غزوات کو سامنے رکھا تھا۔ انہوں نے شمائل اور بقیہ واقعات بھی جمع کر دیا۔ ایک اعتبار سے یہ گویا ابن عبدالبر کی کتاب کی تکمیلی جلد یعنی complementry volume ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر دونوں بڑے محدثین کی تحقیق کے نتیجے میں دو مستند ترین چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ انہوں نے ابن اسحاق اور واقدی کے کام کا بہت گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں کچھ منفی تبصرے مشہور تھے۔ اس لئے ایک عام تاثر یہ پیدا ہو گیا تھا کہ واقدی اور ابن اسحاق کے جن بیانات کی تائید محدثین کی طرف سے نہ ہو وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ابن سیدالناس نے واقدی اور ابن اسحاق کے تمام بیانات کا بہت گہرائی سے جائزہ لیا، مطالعہ کیا۔ جن لوگوں نے ابن اسحٰق اور واقدی کے بارے میں مثبت یا منفی رائے دی تھی ان کا بھی انہوں نے جائزہ لیا۔ جنہوں نے ان کے حق میں رائے دی تھی ان کا بھی جائزہ لیا اور ان دونوں قسم کی آراء کا انہوں نے تفصیل سے محاکمہ کیا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں کئی صفحات پر یہ بحث پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے محاکمہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ان دونوں کے بیانات بالکل مستند ہیں اور ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو صحیح

احادیث اور سیرت کے عمومی ڈھانچہ یا ہیکل عام سے متعارض ہو۔ یہ معلومات سیرت کے عمومی اسٹرکچر میں جہاں جہاں خلا ہے اس کی تکمیل کرتی ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو تحقیق کی میزان پر پوری نہ اترتی ہو یا دین کے معیار پر قابل اعتراض ہو۔

محدثین کے نقطہ نظر سے دور متوسط میں لکھی جانے والی آخری کتاب علامہ ابن کثیر کی چار جلدوں پر مشتمل سیرت النبی ہے۔ علامہ ابن کثیر دمشقی اپنے زمانے کے جید ترین علمائے کرام میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث تھے اور ابن کثیر محدث کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی تفسیر ابن کثیر بہت مشہور ہے جس کا اردو اور انگریز زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ممکن ہے فارسی، ترکی اور دوسری کئی زبانوں میں بھی ہوا ہو۔ حافظ ابن کثیر ایک بالغ نظر مورخ بھی ہیں کیونکہ اسلامی تاریخ کی مستند ترین کتابوں میں سے ایک کتاب 'البدایہ والنہایہ' انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل القدر محدث کے شاگرد ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی شمشیر برّاں سے کوئی بچ نہ سکا اور جس شخص کے خیالات میں ذرہ برابر کمزوری تھی وہ ان کے قلم کی تلوار سے محفوظ نہیں رہا، یعنی شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ۔

ابن تیمیہ واقعی شمشیر برّاں تھے اور جس چیز کے بارے میں واقعی ان کو شبہ ہوا کہ یہ چیز شریعت کے سو فیصد معیار سے ذرا بھی کم ہے انہوں نے اس کے ساتھ رعایت نہیں کی۔ ابن کثیر ان کے شاگرد تھے۔ تو ایسے استاد کے شاگرد سے یہ توقع کرنا کہ وہ کوئی کمزور یا ہلکی بات کریں گے یا جان بوجھ کر کوئی غلط چیز پیش کریں گے ممکن نہیں۔ غلطی تو ہر انسان سے ہو سکتی ہے اور اختلاف ہر انسان کی رائے سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مداہنت اور تساہل کی امید یا توقع علامہ ابن کثیر دمشقی سے نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے سیرت پر پہلے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس کو مکمل کر کے انہوں نے ایک مکمل تاریخ بنا دی جو البدایہ والنہایہ کے نام سے مشہور ہے، یعنی ابتدا اور انتہا۔

البدایہ والنہایہ تاریخ کی کتاب ہے۔ یہ صدر اسلام کے بارے میں معلومات کی ایک کان ہے۔ ایک خزانہ اور معدن ہے۔ انہوں نے اس میں کوشش کی ہے کہ روایات کا محاکمہ اور موازنہ بھی کریں۔ جو بالکل بے بنیاد روایات ہیں ان کو سرے سے نظر انداز کر دیں، جو ذرا

کمزور روایات ہیں ان کو الگ الگ بیان کر دیں۔ جہاں کسی راوی سے کوئی غلطی ہوئی ہے اس کی نشاندہی کر دیں۔ جن لوگوں نے کسی غلط فہمی یا تساہل کی وجہ سے کسی کمزور، بے بنیاد یا موضوع روایت کو بھی قبول کر لیا تھا ان کی نشان دہی کی کہ یہ روایت کمزور ہے، یا بالکل موضوع ہے اور سرے سے نا قابل قبول ہے۔ جن لوگوں نے اسرائیلیات قبول کی تھیں اور جس سے بہت مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں انہوں نے ایک قطعی فیصلہ کیا اور تنقید کر کے اسرائیلیات کو بالکل صاف کر دیا کہ فلاں اور فلاں روایات قابل قبول نہیں ہیں۔

اسرائیلیات سے مراد وہ روایات ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے حلقے سے آئیں اور بعض مسلمان علما نے ان کو قبول کرنے میں اس لئے تامل نہیں کیا کہ ان سے سیرت یا اسلام کے کسی واقعہ کی تکمیل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ مثال کے طور پر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے کہ یہودی اور عیسائی حضور کو اسی طرح پہنچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم۔ اب اگر کسی سابقہ یہودی مسلمان عالم نے، جو اسلام سے قبل یہودی رہا ہو، اس نے کسی آیت یا حدیث کی وضاحت میں یہ کہا ہو کہ اسی مفہوم کی بات یہودیوں کی فلاں کتاب میں بھی آئی ہے۔ تو ایسی باتوں کو قبول کرنے میں بہت سے مسلمان علماء نے تامل نہیں کیا۔ اس سے قرآن کی تائید ہوتی تھی اس لئے انہوں نے بیان کر دی۔ لیکن کیا یہ جو بات بیان کی جا رہی ہے کیا یہ واقعتاً بھی درست ہے؟ اس پر انہوں نے زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یا مثلاً رسول اللہ ﷺ کے اجداد کے بارے میں کوئی بات آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عرب کے جو فلاں سردار تھے، حضور کے اجداد میں ان کا فلاں نام تھا، ان کی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو یہ بات ہوئی۔ اس کو قبول کرنے میں انہوں نے بھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اس طرح ایک ایک کر کے اسرائیلی روایات اسلامی ادب میں شامل ہوتی گئیں۔

یہ اسرائیلی روایات جن دو اسلامی میدانوں میں داخل ہو گئیں ان میں ایک سیرت کا میدان تھا۔ خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے پہلے کے واقعات، آپؐ کی ولادت اور بعثت کے بارہ میں پیشین گوئیاں، آپؐ کے بارے میں سابقہ کتب کی پیشین گوئیاں، آپؐ نے آئندہ آنے والے فتن کے بارے میں جو خبر دی تھی، اس خبر کے بارے میں اگر قدیم کتابوں

میں کچھ تھا تو اس کا بیان۔ یہ میدان تھے جس میں سابقہ لٹریچر سے مواد آیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کو قبول کرلیا۔ ویسے بھی قصے کہانیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں اور عوام میں جلدی مقبول ہوجاتی ہیں۔ اس طرح کے کچھ قصے کہانیاں بہت کثرت سے پھیل گئیں۔ حافظ ابن کثیر نے ان کہانیوں کا شد ومد سے جائزہ لیا اور ایک ایک کر کے یہ ثابت کردیا کہ فلاں چیز قابل قبول ہے اور فلاں بات ناقابل قبول ہے۔

حافظ ابن کثیر کی یہ کتاب ایک جامع کتاب ہے اور استیعاب واستقصاء کے دور میں لکھی گئی ہے، کل میں نے اصطلاح استعمال کی تھی استیعاب واستقصاء، کئی دوستوں نے کہا کہ بڑا مشکل لفظ ہے، اس کی وضاحت کرنی چاہئے۔ استیعاب کا مطلب ہے کسی چیز کے بارے میں مکمل معلومات جمع کرنا۔ استقصاء کا مطلب ہے کسی چیز کو exhaustively بیان کرنا۔ جب آپ کسی چیز کو exhaust کریں گے تو وہ عربی میں استقصاء کہلاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب سارا مواد سامنے آچکا تھا اور اب محدثین، مفسرین اور مورخین اس کو ایک ایک کر کے جمع کررہے تھے اور بڑے بڑے مجموعے مرتب کررہے تھے۔ حافظ ابن کثیر نے یہ کتاب اسی دور میں لکھی۔ ان کے پاس اپنے سے پہلے کے سارے مآخذ موجود تھے۔ انہوں نے اس کتاب میں سیرت سے متعلق تمام چیزیں جمع کردیں۔ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ بھی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شروع ہوا ہے۔ جن روایات کو انہوں نے مستند اور قابل قبول سمجھا ان کو بیان کردیا۔ جن کو انہوں نے کمزور سمجھا ان کو بیان نہیں کیا۔ پھر حضور کے شمائل یعنی عادات وخصائل کے بارے میں ساری روایات انہوں نے بیان کی ہیں اور وہ احادیث جن میں حضور کے فضائل بیان ہوئے ہیں وہ بیان کیں۔ حضور کے خصائص بیان کئے۔ پھر چونکہ وہ خود بہت بڑے محدث تھے اس لئے جہاں جہاں حدیث کے نقطہ نظر کوئی چیز قابل غور ہے اس پر توجہ دلائی ہے۔ کہیں حدیث کے نقطہ نظر سے کوئی چیز ایسی ہے جو عام سیرت نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی تو وہ بھی انہوں نے نمایاں کردی۔ وہ خود بہت بڑے فقیہ بھی تھے اس لئے فقہیات سیرت پر بہت سا مواد ان کی کتاب میں موجود ہے۔ ان کے مصادر کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کا انتقال غالباً 774ھ میں ہوا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں وفات ہوئی تو ان سات سو سالوں میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان تک پہنچا۔ ان سب کا انہوں نے

استقصا اور استیعاب کیا اور چار ضخیم جلدوں میں یہ کتاب مرتب کر دی۔

البدایہ والنہایہ کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے جس میں یہ چاروں جلدیں موجود ہیں۔ جو الگ سے بھی چھپی ہیں۔ اس علیٰحدہ شائع ہونے والے ایڈیشن میں نسبتاً بہتر کام ہوا ہے، اس لئے کہ متعدد محققین نے ان کو ایڈٹ کیا ہے اور اس پر اضافی کام بھی کیا ہے۔ حوالہ جات کی تکمیل کی ہے۔ جہاں مشکل الفاظ ہیں ان کی شرح بھی کر دی ہے اور جو روایات علم حدیث میں آئی ہیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو نسخہ چار جلدوں میں الگ چھپا ہے وہ استعمال کرنا چاہیئے اور تحقیق کی غرض سے اسی کو استعمال کرنا چاہیئے۔ البدایہ والنہایہ کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے، لیکن اس کتاب کے بجائے اصل کتاب ہی سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ترجمہ میں نے پڑھ کر نہیں دیکھا اس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ کتنا مستند ہے۔ لیکن ترجمہ بہر حال موجود ہے۔

محدثین کے نقطہ نظر کی آخری کتاب کا ذکر کر کے میں اس محدثانہ اسلوب کی بات ختم کرتا ہوں۔ اصولاً تو اس کتاب کا تذکرہ دور جدید کی کتابوں کے عنوان کے تحت آنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ایک خاص انداز کی ہے اور اس دور میں اس انداز کی کوئی اور کتاب نہیں ہے اس لئے میرا جی چاہا کہ اس کتاب کو حافظ ابن کثیر کی کتاب کی بہن قرار دیا جائے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کو ان کی کتاب کا تکملہ سمجھ لیں یا ہمشیر جلد یعنی sister volume سمجھ لیں۔ شیخ سعید حویٰ مصر میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے 'الاساس فی السنۃ وفقہہا' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے سیرت بھی بیان کی ہے، فقہیات سیرت بھی بیان کی ہیں۔ حدیثیات سیرت بھی بیان کی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر یوں لگا کہ فقہیات سیرت یا محدثانہ نقطہ نظر کے مطابق یہ دور جدید کی شاید بہترین کتاب ہے۔ اگر کوئی اس کو بہترین کتاب قرار دینے سے اتفاق نہ کرے تو کم سے چند بہترین کتابوں میں لازماً اس کا شمار ہونا چاہیئے۔ ان کے بنیادی مآخذ میں صرف کتب حدیث شامل ہیں۔ جتنی بھی کتب حدیث آج دستیاب ہیں ان سب کو انہوں نے سامنے رکھا ہے۔ بہت سی کتابیں نئی چھپ گئیں ہیں جو پہلے نہیں چھپی تھیں۔ بہت سی کتابیں سی ڈیز پر آ گئی ہیں۔ مخطوطات بھی اکثر سی ڈیز پر دستیاب ہیں۔ اول تو حدیث کا کوئی قابل ذکر مخطوطہ اب غیر مطبوعہ موجود نہیں رہا۔ اگر کوئی اکا دکا ہے بھی تو اس کی تصویریں اور مائکروفلمیں اتنی کثرت سے دستیاب ہیں کہ ہر شخص کی دسترس

میں ہیں۔

انہوں نے ایک اور دلچسپ چیز بیان کی ہے۔ یہ چیز اور لوگوں نے بھی بیان کی ہے لیکن انہوں نے اس کو ایک خاص رنگ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حفظ سیرت دراصل حفظ سنت کا اور حفظ سنت حفظ قرآن کا ایک شعبہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حفظ قرآن کا وعدہ کیا ہے، 'انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون' ۔ذکر یوں تو قرآن مجید کا نام بھی ہے لیکن اس کے معنی یاددہانی کے بھی ہیں۔ اگر قرآن کو بطور یاددہانی کے محفوظ کیا گیا تو یاددہانی تب محفوظ ہوگی جب اس کی تفسیر بھی محفوظ ہو۔ تفسیر ہم تک حدیث کے ذریعے پہنچی ہے۔ تفسیر تب محفوظ ہوگی جب صاحب تفسیر مکمل روشنی میں ہوں گے۔ تو گویا حفظ قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ حفظ حدیث بھی ہو، اور حفظ حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ حفظ سیرت بھی ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کو ایک تسلسل اور ایک ہی مقصد کے مختلف شعبے یا مرحلے قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرا، محدثین اور اصولیین سب کا ہدف ایک ہے اور وہ ہے حفاظت قرآن، حفاظت تفسیر قرآن، حفاظت سیرت صاحب قرآن اور حفاظت احکام قرآن اور حفاظت ہدایت قرآن۔

اس کتاب کی ترتیب اور تدوین میں انہوں نے ایک نیا اسلوب اپنایا ہے۔ آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال پہلے ایک مصنف شیخ محمد جعفر الکتانی گزرے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر علی کتانی مرحوم جو کئی بار یہاں یونیورسٹی میں بھی تشریف لائے ہیں۔ اسی ہال میں ان کی تقریریں بھی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے جد امجد تھے اور شاید ساتویں آٹھویں دادا تھے۔ ان کی کتاب 'الرساله المستطرفه لبيان مشهور كتب السنة المشرفه' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کتب حدیث کے مختلف مدارج بتائے ہیں۔ ان مدارج کو شیخ سعید الحوی نے سامنے رکھا ہے اور جب کوئی بات کہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث درجہ اول کی احادیث میں ہے، یہ درجہ دوم میں ہے اور یہ درجہ سوم میں ہے، وغیرہ۔ دیکھنے والے کو ایک نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ جو کچھ بیان کیا جارہا ہے وہ استناد اور صحت کے اعتبار سے کس معیار پر ہے۔ کون سا بیان ہے جو درمیانی سطح پر ہے اور کون سا بیان ہے جو عام کتب حدیث میں ملتا ہے۔ یہ سب کتب حدیث وہ ہیں جو عام طور پر مشہور اور متداول ہیں۔ اس طرح انہوں نے سترہ کتب حدیث کو چھانٹ کر سیرت کے بارہ میں دستیاب مواد کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔ جو احادیث بیان کی ہیں

ان کا درجہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ صحیح ہے، حسن ہے، حسن لغیرہ ہے یا کیا ہے۔ مصنف نے احادیث کا درجہ متعین کرنے میں قدیم ائمہ فن کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ماہرین حدیث کی آراء کو بھی سامنے رکھا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ ناصر الدین البانی اور شیخ شعیب الارناؤط کی تحقیقات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ حدیث اور معاملات کو بیان کرنے میں ان کا انداز وہ ہے جو شبلی کی سیرت النبی کا ہے۔

شبلی کی سیرت النبی بڑی جامع ہے۔ انہوں نے دو موضوعات سے بحث کی تھی کہ ہمارے نبی کون تھے اور وہ ہمارے لئے کیا لائے ہیں۔ اس طرح سیرت کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یہی دو سوالات سعید حوی نے بھی اٹھائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کون تھے؟ یہ پہلا سوال ہے اور وہ کیا تعلیم لے کر آئے تھے؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ان دونوں سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ پہلی دو جلدیں خالص واقعات سیرت پر ہیں۔ ہر واقعہ کو بیان کرتے وقت اس سے نکلنے والے احکام اور فوائد بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً غزوہ بدر کو کتب حدیث کے نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اس واقعہ سے یہ سبق نکلتے ہیں۔ یہ عبرتیں پنہاں ہیں۔ یہ احکام نکلتے ہیں۔ ان کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ تمام بیانات کے مکمل حوالے دیئے ہیں جو سب کے سب کتب حدیث کے ہیں۔

تیسری جلد حضور کے شمائل، خصائل، اہل بیت اور حضور کے اقارب اور اصحاب پر ہے۔ نمایاں ترین اصحاب رسول کون تھے۔ انسان اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی شان کا اندازہ کرنے کے لئے صحابہ کی شان دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جس کے ساتھی اس شان کے ہوں تو اس کی اپنی شان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر حضور کے اہل خاندان اور قریبی رشتہ دار اور اقارب کون لوگ ہیں۔ حضور کے اپنے شمائل اور خصائل کیا ہیں۔ چوتھی جلد پھر بقیہ نمایاں صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہے جس میں انہوں نے تقریباً 95 یا 100 کے قریب نامور ترین صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان آخری دونوں جلدوں میں خلفائے راشدین کا بھی بھرپور تذکرہ آ گیا ہے۔ یوں یہ کتاب خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور کو بھی محیط ہے۔

یہ تو وہ کتابیں تھیں جو محدثانہ اسلوب کے مطابق لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم اور مفید کتاب ڈاکٹر محمد محمد ابوشہبہ کی کتاب السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ ہے، جو دو ضخیم

جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دور جدید کی ہے جس کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

مورخانہ اسلوب کا آغاز بھی پہلی صدی ہجری ہی میں ہوگیا تھا۔ عروہ بن زبیر کا تذکرہ تفصیل سے آچکا ہے۔ یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جب ہم مورخانہ اسلوب کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد وہ مورخین نہیں ہیں جو آج مغربی زبانوں میں تاریخ نویسی کررہے ہیں اور مورخین سمجھے جاتے ہیں یا جدید دور کی اصطلاح میں مورخ کا جو مطلب ہے۔ ہماری مراد وہ مورخ نہیں۔ آج کے مورخ کے بارے میں سیرت النبی کے مقدمہ میں علامہ شبلی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایک تصویر رکھتا ہے جس کو اپنے قارئین کے ذہنوں تک منتقل کرنا ہی اس کا اصل ہدف ہوتا ہے۔ مثلاً جب مغربی مورخین یونان کی تاریخ لکھتے ہیں تو یونان کی عظمت پہلے سے ان کے ذہنوں میں بیٹھی ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں پہلے سے ایک مفروضہ بیٹھا ہوتا ہے کہ علم وحکمت کا ہر موتی یونان کے صدف کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا ہر اچھا کام یونان میں ہوا ہے۔ جو اچھا کام یونان سے رہ گیا ہے وہ روما میں ہوا ہے۔ ہر بڑا کام، ہر ادارہ، ہر تنظیم، ہر چیز روما میں ہوئی ہے۔ جو چیز اس مفروضہ کے مطابق ہے وہ قابل قبول اور جو اس کے مطابق نہیں ہے وہ ناقابل قبول ہے۔ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک civilized یعنی مہذب دنیا ہے اور دوسری uncivilized یعنی غیر مہذب دنیا ہے۔ وہ خود مہذب ہیں اور ان کے علاوہ باقی سب لوگ غیر مہذب ہیں۔ مہذب لوگوں کو ساری اچھائیاں اور خوبیاں حاصل ہیں اور غیر مہذب لوگوں کو کوئی اچھائی یا خوبی حاصل نہیں ہے۔ یہ ان کا ایک انداز فکر ہے جس کے تحت وہ تاریخ لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے قدیم سیرت نگاروں کا یہ انداز فکر نہیں تھا۔

اسلوب مورخین سے مراد صرف یہ ہے کہ جن حضرات نے شروع میں سیرت نگاری کا کام کیا انہوں نے سیرت کے واقعات کے تسلسل اور تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ مختلف مآخذ سے معلومات جمع کرکے سیرت اور سیرت کے واقعات کی ایک مکمل اور متکامل تصویر بیان کردیں۔ یہ تو قدیم مورخین کا اسلوب تھا، جن میں سے بعض کے نمونے ہم نے دیکھ لئے۔ ایک جدید اسلوب پچھلے سوڈیڑھ سو سالوں سے مسلمانوں میں رائج ہوا ہے جو مغربی مورخین کے اسلوب سے متاثر ہے۔ آج کل اس اسلوب کے مطابق بھی کتابیں لکھی

جا رہی ہیں۔ اس اسلوب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ جو شواہد اور دلائل مغربی معیارات کے مطابق قابل قبول ہوں ان سے کام لیا جائے اور سیرت کے وہ پہلو سامنے لائے جائیں جن کو مغربی دانشور یا مغربی قاری ناقابل قبول قرار نہ دیں۔ وہ پہلو جن کا تعلق خالصتاً مسلمانوں کے ایمان اور عقیدہ سے ہے ان کو زیادہ نمایاں نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ اسلوب مستشرقین کے اثر سے آیا ہے، اس لئے اس پر ہم دور جدید کے موضوع کے تحت بات کریں گے۔

جب اسلوب مورخین بہت نمایاں ہوگیا اور اس کو پختگی کی ایک سطح حاصل ہوگئی تو سیرت نگاروں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی اس میدان میں آئے۔ انہوں نے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے کیا تھا، پہلے سیرت لکھی پھر سیرت کے مضامین کو پھیلا کر پوری تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام کچھ اور حضرات نے بھی کیا۔ یہ سب حضرات جو مورخین تھے، اسلوب مورخین کے مطابق کام کرنا چاہتے تھے، انہوں نے سیرت کو تاریخ کے عمومی مضمون کا ایک حصہ قرار دیا اور تاریخ کے حصہ کے طور پر سیرت کے مضامین سے بھی بحث کی۔ ان میں قدیم ترین نام تو علامہ ابن جریر طبری کا ہے جو محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، مفسر بھی ہیں اور مورخ بھی ہیں۔ ان کی تفسیر قرآن بھی مشہور ہے اور سیرت پر بھی ان کا کام ہے۔ مغازی پر قدیم ماخذ ومصادر کا بڑا حصہ انہوں نے اپنی تاریخ میں سمو کر محفوظ کرلیا ہے۔ چنانچہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ کے مغازی اکثر وبیشتر انہی کی کتاب سے نکالے گئے۔ ابن جریر طبری بنیادی طور پر مورخ، فقیہ اور مفسر قرآن تھے لیکن ان کی کتاب کا خاصا بڑا حصہ سیرت کے مواد پر مشتمل ہے۔ اگرچہ تاریخ کا آغاز انہوں نے بہت پہلے سے یعنی ولادت آدم سے کیا ہے۔ اسلام سے پہلے اقوام کی تاریخ سے متعلق واقعات بھی بیان کئے ہیں۔ یہ بات کہ انہوں نے بھی اسرائیلیات کا مواد اپنی کتاب میں شامل کیا، ان کی کتاب کی تاریخی حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جو حضرات اسرائیلیات پر مبنی مواد سے اتفاق نہیں کرتے وہ ابن جریر طبری کے ان بیانات کو مستند نہیں سمجھتے۔ جو حضرات اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے وہ ان کے بیانات کو مستند سمجھتے ہیں۔ یہ محض تحقیق کا ایک مسئلہ ہے اور ہر محقق اپنی الگ رائے قائم کرسکتا ہے۔

ابن جریر نے مورخین اور محدثین دونوں کے اسلوب کو جمع کیا۔ وہ ہر روایت سند کے ساتھ الگ الگ بیان کرتے ہیں، لیکن اس سند کے بیان سے پہلے وہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا ہے۔ اختصار کے ساتھ اس کے پیش آنے کا ذکر کرتے ہیں، پھر بتاتے ہیں کہ اس کے شواہد میں یہ یہ بیانات اور روایات میرے سامنے آئی ہیں اور پھر ان روایات کو سند کے ساتھ الگ الگ بیان کر دیتے ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ وہ روایات ہیں جو مجھ کو مختلف ذرائع سے ملی ہیں۔ میں نے پوری سند کے ساتھ ان کو بیان کر دیا ہے۔ اب یہ ہر قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان روایات کا خود جائزہ لے کر طے کرے کہ کون سی روایت اس کے لئے قابل قبول ہے اور کون سی ناقابل قبول ہے۔

اب گزشتہ چند عشروں سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ ابن جریر کا ذخیرہ سارے کا سارا غیر مستند ہے۔ حالانکہ ابن جریر کا یہ قیمتی ذخیرہ سارے کا سارا غیر مستند نہیں ہے۔ نہ بیک قلم اس سارے سرمایہ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ محققین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ابن جریر کے ہر بیان کا الگ الگ جائزہ لیں، اس کو روایت اور درایت کے اولوں پر پرکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ ان کا کون سا بیان قابل اعتماد ہے اور کون سا محل نظر ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ یہ سارا مواد جو مجھے ملا ہے یہ مجھے فلاں فلاں ذرائع سے ملا ہے اور ہر بیان کے ساتھ اس کے حوالے ہیں۔ اب آپ کا کام ہے کہ جا کر ان حوالوں کو دیکھیں اور جائزہ لے کر آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا چیز صحیح ہے اور کیا نہیں۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک کتب خانہ میں کتابیں رکھی ہیں۔ مثلاً یہ لائبریری جو پاکستان کی بہترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اگر اس میں چند کتابیں غیر معیاری اور کمزور ہوں، تو کیا آپ یہ کہہ دیں گے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے کتب خانہ کی ساری کتابیں ناقابل اعتبار ہیں ان کو دریا برد کر دیا جائے۔ یہ درست نہیں ہوگا۔ آپ خود جائیں، جائزہ لیں۔ جو کتاب آپ کو مستند لگے وہ دیکھیں اور جو غیر مستند لگے وہ نہ دیکھیں۔ کتب خانہ میں تو غیر مسلموں کی کتابیں بھی ہیں، موافقین کی بھی ہیں اور مخالفین کی کتابیں بھی ہیں۔ یہی معاملہ ابن جریر کی تاریخ کا ہے جس میں ہر طرح کا مواد ہے۔ بعض لوگوں نے اپنے ذوق سے، بعض نے جان بوجھ کر اور بعض نے ناواقفیت کی وجہ سے ابن جریر کی کتابوں کی مدد سے ایسے ایسے نقشے بنائے ہیں جو حقیقت سے بہت بعید ہیں، لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اسلامی تاریخ ہے جو محض جنگ وجدل اور کشت وخون سے عبارت ہے۔ حالانکہ اس میں کشت وخون کے واقعات بھی ہیں، تعمیر کے واقعات بھی ہیں، تخریب کے

واقعات بھی ہیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ بیان کیا ہے جو ان کو ملا۔ پھر اس میں بعض مسلکی عصبیات بھی آ گئی ہیں۔ جس زمانے میں جو ناگفتہ بہ اور ناخوشگوار واقعات ہوئے ہیں، ان ناخوشگوار واقعات میں بعض انتہائی محترم شخصیات کے نام بھی آتے ہیں۔ وہ شخصیات ایسی محترم ہیں کہ جن کے نام پر ہر مسلمان کا سر جھک جاتا ہے۔ اس ضمن میں مختلف انداز کے واقعات اور حکایات بیان ہوئی ہیں۔ اب یہ بات قرین انصاف نہیں ہوگی کہ ایک شخص اپنے نقطہ نظر سے کسی ایک شخصیت کی تائید یا حمایت کے واقعات کو تو چن چن کر جمع کر دے اور دوسرے طرف کے واقعات کو نظر انداز کر کے کہے کہ اسلامی تاریخ یہ تھی۔ اس کے مقابلے کچھ دوسرے لوگوں نے یہ کیا کہ انہوں نے ایک دوسرے نقطہ نظر کے واقعات تاریخی روایات کے اس انبار سے نکال کر جمع کر دیئے اور دعویٰ کیا کہ اسلامی تاریخ یہ تھی۔ حالانکہ اسلامی تاریخ نہ سو فیصد یہ تھی نہ سو فیصد وہ تھی۔ اسلامی تاریخ وہ تھی جو مستند مآخذ سے آئی ہے۔

یہ باتیں میں نے اس لئے عرض کی ہیں کہ ابن جریر کی تاریخ میں جو حصہ سیرت سے متعلق ہے اس میں خاصی روایات اسرائیلیات پر مبنی اور کمزور ہیں۔ خاصی روایات مختلف لوگوں نے نادانی یا کسی کمزوری سے ایسی بھی بیان کی ہیں جو درست نہیں۔ خود مورخین میں بہت سے حضرات نے ابن جریر طبری کے بہت سے بیانات کو تحقیق کی میزان میں ہلکا قرار دے کر ناقابل قبول قرار دیا۔ جن میں ابن کثیر کی میں نے مثال دی، ابن کثیر ہی کے ایک ہم سبق علامہ ذہبی نے بھی تاریخ اسلام پر ایک کتاب لکھی جو مشہور ہے۔ اس کی ایک پوری جلد جو ابن کثیر کے کام کا ایک چوتھائی کے برابر ہوگا، سیرت کے واقعات سے متعلق ہے۔ امام ذہبی بھی محدث تھے۔ فن رجال کے ماہر تھے۔ فن رجال پر جو چند بہترین کتابیں ہیں ان میں علامہ ذہبی کی کتاب بھی ہے۔ اس لئے اسلوب مورخین کے لحاظ سے مستند ترین کام ان دو حضرات کا ہے۔ علامہ ابن کثیر اور امام ذہبی۔ ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں ہیں ان میں مسعودی کی 'مروج الذهب' بھی ہے اور یعقوبی کی بھی کتاب ہے اور دیگر کتابیں بھی ہیں جن کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان میں صحیح مواد بھی ہے اور غلط بھی ہے۔ رطب و یابس دونوں قسم کا ہے۔ کمزور مواد سب سے زیادہ یعقوبی کے ہاں ہے، پھر مسعودی کے ہاں ہے۔ ابن جریر کے ہاں بھی غیر مستند مواد پایا جاتا ہے لیکن یعقوبی اور مسعودی کے مقابلہ میں تھوڑا ہے۔

جب تاریخ کے طلبہ نے اسلوب مورخین کو آگے بڑھایا تو تاریخ نویسی کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ اس کو طبقات نویسی کہتے ہیں۔ طبقات نویسی سے مراد تاریخ اور تذکرہ، رجال اور سوانح ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام تھا۔ طبقہ کے لفظی معنی تو، جیسا کہ میں نے کہا تھا، پیڑھی کے آتے ہیں۔ آج کل شاید بعض لوگ اردو زبان کے اس لفظ کو نہیں سمجھتے۔ اس سے مراد ہے ایک خاص زمانے کے انسانوں کی ایک نسل۔ مثلاً آپ کہیں کہ پاکستان بنانے والوں کی پہلی پیڑھی وہ تھی جو قائداعظم کے ساتھیوں پر مشتمل تھی۔ دوسری پیڑھی وہ تھی جنہوں نے مثال کے طور پر خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بعد میں مسلم لیگ میں کام کیا۔ ایک خاص نسل یا طبقہ کے لوگ جو ایک زمانے میں ہوں وہ طبقہ یا پیڑھی کہلاتے ہیں۔

طبقات کے نام سے پہلی کتاب تو ابن سعد نے لکھی تھی۔ اس کے بعد طبقات پر اور لوگوں نے بھی کام کیا۔ طبقات نویسی کے فن نے جب ترقی کی تو اس میں طبقات صحابہ کو ایک خاص شعبہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ محدثین نے صحابہ کرام کے کوئی گیارہ طبقات قرار دیئے ہیں۔ یہ طبقات صحابہ کرام کی خدمات اور سبقت اسلام کے اعتبار سے قرار دیئے گئے۔ پھر ان طبقات کو اسی طرح بیان کیا گیا۔ ہر صحابی کی سوانح عمری اور تذکرہ میں سیرت کا کوئی نہ کوئی واقعہ مذکور ہے۔ صحابہ کرام کی ساری عظمت یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھی ہیں۔ اور اس حیثیت سے انہوں نے جو بھی کارنامے کئے وہ سیرت ہی کا حصہ ہیں۔ اگر یہ کارنامے حضور کے زمانے میں ہوئے ہیں تو براہ راست سیرت کا حصہ ہیں۔ حضور کے بعد ہوئے ان کو بالواسطہ سیرت کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے صحابہ کرام کے تذکرہ اور سوانح کو سیرت کا تتمہ او تکملہ سمجھا جانا چاہئے۔

طبقات ابن سعد جو اس مضمون کی پہلی کتاب ہے۔ یہ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے بارے میں معلومات کا ایک بڑی حد تک مستند اور غیر معمولی، قیمتی اور دلچسپ خزانہ ہے۔ میں نے بڑی حد تک مستند اس لئے کہا کہ ابن سعد دراصل مورخین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شمار محدثین میں نہیں ہے۔ جو احتیاط اور معیار محدثین کے ہاں ہے وہ ابن سعد کے ہاں نہیں ہے۔ یہ بات ہم سب کے ذہن میں ہونی چاہئے۔ لیکن معلومات کی جو کثرت اور تنوع ہے، وہ بے مثال ہے۔ جس آدمی نے بارہ جلدوں میں کتاب لکھی ہو، اس کے ہاں معلومات کتنی کثرت

سے ہوں گی، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ ابن سعد نے صحابہ کرام میں سے سینکڑوں کا تذکرہ جمع کیا اور ایک ایک فرد کے حالات کے بارہ میں ان کے پس ماندگان اور ساتھیوں سے جا کر تحقیق کی اور جو چیز جمع کی اس میں وقیع معلومات تو بہت ہیں لیکن بعض کمزور چیزیں بھی آ گئی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ طبقات ابن سعد میں اسلامی معاشرہ کی ایک وقیع تصویر سامنے آ جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرام کا معاشرہ اور رہن سہن کیا تھا اور کیسا تھا۔ صحابہ کرام کی زندگی کی ایسی نقشہ کشی ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی صرف طبقات ابن سعد کی مدد سے صحابہ کے معاشرہ کی تفصیل بیان کرنا چاہے تو بہت آسانی سے بیان کر سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو اتنا بڑا کام کرے گا اس سے کچھ نہ کچھ غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ ابن سعد سے بھی غلطیاں ہوئیں۔ بعض ایسی روایات آ گئیں جن کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ یہ درست نہیں ہیں۔ یہ کام اب محققین کا ہے کہ وہ ایک ایک روایت کی تحقیق کریں اور ثابت کریں کہ کس روایت کا کیا درجہ ہے۔ یہ کام بہت مشکل نہیں کیونکہ حدیث کے سارے ذخائر موجود ہیں۔ ان ذخائر کی بنیاد پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ اگر حافظ ابن کثیر، ذہبی، ابن سید الناس اور ابن عبد البر کی چاروں کتابیں سامنے رکھیں تو یہ کام بہت سہولت سے ہو سکتا ہے۔ جو بیانات ان کتابوں کے مطابق ہیں وہ بادی النظر میں قابل قبول ہیں۔ جو ان سے یا قرآن پاک سے متعارض ہیں ان کے بارے میں تامل کرنا چاہئے۔

طبقات ابن سعد کے بعد طبقات کا دوسرا میدان خاص طبقات صحابہ کا تھا۔ صحابہ کرام کے طبقات پر تین کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک تو انہی ابن عبدالبر کی ہے جو اعلم اہل المغرب کہلاتے ہیں۔ **الاستیعاب فی معرفة الاصحاب**۔ دوسری کتاب ہے **الاصابہ فی تمییز الصحابہ**، یہ محدث کبیر حافظ ابن حجر کی ہے۔ تیسری کتاب '**اسد الغابہ**' علامہ ابن اثیر کی ہے۔ ابن اثیر بھی بہت بڑے مورخ اور طبقات نویس تھے۔ صحابہ کرام کے بارے میں یہ تین کتابیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ شاید ہی کوئی مشہور اور قابل ذکر صحابی ہو جن کا تذکرہ ان تینوں کتابوں میں سے کسی ایک نہ ایک کتاب میں موجود نہ ہو۔

طبقات پر کتابیں لکھنے والوں نے طبقات مکانی کے حساب سے بھی کتابیں لکھیں اور

طبقات زمانی کے حساب سے بھی کتابیں لکھیں۔ طبقات مکانی کے حساب سے جن لوگوں نے کتابیں لکھیں وہ انہوں نے مختلف شہروں کے حالات پر لکھیں۔ مثال کے طور پر خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد۔ یہ بغداد کی ایسی تاریخ نہیں جس میں صرف یہ لکھا ہو کہ یہ شہر کب بنا اور اس کی تاریخ کیا ہے۔ بلکہ تاریخ بغداد ایک بہت وسیع مضمون کو بیان کرتی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے والے اصلاً محدث ہیں اور علم حدیث پر ان کی مستند ترین کتابیں ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے لکھا ہے کہ بغداد میں کون سے تابعین آئے۔ کون کون سے تبع تابعین آئے۔ علم حدیث اور تفسیر پر جو کام بغداد میں ہوا وہ کیا تھا۔ کس مفسر نے بغداد میں بیٹھ کر تفسیر بیان کی۔ کس محدث نے حدیث بیان کی۔ کس سیرت نگار نے سیرت بیان کی۔ بغداد میں علوم اسلامی کے بارے میں جو کچھ سرگرمیاں ہوئیں وہ سب اس میں لکھی ہوئی ہیں۔ بغداد اور اسلام، ان دونوں کے حوالے سے جو کچھ ذخیرہ معلومات خطیب بغدادی کو میسر ہوسکا ہے وہ سب تاریخ بغداد میں موجود ہے۔ یہ کتاب کوئی بارہ یا تیرہ جلدوں میں ہے اور پوری انسائکلو پیڈیا ہے۔ امام ابوحنیفہ بغداد میں رہتے تھے، اس لئے ان کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہ کے بارے میں معلومات خطیب بغدادی کو دستیاب ہوئیں (موافق اور مخالف دونوں) وہ اس میں موجود ہیں۔ امام شافعی ایک مرتبہ بغداد گئے تھے۔ تو ان کے سفر بغداد کی پوری تفصیل موجود ہے کہ وہ کب آئے، کیوں آئے، کس سے ملے، کس کے ہاں ٹھہرے۔ تابعین میں سے جو لوگ بالخصوص جو اہل علم، جو محدثین، جو مفسرین وغیرہ بغداد آئے وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔

اسی طرح ایک کتاب علامہ ابن عساکر کی 'تاریخ دمشق' ہے۔ ابن عساکر دمشق میں رہتے تھے۔ انہوں نے جو کتاب لکھی وہ واقعی ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ایک صاحب علم خاتون اس کو ایڈیٹ کر رہی ہیں۔ کچھ حصے چھپ چکے ہیں۔ دمشق کی ایک اکیڈمی 'مجمع اللغة العربیه' اس کو شائع کروا رہی ہے۔ شروع میں انہوں نے اس کتاب کے مختلف حصے مختلف اہل علم کو مرتب کرنے کے لئے دیئے۔ پھر ایک معمر خاتون نے اس کو ایڈیٹ کرنا شروع کیا۔ ان سے میری ملاقات 2001 کے اپریل میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک کتاب کی 80 جلدیں ایڈٹ ہوچکی تھیں۔ ان کا بیان یہ تھا کہ 120 جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہوگی۔ یہ طبقات مکانی کی ایک عجیب مثال ہے۔ اس کتاب میں دمشق کے بارے میں ہر چیز موجود ہے۔ بہت سے

صحابہ کرام دمشق تشریف لے گئے تھے۔کون سے صحابہ کرام وہاں آئے۔دمشق کب فتح ہوا۔ کیسے فتح ہوا۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دمشق کے بارہ میں کوئی ارشادات فرمائے تو وہ کیا تھے۔صحابہ کرام جنہوں نے فتح دمشق میں حصہ لیا ان کی پوری تفصیل ہے۔گویا سیرت،صحابہ، سیرت تابعین،تفسیر،حدیث،ادب،تاریخ غرض کوئی چیز ایسی نہیں جو دمشق کے بارے میں ہو اوراس کتاب میں موجود نہ ہو۔

مؤرخانہ اسلوب کے بعد میں نے مولفانہ اسلوب کا تذکرہ کیا تھا۔اس سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے سارے ماخذ سے کام لے کر سیرت کے دستیاب مواد کو یکجا کر دیا جائے اور ایک جامع اور مرتب انداز میں سیرت کا نقشہ پیش کر دیا جائے۔اس کی ایک مثال تو ہم عرض کر چکے کہ علامہ ابن کثیر دمشقی کی کتاب ہے جو چار جلدوں میں ہے۔یہ اسلوب تقریباً چوتھی پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔چھٹی صدی ہجری تک تمام روایات سیرت مدوّن و مرتب ہو چکی تھیں۔مغازی کی تمام تفصیلات آ چکی تھیں اور یہ اسباب فراہم ہو گئے تھے کہ اب ان تمام معلومات کو یکجا کیا جائے۔

اس رجحان کے مثبت اثرات بھی ہوئے۔جس مولف یا سیرت نگار نے سابقہ مواد کو جمع کیا اس نے از سر نو تحقیق کی اور بار بار مواد کی تحقیق در تحقیق کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا۔جس نے مواد کو جانچنے اور پرکھنے کا کام کیا اور پرکھا اس نے کوئی نئی بات دریافت کی۔کسی سابقہ روایت کا کوئی نیا پہلو تلاش کیا۔اس بار بار کی تنقید اور تنقیح سے گزرنے کے نتیجے میں جو مواد مرتب ہوا وہ بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا اور زیادہ سے زیادہ نکھرتا چلا گیا۔دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مآخذ اور مصادر سے آنے والے مواد کا باہم تقابلی مطالعہ بھی ہوتا رہا۔ایک مواد کا دوسرے مواد سے موازنہ ہوتا گیا اور تائید ہوتی گئی کہ جو سند اس روایت سے آئی ہے اور جو اُس روایت سے آئی ہے دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔اس سے مزید تحقیق کرنے میں مدد ملی۔ جہاں جہاں خلا تھا اس خلا کی تکمیل بہتر انداز میں ہوئی اور زیادہ مفصل تصویر سامنے آئی۔یہ تو اس اسلوب تالیف کے فوائد ہوئے۔

اس اسلوب کے کچھ منفی پہلو بھی سامنے آئے۔جب یہ رجحان پیدا ہوا کہ جامع کتابیں لکھنی ہیں تو اہل علم میں مسابقت کی کیفیت بھی پیدا ہوئی،جو فی نفسہٖ تو اچھی چیز ہے۔

لیکن انسان کا مزاج یہ ہے کہ وہ مسابقت کی فضا میں معیار کا بعض اوقات زیادہ خیال نہیں رکھ پاتا۔ میں کسی کی نیت پر شک نہیں کر رہا، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کے دل میں یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ ابن کثیر نے چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے تو میں چھ جلدوں میں لکھ دیتا ہوں۔ کسی اور نے چھ جلدوں میں لکھی ہے تو میں بارہ جلدوں میں لکھوں۔ چنانچہ اس سے غیر ضروری پھیلاؤ اور توسیع کا رجحان پیدا ہوگیا۔ یہ رجحان جب پیدا ہوا تو اس میں یہ امتیاز پیدا کرنا بڑا دشوار ہوگیا کہ رطب و یابس میں فرق کیسے کیا جائے۔ کمزور روایات بہت کثرت سے آنی شروع ہوگئیں۔ آج اگر بعض لوگ سیرت کے بارے میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس میں کمزور مواد شامل ہے تو وہ اکثر و بیشتر اسی دور کی کتابوں میں شامل ہے۔ زیادہ تر کمزور مواد اسی دور کی کتابوں میں آیا ہے۔ پھر ایک اور وجہ یہ بھی ہوئی کہ یہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو دنیا بھر میں تہذیب کا اعلیٰ ترین معیار مانا جاتا تھا۔ کوئی تنقید کرنے والا نہیں تھا۔ کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام کے حوالہ سے کوئی بات ہو تو اس پر کوئی نقد یا تنقید کی جرات کرے۔ اس لئے بہت سی ایسی چیزیں جو عقیدت مندی کی بنیاد پر عامۃ الناس کے ایک طبقہ میں مشہور تھیں۔ خاص طور پر معجزات کے بیان میں اور مختلف خصائص کے میدان میں، وہ ایک ایک کر کے سیرت کی بڑی بڑی کتابوں میں شامل ہوتی گئیں۔ لوگوں نے لمبی لمبی کتابیں تو لکھ دیں۔ بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ جلدوں میں، مثلاً المواہب اللدنیہ اور شرح المواہب اللدنیہ، لیکن اتنی ضخیم کتابوں میں کمزور روایتوں کا آجانا بعید از امکان نہیں تھا۔

المواہب اللدنیہ پندرہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کا سیٹ رکھ دیں تو یہاں سے وہاں تک ضخیم جلدوں کی پوری قطار بن جاتی ہے، لیکن اس میں کمزور بیانات بہت ہیں۔ یہ سب اس لئے کہ ایک رجحان تھا کہ بڑی کتاب لکھی جائے اور زیادہ سے زیادہ مواد جمع کر دیا جائے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ غیر ضروری توسیع پر زیادہ زور دیا گیا۔ غیر ضروری مواد کو بیان کرنے کا موقع ملا اور وہ سیرت کے لٹریچر میں شامل ہوگیا۔ استناد اور کوالٹی سے توجہ ہٹ گئی۔ جہاں توجہ توسیع پر ہو وہاں کوالٹی کم ہو جاتی ہے۔ انسان کا مزاج ہے کہ اس کی توجہ یا معیار پر ہوگی یا مقدار پر ہوگی۔ معیار پر توجہ دیں تو توسیع نہیں ہوتی۔ توسیع کی کوشش کریں تو معیار متاثر ہو جاتا ہے۔ شروع

میں توجہ معیار پر تھی مقدار پر نہیں تھی۔ یہ دور مقدار پر توجہ کا دور تھا معیار پر توجہ کا دور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں میں موضوعات اور اسرائیلیات بڑی تعداد میں آ گئیں۔

اس دور کی دو کتابیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک سیرت شامیہ کہلاتی ہے اور دوسری سیرت حلبیہ کہلاتی ہے۔ دونوں بڑی ضخیم کتابیں ہیں اور دونوں کا اردو ترجمہ موجود ہے۔ یہ دونوں بڑی مفصل کتابیں ہیں۔ وہی ملاحظات ان کے بارے میں بھی کہے جا سکتے ہیں جو بقیہ کتابوں کے بارے میں ہے کہ ان میں رطب و یابس خاصا پایا جاتا ہے اور ان سے استفادہ میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

تدوین و تالیف کے اس زمانے میں ایک بہت غیر معمولی کام بھی ہوا۔ جمع معلومات کے ساتھ ساتھ، استناد اور جدت بھی، اور ایک اچھوتا پن بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ اسپین سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ شیخ علی بن محمد الخزاعی تھے جو اندلس میں برپا افراتفری کی وجہ سے اپنا ملک چھوڑ کر مراکش کے شہر فاس آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب مرتب کی جو ساری کی ساری کتب حدیث سے ماخوذ ہے۔ اس اعتبار سے ان کے دور کی منفرد کتابوں میں سے ہے۔ اس کتاب کے استناد اور معیار کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کا سارا مواد کتب حدیث اور مستند کتب سیرت سے ماخوذ ہے۔ اس کا نام 'تخریج **الدلالات السمعية على ما كان في عهد رسول الله ﷺ من الحرف والصنائع والعمالات الشرعية**' تھا۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو مختلف انتظامی تدابیر اختیار کی گئیں، خاص طور پر مدینہ منورہ میں، جو ذمہ داریاں مختلف لوگوں کو سونپی گئیں یا انتظامی طور پر جو مختلف کام کئے گئے وہ کیا تھے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ اس کے مصنف بہت پختہ علم والے تھے۔ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ پوری کتب حدیث اور علم سیرت کی بنیادی کتابیں ان کے سامنے تھیں۔ اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو غیر مستند ہو۔

یہ کتاب دس حصوں اور 78 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں 156 موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے ایک حصہ مذہبی امور کے عنوان سے مرتب کیا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مسجد کا انتظام کیسے ہوتا تھا۔ مسجد نبوی کا انتظام کون کرتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اور کون

کون سی مساجد تھیں۔ ان میں موذن کا تقرر کون کرتا تھا۔ امامت کون کرتا تھا۔ کیا اماموں کو رسول اللہ ﷺ کوئی تربیت دیا کرتے تھے کہ نہیں دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس میں ایک شعبہ دستاویزات کا ہے کہ دستاویزات نویس کون تھے۔ دستاویزات کو محفوظ کیسے رکھا جاتا تھا۔ عدالتی امور کیسے انجام پاتے تھے۔ عسکری امور کیسے انجام پاتے تھے۔ جبایات یعنی صدقات، عشور اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام کیا تھا۔ بیت المال کیسے کام کرتا تھا۔ اس طرح کے اہم اور دلچسپ موضوعات پر یہ ایک بہت عمدہ کتاب ہے جو مدینہ منورہ کے معاشرہ، مدنی ریاست اور معیشت کی بہت اچھی تصویر بیان کرتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سو فیصد محدثانہ اسلوب سے کام لیا ہے۔ کتب حدیث سے مواد لیا ہے۔ مورخانہ اسلوب کو بھی نبھایا ہے کہ سارا مواد یکجا کر کے اس کو پھر دلائل اور سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مواد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ احادیث کی تخریج بھی کرتے ہیں کہ کون سی حدیث کس کتاب میں ہے۔ اس کا مکمل حوالہ دیا ہے۔ کسی حدیث میں کوئی مشکل لفظ آیا ہے اس کی تشریح کی ہے۔ ان سے جو مسائل نکلتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ یوں یہ بیک وقت تاریخ، حدیث، سیرت اور حتیٰ کہ سیاسیات اور فقہ سمیت بہت سی موضوعات پر ایک مفید کتاب ہے۔

علامہ خزاعی کی یہ کتاب خاصے عرصہ تک اہل علم میں مقبول رہی اور لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے۔ اس کتاب کے لکھے جانے کے کئی سو سال بعد ایک اور صاحب علم بزرگ علامہ شیخ عبدالحئی کتانی نے جن کا تعلق انہی جعفر کتانی کے خاندان سے تھا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ 1250ھ کے لگ بھگ ان کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خزاعی کی اس کتاب کو سامنے رکھ کر اس میں کچھ اضافے کئے۔ اتنے اضافے کئے کہ اس کا سائز تقریباً دگنا ہو گیا اور انہوں نے اس کو مزید مکمل بنا دیا۔ اس کتاب کا نام ہے 'التراتیب الاداریہ فی نظام الحکومۃ النبویہ'، حکومت نبوی کے نظام کی ادارتی تفصیلات۔ یعنی institutional details of the government of the Prophet۔ اس میں انہوں نے وہ سارے دس کے دس موضوعات برقرار رکھے جو علامہ خزاعی کی اصل کتاب میں بیان ہوئے تھے۔ ان پر مزید اضافہ بھی کیا کیونکہ اس وقت تک مزید معلومات سامنے آ گئی تھیں۔ جو کتابیں کسی علاقے میں مروج تھیں اور دوسرے علاقے میں دستیاب نہیں

تھیں وہ علامہ عبدالحیٔ کتانی کو دستیاب ہوگئی تھیں۔ یہ لمبے لمبے سفر کرتے تھے۔ کئی بار حج کا سفر کیا۔ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ علامہ کتانی ایک جہاں گرد شخصیت تھے۔ یہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے مراکش میں بیٹھ کر ہمارے ہاں کے اہل علم پر کتاب لکھی۔ وہ برصغیر کے مصنفین یعنی لاہور، ملتان اور ہمارے دوسرے علاقوں کے مصنفین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کو اتنی واقفیت ہمارے علاقے سے بھی تھی۔ شاید اسی لئے ان کی کتاب زیادہ جامع اور مکمل ہے۔ اس میں خزاعی کی کتاب کا سارا مواد بھی ہے اور علامہ کتانی کا اپنا اضافہ بھی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے معاونین اور مشیر کون کون تھے۔ 'وزارت' کی ذمہ داری پر کون سے صحابہ کرام فائز تھے۔ پھر ایک بڑی اہم چیز جو علامہ کتانی نے اضافہ کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تحریر اور نوشت وخواند کا نظام کیا تھا۔ اس سے حضور کے زمانے کے نظام تعلیم پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ پھر عسکری انتظامات اور حربیات کی تفصیلات پر بھی بہت وقیع مواد فراہم کیا ہے۔

یہ سارا مواد جو علامہ عبدالحیٔ کتانی نے لیا ہے انتہائی مفید اور وقیع ہے۔ یہ کتاب اس دور کے اُس اسلوب کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ بہت وسیع مآخذ کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے تمام دستیاب کتب حدیث، تمام شروح حدیث سے بھرپور استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں، تاریخ کی تمام کتابیں، حتیٰ کہ برصغیر کے علمائے کرام کی کتابیں اور تصنیفات بھی ان کے سامنے تھیں۔ میں نے ایک گفتگو میں شیخ ابوجعفر سندھی کا ذکر کیا تھا جو ٹھٹھہ کے ایک بزرگ تھے، ان کی کتابیں بھی علامہ کتانی کو دستیاب تھیں۔ نواب صدیق حسن خان جو بھوپال کے نواب تھے، ان کی کتاب بھی اُن کو دستیاب تھی۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی جو فرنگی محل کے مشہور علماء میں سے تھے ان کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ایک بزرگ مولانا محمد عبداللہ پنجابی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ یہ ہمارے لاہور کے رہنے والے ایک بزرگ تھے۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور محمد عبداللہ الفنجابی کے نام سے وہاں مشہور تھے۔ انہوں نے پ کو معرب کر کے ف کر دیا تھا۔ ان سے وہ مدینہ منورہ میں ملے اور ان کی کتابوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ بظاہر وہ برصغیر کی علمی روایت کی نقل کرنے والے پہلے مراکشی عالم ہیں۔ ان سے پہلے غالباً کسی مراکشی عالم نے برصغیر کے اہل علم کا اتنی واقفیت سے ذکر نہیں کیا ہوگا۔ حضرت مجدد

الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ اور تلامذہ میں شاہ ابوسعید مجددی ایک مشہور بزرگ تھے، محدث تھے اور مکہ مکرمہ میں جا کر آباد ہوئے، ان کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ کتاب مولفانہ اسلوب کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

میری خواہش تھی کہ متکلمانہ اسلوب کے بارے میں بھی ایک دو باتیں کروں۔ متکلمانہ اسلوب سے مراد سیرت کے وہ مباحث ہیں جن کا علم کلام سے بھی تعلق ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے سیرت کے موضوعات پر بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو علم کلام کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اب ان کا مختصر تذکرہ کلامیات سیرت کے عنوان کے تحت ہوگا۔

اس کے بعد سیرت نگاری کے ادبی اسلوب پر بات کرنے کا پروگرام تھا۔ سیرت پر ادبی انداز کی کتابیں عربی اور فارسی میں سب سے پہلے لکھی جانی شروع ہوئیں۔ نظم ونثر دونوں میں اہل علم وادب نے عقیدے کے پھول نچھاور کئے۔ لیکن چونکہ وقت بہت تنگ ہو گیا ہے اس لئے میرے خیال میں اس وقت ہمیں ختم کر دینا چاہئے۔ ان شاء اللہ اگلی گفتگوؤں میں اس پہلو کو مزید واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

-☆-

سوال وجواب

متکلمانہ اسلوب سے کیا مراد ہے؟ مزید یہ فرمایئے کہ شیخ محمد جعفر کتانی کی کتاب کا نام کیا ہے؟

متکلمانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ بنیادی مسائل جو اسلامی عقائد کی تائید سے متعلق ہیں، یا ان عقائد کی مخالفت، تردید یا تشکیک کے بارے میں دوسرے مذاہب کے لوگوں نے جو باتیں کی ہیں، عقلی دلائل سے ان کا جواب دیا جائے۔ متکلمانہ انداز میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں یا وہ انداز جس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کرنے والے شواہد اور روایات کو جمع کیا گیا۔ خاص طور پر معجزات کی بحث سامنے لائی گئی اور جو چیزیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص سے متعلق ہیں ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کیا جانے لگا۔ متکلمانہ اسلوب سے کتابیں لکھے جانے کا رجحان چوتھی پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اس کی ضرورت غالباً اس لئے پیش آئی کہ مسلم معاشرہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ نئی نئی اقوام اسلام میں داخل ہورہی تھیں اور مسلمانوں کا سابقہ بہت سی غیر مسلم اقوام سے پڑ رہا تھا جن میں یہودی، عیسائی، ایران کے آتش پرست، ہندوستان کے بت پرست اور افغانستان کے بدھ مت کے پیروکار بھی تھے۔ یہ سب لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے ہوں گے، طرح طرح کے اعتراضات اٹھاتے ہوں گے۔ مسلمان علماء سیرت اور قرآن پاک کے حوالہ سے ان کا جواب دیتے ہوں گے۔ ان مسائل کے پس منظر میں اور ایسے ماحول میں ضرورت پیش آئی ہوگی کہ سیرت کے اس مواد کو الگ سے بھی مرتب کیا جائے تاکہ زیادہ بہتر طریقہ سے متکلمانہ انداز میں ان مسائل کا جواب دیا جا سکے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کو متکلمانہ اسلوب کی کتابیں کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس سلسلۂ محاضرات میں ایک خاص موضوع کلامیات سیرت بھی

ہے۔اس لئے مزید تفصیل ان شاء اللہ کلامیات سیرت کے تحت گفتگو میں پیش کر دی جائے گی۔

شیخ جعفر الکتانی کی کتاب کا نام ہے'التراتیب الاداریہ فی نظام الحکومۃ النبویہ'۔اس کا اردو خلاصہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا مستند ہے،لیکن کراچی میں شائع ہوا ہے۔

☆

کیا شیخ علی بن محمد الخزاعی کی کتاب اردو میں موجود ہے؟

میری معلومات کی حد تک اس کا اردو ترجمہ موجود نہیں ہے۔ان کی کتاب کا نام ہے 'تخريج الدلالات السمعية'۔

جس کتاب کا آپ ذکر یں اور وہ اردو میں موجود ہو تو براہ کرم نام بتادیا کریں۔

میں بتاتا رہتا ہوں۔جن جن کا مجھے علم ہوتا ہے ان کا نام میں لیتا ہوں۔لیکن میری کمزوری اور مشکل یہ ہے کہ عربی کتابوں کے اکثر اردو تراجم کے بارے میں مجھے علم نہیں۔اس لئے کہ خود مجھے اردو ترجمہ دیکھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔عربی سے براہ راست استفادہ کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

ان معلومات کو مختصر صفحات میں کیسے بیان کیا جائے؟

یہ محاضرات ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ان شاء اللہ بعد میں ان کو کاغذ پر منتقل کیا جائے گا۔ پھر ابتدائی اور ضروری نظر ثانی کے بعد شائع ہوں گے اور آپ کی دسترس میں ہوں گے۔پھر آپ چاہیں تو اس کا خلاصہ کریں اور چاہیں تو پورا سامنے رکھیں۔

حافظ ابن القیم کی کتاب 'زاد المعاد' سیرت نگاری میں کس اسلوب کی نمائندہ ہے؟

حافظ ابن القیم کتاب 'زاد المعاد' سیرت نگاری میں فقہیانہ اسلوب کی نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔ کل ان شاء اللہ اس کا مختصر اور پھر فقہیات سیرت میں اس کا تفصیلی تذکرہ ہوگا۔ میں نے پہلے ہی عذر کر دیا تھا کہ بعض کتابوں کا تذکرہ بار بار آئے گا۔ اس لئے کہ کئی کتابیں اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ مختلف موضوعات کے تحت ان کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے زاد المعاد بھی ایک ہے۔

وضاحت فرمایئے کہ کیا علامہ ابن عبدالبر کو خلیفہ وقت عبدالرحمٰن الناصر نے بغاوت کے الزام میں پھانسی دے دی تھی۔

میری علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو بہت دکھ کی بات ہے۔ لیکن میں نے نہیں سنا۔

آپ نے مختلف اسالیب سیرت کا ذکر کیا لیکن متصوفانہ اسلوب کا ذکر نہیں کیا۔

متصوفانہ اسلوب کا ذکر تو میں پہلے ہی دن روحانیات سیرت کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ روحانیات سیرت علم سیرت کا ایک الگ موضوع تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی الگ اور مستقل بالذات کتاب اس نقطہ نظر سے لکھی جانے والی میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے میں نے آج کی گفتگو میں الگ سے اس اسلوب کا ذکر نہیں کیا۔ سیالکوٹ کے ایک بزرگ نے دو جلدوں میں ایک کتاب 'سیرت نبوی پر محققانہ نظر' لکھی تھی۔ اس کتاب

میں سیرت کے روحانی پہلوؤں پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اونچی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ بزرگ دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی کتاب کے بارہ میں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کتاب کوئی معیاری کتاب نظر نہیں آئی۔ اس لئے اس کو سیرت کے سنجیدہ ادب میں میں نے شامل نہیں کیا۔

☆

خطیب بغدادی نے امام اعظمؒ کے بارے میں بہت کچھ جھوٹ لکھا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

یہ تو خطیب بغدادی سے پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں یا ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جن میں بغداد یا دمشق کا حوالہ ہے۔ آپ نے شاید خود خطیب بغدادی کی کتاب نہیں دیکھی۔ بلکہ آپ نے خطیب بغدادی کے بارے میں ذرا متشدد احناف کا تبصرہ ہی پڑھا ہے۔ خطیب بغدادی نے دونوں روایات جمع کی ہیں۔ جنہوں نے امام صاحب پر تنقید کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں اور جنہوں نے امام صاحب کے حق میں بات کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں۔ میرے خیال میں اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ان کو وہ روایات بیان نہیں کرنی چاہئیں جو امام صاحب پر تنقید میں ہیں تو یہ ایک وقیع رائے ضرور ہے۔ لیکن خطیب بغدادی کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ خطیب بغدادی نے اس کو objectivity کے خلاف سمجھا ہو۔ خطیب بغدادی کی ان روایات کا بہت سے اہل علم اور مورخین نے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر البانیہ کے رہنے والے ایک بزرگ تھے، شیخ محمد زاہد الکوثری، جو عثمانیوں کے آخری دور میں استنبول میں شیخ الاسلام کے دفتر کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ایک کتاب **تانیب الخطیب** لکھی تھی جس میں خطیب بغدادی کی ان تمام روایات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ میرے خیال میں خطیب بغدادی نے جو کچھ کہا ہے اس کا اس کتاب میں بہت موثر جواب دے دیا گیا ہے۔ اب ان کو مطعون کرنا شاید مناسب نہ ہو۔

☆

آپ نے الدرر فی المغازی والسیر کے سلسلہ میں قافیہ بندی کا ذکر کیا ہے۔ یہ محض ایک لطیفہ ہی ہے۔ ایک بزرگ نے دو کتابیں لکھی ہیں جس میں قافیہ بندی کی ہے۔ ایک ہے 'انزال الصواعق علیٰ من یاکل بالملاعق' اور دوسری ہے 'القھر الالٰھی علیٰ من یاتی فی المقاھی'۔

ایک اور بزرگ تھے۔ ہندوستان میں شاردھا بل کے نام سے ایک قانون منظور ہوا تھا جس میں بچوں کی شادی یا اس طرح کی کسی ممانعت کا ذکر تھا۔ اس پر ان بزرگ نے کتاب لکھی تھی 'ضم شارد الابل فی ذم شاردا بل'۔

☆

براہ مہربانی خزاعی کا پورا نام اور کتاب کا نام بتادیں۔

خزاعی کا پورا نام 'علی بن محمد الخزاعی' ہے۔ کتاب کا نام ہے 'تخریج الدلالات السمعیۃ'۔ عبدالحیٔ الکتانی کی کتاب کا نام ہے 'التراتیب الاداریہ فی نظام الحکومۃ النبویۃ'۔

☆

یہ بہت عجیب بات ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ہی حج کیا اور اس کی تعین میں بھی صحابہ کرام کو اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا حج تھا؟

میرے خیال میں شریعت اور احادیث میں حج کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ جن صحابہ نے حضور کے حج کو دیکھا انہوں نے اپنی فہم کے مطابق اس کی وضاحت کی۔ یہ بات کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کے حج کو تینوں قسم کا سمجھا شاید یہ ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوا ہو۔ اب آپ جس قسم کی حج کریں گے تو آپ کو اعتماد ہوگا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔ اگر حضور نے جو حج کیا اس کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ ایک ہی رائے ہوتی

تو ہمارے اور آپ کے لئے تنوع کم ہو جاتا۔ حج تمتع نسبتاً آسان ہے۔ ہم جیسے سہل انگاروں کے لئے تمتع کرنا آسان ہے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ حضور نے تمتع کا حج نہیں کیا تو مجھے تمتع کا حج کرنے میں تامل ہوتا۔ اب جو بھی حج کروں گا مجھے یقین ہے کہ کچھ محققین کی نظر میں یہ سنت کے مطابق ہے۔ شاید ہمارے لئے اس میں آسانی ہے مشکل نہیں۔

☆

کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس گھر میں یا آپ کی نگرانی میں قرآن تیار ہو رہا تھا؟

میں تو بہت پہلے بیان کر چکا ہوں کہ حضورﷺ ہر ہفتہ دس دن بعد، جب بھی ضرورت محسوس کرتے، تمام صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور جس صحابی کے پاس جو تحریری ذخیرہ یا نوشتہ ہوتا تھا اس کی آپ سماعت فرمایا کرتے تھے۔ اس میں اگر کوئی غلطی ہوتی تو آپ اس کی اصلاح فرما دیتے۔ متفرق آیات ہوتیں تو آپ ان کی ترتیب بیان فرمایا کرتے تھے۔ جب کوئی سورۃ مکمل ہو جاتی تھی اس کو بھی بیان فرمادیا کرتے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں بخاری میں حضرت زید بن ثابت کی روایت آئی ہے: **کنا نولّف القرآن من الرقاع فی حضرۃ رسول اللہ** ﷺ، یعنی حضور کی موجودگی میں ہم قرآن پاک کو پرچیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے جمع کیا کرتے تھے۔ مخالفین نے انہی اجتماعات کو دیکھ الزام لگایا تھا کہ یہ **اساطیر الاولین** ہیں۔ جو انہوں نے لوگوں سے لکھوا رکھی ہیں۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ یہ کام خود حضور کی نگرانی میں تسلسل کے ساتھ ہو رہا تھا۔

☆

کیا ابن کثیر نے تمام قسم کی اسرائیلیات کو قبول کرنے پر پابندی لگائی ہے؟

اسرائیلیات کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل ذہن میں رہنی چاہیے۔ اسرائیلیات تین قسم کی ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سو فیصد اسلامی روایت کے مطابق ہیں اور قرآن پاک اور احادیث

صحیحہ میں دیئے گئے بیانات سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادے تھے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق۔ یہ بات اسرائیلیات میں بھی شامل ہے اور بائبل میں بھی ہے۔ ظاہر ہے اس میں اور قرآن پاک کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بیان بالکل صحیح ہے اور اس کو بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو صریحاً قرآن پاک اور حدیث سے متعارض ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بعض پر اخلاقی نوعیت کے الزامات ہیں۔ یہ بیان کرنا بالکل غلط اور ناجائز ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو نہ تو قرآن پاک سے بالکل متعارض ہیں اور نہ موئید ہیں۔ ایسی روایات کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ ممکن ہے ایک محقق کی نظر میں اسرائیلیات کی ایک روایت قرآن کی مخالف نہ ہو۔ دوسرے محقق کی رائے میں وہ قرآن کے خلاف ہو۔ جو جتنی گہرائی میں غور کرے گا اس کو اتنے ہی پہلو نظر آئیں گے۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسرائیلیات کے بارے میں شد و مد سے جو اختلافات اور بحث وتمحیص ہے وہ اسی درمیانے درجہ کی روایات کے بارے میں ہے۔ پہلے درجہ کی روایات کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان کو قبول کرلیا جائے۔ دوسری قسم کی روایات کے بارے میں بالاتفاق یہ رائے ہے کہ اسے مسترد کردیا جائے۔ جو اختلاف ہے وہ تیسری قسم کے بارے میں ہے۔

پہلی قسم کے بارے میں حضور نے فرمایا تھا کہ 'حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج'۔ بنی اسرائیل سے کوئی روایت بیان کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

☆

ایک بہن نے انگریزی میں سوال کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ جن کتابوں کے نام لے رہے ہیں، ان کی فہرست مرتب کرکے تقسیم کردیں۔

میں نے پہلے سے کتابوں کی کوئی مکمل فہرست بنا کر نہیں رکھی۔ ذہن میں جو چیز آتی

جاتی ہے وہ بیان کرتا جاتا ہوں۔ لہٰذا فی الوقت تو فہرست بتانا بہت دشوار ہے۔ لیکن ان شاء اللہ جب یہ کتاب چھپ جائے گی تو اس میں شامل یہ سارے نام جو ریکارڈ ہو رہے ہیں وہ سب آپ کے سامنے تحریری صورت میں آ جائیں گے۔

☆

مؤرخانہ اسلوب رکھنے والی وہ قدیم کتابیں جن میں کسی بیان کردہ واقعہ کا کوئی حصہ ایسا ہو جس کا ثبوت حدیث نبوی سے نہ ہو سکے، اسے میں اور آپ تو تسلیم کرلیں گے۔ لیکن ایک مستشرق کے اعتراضات کے جواب میں اس کا دفاع کیسے کریں گے؟

مستشرقین میں جو لوگ نسبتاً معتدل مزاج کے ہیں اور ایک معروضی رویہ رکھتے ہیں وہ تو معقول بات کو مان لیتے ہیں۔ لیکن جو متعصب اور شدت پسند ہیں وہ تو قرآن پاک کو بھی نہیں مانتے۔ احادیث کو بھی نہیں مانتے۔ انہوں نے یہ تک تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج نہیں نکل رہا۔ پاکستان نام کا کوئی ملک اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اگر کوئی ان طے شدہ امور، روشن حقائق اور واضح اور بدیہی چیزوں کو انکار کرے تو اس کو آپ مرفوع القلم سمجھیں گے۔ اس لئے میں ایسے مستشرقین کو مرفوع القلم سمجھتا ہوں اور ان لوگوں کی ایسی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو بدیہیات کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں جو مستند اور ذمہ دار لوگ ہیں وہ ایسی چیزوں کا انکار نہیں کرتے۔ اگر کسی نے انکار کیا ہو اور اس کو دلائل سے قائل کر لیا جائے تو وہ بعض اوقات مان بھی لیتے ہیں۔

مستشرقین کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مستشرقین مسلمان نہیں ہیں اس لئے ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ سیرت بیان کرتے وقت ہمارے عقائد ہی کے مطابق بات کریں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کی بعض تحریریں گمراہی کا موجب ہوتی ہیں، یہ بات خطرناک بھی ہے اور اس سے برائی

پھیلتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، وہ انگریزی اور مغربی زبانوں میں اسی انداز سے ان امور کو بیان کریں جس انداز سے مستشرقین بیان کرتے ہیں تا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دونوں نقطۂ نظر موجود ہوں اور کوئی شخص اگر مستشرقین کی رائے سے متاثر ہوا ہے تو اس کے سامنے دوسری رائے بھی موجود ہو۔

☆

طبقات صحابہ کے بارے میں آپ نے جن تین کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام دوبارہ بتا دیں۔

وہ تین کتابیں یہ ہیں:

(۱) علامہ ابن عبدالبر کی 'الاستیعاب فی معرفة الاصحاب'

(۲) حافظ ابن حجر کی 'الاصابه فی تمییز الصحابه'

(۳) علامہ ابن اثیر کی 'اُسد الغابه فی معرفة الصحابه'

☆

ایک سوال ہے کہ روایت اور درایت میں کیا فرق ہے؟

علم حدیث میں روایت سے مراد یہ ہے کسی حدیث کا جائزہ لے کر یہ طے کرنا کہ اس کی صحت کا معیار روایت کے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اس کا راوی کون ہے، بیان کرنے والے راویوں کا درجہ کیا ہے۔ ان کا حافظہ اور کردار کیسا تھا۔ وہ سچے تھے کہ نہیں تھے۔ یہ روایت کہلاتا ہے۔

درایت یہ ہے کہ حدیث کے اندر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر آپ عقلی انداز سے غور کریں کہ کیا یہ واقعہ ہو بھی سکتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ غالباً خلیفہ منصور کے پاس کچھ یہودی ایک دستاویز لے کر آئے اور دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ مراعات دی تھیں اور اس دستاویز پر سعد بن معاذ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں کے نام بطور گواہ لکھے ہوئے تھے۔ خلیفہ منصور نے امام اوزاعی سے رائے مانگی تو انہوں نے ایک نظر ڈالتے ہی کہہ دیا کہ یہ

جعلی ہے۔اس لئے کہ جب حضرت معاویہؓ ایمان لائے تھے تو حضرت سعد بن معاذ کا انتقال ہو چکا تھا۔تو یہ دونوں بیک وقت ایک دستاویز کے گواہ نہیں ہو سکتے۔اس کو درایت کہتے ہیں۔

☆

کیا حضورؐ کی پیدائش اور اعلان نبوت سے پہلے کے اقوال اور افعال نبوت کا حصہ ہیں؟

میرے خیال میں یہ چیزیں ہمارے لئے قابل احترام، محبوب اور مقدس تو ہیں، لیکن شریعت کا حصہ صرف وہی اقوال اور افعال ہیں جو حضور نے بطور نبی کے ارشاد فرمائے۔تاہم نبوت سے پہلے کی تفصیلات کو جمع کرنے میں بھی اتنی ہی احتیاط سے کام لیا گیا ہے جس احتیاط سے دوسری احادیث کو جمع کرنے میں کام لیا گیا ہے۔

☆

موضوع احادیث کیوں گھڑی گئیں اور وہ کون سے لوگ تھے جو اس فعل بد میں شامل تھے۔

موضوع احادیث میں کئی طرح کی احادیث شامل ہیں۔کچھ احادیث تو وہ ہیں جن کے راوی جھوٹے تھے۔مثلاً کسی راوی کے بارے میں ثابت ہو گیا کہ یہ جھوٹا آدمی تھا یا غلط بیانی کرتا تھا۔اگر ایک واقعہ میں کسی راوی کی غلط بیانی کسی محدث کے سامنے ثابت ہو گئی تو اس کی تمام روایات کو موضوع قرار دے دیا گیا۔

کچھ لوگوں نے دیانت داری سے، لیکن غلط فہمی کی وجہ سے، کسی بات کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیا۔بات اچھی ہونا اور چیز ہے اور اس کا ارشاد نبوی ہونا اور چیز ہے۔کسی نے کوئی اچھی بات سن کر غلط فہمی کی بنیاد پر یہ سمجھا کہ یہ شاید حضور کا ارشاد ہے۔محدثین نے چیک کر کے بتا دیا کہ یہ حضور کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔یہ حدیث بھی موضوع حدیث ہے۔

کچھ لوگوں نے کسی سیاسی غرض سے بددیانتی یا کسی ذاتی غرض یا گروہی مقصد کے لئے کوئی بات حضور سے منسوب کر دی۔بنو عباس کا ایک خلیفہ تھا، جن کا نام مجھے یاد نہیں، وہ بیٹھا ہوا

کہ اس کے سامنے کوئی شخص کبوتر اڑا رہا تھا۔ وہاں پر ایک شخص نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'لاسبق الا فی حافرٍ او خفٍ'، یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ صرف دو چیزوں میں مقابلہ کرانا جائز ہے یعنی اونٹ اور گھوڑوں کا۔ چونکہ خلیفہ بیٹھا ہوا تھا اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ کوئی صاحب کبوتر اڑا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ خلیفہ کی توجہ حاصل کرنے کا اچھا موقع ہے۔ اس نے ایک لفظ بڑھا دیا: أو طائر : یا پرندوں کے درمیان۔ لیکن خلیفہ بھی کوئی آج کل کے حکمرانوں کی طرح شریعت سے بالکل نابلد نہیں تھا۔ اس کو علم تھا کہ اصل حدیث کیا ہے۔ اس لئے فوراً کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ یہ حصہ حدیث میں شامل نہیں ہے۔ اس طرح کے خوشامدی لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں۔

☆

حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شادی کے وقت کیا تھی۔ آپ نے مورخین کی رائے تو بتا دی لیکن صحیح عمر نہیں بتائی۔

میں نے عرض کیا نا کہ ہمارے ارباب حدیث اور ارباب سیر کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شادی کے وقت نو سال تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ عرب کے ماحول میں لوگ جلدی grow کیا کرتے تھے۔ لہٰذا بچوں کی شادیاں کم سنی میں ہو جاتی تھیں۔ بیسیوں صحابہ کرام کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ انہوں بارہ تیرہ سال کی عمر میں شادیاں کیں۔ اس لئے عام محدثین اور سیرت نگار اس کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ جن روایات کی بنیاد پر نو سال کی عمر ثابت کی جاتی ہے، وہ کمزور ہیں یا ان میں کوئی بات محل اعتراض ہے، لیکن بعض دوسرے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ تھی۔ یہ اقلیت کی رائے تھی۔ اس لئے میں نے بیان کیا کہ علامہ ابن عبدالبر جیسے مستند آدمی کی کتاب میں بھی اشارۃً وہی رائے موجود ہے جو اقلیت کی رائے تھی۔ لیکن یہ ان کی رائے ہے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

آپ نے بتایا کہ روایت بالمعنیٰ نہیں ہونی چاہئے، لیکن معاشرہ میں عام لوگوں سے ہٹ کر بعض اوقات علمائے کرام بھی یہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے اور پھر وہ بیان کر دیتے ہیں۔

جب روایت بالمعنیٰ کی ممانعت کی جارہی تھی تو یہ وہ زمانہ تھا جب علم حدیث مدوّن ہو رہا تھا اور حدیث کی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر روایت بالمعنیٰ کی اجازت دے دی گئی تو احادیث کچھ سے کچھ ہو کر ہم تک پہنچیں گی۔ اب ساری احادیث مکمل اور مرتب ہو چکی ہیں۔ ان میں کسی تحریف کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے اب علماء اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی یادداشت سے اپنی زبان میں اور اپنے الفاظ میں حدیث بیان کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اگرچہ بہتر اب بھی یہی ہے کہ جو کچھ حضور کی زبان مبارک سے نکلا تھا وہی بیان کیا جائے۔ لیکن ہر شخص کو احادیث کے الفاظ یاد نہیں ہوتے اور اگر یہ شرط لگا دی گئی تو کوئی بھی شخص حدیث کا مفہوم بیان نہیں کر سکے گا اور حضور کے پیغام کی اشاعت محدود ہو جائے گی۔ اس لئے میرے خیال میں اس زمانے کے لحاظ سے یہ اجازت ہونی چاہئے۔

☆

اسپین کے عالم بڑے مشہور ہوئے۔ آپ نے اسپین کے جن عالم کا ذکر کیا ان کا نام بتائیے۔

ان کا پورا نام بتا چکا ہوں علی بن محمد الخزاعی، کتاب کا نام ہے تخریج الدلالات السمعیۃ۔

☆

ایک سابقہ نشست میں جناب خالد مسعود صاحب نے فرمایا تھا کہ لفظ اُمّی کا عرف عام میں جو معنیٰ کیا جاتا ہے وہ

درست نہیں۔

یہ سوال تو آپ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے ہی پوچھتے تو بہتر تھا۔ میں ان کی طرف سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ اُمی کے بارے میں عام طور پر مفسرین اور سیرت نگاروں نے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ ایک تو امی کا وہی مفہوم ہے جو عام طور پر مشہور ہے، یعنی جس نے کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ دوسرا مفہوم جو بعض لوگوں نے بیان کیا ہے اس کے مطابق امی سے مراد وہ لوگ ہیں جو ام القریٰ (مکہ معظمہ) کے رہنے والے ہیں۔ ام القریٰ کے باشندوں کے لئے بھی بعض جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

☆

کیا ابن خلدون نے اپنی تصانیف میں سیرت پر کچھ لکھا ہے۔

میری ناچیز اور محدود معلومات کے مطابق ابن خلدون نے سیرت پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن تاریخ ابن خلدون میں انہوں نے سیرت کے دور کو بھی لیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ ان کو سیرت نگار بھی کہہ سکتے ہیں۔

☆

کل کی نشست میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں تدوین قرآن کی جو بات ہوئی تھی، ان دونوں میں کیا فرق تھا۔ اور جو مکتوب پہلے سے تھا اس کو جلایا گیا تھا یا نہیں؟

ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں ایک نسخہ جامع ترتیب کے ساتھ سرکاری طور پر لکھوایا گیا اور مسجد نبوی میں خلیفہ کی نگرانی میں موجود رہا۔ حکم یہ تھا کہ جس کو ترتیب کے بارے میں کوئی تامل ہو یا کسی کی یادداشت میں کمی ہو وہ اس نسخہ کے مطابق چیک کر کے اس کو درست کر لے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں یہ ہوا کہ اسی نسخہ کی

مزید کاپیاں کرا کر بھیج دی گئیں اور سابقہ نسخوں کو رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ کے دور میں اسلامی ریاست کی حدود آرمینیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر سوڈان کے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں۔اس پورے علاقے میں آج بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک ذاتی نسخہ کا جائزہ لے کر چیک کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی ترتیب وغیرہ درست ہے کہ نہیں۔اگر ایسا آج بھی ممکن نہیں تو اس دور میں کیسے یہ ممکن ہوسکتا تھا۔اس لئے حضرت عثمان نے حکم دیا کہ ان سب نسخوں کو ضائع کر دیا جائے۔جو نسخے چمڑے اور پتھر پر لکھے ہوئے تھے ان کو دھو دیا گیا اور دھونے کے بعد دوسرے کام میں لایا گیا۔اور جو دھوئے نہیں جاسکتے تھے ان کو جلوا دیا گیا اور جلانے کے بعد ان کو احترام کے ساتھ کہیں محفوظ یا دفن کر دیا گیا۔

☆

سیرت النبی کی قلم بندی، تعلیم، ترتیب، تدوین، استدلال اور سند سازی کے لئے قرآن کی کونسی آیات رہنمائی کرتی ہیں۔

قرآن پاک تو سارے کا سارا سیرت کے بارہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔انہوں نے 'ہمہ قرآن درشان محمدؐ' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ایک ایک سورۃ کا الگ الگ جائزہ لے کر بتایا ہے کہ یہ سیرت کے کون سے پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

☆

ایک صاحب نے بلاوجہ انگریزی میں سوال کیا ہے۔ بات اردو میں ہورہی ہے تو آپ اردو ہی میں سوال پوچھیں۔انہوں نے پوچھا ہے کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک یہاں اس محفل میں موجود ہے اور وہ درود شریف سنتی ہے۔

میرے خیال میں مسلمانوں کی طرف سے پڑھا اور بھیجا جانے والا درود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچایا جاتا ہے۔ جو آپ درود بھیجتے ہیں وہ حضور تک پہنچایا جاتا ہے اور آپؐ کے علم میں آجاتا ہے۔ یہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ میں کوئی سخت لفظ نہیں بولنا چاہتا لیکن دورِ جدید کے بعض مستشرقین کو ہر اس بات کی تردید سے دلچسپی ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی ذات رسالت مآب سے محبت اور عقیدت سے ہو۔ انہوں نے تحقیق کرکے ان احادیث کو بھی کمزور قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ احادیث واقعی کمزور ہوں، لیکن میں سردست اس بحث میں نہیں جاتا۔ اگر کمزور بھی ہوں تو اس طرح احادیث کے بارہ میں ہمیشہ دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ ایک حدیث ایک کی رائے میں ثابت شدہ اور دوسرے کی رائے میں غیر ثابت شدہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔

ایک بات میں ذرا وضاحت سے کہہ دوں۔ نکیر اسلام کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے منکر پر اظہار ناپسندیدگی کرنا۔ منکر پر ناپسندیدگی کا حسب استطاعت اظہار کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ منکر وہ ہے جو قرآن پاک اور حدیث کی نص قطعی کی رو سے برا کام ہے اور ناجائز ہے۔ معروف اور منکر دو اصطلاحات ہیں۔ بدکاری منکر ہے، چوری، فحاشی، جھوٹ بولنا، جعل سازی اور توہین انبیا منکر ہیں۔ ان چیزوں کے منکرات ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان پر نکیر کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ 'من رآی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ' یہ جو مشہور حدیث ہے۔ اس میں منکر سے یہی منکر مراد ہے۔ لیکن جو جو چیزیں مختلف فیہ ہوں۔ جہاں قرآن وحدیث کی تعبیر کا مسئلہ ہو۔ اور اس تعبیر کی بنیاد احادیث یا قرآن کی آیات پر ہو اس رائے سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ منکر نہیں ہوتی، اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر کوئی اس طرح کی مختلف فیہ بات پر نکیر کرتا ہے تو وہ شریعت کو نہیں سمجھا ہے۔

میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص مختلف فیہ چیزوں پر نکیر کرتا ہے وہ شریعت کو نہیں سمجھتا۔

☆

There is also a Sirah in English by Maulana Maudoodi-

مولانا مودودی کی سیرت کا انگریزی ترجمہ تو اب تک میرے علم میں نہیں آیا۔ مولانا کی سیرت کا ذکر ان شاء اللہ میں دور جدید میں سیرت کے موضوع پر گفتگو کے دوران کروں گا۔ مولانا کی سیرت کی کتاب بہت اچھی کتاب ہے لیکن مکمل نہیں ہے۔ اگر وہ اس کو مکمل کرتے تو یقیناً وہ ایک غیر معمولی کتاب ہوتی۔ اس کی دوسری جلد خاص طور پر بہت اچھی ہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک اس کا انگریزی ترجمہ اب تک نہیں ہوا۔ اگر ہو گیا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔

جزاکم اللہ

☆

پانچواں خطبہ

چند نامور سیرت نگار

اور ان کے امتیازی خصائص

پانچواں خطبہ

چند نامور سیرت نگار
اور ان کے امتیازی خصائص

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام صدر جلسہ جناب ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری،
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب،
سربراہ، ادارہ تحقیقات اسلامی،
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
برادران محترم!
خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا موضوع ہے: 'چند نامور سیرت نگار اور ان کے امتیازی خصائص'۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت مشکل موضوع ہے۔ اس لئے کہ ایک اعتبار سے ہر سیرت نگار نامور سیرت نگار ہے۔ کوئی مخلص سیرت نگار ایسا نہیں ہے جو ان شاء اللہ روز قیامت نامور نہیں ہوگا۔ اس لئے سیرت نگاروں کی طویل، لامتناہی اور مبارک فہرست میں سے نامور سیرت نگاروں کا تعین اور انتخاب اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ کوئی بھی شخص قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ فلاں سیرت نگار نامور سیرت نگار ہے اور فلاں سیرت نگار نامور سیرت نگار نہیں ہے۔ پھر نامور سیرت نگاروں کا جو بھی معیار مقرر کیا جائے گا اس معیار پر بھی

سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سیرت نگار پورے اتریں گے۔ کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مختصر سی نشست میں نامور سیرت نگاروں کی فہرست ہی بیان کر سکے۔

چند روز قبل میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ایرانی محقق نے 12 جلدوں میں سیرت کی ایک کتابیات تیار کی ہے۔ اس میں 29 ہزار سے زیادہ اندراجات ہیں۔ ان 29 ہزار اندراجات میں صرف 29 اندراجات ہی منتخب کئے جائیں۔ ہر اندراج پر دس منٹ بھی بات کی جائے تو 290 منٹ درکار ہیں۔ اس لئے خاصی دیر غور وخوض کے بعد چند نام تجویز کئے ہیں۔ اور آج خاصی دیر میں یہی کام کرتا رہا۔ مختلف فہرستیں بنائی گئی، بار بار کئی نام تجویز کئے کہ آج ان پر گفتگو کی جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ انتخاب کرنا بڑا دشوار تھا کہ کس سیرت نگار کا انتخاب کیا جائے اور کس کے کام پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ انتخاب کرنے میں پہلی ترجیح ان بزرگان علم وتحقیق کو حاصل ہے جنہوں نے ہمارے لئے فن سیرت کو مرتب کیا۔ محفوظ کیا اور اس کو اتنی مضبوط اور سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا کہ بعد میں آنے والوں کے لئے ایک دائمی شاہراہ تحقیق قائم کر دی۔

نامور سیرت نگاروں میں کچھ حضرات تو وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے برصغیر سے ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ آخر میں برصغیر کے عنوان سے ہونے والی گفتگو میں پیش کیا جائے گا۔ کچھ نامور سیرت نگار وہ ہیں جن کا تعلق دور جدید سے ہے۔ ان کا تذکرہ دور جدید کے موضوع پر ہونے والی گفتگو میں سامنے آئے گا۔ اس لئے آج کی گفتگو صرف ان متقدمین تک محدود ہے جن کا تذکرہ پہلے نہیں ہو سکا اور ان کا کام اس درجہ کا ہے کہ انہوں نے اپنے بعد آنے والوں کے لئے بنیادیں متعین کیں۔ راستے کے نشانات وضع کئے۔ اس فن کے قواعد، ضوابط اور بنیادی اصول طے کئے۔ جن سے کام لے کر بعد میں آنے والوں نے سیرت کے عنوان پر یہ پورا کتب خانہ تیار کیا جس کی کتابیات کی ایک فہرست 29 ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔

برادران محترم!

سیرت کی تقریباً تمام ابتدائی کتابوں کی بنیاد محققین کی رائے کے مطابق چار بڑی شخصیتوں کے کام پر قائم ہے۔ یہ چار بڑی شخصیتیں وہ ہیں جنہوں نے سیرت نگاری کے بالکل

ابتدائی دور یعنی دوسری صدی ہجری تقریباً پوری اور تیسری صدی ہجری کے ابتدائی حصہ میں سیرت نگاری کے فن کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی ابتدائی تدوین اتنے مضبوط خطوط پر کردی کہ آئندہ آنے والوں کے لئے ان خطوط سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہ شخصیات چار ہیں۔

۱۔ محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ)

۲۔ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۲۰۷ھ)

۳۔ محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)

۴۔ عبدالملک بن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ)

ابن اسحٰق کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ابن اسحٰق کے بارے میں میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ان کو علم سیرت سے وہی نسبت ہے جو حکیم ارسطا طالیس کو علم منطق سے، امام شافعی کو علم اصول فقہ سے اور خلیل بن احمد افرہیدی کو علم عروض سے ہے۔ ابن اسحٰق سے پہلے فن سیرت موجود تھا۔ علم سیرت کا سارا مواد بھی موجود تھا۔ لیکن ابن اسحٰق نے اس کو انتہائی مربوط خطوط پر استوار کیا۔ اس انداز سے مرتب کیا کہ بعد میں آنے والا ہر شخص ان کا ممنون احسان ہے۔

ابن اسحاق کے علاوہ جو تین نام معروف ہیں وہ واقدی، ابن سعد اور ابن ہشام کے ہیں۔ گفتگو کا آغاز انہی تین سے کرتے ہیں۔ ان تین یا چار سیرت نگاروں کا تذکرہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ ابتدائی دو صدیوں میں سیرت پر کام کرنے والے لوگ بہت محدود تھے۔ کوئی تین چار درجن سیرت نگاروں کے نام تو گزشتہ دو چار دن کی گفتگو میں سامنے آ چکے ہیں۔ خود مغربی مصنفین اور محققین نے اس کثرت تعداد کو محسوس کیا ہے۔ انہوں نے سیرت پر ابتدائی کام کرنے والے لوگوں کی فہرستیں مرتب کی ہیں۔ ایک جرمن محقق اور مستشرق وسٹن فیلڈ نے کم وبیش سوا سو سال پہلے غالباً ۱۸۸۲ء عرب میں علم تاریخ کے آغاز وارتقاء پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس نے بہت سے نام تلاش اور جستجو سے جمع کیے۔ اس کی تحقیق کے مطابق ابن اسحاق سے پہلے 27 افراد تھے جنہوں نے سیرت پر مواد جمع کیا۔ ان ستائیس نامور سیرت نویسوں میں تین صحابہ کرام کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق سے ان 27 میں مزید اضافے کیے ہیں۔ اب یہ تعداد تقریباً 40 ہے۔ان چالیس میں چار وہ صحابہ کرام بھی شامل ہیں جنھوں نے سیرت اور مغازی پر تحریری ذخیرے چھوڑے ہیں۔اس لئے ہم ایک ایسے مقدس اور محترم فن پر بات کررہے ہیں جس کے مرتبین میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چار صحابہ کے اسمائے گرامی بھی آتے ہیں۔

سیرت کے فن کو جس مؤرخ اور سیرت نگار نے اپنی زندگی بھر کی تحقیق اور کاوش سے چار چاند لگادیئے۔جس نے مغازی پر ساری معلومات جمع کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیں کہ آج غزوہ بدر، غزوہ احد اور حنین و ہوازن اس طرح ہمارے سامنے ہیں جیسے کسی کے سامنے فلم دکھادی گئی ہو۔ یہ کارنامہ جن بزرگ کا ہے ان کا نام محمد بن عمر الواقدی ہے۔محمد بن عمر الواقدی سیرت نگاروں میں بڑا نمایاں نام اور مقام رکھتے ہیں۔ جو بات کل ابن اسحٰق کے بارے میں کہی گئی تھی وہ واقدی پر بھی بدرجۂ اتم صادق آتی ہے۔ابن اسحٰق سے کہیں زیادہ واقدی کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ ان کے بیانات کی دینی اور استنادی حیثیت کیا ہے۔ ان کے بیانات اور تحقیقات کی علمی اور تاریخی حیثیت کے بارے میں تو کبھی بھی کوئی شبہ نہیں رہا۔ابن اسحٰق کی طرح واقدی کے بارے میں بھی بہت سے محدثین نے یہ تامل ظاہر کیا کہ وہ تمام روایات کو جمع کر کے ان کو ایک مرتب نقشہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور محدثین کے لئے یہ تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پوری روایت بلکہ قصہ یا مجموعہ روایات میں کون سا لفظ کس راوی نے بیان کیا ہے۔ یوں ان اجزا کا الگ الگ طور پر معیار استناد مقرر کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ ایک بڑا اعتراض ہے جو محدثین نے بہت سے مورخین اور ارباب سیرت پر کیا ہے اور واقدی پر بھی کیا ہے۔لیکن واقدی نے کس محبت، کس عقیدت اور کس محنت اور اہتمام کے ساتھ سیرت کے واقعات کو جمع کیا، ان میں سے چند جھلکیاں میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

خطیب بغدادی جو خود ایک بہت بڑے محدث ہیں اور علم حدیث کے ائمہ میں ان کا شمار ہے۔علوم حدیث پر ان کی کتابیں بہت اونچا مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے واقدی کے بارے میں لکھا ہے کہ واقدی نے مشرق سے لے کر مغرب تک دنیائے اسلام کے لوگوں سے کسب فیض کیا۔ان کا ذکر مشرق و مغرب میں ہر جگہ موجود ہے۔اور کسی شخص کے لئے جو سیرت

اورابتدائی تاریخ اسلام سے شغف رکھتا ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ واقدی کی تحقیقات ،تصنیفات اور کارناموں سے صرف نظر کر سکے۔

واقدی نے مغازی کے علاوہ براہ راست سیرت کے مختلف پہلوؤں پر، طبقات پر، رسول اللہ ﷺ سے متعلق بہت سے ایسے معاملات پر جو عام سیرت نگار اس وقت بیان نہیں کرتے تھے، ان سب کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں واقدی ایک بہت بڑے فقیہ اور قاضی تھے۔ ان کا شماران لوگوں میں ہے جنہوں نے علم مغازی اور سیر یعنی اسلام کے بین الاقوامی قانون کے قواعد وضوابط وضع کئے اوران کو اس موضوع پر ابتدائی تالیفات میں سے ایک تالیف پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کی جاچکا ہے کہ مغازی سے دلچسپی دو قسم کے حضرات کو تھی یعنی مورخ کو اور قانون دان اور فقیہ کو۔ مورخ اور سیرت نگار کی دلچسپی واقعات اور تفصیلات کو جمع کرنے سے تھی۔ مورخ اور سیرت نگار کی دلچسپی یہ تھی کہ کسی واقعہ کا مکمل نقشہ سامنے آ جائے۔ فقیہ اور قانون دان کی دلچسپی یہ تھی کہ اس واقعہ سے، جو جنگ کا واقعہ ہو، صلح کا واقعہ ہو، معاہدے کا واقعہ ہو، جو جو قوانین بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کے لئے نکلتے ہیں، ان کی نشاندہی کی جائے۔ واقدی کا شمار دونوں کی قسم کی شخصیات میں ہے۔ وہ قاضی بھی رہے۔ انہوں نے فقہ پر بھی کتاب لکھی۔ ایک کتاب انہوں نے اختلاف حدیث پر بھی لکھی۔ یعنی وہ احادیث جن کے بظاہر مختلف احکام نکلتے ہیں ان دونوں کے درمیان تطبیق کیسے پیدا کی جائے۔ اوراس ظاہری اختلاف کو کیسے دور کیا جائے۔ اس پر متقدمین کے زمانے سے لوگ کتابیں لکھتے چلے آئے ہیں۔ امام شافعی نے اس پر کتاب لکھی۔ اور بھی کئی محدثین اور فقہا نے اس پر کام کیا ہے۔

سیرت پر واقدی کا جو کارنامہ ہے لوگ اس سے تو بخوبی واقف ہیں۔ واقدی کی ضخیم کتاب مغازی پر مطبوعہ موجود ہے۔ لیکن انہوں نے جو کام بین الاقوامی قانون پر کیا تھا اس کا تذکرہ نسبۃً کم ہوتا ہے۔ ان کا یہ کام بھی دستیاب ہے اور آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اور امام شافعی جیسے محتاط اور قابل احترام فقیہ اور محدث نے واقدی کے کام کو محفوظ کرلیا ہے۔ امام شافعی کی آٹھ جلدوں میں ایک ضخیم کتاب ہے جو فقہ شافعی کی اساس اور بنیاد مانی جاتی ہے، کتاب الام، یعنی mother book۔ ان آٹھ جلدوں میں چوتھی جلد میں امام شافعی نے

سیر الواقدی کے نام سے ایک کتاب بیان کی ہے جو واقدی کی سیر کا وہ حصہ ہے جس پر امام شافعی نے کوئی تبصرہ یا comment کرنا چاہا۔ یہ مکمل کتاب واقدی کی نہیں اور نہ واقدی کی کتاب کا بقیہ حصہ ہم تک پہنچا ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ واقدی کو علم سیر اور مغازی دونوں سے دلچسپی تھی۔ بطور مورخ اور سیرت نگار کے بھی اور بطور فقیہ اور ایک قانونی ماہر کے بھی۔

تذکرہ نگاروں نے واقدی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ انتہائی پاکردار اور بااخلاق شخصیت تھے۔ جود وسخا میں مشہور تھے۔ ان کی سخاوت کے واقعات کئی لوگوں نے بیان کئے ہیں۔ ایک واقعہ شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔ واقدی نے اپنی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک چھوٹا سا کاروبار کر رکھا تھا جو ان کے ملازمین چلاتے تھے۔ غالباً مدینہ منورہ میں ایک دکان تھی جس میں ان کا ملازم بیٹھتا تھا۔ ملازم ہی سارا کاروبار کرتے، وہ جتنی رقم لاکر دیتے تھے وہ لے لیتے تھے اور اس کا بھی بیشتر حصہ کتابوں پر اور بقیہ اور علمی ضروریات پر خرچ کرتے تھے۔ دو ملازم خاص طور پر اس کام کے لئے رکھے تھے کہ ان کے علمی کاموں میں مدد کریں۔ یہ دونوں ملازم دن رات ان کے لئے مسودے نقل کرتے تھے، ان کو بہتر بناتے تھے۔ بقیہ دو ایک ملازمین تجارت اور کاروبار کو دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے جو کاروبار ملازمین کے ہاتھ میں ہو اور خود مالک نگرانی نہ کرتا ہو اس پر کیا گزرتی ہے۔ چنانچہ واقدی پر بھی یہی گزر رہی تھی۔ پیسے ختم ہو جاتے تھے اور ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ تھا اور عید الفطر آنے والی تھی۔ گھر والوں نے کہا کہ عید کا کچھ انتظام کریں۔ انہوں نے اپنی ناداری کا اظہار کیا اور عذر کیا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ اہلیہ محترمہ نے کہا کہ آپ کے فلاں دوست جو بڑے بارسوخ ہیں اور باوسائل ہیں آپ ان سے بات کریں۔ جب گھر سے اصرار ہوا تو مجبوراً انہوں نے جا کر اپنے مخیر دوست سے بات کی۔ دوست نے واقدی کی ضرورت کا حال سنتے ہی ایک ہزار درہم کی تھیلی لاکر دے دی۔ یہ بزرگ ہاشمی تھے۔ حضورؐ کے خاندان کے تھے۔ ہاشمیوں کی سخاوت ہمیشہ سے مشہور ہے۔ واقدی نے ایک ہزار درہم کی تھیلی لاکر بیوی کو دے دی۔ ابھی یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اس رقم سے کیا کیا کرنا ہے۔ ایک دوست آئے اور کہا کہ میں بہت محتاج ہوں۔ عید آنے والی ہے اور میرے

پاس کچھ ہے نہیں تو آپ میری کوئی مدد کریں۔ واقدی نے بیگم کے مشورہ سے وہ تھیلی جوں کی توں اٹھا کر ان کو دے دی۔

تھوڑی دیر میں واقدی کے ہاشمی دوست ان کے پاس آئے اور کہا کہ بھئی کیا قصہ ہے، میں نے آپ کو جو تھیلی دی تھی وہ کہاں گئی۔ واقدی نے بتانے میں تامل کیا، لیکن جب ہاشمی دوست نے اصرار کیا تو بعد میں بتا دیا کہ فلاں دوست کو دے دی۔ ہاشمی دوست نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس تھیلی کے کچھ نہیں تھا۔ جب وہ آپ کو دے دی تو اپنے ایک دوسرے دوست سے کہا کہ مجھے کچھ مدد چاہئے۔ انہوں نے میری ہی تھیلی مجھے بھیج دی۔ اب یہ تینوں چاروں دوست ایک جگہ جمع ہوئے اور آپس میں اس دلچسپ اتفاق بلکہ تفریح پر اظہار خیال کرر ہے تھے کہ ان ہاشمی دوست کو وزیر اعظم کی طرف سے بلاوا آیا۔ وزیر اعظم کو اطلاع ملی کہ مجلس میں واقدی بھی موجود ہیں انہوں نے کہا سب کو لے آؤ۔ چاروں چلے گئے۔ وزیر اعظم نے سارا واقعہ سن کر سب کو ایک ایک ہزار درہم دیئے اور واقدی کو دو ہزار درہم دے کر کہا کہ اس میں ایک ہزار تمہاری بیگم کے لئے ہیں کیونکہ اسی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ سارے درہم ہاشمی دوست کو دے دیئے جائیں۔ جو خاتون حضور کے خاندان کے ایک آدمی کے لئے اپنی ضروریات قربان کر دے وہ اس کی مستحق ہے کہ اس کو بھی ایک ہزار درہم کی تھیلی دے دی جائے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ واقدی کس مزاج اور کس انداز کے آدمی تھے۔

مغازی اور سیرت نبوی کے بارے میں تمام مورخین اور سیرت نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ مغازی کے بارے میں ان سے زیادہ جاننے والا کوئی اور آدمی اس وقت دنیائے اسلام میں موجود نہیں تھا۔ محمد بن سلام الجمحی ایک مشہور مورخ اور ادیب ہیں، جنہوں نے طبقات پر ایک کتاب لکھی ہے 'طبقات الشعرا'، یہ واقدی کے جونیئر ہم عصر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ 'کان الواقدی عالم دھرہ'، واقدی اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تھا جو مغازی کے علم کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا۔ واقدی کو کتابوں سے اتنی دلچسپی تھی کہ ایک مرتبہ جب ایک مکان سے دوسرے مکان منتقل ہو رہے تھے اور اپنا سامان لے جانے لگے تو 120 اونٹوں پر اپنی کتابیں لے کر گئے۔ ان کے جو مسودات تھے وہ 600 صندوقوں میں محفوظ تھے۔ ہر صندوق اتنا بڑا تھا کہ دو آدمی اس کو اٹھاتے تھے۔

واقدی کی زندگی کا بیشتر حصہ مدینہ منورہ میں اور بہت تنگدستی میں گزرا۔ مدینہ منورہ میں وہ دن رات اسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کے خاندانوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان سے پوچھ پوچھ کر وہ دستاویزات جمع کرتے تھے جو حضور کے زمانے سے اس خاندان میں چلی آرہی ہوں۔ حضور کے زمانے کا اگر ناپ تول کا پیمانہ کسی گھر میں محفوظ ہوتا تھا تو اس کو منگوا کر دیکھتے تھے اور ناپ تول کر اس کے بارہ میں معلومات مدون کرتے تھے۔ کسی نے اگر کسی غزوہ کے بارے میں کوئی معلومات بتائیں تو وہ جمع کیں۔ پھر خود جا کر ان مقامات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں خلیفہ ہارون رشید نے حج سے واپسی پر مدینہ منورہ کا دورہ کیا۔ ایک دن شام کے وقت خلیفہ کا آدمی واقدی کے پاس آیا۔ ان دنوں یحیٰ بن خالد برمکی وزیر اعظم تھا۔ اس نے کہا کہ آج رات امیر المومنین رسول اللہ ﷺ کی یادگاریں دیکھنے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ چلیں اور انہوں مدینہ منورہ کے مختلف مقامات کی زیارت کرادیں۔ واقدی نے کہا بہت اچھا۔ عشاء کی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر وہ خلیفہ کے ساتھ نکلے۔ وہ خلیفہ کو ایک ایک مقام پر لے جاتے رہے۔ خلیفہ وہاں نوافل ادا کرتے اور عبادت میں وقت گزارتے۔ یوں وہ فجر کی نماز تک اس کام میں مصروف رہے۔ اس کے بعد واقدی گھر آگئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک آدمی پیغام لے کر آیا کہ آپ کو وزیر اعظم یحیٰ بن خالد برمکی نے بلایا ہے۔ وزیر اعظم نے واقدی سے کہا کہ امیر المومنین جب سے نماز فجر سے فارغ ہوئے ہیں اس وقت سے مسلسل رو رہے ہیں، 'ان امیر المومنین لم یزل باکیاً'۔ وہ ان تمام زیارات میں ساتھ جانے پر آپ کے بہت شکر گزار ہیں اور آپ کے لئے یہ 10 ہزار درہم بھیجے ہیں۔ واقدی نے وہ دس ہزار درہم قبول کر لئے اور جو قرضہ چلا آرہا تھا وہ ادا کیا۔ کچھ ضروریات کی تکمیل کی، کچھ کتابیں خریدیں اور یوں چند ہی مہینوں میں وہ رقم ختم ہوگئی۔

جب تنگدستی پیش آئی اور مزید رقم کی پھر ضرورت پڑی تو بیگم نے مشورہ دیا کہ وزیر اعظم سے آپ کا تعارف ہے۔ خلیفہ بھی آپ کو جانتا ہے۔ آپ بغداد جائیں اور کوشش کریں شاید کوئی فائدہ ہو۔ عورتیں ہی ہمیشہ تنگ کرتی ہیں۔ یہ بچارے تحقیق اور کتابیں چھوڑ کر بغداد کے لئے روانہ ہوگئے۔ بغداد جانے کے لئے بھی خاصی رقم درکار تھی۔ وہاں قیام کے لئے

بھی پیسے درکار تھے۔آپ کے پاس نہیں تھے۔کسی نہ کسی طرح بصرہ پہنچ گئے۔وہاں پیسے بالکل ہی ختم ہو گئے۔اتفاق سے وہاں سے فوجیوں کا کوئی کنوائے بغداد جا رہا تھا۔انہوں نے واقدی سے بصرہ آنے کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی بغداد جانا چاہتے ہیں۔فوجیوں نے واقدی کو بھی اپنے ساتھ کشتی میں سوار کر لیا اور بغداد کی طرف چل پڑے۔واقدی خود بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم انہوں نے میری اتنی خدمت کی کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی بھی اتنی خدمت نہیں کرتا ہوگا۔انہوں نے ان کو کھلایا پلایا اور بغداد میں جہاں ٹھرے ہوئے تھے وہاں ان کو بھی ٹھرا لیا۔اب واقدی نے اپنے یہاں آنے کا مقصد ان پر ظاہر کرنا عزت نفس کے خلاف سمجھا۔وہ پوچھتے تو واقدی مختلف عذر کرتے رہے کہ یہ کام ہے اور وہ کام ہے۔اسی اثنا میں ظاہر ہے لمبا سفر کر کے آئے تھے، کپڑے پرانے ہو گئے تھے۔ایک دن وزیر اعظم کے ہاں پہنچے تو کسی نے جانے ہی نہیں دیا۔عام طور سے لوگوں کو لباس اور حلیہ دیکھ کر تامل ہوتا ہے۔یہ روز جاتے تھے اور روز وزیر اعظم سے ملاقات کی کوشش کرتے تھے۔لیکن جب ملاقات کا موقع نہیں ملا تو مایوس ہو کر مدینہ منورہ واپس جانے لگے۔مدینہ منورہ کے راستے میں ایک منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے تو ان کے ایک دوست سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی جو فقیہ اور عالم تھے، اور مدینہ کے قاضی مقرر ہو کر جا رہے تھے۔جب انہوں نے واقدی سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے پوری داستان سنا دی۔دوست نے کہا کہ چلئے میں آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔وہ دوبارہ واپس ہوئے۔بغداد آئے اور وزیر اعظم سے ملاقات کروائی۔وزیر اعظم بہت خوش ہوئے اور چلتے ہوئے ان کو 500 درہم پیش کر دیئے۔انہوں نے اس رقم سے کچھ اپنی ضروریات پوری کیں۔اپنی حالت بہتر بنائی اور چار پانچ دن مزید وہاں رہے۔وزیر اعظم نے ان سے کہا کہ جب تک آپ یہاں ہیں تو مغرب کی نماز ہمارے ساتھ پڑھا کریں۔وہ روزانہ مغرب کی نماز پڑھنے وہاں جاتے اور واپسی پر یحییٰ بن خالد ان کو پانچ سو درہم دے دیا کرتے تھے۔اس دوران انہوں نے خلیفہ سے بھی واقدی کی ملاقات کروائی اور یاد دلایا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے آپ کے رہنما کے فرائض ادا کئے تھے۔خلیفہ نے بہت بڑی رقم ان کو دے دی اور اس کے بعد واقدی واپس آ گئے۔

یہ واقدی کا پس منظر ہے۔انہوں نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گزاری۔ابن ندیم

نے واقدی کی لکھی ہوئی 28 کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔واقدی نے بڑے بڑے اساتذہ سے کسب فیض کیا جن میں امام مالک اور معمر بن راشد بھی شامل ہیں۔معمر بن راشد وہی بزرگ ہیں جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔امام سفیان ثوری بھی ان کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ایک خاص بات ہمارے برصغیر کے لوگوں کے لئے یہ ہے کہ ہمارے سندھ کے ایک بزرگ ، ابومعشر نجیح السندھی، جو بڑے سیرت نگار تھے وہ بھی واقدی کے اساتذہ میں شامل تھے۔سندھ سے جا کر وہ مدینہ منورہ گئے تھے۔پھر بغداد میں رہے جہاں واقدی نے ان سے کسب فیض کیا۔

واقدی کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کے خاندانوں میں جایا کرتے تھے اور یہ پوچھتے تھے کہ کیا آپ کے خاندان میں کوئی ایسا شخص ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مغازی کا علم رکھتا ہو۔کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے آباواجداد میں کوئی شہید ہوا ہو۔کیا کوئی ایسا شخص ہے جس نے حضور کے ساتھ کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا حضور نے اس کو کسی مہم پر بھیجا ہو۔جب ایسا ہوتا تھا کہ فلاں خاندان میں کوئی شخص نکل آیا تو اس سے جا کر ملتے، واقعہ کی تفصیلات پوچھتے۔غزوہ کے موقع پر جا کر اس جگہ کا خود مطالعہ اور مشاہدہ کرتے تھے اور ان معلومات کا موازنہ اس علاقے سے کرتے تھے تا کہ ایک مکمل تصویر اور نقشہ ان کے سامنے آسکے۔یہ بات واقدی کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ انہوں نے محض نظری طور پر معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان مقامات کو دیکھنے کی کوشش کی اور ہر جگہ خود جا کر اس نقشہ اور اس جگہ کا معائنہ کیا۔وہاں جو بھی جغرافیائی چیزیں موجود ہوتیں ان سب کو ضبط تحریر میں لاتے اور اس جگہ کا مکمل نقشہ بناتے۔

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سخت گرمی کے موسم میں دیکھا کہ واقدی کے ایک ہاتھ میں کاغذات میں پلندہ ہے۔جیب میں قلم رکھا ہوا ہے اور کاندھے پر پانی کی چھوٹی سی مشک ہے اور تیز تیز کہیں جا رہے ہیں۔میں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں تو بتایا کہ آج ہی بعض صحابہ کرام کی اولادوں میں سے کچھ لوگوں سے غزوہ حنین کے بارے میں معلومات ملی ہیں۔میں حنین کا مقام دیکھنے جا رہا ہوں۔یاد رہے کہ حنین مکہ مکرمہ سے 70 یا 80 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اس روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدل جا رہے

ہوں گے۔ پیدل ایک دن میں تو نہیں پہنچے ہوں گے۔ دو تین دن جانے میں اور دو تین دن آنے میں لگے ہوں گے۔ ایک دو دن کام کے لئے رکے بھی ہوں گے تو گویا پورے ہفتہ دس دن کا یہ پروجیکٹ صرف ایک راوی کی روایات کی تصدیق کرنے کے لئے اور ایک غزوہ کا مقام دیکھنے کے لئے تھا۔

پھر جیسے جیسے یہ لکھتے جاتے تھے اس کو مرتب کرتے جاتے تھے۔ پھر اپنی مرتب کردہ تحریروں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کئی مورخین نے بیان کی ہے۔ بعض جدید مورخین اس کو ایک طرح سے پڑھتے ہیں میں دوسری طرح سے پڑھتا ہوں۔ ابن سید الناس نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قال ابراہیم الحربی، ابراہیم الحربی کہتے ہیں کہ میں نے فلاں صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ 'رایت الواقدی یوماً جالسا الی اسطوانة فی المسجد' کہ میں نے واقدی کو مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ 'وھو یُدرّس'، یہ لفظ ہے جس کو کچھ لوگوں نے تشدید سے پڑھا ہے 'وھو یدرّس'، یعنی وہ درس دے رہے تھے، پڑھا رہے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ 'ای شئی تدرس'، آپ کیا پڑھا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا 'حزبی من المغازی'، مغازی میں سے اپنی منزل۔ میرا خیال ہے یہ یُدرّس یا اُدَرِّس نہیں ہے بلکہ یدرُس ہے یعنی وہ اس کو پڑھ رہے تھے اور یاد کر رہے تھے۔ حزب یعنی ورد اپنے پڑھنے کا ہوتا ہے دوسروں کو پڑھانے کا نہیں ہوتا۔ اگر پڑھا رہے ہوتے تو آگے حلقہ بیٹھا ہوتا۔ اس میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ پوچھنے کی ضرورت تب ہوتی ہے جب آدمی آہستہ آہستہ اور تنہا پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس سے یہ لگتا ہے کہ وہ روزانہ تنہا بیٹھ کر مغازی کی اپنی منزل یاد کرتے تھے۔ جو جو لکھتے جاتے تھے اس کو زبانی یاد بھی کرتے جاتے تھے۔

اس طرح سے واقدی نے کتاب المغازی کے نام سے ایک بہت مفصل اور مربوط کتاب تیار کی۔ یہ کتاب مخطوطات کی شکل میں طویل عرصہ تک لوگوں کو دستیاب رہی اور تقریباً ہر دور کے سیرت نگاروں نے ان مخطوطات سے استفادہ کیا ہے۔ اس مخطوطہ کی طباعت کی نوبت انیسویں صدی کے وسط میں آئی۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ جو مخطوطہ شائع ہوا ہے یہ مکمل نہیں ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو edit کر کے

شائع کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ نامکمل ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکمل شکل میں ہم تک پہنچایا نامکمل شکل میں۔

اس وقت یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ کتاب کا آغاز ہجرت کے واقعات سے ہوتا ہے اور اس ابتدائی تمہید میں چند مہمات کے بعد غزوہ بدر کا ذکر ہے۔ یہ غزوہ تبوک کے بعد جیش اسامہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ غزوہ تبوک آخری غزوہ تھا اور جیش اسامہ وہ تھا جس کی تشکیل کا حکم حضور نے دیا تھا اور عمل درآمد سیدنا ابوبکر صدیق نے کروایا تھا۔ اس کی تفصیل پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مکمل کتاب ہو جس میں انہوں نے غزوات ہی کو بیان کیا ہو، اور اسی وجہ سے اس کا نام کتاب المغازی رکھا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ابتدائی ابواب ضائع ہو گئے ہوں اور ہم تک نہ پہنچے ہوں۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ پوری کتاب تین جلدوں پر مشتمل اور کوئی گیارہ بارہ سو صفحات پر محیط ہے۔ ایک ایک غزوہ کے بارے میں جتنی تفصیل وہ دے سکتے تھے اتنی تفصیل انہوں نے بیان کر دی ہے۔

غزوات کے ساتھ ساتھ دوسری بے شمار تفاصیل بھی واقدی کی اس کتاب میں موجود ہیں۔ عہد نبوی میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدات کا پس منظر کیا تھا۔ اگر کسی قبیلے نے دوسرے کسی دو قبیلوں کے درمیان ثالثی کرائی تو اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اگر کوئی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ہے تو اس کا تذکرہ ہے۔ جا بجا اس کے بھی اشارے ملتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حربی اور عسکری امور کے لئے سراغ رسانی کا جو شعبہ قائم کیا تھا وہ کیسے کام کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی غزوہ کے لئے جاتے تو پہلے آپ اس علاقہ اور دشمن کے بارہ میں مکمل معلومات جمع فرماتے۔ بعض صحابہ کرام کے بارے میں صراحت ہے کہ ان کو اس کام کے لئے بھیجا۔ بعض کے نام نہیں ہیں لیکن یہ ذکر ہے کہ حضور نے سراغ رساں بھیجے۔ پھر اس کا ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فوجوں کی تربیت کیسے کی۔ ان کی پریڈ اور قواعد کیسے ہوتی تھی۔ بعض دستے پٹرولنگ کے لئے مقرر کئے جاتے تھے کہ وہ گشت لگاتے رہیں اور خطرات کی نشاندہی کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے، جس کو آج کل counter intelligence کہتے ہیں اس کا بھی انتظام فرمایا۔ اپنے لئے معلومات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کے بارے میں بھی معلومات جمع کی جائیں اور

دشمن کو ہمارے بارے میں معلومات جمع کرنے سے روکا جائے۔ یہ پوری تفصیلات واقدی کے ہاں بہت تفصیل سے ملتی ہیں۔

تاریخ کے طالب علم کے نزدیک واقدی کی جو خوبی ہے وہ محدثین کے ہاں قابل اعتراض بات ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو پورے واقعہ کا مکمل نقشہ بیان کرنے سے پہلے تقریباً پچیس راویوں کے نام دے کر لکھتے ہیں کہ 'فكل حدثني من هذا بطائفه'، ان میں سے ہر ایک نے اس واقعہ کا ایک حصہ مجھ سے بیان کیا۔ 'وبعضهم اوعىٰ من بعض'، بعض لوگ جو حصہ بیان کرتے تھے ان کو بہت اچھی طرح یاد تھا، بعض کو یہ بات اچھی طرح یاد نہیں تھی۔ 'وغيرهم قد حدثني ايضاً' ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات نے یہ واقعات بیان کئے ہیں۔ 'فكتبت كل ماحدثني'، جو کچھ جس شخص نے بیان کیا میں نے وہ سب قلم بند کیا۔ 'فقالوا'، انہوں نے یہ کہا۔ اس کے بعد پھر ہجرت کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس تاریخ کو مدینہ منورہ میں قدم رنجہ ہوئے۔ کس وقت اور کس دن یہ واقعہ پیش آیا۔ واقدی نے خاص طور پر تاریخوں کا تعین کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ کون سا واقعہ کس دن اور کس تاریخ کو پیش آیا۔ کون سے غزوات اور سرایا کے لئے حضور کس وقت گھر سے نکلے۔ کس تاریخ کو نکلے۔ صبح کو نکلے کہ شام کو نکلے، ظہر کے وقت نکلے کہ عصر کے وقت نکلے۔ نماز پڑھ کر مدینہ منورہ سے نکلے یا پہلی منزل پر پہنچ کر نماز پڑھی۔ اس طرح کی جزوی تفصیلات کا واقدی نے بڑا اہتمام کیا ہے۔

واقدی نے شروع کے آٹھ دس صفحات میں پہلے تمام غزوات کا ایک خلاصہ دیا ہے۔ اس میں 27 غزوات اور 47 سرایا کا ذکر کیا ہے۔ یعنی 27 مہمات وہ تھیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے براہ راست شرکت فرمائی اور 47 دستے وہ تھے جو آپ نے مختلف صحابہ کرام کی سرکردگی میں بھیجے۔ تین مرتبہ حضور نے عمرہ فرمایا۔ یہ واقدی کی ایک رائے یا تحقیق ہے جس سے بہت سے محدثین اتفاق کرتے ہیں اور بعض محدثین اختلاف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اکثر محدثین اور سیرت نگاروں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے تین عمرے فرمائے۔

غزوہ بدر کا بیان واقدی کی کتاب کے 153 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ مفصل بیان سیرت کی کسی بھی کتاب میں نہیں ہے۔ حدیث اور سیرت کی کسی بھی کتاب میں

غزوہ بدر کا چار پانچ یا دس صفحات سے زیادہ کہیں نہیں ہے۔ واقدی نے چونکہ پوری زندگی اس کام میں لگائی۔ جو جو معلومات جمع ہو سکتی تھیں وہ جمع کیں۔ کفار مکہ کی طرف سے کون کون لڑنے کے لئے آیا۔ کون کون مرا، اس کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اس میں کوئی اختلاف ہے کہ نہیں ہے۔ صحابہ میں کون کون سے لوگ شہید ہوئے۔ اصحاب بدر کی مکمل فہرست قبیلہ کے لحاظ سے موجود ہے کہ فلاں صحابی فلاں قبیلہ سے تھے۔ اسلحہ کون کون سا تھا۔ گھوڑے کتنے تھے اور کس کس کے تھے۔ اونٹ کتنے تھے اور کس کس کے تھے۔ ہتھیار کس کس کے تھے۔ کون کون ہتھیار بند تھا اور کس کس کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ بہت منطقی ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے۔ غالباً وہاں اگر کوئی روئداد نویس بھی بیٹھا ہوتا تو شاید اتنی تفصیل اور ترتیب کے ساتھ نہ لکھ سکتا تھا جتنا واقدی نے ڈیڑھ سو سال بعد محنت کر کے ان واقعات کو جمع کیا ہے۔

اس کے بعد ایک اور اہم خدمت جو واقدی نے کی ہے۔ وہ غزوات اور سیر کا فقہی پہلو ہے۔ وہ خود بھی حدیث کے بڑے عالم تھے۔ اختلاف حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ قاضی بھی تھے، فقہ بھی جانتے تھے اور بین الاقوامی قانون پر کتاب لکھی تھی۔ اس لئے ان کو ان غزوات کے فقہی، دینی اور قانونی پہلوؤں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہر غزوہ اور ہر بڑے واقعہ کے بعد قرآن پاک میں اس پر جو تبصرہ آیا ہے وہ بھی نقل کیا ہے اور اس کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ مثلاً غزوہ بدر بیان کرنے کے بعد سورۃ انفال میں جہاں جہاں غزوہ بدر پر تبصرہ ہے، ان آیات کو نقل کیا ہے، ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے اور تفسیر بیان کرنے میں جہاں جہاں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے وہاں اس سوال کا جواب بھی دیا ہے۔ گویا سیرت قرآنی، جس کے بارے میں کل ڈاکٹر انیس صاحب نے کہا تھا کہ نیا رجحان ہے، اس پر بھی واقدی نے قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ گویا یہ رجحان واقدی کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی واقدی نے قرآن حکیم سے بھی واقعات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ چیز ان کی کتاب المغازی میں موجود ہے۔ پھر ہر جنگ اور ہر غزوہ کے بعد اس کے شرکا کے بارے میں جس حد تک معلومات ہو سکتی تھیں وہ بیان کی ہیں اور ان کے نام دے دیئے ہیں۔

واقدی کا انداز خالص مورخانہ ہے۔ انہوں نے ایک منطقی اور مرتب و مربوط انداز سے معاملات اور تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ پہلے وہ مآخذ اور حوالہ جات بیان کرتے ہیں۔ سب

کے نام بتاتے ہیں۔ واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ تاریخ اور محل وقوع کو بیان کرتے ہیں۔ متعلقہ معلومات دیتے ہیں کہ اس دستے کا سربراہ کون تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ خود سربراہی فرمارہے تھے تو مدینہ میں جانشینی کے لئے کس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ مسلمانوں کا شعار یعنی password کیا تھا۔ چونکہ برسر جنگ فریقوں کو کوئی خاص یونیفارم نہیں ہوتا تھا۔ حلیہ، لباس زبان سب کے ایک ہی جیسے تھے۔ خاص طور پر بڑی فوجوں کے درمیان جنگ کے مواقع پر رات کے وقت یہ تعین دشوار ہوتا تھا کہ اپنا کون ہے اور دشمن کون ہے۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ تھا کہ جب جنگ کے لئے نکلتے تھے تو ایک خفیہ لفظ متعین فرما کر سب سپاہیوں کو بتا دیتے تھے۔ واقدی نے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ ہر غزوہ کا پاس ورڈ کیا تھا۔ کسی میں 'یامنصور امت' تھا۔ کسی میں اس طرح کے دیگر الفاظ ہوا کرتے تھے۔

واقدی نے غزوات کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اور دیگر سیرت نگاروں کے بیان کردہ واقعات میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ واقعہ کا جو بنیادی حصہ ہے۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے جو اصل حقائق واقدی نے بیان کئے ہیں ان میں اور ابن اسحاق میں یا دیگر محدثین کے بیان کردہ واقعات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے تشریف لے گئے۔ 313 صحابہ ساتھ تھے۔ ابتدا میں خیال یہ تھا کہ قریش کے قافلہ سے مڈبھیڑ ہوگی۔ لیکن وہاں جا کر بدر کے مقام پر پتہ چلا کہ قافلہ نکل گیا اور اس کے دفاع کے لئے ایک ہزار افراد کا لشکر آرہا ہے۔ پھر حضور نے صحابہ کرام کو تیار کیا کہ مقابلہ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ کفار کے 70 سردار مارے گئے۔ صحابہ کرام میں بھی کچھ شہید ہوگئے۔ یہ گویا واقعہ کا خلاصہ ہے۔ واقدی کے بیانات سے بھی واقعہ کے اسی بنیادی خاکہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔

واقدی کے ہاں اس خاکہ میں رنگ بھرنے اور بقیہ تفصیلات فراہم کرنے کا اہتمام ہے۔ ان کی یہ تحقیق راویوں کے بیانات اور چشم دید گواہی پر مشتمل ہے۔ غزوہ بدر کس مقام پر ہوا۔ آج تو وہ مقامات خاصے بدل گئے۔ لیکن خاصے بدلنے کے باوجود بڑی حد تک آج بھی وہ جغرافیائی محل وقوع اسی طرح موجود ہے۔ لیکن واقدی کے زمانے میں بالکل ہی وہی شکل رہی ہوگی۔ اس لئے واقدی نے محل وقوع کی جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان کے قطعی اور یقینی ہونے

میں شک وشبہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ واقدی سے پہلے کے مورخین، مثلاً ابن اسحاق، عروہ بن زبیر یا امام زہری کے ہاں وہ تفصیلات نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ابن اسحٰق یا عروہ بن زبیر نے مختلف مہمات کی تاریخوں کے بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ واقدی نے اس بات کا اہتمام کیا کہ ہر غزوہ کی تاریخ اور اس کی ترتیب کے بارے میں بھی تحقیق کی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے احکام کے بارے میں تدریج کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جو احکام دیئے گئے اور جو قوانین نافذ کئے گئے وہ تدریج کے ساتھ دیئے گئے۔ اگر کوئی بڑی برائی تھی تو اس کو یک دم منع نہیں کیا گیا۔ پہلے اس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس کے بعد اس کو بعض صورتوں میں حرام قرار دے دیا گیا۔ پھر مزید بعض صورتوں میں حرام قرار دے دیا گیا۔ بالآخر مکمل طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ یہ تفصیل اسی وقت معلوم ہوسکتی ہے جب مختلف احکام کی تاریخ معلوم ہو۔ بعض احکام کی تاریخ تو نہیں معلوم، لیکن یہ معلوم ہے کہ فلاں حکم فلاں مہم کے دوران نازل ہوا۔ اگر اس مہم کی تاریخ معلوم ہو تو اس حکم کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وقائع نبوی میں اور غزوات نبوی میں تاریخ اور ترتیب کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ کام واقدی نے بڑی تحقیق کے ساتھ کیا ہے۔ اس مفید تحقیقی کاوش کے لئے امت کو واقدی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ ہر محقق کے کام سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض تاریخوں کے بارے میں بعد کے محققین نے واقدی سے اختلاف کیا اور دلیل کے ساتھ ثابت کیا کہ واقدی کی تحقیق اس معاملہ میں نظر ثانی کی محتاج ہے۔ اس طرح کے ایک دو واقعات بھی ملتے ہیں۔ غزوات کی تفصیلات کے ساتھ اس دور کے مدینہ منورہ اور اسلامی معاشرہ کے عام خصائص کی بابت قیمتی معلومات کتاب المغازی میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ واقدی کا مقصد تو وہ معلومات جمع کرنا نہیں تھا۔ لیکن ضمناً بہت ساری ایسی معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں جس سے اس دور کے مدینہ منورہ اور معاشرہ کے بارے میں بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر مدینہ منورہ میں زراعت کا نظام کیا تھا۔ کون کس زمین کا مالک تھا۔ کس کی زمین میں کیا کاشت ہوتا تھا۔ یہودیوں کے پاس کون کون سی زمینیں تھیں۔ کن کن قبائل کے ساتھ کون کون سے قبائل کی تجارت تھی۔ اس سے مدینہ منورہ کی زراعت اور تجارت کے بارے میں بہت سی معلومات

سامنے آجاتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں کھانے پینے کی عادات کیا تھیں۔ کس قسم کا کھانا کھایا جاتا تھا۔ اچھے، بااثر اور اہل ثروت لوگ کس طرح کا کھانا کھاتے تھے اور غریب اور بے سہارا لوگ کس قسم کا کھانا کھاتے تھے۔ پھر وہاں موجود مشرکین کن بتوں اور دیویوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کی الگ دیویاں اور الگ بت ہوتے تھے۔ بعض بت ایسے تھے جو بڑے سمجھے جاتے تھے اور کئی قبیلے مل کر اس کو پوجتے تھے۔ اس کے علاوہ قبیلوں کے الگ الگ بت اور دیویاں تھیں۔ یہ معلومات کوئی خاص دینی اہمیت نہیں رکھتیں، لیکن تاریخی دلچسپی کے پیش نظر واقدی نے ان کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔

پھر جو عام معاشرتی زندگی اور تمدنی اور ثقافتی امور ہیں، ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں واقدی کے ہاں معلومات ملتی ہیں۔ اس زمانے میں تجارتی کاروان کیسے جایا کرتے تھے۔ قافلے کیسے جاتے تھے۔ ظاہر ہے عرب کے لوگ دور دراز علاقوں کے سفر کے لئے قافلوں میں جایا کرتے تھے۔ رحلة الشتاء والصيف کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے۔ شام اور یمن تک تجارتی قافلے جایا کرتے تھے۔ یہ کیسے جاتے تھے۔ جب لاکھوں روپے کا سامان لے کر جا رہے ہوں گے تو اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے لئے جو تفصیلات واقدی نے دی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح آج کل ٹور آپریٹرز ہوتے ہیں اسی طرح کے ٹور آپریٹرز ہوا کرتے تھے جو بڑے پیمانے پر اونٹ تیار رکھتے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لئے باقاعدہ کل وقتی اور جز وقتی ملازمین ہوتے تھے۔ ان کے پاس راستہ بتانے والے لوگ ہوتے تھے۔ سپلائی کا سامان وہ ساتھ بھیجا کرتے تھے۔ پانی کا انتظام ساتھ ہوتا تھا اور مسافروں سے پیشگی معاوضہ لے کر منزل پر پہنچا دیا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات جو پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں، ان کو جمع کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ طریقہ کار رائج تھا۔

واقدی نے جو معلومات جمع کی ہیں، ان کے بارے میں محدثین کے تحفظات اور ملاحظات کے باوجود عام طور پر سیرت نگاروں نے واقدی کی جمع کردہ ان تفصیلات کو قبول کیا ہے۔ ایک مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ واقدی نے سیرت اور غزوات کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کے بیشتر حصہ کی تائید حدیث کی کتابوں سے ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مسند

امام احمد میں بہت سی ایسی احادیث ہیں جو واقدی کے ان بیانات کی تائید کرتی ہیں جن کی عام کتب حدیث سے تائید نہیں ہوتی۔

محدثین کا جو اعتراض تھا کہ واقدی اور ان کی طرح دوسرے لوگ بہت سے راویوں کے بہت سے بیانات کو یک جا کر کے بیان کرتے ہیں۔ اِس پر اُس زمانے میں بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا۔ واقدی کے تلامذہ بھی یہ اعتراض کرتے تھے۔ ابن سید الناس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واقدی اپنے تلامذہ کے حلقہ میں غزوات کے بارے میں کوئی درس دے رہے تھے۔ بعض طلبہ نے کہا کہ یہ طریقہ کار ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے کہ آپ پچیس راویوں کے نام لے لیتے ہیں اور ان سب کی مشترکہ معلومات کو ایک بیان کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہر راوی کے حالات اور اس کی فراہم کردہ روایات و معلومات کو الگ الگ بیان کریں۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، لیکن اس طرح درس بہت طویل ہوا کرے گا اور وقت بھی بہت صرف ہوگا۔ طلبہ نے کہا: کوئی بات نہیں ہمیں منظور ہے۔ واقدی نے کہا: آپ مجھے ایک ہفتہ کی مہلت دے دیں۔ اگلے ہفتہ آیئے گا تو میں اس طرح پڑھا دوں گا۔ اگلے ہفتہ طلبہ آئے۔ طلبہ کہتے ہیں کہ 'غاب عنا جمعةً' پورے ہفتہ تک ہمارے پاس نہیں آئے۔ 'ثم اتانا بغزوة احد' پھر غزوہ احد پڑھانے کے لئے آئے۔ 'بعشرين مجلداً' بیس جلدوں کے ساتھ۔ یعنی بیس جلدیں لے کر آئے اور کہا کہ یہ غزوہ احد کے بارہ میں تمام رایوں کے الگ الگ بیانات کا مجموعہ ہے۔ ایک اور راوی نے بیان کیا کہ سو جلدیں لے کر آئے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ بتایا کہ ہر جلد میں ایک راوی کے حالات و روایات میں نے الگ الگ بیان کیے ہیں۔ تو غزوہ احد اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو یہ بیس جلدیں آپ کو سناؤں گا۔ ہم نے کہا کہ 'رُدنا الى الطريق الاول' نہیں وہ پہلے والا طریقہ ٹھیک ہے۔ آپ اسی طرح پڑھائیں۔

ہمارے ہاں بہت سے لوگ محدثین کرام کے تحفظات کو بیان کرنے میں بے احتیاطی کرتے ہیں۔ محدثین کرام کے تحفظات اپنی جگہ سر آنکھوں پر۔ محدثین نے واقدی کے بارے میں بھی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ محدثین واقدی کے تمام ذخیرہ معلومات ناقابل اعتماد سمجھتے تھے۔ خود امام مالک نے بعض جگہ واقدی کے بارے میں تحفظ کا اظہار کیا ہے۔ ظاہر ہے امام مالک حدیث کے سب سے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔ انہوں نے

بھی انہی تحفظات کا اظہار کیا جن کا اظہار بقیہ محدثین کرتے تھے۔لیکن کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ امام مالک کو سیرت کے کسی معاملے پر کسی رہنمائی کی ضرورت پڑی تو انہوں نے واقدی ہی سے پوچھا۔ایک مرتبہ امام مالک پڑھا رہے تھے، ان کے حلقۂ درس میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی جادوگر جادو کے زور سے کسی کو قتل کردے تو اس کی سزا کیا ہونی چاہئے۔ یہ ایک خالص قانونی سوال ہے۔اس پر غور کیا گیا تو زیر بحث یہ آیا کہ مشہور ہے کہ ایک یہودی عورت نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کرنے کی کوشش کی تھی۔اگر یہ حقیقت ہے تو اس واقعہ میں کیا ہوا تھا؟ کیا حضور ﷺ نے اس عورت کو کوئی سزا دی تھی یا نہیں۔امام مالک نے کہا کہ اچھا میں اہل علم سے مشورہ کرکے بتاؤں گا۔امام مالک نے واقدی کو خط لکھا۔واقدی نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔امام مالک نے بعد میں اپنے شاگردوں کو بتایا کہ 'سئلت اہل العلم' ، میں نے اہل علم سے پوچھا ہے۔ 'فاخبرونی انہ قتلہا' ، اور انہوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو سزائے موت دی تھی۔اس لئے اگر ایک جادوگر جادو کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو اس کی سزا سزائے موت ہوسکتی ہے۔واقدی کے طرز روایت کے بارے میں یہی بات امام احمد نے بھی فرمائی۔امام احمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو واقدی پر کیا اعتراض ہے۔آپ نے فرمایا 'انما انکر علیه جمعه الاسانيدو مجيئه بالمتن واحدا' ، میں جس چیز کو ناپسند کرتا ہوں وہ تمام سندوں کو ایک جگہ جمع کرنا اور پھر ان کو ایک متن میں بیان کرنا ہے۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محدث ابراہیم الحربی نے کہا ہے کہ ایسا کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ اسلوب اپنایا ہے۔

ایک اور بات ایک بہت بڑے آدمی نے کہی ہے میں تو نہیں کہہ سکتا۔ابن سید الناس نے کہی ہے۔ایک حد تک درست بھی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ جب ایک آدمی بہت زیادہ لکھتا ہے تو بعض باتیں عام ڈگر سے ہٹ کر بھی کہہ جاتا ہے۔جب عام ڈگر سے ہٹ کر وہ کوئی بات کہتا ہے تو پھر اعتراض بھی ہوتا ہے اور اعتراض کرنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔کچھ لوگ سخت اعتراض کرتے ہیں اور کچھ نرمی بھی کر لیتے ہیں۔چونکہ واقدی نے بہت لکھا۔اس میں بعض ایسی تفصیلات بھی آگئیں جو عام ڈگر سے ہٹ کر تھیں۔لوگوں نے اس کو عجیب سمجھا۔عام لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ان کے مزاج سے ہٹ کر کوئی بات کی جائے تو وہ اس

کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو نا قابل اعتنا سمجھتے ہیں اس لئے واقدی کو بھی قابل اعتراض سمجھا گیا۔

واقدی کی یہ کتاب، یعنی کتاب المغازی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں 1855 میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی اشاعت میں بہت دلچسپی لی۔ یہ وہی ڈاکٹر اسپرنگر ہیں جو کلکتہ میں رہتے تھے اور مشہور محقق اور مستشرق تھے۔ جن کی علمی خدمات کا بہت سے لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے حافظ ابن حجر کی الاصابہ کی بھی مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔

جرمن مستشرق ول ہاوزن نے اس کا جرمن ترجمہ بھی کیا۔ یہ 1882 میں چھپا۔ جرمن ترجمہ ول ہاؤزن نے کس معیار کا کیا میں نہیں جانتا، کیونکہ میں جرمن زبان سے بخوبی واقف نہیں ہوں۔ لیکن بعض مستشرقین نے اس ترجمہ کی بنیاد پر ایک دلچسپ بات لکھ دی۔ اس پر 25-1920 میں ہندوستان میں بڑی بحث وتمحیص ہوئی۔ مارگولیتھ ایک مشہور مستشرق ہیں۔ انہوں نے سیرت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے لکھا، نقل کفر کفر نہ باشد۔ میں ان کی بات کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ بہادر نہیں تھے۔ اُس نے اور لفظ بولا تھا میں اس کو دوسرے الفاظ میں بیان کرر ہا ہوں۔ اس دعوی کی تائید میں انہوں نے کہا کہ غزوہ بدر میں حضور نے جونہی خون کا پہلا چھینٹا دیکھا تو آپ خوف سے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ جنگ ہو رہی ہے۔

اب یہ بات تو ہر کسی کے علم میں ہے کہ حضور نے ہر جنگ میں قائدانہ حصہ لیا۔ اسلام سے پہلے بھی ایک معرکہ میں شرکت فرمائی تھی۔ یہ بات جو مارگولیتھ نے کہی یہ کسی بھی سیرت نگار نے یا حضور کے قریب رہنے والے لوگوں میں سے کسی نے بھی نہیں کہی۔ بلکہ ہر ایک نے یہی گواہی دی کہ حضور اشجع الناس تھے۔ بہادر ترین تھے۔ جنگ میں صحابہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی حفاظت کے لئے حضور کے پاس جا کھڑے ہوتے تھے۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور ﷺ تن تنہا دشمن کی خبر لینے چلے گئے۔ ایک زمانے میں مدینہ منورہ شدید خطرے کی زد میں تھا۔ صحابہ کرام راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے باہر سے کسی شور کو آتے سنا۔ پہرے داروں نے یہ سمجھا کہ شاید حملہ ہو رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی جائے۔ کسی نے کہا

کہ نہ دی جائے۔ پہلے جا کر دیکھ لیں کہ واقعہ کیا ہے۔ ابھی لوگ یہ طے کر رہے تھے کہ جدھر سے شور آرہا تھا دیکھا کہ اسی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آرہا ہے۔ قریب آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خود گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور کہہ رہے تھے کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ آیا ہوں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس طرح کے واقعات کی روشنی میں یہ بات اس نے کیسے کہی کہ غزوہ بدر کے موقع پر آپ نعوذ باللہ خوف سے بے ہوش ہو گئے۔

اس بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مارگولیتھ کو خط لکھا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات میں نے ول ہاؤزن کے ترجمے سے لی ہے۔ ول ہاؤزن کے ترجمے میں انہوں نے دیکھا تو واقعی اس نے یہی لکھا تھا۔ ولہاؤزن نے دعویٰ کیا کہ واقدی نے بھی یہی لکھا ہے۔ واقدی نے وہی لکھا ہے جو عام سیرت نگار بیان کرتے ہیں۔ اس کا قرآن پاک میں بھی ذکر ہے کہ جس وقت غزوہ بدر شروع ہونے والا تھا تو 'اذ یغشیکم النعاس' تم پر ایک نیند کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور اللہ تعالیٰ نے تم کو مدد کی بشارت دے دی۔ ہوا یہ تھا کہ صحابہ کرام کے مشورہ سے رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک چھوٹی سی چٹان پر ایک چھپر بنا دیا گیا تھا۔ آپ اور حضرت ابوبکر صدیق اس چھپر پر تشریف فرما تھے۔ فجر کی نماز کے بعد سے حضور دعا میں مصروف تھے۔ تمام رات فوجوں کی ترتیب میں مصروف رہے تھے۔ فوجوں کی صف بندی اور جنگ کی منصوبہ بندی میں ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔ آپ کا حکم تھا کہ جب تک میں نہ کہوں آپ میں سے کوئی جنگ شروع نہ کرے۔ یہ کہہ کر حضور اپنے عریش پر تشریف لے گئے۔ یہ مسلم فوج کے پیچھے تھا۔ سامنے مسلمان فوج تھی۔ وہاں حضور مسلسل دعا میں مصروف رہے۔ ابھی سورج نکلنے ہی والا تھا کہ حضور کو ہلکی سی اونگھ آ گئی۔ 'فغشیہ النوم'، یہ واقدی کے الفاظ ہیں کہ آپ کو نیند نے آلیا۔ اسی اثنا میں، جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نیند کا ایک جھونکا آیا، کفار قریش نے تیر اندازی شروع کر دی۔ اس سے بعض مسلمان زخمی ہوئے اور خون بہہ نکلا۔ جب حضور کو اطلاع ہوئی کہ کفار نے حملہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کا خون بہہ نکلا ہے تو حضور ایک دم سے گھبرا کر اٹھے۔ یہ عبارت ہے جس کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا کہ غشی آ گئی اور بے ہوش ہو گئے اور گھبرا کر اٹھے گویا ڈر کر اٹھے، یوں 'گھبرا کر' کو 'ڈر کر' کر دیا۔ ممکن ہے ول ہاؤزن کا سارا ہی ترجمہ ایسا ہو، میں نہیں جانتا۔ لیکن واقدی کی اس سادہ سی عبارت کے اس ترجمہ سے یہ غلط فہمی پیدا

ہوئی اور ایک طویل عرصہ تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ واقدی کی کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی بہت پہلے ترجمہ ہوا تھا جو کہ شائع شدہ موجود ہے۔

واقدی کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام محمد بن سعد کا ہے جن کی کتاب طبقات ابن سعد کی طرف میں پہلے مختصر اشارہ کر چکا ہوں۔ محمد بن سعد اپنے استاد سے زیادہ مستند سمجھے گئے۔ اپنی تحقیق کے معیار اور علمی سطح کے اعتبار سے ان کو نسبتۂ زیادہ اونچا مقام ملا۔ انہوں نے سیرت، تذکرہ اور صحابہ کی سوانح عمری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے دلائل نبوت پر مواد جمع کیا۔ حضور کے معجزات اور نبوت کے دلائل پر وقیع معلومات جمع کئے۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے شمائل نبوی پر سب سے پہلے اتنا بڑا مجموعہ فراہم کیا۔

طبقات ابن سعد کو ایڈورڈ سخاؤ نے ایک ٹیم کے ساتھ ایڈٹ کیا تھا۔ اس ٹیم نے ۱۹۰۳ء میں اس کام کو شروع کیا اور کئی سال تصحیح کے کام میں صرف کر کے اس پوری کتاب کو مکمل کیا۔ اس ٹیم میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔ جوزف ہورووٹس کا میں ذکر کر چکا ہوں وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ بروکلمان جو مشہور مورخ اور تاریخ نویس ہے اور جس کی کتاب تین چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ ان لوگوں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن آٹھ جلدوں میں مرتب کیا۔ طبقات ابن سعد سیرت کے بارے میں معلومات کے مستند ترین اور جامع ترین خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ ابن سعد نے بھی بقیہ کتابوں کی طرح تخلیق آدم سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔ حضور سے پہلے کے انبیا کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ اکثر اسرائیلیات سے لی گئی ہیں۔ اسرائیلیات کے بارے میں علماء کی رائے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسرائیلیات کا وہ حصہ جو قرآن پاک اور سنت کے بیانات کے مطابق ہے وہ قابل قبول ہے۔ جو قرآن وسنت کے بیانات کے مطابق نہیں وہ نا قابل قبول ہے۔ ظاہر ہے کہ ابن سعد اور واقدی نے ایسی کوئی چیز نہیں لی جو صراحتاً قرآن وسنت سے متعارض ہو۔ البتہ ایسی کوئی چیز جس کے بارے میں قرآن وسنت میں نہ کوئی منفی بات ہو نہ مثبت، تو ایسی باتوں کے بارے میں اختلاف رائے رہا ہے کہ ان کو قبول کیا جائے کہ نہیں۔ کچھ لوگوں نے اس کو قبول کرنے اور بیان کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ کچھ لوگوں نے اس کو بیان کرنے میں حرج سمجھا۔ ابن سعد اول الذکر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور

انہوں نے ایسے مواد کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

ابن سعد نے ایک بات کی طرف بالواسطہ طور پر اشارہ کیا ہے۔ یہ اشارہ دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے علامہ اقبال کے حوالہ سے کہی تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیا کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تمہید تھی۔ اس لئے نبوت خاتم الانبیاء کو یعنی ختم نبوت کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہیدی نبوتوں کا بھی بیان کیا جائے۔ تمہیدی نبوتوں کے بیان سے ختم نبوت کی عظمت اور حقیقت مکمل طور پر سامنے آسکتی ہے، اس لئے تمام انبیا کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے۔ یہی بات علامہ اقبال نے یوں کہی تھی کہ

All previouse prophets were Muhammad in the making.

ابن سعد کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے فرامین، احکام اور وثائق کا ایک بڑا مجموعہ اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ یہ مجموعہ دراصل ان کے استاد واقدی نے جمع کیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ میں نے یہ فرامین اپنے استاد واقدی سے لئے ہیں۔ واضح رہے کہ واقدی نے جہاں جہاں سے ان فرامین و دستاویزات کی نقل کی ہے تو انہوں نے اصل فرامین سے نقل کی ہے اور یہ کہ واقدی کا بیان ہے کہ انہوں نے اصل فرامین خود دیکھے تھے۔ تب انہوں نے ان کی نقلیں بنائیں۔

ابن سعد کے اساتذہ میں واقدی کے علاوہ مشہور فقیہ اور محدث سفیان بن عیینہ بھی شامل ہیں۔ وکیع بن الجراح جو امام بخاری کے اساتذہ اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں، وہ بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ فضل بن دکین مشہور محدث ہیں وہ بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ سفیان بن حرب بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ان حضرات کے علاوہ ابن سعد نے موسیٰ بن عقبہ اور ہمارے سندھ کے سیرت نگار ابو معشر نجیح السندی کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا۔ ابن اسحاق کی سیرت بھی ان کے سامنے تھی۔ جہاں تک اسرائیلیات کے مواد کا تعلق ہے تو وہ اکثر و بیشتر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی سے ماخوذ ہے جن کا درجۂ استناد محدثین کی نظر میں زیادہ بھروسہ کے قابل نہیں ہے۔ محدثین کی بڑی تعداد نے

ابن سعد کو ثقہ اور حافظ قرار دیا ہے۔ بعض محدثین نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ خطیب بغدادی نے ان تمام محدثین کے اقوال الگ الگ جمع کر دیئے ہیں جو ابن سعد کی تائید کرتے ہیں یا ان پر تنقید کرتے ہیں۔ متاخر دور کے دو بڑے محدثین، خطیب بغدادی اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں ابن سعد کو ثقہ اور قابل اعتماد مانتے ہیں۔ امام سخاوی جو متاخر دور کے بڑے مورخین اور محدثین میں سے ہیں انہوں نے بھی ابن سعد کی ثقاہت کی تعریف وتصدیق کی ہے۔

ابن سعد سیرت نگار اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے۔ ایک مرتبہ مامون نے کسی اہم معاملہ میں مشورے کے لیئے سات بڑے فقہا کو بلایا تھا۔ ان میں ابن سعد بھی شامل تھے۔ وہ فقیہ اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ قرات میں بھی درک رکھتے تھے۔ علم انساب کی بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انساب اس دور میں تاریخ کا اہم حصہ تھا۔ اس کو جانے بغیر تاریخ سے واقفیت مشکل ہوتی تھی۔

طبقات ابن سعد کی پہلی دو جلدیں سیرت کے بارے میں ہیں۔ بقیہ دو جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے حالات بیان کئے ہیں۔ صحابہ کے حالات بیان کرنے میں انہوں نے حضرت عمر فاروق کی ترتیب کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے جب دیوان مرتب کیا۔ سپاہیوں کی فہرستیں بنائیں۔ تو پہلے وہ صحابہ شامل کئے جو حضور کے خاندان کے تھے۔ پھر وہ جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے قریب کی رشتہ داری رکھتے تھے۔ پھر وہ جو ان کے بعد حضور سے قرب رکھتے تھے۔ حضور کی قرابت کی نسبت سے انہوں نے فہرست بنائی تھی۔ ابن سعد نے بھی یہی ترتیب رکھی ہے۔ سب سے پہلے خاندان بنی ہاشم کو رکھا ہے۔ بنی ہاشم میں السابقون الاولون کو پہلے رکھا ہے۔ پھر بدری صحابہ کو اور پھر بقیہ صحابہ کو رکھا ہے۔ ترتیب مکانی کا بھی لحاظ کیا ہے۔ ترتیب زمانی کے بعد ترتیب مکانی یعنی مختلف شہروں کے حساب سے بیان کیا ہے۔ جب صحابی کا ذکر پہلی مرتبہ آتا ہے تو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ جب کسی اور موقع کے حوالہ سے تذکرہ آتا ہے تو بتا دیتے ہیں کہ میں پہلے فلاں جگہ بیان کر چکا ہوں۔

طبقات ابن سعد ہر دور میں مستند ماخذ سمجھی گئی۔ بعد میں بھی جن لوگوں نے صحابہ کرام کے تذکرہ یا اسلامی تاریخ پر کتابیں لکھیں، ان سب نے ابن سعد سے استفادہ کیا۔ ابن سعد

سے استفادہ کرنے والوں میں بلاذری جیسے ثقہ اور قابل اعتماد مؤرخین بھی شامل ہیں۔کل میں نے صحابہ کرام کے بارے میں تین بڑی کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ان میں سے دو کتابیں ابن سعد سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہیں۔ان میں سے ایک ابن اثیر ہیں جن اسد الغابہ مشہور ہے، اور دوسرے حافظ ابن حجر ہیں جن کی کتاب الاصابہ اس موضوع کی مستندترین کتابوں میں سے ہے۔ان کے علاوہ بھی بقیہ محدثین و مورخین، ابن کثیر، ذہبی اور ابن عساکر جن تاریخ دمشق کا کل ذکر آیا تھا، ان سب حضرات نے ابن سعد سے استفادہ کیا ہے۔

ابن سعد کے بعد سیرت نگاروں میں جو نام سب سے نمایاں ہے وہ ابن ہشام کا ہے۔ ابو محمد عبدالملک ابن ہشام یمن کے رہنے والے تھے۔ایک واسطہ سے ابن اسحاق کے شاگرد تھے۔عجیب بات ہے کہ بنیادی کام ابن اسحٰق نے کیا۔سیرت پر ابن اسحٰق کا کام بہت بڑا ہے۔ لیکن ان کی کتاب کو اتنی شہرت حاصل نہ ہوئی جو ابن ہشام کی کتاب کو ہوئی۔ابن ہشام نے اس کتاب کا نسخہ اپنے استاد زیاد بن عبداللہ البکائی کے ذریعے حاصل کیا۔اس پر کام کیا، محنت کی اور اس کا ایک نیا نسخہ تیار کیا۔وہ نسخہ اتنا مقبول ہوا کہ لوگوں نے ابن اسحٰق کی اصل کتاب کو چھوڑ دیا اور ابن ہشام کی کتاب نے اصل کتاب کی جگہ لے لی۔ابن ہشام نے اتنا غیر معمولی کام کیا تھا کہ آج سیرت پر مستندترین، جامع ترین اور قدیم ترین کتاب انہی کی ہے۔یہ اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے محدث بھی تھے، فقیہ بھی تھے، مورخ بھی تھے اور ادیب اور شاعر بھی تھے۔ادب اور شعر میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔اپنے زمانے کے جید ترین علما سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ جو قرآنی ادبیات اور لسانیات کے ماہر تھے، ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔انہوں نے قرآن کے مجاز پر، قرآن کے غرائب اور مشکل الفاظ پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ابو عبیدہ کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ امام بخاری نے ان کی کتاب کا بیشتر حصہ اپنی کتاب صحیح بخاری میں شامل کر لیا ہے۔امام بخاری جہاں کسی حدیث میں موجود مشکل لفظ کے معنی بیان کرتے ہیں یا کسی آیت کی لغوی یا لسانی تشریح کرتے ہیں یا کوئی اور ایسی بات بیان کرتے ہیں جس کا تعلق لغت اور ادب سے ہو تو ابو عبیدہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔افسوس کہ بعض مستشرقین نے چند معمولی اور غیر اہم باتوں کو بنیاد بنا کر ابو عبیدہ کے کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور سیرت نگار جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے یعنی محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم جو حضور کی طرف سے یمن بھیجے گئے گورنر کے پوتے تھے۔ وہ بھی ابن ہشام کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ابن ہشام کے اپنے والد اور دادا بھی صاحب علم تھے۔ تاریخ کا ذوق رکھتے تھے۔ یقیناً تاریخ کا ذوق ان کو باپ اور دادا سے ہی ملا ہوگا۔

ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق کا تفصیل سے جائزہ لیا اور اس کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ سیرت ابن اسحٰق کے بارے میں کل میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک کا عنوان تھا کتاب المبتدأ، جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور کی ولادت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ تھا المبعث، اس میں حضور کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے واقعات ہیں۔ تیسرا حصہ المغازی تھا جس میں ہجرت سے لے کر وفات تک کے تمام غزوات کی تفصیلات اور واقعات ہیں۔ اس کتاب میں ابن اسحٰق نے مختلف ذرائع سے ملنے والی تمام معلومات جمع کر دیں۔ یقیناً یہ کتاب بہت ضخیم تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی ضخیم تھی کیونکہ اس وقت اس کے ایک نسخہ کا جزوی حصہ ملا ہے۔ وہ شائع ہوا ہے، لیکن اصل کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ شروع کے کئی سو سال تک وہ علمی حلقوں میں متداول رہی۔ بہت سے اہل علم کو حاصل تھی۔ انہوں نے اس کے حوالے دیئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سقوط بغداد کے موقع پر جب بہت سے کتب خانوں کو ضائع کر کے دریا برد کر دیا گیا اور اس میں لاکھوں کتابیں ضائع ہوئیں۔ ابن اسحٰق کی کتاب بھی شاید اسی افراتفری میں ضائع ہوگئی۔ ابن ہشام نے اس کتاب کا جائزہ لیا اور اس کا ایک نیا نسخہ تیار کیا۔ پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ المبتدأ کے نام سے جو پہلی جلد تھی وہ قریب قریب پوری ہی نکال دی۔ ابن ہشام نے خود مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابن اسحٰق نے بہت سی ایسی چیزیں بیان کر دی تھیں جن کا حضور کی سیرت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب سابقہ انبیا میں بنی اسرائیل کے واقعات، حضرت موسیٰ کے بعد کون کون سے نبی آئے، ان کی زندگی کیسی تھی، یہ ساری معلومات انہوں نے یہودی عیسائی مآخذ سے لے کر بیان کی تھیں۔ ان معلومات کا براہ راست حضور کی سیرت کو سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر یہ سب اسرائیلیات تھیں جن کا بڑا حصہ کلبی کی روایات کی بنیاد پر لیا گیا تھا۔ کلبی کے بیانات اور اسرائیلیات دونوں کے مستند یا غیر مستند ہونے کے بارے میں کچھ سوالات ہمیشہ موجود رہے

ہیں۔ اس لئے ابن ہشام کی رائے میں اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے اس تمام حصہ کا اختصار کے ساتھ خلاصہ دے دیا جس سے اجمالاً یہ اندازہ ہو جائے کہ بقیہ انبیا کون کون تھے اور باقی حصہ حذف کر دیا۔ پھر حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام اور حضور کے جد امجد معد بن عدنان تک چند صفحات میں تلخیص دی ہے اور یوں پوری جلد کو آٹھ دس صفحات میں ملخص کر کے باقی مباحث کو نکال دیا۔

ابن ہشام نے دوسرا کام یہ کیا کہ ابن اسحٰق کے کام کے ادبی حصہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔ ابن اسحاق نے جو معلومات جمع کی تھیں تو ان میں بہت سے اشعار اور قصائد بھی بیان کئے تھے۔ یہ قصائد وہ تھے جو مختلف جنگوں اور معرکوں کے موقع پر مختلف شعرا نے لکھے تھے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک شاعر ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے قبیلے کے کارناموں کو بلکہ دوسرے قبائل کی کمزوریوں کو قصائد کی صورت میں بیان کیا کرتا تھا۔ یہ سارا ذخیرہ سیرت سے متعلق تو نہیں تھا لیکن سیرت کے دوران وجود میں آیا تھا جس کو ابن اسحٰق نے اپنی سیرت میں شامل کر لیا تھا۔ ابن اسحاق خود ادیب یا شاعر نہیں تھے اس لئے ان کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ کون سے اشعار حقیقی ہیں اور کون سے منسوب یا الحاقی ہیں۔ بہت سے اشعار بعد میں بھی غلط طور پر مختلف شاعروں سے منسوب ہو گئے۔ بعض اوقات کسی قصیدہ میں بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے اشعار لگائے اور ہر ایک نے تک بندی کی۔ اصل شاعر نے شاید پانچ شعروں کی نظم کہی ہوگی۔ ہوتے ہوتے وہ بیس پچیس شعر ہو گئے۔ اب اساتذہ اور ماہرین فن کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنا حصہ اصلی اور کتنا حصہ الحاقی ہے۔ یہ اندازہ ابن اسحٰق کو نہیں ہوا۔ انہوں نے جو سنا وہ اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ ابن ہشام خود بڑے ادیب اور نحوی تھے۔ ابوعبیدہ جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا۔ خلف الاحمر جیسے ماہر شعریات کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ انہوں نے غیر مستند اور غیر ضروری اشعار کو نکال دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ابن ہشام نے ایک اور کام یہ کیا کہ ایسے اشعار اور قصائد جن سے بعد میں چل کر کوئی بدمزگی پیدا ہو سکتی تھی ان کو بھی نکال دیا۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر میں قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل بھی لڑنے کے لئے آئے تھے۔ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے اور صحابہ کرام میں بڑا نمایاں مقام حاصل کیا۔ بہت سی فتوحات میں شریک رہے۔ حضور ﷺ کو

جب اطلاع ملی کہ عکرمہ اسلام قبول کرنے آ رہے ہیں تو آپؐ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ عکرمہ کی موجودگی میں کوئی شخص ان کے باپ کو برا نہ کہے۔ یہ بات حضور علیہ السلام اس شخص کے بارے میں فرما رہے تھے جس کو حضور نے اپنی امت کا فرعون قرار دیا تھا۔ اب ابن ہشام نے کہا کہ اگر کسی نے شاعری میں عکرمہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے تو بعد میں ان اشعار کو دہرانے اور بیان کرنے سے بدمزگی ہی پیدا ہوگی۔ صحابہ کرام کی اولاد میں سے جو بدر یین کی اولاد ہے وہ عکرمہ پر تنقید کرے گی۔ کسی نے جواب دے دیا تو مزید بدمزگی پیدا ہوگی اس لئے میں نے وہ حصہ حذف کر دیا۔ یہ اچھی بات تھی۔ ممکن ہے کسی کو اس سے اختلاف ہو لیکن ابن ہشام کا جذبہ بہت اچھا تھا۔

بعض اشعار ثقاہت سے گرے ہوئے اور غیر معیاری تھے وہ بھی حذف کر دیئے گئے۔ غیر معیاری اشعار سے مراد کسی پر اخلاقی لحاظ سے ایسا حملہ کرنا تھا جو بیان کرنا مناسب نہ ہو۔ ایسے اشعار بھی حذف کر دیئے گئے۔ اسی طرح سے ابن اسحٰق نے جزوی طور پر جگہ جگہ بعض ایسی معلومات بیان کر دی تھیں جن کے بارے میں ابن ہشام کا خیال تھا کہ وہ براہ راست سیرت سے متعلق نہیں تھیں۔ اس لئے جب پڑھنے والا پڑھتا تھا تو سیرت کے واقعات میں تسلسل نہیں رہتا تھا۔ تو وہ واقعات بھی انہوں نے نکال دیئے ہیں۔ پھر ابن ہشام نے اس کے ساتھ ساتھ بعض جگہ حواشی اور اپنے فٹ نوٹس کا بھی اضافہ کیا ہے۔ فٹ نوٹس بلکہ اضافے صفحات کے آخر میں نہیں متن کے اندر ہیں۔ لیکن قال ابن ہشام سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے اپنے نوٹس ہیں۔ جہاں کوئی مشکل لفظ ہے وہاں اس کی تشریح کر دی ہے۔ کوئی شعر یا قصیدہ ہے تو اس کے بارہ میں یہ بتا دیا ہے کہ اس کا شعری مقام اور مرتبہ پر تبصرہ کیا ہے۔ کہیں کچھ اشعار غلط طور پر منسوب ہو گئے ہیں تو کہا گیا ہے کہ یہ اشعار فلاں کے نہیں بلکہ فلاں کے ہیں۔ کوئی بات عام طور پر مشہور ہے لیکن صحیح نہیں ہے تو ابن ہشام نے تصحیح کی ہے کہ صحیح بات اس طرح ہے۔ غرض یہ سارا کام ابن ہشام نے کیا اور ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جس کے بارہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسبۃً مختصر بھی ہے، مستند بھی ہے اور ضروری معلومات کے اعتبار سے مکمل بھی ہے۔

ابن ہشام کا یہ کام اتنا مفید اور اچھا تھا کہ عام لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ جتنی

مقبولیت اصل کتاب کو حاصل ہوئی تھی اس سے کہیں بڑھ کر مقبولیت اس کے اس ملخص اور مہذب ایڈیشن کو حاصل ہوئی۔ یہ اردو والا مہذب نہیں، بلکہ عربی والا مہذب ہے، یعنی edited یا refined version۔ ابن ہشام کی اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ کئی لوگوں نے اس کے خلاصے لکھے۔ ایک خلاصہ ابھی کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے مصر کے مشہور عالم عبدالسلام ہارون نے تیار کیا تھا جو بہت مقبول ہوا اور بارہا چھپا ہے۔ کئی لوگوں نے اس پوری کتاب کو نظم بھی کیا۔

سیرت ابن ہشام کے درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر عرب ملک میں دو چار ایڈیشن ابن ہشام کے نکلے ہوں گے۔ اردو، انگریزی اور جرمن زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں۔ آج سیرت جو کچھ ہے اس کا بہت بڑا حصہ ابن ہشام کی اس کتاب کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ کتاب تو یہ دراصل ابن اسحاق کی ہے لیکن ابن ہشام نے اس پر کام کیا ہے۔

سیرت کی ایک اور کتاب جو اس قابل ہے کہ اس کا تذکرہ کیا جائے۔ ویسے تو سیرت کی ہر کتاب اس قابل ہے کہ اس کا تذکرہ ہو۔ لیکن بعض خاص اوصاف کی وجہ سے یہ وہ کتاب ہے جس کا اہتمام کے ساتھ تذکرہ ضروری ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف شاید پرسوں میں نے اشارہ کیا تھا۔ یہ کتاب ایک ایسی شخصیت نے لکھی جو اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد شخصیت ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اہل سنت کے چار فقہی مسالک حنفی، شافعی، حنبلی اور شافعی مشہور ہیں۔ ایک فقہ جعفری اور زیدی ہے۔ ایک فقہ اباضی ہے جو خوارج کی ایک شاخ ہے۔ ایک اور فقہ بھی ہے جو اس وقت دنیا میں عملاً موجود نہیں ہے۔ لیکن اکا دکا لوگ اس کی پیروی کرنے والے موجود ہیں۔ یہ فقہ ظاہری کہلاتی ہے۔ فقہ ظاہری دراصل تیسری صدی ہجری کے ایک فقیہ داؤد بن سلیمان ظاہری سے منسوب ہے۔ ان کی فقہ کی بنیاد دو اصولوں پر ہے۔ ایک تو وہ قرآن پاک اور سنت کے ظاہری الفاظ کو لیتے ہیں اور ان کے کسی مجازی معنی کو قبول نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک اور حدیث میں جو لفظ آیا ہے اس کا ڈکشنری میں جو بھی مفہوم ہے وہ صحیح ہے اور اس ظاہری مفہوم کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں لیا جائے گا۔ دوسرے وہ کسی قسم کے قیاس یا analogical reasoning کو قبول نہیں کرتے۔ جو لفظ

حدیث میں جس طرح آیا ہے اس کو اسی طرح لیا جائے گا اور اس کے علاوہ کسی انسانی کاوش یا فہم کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ مسلک ان کے زمانے میں خاصا مشہور رہا۔ لیکن داؤد ظاہری کے تلامذہ کی بڑی تعداد نہیں تھی۔ انہوں نے خود کوئی کتاب بھی نہیں لکھی اس لئے یہ مسلک زیادہ دیر تک نہیں چلا۔

داؤد بن سلیمان کے انتقال کے ڈیڑھ دوسو سال بعد اسپین میں ابومحمد علی بن حزم کے نام سے ایک بزرگ سامنے آئے۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں پیدائش ہوئی اور پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ کئی اعتبار سے انتہائی غیر معمولی انسان تھے۔ حافظہ کے اعتبار سے شاید دنیائے اسلام کی تاریخ میں چند ممیز ترین لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کے والد بھی قرطبہ کی حکومت میں وزیر تھے یہ خود بھی وزیر رہے۔ ان کا خاندان مختلف سرکاری عہدوں پر رہا۔ ایک وقت آیا کہ ابن حزم تمام سرکاری مصروفیات ترک کر کے علم کے لئے وقف ہوگئے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی لکھی ہوئی ہر کتاب اپنے فن میں بہت اونچے درجہ کی کتاب ہے۔ ان میں جو چیز بڑی نمایاں ہے وہ ان کے قلم کی تیزی اور زبان کی شدت ہے۔ اگر کوئی شخص ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرات کرے تو ان کا قلم اسے معاف نہیں کرتا۔ انہوں نے اپنے مخالفین پر اتنی شدت کے ساتھ تنقید کی ہے کہ لوگوں نے کہا کہ حجاج کی تلوار اور ابن حزم کے قلم سے اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں مبالغہ ہو، لیکن جن لوگوں نے یہ کہا انہوں نے ابن حزم کی تنقیدات کی شدت کے پیش نظر ہی کہا۔

ابن حزم کی ایک ضخیم کتاب 'المحلی' بارہ پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ فقہ ظاہری پر بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں اصول فقہ پر 'الاحکام فی اصول الاحکام' کے نام سے چھ سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں بڑے دلائل کے ساتھ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی زور و شور سے کوشش کی ہے کہ نہ قرآن پاک اور سنت کی لفظی تعبیر کے علاوہ کوئی تعبیر قابل قبول ہوسکتی ہے اور نہ قیاس کی بنیاد پر کوئی حکم قابل قبول ہوسکتا ہے۔ اب قیاس کے انکار اور لفظی تعبیر کے جو نتائج ہیں وہ ان کی کتاب میں دیئے گئے اجتہادات کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔ بہت سے احکام ایسے ہیں کہ آج بہت اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس گفتگو

میں جائیں گے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

ابن حزم نے سیرت سے متعلق دو بہت اہم کام کئے۔ ایک تو انساب پر ایک کتاب لکھی جو آج مطبوعہ موجود ہے۔ چونکہ وہ خود مزاجاً بہت سخت تھے اور معاملات کا بہت ناقدانہ نظر اور باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے اس لئے انہوں نے انساب میں رسول اللہ کا نسب مبارک، آپ کے آباواجداد، ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کے بارے میں سارا مواد سامنے رکھ کر اس کا بھی خوب دقت نظر سے جائزہ لیا۔ اس جائزہ کے نتیجہ میں انہوں نے ایسا بہت سا مواد مسترد کر دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ جس کو انہوں نے قابل اعتبار سمجھا وہ مواد ایک کتاب کی شکل میں مطبوعہ موجود ہے۔ علم حدیث میں یہ علامہ ابن عبدالبر (انہی اعلم اہل المغرب) کے شاگرد تھے۔

ان ابن حزم نے جوامع السیرۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور سیرت پر جتنی کتابیں ان کے زمانے میں دستیاب اور متداول تھیں ان کو جمع کر کے ان کی ایک ایسی تلخیص تیار کی جس سے سیرت کا ایک انتہائی پاکیزہ، صاف ستھرا اور منقح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ کتاب مختصر ہے۔ ایک جلد میں ہے۔ یہ کتاب دنیائے مغرب سیرت پر لکھی جانے والی دو تین اہم کتابوں میں شامل ہے۔ دو کتابوں کا میں نے کل ذکر کیا تھا۔ تیسری کتاب یہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے اور خاص طور پر ہمارے شمالی افریقہ میں یہ کتاب بہت مقبول رہی اور مصر سمیت کئی ممالک میں چھپی ہے۔

سیرت پر ایک اور کتاب جو بڑی قابل ذکر ہے وہ ابن ہشام کی سیرت کی شرح ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ابن ہشام نے جو کتاب مرتب کی تھی اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ تقریباً ایک درجن تلخیصوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ تہذیبیں ہوئیں، نظمیں لکھی گئیں۔ ان شرحوں میں جو شرح بہت مقبول اور عالمانہ ہے وہ 'الروض الانف' کے نام سے پانچ جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے۔ کئی بار چھپی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر کام کیا ہے۔ علمی اور تحقیقی انداز میں ایڈیٹ بھی ہوئی ہے۔ تازہ ترین edited version پانچ جلدوں میں ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔ یہ علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن السہیلی (متوفی ۵۸۱ھ) کی لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس پر سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ جو قصائد تھے ان کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی۔

جہاں جہاں مشکل الفاظ آئے ان کو بیان کیا۔ جہاں جہاں وہ کسی خاص نقطہ پر توجہ دینا چاہتے ہیں اس نقطے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ ابن ہشام کے بیان کو مزید واضح کرنے اور مزید مدلل بنانے کی ضرورت ہے وہاں حسب ضرورت اس کا اضافہ کر دیا۔ جہاں کوئی بات ابن ہشام کے ہاں نامکمل نظر آئی اس کی تکمیل کر دی۔ خاص طور پر ایک چیز جس کا انہوں نے اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اگر کسی واقعہ سے کوئی اہم نکتہ نکلتا ہے یا کوئی درس ان کے سامنے آتا ہے یا کوئی سبق ملتا ہے تو اس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم آج کل کی اصطلاح میں فقہ السیرۃ کہہ سکتے ہیں۔ فقہ سیرۃ پر ان شاء اللہ آگے بحث ہوگی۔ اس موضوع پر سب سے پہلے جو وقیع اور عالمانہ اشارے ملتے ہیں وہ سہیلی کے ہاں الروض الانف میں ملتے ہیں۔ سہیلی خود ایک بہت بڑے ادیب اور نحوی تھے اس لئے انہوں نے نحوی قواعد وضوابط پر بھی بات کی ہے۔ جس قصیدے کے کسی شعر سے کوئی نحوی اصول نکلتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ علامہ سہیلی بھی اسپین کے رہنے والے تھے۔ بحر متوسط کے ساحل پر ایک شہر مالقہ کے رہنے والے تھے۔ تقوی اور زہد واستغناء میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اپنے لڑکپن میں نابینا ہو گئے تھے۔ بعد میں جتنی کتابیں لکھیں وہ سب انہوں نے املا کرا کر لکھوائیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی مفید ہے کہ اس سے ابن ہشام کے کئے ہوئے کام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ابن ہشام نے جہاں جہاں کوئی ایسی چیز بیان کی تھی جس کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، یا کسی چیز کی شرح درکار تھی تو وہ علامہ سہیلی نے بیان کر دی ہے اور ابن ہشام کی کتاب کو سمجھنا بہت آسان بنا دیا ہے۔

علامہ سہیلی محدث بھی تھے، فقیہ، لغوی، نحوی، ماہر انساب اور مفسر اور مورخ بھی تھے۔ ان کی شرح میں ان سب حیثیتوں کی جھلک صاف محسوس ہوتی ہے۔ ان علمی خوبیوں کی وجہ سے ابن ہشام کی وہ شرح جو علامہ سہیلی نے الروض الانف کے نام سے لکھی وہ بہت جلد مقبول ہوگئی اور دنیائے اسلام کے ہر علاقے میں مقبول اور متداول رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس کی بھی شرحیں لکھیں اور اس پر حواشی لکھے۔ بعض لوگوں نے اس کی تلخیص کی۔ بعد میں آنے والے تقریباً ہر سیرت نگار نے اس سے استفادہ کیا۔ علامہ ابن قیم کی تحریروں اور تصنیفات میں جا بجا اس کے تذکرے اور حوالے ملتے ہیں۔

ایک اور کتاب جو قابل ذکر ہے وہ بھی اتفاق سے ایک اندلسی عالم ہی کی ہے، الاکتفاء ہے۔مصنف ہیں: علامہ ابوالربیع سلیمان الاندلسی (متوفی ۶۳۴ھ)۔ان کی کتاب 'الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ و الثلاثہ الخلفاء'۔یعنی حضور اور آپؐ کے پہلے تین خلفاء، سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنی کے دور میں جتنے مغازی ہوئے، ان پر انہوں نے لکھا ہے۔ یہ خود اسپین میں عیسائی حملہ آوروں کے خلاف جہاد میں شریک رہے۔ جہاد میں خود بھی حصہ لیا۔محدث بھی تھے کیونکہ علم حدیث پر کئی کتب کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے کئی بنیادی مآخذ کو سامنے رکھ کر مرتب کی۔ جو قدیم ترین کتابیں تھیں، جن میں ابن اسحٰق کی مغازی بھی تھی اور موسیٰ بن عقبہ کی کتاب بھی تھی۔ وہ سب کتابیں ان کے سامنے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے واقدی کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ان ساری کتابوں کو سامنے رکھ کر الاکتفاء کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی۔ اس کتاب کا بنیادی وصف معلومات کی جامعیت اور ان کا ٹھوس ہونا ہے۔ایک اور بات یہ ہے کہ کئی ایسی کتابیں جو آج موجود نہیں ہے۔مثلاً موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق کی اصل کتابیں جن ان کا بیشتر حصہ آج موجود نہیں ہیں۔ان دونوں کتابوں کے طویل اقتباسات ان کی کتاب میں مل جاتے ہیں۔ جن کتابوں کی مدد سے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا استخراج کیا گیا ان میں یہ کتاب الاکتفاء بھی شامل ہے۔

کتاب کا آغاز معد بن عدنان کے زمانے سے ہوتا ہے اور ولادت نبوی تک تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں ان حقائق کو بیان کیا ہے۔حضور کے اجداد اور خاندان کے بارے میں تفصیل دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے واقعات سیرت کے عام انداز کی طرح بیان کئے ہیں۔ دوسری جلد مغازی اور فتوحات کے لئے خاص طور پر مخصوص ہے۔ یہ مواد انہوں نے زیادہ تر زبیر بن بکار کی نسب قریش سے لیا ہے جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔ایک چیز جو اس کو سیرت کی بقیہ کتابوں ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کون کون سے مذہبی عقائد مروج تھے۔عربوں میں مذہبی ثقافت کیا تھی۔ کن کن بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ کس قبیلے میں کیا رسوم تھیں۔ان کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔

کتاب الاکتفا کے بعد جس کتاب کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ وہ نہ صرف ادبیات

سیرت میں بلکہ شاید ادبیات اسلامی کی چند منتخب روزگار اور مایہ ناز کتابوں میں سے ایک ہے۔ ادبیات سیرت میں تو یہ کتاب بلاشبہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اور اس طرح کی کوئی اور کتاب پورے سیرت لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ یہ علامہ ابن قیم کی کتاب 'زاد المعاد في هدي خير العباد' ہے۔ علامہ ابن قیم بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کا غیر معمولی تفقہ ان کی کتاب اعلام الموقعین سے ظاہر ہے۔ بہت بڑے محدث تھے اور ابن تیمیہ کے قریب ترین اور سب سے نمایاں شاگردوں میں سے تھے۔ خود بہت بڑے صوفی اور روحانیات کے امام تھے۔ ان کی کتاب 'مدارج السالکین' اس کی دلیل ہے۔ ان کا مطالعہ قرآن اتنا غیر معمولی تھا کہ قرآن پاک کے بعض ایسے پہلوؤں پر ان کی کتابیں ہیں جن پر پہلے کسی نے نہیں لکھا۔ قرآن پاک کی بدائع پر، اقسام پر، امثال پر بہت عالمانہ کام انہوں نے کیا۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں سیرت کے تمام واقعات کو جمع کر کے یہ بتایا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں عام مسلمان کے لئے اس میں کیا ہدایت ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں Sirah in action یا Sirah in practice اس کا موضوع ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے فقہ اور سیرت کو اس طرح سے ملا دیا ہے کہ فقہ اور سیرت کو الگ الگ کرنا اس کتاب کی حد تک تو ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ سیرت کے ہر واقعہ کو فقہ کے حکم سے جوڑا ہے اور فقہ کے ہر حکم کو سیرت سے وابستہ کیا ہے۔ اس طرح فقہیات سیرت کی سب سے بڑی اور اونچی کتاب اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

فقہ کی ایک تو عام اصطلاح ہے جو فقہی اور قانونی احکام کے لئے بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فقہ کی ایک اور اصطلاح جو کبھی کبھی استعمال ہوتی ہے۔ امام غزالی اور کئی دوسرے ائمہ کی اصطلاح میں فقہ النفس کی اصطلاح ہے۔ یعنی انسانی نفسیات کا علم، انسانی رجحانات کا اندازہ، مزاج اور طبیعت کی تحقیق اور مطالعہ۔ ابن قیم کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی نمایاں ہے کہ فقہ نفس کے موضوع پر انہوں نے سیرت کے حوالے سے بعض ایسے حقائق بیان کئے ہیں۔ جو ابن قیم سے پہلے کسی نے اس وضاحت اور اس انداز سے بیان نہیں کئے۔

روحانیات اور تصوف کے میدان میں اس کتاب میں بعض ایسے مسائل زیر بحث آگئے ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی میں بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان پر اکثر و بیشتر علمی اعتبار سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر قرآن پاک نے توکل کا حکم دیا ہے۔

مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ توکل سے کام لیں۔توکل کیا ہے۔توکل کی حقیقت کیا ہے۔ توکل کس کو کہتے ہیں۔توکل کہاں کرنا چاہیے اورکہاں نہیں کرنا چاہیے۔کیا ترک اسباب کا نام توکل ہے۔اگر ترک اسباب کا نام توکل ہے تو رسول اللہ ﷺ نے تو اسباب اختیار فرمائے۔ صحابہ کرام توکل کی بہت اونچی معراج پر تھے لیکن انہوں نے اسباب اختیار فرمائے۔ان سے اونچا توکل تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ابن قیم نے ان سب سوالات سے سیرت کی روشنی میں بحث کی ہے۔انہوں نے جابجا توکل، صبر اور شکر جیسے خالص روحانی اوراخلاقی اقدار اور اصولوں پر سیرت نبوی کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی ہے۔اس طرح سے یہ روحانیات سیرت پر بھی ایک انتہائی وقیع کتاب بن گئی ہے۔

یہ کتاب سیرت کے تمام ابواب پر محیط ہے۔اس طرح سے انسانی زندگی کے تمام ابواب سے بحث کرتی ہے۔چونکہ اس کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ عام انسان کو سیرت کے واقعات سے رہنمائی ملے۔اس لئے اس میں نماز اور عبادات سے لے کر، خاندانی اور شخصی زندگی، بقیہ سرگرمیاں، تجارت، بین الاقوامی تعلقات، لین دین اور جنگ ہر پہلو پر رسول اللہ ﷺ کے سیرت حسنہ کے حوالے سے گفتگو ہے۔اس لئے اس میں فقہ کے محدود مفہوم کے ساتھ ساتھ، معاشرت، عادات، ثقافت، تہذیب اوراجتماعیات کے بارے میں جابجا ہدایات ہیں۔مثلاً لوگ آپس میں ملیں تو سیرت کی روشنی میں کیا طریق کار ہے۔لوگوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں سیرت سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔یہ فقہ سیرت کی کتاب بھی ہے۔فقہ معاشرت بھی ہے۔فقہ النفس بھی ہے اور فقہ اپنے حقیقی معنی اور مفہوم میں بھی ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک سر تنشہ ہے جو ابن قیم نے تیار کیا ہے۔اس میں سیرت کی پاکیزگی بھی ہے۔سیرت پڑھتے ہوئے انسان اپنے دل میں جو روحانی لذت اور لطف محسوس کرتا ہے وہ تو ہے ہی، کیونکہ سیرت کی کتاب ہے۔اس میں حدیث کے فن کو اور استناد کو پورے طور پر شامل کر دیا ہے۔خود بہت بڑے محدث ہیں۔کسی ایک لفظ کے بارے میں بھی نہیں کہا جاسکتا کہ غیر ذمہ دارانہ طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ایک ایک بیان محدثین کی مکمل احتیاط کا نمونہ ہے۔فقہ النفس، فقہ المعاملات، فقہ السیرۃ، ان میں سے ہر چیز کے بارے میں ایسے توازن سے بیان کیا ہے کہ جس میں محدثین کی سی باریک بینی، فقہا کی جز

رسی اور اعتنا بالتفاصیل اور اصحاب سیر کا سا جذبہ حب رسول، یہ ساری چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ ایک گلدستہ ہے جس میں فقہ، سیرت، تصوف اور علم النفس سب کی خوشبو الگ الگ ملتی ہے۔ سیرت رسول اس کی بنیاد ہے۔ احادیث قولی اور فعلی سے اس کی شاخیں نکلتی ہیں۔ فقہ اس کا ثمرہ ہے۔ تصوف اس کی خوشبو ہے۔ اس طرح سے یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جو ہمیں سیرت کی کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتا۔

ابن قیم کو ایک متعمق فقیہ کے طور پر تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ لیکن کم لوگوں کو روحانیات اور تزکیہ واحسان میں ان کی امامت اور مہارت کا اندازہ ہے۔ مدارج السالکین ان کی کتاب کا نام ہے۔ تصوف کے اعلیٰ ترین ادب میں شامل ہے۔ امام غزالی کی احیاالعلوم اور علامہ کلاباذی کی التعرف اور حضرت شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب جیسی بنیادی کتب کے درجہ کی کتاب ہے۔

زادالمعاد سے مصنف کی غیر معمولی بصیرت اور دین فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دین کی مزاج شناسی، حدیث، فقہ، تصوف اور روحانیات میں درک کتاب کے ہر ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔ مصنف نے فقہ کے تمام ابواب کو سامنے رکھ کر ذخیرہ احادیث اور سیرت سے ہدی خیر العباد مرتب کی ہے۔ یہ کتاب بار بار چھپی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ انداز یہ ہے کہ پہلے سیرت کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ پھر اس واقعہ سے متعلق جو احادیث ہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر ان احادیث سے نکلنے والے فقہی مسائل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں کہتے ہیں کہ 'فصل فی فقہ ہذا الباب'، یعنی اس باب کی اصل فہم اور درک کے بیان میں، کہ اس میں کیا حکمتیں نکلتی ہیں۔ یہ درس اور بصائر اور عبرتیں کیا ہیں۔ مسئلہ کے باریک اور دقیق پہلو کیا ہیں۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے ابن قیم نے ان تمام مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

فقہیات سیرت پر ایک دن الگ سے گفتگو ہوگی۔ اس کے بہت سے اہم اور معرکۃ الآرا مسائل پر ابن قیم نے گفتگو کی ہے اور بہت سے اہم پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔ فقہیات سیرت میں اٹھنے والے سوالات کی نوعیت کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔

ایک روایت ہے کہ جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے، یوم قدم رسول

اللہ ﷺ الی المدینہ ،تو آپ نے دیکھا کہ یہودی روزہ رکھے ہوئے ہیں۔آپ نے پوچھا کہ یہودیوں نے کیوں روزہ رکھا ہے۔ جواب دیا گیا کہ آج کے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوفرعون کے ظلم اوراس کی سختی سے نجات دلائی تھی تو شکرانہ کے طور پر ہم آج کے دن روزہ رکھتے ہیں۔آپؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کی نجات اور کامیابی کی یاد میں روزہ رکھنے کا زیادہ حق تو ہمیں حاصل ہے۔آپ نے صحابہ کرام کوحکم دیا کہ تم بھی روزہ رکھا کرو۔یہ ایک روایت ہے ۔اس وقت سے مسلمان عاشورہ کا روزہ رکھتے چلے آرہے ہیں۔عاشورہ کا روزہ پہلے فرض تھا۔ جب رمضان کے روزے آئے تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔اب یہ روزہ مستحب یا سنت ہے۔اس حد تک تو حدیث میں موجود ہے۔لیکن شروع سے یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ مسلمان یوم عاشورہ کا جو روزہ رکھتے ہیں اس کی اصل تاریخ کیا ہے۔مسلمانوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ ۱۰ محرم کو عاشورہ ہے اور دس محرم کو روزہ رکھنا چاہئے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ محرم اور صفر عربی مہینے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں یہ کیلنڈر رائج نہیں تھا۔ان کا اپنا کیلنڈر تھا۔یہودی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عاشوراء ان کے کلینڈر کے پہلے مہینے تشری کی دس تاریخ ہے۔اسی دن موسیٰ علیہ السلام کوفرعون سے نجات ملی تھی ۔تو رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو کیا یہودی سال کے پہلے مہینے تشری کی دس تاریخ تھی؟ یہ بات تو واضح ہے کہ اس دن دس محرم نہیں تھا۔یہودیوں کے حساب سے کوئی اور تاریخ تھی ۔رسول اللہ ﷺ تو ربیع الاول میں تشریف لائے تھے۔اب یہ بحث بہت عرصہ سے رہی ہے کہ عاشورہ کے روزہ سے کیا مراد ہے۔کیا یہودیوں کا دس تشری کا روزہ مراد ہے، یا دس محرم مراد ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ اس سے دس محرم مراد ہے۔بہت سے لوگوں کی رائے میں دس محرم مراد نہیں ہے۔دونوں طرف کے حضرات کے پاس دلائل ہیں۔ابن قیم نے اس بحث کو زادالمعاد میں شامل کیا ہے اور اپنی رائے بیان کی ہے۔اسی طرح اور طرح طرح کے واقعات جو اصلاً سیرت کے واقعات ہیں لیکن ان سے کسی فقہی معاملہ کو سمجھنے اور طے کرنے میں مدد ملتی ہے۔اس لئے ابن قیم نے ان سے بحث کی ہے۔

زادالمعاد کی تیسری جلد ساری کی ساری جہاد اور مغازی کی تفصیلات اور دروس وعبر پر مشتمل ہے۔ بڑی ضخیم جلد ہے اور پوری جلد میں جہاد اور مغازی ہی پر بحث کی ہے۔ یوں تو

پوری کتاب اپنی مثال آپ ہے، لیکن یہ حصہ یعنی جلد سوم اس میں خاصے کی چیز ہے۔ پہلے انہوں نے جہاد کی وضاحت کی ہے کہ جہاد کیا ہے۔ حدیث اور قرآن میں جہاد کس مفہوم میں آیا ہے۔ جہاد بالنفس کیا ہے۔ جہاد بالشیطان کیا ہے، جہاد بالکفار اور جہاد بالمنافقین کیا ہے۔ یہ چار اقسام انہوں نے احادیث کی روشنی میں الگ الگ بتائی ہیں اور ان کی تقسیمیں بتائی ہیں۔ جہاد کیسے ہوتا ہے۔ کیسے ہونا چاہئے۔ اس کے احکام کیا ہیں۔ جگہ جگہ اس پر بحث کی ہے۔ جو غزوہ بیان کیا ہے تو اس سے نکلنے والے احکام بھی بیان کئے ہیں۔ گویا سیر اور مغازی کا پرانا مفہوم انہوں نے برقرار رکھا ہے۔ واقعات بھی بیان کئے ہیں اور قانون بھی بیان کیا ہے۔ مسلموں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں موجود ہدایات بھی بیان کی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مغازی کی کتاب بھی ہے۔ سیرت کی کتاب بھی ہے۔ علم سیر یعنی بین الاقوامی قانون کی کتاب بھی ہے۔

بین الاقوامی قانون کے حوالہ سے ایک بات اور بھی ذہن میں رکھئے گا۔ پچھلے سوسوا سو سال سے بین الاقوامی قانون کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک پبلک انٹرنیشنل لاء کہلاتا ہے اور دوسرا پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کہلاتا ہے۔ پبلک انٹرنیشنل لا تو وہ ہے جو ملکوں یا قوموں کے درمیان تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء وہ ہے جو کسی ملک کے اندر دو ممالک کے قوانین کے conflict یعنی تعارض قوانین سے بحث کرتا ہے۔ تعارض قوانین میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی قوم میں جو قوانین رائج ہیں ان پر دوسرے کسی ملک کی عدالتوں کو کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ فرض کیجئے آپ انگلستان میں کسی کاروبار کے سلسلہ میں کسی سے کوئی معاہدہ کریں۔ اس معاہدہ کے مطابق پاکستان میں اپنا مکان اس کو دے دیں۔ تو معاہدہ آپ نے انگلستان کے قانون کے تحت کیا ہوگا۔ عدالت میں ہمارے ہاں زیر بحث آئے گا۔ تو ہماری عدالت ہمارے قانون کے مطابق نوٹس لے گی یا اُن کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ یہ پرائیویٹ انٹرنیشنل لا کا مسئلہ ہے۔ اس شعبہ قانون کے بارے میں اہل مغرب کا خیال ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا تصور دنیا کو دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس پر سب سے پہلی دستیاب کتاب ابن قیم کی ہے۔ ان کی احکام اہل الذمہ دو جلدوں میں ہے۔ اس میں انہوں نے وہ تمام مسائل اٹھائے ہیں جو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں اٹھائے جاتے

ہیں۔خود ابن قیم انٹرنیشنل لاء کے ماہر تھے۔اس پر ان کی کتاب قدیم ترین اور مستند ترین کتاب ہے۔اس لئے انہوں نے مغازی سے جس طرح کے احکام نکالے ہیں وہ شاید کوئی اور سیرت نگار نہ نکال سکتا۔

تقریباً 600 صفحات میں انہوں نے مغازی اور جنگوں اور مہمات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغازی پر مستند ترین مآخذ میں سے ایک ماخذ یہ بھی ہے۔چونکہ خود فقیہ ہیں، سیرت نگار ہیں مورخ ہیں، ساری خصوصیات جمع ہیں۔پچھلے چھ سو سال کا سارا کام ان کو دستیاب تھا۔اس لئے اس کے مستند ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔سیرت اور مغازی کی بعض تفصیلات انہوں نے واقدی سے لی ہیں۔ابن قیم جیسے دیدہ ور اور بالغ نظر فقیہ کی طرف سے واقدی پر یہ اظہار اعتماد واقدی کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔یہ واقدی کے مقام اور مرتبے کا کھلا اعتراف ہے۔البتہ غزوات کے بارے میں عمومی تفصیلات انہوں نے حدیث کی کتابوں بالخصوص صحاح ستہ سے لی ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں روحانیات سیرت پر بھی بڑا قیمتی مواد ہے۔رسول اللہ ﷺ اصلاً تو مزکی اور مربی تھے۔آپ کا فوجوں کی قیادت کرنا، حکومت کی سربراہی کرنا، سفیروں کو بھیجنا اور گورنروں کی تقرریاں کرنا، یہ سب حضور کے اصل مقصد کے حصول کے ذرائع تھے۔یہ حضور کا مقصود نہیں تھا۔حکومت اسلام کا مقصد نہیں ہے، بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔اقتدار اسلام کی ضرورت کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔اس لئے جو اصل چیز ہے وہ حضور کی دی ہوئی تربیت، اخلاق اور کردار سازی ہے۔ابن قیم نے زاد المعاد میں اس پہلو پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اس پر باقاعدہ بحث کی ہے کہ سیرت کی روشنی میں تزکیہ نفس اور اخلاق اور کردار کی تعمیر کیسے کی جاسکتی ہے۔پھر خالص روحانی مسائل جن پر صوفیائے کرام نے، مثلاً مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور اس درجہ کے بزرگوں نے جو اس فن کے ائمہ میں سے تھے، جو کچھ لکھا ہے اس طرح کی چیزیں ابن قیم کے ہاں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔

مثال کے طور پر حضور کے شق صدر کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔شق صدر سے کیا مراد ہے۔یقیناً یہ ایک ایسا میدان ہے جس کے بارے میں محض عقل کی بنیاد پر کچھ کہنا بہت

دشوار ہے۔ کیا یہ شرح صدر کی ایک قسم ہے؟ اگر ایسا ہے تو شرح صدر سے کیا مراد ہے۔ اس پر ابن قیم نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے کہ شرح صدر سے کیا مراد ہے۔ شق صدر کیسے ہوا۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ کیسے اللہ تعالیٰ نے حضور کے سینے کو کھول دیا۔ **الم نشرح لک صدرک**، سینے کو کھولنے کی کیا شکل ہے۔ اس موضوع پر اکابر صوفیہ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ زیادہ تفصیل میں جاؤں گا تو بہت وقت لگ جائے گا۔ اسی طرح سے علامہ ابن قیم نے بعض عبادات کے روحانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ روزہ کے روحانی پہلوؤں پر بڑا نفیس کلام کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں روحانیات سیرت کا ایک حصہ ہے۔ اس میدان میں شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی یہ سب ابن قیم کے ہم پلہ ہیں۔ اور ان سب نے سیرت کے روحانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

آخری کتاب جس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں وہ بھی اتفاق سے اسپین ہی کے ایک صاحب علم کی ہے۔ بعد میں ایک دو کتابوں کے صرف نام لوں گا۔ میں نے جان بوجھ کر اسپین کے اہل علم کا انتخاب نہیں کیا۔ اب بات کر رہا ہوں تو احساس ہوا کہ یہ سب بزرگ اسپین ہی کے ہیں۔ قاضی عیاض بہت نامور صاحب علم، متکلم اور بڑے مشہور بزرگ تھے۔ قاضی تھے۔ شریعت کے نفاذ میں انہوں نے حصہ لیا۔ مجاہد تھے، جنگوں میں بھی حصہ لیا۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جو اپنی نوعیت کی اسی طرح منفرد کتاب ہے جس طرح زادالمعاد منفرد ہے۔ کتاب کا نام ہے '**الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ**'۔ اس کتاب میں بنیادی طور پر دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ امت پر حضور ﷺ کے حقوق کیا ہیں۔ حضور ﷺ کے حوالے سے امت کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ دوسرے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتیازی خصائص کیا تھے۔ معجزات پر بھی بحث ہے۔ نبوت پر بھی بحث ہے۔ اور نبوت و معجزہ کی حقیقت پر بھی بحث ہے۔ ایسے مسائل اٹھائے ہیں جن کا براہ راست سیرت کے واقعات یا تاریخی پہلوؤں سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ان واقعات کے اندر جو درس پنہاں ہے۔ ان کے اندر جو سبق پوشیدہ ہے۔ ان عبرتوں اور دروس پر روشنی ڈالی ہے۔ شروع میں ایک بات یہ بڑی عجیب لکھی ہے کہ میں نے یہ کتاب کسی منکر یا دشمن کے لئے نہیں لکھی۔ لہٰذا میں کوئی عقلی دلیل نہیں دوں گا۔ یہ کتاب میں نے ان محبان رسول کے لئے لکھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی

نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضور کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ ان کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کتاب میں نے ان کے اطمینان اور شرح صدر کے لئے لکھی ہے۔ کوئی منکر یا دشمن اس کتاب کو نہ دیکھے اور اگر دیکھے تو اعتراض نہ کرے۔ اس طرح انہوں نے پہلے ہی قدم پر معاملہ صاف کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ تین کتابیں اور بھی ہیں جو تفصیلی گفتگو اور تعارف کی مستحق ہیں لیکن تفصیل کا وقت نہیں رہا۔ اس لئے ذرا اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ ان کتابوں میں سے ایک شیخ علی بن برہان الدین حلبی کی جامع کتاب ہے جو 'سیرت حلبیہ' کے نام سے معروف ہے۔ کتاب کا اصل نام 'انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون'، انسان سے مراد ہے آنکھ کے اندر کالی پتلی۔ آدمی کو بھی انسان کہتے ہیں لیکن عربی میں آنکھ کی پتلی کو بھی انسان کہتے ہیں۔ انسان العیون یعنی آنکھوں کی پتلی، جیسے آنکھوں کی پتلی اندر محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کا ذکر مبارک لوگوں کی آنکھوں میں ہونا چاہئے۔ یہ مفہوم دینا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب سات ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ کراچی میں بھی چھپا ہے۔ ہندوستان میں بھی چھپا ہے۔ چونکہ مصنف حلب کے رہنے والے تھے اس لئے کتاب سیرت حلبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس دور کی کتاب ہے جس کو میں نے اُستیعاب کا زمانہ کہا تھا، یعنی معلومات کو جمع کرنے اور یکجا کرنے کا زمانہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب معلومات کا خزینہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ایک تبصرہ ہے جو بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ زیادہ معلومات جمع کی جائیں گی تو ان میں کمزور باتیں بھی آجائیں گی۔ کمزور باتیں آجائیں گی تو ان پر اعتراض ہوگا۔ اس کتاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض باتیں بہت کمزور ہیں۔ خاص طور پر معجزات وغیرہ کے بارے میں غیر مستند روایات کا خاصا ذخیرہ اس میں آگیا ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ جس زمانے میں یہ حضرات یہ کتابیں تحریر فرما رہے تھے وہ عقلیات کا زمانہ نہیں تھا۔ لوگ دین پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ اپنی عقل کو دین کے معاملہ میں فیصلہ کن نہیں سمجھتے تھے۔ بس ایک بار معجزہ کو مان لیا تو پھر جس نے جو روایت بیان کی اس کو بلا تأمل تسلیم کر لیا۔ زیادہ تحقیق کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی کہ وہاں انکار اور شک کا ماحول نہیں تھا۔ شاید یہ وجہ ہو۔ اعتراض کا یہ رجحان

اہل مغرب کی دین ہے۔ وہ اپنے ہاں ہر مذہبی بات پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے ہاں بھی یہ ماحول بعد میں پیدا ہوگیا۔ دور جدید پر بات ہوگی تو ہم دیکھیں گے کہ مغربی مصنفین نے کیا اعتراضات کئے اور کن چیزوں کو غیر مستند کہا۔ میں نے پہلے دن کہا تھا کہ اہل مغرب کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی زندگی پر عقیدت کی سطحیں بچھا دیں ہیں۔ اور یوں 'حقیقی محمد' کی جگہ ایک 'فرضی اور مثالی محمد' تشکیل کرلیا ہے۔ اس کام کے لئے بعد میں آنے والوں نے روایات وضع کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی مستشرقین کی بدنیتی سے قطع نظر خود ہماری کتابوں میں موجود کمزور مواد نے ہی ان کو یہ باتیں کہنے کا موقعہ دیا ہے۔ علامہ حلبی نے جن کی وفات گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی، ابن سید الناس کی کتاب عیون الاثر اور قاضی عیاض کی کتاب الشفاء سے بھی استفادہ کیا گیا۔ اگرچہ انہوں نے بعض کمزور روایات کا تعاقب کیا ہے لیکن خود بھی کمزور روایات سے محفوظ نہ رہ سکے۔

کتاب کے آخر میں سراپا اور بعوث کے عنوان سے ایک الگ باب ہے۔ اس میں ۵۶ سراپا کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کے آخری پچیس ابواب میں سیرت کے بعض ضمنی پہلوؤں کے بارہ میں اہم معلومات کو یکجا کردیا ہے۔ مثلاً:

- بارگاہ رسالت میں آنے والے وفود اور سفراء
- بارگاہ رسالت سے جانے والے نامہ ہائے مبارک
- خصائص نبوی
- معجزات
- اولاد
- دیگر رشتہ دار
- سواریاں اور اسلحہ جو حضور کے استعمال میں رہیں۔

ایک اور کتاب 'سیرت شامیہ' کہلاتی ہے۔ اس کے مصنف بھی شام کے رہنے والے تھے۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام ہے محمد بن یوسف دمشقی (متوفی ۹۴۲ھ)۔ دمشق کو شام میں شام ہی کہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ شام کے کسی اور شہر سے دمشق جانا چاہیں تو ٹیکسی والے سے کہیں گے کہ شام جانا ہے۔ اس سے مراد دمشق ہوتی

ہے۔یوں دمشق کے لئے شام کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس لئے ان کو شامی بھی کہا جاتا تھا۔ان کی کتاب کو سیرت شامیہ کہا جاتا ہے۔کتاب کا اصل نام سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد ہے۔یہ بھی بہت مستند اور جامع کتاب ہے۔بارہ جلدوں میں ہے۔کئی بار چھپی ہے۔انہوں نے کئی سو کتابیں سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی تھی۔اس کا اردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

ایک آخری کتاب جس کا تذکرہ کر کے میں آج کی گفتگو ختم کردیتا ہوں علامہ مقریزی کی جامع کتاب امتاع الاسماع ہے۔۔ یہ بڑے مشہور مصنف، مورخ ، ادیب اور ماہر معاشیات تھے۔پورا نام تقی الدین مقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) ہے۔ان کی بہت ساری کتابیں ہیں۔ان میں سے ایک 'امتاع الاسماع' ہے۔یہ پندرہ جلدوں میں ہے۔اس کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی زندگی، آپ کا خاندان اور اولاد، آپ کے متلکات اور آپ کے عادات و خصائل کا تذکرہ ہے۔یہ اس وقت تک لکھی جانے والی تمام کتابوں کا خلاصہ تھا۔مقریزی انتہائی عالم فاضل انسان تھے۔انہوں نے پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔تاریخ، ادب اور معاشیات مین بھی درک رکھتے تھے۔مقریزی نے ہی وہ اصول دریافت کیا تھا جو مغربی لکھنے والے گریشم سے منسوب کرتے ہیں۔گریشم لاء معاشیات کا ایک قانون ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جعلی سکہ اصلی سکہ کو شکست دے دیتا ہے۔یہ قانون گریشم کا نہیں ہے۔مقریزی کا ہے اور مقریزی نے ہی نے اس کو پہلی مرتبہ باقاعدہ تحریری طور پر بیان کیا ہے۔سیرت پر ان کی اصل کتاب چودہ جلدوں میں ہے۔ پندرھویں جلد انڈکس پر مشتمل ہے۔مقریزی بھی اسپین کے رہنے والے تھے۔

افسوس کہ وقت ختم ہوگیا۔مغرب کی جماعت تیار ہے۔ ارادہ تھا کہ علامہ قسطلانی کی المواہب اللدنیہ اور اس کی شرح جو علامہ زرقانی نے لکھی ہے، ان دونوں کا تذکرہ بھی ہو۔ دونوں بہت جامع کتابیں ہیں۔علامہ شبلی نے شرح المواہب اللدنیہ کے بارہ میں لکھا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی۔علامہ شبلی کا یہ تبصرہ بڑی حد تک درست ہے۔لیکن افسوس کہ یہ کتاب کمزور اور غیر مستند بیانات سے خالی نہیں۔یہ کمزور روایات علامہ قسطلانی کی اصل کتاب میں تو بہت کم ہیں، لیکن اس کی شرح میں بہت ہیں۔علامہ قسطلانی کا پورا نام شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) ہے۔یہ

اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔

علامہ زرقانی بھی اپنے زمانہ کے نامور محدث تھے۔ ان کی شرح موطا امام مالک مشہور ہے۔ پورا نام محمد بن عبدالباقی الزرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) ہے۔

☆

سوال و جواب

مہربانی فرما کر ہمہ قرآن در شان محمد کے مصنف اور پبلشر کا نام بتا دیجئے۔

ہمہ قرآن در شان محمد اردو میں ایک کتاب ہے۔ اس کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مرحوم نے لکھا ہے۔ یہ سندھ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔ بہت اللہ والے بزرگ تھے۔ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی ہے۔ نقوش کے سیرت نمبر کی پہلی جلد میں بھی موجود ہے۔

قاضی عیاض کے الشفا پر تبصرہ اور تعارف تو مختصر آ گیا۔ اس ضمن میں ان کی اس کتاب کی شرح نسیم الریاض کا سیرت نگاری میں کیا مقام ہے؟

نسیم الریاض بہت اچھی شرح ہے۔ اس کا بہت اونچا مقام ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میرے نزدیک سیرت کی ہر کتاب کا مقام اونچا ہے اور اگر ان کی صرف فہرست ہی بیان کی جائے تو 29 ہزار کتابیں ہیں۔ ان کی فہرست بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ چند کتابیں نمونے کے طور پر ذکر کی گئیں۔ دیگ کھول کر آپ ایک چاول دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بھی دیگ کا ایک چاول تھا جو میں نے آپ کو دکھایا۔

☆

تصوف کیا ہے؟ کیا صوفی کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے؟

تصوف جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اس کی شریعت پر عمل کیا جائے۔ اللہ کی شریعت پر اس کی پوری جزئیات اور باریکیوں کے ساتھ عمل کیا جائے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے۔ اللہ سے محبت کی جائے۔ رسول کی عقیدت سے انسان سرشار ہو۔ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس ہو۔ وہ کیفیت ہو جو حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ حضور سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ **الاحسان ان تعبدالله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك** ' احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اسی کا نام تصوف ہے۔ اس کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

☆

کیا شیخ الاسلام علامہ ابن قیم کسی خاص مسلک کے مقلد تھے؟

شیخ الاسلام علامہ ابن قیم فقہی اعتبار سے حنبلی تھے۔ انہوں نے جہاں جہاں فقہی مسائل بیان کئے ہیں اکثر حنبلی نقطہ نظر کے حوالہ سے بیان کئے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنے مسلک سے اختلاف بھی کیا ہے اور دوسری رائے ظاہر کی ہے۔

☆

موسیٰ بن عقبہ نے اپنی تصنیف الاکتفاء میں حضرت علی کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

الاکتفاء موسی بن عقبہ کی تصنیف نہیں ہے۔ الاکتفاء ان کے بہت بعد میں لکھی گئی۔ یہ علامہ ابوالربیع الکلاعی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی کی زندگی کا بیشتر حصہ اندرونی بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ بقیہ تینوں خلفا کا زمانہ تو فتوحات کا زمانہ تھا۔ مسلمان فاتحین کو کیسا ہونا چاہئے۔ ملکوں کے ساتھ معاہدے کیسے ہوں۔ مفتوحین کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ یہ تو خود حضور کی اپنی سیرت سے بھی واضح ہے

اور پہلے تینوں خلفاء کی زندگیوں سے بھی اس باب میں بہت رہنمائی ملتی ہے۔لیکن یہ بات کہ مسلمانوں میں اگر کوئی باغی ہو تو ان کے ساتھ کیسا رویہ ہونا چاہئے، یہ سنت ابھی تک دستیاب نہیں تھی۔اس معاملہ میں اب تک کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں تھی۔سیدنا علی بن ابی طالب کی زندگی میں یہ سنت ملتی ہے کہ باغی لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہئے۔مسلمان باغیوں سے کیسے عہدہ برآ ہونا چاہئے۔چونکہ کتاب الاکتفا مغازی پر ہے۔مغازی غیر مسلموں کے ساتھ جنگوں سے متعلق موضوع ہے۔اس لئے انہوں نے پہلے تین خلفا کے دور کا ذکر کیا ہے اور سیدنا علی بن ابی طالب کے دور کا ذکر نہیں کیا ہے۔

☆

آپ نے سیرت ابن ہشام کے اردو تراجم کا ذکر فرمایا ہے۔
ان میں مستند کونسا ہے؟

میرے لئے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کتابوں کے اردو ترجموں کا الگ الگ اصل سے مقابلہ کر کے موازنہ نہیں کیا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔آپ کسی ایسے شخص سے معلوم کریں جو اردو ادب کا آدمی ہو۔اور جس نے ان ترجموں کا موازنہ کیا ہو۔میں نے نہیں کیا۔

ہندوستان میں اردو زبان میں سیرت پر جو کام ہوا ہے اس
کا تذکرہ سننے میں نہیں آیا۔

آپ نے غالباً عنوانات کی فہرست نہیں دیکھی۔عنوانات میں ایک مستقل عنوان ہے 'برصغیر میں علم سیرت'۔اس عنوان کے تحت برصغیر میں ہونے والے کام کا تذکرہ آئے گا۔

☆

زادالمعاد میں جہاد سے متعلق احکام کو دہرا دیں۔

زاد المعاد کی تیسری جلد پوری جہاد پر ہے۔ اس کے شروع میں انہوں نے جہاد پر مختصر علمی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جہاد کی چار قسمیں یا چار درجات ہیں۔ ایک جہاد بالنفس، دوسرا جہاد بالکفار، تیسرا جہاد بالمنافقین اور چوتھا جہاد بالشیطان ہے۔ یہ جلد چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ چھ سو صفحات کو یہاں دہرانا ممکن نہیں۔

☆

ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کا اردو ترجمہ کس نام سے ہے؟

اس وقت مجھے نام یاد نہیں۔ لیکن اردو ترجمہ موجود ہے۔

☆

ابومحمد علی بن حزم نے دو کام کئے۔ ایک سیرت سے براہ راست متعلق ہے۔ دوسرا کام کون سا ہے؟

ایک کتاب تو انساب پر ہے اور دوسری جوامع السیرۃ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ یہ سیرت کی کتابوں کی تلخیص ہے۔ انساب پر ان کی کتاب سے بھی سیرت کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں۔

☆

ابن قیم کی کتاب کی خصوصیات ذرا دوبارہ دہرا دیں۔

ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہ بیک وقت حدیث، فقہ، سیرت، روحانیات اور تصوف سمیت ہر فن کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سیرت کے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے روزمرہ زندگی کے لئے ملنے والی رہنمائی کا بہت واضح تذکرہ اور مفصل بیان سامنے آجاتا ہے۔ سیرت مبارکہ کے نتیجہ میں پاکیزہ اخلاق کیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں یہ بیان کیا ہے۔ سیرت کے واقعات سے جو سبق ملتے ہیں وہ بھی بیان کئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد پوری کی پوری مغازی کے بارے میں ہے جس میں انہوں نے

مغازی کی تفصیل اور ان سے نکلنے والے قانونی احکام بیان کئے ہیں۔ جو درس اور عبرتیں نکلتی ہیں وہ بھی بیان کی ہیں۔

☆

علامہ اقبال کا یہ بیان کہ All previous prophets were Muhammad in the making. ان کی کس تحریر میں ہے؟

مجھے اس کا حوالہ زبانی یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ بات انہوں نے کسی مضمون میں بیان کی ہے۔

☆

خلیفہ ہارون رشید کی طرح اب بھی بہت سے لوگ مدینہ کے گردونواح میں زیارت کی جگہوں پر نوافل ادا کرتے ہیں۔ کیا یہ عمل درست ہے یا بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔

میرے نزدیک تو یہ عمل درست ہے۔ میں تو جب بھی موقع ملتا ہے ایسے بابرکت اور تاریخی مقامات پر نوافل ادا کرتا ہوں۔ دوسرے ممالک مثلاً مصر، اردن اور شام وغیرہ میں ایسے مقامات پر نوافل ادا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن چونکہ ہمارے سعودی بھائی اس کو ...نت سمجھتے ہیں اس لئے سعودی عرب میں ایسا کرتے وقت شرطہ سے بھی اپنی حفاظت کرنی ... ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے کہ آپ نوافل بھی ادا کریں اور شرطہ سے بھی اپنی حفاظت ...ں۔ اگر آپ کو موقع ملے تو اس احتیاط کے ساتھ ضرور نوافل ادا کریں۔

☆

ابن حزم نے انساب پر جو کتاب لکھی ہے اس کا مکمل نام کیا ہے؟

اس کا نام کتاب الانساب ہی ہے۔

☆

عاشورہ کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے روزہ کا
حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے دیا تھا تو وہ کس دن
ہوگا۔ کیا وہ دس محرم کو ہوگا یا کسی اور دن؟

اس وقت عام طور پر مسلمانوں میں جو رائے موجود ہے وہ یہی ہے کہ عاشورہ دس محرم
کو کہتے ہیں۔ دس محرم کے اور بھی فضائل بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے جو آدمی پہلے سے دس محرم
کے روزے کا اہتمام کرتا ہے اس کو یہ اہتمام ترک نہیں کرنا چاہئے۔ جو حضرات اپنی تحقیق میں
دس محرم کو یوم عاشورہ نہیں سمجھتے وہ روزہ نہ رکھیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ فرض یا واجب
نہیں ہے۔ محض مستحب ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ صحابہ کرام نے بھی سیرت رسول کو بیان
فرمایا؟ اس کی ذرا وضاحت کردیں۔

آپ نے شاید میری پچھلی گزارشات نہیں سنیں۔ صحابہ کرام میں متعدد وہ حضرات تھے
جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور ارشادات کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض بزرگوں
نے سیرت کے واقعات کو بھی قلم بند فرمایا۔ ان میں سے کئی کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ ان میں
سے ایک حضرت براء بن عازب تھے۔ ایک حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ حضرت
ابو ہریرہ اور دیگر کئی حضرات تھے۔

☆

ابن حزم اور داؤد کا ظاہری کا باہمی تعلق بتائیں۔

دونوں میں تعلق یہ ہے کہ دونوں مسلمان تھے۔ دونوں فقیہ تھے۔ محدث تھے

اور دونوں ظاہری نقطۂ نظر سے فقہی احکام کی تشریح کیا کرتے تھے۔

☆

Can you please repeat the name of the author of the book which focus on the Prophet Muhammad as a politician and diplomat.

رسول اللہ ﷺ کو سیاستدان کہنا میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔سیاستدان کا ایک خاص مفہوم ہے۔رسول اللہ نبی اور رسول تھے اور نبی آخرالزمان تھے۔آپؐ نے زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات اور رہنمائی چھوڑی۔سیاست دانوں اور سفارت کاروں کے لئے بھی رہنمائی چھوڑی۔تاجروں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی رہنمائی عطا فرمائی۔ان میں سے ہر پہلو پر الگ سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ایک کتاب جو بڑی جامع کتاب ہے۔اس کا تذکرہ آگے چل کر ہوگا۔ایک صاحب افضال الرحمٰن کے نام سے ہیں۔انگلینڈ میں رہتے ہیں۔انہوں نے دس بارہ جلدوں میں انسائکلو پیڈیا آف سیرت کے نام سے کتاب لکھی ہے۔اس میں ایک پوری اور بڑی ضخیم جلد رسول اللہ کی سیرت کے سیاسی اور سفارتی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔

☆

مہربانی فرما کر میلاد پڑھنے کی فضیلت اور اہمیت کے بارے میں بیان فرمادیں۔عوامی سطح پر اس کو کس طرح رائج کیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ لینا ہوتو آپ کسی مفتی سے پوچھئے۔یہ فتویٰ کا معاملہ ہے آپ کسی مفتی سے معلوم کیجئے۔

☆

ایک مبتدی کی حیثیت سے سیرت کی کون سی کتاب پڑھنی چاہئے جبکہ زبان بھی کمزور ہو۔

اگر آپ انگریزی میں پڑھنا چاہیں تو انگریزی میں سیرت پر مارٹن لنگز کی کتاب بہت اچھی ہے۔ MUHAMMAD: His Life based on Earliest Sources۔ زبان بہت اچھی ہے۔ کتاب بہت عالمانہ اور مآخذ بہت مستند ہیں۔
مختصر کتاب پڑھنا چاہیں تو ہماری دعوۃ اکیڈمی کی کتابیں سامنے رکھی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی لے لیں۔

☆

اتباع سنت میں پرانی دشمنی نظرانداز کرنا ثابت ہے۔ کیا انگریزوں کی پرانی دشمنی کے بارے میں کوئی ہدایت ملتی ہے۔

حضور ﷺ نے جن کی دشمنی کو بھلانے کے لئے کہا تھا وہ صحابی تھے اور اسلام لے آئے تھے۔ انگریز اگر دشمنی چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں تو ہم ان کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انہوں نے یہ دشمنی پانچ سو سال سے نہیں چھوڑی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آرہی ہے۔ وہ جو قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'وما تخفی فی صدورھم اکبر' تو یہ بات درست ثابت ہورہی ہے۔

☆

سیرت طیبہ پر عربی اور اردو میں سب سے مستند اور جامع کتاب کون سی ہے؟

سب سے جامع اور مستند کہنا تو بہت مشکل ہے۔ یہ جو میں نے اتنی تفصیل سے گزارشات کی ہیں سب مستند کتابوں کے بارے میں ہی ہیں۔ اردو اور عربی میں اگر آپ مختصر اور مستند کتاب پڑھنا چاہیں تو الرحیق المختوم پڑھ لیں۔ یہ اچھی کتاب ہے اور دونوں

زبانوں میں موجود ہے۔

ہمارے برصغیر کی کتاب پڑھنا چاہیں تو اس پر ان شاء اللہ ایک دن مستقل بالذات گفتگو ہوگی۔ وہاں بہت سی کتابوں کا تذکرہ آئے گا۔ برصغیر کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب رحمۃ للعلمین ہے، یہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تصنیف ہے۔ یہ بھی اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے۔

☆

براہ کرم ابن اسحٰق کا پورا نام بتا دیجئے۔

ابن اسحٰق کا پورا نام محمد بن اسحاق تھا۔

☆

یوم عاشور کے روزہ کے بارے میں ابن قیم کی کیا رائے تھی؟

غالباً ابن قیم کی رائے وہی ہے جو عام جمہور کی رائے ہے۔ یعنی اس سے مراد دس محرم ہی کا روزہ ہے۔

☆

مسلم سیرت نگاروں اور غیر مسلم سیرت نگاروں میں اگر کوئی فرق ہو تو واضح فرما دیں۔

غیر مسلم سیرت نگار اجنبیت کی نظر سے اور غیریت کے ساتھ لکھتا ہے جبکہ مسلمان ظاہر ہے عقیدت اور محبت سے لکھتا ہے۔ اپنے اور پرائے کی نظر میں فرق ہوتا ہے۔ بچے کی طرف اپنی ماں جس نظر سے دیکھتی ہے پرائی عورت اس نظر سے نہیں دیکھتی۔ جس عقیدت اور احترام سے بیٹا باپ کو اور مشرقی ماحول میں شاگرد استاذ کو دیکھتا ہے وہ کسی غیر سے توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

☆

کہا جاتا ہے کہ مسلمان پہلی مرتبہ جنگ میں قافلہ لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ کسی کا قافلہ لوٹ لیا جائے۔

عام اور پرامن حالات میں کسی تجارتی قافلہ لوٹنا بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ رسول اللہ ازخود تو قافلہ روکنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے قریش اور بعض دشمن قبائل کے تجارتی قافلوں کو روکنے کا حکم دیا تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ حالت جنگ تھی۔ جب دشمن کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا ہو تو اس کی مدد کے لئے آنے والے سامان کے قافلے روکے جا سکتے ہیں۔ آج پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہو جائے، تو پاکستان کے لئے بھارت کے تجارتی جہازوں کی نقل وحرکت کو روکنا جائز ہوگا۔ یہاں ملک کے قابل احترام امیرالبحر تشریف فرما ہیں، ان کی بحریہ بھارت کے لئے پٹرول وغیرہ لے جانے والے جہازوں کو بھی نہیں چھوڑے گی۔ یہ دنیا کے ہر قانون میں جائز ہے۔ اسی طرح جب کفار مکہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور اسلحہ جمع کر رہے تھے تو ان وسائل کو روکنا اور ان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے سے منع کرنے میں کوئی چیز غیر اخلاقی یا غیر قانونی نہیں تھی۔

☆

کل آپ نے سیرت نگاری کے مناہج واسالیب پر خطبہ دیا۔ اس موضوع کا ترجمہ انگریزی اخبار نیوز نے Science of Sirah; Genesis, formulation, evolution and expansion کیا ہے جو آپ کے دیئے ہوئے عنوان سے مطابقت نہیں رکھتا۔

معلوم نہیں نیوز اخبار نے کیا ترجمہ کیا ہے۔ مناہج کا ترجمہ تو methodology ہے۔ اخبار نے جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی کوئی غلط نہیں ہے۔ یہ منہج کا لفظی ترجمہ تو نہیں ہے لیکن

مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

☆

ان شخصیات کا کیا جائے جو کسی دوسرے پر جادو کرواتے ہیں۔

یہ بھی آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔

☆

اگر کوئی کسی کے جادو کا توڑ کرنا چاہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟

چونکہ میں نے جادو نہیں سیکھا اس لئے میں اس کا توڑ بھی نہیں جانتا۔

☆

زاد المعاد کے بارے میں سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب کتب خانے میں بیٹھ کر نہیں بلکہ حالت سفر میں لکھی گئی ہے۔

میں نے بھی یہی سنا ہے کہ یہ کتاب حالت سفر میں لکھی گئی تھی۔ وہ غالباً حج کرنے جا رہے تھے اور سفر کے دوران یہ کتاب لکھی۔ اس زمانے میں لوگوں کے حافظے بہت غیر معمولی ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر علمائے حدیث کا حافظہ دوسرے لوگوں کی نسبت بہت تیز ہوتا ہے۔ میں نے حدیث کے ایسے علما دیکھے ہیں جو اپنی یادداشت سے علم رجال اور روایات کی تفصیل اس طرح بیان کرتے تھے کہ ہم اور آپ کتاب میں سے دیکھ کر بھی بیان نہیں کر سکتے۔ اگر ابن قیم نے سفر حج کے دوران یہ کتاب لکھی ہو تو یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے۔

☆

اسپین کے علما نے سیرت کے میدان میں کیوں قدم بڑھایا۔
باقی علما بھی تو تھے۔

باقی علما نے بھی بہت قابل قدر اور وقیع کام کیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس وقت گفتگو میں آنے والی اکثر کتب کے مصنفین کا تعلق اسپین سے تھا۔ یہ انتخاب جان بوجھ کر نہیں کیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں خاصی دیر تک کوئی بھی دس کتابیں منتخب کرنے کے لئے سوچتا رہا۔ ہر کتاب اس قابل تھی کہ اس پر گفتگو کی جائے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اردو کتابوں کا تذکرہ برصغیر کے موضوع کے تحت ہونے والی گفتگو میں آجائے گا۔ کچھ کتابیں دور جدید کے سیاق وسباق میں بیان ہو جائیں گی۔ اس لئے میں نے اردو اور انگریزی کی کتابیں چھوڑ دیں اور عربی کتابوں پر اکتفا کیا۔ کتابیں بہت زیادہ ہیں اور ان میں انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔ اسپین کے علاوہ بھی ہر علاقے میں سیرت پر کتابیں لکھی گئیں۔ ابھی میں نے سیرت شامیہ اور سیرت حلبیہ کا ذکر کیا۔ امتاع الاسماع کا ذکر کیا۔ المواھب اللدنیہ بھی بڑی مشہور کتاب ہے۔ یہ کتابیں مصر اور شام میں لکھی گئیں۔

☆

محاضرہ کے دوران چائے کے پروگرام میں آپ سمیت ہم
سب کھڑے کھڑے پیتے ہیں۔ کیا کھڑے ہوکر پینا اور کھانا
سنت کے خلاف نہیں ہے؟

یہ بھی آپ کسی مفتی سے پوچھئے۔

☆

عقیدہ آخرت اور ایک خدا کا تصور تو بہت سے مذاہب میں
ہے۔ ایک خدا کا صحیح تصور دین اسلام میں ہے۔ اس طرح
اور عقائد کا عقلی ثبوت اور ان پر کئے جانے والے عقلی
اعتراضات کے جوابات پر لکھی جانے والی کتابوں کے نام

ارشاد فرمائیں۔

ان شاء اللہ کلامیات سیرت پر گفتگو کے دوران اس پر بات ہوگی۔

☆

آپ نے سیرت کے کچھ اہم مصادر کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ان کتب میں تاریخ الخمیس کا کیا مقام ہے۔

تاریخ الخمیس بہت عالمانہ اور فاضلانہ کتاب ہے۔دراصل تاریخ کی ہر کتاب میں اور خاص طور پر جو متقدمین علماء نے لکھی ہیں، ان میں حدیث اور سیرت پر معلومات کے ذخائر موجود ہیں۔

☆

ابن قیم کی تمام کتابیں کیا اردو میں موجود ہیں؟

تمام کتابیں تو اردو میں موجود نہیں ہیں۔میرے علم کی حد تک زاد المعاد اور اعلام الموقعین کا اردو ترجمہ دستیاب ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی کتاب ترجمہ ہوئی ہو تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔

☆

سیرت کی جو کتابیں مغربی محققین نے تحقیق کر کے شائع کی ہیں، ان پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

میرے خیال میں ان کتابوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔مخطوطات ہر جگہ دستیاب ہیں۔اگر کسی کو شک ہو تو مخطوطات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں۔میری نظر سے کوئی ایسی چیز نہیں گزری کہ کسی محقق نے غلط طور پر جان بوجھ کر منسوب کی ہو۔

☆

پروگرام کے شروع میں نعت پڑھنے کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

فتویٰ کی بات تو کسی مفتی سے پوچھئے۔ میرے خیال میں نعت پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں صحابہ کرام نعتیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔
میں فتویٰ نہیں دیتا، بلکہ میری ایک ذاتی رائے ہے، اس کا اظہار کر سکتا ہوں۔ میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ہم نے تلاوت قرآن کے فوراً بعد نعت خوانی کا التزام کر کے گویا قرآن پاک کو جو سراسر کلام الٰہی اور معجزہ کبریٰ ہے عام انسانوں کے کلام کے برابر کر دیا ہے۔ کم از کم مجھے ہر تلاوت کے بعد لازمی طور پر نعت پڑھنے سے، جو بہر حال انسانوں کا کلام ہے، یہی تاثر ہوتا ہے۔ اگر ہم تلاوت کے بعد پہلے حمد پڑھیں اور حمد کے بعد نعت ہو تو یہ تاثر نہ ہوگا۔

☆

کیا واقدی شیعہ تھے؟ اگر نہیں تو بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو شیعہ کیوں لکھا ہے؟

اس زمانے میں تشیع اور مفہوم کا ہوتا تھا۔ سنی شیعہ حضرات میں بعد میں جو شدت پیدا ہوئی، یہ اس زمانے میں نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہر وہ شخص جو حضرت علی یا اہل بیت سے زیادہ محبت رکھتا تھا وہ شیعہ کہلاتا تھا۔ واقدی کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔ ان کی کتاب کو پڑھ کر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرقہ وارانہ مفہوم میں شیعہ ہوں گے۔ کتاب میں کئی ایسی چیزیں بھی ہیں جو شیعہ روایات کے خلاف ہیں۔ مثلاً شیعہ روایت یہ ہے کہ مرحب کا قتل حضرت علی نے کیا تھا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کیا تھا۔ عمرو ابن عبدود کے بارے میں شیعہ روایت ہے کہ اس کو حضرت علی نے قتل کیا تھا۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ کسی اور صحابی نے قتل کیا تھا۔ اگر واقدی ہمارے ہاں رائج معنوں میں شیعہ ہوتے تو اس طرح کی روایات کو بیان نہ کرتے۔

☆

ابن حزم ظاہری تھے کہ مالکی؟ ابن حزم مالکی کی کتابوں کے بارہ میں بتایئے۔

ابن حزم مالکی سے تو میں واقف نہیں ہوں۔ ممکن ہو کوئی بزرگ گزرے ہوں۔ ابن حزم ظاہری مالکی نہیں تھے۔ پہلے شافعی مسلک کے پیرو تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا الگ مسلک اختیار کیا تھا ظاہری مسلک۔ انہوں نے اس مسلک کو اتنی ترقی دی کہ آج ظاہری مسلک ابن حزم ہی کے خیالات کا نام ہے۔

☆

کیا اسلام میں کھڑے ہو کر کھانا پینا جائز ہے؟

کسی مفتی سے پوچھئے۔ میرے خیال میں تو ضرورت کے وقت جائز ہے۔ اگر بیٹھنے کا صحیح انتظام نہ ہو تو کھڑے ہو کر کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا 'شرب قائما'۔ اسی شمائل ترمذی میں جس کا میں نے کئی بار ذکر کیا ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ حضور نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ جہاں جگہ نہ ہو یا زیادہ لوگ ہوں اور بیٹھنے کا بندوبست نہ ہو سکتا ہو تو وہاں کھڑے ہو کر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆

چھٹا خطبہ

ریاست مدینہ

دستور اور نظام حکومت

چھٹا خطبہ

ریاست مدینہ

دستور اور نظام حکومت

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلى على رسوله الكريم و علىٰ آله و اصحابه اجمعين

قابل احترام صدر جلسہ جناب ڈاکٹر محمود الحسن بٹ،
وائس چانسلر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
برادران مکرم،
خواہران معظم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: 'ریاست مدینہ، دستور اور نظام حکومت'۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کے سیاق وسباق میں نظام حکومت، دستور ریاست، حکمرانی کے آداب اور لوازم ریاست کا ذکر گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں بہت کثرت سے ہوا ہے۔ اس عرصہ میں دنیا کی مختلف زبانوں میں سیرت پر بہت سا ایسا مواد سامنے آیا ہے جس نے ایک طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قائم کردہ اداروں، آپ کی برپا کردہ اصلاحات اور آپ کی آوردہ تبدیلیوں کے بارے میں بہت وقیع اور قیمتی معلومات پیش کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ

ساتھ ان تحریروں کا ایک منفی اثر بھی ہوسکتا ہے، اور ممکن ہے یہ اثر پیدا ہوا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے عظیم الشان اور منفرد کارنامے کو محض ایک ریاست کا قیام، محض دنیاوی معاملات کی تکمیل، محض انتظامی نظم ونسق کی بہتری اور فراہمی سمجھ لیا گیا ہو۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ پیغمبر آخر الزمان، خاتم الرسل، دانائے سبل اور مولائے کل ہیں۔ آپ کا اصل مقصد اور ہدف جس کی خاطر آپ کو دنیا میں بھیجا گیا وہ قرآن مجید میں فرائض چہارگانہ کی صورت میں بیان کردیا گیا۔ یتلو علیھم آیاتہ، یعنی قرآن مجید کی آیات تلاوت کرکے لوگوں تک پہنچانا، ویزکیھم، لوگوں کی اخلاقی، روحانی اور اندرونی اصلاح کرنا یعنی تزکیہ نفس، ویعلمھم الکتاب والحکمۃ، کتاب اللہ کے اسرار ورموز کی تعلیم دینا اور اس کی بنیاد پر اللہ کی وحی کی روشنی میں جو دانائی آپ کو عطا ہوئی، جس کے سرچشمے آپ ہی کی ذات مبارک سے جاری ہوئے، ان کی تعلیم انسانیت کو دینا۔ یہ تھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بنیادی ذمہ داری۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے چونکہ آپؐ کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا، کسی اور شریعت کو نازل نہیں ہونا تھا، کسی اور کتاب کا نزول مقدر میں نہیں تھا، اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کو جامع اور کامل اسوۂ حسنہ بنایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ جہاں افراد اور عام انسانوں کے لئے نمونہ ہیں، وہاں آپ کی ذات مبارکہ حکمرانوں کے لئے، فرمانرواؤں، فاتحین، جرنیلوں اور سربراہان مملکت کے لئے بھی نمونہ ہے۔ اس لئے اللہ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ آپ ہی کی ذات گرامی میں نبوت اور حکمرانی دونوں کی صفات جمع فرمائی جائیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو تبدیلی فرمائی، جو انسانی تاریخ کی اتنی ہمہ گیر تبدیلی ہے جس کی مثال دنیا کی مدون تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ تبدیلی جس نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دی ہوئی تربیت سے اصلاح پذیر نہ ہوا ہو اور اس کے اثرات اور ثمرات اور اس کے آثار وبرکات اس نے قبول نہ کئے ہوں۔ اس ساری تبدیلی کے تحفظ کے لئے، اسلام کے تمدن کی بقا کو یقینی بنانے اور اسلامی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے ریاست ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ریاست اور حکومت اسلام کا مقصد نہیں بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کی منزل نہیں، نشان منزل ہے۔ اسی ضرورت کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ میں ریاست قائم فرمائی جو ہمیشہ کے لئے تمام ریاستوں کے لئے اسی طرح کا نمونہ ہے اور نمونہ رہے گی جس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہر انسان کے لئے نمونہ ہے۔ اس ریاست نے جو قوانین نافذ کئے وہ تمام قوانین کا سرچشمہ ہیں اور تمام قوانین کے لئے معیار اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت کا آغاز فرمایا اور آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت دنیا میں متعدد بڑی بڑی سلطنتیں اور ریاستیں قائم تھیں۔ بعض بڑی بڑی سلطنتوں کے قوانین بھی موجود تھے جن میں سے آج بھی تحریری طور پر کئی قوانین موجود ہیں۔ روما اور فارس کی سلطنتیں تو مشہور ہیں اور ان کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں بھی آیا ہے۔ لیکن روما اور فارس کے علاوہ ہمارے موجودہ برصغیر میں اور دنیا کے کئی متمدن مقامات پر بڑی متمدن ریاستیں اور حکومتیں قائم تھیں۔ چین میں ترقی یافتہ تمدن اور ریاست کا بھی عربوں کو علم تھا۔ خود جزیرہ عرب میں متعدد مقامات پر شمال اور جنوب میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں جو سلطنت روم یا فارس کے زیر نگیں یا ان کی باجگزار تھیں۔ اس لئے عرب ریاست کے وجود سے پورے طور پر آشنا تھے اور انہیں معلوم تھا کہ حکمرانی کیا ہوتی ہے اور بادشاہی کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ قدیم عرب شاعروں حیرہ، غسان اور کندہ کے حکمرانوں کے تذکرہ سے بھری پڑی ہے۔

لیکن جزیرہ عرب کے درمیانی علاقہ میں خاص طور پر صحرائی مقامات پر صورت حال قدرے مختلف تھی۔ یہاں کے اصل باشندے قبائلی نظام سے مانوس تھے۔ ان میں کبھی مدون تاریخ کے دوران کوئی متمدن ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ ان علاقوں میں قبائلی نظام رائج تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور خود مختار یونٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ جو قبیلہ جتنا بڑا ہوتا تھا اتنا ہی اس کا اثر رسوخ ہوتا تھا۔ قبائل میں عام طور پر فیصلے عامۃ الناس کی مرضی اور جمہور کی رضامندی سے کئے جاتے تھے۔ جس شخص کو قبیلہ کا سربراہ چنا جاتا تھا وہ اکثر اپنے قبیلے کا سب سے نمایاں اور بعض حالات میں سب سے معمر فرد ہوتا تھا۔ سربراہ قبیلہ کی ذاتی صلاحیتیں اور اس کا شخصی

کرداراس کے انتخاب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ اس قبائلی سردار کی کامیابی اور ناکامی میں اکثر و بیشتر یہ سب چیزیں فیصلہ کن ثابت ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ قبیلہ کے معمرترین افراد کو نظر انداز کر کے نسبۃً کم سن لوگوں کو قبیلہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اپنے والد ابو قحافہ کی موجودگی میں وہ قبیلہ کے سربراہ بنے اور ان کو اپنے قبیلہ میں نمایاں ترین مقام حاصل ہوا۔ اس لئے کہ اسلام سے پہلے ہی اہل قبیلہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت ابو قحافہ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ صلاحیتوں، کردار اور شخصیت کے اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔

یہ سمجھنا درست نہیں کہ عربوں کے ہاں قبائل کے اندر کوئی باقاعدہ نظم و نسق نہیں ہوتا تھا۔ جاہلی ادب اور دور جاہلی کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ہر قبیلہ ایک بہت منظم یونٹ ہوا کرتا تھا۔ اکثر قبائل میں مضبوط داخلی تنظیم موجود تھی۔ اس داخلی تنظیم میں ہر دس افراد پر ایک عریف مقرر ہوتا تھا۔ یہ عریف اپنے دس افراد کی ہر چیز کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ان کے تمام معاملات اور ضروریات کی ذمہ داری اس عریف کی ہوتی تھی۔ ہر دس عریفوں کے اوپر یعنی سو آدمیوں کے اوپر ایک نقیب مقرر ہوتا تھا۔ نقیب اپنے ماتحت عرفاء کے ذریعے بقیہ لوگوں کا ذمہ دار ہوتا تھا اور یوں 110 آدمیوں کی ذمہ داری نقیب کے سپرد ہوتی تھی۔ نقیب کے اوپر بھی ذمہ دار اور عہدیدار ہوتے تھے۔ ہر قبیلہ میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ عریف اور نقیب کا یہ ادارہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں بھی قائم رہا۔ اس کو آپ نے مزید پختہ بھی بنایا۔

عریف اور نقیب کے علاوہ ایک اہم ادارہ ولاء یا موالات کا ہوتا تھا۔ اس ادارہ کے ذریعہ قبیلہ سے باہر کا آدمی قبیلہ کی رکنیت حاصل کر سکتا تھا اور رکنیت کے حقوق اور ذمہ داریوں میں دوسرے افراد قبیلہ کے ہم پلّہ شمار ہوتا تھا۔ اسلام نے اس ادارہ کو بھی نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مزید بہتر بنایا۔ اس ادارہ نے اسلام کی وسیع اشاعت اور اسلامی معاشرہ کی توسیع کے دور میں اسلامی معاشرہ کے اندرونی استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے رسول اللہ ﷺ ایک معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے ایک ریاست قائم فرمائی۔ شریعت کے تفصیلی احکام نافذ فرمائے۔ معاشرتی، تمدنی، عائلی اور دیگر اصلاحات نافذ فرمائیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مغربی مستشرقین میں سے بہت سوں

کو یہ سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے کہ ایک پیغمبر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے۔ خاص طور پر عیسائی حضرات پیغمبری کے جس تصور سے مانوس ہیں وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا زہد و استغناء ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دنیا سے بیزاری اور ترک دنیا کا رجحان ہے۔ ان کے تصور میں رہبانیت، ترک دنیا اور دنیا کے تمام معاملات سے لاتعلق رہنا ہی نبوت کی شان ہے۔ اس لئے ان میں سے بہت سوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک نبی اور پیغمبر ریاست کیسے قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے معتدل سے معتدل ترین لوگوں نے بھی اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا۔ منٹگمری واٹ، انگریز مستشرق جو بہت معتدل مشہور ہیں۔ انہوں نے Muhammad at Mecca اور Muhammad at Madina کے نام سے دو بہت مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے بین السطور میں ہر جگہ یہ بات نمایاں ہے کہ مکہ میں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انداز ایک نبی کا تھا، لیکن مدینہ میں آپ کے مزاج، انداز اور پیغام میں تبدیلی آئی اور وہاں جا کر آپ ایک بادشاہ اور حکمران بن گئے۔

یہ اعتراض یا شبہ ایک تو اسلام کے مزاج اور رسول اللہ ﷺ کے پیغام کی خاتمیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام محض زاہدوں، مرتاضوں اور مستغنیوں کی تربیت کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ آپؐ تارک الدنیا لوگوں کی فوج بنانے کے لئے نہیں آئے تھے۔ آپ فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة کی جامعیت پیدا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ایک جگہ آپؐ نے خود فرمایا کہ انا نبی الملحمة انا نبی المرحمة، میں جہاں رحمت کا نبی ہوں وہاں میں جنگ کا نبی بھی ہوں۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ انا الضحوک القتال، میں جہاں انسانوں کے لئے مسکراہٹیں بکھیرنے کے لئے آیا ہوں وہاں بدکرداروں اور ظالموں کے لئے شمشیر براں بھی ہوں اور مجھے ان کے ساتھ جنگ کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک میں پہلے دن سے ہی یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔

جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں کفار کو دعوت دے رہے تھے تو آپ نے بار بار یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ آپؐ کی اس دعوت کو قبول کر لینے والے عرب وعجم کے حکمران بن سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت ابتدائی دور میں جب حضور علیہ السلام کے عم محترم جناب ابوطالب زندہ تھے اور کفار مکہ

کی طرف سے ابھی دشمنی اور مخالفت میں بہت شدت پیدا نہیں ہوئی تھی تو کفار مکہ نے چاہا کہ جناب ابو طالب کے ذریعے مصالحت کی کوئی شکل نکل آئے اور افہام و تفہیم کی کوئی ایسی فضا بن جائے جس میں یہ کشیدگی اور یہ شدت ختم ہو جائے۔ ابو طالب نے اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ مجھے اس سے زیادہ خوشی اور کس بات سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام بھی تشریف لے آئے اور کفار مکہ کے بڑے بڑے نمائندہ سردار بھی آ گئے۔ ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ کوئی بات کہنے آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ چچا! آپ جو بات پسند کرتے ہیں میں اس کے لئے تیار ہوں، آپ حکم فرمائیں۔ اس پر مکہ کے سرداروں نے اپنی بات کہی۔ حضور نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ بہت اہم ہے۔ غور سے سنیں کہ حضور نے فرمایا میں ان سے صرف ایک ایسے کلمہ پر ایمان لانے کی بات کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ اس کو مان لیں تو پورے عرب ان کے ماتحت ہو جائیں گے اور تمام عجم ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ یعنی عرب و عجم کی فرمانروائی اور برتری ان کو حاصل ہو جائے گی۔ یہ بات آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ایک دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ مکہ سے باہر شاید ہی کوئی اسلام کے بارہ میں کچھ جانتا ہوگا۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ کے آخری دور میں جب رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل کے وفود سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر جب حج کے موقع پر حضور دین کی دعوت دینے مختلف قبائل کی قیام گاہوں پر تشریف لے جا رہے تھے۔ تو اس موقع پر ہر قبیلہ سے آپ فرماتے تھے کہ لا الہٰ الا اللہ کا اقرار کر لو تو عرب اور عجم دونوں تمہارے زیر نگیں ہو جائیں گے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے ارشادات یہ بات واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام کے مزاج اور پیغام میں پہلے دن سے ہی یہ عنصر موجود تھا، بلکہ وہ عناصر موجود تھے جن میں زندگی کی مکمل تبدیلی، نظام معاشرت کی مکمل اصلاح، فرد اور معاشرہ کے ساتھ ساتھ حکومت کی مکمل اصلاح کا ایک پروگرام حضور کے پیش نظر تھا۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد ایک نیا اور اجنبی عنصر اسلام کی تعلیم میں شامل ہو گیا جو مکی دور میں شامل نہیں تھا۔

کچھ اور حضرات نے خاص طور پر مغربی مستشرقین نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ عرب کے ایک چھوٹے سے اور محدود ماحول میں رہ کر آپؐ کے مزاج اور انداز میں یہ

بین الاقوامیت اور بین الانسانیت یک بیک کیسے پیدا ہوگئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تو قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ قریش میں تو پھر بھی باہر کی آمد ورفت موجود تھی۔ سرداران قریش بیرونی دنیا میں روابط رکھتے تھے۔ مدینہ میں تو یہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے بعض مبصرین کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ بین الاقوامیت اسلام کے مزاج اور پیغام میں کیسے پیدا ہوئی۔ لیکن یہ مبصرین یہ اہم حقیقت بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بین الاقوامی پیغام لے کر آئے ہیں۔ پہلے دن سے پوری کائنات اور پوری انسانیت سے خطاب فرمارہے ہیں۔ مکہ مکرمہ کی بالکل ابتدائی اور بالکل آغاز کی سورتوں میں یاایھالناس اوریا بنی آدم سے خطاب ہے جس سے پوری انسانیت کا بیک وقت مخاطب ہونا واضح ہوجاتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا خاندان اور آپ کی ذات گرامی ایک ایسا بین الاقوامی مزاج اور کردار رکھتے تھے کہ جو عرب میں بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے جد امجد جناب قصی جنہوں نے مکہ مکرمہ کی شہری ریاست قائم کی ان کے ذاتی تعلقات اپنے زمانے کے کئی حکمرانوں سے قائم تھے۔ ان کا بچپن اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ شام میں گزرا تھا۔ وہ وہاں کے حالات ومعاملات سے اچھی طرح واقف تھے۔ غالبًا شام میں طویل سکونت کی بناء پر ہی ان کو قیصر روم کے دربار میں بھی تعارف حاصل تھا۔ ان کے تعلقات یمن کے حکمرانوں سے بھی تھے۔ قصی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قریش کی تجارت کو مختلف علاقوں میں منظم اور مرتب کیا اور ان کی انہی کوششوں اور تعلقات کی وجہ سے قریش کا تعارف بقیہ دنیا کے بہت سے حصوں میں ہوا۔ جناب قصی کو جب مکہ مکرمہ پر قبضہ بحال کرکے وہاں کا نظام بحال کرنے اور امن وامان قائم کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ایک باقاعدہ شہری ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس ریاست کو قائم کرنے میں جناب قصی کو خاصی تگ ودو کرنی پڑی۔ انہوں نے قبیلہ خزاعہ سے جو کعبہ کی تولیت پر عرصہ سے زبردستی اور ناجائز طور پر قابض تھا، جنگ کی اور کعبہ کے انتظام سے ان کو بزور بے دخل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جناب قصی کی اس مہم میں قیصر روم نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

جناب قصی کی قائم کردہ اس شہری ریاست کا تذکرہ مغربی مصنفین نہیں کرتے۔ مغربی مصنفین جب سٹی اسٹیٹ کی بات کرتے ہیں تو صرف یونان یا زیادہ سے زیادہ روما کی بات

کرتے ہیں۔ اگرچہ مغربی مصنفین مکہ کی شہری ریاست کا ذکر نہیں کرتے لیکن کسی کے تذکرہ نہ کرنے سے تاریخ کے حقائق نہیں بدل سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ کی شہری ریاست کئی سو سال تک قائم رہی۔

اس ریاست میں قصی نے پہلے دس شعبے قائم کئے اور ان کو قریش کے دس قبائل میں تقسیم کیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ مزید شعبے قائم ہوتے گئے جو مختلف قبائل میں تقسیم کئے جاتے رہے۔ یوں کل اکیس عہدے قائم ہوئے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ پیدائشی اور خاندانی طور پر اس عہدے کا حامل بھی ہوتا تھا، جو اس خاص قبیلے کا عہدہ تھا۔ جناب صدیق اکبر کے خاندان میں عدالتی ذمہ داری تھی اور خاص طور پر یہ ذمہ داری کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جائے یا زخمی کر دیا جائے تو اس کی دیت یا تاوان ادا کرنے کا معاملہ۔ ایسے تمام مقدمات کا فیصلہ جناب صدیق اکبر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق کے خاندان میں سفارت کا عہدہ تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت خارجہ کا عہدہ۔ دوسرے قبائل سے معاملہ اور گفتگو کے لئے جب قریش کی نمائندگی کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت عمر فاروق یا ان کے خاندان کے بزرگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اسی طرح سے مختلف خاندانوں میں مختلف عہدے قائم تھے۔ بنی عبدالدار جو عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا وہ بیت اللہ کا متولی تھا اور بیت اللہ کی چابی بنی عبدالدار کے سربراہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ جناب قصی کا قائم کردہ یہ عہدہ آج تک قائم ہے۔ آج بھی اس وقت بنو عبدالدار ہی کے ایک سردار کے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ اور حجاز کا کوئی بھی چھوٹا یا بڑا حکمران آج تک اس خاندان سے بیت اللہ کی چابی واپس لینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ نبوت کی دعوت دے رہے تھے تو اس وقت اس خاندان کے سردار عثمان بن طلحہ الشیبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ہجرت کا فیصلہ فرما چکے تھے۔ کفار مکہ کی طرف سے دشمنی انتہا پر تھی۔ حضور کا جی چاہا کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہو کر عبادت کریں اور یوں بیت اللہ کو الوداع کہیں۔ ہجرت سے چند دن پہلے حضور علیہ السلام نے عثمان بن طلحہ سے فرمایا کہ تم اگر میرے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھول دو تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ عثمان بن طلحہ نے بڑے تمسخر اور استہزا سے کہا کہ اب

میں تمہارے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھولوں گا؟ یہ طنزیہ جواب دیا اور دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن آئے گا جب بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جس کو چاہوں گا دوں گا۔ عثمان بن طلحہ نے کہا جس دن تمہارے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی آئے گی تو شاید قریش تو سارے مر گئے ہوں گے۔ قریش تو ذلیل ہو گئے ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، وہ دن قریش کی ذلت کا نہیں بلکہ قریش کی عزت کا دن ہوگا۔ اس کے بعد حضور ہجرت کے ارادہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ بیت اللہ میں الوداعی داخلہ کا موقع نہیں مل سکا۔

جب فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ اور آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ پھر آپ بیت اللہ کے اندر تشریف لے جانے کے ارادے سے کھڑے ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو طلب فرمایا۔ انہوں نے آکر دروازہ کھول دیا۔ آپؐ اندر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر اندر عبادت میں مصروف رہے۔ جب آپ بیت اللہ سے باہر نکلے تو آپؐ کے دست مبارک میں چابی تھی۔ لوگ باہر نیچے انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے عثمان بن طلحہ سے پوچھا کہ تمہیں یاد ہے میرے اور تمہارے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جی یاد ہے۔ آپ نے پوچھا کہ میں نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے دہرایا کہ آج کا دن قریش کی عزت کے آغاز کا دن ہے۔ اس وقت حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ، آج کے دن یہ چابی ہمیں دے دیجئے، ہمارے خاندان میں رہے گی۔ حضرت علی نے کہا ہمیں دے دیجئے۔ اور بھی کئی صحابہ نے خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے عثمان بن طلحہ کو بلا کر چابی انہی کو دے دی اور فرمایا کہ تم اس کو رکھو، وتبقیٰ فیکم خالدۃ تالدۃ لایاخذھا منکم الاظالم '، اس چابی کو تم رکھو۔ یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ کوئی تم سے نہیں لے گا۔ اگر کوئی تم سے لینا چاہے گا تو وہ ظالم ہوگا۔ صرف کوئی ظالم ہی تم سے یہ چابی لے سکے گا اور کوئی نہیں لے سکے گا۔ اب کوئی بھی شخص زبان رسالت مآب سے ظالم نہیں بننا چاہتا تھا۔ بڑے سے بڑے حکمران نے کبھی یہ جرات نہیں کی کہ یہ چابی اس خاندان سے واپس لے لے۔

میں نے 25 جنوری 1981ء کو یہ منظر دیکھا ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس تھی۔ بیت اللہ میں اس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ اجلاس نماز عشاء کے بعد کوئی نو ساڑھے نو بجے ختم

ہو گیا۔ اس وقت یہ تجویز کیا گیا کہ تمام مسلم سربراہان اور ان کے ہمراہی وفود بیت اللہ میں داخل ہوں۔ اس وقت تقریباً 57 سربراہان انتظار میں کھڑے تھے۔ اور کلید بردار کعبہ کی تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھے۔ مجھے ان کا اسم گرامی یاد نہیں، لیکن وہ ایک بہت ہی معمر بزرگ تھے وہ وہیل چیئر پر تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے بیت اللہ کا دروازہ کھولا۔ دروازہ پر وہیل چیئر پر بیٹھے رہے اور ایک ایک شخص کو اندر جانے کی اجازت دیتے رہے۔ ایک ایک شخص ان کی اجازت سے اندر جاتا رہا۔ میں نے مکہ مکرمہ کے قدیم باشندوں سے بارہا سنا ہے کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ وہ خود موجود نہیں تھے تو انہوں نے اپنے خاندان کے کسی اور فرد کو بھیجا۔ یہ بھی سنا ہے کہ بعض اوقات کوئی بچہ اس خاندان کا آیا اور اس نے دروازہ کھولا تو لوگ اندر داخل ہو گئے۔

یہ بات محض تاریخی اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک اور تصور بھی ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں بھی ایک شہری ریاست قائم فرمائی۔ آپ کی قائم کردہ یہ نئی شہری ریاست مدینہ دراصل مکہ مکرمہ کی ایک جلاوطن حکومت تھی جو مدینہ منورہ میں قائم کی گئی۔ اس لئے کہ آپ نے انہی صحابہ کرام کو وہی عہدے وہاں دیئے جو مکہ مکرمہ میں ان کے خاندانوں کو حاصل تھے۔ قاضی کا منصب حضرت ابوبکر صدیق کو حاصل تھا۔ بیرونی سفارت کی ذمہ داری حضرت عمر فاروق کو کئی مرتبہ سونپی گئی۔ بقیہ معاملات میں جہاں جہاں متعلقہ قبائل سے اگر صحابہ موجود تھے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے وہ ذمہ داریاں انہوں نے ہی انجام دیں۔

جناب قصی کے بعد ان کے جانشینوں میں سب سے نامور اور غیر معمولی شخصیت جناب ہاشم بن عبد مناف کی تھی۔ جلد ہی انہوں نے ریاست مکہ کے سربراہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وہ بڑی مشہور اور بین الاقوامی شخصیت تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دادا کے والد تھے۔ جناب ہاشم اس اعتبار سے بڑے نمایاں ہیں کہ نہ صرف عرب کے قبائل میں بہت معتبر تھے بلکہ قیصر روم کے دربار میں براہ راست شناسائی رکھتے تھے۔ قیصر روم ان کی شخصیت سے متاثر تھا۔ جب وہ تجارت کا قافلہ لے کر شام جاتے اور قیصر روم شام میں ہوتا تو وہ ملاقات کے لئے جناب ہاشم کو بلایا کرتا اور روایت میں آتا ہے کئی مرتبہ بعض معاملات میں ان کی

ذہانت اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے ان کی رائے بھی لی۔ جناب ہاشم نے قریش کے قبیلہ کے لئے روم کی سلطنت سے بہت سی مراعات حاصل کیں۔ یمن میں ایرانیوں کی جو کالونیاں تھیں، وہاں سے بھی قریش کے لئے رعایتیں حاصل کیں۔ اس طرح آس پاس کی دوسری ریاستوں مثلاً حبشہ سے مراعات حاصل کیں۔ یہ تمام مراعات اور سہولتیں قبیلہ قریش کو جناب ہاشم کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔

جب قرآن مجید میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ **لایلاف قریش ایلفهم رحلة الشتاء والصیف o فلیعبدوا رب هذاالبیت o الذی اطعمهم من جوع وامنهم من خوف o** کہ جس بیت اللہ کی تولیت کی وجہ سے تمہیں یہ مراعات حاصل ہوئی ہیں اس بیت اللہ کے کچھ حقوق بھی تم پر عائد ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش کو یہ عزت افزائی بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے حاصل تھی۔ بیت اللہ کی خدمت اور تولیت سے جو اعزاز حاصل ہوا ہے اور جو بین الاقوامی شناسائی ملی ہے تو اس کا کم سے کم اتنا حق تو ادا کرنا چاہئے کہ اس پروردگار کی عبادت کریں جس پروردگار کے نام سے یہ گھر منسوب ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کا حوالہ تھا کہ انہی کے خاندان کی برکت سے اور انہی کے آباؤ اجداد کے طفیل تمہیں یہ ساری مراعات حاصل ہوئیں۔ اور آج انہی ہاشم کے پڑپوتے کے ساتھ تم جو ظلم کر رہے ہو اس پر تمہیں غور کرنا چاہئے۔

رسول اللہ کی نبوت کا دسواں سال تھا۔ اس سال کو حضور نے عام الحزن قرار دیا تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک ایسی خاتون جنہوں نے پچیس سال شب و روز حضور کی معیت میں وقت گزارا تھا۔ نبوت کی سب سے پہلے تصدیق انہوں نے کی تھی۔ اپنا پورا اثر رسوخ، خاندان، مال و دولت ہر چیز اسلام پر نچھاور کر دی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جناب ابو طالب بھی انتقال کر گئے تھے جنہوں نے ہر مرحلہ پر حضور کی سرپرستی اور مدد فرمائی تھی اور آپ کی ذات گرامی کو بے مثال تحفظ فراہم کیا تھا۔ اس لئے اس سال کو حضور نے بجا طور پر عام الحزن قرار دیا۔ ان حالات میں جو شخص ابو طالب کا جانشین بنا وہ بدقسمتی سے ابولہب تھا جو حضور کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں خاندان چونکہ قبائلی نظم کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ قبائلی مدد اور سپورٹ کے بغیر کسی شخص کے لئے اس معاشرہ میں زندہ رہنا اور کام کرنا تقریباً ناممکن

تھا۔اس لئے اب دعوت اسلامی کے راستہ میں بے پناہ مشکلات آ کھڑی ہوئیں۔

جب تک جناب ابو طالب زندہ رہے تو ان کی مدد اور سرپرستی جناب رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھی۔ وہ قبیلہ بنو ہاشم اور پورے قریش کے سردار تھے۔ان کو اپنے قبیلہ کی تائید بھی حاصل تھی اور جس حد تک ان کے بس میں ہوا انہوں نے قریش کو بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ان کے انتقال کے بعد یہ ساری حمایت ابولہب نے ختم کر دی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مکہ مکرمہ میں دعوت کا کام جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آس پاس کے قبائل سے مدد لینے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ کوئی قبیلہ اسلام کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔اس ضمن میں حضور علیہ السلام قرب و جوار کے مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔طائف کی داستان سے ہر شخص واقف ہے۔اس کے ساتھ ساتھ حضور یہ بھی کرتے تھے کہ حج کے لئے جب مختلف قبائل کے لوگ مکہ مکرمہ آتے تھے تو حضور علیہ السلام منیٰ میں ان کے ٹھکانوں پر جا کر ان کو دعوت دیا کرتے تھے۔لیکن ان دعوتی اجتماعات کا نتیجہ بالکل حوصلہ افزا نہ تھا۔ ہر قبیلہ کی طرف سے یا تو ایک لاابالی اور لاپرواہی کا رد یہ ہوتا تھا یا مخالفت کا ہوتا تھا۔اگر کسی عرب قبیلہ نے روایتی اخلاق اور مہمانداری کے مطابق آپ کا خیر مقدم کیا بھی یا آپ کی بات سننے کے لئے تیار ہوا تو پیچھے سے ابولہب کے بھیجے ہوئے کارندے تعاقب میں ہوتے تھے۔وہ خرافات بکتے تھے۔ یوں اس قبیلہ کو یہ خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ مکہ میں بیٹھ کر قریش کی مخالفت کیوں مول لیں۔اس لئے وہ حضور ﷺ کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔

پہلی مرتبہ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک صاحب سے حضور ﷺ کا واسطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ یہ صاحب سوید بن صامت تھے جو مدینہ میں اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کی وجہ سے الکامل کی وجہ سے مشہور تھے۔حضور ﷺ نے ان کے سامنے دعوت پیش کی۔انہوں نے توجہ سے بات سنی اور حضور ﷺ کے پیغام میں دلچسپی لی۔ان کے پاس حکمت لقمان کے کچھ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میرے پاس بھی اسی طرح کی چیز ہے جو آپ بیان فرمارہے ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کے پیغام کو قبول تو نہیں کیا لیکن مخالفت بھی نہیں کی۔اس کے بعد سوید بن صامت کا انتقال ہو گیا۔سیرت نگاروں میں اس پر بحث ہوتی رہی ہے کہ سوید بن صامت اسلام قبول کر چکے تھے یا نہیں۔اور کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے یا نہیں۔

اس کے بعد غالباً اس سے اگلے سال مدینہ منورہ کا ایک اور گروہ مکہ مکرمہ حج کرنے کے لئے آیا۔ یہ قبیلہ اوس کی ایک شاخ بنو عبدالاشہل کے کچھ لوگ تھے۔ یہ قریش مکہ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتے تھے جس کے مطابق خزرج کے ساتھ لڑائی میں قریش مکہ اوس قبیلہ کا ساتھ دیں۔ حضور ﷺ ان کے پاس بھی بات کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے بہت غور سے آپ کی بات سنی۔ اخلاق سے پیش آئے۔ اور کہا کہ ہم اس وقت تو ایک اور کام کے لئے آئے ہیں، اس لئے اس موقع پر ہم کسی اور کام پر توجہ نہیں دے سکتے۔ انہوں نے بھی حضور ﷺ کی بات قبول نہیں کی۔

اہل مدینہ کے ساتھ حضور ﷺ کا پہلا باقاعدہ رابطہ اس وقت ہوا جب آئندہ سال یعنی غالباً سنہ گیارہ نبوت میں مدینہ منورہ سے آنے والے چھ حجاج کرام کے ساتھ حضور ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ چھ کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا اور مدینہ چلے گئے۔ بعض لوگوں نے اس کو پہلی بیعت عقبہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے حضرات لوگ نے اس کو بیعت قرار نہیں دیا کیونکہ اس موقعہ پر کسی باقاعدہ بیعت کا باقاعدہ ذکر نہیں ملتا۔ کسی سیرت نگار نے ان حضرات کی بیعت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ان حضرات نے واپس جا کر مدینہ منورہ میں دعوت اور تبلیغ کا کام کیا۔ اگلے سال جب یثرب کے لوگ حج کے لئے آئے تو بارہ حضرات کا ایک باقاعدہ وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان بارہ میں سے پانچ حضرات تو پچھلے سال والے تھے اور غالباً سات افراد نئے تھے۔ ان بارہ افراد نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ بیعت کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی مبلغ کو بھیجیں۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان کا تعلق بھی بنی عبدالدار سے تھا۔ انہوں نے مدینہ جا کر اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔ ان کی تبلیغ بہت مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔ جلد ہی مدینہ منورہ کے ہر گھر، خاندان اور برادری میں اسلام کا نام اور چرچا پھیل گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ مسلمان بھی ہو گئے۔ اس کے اگلے سال 72 افراد اسلام قبول کرنے کے ارادے سے بقیہ حجاج کے ساتھ آئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ بیعت کی اور عقبہ کے مقام پر حضور ﷺ کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کیں۔ عقبہ وہ جگہ ہے جب آپ منیٰ سے مکہ مکرمہ کی طرف آئیں تو دائیں طرف ایک

بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی شکل دیوار کی سی ہے۔ اس کے اندر ایک راستہ جاتا ہے جہاں ایک مسجد ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں یہ ملاقاتیں ہوئیں۔

یہ بات بڑی دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ان ملاقاتوں میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی موجود تھے۔ اس لئے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ بہت ابتدا میں اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور ﷺ کے حکم اور مشورہ ہی سے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، ان کی رائے کی اس سے تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مدینہ کے لوگوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ کو ہمارے ساتھ جانے کی ہدایت دیں اور خود بھی مدینہ تشریف لے آئیں۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو ہجرت کرکے مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ صحابہ ایک ایک کرکے مدینہ منورہ جانے لگے۔ یہ جو معاہدہ ہوا، جس میں باقاعدہ بیعت بھی ہوئی اس کو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بیعت بیعت حرب کہلاتی ہے۔ پہلی بیعت النساء کہلاتی ہے۔ بیعت النساء کے لفظی معنی تو ہیں عورتوں کی بیعت۔ لیکن عورتوں کی بیعت سے مراد بیعت کے وہ الفاظ ہیں جو سورۃ ممتحنہ میں آئے ہیں جس میں حضور علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ خواتین سے بیعت کریں تو فلاں فلاں چیزوں کی بیعت لیں۔ خواتین چونکہ میدان جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ نہ ان سے یہ وعدہ لینا مناسب تھا کہ وہ میدان جنگ میں جا کر لڑیں۔ اس وجہ سے ان سے جنگ میں حصہ لینے کی بیعت نہیں لی جاتی تھی۔ اس لئے جنگ کے علاوہ اور چیزوں کی بیعت کو بیعت نساء کہا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلی بیعت کو بیعت نساء کے نام سے یاد کیا گیا۔

دوسری بیعت میں انصار مدینہ نے یہ وعدہ کیا کہ ہم آپ کا دفاع بھی کریں گے۔ آپ کے لئے لڑیں گے۔ جو آپ پر حملہ آور ہوگا اس کو ہم اپنے اوپر حملہ آور سمجھیں گے اور آپ کے ساتھ ہر سرد و گرم میں مل کر رہیں گے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر چیز میں ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ جب یہ بیعت ہوگئی تو بعض انصاری صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں مکہ فتح کر دے تو آپ واپس مکہ چلے جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟ انہوں نے مناسب انداز میں یہ سوال حضورؐ کے سامنے رکھا۔ جواب میں آپ مسکرائے اور فرمایا: میرا خون تمہارا خون، تمہارا خون میرا خون، تمہاری صلح میری صلح اور میری صلح تمہاری صلح۔ اب تمہارے

ساتھ ہی مرنا جینا ہوگا۔ یہ معاہدہ تھا جس کے بعد حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

آج سیاست و ریاست کے سیاق و سباق میں سوشل کنٹریکٹ کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ روسو کے زمانے سے ہورہی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یورپ میں کوئی ریاست کسی باقاعدہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر قائم ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کوئی تاریخی ثبوت ایسا نہیں ہے کہ کسی حکمران کے ساتھ ریاست کے قیام سے پہلے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو اور اس معاہدہ کے نتیجہ میں کوئی ریاست قائم ہوئی ہو۔ یورپ کے برعکس یہاں تمام سیرت نگار اور مورخین متفق ہیں کہ دو مرتبہ معاہدہ ہوا۔ 72 آدمی جو نہ صرف اپنے اپنے قبائل کے نمائندہ تھے بلکہ اتنے نمایاں افراد تھے کہ پہلے سے وہاں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے قبیلہ کی طرف سے معاہدہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے توثیق فرمائی اور اس کے نتیجہ میں آپؐ مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جو ایک آزادانہ سوشل کنٹریکٹ کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔

مدینہ کی ریاست اور بقیہ ریاستوں میں ایک دوسرا بڑا اہم فرق یہ ہے کہ جب ریاست بنتی ہے تو اس کو چلانے کے لئے قانون کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا ریاست مقصد ہے اور قانون اس کو چلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں اس کے برعکس ہے۔ یہاں ایک قانون الٰہی نازل ہورہا تھا۔ ایک شریعت دی جارہی تھی۔ اس شریعت کے بعض احکام مکہ مکرمہ میں نازل ہوچکے تھے۔ اس شریعت کے نفاذ اور تحفظ کے لئے ریاست کی ضرورت تھی۔ یہاں قانون اصل چیز تھی اور ریاست ذریعہ تھی۔ لہٰذا شریعت اصل مقصود ہے اور ریاست اس کا ذریعہ ہے۔ اسلام میں ریاست مقصود نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست حصول مقصد کا ایک اہم اور ضروری وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں ریاست کا درجہ بعد میں ہے۔ شریعت کا درجہ پہلے ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو بیعت عقبہ تھی اور جس میں ریاست کی بنیاد رکھی گئی یہ اسلامی ریاست کا روز آغاز تھی۔ 11 ذی الحجہ 13 نبوت گویا اس کے فوراً بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اگر ریاست مدینہ کے آغاز کی تاریخ حضور ﷺ کے پہنچنے سے پہلے شمار کی جائے تو وہ نبوت کے گیارہویں سال ذی الحجہ کی تیرہویں تاریخ ہوگی۔ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے شمار کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس معاہدہ کے نتیجے میں حضور ﷺ کو آئندہ ریاست مدینہ کا سربراہ تسلیم کیا جاچکا تھا۔ اسلامی قوانین پر چلنے کا عہد و پیمان ہوچکا تھا۔ حضور کے مقرر کردہ کارندے

وہاں ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔ اس لئے ریاست تو حضور کی تشریف آوری سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام جانا شروع ہو گئے، جو جو صحابی وہاں پہنچتے گئے انہوں نے وہاں ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ 11 ذی الحجہ سن 13 نبوی کو مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ اس کے سربراہ کے طور پر بعد میں وہاں تشریف لے گئے۔

مدینہ منورہ جانے سے پہلے جو بیعت ہوئی اس کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک سیاسی اور ریاستی بندوبست کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ انصار مدینہ نے طے کیا کہ ہم ہر معاملہ میں آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، یعنی سمع وطاعت۔ آپ کے ارشادات قانون کا درجہ رکھیں گے اور ہم ان کی پیروی کریں گے۔ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اپنی ذمہ داری انجام دیں گے۔ آپ کے احکام کو بجالانے میں ہم اپنی قوت استعمال کریں گے۔ جو حق کا معاملہ ہوگا اس میں صرف حق کی پیروی کریں گے اور کسی قبائلی عصبیت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ حق کے معاملہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے خوف نہیں کھائیں گے۔

معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ میں ایک چھوٹی سی کامن ویلتھ قائم ہو گئی۔ کامن ویلتھ اس لئے کہ یہ ایک قبائلی معاشرہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان قبائلی یونٹوں کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ ہر قبیلہ میں عریف اور نقیب مقرر فرمائے تاکہ اس قبیلہ کی طرف سے بات کر سکیں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے مہاجرین کے نمائندے بھی مقرر فرمائے۔ اس طرح سے الگ الگ یونٹ قائم ہو گئے۔ ان یونٹوں کے باہمی اتحاد سے ایک ایسی دولت مشترکہ وجود میں آ گئی جو داخلی طور پر خود مختار یونٹوں پر مشتمل تھی۔

مدینہ منورہ کے ماحول پر اگلے ہفتے بات ہوگی۔ جس شہر کو مدینہ منورہ کا نام دیا گیا یہ کوئی ایک شہر نہیں تھا۔ بلکہ یہ بہت سی بستیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا رقبہ تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ غالباً درست ہوگا کہ وہ موجودہ اسلام آباد کے رقبہ کے برابر تھا۔ اس کا طول تقریباً تیرہ چودہ یا شاید پندرہ میل کے قریب تھا۔ عرض دس بارہ میل کے درمیان تھا۔ تمام سیرت نگاروں نے اس کی شمالی اور جنوبی حد جبل احد اور جبل عیر کو قرار دیا ہے۔ جبل عیر سے پرے آج

کل مدینہ کا ایئرپورٹ ہے۔ ایئرپورٹ سے شہر کی طرف جاتے ہیں تو راستے میں جبل عیر پڑتا ہے۔ جبل احد اور جبل عیر کے درمیان شمالاً جنوباً یہ حد ہے۔ اور شرقاً غرباً بھی دس بارہ میل کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں بہت سارے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔ ان کے لئے آطام کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ یہ قلعے اس نوعیت کے جس کو اردو میں گڑھی کہتے ہیں۔ گڑھی سے مراد ایک ایسی بڑی حویلی ہے جو دفاعی طور پر مضبوط بنائی گئی ہو۔ جس کے اندر ایک سے زائد خاندان رہتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ بھی وہاں رہتا ہو۔ اس کے باہر ان کی زمینیں ہوں جس پر وہ کاشت کرتے ہوں۔ کچھ لوگ باہر زمینوں پر رہتے تھے۔ کچھ لوگ اطم یعنی گڑھی میں رہا کرتے تھے۔ اس طرح کے تقریباً 72 آطام مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں موجود تھے۔ اس وقت بھی بعض آطام کے اثرات مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ اگر آپ وہاں تشریف لے جائیں تو کعب بن اشرف کے اطم کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ خود شہر مدینہ کے اندر بھی بعض آطام کے آثار موجود ہیں۔ اس طرح بعض باغات بھی ابھی تک موجود ہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا باغ ہے جو ایک قبیلہ کی ملکیت ہے۔ اس باغ کے درمیان میں یا اس کے ایک طرف بڑی حویلی قائم ہے جس میں وہ سارا قبیلہ یا خاندان رہتا تھا۔ اس پورے رقبہ میں ان اطام کے علاوہ بارہ پندرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں کا نام یثرب تھا اور جو نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی اس پورے علاقہ کو یثرب بھی کہا جاتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں وہ بھی تھا جس میں آج مسجد نبوی موجود ہے۔ یہ گاؤں بنو مالک بن نجار کی ملکیت تھا۔ وہاں ایک خالی جگہ دو یتیموں کی ملکیت تھی جو حضور نے معاوضہ دے کر خرید لی اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس پورے علاقہ کا نام مدینۃ النبی یا مدینہ قرار پایا۔

مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بلکہ باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک ریاستی نظم و نسق قائم کیا گیا۔ اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ ﷺ نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ اور ابتلا کی روایت ختم ہوگئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔ ہجرت سے غالباً سات آٹھ سال قبل ایک جنگ شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی۔ کئی سال جاری رہی اور اوس اور خزرج کے قبائل آپس میں شمشیر آزما ہوئے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی، اسی جنگ سے مایوس ہو کر اور اس سے پریشان ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دے رکھی تھی کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کی تجویز کے مطابق وہ منتخب سربراہ عبداللہ بن ابئ تھا جو بعد میں منافقین کا سردار کہلایا۔ اس کی مشترکہ سرداری یا بادشاہی کا معاملہ باقاعدہ طے تو نہیں ہوا تھا لیکن تجویز زیر غور تھی۔ بعض لوگ متفق تھے اور بعض لوگ نہیں تھے۔ یقیناً عبداللہ بن ابئ اور اس کے رفقاء کی یہ کوشش ہوگی کہ تجویز پر عمل ہو جائے۔ اسی اثنا میں ہجرت کا واقعہ پیش آ گیا اور جتنے انصاری صحابہ یعنی اوسی اور خزرجی تھے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوگئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبداللہ بن ابئ کے لئے سوچی جا رہی تھی۔

حضور ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ہی مدینہ منورہ کا داخلی نظم و نسق طے فرما دیا تھا۔ جو مہاجرین تھے وہ مختلف انصاری خاندانوں کے ساتھ ان کے خاندانوں کے فرد قرار پائے۔ انصاری خاندانوں میں بارہ نقیب پہلے ہی مقرر کر دئے گئے تھے۔ سعد بن عبادہ خزرج قبیلے کے نقیب النقباء کہلائے۔ جو بقیہ نقباء منتخب کئے گئے اور جن کو ان کے قبیلوں نے پہلے ہی منتخب کیا تھا وہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو پہلے سے ہی اپنی اپنی قوم میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت براء بن معرور کے بارے میں ابن ہشام کی روایت ہے کہ ان کے بارہ میں لوگوں نے کہا کہ **هو سيدنا و شريفنا و ابن سيدنا و ابن شريفنا**، وہ ہمارے سردار بھی ہیں، باعزت آدمی ہیں، ہمارے سردار کے بیٹے ہیں اور شریف آدمی کے بیٹے ہیں۔ اس طرح سے جب یہ سارا مقامی بندوبست مکمل ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے آپ نے تین کام کئے۔ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ اس سے پہلے قبا میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے مواخاۃ کا عمل مکمل فرمایا۔ جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کو مدینہ کے خاندانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ مواخاۃ دراصل ایک قدیم عرب ادارہ کے احیا کا ایک نیا انداز تھا۔ یہ ولاء کے نام سے

عرب میں رائج تھا۔ اسلام کے بعد بھی رائج رہا۔ ولاء سے مراد یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر چاہے تو اپنے قبیلے سے تعلق ختم کر کے کسی دوسرے قبیلہ سے تعلق جوڑ سکتا تھا۔ اگر دوسرا قبیلہ قبول کر لے تو وہ شخص پھر اس دوسرے قبیلہ کا فرد بن جاتا تھا۔ اس کو ولاء کا تعلق کہا جاتا تھا۔ جو شخص اس طرح کا تعلق قائم کرتا تھا اس کو مولیٰ الموالات کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ شخص جو ولاء کے ذریعے مولیٰ بنا ہو۔ مولیٰ کے معنی دوست، تعلق رکھنے والا، مدد کرنے والا، مدد کی توقع رکھنے والا، یہ سب معنی مولیٰ کے لفظ کے ہیں۔

تیسرا کام حضور نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مورخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام ابوداؤد، امام احمد بن حنبل اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور مورخین میں کئی افراد نے اس کے لئے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کتاب رسول اللہ ﷺ للانصار والمہاجرین یا بین الانصار والمہاجرین۔ کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں کتاب کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ 'لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب الیم' اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ آ چکا ہوتا، کلا ان الکتاب الابرار لفی علیین کلا ان کتاب الفجار لفی سجین۔ لہٰذا کتاب کا لفظ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور مفہوم میں آیا ہے اس سے مراد فیصلہ اور حکم ہے۔ اس لئے یہاں کتاب کے معنی میثاق یا معاہدہ لینا درست نہیں ہے۔ یہ چارٹر یا فیصلہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور نے قبائل سے بات کی۔ اور چارٹر کی تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں سے ابتدائی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت انس کی گھر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ میں حضور کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا گھٹنا اور حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔

اس کے بعد جب یہ معاہدہ مکمل ہو گیا۔ عام طور پر مورخین کا اور جدید مورخین میں سے

بہت سے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ معاہدہ جو اس وقت 47 یا 52 دفعات پر مشتمل ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ معاہدہ دو الگ الگ اوقات میں کیا گیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک ہی معاہدہ ہے اور ایک ہی وقت میں کیا گیا تھا۔ تقریباً تمام قدیم مصنفین اس کو ایک ہی وقت میں ہونے والا ایک معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ جدید مصنفین میں سے مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور کئی اور حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ دو الگ الگ دستاویزات تھیں جو دو مختلف اوقات میں مرتب ہوئیں اور بعد میں ان کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ پہلی پچیس دفعات تو ہجرت کے بالکل ابتدائی دنوں میں مرتب ہوئیں۔ اور یہ مہاجرین اور انصار اور انصار کے مختلف قبائل کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا۔ دوسرا حصہ غزوہ بدر کے بعد مرتب ہوا۔ اس کی رو سے یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہوئے۔ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں ایک جگہ دو کتابوں کا حوالہ ہے کتاب النبی ﷺ للمہاجرین والانصار اور کتاب النبی ﷺ للیہود۔ اس سے پتہ چلا کہ قدیم مصنفین میں سے ابن منظور افریقی بھی اس کو دو دستاویزات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ امام ابوداؤد نے بھی اپنی کتاب الخراج والفیٔ والامارۃ، جو سنن ابوداؤد کا ایک حصہ ہے، اس کے باب نمبر 21 میں جس کا نام ہے **باب کیف کان اخراج الیھود من المدینہ المنورۃ** ۔کہ یہودیوں کا اخراج مدینہ منورہ سے کب اور کیسے ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیسے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک کتاب تحریر فرمائی تھی اور یہ کہ غزوہ بدر کے بعد یہودی بھی اس چارٹر میں شامل ہو گئے تھے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ یہ دو الگ الگ معاہدے تھے جو بعد میں ایک دستاویز میں جمع کر دیئے گئے۔ اس کی دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے 52 قرار دی ہیں۔ وینسنک جو مشہور ڈچ مستشرق تھے، انہوں نے 47 دفعات قرار دی ہیں۔ بعض اور مصنفین نے 56 دفعات قرار دی ہیں۔

یہ تحریر یا دستاویز ایک آئینی دستاویز ہے، اور ڈاکٹر حمید اللہ اور دل ہاوزن اور کئی دوسرے جدید مصنفین نے بجا طور پر اس کو انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور کہا ہے۔ یقیناً یہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری اور مدوّن دستور ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے تحریری دستور مرتب کر کے نافذ کیا گیا ہو۔ اس کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔ پہلی دو دفعات بڑی اہم ہیں میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هـذا كتاب من محمد النبی ﷺ بين المومنين والمسلمين من قريش ويثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم انهم امة واحدة من دون الناس ۔ اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے۔ یہ ایک چارٹر ہے جو پیغمبر اسلام محمد (ﷺ) نے جاری کیا ہے۔ یہ ان مومنین اور مسلمین کے درمیان ہے۔ جن کا تعلق قریش اور یثرب سے ہے اور ان تمام لوگوں سے جو بعد میں ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کے ساتھ آملیں۔ اور ان کے ساتھ جہاد کریں۔ یہ تو فریقین کا ذکر آ گیا کہ یہ وہ پارٹیاں ہیں جن کے درمیان یہ چارٹر جاری کیا گیا۔

امة واحد من دون الناس میں **من دون** کا لفظ بڑا اہم ہے۔ دون کا لفظ عربی زبان میں کسی چیز کو exclude کرنے کے لئے آتا ہے۔ من دون کا صحیح ترجمہ ہوگا to the exclusion of ۔ یہ ایک امت واحدہ ہے، تمام انسان سے الگ۔ اس کو انگریزی میں کہا جائے تو یوں کہا جائے گا: They shall constitute one single indivisible Ummah to the exculsion of all other human beings.۔

یہ چارٹر حضور ﷺ نے بطور سربراہ ریاست دیا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک قبائلی نظام میں ایک ریاست قائم ہورہی ہے۔ پہلی مرتبہ ایک ایسی امت قائم ہورہی ہے جو مختلف قبائلی وابستگیوں سے ماورا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک دینی عقیدہ کی بنیاد پر ایسی وحدت قائم کی جارہی ہے جو رنگ ونسل سے بالاتر ہے۔ ان دفعات سے یہ باتیں خود بخود سامنے آتی ہیں۔

ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک مدینۃ النبی کا نام زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ مدینۃ النبی کا نام اگر عام ہوگیا ہوتا تو شاید یثرب کے بجائے وہی لکھا جاتا۔ بعد کی بعض دستاویزات میں مدینہ کا لفظ شامل ہے۔ جو قبائل اس دستاویز میں شامل ہوئے آگے چل کر ان کی فہرست الگ الگ دفعات میں بیان کی گئی ہے۔ یہودی قبائل ابتدا میں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے۔ خود کئی عرب غیر یہودی قبائل بھی شروع شروع میں اس دستور یا چارٹر میں شامل نہیں تھے۔ اوس کے بہت سے گروپ شروع ہی میں شامل ہوگئے، چار قبائلی

گروپ شامل نہیں ہوئے۔ یوں مدینہ کا یہ غزوہ خیبر کے بعد شامل ہوئے۔ یہ جو بارہ چودہ میل چوڑا علاقہ تھا اس میں جو منتشر گاؤں یا آطام تھیں ان کا بیشتر حصہ اس میں شامل ہو گیا۔ اور جو لوگ شامل نہیں ہوئے ان میں سے کچھ نے اس کی مخالفت کی۔ کچھ نے مخالفت نہیں کی۔ لیکن بالادستی عملاً سب نے اس کی تسلیم کر لی۔

پہلی دفعہ سے یہ بات بھی واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ بنیادی طور پر قریش کے مسلمانوں اور انصار کے مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ انہی کو امت واحدہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ بقیہ لوگ ضمناً اس میں شامل ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی معاہدہ، حلف یا ولاء کے نتیجے میں قریش یا انصار کے ساتھ تھے۔ یا کچھ ایسے غیر قریشی مہاجرین جو مکہ مکرمہ میں آباد تھے اور ان کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔ مثلاً حضرت بلال حبشی، صہیب رومی، یہ حضرات خود قریشی نہیں تھے، لیکن مختلف قریشی قبائل سے وابستہ تھے۔ وہ سب اس کے تحت شامل ہیں۔

اس کے بعد جو بقیہ دفعات ہیں ان میں بعض غیر مسلم مدنی قبائل کو بھی شامل کیا گیا۔ وہ غیر مسلم جن میں بعد میں پہلے مشرکین اور پھر یہودی بھی شامل ہو گئے۔ یہ بطور شہریان ریاست کے شامل ہوئے اور بطور افراد امت کے شامل نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ امة مع المومنین۔ ان کو امة من المومنین نہیں کہا گیا بلکہ امة مع المومنین کہا گیا۔ اس کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا: They shall constitute a (seperate) Ummah along with the believers.۔ میں اس پر زیادہ زور اس لئے دینا چاہ رہا ہوں کہ بعض حضرات نے اس معاہدہ کو بہت mis-interpret کیا ہے۔

اس کو غلط انداز سے بارہا بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات بڑی تکلیف اور دکھ کی ہے کہ اس معاہدہ میں قیام پاکستان سے پہلے متحدہ قومیت کے حامی اور کانگریسی لوگ جو تحریفیں کیا کرتے تھے وہی تحریفیں اب پاکستان میں بعض لوگ کرنے لگے ہیں۔ اُس وقت جو مسلم لیگ اور پاکستان کے حامیوں کا موقف تھا آج کچھ لوگوں نے وہ بھلا دیا ہے اور ان تحریفوں کو دہرا رہے ہیں جو کانگریسیوں اور ہندو مسلم متحدہ قومیت کے علمبردار کیا کرتے تھے۔ وہ اس معاہدہ کی روشنی میں انڈین نیشنل کانگریس کے موقف کو صحیح ثابت کیا کرتے تھے۔ یہی کارنامہ مبارکہ آج بعض

لوگ پاکستان میں دہرا رہے ہیں۔ یہ فرق جو امت من دون الناس اور امت مع المومنین میں ہے، یہ عربی زبان کا اتنا بدیہی فرق ہے کہ جو شخص عربی زبان کی ذرا سی شدبد رکھتا ہو وہ اس فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔

اس معاہدہ کے ابتدائی حصہ کے نفاذ کے بعد غزوہ بدر تک بیشتر یہودی اس میں شریک نہیں رہے۔ کچھ قبائل تو پہلے شامل ہوئے تھے۔ غزوہ بدر کے بعد بقیہ یہودی شامل ہو گئے، البتہ کچھ یہودی قبائل آغاز ہی سے اس میں شامل تھے۔ ان کے بارے میں الگ سے دفعات رکھی گئیں۔ ایک دفعہ تھی: **وانه من تبعنا من يهود فان له النصر والاسوة غير مظلومين ولا متناصرين عليهم**، جو یہودی ہمارے اس معاہدہ میں ہماری پیروی کریں گے ان کو بھی اسی طرح سے مدد فراہم کی جائے گی اور ان کو وہی مساوات فراہم کی جائیں گی جو قریش اور انصار کو دی جا رہی ہے۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔ **وان اليهود ينفقون مع المومنين ما داموا محاربين**، یہ جملہ دو مرتبہ آیا ہے۔ اگر یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لئے کہا جائے گا تو وہ جنگ کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس لئے کہ ان کا بھی دفاع ہوگا۔ اپنے دفاع کے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے دفاع کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس سے بھی واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ امت واحدہ کے فرد نہیں تھے۔ اگر امت واحدہ کے فرد ہوتے یا ان کو امت واحدہ میں شامل سمجھا جاتا تو وہ اپنے دفاعی اخراجات کو خود ادا کرنے کے پابند نہ ہوتے۔

اس کے بعد آگے چل کر ایک ایک کر کے یہودی قبائل اس معاہدہ میں شامل ہوتے گئے۔ ان میں سے اکثر کی نشاندہی اس دستاویز کے متن میں کی گئی ہے۔ سات قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان قبائل کو وہ تمام مراعات دی گئیں جو ابتدا میں مسلمانوں کی دی گئی تھیں۔ اس دستاویز میں ایک دفعہ ایسی ہے جو تقریباً ہر قبیلہ کے حوالہ سے دہرائی گئی۔ آٹھ دس مرتبہ اس کو دہرایا گیا ہے۔ وہ ہے **المهاجرون من قريش على ربعتهم يتعاقلون بينهم معاقلهم الاولى**، یہی بات انصار کے بارے مین بھی ہے کہ وہ اپنے سابقہ طریقہ کار پر کاربند رہیں گے اور دیت کی ادائیگی آپس میں حسب سابق کرتے رہیں گے۔ گویا سوشل سکیورٹی کی ذمہ داری

ہر قبیلہ کی اپنی ہوگی اور وہ اس نظام کے بدستور پابند ہوں گے جو ان کے قبیلے میں پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ بات مہاجرین کے ساتھ ساتھ، انصار کے آٹھ اور تمام یہودی قبائل کے بارے صراحت سے کہی گئی اور ان الفاظ کو ایک ایک کرکے دہرایا گیا۔

25 دفعات پر مشتمل پہلے جز کی آخری دفعہ میں یہ تھا کہ **وانکم مھما اختلفتم من شئی فانمامردہ الی اللہ عزوجل والی محمد** ﷺ۔ اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے تو اس کا آخری فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کریں گے۔ گویا شریعت کی بالادستی اور اختلافی امور یعنی غیر منصوص امور میں Final Authority حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ کو تسلیم کرلیا گیا۔ اس میں تمام شہریوں کو مساوات کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس سے پہلے عرب کے ماحول میں مساوات نہیں ہوتی تھی۔ بعض قبائل کا حق زیادہ ہوتا تھا اور بعض کا کم ہوتا تھا۔ یہاں تک تھا کہ اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا تو آدھی دیت دی جائے گی اور اگر فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے تو پوری دیت دی جائے گی۔ فلاں قبیلہ کا آدمی مارا جائے گا تو دوگنی دیت ادا کی جائے گی۔ فلاں قبائل کا سردار مارا جائے گا تو قاتل قبیلہ کے چار سرداروں کو مارا جائے گا۔ اس طرح کے رائج الوقت نظام میں پہلی مرتبہ مساوات انسانی ایک قانونی اصول کے طور پر اختیار کی گئی۔ **سواسیۃ لافرق بین صغیر و کبیر وغنی وفقیر** ۔ یہ سب برابر ہوں گے، چھوٹے اور بڑے اور غنی اور فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ پھر مزید وضاحت کے لئے کہا گیا کہ **تتکافؤ دمائھم ودیتھم واحدۃ**، ان سب کے خون ایک دوسرے کے برابر ہوں گے اور دیت سب کی ایک ہی جیسی ہوگی۔ پھر فرمایا گیا کہ **ذمۃ اللہ واحدۃ**، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گارنٹی دی گئی ہے وہ سب کے لئے برابر ہے اور ایک جیسی ہے۔ **ان المومنین یحمی کل من الاخر**، سب اہل ایمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی طرح سے پہلی مرتبہ قبائلی تعصبات سے بالاتر ہوکر جنگ اور صلح کا اختیار ایک مرکزی حکومت کو دیا گیا۔ اس سے پہلے ہر قبیلہ بلکہ ہر فرد آزاد تھا کہ جب چاہے جنگ شروع کرے اور جس کے خلاف چاہے ہتھیار اٹھائے۔ اس ضمن میں دستاویز میں یہ کہا گیا کہ **سلم المومنین واحدۃ**، مسلمانوں کی مصالحت اور امن کا نظام ایک ہوگا۔ **لایسالم مومن دون مومن**، کوئی ایک صاحب ایمان ایک صاحب ایمان کو چھوڑ کر

کسی سے جنگ یا صلح کا معاملہ نہیں کرے گا' الا علی سواء وعدل بینھم ، سوائے اس کے کہ سب کے لئے ایک جیسا نظام ہو اور عدل کے ساتھ سب کے لئے ایک جیسا نظام اختیار کیا جائے گا۔

بعض چیزیں اس دستاویز میں اور بھی ہیں جو اگر موقع ملا اور وقت ہوا تو ان شاء اللہ فقہیات سیرت کے تحت گفتگو میں پیش کروں گا۔

یہودی جب اس چارٹر میں غزوہ بدر کے بعد شامل ہو گئے تو ان کے لئے بعد میں 24 مزید دفعات کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں پہلی دفعہ میں ہے وان یھود بنی عوف امة مع المومنین ، بنی عوف کے یہودی مسلمان کے ساتھ ساتھ alongwith the Muslims ایک الگ امت ہوں گے۔ للیھود دینھم وللمسلمین دینھم ۔ یہودیوں کا اپنا دین ہوگا اور مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا۔ دونوں جنگ کے دوران اپنے اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

یہ میثاق جو سنہ دو ہجری میں جاری ہوا۔ انسانی تاریخ میں پہلا تحریری اور مدوّن دستور ہے۔ حجاز اور عرب کی تاریخ میں بھی پہلی مرتبہ ایسی دستاویز مرتب ہوئی۔ صحابہ کرام کے پاس اس دستاویز کی نقلیں موجود رہیں۔ صحابہ کے خاندانوں میں ان نقول کی بہت اہتمام سے حفاظت کی جاتی تھی۔ امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے خاندان میں ایک صاحب کے پاس میں نے اس کی نقل دیکھی ہے۔ امام بیہقی کا انتقال 458ھ میں ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ 458ھ تک اس کی نقلیں صحابہ کے خاندانوں میں موجود تھیں۔ یہ ایک کثیر القبائل یعنی muti-tribal اور کثیر المذہبی یعنی multi-religious اور کثیر الثقافتی یعنی multi-cultural حکومت تھی جس میں بالادستی شریعت کو حاصل تھی۔ آخری قانون اللہ اور اس کے پیغمبر کا فرمان تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس میں بطور حاکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ تمام فریقوں کو داخلی خودمختاری بھی دی گئی اور سابقہ روایات کی اچھی چیزوں کو اس میں جگہ دی گئی۔ اسلام کا ایک مزاج جو مدینہ منورہ کے دور میں بہت نمایاں ہوا۔ وہ دوسری اقوام اور دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کی مثبت اور تعمیری چیزوں کو اپنا لینے اور اپنے نظام میں سمو لینے کا ہے۔ مسند امام احمد کی روایت میں حضور نے فرمایا کہ یعمل فی الاسلام بفضائل الجاھلیة، کہ

اسلام میں جاہلیت کے زمانہ کی تمام فضیلتوں اور اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا۔اس لئے کسی بھی قوم، کسی بھی علاقہ یا کسی بھی زمانہ میں جو بھی اچھی چیز مروج ہے تو اس کو اسلامی نظام میں اختیار کر کے قبول کیا جائے گا اور کسی اچھی بات کو اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جائے گا کہ وہ کسی غیر اسلامی پس منظر سے آئی ہے۔

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں باقاعدہ نظم ونسق قائم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل کے نقبا کی تقرری کے کام کو مکمل فرمایا۔اس دستاویز یا دستور کے بعد جب مدینہ منورہ کے داخلی نظم ونسق کے کام سے ذرا فرصت ملی تو رسول اللہ ﷺ نے آس پاس کے قبائل پر توجہ دی اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے رابطوں کا آغاز فرمایا۔اس غرض کے لئے مختلف قبائل میں بہت سی مہمات بھی بھیجی گئیں۔پہلی مرتبہ جو دستہ بھیجا گیا وہ حضور ﷺ نے اپنے عم محترم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے جنوب میں بنی ضمرہ کے قبیلہ میں بھیجا۔ وہاں ان گفتگوؤں اور مہمات کے نتیجہ میں ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔عہد نبوی کے وثائق کے مجموعوں میں دستیاب ہے۔اسی طرح مدینہ منورہ کے شمال میں جہینہ قبیلہ کے پاس ایک دستہ بھیجا گیا۔ان سے بھی دوستی کا معاہدہ ہوا اور وہ بھی اس بندوبست میں شامل ہوگئے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو مدینہ منورہ کی بنیادی ریاست تھی جو معاہدہ کے شرکا پر مشتمل تھی۔پھر مدینہ منورہ کے وہ آطام یا بستیاں تھیں جو معاہدہ میں تو شریک نہیں تھیں لیکن عملاً انہوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کرلیا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دائرہ آپ کہہ سکتے ہیں جو حضور نے مدینہ کے چاروں طرف ایک حلقہ اثر کی صورت میں قائم کیا۔اس دائرہ میں مدینہ کے چاروں طرف بسنے والے قبائل کی دشمنیوں کو ختم کرنا اوران کو اسلام کے حق میں مائل کرنا اور مسلمانوں سے دوستی کرنے کے لئے آمادہ کرنا مقصود تھا۔چنانچہ سب سے پہلے جنوب میں ان قبائل سے رابطے ہوئے جو مکہ مکرمہ کے راستہ میں تھے، بنوضمرہ سے، پھر بنوجہینہ سے معاہدہ کیا گیا۔پھر مزینہ کا قبیلہ جو بہت بڑا قبیلہ تھا اور مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد تھا ان سے معاہدہ کیا گیا۔یہ سب معاہدات ہجرت کے بہت ابتدائی دنوں میں اور بہت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ان دوستانہ معاہدات سے مدینہ کے دفاع کو منظم کرنے اور مسلمانوں کو امن وسکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے دوسرے انتظامات پر توجہ دی اور اس ننھی سی ریاست میں مختلف شعبے قائم فرمائے۔ ہم آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صیغہ خاص تھا۔ ایک توقیعات وفرامین اور دستاویزات کا شعبہ تھا۔ ایک شعبہ احتساب تھا۔ شعبہ داخلہ، شعبہ خارجہ، شعبہ مالیات، شعبہ عساکر یعنی فوجی نظم ونسق، شعبہ تعلیم، یہ سارے شعبے ایک ایک کر کے قائم کر دیئے گئے۔ ان میں سے شعبہ تعلیم، معیشت، مذہبی امور کے شعبوں پر ان شاءاللہ اگلے ہفتے گفتگو ہوگی۔ آج جو دو تین اہم شعبے ہیں ان کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

سب سے پہلا اور ابتدائی کام جو رسول اللہ ﷺ کو سربراہ ریاست کے طور پر کرنے کی ضرورت پیش آئی وہ شعبہ خارجہ کی تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دشمنوں کے اس سمندر میں کیسے محفوظ دمامون بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے آس پاس کے قبائل سے روابط ناگزیر تھے۔ دستور مدینہ بھی ایک طرح سے مختلف قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات تھی۔ اس میں بھی خارجہ معاملات کا ایک عنصر موجود تھا۔ پھر جہینہ، ضمرہ اور مزینہ کے ساتھ جو تعلقات اور معاہدے کئے گئے وہ بھی امور خارجہ کی پہلی کڑی یا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں حضور علیہ السلام کے سامنے تین مقاصد تھے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی کہیں تو صراحت ملتی ہے اور کہیں ان معاہدات کے الفاظ سے ان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بنیادی ہدف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو فروغ دیا جائے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ چنانچہ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والوں معاہدوں میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کے داعیوں کا راستہ نہیں روکیں گے۔ مسلمان داعی اگر کہیں جارہے ہوں تو ان کو مہمان نوازی اور تحفظ فراہم کریں گے۔ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیں گے۔ اس کے عوض میں مسلمان ان کے ساتھ یہ اور یہ کریں گے۔

ان معاہدات کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب کے معاشرہ میں امن وامان قائم ہو۔ عدل وانصاف کو فروغ ہو اور تمام قبائل کو اس طرح سے ایک لڑی میں پرو دیا جائے کہ وہ ان مشترکہ مقاصد کی خاطر عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پھر آخری مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کا ایک رعب اور دبدبہ عرب میں قائم ہو کہ

کوئی دوسری قوت ان کی طرف میلی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ ریاست مدینہ کی خارجہ پالیسی کے یہ تین بنیادی اہداف تھے جن کے تحت معاہدات کئے گئے۔ اور اس طرح تبلیغ اسلام کو آسان بنایا گیا۔ اندرونی استحکام کو یقینی بنایا گیا۔ انسانی جان کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا۔ دشمنوں پر معاشی دباؤ قائم رکھنے کے سامان کئے گئے۔ دشمن کے دوستوں سے دوستی کی کوشش کی گئی۔ دشمن کے دشمنوں سے دوستی مزید بہتر بنائی گئی۔ دشمن کے اطراف میں اپنے دوستوں کی ایک ڈھال بنائی گئی۔ یعنی خیبر کے یہودیوں کے اطراف میں بھی اور قریش مکہ کے اطراف میں بھی بسنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدے کئے گئے۔ دشمن قبیلوں کے درمیان اگر کوئی اتحاد تھا تو اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ معزز دشمنوں کا احترام کرکے ان کا دل جیتنے کی کوشش کی گئی۔

تالیف قلب ریاست کے شعبہ خارجہ کی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تالیف قلب کے طور پر بہت سے اقدامات کئے گئے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط کا سامنا کرنا پڑا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ سے بڑی تعداد میں کھجوریں اور جو کی کمیت بھیجی اور کہلا بھیجا کہ ہماری طرف سے یہ سامان خورد ونوش مکہ کے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اس طرح کے اقدامات وقتاً فوقتاً کئے گئے۔ یہ صیغہ خارجہ تھا جس میں بنیادی ذمہ داری سیدنا عمر فاروق کی تھی۔ ان کا قبیلہ مکہ مکرمہ میں بھی شہری ریاست میں امور خارجہ اور سفارت کا ذمہ دار تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جو مہمات بھیجیں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں بہت کثرت سے مہمات بھیجی گئیں۔ مدینہ منورہ کے چاروں طرف حتیٰ کہ مکہ مکرمہ کے قریب کے رہنے والے بعض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدات کئے گئے۔ اسی اثنا میں حضور نے سفراء بھی بھیجے۔ بعض سفراء کا نام ملتا ہے۔ ایک سفیر جن کو کئی مواقع پر حضور نے بھیجا اور اس زمانے کی سب سے بڑی ریاست کے حکمران کے پاس بھیجا وہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی تھے۔ بنی کلب سے آپ کا تعلق تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور بااثر قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کی بہت سی داستانیں جاہلی ادب میں مشہور ہیں۔ لمبی لمبی اور طویل جنگیں اس قبیلہ نے مختلف لوگوں سے کیں۔ پورے عرب میں اس قبیلہ کے سرداروں کا رعب داب مشہور و معروف تھا جس کا تذکرہ

عرب شاعری میں ملتا ہے۔ اس قبیلہ سے حضرت دحیہ کا تعلق تھا۔ چونکہ یہ قبیلہ ایک ایسے علاقہ میں آباد تھا جس میں وہ قبائل آباد تھے جو قیصر روم کے باجگزار تھے اس لئے اس قبیلہ کی حیثیت ایک طرح سے بفرزون کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس قبیلہ کے تعلقات قیصر روم کے درباریوں سے بھی رہے ہوں۔ اس لئے جناب دحیہ بن خلیفہ الکلبی کو حضورﷺ نے قیصر روم کے دربار میں بھیجا۔ ان کے بارے میں ایک بات تمام سیرت نگاروں نے لکھی ہے کہ صحابہ کرام میں ان سے زیادہ خوبصورت آدمی کوئی نہیں تھا۔ جب وہ قیصر روم کے پاس دمشق پہنچے اور بتایا گیا کہ عرب سے ایک بہت خوبصورت سفیر آیا ہے تو تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں میں اس خوبصورت نوجوان کو دیکھنے کے لئے کھڑی تھیں، جو عرب سے پیغمبر عربی کا خط لے کر آیا ہے۔

سفرائے نبی میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کی خوبصورتی کا ذکر تو ہو گیا۔ لیکن یہ بات شاید کچھ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ جب کبھی جبرئیل امین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں آتے تھے۔ کئی مرتبہ صحابہ کرام نے بیان کیا کہ ہم نے دحیہ کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ریاست سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ حضور کے بتانے سے لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ جبرئیل امین تھے جو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں کئی بار حضور کے پاس آئے۔

بقیہ سفرا میں حضرت عمرو ابن امیہ الضمری کا ذکر ہو چکا ہے جو نجاشی کے دربار میں نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص جیسے ہی اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ آئے ان کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ مختلف حکمرانوں کے پاس جب حضور کا سفیر جایا کرتا تھا تو رسول اللہﷺ کا طریقہ تھا کہ مکتوب الیہ کے لئے کوئی ہدیہ بھی دیتے تھے۔ باہر سے کوئی سفیر آیا کرتا تو اس کو بھی ہدیہ دیا کرتے تھے۔ حضور کی طرف سے سفرا کو ہدیہ دیا جانا اتنا طے شدہ طریقہ کار تھا کہ جب آپؐ بستر مرگ پر تھے اور دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اجیزوا الوفود کما کنت اجیزھم، جیسے میں مختلف وفود کو انعامات دیا کرتا تھا تم بھی انعامات دیتے رہنا اور ہر آنے والے سفیر کو کوئی نہ کوئی انعام دے کر بھیجنا۔

رسول اللہﷺ کے صیغہ خارجہ میں ایک شعبہ اور بھی تھا جس کو آپ شعبہ مراسلات اور

وثائق بھی کہہ سکتے ہیں۔ شعبہ مراسلات اور وثائق کا کام رسول اللہ ﷺ کی خط کتابت اور دوسرے سرداروں اور حکمرانوں سے مراسلت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس شعبہ میں سب سے نمایاں خدمات حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت انجام دیا کرتے تھے۔

اس شعبہ میں عربی کے علاوہ عبرانی اور سریانی زبانوں مین بھی دستاویزات تیار کی جاتی تھیں۔ عبرانی زبان ان یہودیوں میں مروج تھی جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، جبکہ اور خیبر کے یہودیوں میں غالباً سریانی زبان مروج تھی۔ غالباً ان کی علمی زبان سریانی ہوگی۔ وہاں سے جو تحریر آتی تھی وہ سریانی میں آتی تھی اور حضور کا جواب عربی زبان میں جاتا تھا۔ جب ان کا خط آتا تھا تو پڑھنے کے لئے کسی یہودی کو بلاتے تھے۔ آپؐ نے حضرت زید بن ثابت سے فرمایا کہ مجھے یہودیوں پر بھروسہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ترجمہ کرکے بتادیں۔ اس لئے تم جاکر سریانی سیکھ لو۔ وہ یہودیوں کے ایک مدراس میں گئے جو مدرسہ کو کہتے ہیں۔ انہوں نے سترہ دنوں میں سریانی زبان سیکھ لی اور واپس آ گئے۔ وہ سریانی کے علاوہ بھی کئی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں میں رسول اللہ ﷺ کی مدد کیا کرتے تھے۔ دستاویزات کا ریکارڈ بھی رکھا کرتے تھے۔

یہ بات بہت سے سیرت نگاروں نے نقل کی ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی تھی۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عرب کے یہودی خط وکتابت تو عربی ہی میں کرتے ہوں گے، لیکن ان کا رسم الخط عبرانی یا سریانی ہوگا۔ شاید اسی لئے حضرت زید بن ثابتؓ نے سترہ دنوں میں یہ زبان سکھ لی ہوگی۔ بہرحال عام انداز کی مراسلت حضرت زید بن ثابتؓ کے ذمہ تھی۔ جب کوئی اہم معاہدہ ہوتا تھا تو عموماً سیدنا علی بن ابی طالب تحریر فرمایا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ سمیت کئی معاہدے سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

'وزارت خارجہ' کے ماتحت ایک شعبہ مہمانداری بھی تھا۔ اس کے سربراہ کچھ زمانے تک حضرت بلال رہے۔ پھر ایک صحابی معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی، جو حضرت ابوہریرہ کے قبیلہ کے تھے، اس شعبہ کے نگران ہوئے۔ ان کو آپ افسر مہمانداری یا کہہ لیں کہ چیف آف پروٹوکول کہہ لیں۔ دارالکبریٰ کے نام سے ایک بڑا مکان تھا۔ یہ مکان حضرت عبدالرحمٰن بن

عوف نے مدینہ میں اپنی تجارت چل پڑنے کے بعد بنایا تھا۔ انہوں نے حضور کے کہنے پر یہ مکان خالی کر کے شعبہ مہمانداری کو دے دیا۔ یہاں باہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جب تعمیر ہو رہا تھا تو کئی مرتبہ حضور اس کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس مکان میں کھجوروں کے کئی درخت بھی تھے اور حضور کے مہمان اس مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

ایک اور مکان تھا جو ایک خاتون رملہ بنت حارث کا تھا۔ انہوں نے بھی ایک بہت بڑا مکان بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ باہر سے آنے والا کوئی وفد یا کسی قبیلہ کا سفیر اس مکان میں بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب بنوحنیفہ کا وفد آیا تو اس میں اسی آدمی تھے۔ وہ سب کے سب حضرت رملہؓ کے مکان میں ٹھہرے۔ دو وقت کا کھانا انہی کی طرف سے آتا تھا۔ کھانے کی تفصیل بھی موجود ہے کہ ایک وقت کا کھانا دودھ اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرے وقت کا کھانا گوشت اور گھی پر مشتمل ہوتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اس انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ 9 ہجری میں خالد بن سعید بن العاص 'چیف آف پروٹوکول' تھے۔

ایک مرتبہ چار سو آدمیوں پر مشتمل قبیلہ مزینہ کا وفد آیا۔ وفد کا مقصد پہلے سے موجود معاہدہ کی تجدید اور از سر نو اسلام میں داخل ہونا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق سے جو وزیر خارجہ تھے، ان کی دیکھ بھال اور مہمان داری کا بندوبست کرنے کے لئے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ بڑے وفد کے لئے زیادہ ذمہ دار شخص سے کہا جائے گا۔ چھوٹے وفد کے لئے کم ذمہ داری والے افسر سے کہا جائے گا۔ تو آپؐ نے گویا اپنے وزیر خارجہ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی۔ جب وفد کی روانگی کا وقت آئی تو آپؐ نے حضرت عمر فاروق سے فرمایا کہ 'زَوِّدْهُمْ' ان کو جاتے وقت خاصی مقدار میں زادراہ دے دینا۔

حضرت عمر نے عرض کیا کہ اتنے زیادہ لوگوں کو خاصی مقدار میں زادراہ میں کہاں سے دے دوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کہیں سے بھی دے دو۔ یہ تفصیلی روایت موجود ہے۔ حضرت عمر مختلف جگہوں پر گئے اور جائزہ لیا کہ چار سو آدمیوں کو کیا زادراہ دوں۔ واپس آ کر حضور سے شکایت کی کہ اتنے زادراہ کا انتظام مشکل ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ رملہ بنت حارث کے جس مکان میں وفد کو ٹھہرایا ہے، اس میں بہت عمدہ کھجوریں لگتی ہیں وہی توڑ کر دے دو۔ حضرت عمر

کہتے ہیں کہ میں سیڑھی لگا کر وہاں گیا تو دیکھا کہ کھجوریں اتنی نہیں تھیں کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے لئے کافی ہوتیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ حضور نے جیسے فرمایا ہے اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدمی کو کھجوریں توڑنے پر لگایا اور ایک دوسرا آدمی ٹوکریاں بھرنے لگا۔ باہر لیجا لیجا کر بنی مزینہ کے لوگوں کو دیتے رہے۔ چار سو آدمیوں کا زاد راہ مکمل ہو گیا اور درختوں میں کھجوریں جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ میں نے جا کر حضور کو اطلاع کر دی کہ سب کو زاد راہ مل گیا ہے۔

رملہ بنت حارث کے مکان کے بارے میں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ 'کانت دار اواسعة' بہت بڑی حویلی تھی۔ دار گھر کو نہیں بلکہ حویلی کو کہتے ہیں جس میں کئی گھر ہوں۔ اس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور وفود عرب کو اس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک وقت میں کئی کئی وفود آ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگ حضرت عبدالرحمن بن عوف کے گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ کا مکان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ضرورت اگر باقی رہتی تو مسجد نبوی کے صحن میں اور باہر خیمے لگوا کر مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔

بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے ایک بڑا اہم میدان بین الاقوامی قانون ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون کا ماخذ تو سیرت نبوی ہی ہے۔ ان دونوں کا اتنا گہرا ربط ہے جس کی طرف کئی بار اشارے کئے جا چکے ہیں۔ اسلام کا سارا بین الاقوامی قانون نکلا ہی سیرت سے ہے۔ ایک بات اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ مغربی مصنفین تو خیر جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ بات آج کل کا انٹرنیشنل ہیومینیٹیرین لا International Humanitarian Law ہے۔ پچھلے تیس چالیس سال میں بین الاقوامی قانون میں ایک نئی شاخ، ایک نئی جہت یا پہلو سامنے آیا ہے جس کو International Humanitarian Law کہتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون تو ریاستوں کے درمیان تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ انٹرنیشنل ہیومینیٹیرین لا یعنی آئی ایچ ایل کا مقصد یہ ہے کہ جنگ سے متاثر ہونے والے زخمی، شہری، پناہ گزین، قیدی اور اس طرح کے غیر محارب لوگوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور ان کو جنگ کے اثرات بد سے محفوظ رکھا جائے۔ اس پر ایک نیا قانون سامنے آیا ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے

معاہدات کی بنیاد پر یہ قانون مرتب ہوا ہے۔ اب تجویز ہے کہ اس پر عمل درآمد کے لئے عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ چنانچہ بعض عدالتیں بنی ہیں۔ International Criminal Court قائم ہوئی ہیں۔ بعض دوسری عدالتوں اور جوڈیشل فورمز کی تشکیل کا مسئلہ زیر غور ہے۔

لیکن تاریخ میں پہلی مرتبہ بین الاقوامی قانون کی ایسی ہدایات، جن میں آئی ایچ ایل کے بنیادی احکام دیئے گئے ہوں وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دی گئیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب بھی صحابہ کرام پر مشتمل دستہ بھیجا۔ یا خود قیادت فرماتے ہوئے تشریف لے جاتے تو تین چار چیزوں کی ہدایت اور تاکید بہت اہتمام سے فرماتے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو آج آئی ایچ ایل کے چار بڑے معاہدات میں مرتب کی گئی ہیں، آئی ایچ ایل کے کنونیشن نمبر ایک، دو اور تین، ان معاہدات کو آپ انہی نبوی ہدایات کی تشریح کہہ سکتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں 'الا لا یجهزن علی جریح' میدان جنگ میں دشمن کا فوجی اگر زخمی ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ زخمی ہے تو اٹھا لیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ 'ولا یتبعن مدبر'، کوئی اگر فرار ہو جائے تو اس کا پیچھا کر کے اس کو پکڑنے یا مارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ 'ولا یقتل اسیر'، کوئی جنگی قیدی ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ 'ومن اغلق علیک بابه فهو امن'، اور اگر کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے تو اس کو بھی امان دے دی جائے۔

اسی طرح سے ایک اور دستاویز ہے جو کئی لوگوں نے نقل کی ہے۔ امام ابوعبید نے کتاب الاموال میں نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی دستہ بھیجتے تھے۔ یا کسی امیر کو سربراہ مقرر کرتے تھے اور اس کو جن چیزوں کی ہدایت فرماتے تھے وہ یہی چار چیزیں ہوتی تھیں۔ اس میں یہ چار جملے بھی خاص طور پر ہوتے تھے۔ 'لا تغلوا'، دھوکہ مت دینا، مال میں ہیرا پھیری مت کرنا، 'ولا تغدروا'، کسی سے غدر، خیانت اور وعدہ شکنی نہ کرنا۔ 'ولا تمثلو' اور کسی مردہ کی لاش کی بے حرمتی مت کرنا mutilate مت کرنا۔ 'ولا تقتلوا ولیداً' کسی بچے کو قتل مت کرنا۔ 'ولا امرأۃ'، نہ کسی عورت قتل کرنا، کسی پادری یا مذہبی شخصیت کو قتل مت کرنا۔ یہ ساری ہدایات اس میں لکھی ہوتی تھی۔

ریاست مدینہ میں وزراء بھی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے آج کی طرح کی وزارتیں نہیں ہوتی تھیں کہ الگ الگ وزارت اور عملہ ہو۔ البتہ مختلف معاملات پر مشورہ لینے کے لئے اور ذمہ

ذاریوں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بعض صحابہ کرام متعین تھے۔ تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیثیت وزیر اول کی سی تھی۔ امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں سعید بن مسیّب سے روایت کی ہے کہ 'کان ابوبکر من النبی ﷺ مکان الوزیر' کہ حضرت ابوبکر کا درجہ حضور کی بارگاہ میں وہی تھا جو وزیر کا ہوتا ہے۔ 'فکان یشاورہ فی جمیع امورہ'، ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے، 'ولم یکن رسول اللہ ﷺ یقدم علیہ احداً'، اور کسی کو بھی ان کے اوپر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر عطا فرماتا ہے اور برے حاکم کو برے وزیر عطا فرماتا ہے۔ جب کوئی حاکم اچھے کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو اس کی ٹیم میں شامل کر دیتا ہے اور جب برے کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو برے لوگوں کو اس کی وزارت میں شامل کر دیتا ہے۔

شعبہ وزارت کے ساتھ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت دفاع بھی تھی۔ عسکریات کا شعبہ تھا۔ اس بارے میں کچھ لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ جب حضور ﷺ جہاد کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور چل پڑتا تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد حضور ﷺ نے اولین فرصت میں جو کام کئے ان میں ایک مردم شماری کا کام تھا۔ مردم شماری میں تمام بالغ مسلم خواتین اور حضرات کے نام لکھے گئے۔ پھر جب کوئی غزوہ یا دستہ بھیجا جاتا تھا تو شرکاء کے نام باقاعدہ لکھے جاتے تھے اور فہرست بنتی تھی۔ اس کا ریکارڈ بنتا تھا۔ ایک نقل مرکز میں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کوئی جگہ ہوگی جہاں پر یہ ریکارڈ رکھا جاتا رہا ہوگا۔ کچھ صحابہ کرام اس کے نگران اور منتظم بھی ہوتے ہوں گے۔ اس دستاویز کی ایک نقل دستے کے کمانڈر کے پاس ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ جب تبوک تشریف لے گئے تو 30 ہزار صحابہ کرام ساتھ تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار، حنین اور طائف میں 12 ہزار ساتھ تھے۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ دس بارہ ہزار افراد کا ہجوم بغیر کسی ترتیب کے ساتھ ہو جاتا ہو۔ یہ سب کام ایک ترتیب کے مطابق ہوتا تھا۔ دستے ہوتے تھے۔ ہر دستے کا الگ کمانڈر ہوتا تھا۔ الگ پرچم اور پاس ورڈ ہوتا تھا۔ فہرست مرتب ہوتی تھی۔ کئی اور مقامات پر بھی ان نقلوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی نے کہا کہ میرا نام

فلاں فلاں غزوے میں لکھا جا چکا ہے۔ اکتتبت فی غزوۃ کذا و کذا۔ ایک نوجوان نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں اسے پہلے حج کروادوں، جبکہ میں فلاں غزوہ میں لکھا جا چکا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ غزوہ سے چلے جاؤ اور بیوی کو حج کرواؤ۔ ان کی تسلی نہیں ہوئی ہوگی۔ بھیس بدل کر دوبارہ حاضر ہوئے اور وہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیوی کو حج کے لئے لے جاؤ۔ تیسری مرتبہ جب اسی طرح کیا تو حضور نے پہلے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر فرمایا کہ پہلے بیوی کو حج کرواؤ اس کے بعد غزوہ کرنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر غزوہ میں جانے والے شرکا کی ایک فہرست بنتی تھی۔ اس کے مطابق لوگ جاتے تھے اور اس کے مطابق ساری کارروائی ہوتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو طرح کے ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ کچھ ہتھیار تو وہ ہوتے تھے جو ہر فرد کے اپنے ذاتی ہوتے تھے۔ عرب میں قبائلی معاشرہ تھا۔ ہمارے ہاں کے قبائلی معاشرہ میں بھی ہر فرد کا ذاتی اسلحہ الگ ہوتا ہے۔ عرب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس ذاتی اور انفرادی اسلحہ کے علاوہ کچھ بڑا اسلحہ تھا جو ریاست کی ملکیت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں یمن کی طرح جو علاقے زیادہ متمدن اور بڑے تھے وہاں دو بڑے ہتھیار بھی استعمال ہوتے تھے۔ ایک منجنیق اور دوسرا دبابہ کہلاتا تھا۔ میں نے ایک جگہ منجنیق کی تصویر دیکھی ہے۔ اس کو آپ موجودہ دور کے ٹینک یا توپ کا ایک ابتدائی ماڈل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ فوج کے راستہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ اس کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک بہت بڑا وزنی پتھر لے کر قلعوں کی دیواریں توڑنے کے لئے دور سے پھینکا جاتا تھا۔ تاکہ قلعہ بند دشمن کے قلعہ کی دیوار توڑ کر اندر داخل ہوا جائے۔ یہ بہت سادہ سی چیز ہوتی تھی۔ اس میں ایک بڑے پتھر کو رسیوں اور بانسوں کے زور سے بہت قوت کے ساتھ دور تک مارا جا سکتا تھا۔ اس سے قلعہ کی دیوار ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ یہ چیز عرب کے شہروں یعنی مکہ، طائف، مدینہ وغیرہ میں نہیں تھی۔ یمن میں ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے دو صحابہ کرام کو یمن سے منجنیق چلانے کا طریقہ سیکھنے اور ایک منجنیق خرید کر لانے کے لئے بھیجا۔ وہ اس کو بنانے اور چلانے کی تربیت بھی حاصل کر کے واپس آئے۔ غیر مسلموں سے بڑے ہتھیاروں کے بنانے کی تربیت حاصل کرنا، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طرح سے ہالینڈ سے سیکھ کر آنا، یہ صحابہ کرام کی سنت ہے۔ صحابہ کرام

یمن سے منجنیق بھی لائے، اس کو بنانے اور استعمال کرنے کی تربیت بھی لے کر آئے۔ حضور ﷺ نے اس کو طائف کی فتح میں استعمال بھی کیا۔

دوسرا اسلحہ دبابہ تھا۔ آج کل عربی میں ٹینک کو دبابہ کہتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں دبابہ سے مراد ایک ایسی سواری تھی جس کو لکڑی یا لوہے کی چھت کے ذریعے اوپر سے ڈھانپ دیا جاتا تھا اور اس پر کوئی ایسی چیز لگا لیا کرتے تھے جس پر تیر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب قلعہ میں داخلہ کے لئے یا کسی اور طریقے سے دشمن کے قریب جانا ہوتا تھا تو دبابہ سے دشمن پر تیروں کی بارش ہوتی تھی اور دبابہ خود تیر اندازوں سے محفوظ رہتا۔ دبابے میں تین چار سپاہی بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ قلعہ کے قریب جا کر اس کا دروازہ یا دیوار توڑنے کی کوشش کرتے۔ آپ اُس دور کے دبابہ کو آج کی بکتر بند گاڑی کا پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل ابن ہشام نے بھی لکھی ہے اور الروض الانف نے بھی لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے سراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم فرمایا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض افراد مستقل طور پر بعض قبائل میں اس کام پر مامور تھے کہ وہ اس قبیلہ میں اسلام کے خلاف جو بھی تیاریاں ہو رہی ہوں اس کے بارے میں معلومات سے اسلامی ریاست کو مطلع کیا کریں۔ چنانچہ حضرت عباس کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش مکہ کی تیاریوں سے حضور کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ اس کی درجنوں مثالیں ہیں اور کتاب المغازی میں واقدی نے تقریباً ہر صفحہ پر ایک آدھ بات ایسی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سراغ رسانی کا ایک منظم اور موثر شعبہ موجود تھا۔ اس پر ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک مضمون بھی ہے، Military Intelligence During the Life Time of the Prophet of Islam، یہ مضمون Pakistan Historical Society کے جرنل میں چھپا ہے۔ یہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ counter intelligence یعنی جوابی سراغ رسانی کا بھی ایک شعبہ تھا جو دشمن کی انٹیلی جنس کو غیر موثر بنانے اور ان کو غلط معلومات فراہم کر کے گمراہ کرنے کا کام کرتے تھے۔

امور خارجہ اور عسکریات کے علاوہ جو سب سے اہم شعبہ تھا وہ صیغہ عدل وقضا تھا۔ اسلام آیا ہی عدل کے لئے ہے۔ اسلام کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اس لئے پہلی چیز جس کی طرف میثاق مدینہ میں بھی بار بار اشارہ موجود ہے اور حضور کے انتظامات میں بھی نظر آتا ہے کہ جو پہلا کام کیا گیا وہ عدل وقضا کا بندوبست تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین عدالت کی تھی۔ آج بھی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو بہت سے ممالک میں اپیلٹ اختیارات حاصل ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو اپیلیٹ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی تو نبی اور سربراہ ریاست کے طور پر دو حیثیتیں تھیں۔ دونوں حیثیتوں میں حضور علیہ السلام کو آخری عدالت اپیل کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل میں الگ الگ قاضی بھی مقرر فرمائے۔ بعض افراد کو معلم اور قاضی دونوں کی ذمہ داریاں دیں۔ چنانچہ مشہور حدیث کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا گیا۔ اس طرح سے مختلف قبائل میں جو قاضی مقرر تھے وہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ confirmation کے لئے بعض صورتوں میں مدینہ منورہ بھیجا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ قاضی کو پتہ نہیں چلا کہ اس معاملہ میں صحیح حکم کیا ہے، یا ان کو تامل ہوا تو انہوں نے توثیق کے لئے اپنا فیصلہ حضور ﷺ کو بھیج دیا۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ از خود suo moto کاروائی کیا کرتے تھے اور خود ہدایت دیتے تھے کہ فلاں معاملہ کا فیصلہ اس طرح کرو۔

حضرت عتاب اسید جو مکہ مکرمہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے سامنے قبل از اسلام کے ایک سودی معاملہ سے متعلق دعویٰ کا مقدمہ آیا۔ مدعی کا دعویٰ تھا کہ یہ تو سود کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اس لئے سود کی حرمت کے باوجود بھی مجھے اپنے سابقہ واجبات کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ عتاب نے حضور علیہ السلام کو خط لکھا اور تفصیل بتا کر حضور سے رہنمائی کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے دربار میں ریفرنس بھیجے جاتے تھے اور آپؐ عدالتوں کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار ایک قبائلی سردار کا قتل ہو گیا۔ قاتلین نے دیت ادا کی اور اس کی اطلاع حضور کی دے دی گئی کہ دیت ادا کر دی گئی ہے۔ یہ بات خواتین کے لئے شاید خاص دلچسپی کی ہو گی

کہ بعد میں رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں اس مقتول کی بیوہ کو دیت میں حصہ دیا گیا ہے یا نہیں۔ اس خیال کی بنیاد پر کہ حضور ﷺ نے اُس علاقہ کے گورنر کے نام ایک نامہ مبارک لکھا کہ فلاں مقتول کی دیت اور ترکہ میں اس کی بیوہ کو اس کا حصہ دلایا جائے اور مجھے اطلاع دی جائے کہ یہ کام ہو گیا یا نہیں۔ اس طرح سے حضور نے ایک مؤثر اور مرکزیت کا حامل صیغہ عدالت قائم فرمایا۔

حضور ﷺ نے بطور قاضی کے جو فیصلے کئے وہ الگ سے جمع کئے گئے ہیں۔ اقضیۃ الرسول کے نام سے ایک قدیم ترین کتاب ہے جو اسپین کے ایک بزرگ امام محمد بن الفرج الاندلسی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی 'دربار رسول کے فیصلے' کے نام سے ملتا ہے۔

امام ابوبکر بن ابی شیبہ مشہور محدث ہیں۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مسند ابن ابی شیبہ ان کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ انہوں نے بھی اقضیۃ الرسول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کئی کتابیں اور بھی اس موضوع پر ملتی ہیں۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضور کے بہت سے فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے بھی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی تھی۔ پاکستان میں حال ہی میں ہماری یونیورسٹی کے سابق ریکٹر جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان کی رہنمائی اور تعاون سے ایک کتاب دس بارہ جلدوں میں تیار ہو رہی ہے۔ اس کی پہلی جلد چھپی ہے جس میں حضور ﷺ کے کئے ہوئے تمام فیصلے اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں جمع کئے گئے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن لوگوں کو قاضی مقرر فرمایا ان میں سیدنا عمر بن الخطاب کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موجودگی میں مدینہ میں مقدمات کے فیصلے حضرت عمر کرتے تھے۔ یمن کے ایک علاقے میں حضرت علی بن ابی طالب اور ایک دوسرے علاقے میں حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا تھا۔ حافظ شامی نے سیرت شامی کے آٹھ ابواب میں سے ایک پوری فصل میں یہ فیصلے جمع کئے ہیں۔ آج Ombudsmann کا ادارہ موجود ہے۔ اومبڈزمین کے ادارہ کے بارے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تصور سویڈن سے آیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس ادارہ کا آغاز سویڈن میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور

حضرت عمر فاروق نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ دیوان مظالم دراصل ایک اعلیٰ سرکاری عدالت تھی جو اعلیٰ سرکاری حکام اور بااثر لوگوں کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف شہریوں کی شکایات سنا کرتی تھی۔ حضور کے زمانے میں اس کا بندوبست بعض علاقوں میں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے اس کو باقاعدہ شکل دی۔ اس کے بعد دنیائے اسلام کے بیشتر مسلم ممالک میں یہ ادارہ قائم رہا۔ اسپین سے اس کو یورپیوں نے سیکھا۔ وہاں سے بعض پادری غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس ادارہ کے بارے میں واقفیت حاصل کرکے گئے۔ انگلستان میں پارلیمنٹری کمیشن اور سویڈن میں ادمبڈزمین کے نام سے یہ ادارہ بنایا گیا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔

صیغہ احتساب بھی اسی زمانے میں قائم ہوا تھا جس کو ہمارے صوبہ سرحد میں حِسبہ کے نام سے قائم کرنے کی نیم دلانہ کوشش کی گئی۔ جس کو ہمارے اخبار والے حَسبہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ حَسبہ نہیں ہے بلکہ ح کے زیر سے حِسبہ ہے۔ یہ احتساب سے متعلق ایک ایسا نیم عدالتی ادارہ ہے جو اس کام کے لئے قائم کیا جاتا تھا کہ عام معاشرتی اخلاق کا تحفظ کرے اور اسلام کے معاشرتی اخلاق کے بارے میں نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں انجام دے۔ یہ ادارہ بھی حضور نے قائم فرمایا تھا۔

یہ وہ عدالتی ادارے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمائے۔ مدینہ منورہ میں جو غیر مسلم رہتے تھے ان سے بھی ریاست کے امور میں کام لیا جاتا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایسی ذمہ داریاں جو ریاست کے strategic interests سے متعلق ہیں، یا شریعت کی فہم اور تعبیر سے متعلق ہیں وہاں غیر مسلم کو مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جو فنی مہارت کے معاملات ہیں وہاں غیر مسلموں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے دو اہم ترین مواقع پر غیر مسلموں سے کام لیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے اور ہر عرب قبیلہ سو اونٹوں کے لالچ میں آپ کی جان کے درپے تھا تو حضور کو راستہ بتانے کے لئے جو آدمی رکھا گیا وہ عبداللہ

بن اریقط ایک غیر مسلم تھا۔ اس غیر مسلم پر حضور نے اعتماد کیا اور وہ نہایت قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا۔ اگر وہ سو اونٹوں کی لالچ میں آکر حضور کو گرفتار کرانا چاہتا تو اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ لیکن حضور کا انتخاب دیکھئے کہ آپؐ نے جس آدمی کو چنا اس نے ایک دوسرے راستے سے حضور کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضور کے دربار کے سفیر رہے۔ جب وہ بطور سفیر پہلی مرتبہ بھیجے گئے تو اس وقت وہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ بات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی فرانسیسی سیرت کی جلد اول میں کہی ہے۔

اسی طرح سے کئی اور غیر مسلم حضرات سے کام لیا گیا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ غیر مسلموں سے ایسی اطلاع مل جاتی تھی جس کا دینا ان کی نیت میں نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ بدر کے موقع پر تشریف فرما تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اب تجارتی قافلہ سے نہیں بلکہ قریش کے لشکر سے ہی مقابلہ ہوگا۔ ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ لشکر میں کتنے آدمی ہیں۔ حضور نے دو صحابہ کرام کو اس غرض کے لئے بھیجا کہ دشمن کی تعداد کا پتہ لگائیں۔ وہ کوشش کے باوجود صحیح تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ ایک لڑکا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس کو مشکوک سمجھ کر ساتھ لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ صحابہ نے لڑکے سے قریش کی فوج اور قافلہ کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرام کا خیال تھا کہ یہ لڑکا تجارتی قافلہ میں شریک ہے اور اس کے بارے میں معلومات کو چھپا رہا ہے۔ لڑکا کہنے لگا کہ میں نے قافلہ نہیں دیکھا، البتہ قریش کا لشکر دیکھا ہے۔ صحابہ نے اس پر کچھ سختی کی تو اس نے تسلیم کیا کہ ہاں میں نے قافلہ کو دیکھا ہے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ سچ بول رہا تھا تو تم اس کو مار رہے تھے جب اس نے جھوٹ بول دیا تو تم نے چھوڑ دیا۔ اس نے قافلہ کو نہیں بلکہ لشکر ہی کو دیکھا ہے۔ آپؐ نے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے قریش کے لشکر کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میں ان کو دودھ فراہم کرنے گیا تھا۔ پوچھا کہ لشکر میں کتنے آدمی تھے تو اس نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرام نے پھر کہا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا تم نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے۔ آپؐ نے پوچھا یہ بتاؤ کہ کتنے اونٹ ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ اس نے دیکھا ایک دن میں نے دیکھا نو اونٹ ذبح ہوئے تھے ایک اور دن دیکھا دس اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ

نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں اور واقعی وہ ساڑھے نو سو تھے۔ ان کی تعداد بعینہ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہی نکلی۔

یہ شعبہ جو حضور نے معلومات اور سراغ رسانی کا قائم فرمایا اس میں تین ذیلی شعبے تھے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے لا تجسسوا، ایک دوسرے کا تجسس نہ کرو۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس میں تو جاسوسی سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا جاسوسی کا شعبہ کیسے اسلامی ہوسکتا ہے۔ آج بھی انٹیلی جنس کے ایک ذمہ دار آدمی آکر پوچھ رہے تھے کہ جناب! میں قرآن کی تفسیر پڑھ رہا تھا کہ وہاں یہ حکم لا تجسسوا نظر آ گیا۔ ہمارا تو کام ہی تجسس ہے۔ ہم کیا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ عربی زبان میں تین الفاظ ہیں۔ ۱: تجسس، ۲: تحسس، ۳: تعسس۔ تحسس کا مطلب ہے کسی مقصد یا ہدف کی خاطر مثبت چیز کا پتہ لگانا۔ یا بنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف، اے بیٹو جاؤ اور یوسف کے بارے میں پتہ چلاؤ۔ ایک تعسس ہوتا ہے جو کسی جرم کو روکنے کی خاطر اور کسی برائی کو وجود میں آنے سے پہلے پیش بندی کے لئے کیا جاتا ہے۔ تجسس وہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سوچی ہو اور اس برائی کے لئے تجسس کی جائے۔ یہ تجسس ہے جس کی ممانعت ہے۔ تعسس اور تحسس کی ممانعت نہیں ہے۔ وہ سنت اور سیرت سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں کی آبادیاں مدینہ کے باہر بھی تھیں۔ جو قبائل اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض مراعات عطا فرمائیں۔ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا کہ من کان علی یھودیتہ او علی نصرانیتہ فانہ لا یبتلی عنھا۔ جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم ہے اس کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نجران کے عیسائیوں کو ایک چارٹر عطا کیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ان کو تمام حقوق اور مراعات دیئے جائیں گے۔ ان کے پادریوں اور گرجوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ وہ اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے۔ لیکن وہ اسلامی شریعت کی بالادستی قبول کریں گے۔ مسلمانوں کو ٹیکس دیں گے اور سود کا کاروبار نہیں کریں گے۔ اس معاہدہ میں واضح طور پر یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ربا کا کاروبار کیا تو یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ گویا اگر ربا کا کاروبار کرو گے تو تمہاری شہریت منسوخ کر دی جائے

گی۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروق کو اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربوٰ کا کاروبار کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے یہ معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔

حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں جو علاقائی نظم و نسق قائم ہوا اس ضمن میں ایک بات کر کے میں گفتگو ختم کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل سے جو معاہدے کئے تو ان قبائل سرداروں کو آپ نے اپنے نمائندے کے طور پر تسلیم کرلیا۔ بہت کم صورتیں ایسی ہوں گی کہ کسی نئے آدمی کو مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر صورتوں میں اسی آدمی کو مقرر کیا گیا۔ بعض صورتوں میں حضور نے دو چیزوں کی یقین دہانی بھی کرائی۔ **انہ لایؤمر علیکم من لیس منکم**، جو شخص تمہارے قبیلے سے نہیں ہے اس کو تم پر امیر مقرر نہیں کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی کرائی کہ تمہارے حکمران تمہارے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ باہر سے حکمرانوں کا مقرر کیا جانا غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ دوسری یہ یقین دہانی فرمائی کہ تمہارے جو اپنے وسائل جنگلات اور پانی وغیرہ کی صورت میں ہیں وہ تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور کوئی ان کو تمہاری رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کر سکے گا۔ یہ بھی غلط فہمی کا ذریعہ بنتا ہے کہ ہمارے وسائل دوسروں کے قبضہ میں چلے جائیں۔ کسی علاقہ کے لوگوں کو یہ بدگمانی یا خیال ہو جائے کہ ہماری دولت فلاں کھا گیا یا فلاں کھا گیا تو اس سے ریاست کی بقاء اور وحدت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ بہت درپیش رہتا ہے۔ اگر پہلے دن سے ہی یہ دو باتیں طے ہو تیں کہ تمہارے صوبے پر تمہارے ہی آدمی کو مقرر کیا جائے گا۔ تمہارے وسائل تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور تمہاری ہی اجازت سے استعمال ہوں گے تو شاید پاکستان نہ ٹوٹتا۔

-☆-

سوال وجواب

حضور ﷺ نے جو مہمات غزوہ بدر سے پہلے بھیجی تھیں وہ اس بات کی علامت تھیں کہ قریش مکہ کے ساتھ لڑائی کا آغاز نبی ﷺ نے کیا تھا۔ حالانکہ اصل مقصد دین کا غلبہ تھا۔

میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ ہجرت کے فوراً بعد جو مہمات بھیجی گئیں وہ سب پر امن سفارتی مہمات تھیں۔ ان کا مقصد جنگ یا ہتھیار کا استعمال نہیں تھا۔ ہتھیار کا استعمال تو قرآن پاک کی اس آیت کے بعد کیا گیا جس میں فرمایا گیا کہ اُذِنَ للذین یقاتلون بانھم ظلموا[1]، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضور غزوہ بدر کے لئے نکل رہے تھے۔ اس سے پہلے تو اجازت ہی نہیں تھی۔ اس لئے ہجرت کے فوراً بعد کے مہینوں میں کسی فوجی اور عسکری دستے کا بھیجا جانا اسلام کے مزاج اور رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار کے مطابق نہ ہوتا۔ اس وقت جو مہمات بھیجی گئیں وہ خالصتاً پر امن اور سفارتی تھیں۔ ان کو صرف اصطلاحاً غزوہ یا سریہ کہا جاتا ہے۔ وہ فوجی مہمات نہیں ہیں۔

☆

آپ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے مختلف قبیلے مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں ایک مرکزی حکومت قائم کی تھی۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج کل کی وفاقی ریاستوں کے مشابہ تھی۔

ممکن ہے کہ یہ ریاست وفاقی نظام سے مشابہ ہو۔ دراصل اس کو وفاقی ریاست بھی کہا جا سکتا ہے۔ کامن ویلتھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جزوی طور پر وہ وفاقی ریاست سے بھی مشابہ تھی

اور جزوی طور پر کامن ویلتھ کے ساتھ بھی مشابہ تھی۔

☆

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی روشنی میں پاکستان کے لوگوں کو سیاست پر زور دینا چاہئے یا دعوت وتبلیغ کے ذریعے اسلامی اقدار پھیلانے پر زور دینا چاہئے۔

میرے خیال میں تو سیاست پر زور دینے اور تعلیم وتربیت کو نظر انداز کرنے سے ہی سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بات میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ سیرت مبارکہ کی روشنی میں کام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اسلامی اقدار، اخلاق اور تمدن کو دعوت وتبلیغ کے ذریعے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد جب اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق وجود میں آ جائیں تو پھر ان کے تحفظ کے لئے ریاست کی ضرورت پڑتی ہے۔ ریاست مقصد نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

☆

کیا حضور کے زمانے میں مدینہ اور خیبر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہودی آباد تھے؟ آج کل کے دور میں سرزمین مدینہ پر یہود کا حق ملکیت تاریخی اعتبار سے کس حد تک درست ہے؟

حضور کے زمانے میں مدینہ اور خیبر سے باہر بھی بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے۔ مدینہ اور جزیرہ عرب میں تو یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کچھ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر جزیرہ عرب میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور یہ ان کی اولاد ہے۔ یہ کہا جاتا ہے، ممکن ہے صحیح ہو۔ یہودیوں کی بڑی تعداد بہر حال جزیرہ عرب سے باہر آباد تھی۔ اس لئے مدینہ منورہ پر ان کا دعویٰ کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اگر سابقہ ملکیتوں کو دعووں کی بنیاد مان لیا جائے تو اسپین پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ پرتگال اور یہاں تک کہ امریکہ پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ امریکہ کو

سب سے پہلے مسلمانوں نے دریافت کیا تھا اور وہاں ایک قوم جو سو فیصد مسلمان تھی اور مدجنین کہلاتی تھی، آباد تھی۔ اس کا وجود ابھی کچھ دن پہلے دریافت ہوا ہے۔ انگریزی میں اس کو ملنجنر کہتے ہیں۔ ملنجنر میں تبلیغ اسلام کا کام بڑے زور و شور سے ہو رہا ہے۔ اگر پرانی تاریخی روایات کے حوالے سے ملکوں کی قسمت کے فیصلے ہونے لگیں تو پوری دنیا کا نقشہ بدلنا پڑے گا۔ اس کے لئے دنیا شاید تیار نہ ہو۔

☆

مدینہ کا پرانا نام یثرب کیوں تھا؟

مجھے نہیں معلوم کہ مدینہ کا پرانا نام یثرب کیوں تھا۔ تاہم بہت سے عرب مؤرخین نے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح یثرب کو اس شہر کے بانی کا نام بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

☆

میثاق مدینہ کے بعد حضور کے حکم پر صحابہ کرام کی چھاپہ مار کاروائیاں کس حد تک درست تھیں؟

ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ جس چیز کو آپ چھاپہ مار کاروائیاں کہہ رہے ہیں وہ غزوہ بدر کے بعد شروع ہوئیں۔ غزوہ بدر کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد چھاپہ مار کاروائیاں درست تھیں۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ شروع ہو جائے اور پاکستان کی نیوی یہ محسوس کرے کہ ہندوستان کا کوئی تجارتی جہاز پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اسلحہ لے جا رہا ہے اور پاکستان کی نیوی اس کو روکے تو یہ بالکل حق بجانب ہوگا۔ دنیا کے ہر قانون اور اخلاق کی رو سے اس کی اجازت ہوگی۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قریش کے جو تجارتی قافلے روکے وہ جائز تھے اور ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جو قافلے روکے گئے وہ صرف دو تھے۔ اس کا مبالغہ آمیزی سے ذکر ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بہت سے قافلے روکے گئے ہوں۔ حضور ﷺ اصلاً جس قافلہ کو روکنے کے لئے

نکلے تھے یہ وہ قافلہ تھا جو بدر کو فنانس کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا بڑا واقعہ پیش نہیں آیا کہ تجارتی قافلے روکے گئے ہوں اور ان سے بہت مال و دولت حاصل کی گئی ہو۔

☆

کیا عبرانی لفظ مدراش اور مدراس ایک ہی ہے جس کے معنی الگ الگ ہیں؟

میں عبرانی نہیں جانتا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک لفظ ہے کہ دو ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں مدراس کا لفظ ملتا ہے کہ حضورﷺ کے زمانے میں یہودی مدرسہ کو مدراس کہا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ دونوں ایک ہی لفظ ہوں۔

دارالحرب اور دارالاسلام کو دور نبوی میں کس حیثیت سے دیکھا گیا۔

یہ دونوں اصطلاحات بعد کی ہیں۔ حضورﷺ کے زمانے میں یہ اصطلاحات نہیں تھیں۔ یہ دوسری صدی ہجری کے اوائل کی اصطلاحات ہیں۔ فقہائے اسلام نے اپنے زمانے میں جب صورت حال کا جائزہ لیا تو اپنے اپنے فہم اور تصور کے مطابق اصطلاحات وضع کیں۔ اس وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک پوری دنیا دو حصوں یا دو داروں اور کیمپوں میں تقسیم تھی، دارالحرب اور دارالاسلام۔ امام شافعی کے نزدیک تین حصوں میں تقسیم تھی، دارالاسلام، دارالحرب اور دارالعہد۔ کچھ اور فقہاء کے نزدیک چار حصوں میں تقسیم تھی، یعنی دارالصلح، دارالحرب، دارالعہد اور دارالاسلام۔ یہ کوئی ایسی متعین اور سخت تقسیم نہیں ہے جس کا ذکر قرآن یا سنت میں آیا ہو۔ یہ الفاظ اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے فقہاء کے فہم کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حضرت عباس بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت حضور کے ساتھ تھے۔

نتیجہ کے طور پر وہ مسلمان شمار کیے جاتے تھے۔ پھر کفار مکہ کی طرف سے لڑتے ہوئے قیدی کیوں بنے؟ کیا ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے؟

ممکن ہے آپ کو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہو۔ لیکن جب وہ بدر میں کفار مکہ کی فوج کے ساتھ تشریف لا رہے تھے تو حضور نے فرمایا تھا کہ عباس قریش کے ساتھ بادل نخواستہ آ رہے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شخص کی زد میں آ جائیں تو اس پر حملہ نہ کرے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کو ان کی اصل حیثیت اور کارکردگی کے بارے میں علم تھا۔ کسی بھی خفیہ کارندے کے بارے میں یہ اعلان نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں شخص ہمارا خفیہ کارندہ ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اپنوں والا سلوک کیا جائے۔ اس لئے اگر وہ بطور مسلمان کے خفیہ طور پر مکہ میں رہے تو یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ کفار مکہ کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیتے تو ان کا اعتماد متاثر ہوتا۔ اس لئے ساتھ روانہ ہو گئے۔ میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت یا تعارض نہیں ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد دعوت و تربیت ہے اور حکومت ایک ضرورت ہے۔ اس دور میں مختلف جماعتیں جو اسلامی حکومت کے لئے کام کر رہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں کیونکہ اجتماعی معاملات اللہ کی کتاب کے مطابق نہیں ہو رہے ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

یہ وضاحت تو آپ ان جماعتوں سے طلب کریں جو یہ کام کر رہی ہیں اور پوری قوم کو آپ کے بقول اجتماعی طور پر کافر قرار دے رہی ہیں۔ ان کی طرف سے میں کیسے وضاحت کر سکتا ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ ان کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے، اس کی روشنی میں وہ بات درست نہیں ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، جمعیت

علمائے پاکستان کا لٹریچر دیکھیں تو ان کا کہنا یہی ہے کہ ہم دراصل دعوت و تبلیغ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور دعوت و تبلیغ کے کام میں ایک غلط حکومت رکاوٹ بن سکتی ہے اس لئے حکومت کو بدلنے کا مقصد بھی ہمارا ایک ثانوی یا جزوی مقصد ہے۔ اس لئے نظری اعتبار سے وہ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو میں نے عرض کی۔

مولانا مودودی نے ماچھی گوٹ میں غالباً 1956 میں ایک تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے پروگرام کے چار مدارج بیان کئے تھے۔ ایک تطہیر عقائد، دوسرا تعمیر عقائد، تیسرا اصلاح معاشرہ اور چوتھا اصلاح حکومت۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم ان چاروں پر کام کریں گے۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہی ہے اس لئے ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم الحمدللہ اجتماعی طور پر کافر نہیں ہیں۔ ہم اجتماعی طور پر بھی مسلمان ہیں اور انفرادی طور پر بھی مسلمان ہیں۔ پاکستان ایک مسلم اور اسلامی ریاست ہے۔ جیسے مسلمان انفرادی طور پر خطا کار ہو سکتے ہیں، اور گناہگار ہوتے ہیں، اسی طرح اجتماعی طور پر بھی مسلمانوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ اس طرح ہماری ریاست مسلمان ہے لیکن اس سے بھی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں۔ غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ ریاستی غلطیوں کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ پاکستانی ریاست یا پاکستانی معاشرہ کو کافر ریاست یا کافر معاشرہ کہنا میرے خیال میں غلط ہے۔ مسلمانوں کی یوں اجتماعی تکفیر کرنے والوں کو اللہ سے توبہ کرنی چاہئے۔

☆

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقرر کردہ نقیب اور عریف کی ریاستی ذمہ داریوں میں کیا فرق تھا؟

نقیب اور عریف تو مختلف سطحیں تھیں۔ عریف دس آدمیوں کا سردار تھا۔ نقیب دس عریفوں کا سردار تھا۔ نقیب کی ذمہ داری عریف کی نگرانی تھی اور عریف کا کام یہ تھا کہ اپنے قبیلہ کے دس آدمیوں کا دستہ تیار رکھے۔ ان کی ضروریات کی نگرانی کرے، ان کی تربیت کرے۔ ان

کے اور قبائلی سرداروں کے درمیان واسطہ بنے، جب حکومت کو کسی بارے میں کوئی رائے درکار ہو تو اپنے لوگوں کے ساتھ مشورہ کر کے حکومت تک ان کی رائے پہنچا دے۔ یہ ایک طرح سے ایک بالواسطہ الیکٹورل کالج بھی تھا۔ ایک طرح سے لوکل گورنمنٹ سسٹم کا حصہ تھا اور ایک اعتبار سے قبائلی سسٹم کو زیادہ بہتر بنانے کا ایک طریقہ تھا۔

☆

کیا رسول اللہ ﷺ نے بنکاری کا کوئی نظام متعارف کرایا ہے؟

میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن جو مقاصد آج کل بنکاری نظام سے حاصل کئے جاتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے مطابق اس وقت بھی حاصل کئے جاتے تھے۔ لوگ اپنی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے۔ تجارت کے لئے قرضہ بھی حاصل کرتے تھے۔ مضاربہ اور مشارکہ کی صورت میں مشترکہ کاروبار بھی ہوتے تھے۔ ان سب کی مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں۔

☆

دشمن افواج کو گرفتار کرنے کے بعد اگر مسلمان افواج کے پاس جگہ نہ ہو، یا ارد گرد دشمن کی فوج موجود ہو اور حالات نازک ہوں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ امیر البحر موجود ہیں ان سے پوچھیں۔ میں نے تو کبھی فوج کی کمان نہیں کی اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ اسلامی احکام وہ ہیں جو میں نے بیان کئے۔ ان احکام کی روشنی میں جو آسان اور قابل عمل حل ہو وہ اختیار کرنا چاہئے۔ کسی زخمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کسی قیدی کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں کا قتل نہیں کیا جائے گا۔ دشمن کے فوج کے ساتھ جو طبی دستہ ہے اس پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ احکام ہیں ان کے مطابق جو مناسب

انتظام ہو وہ کرنا چاہیے۔

☆

میثاق مدینہ کے حوالے تاریخ کی کتب میں تو ملتے ہیں لیکن کیا حدیث کی کتابوں میں بھی ہیں؟

ابھی میں مسند امام احمد اور سنن ابی داؤد کا حوالہ دے چکا ہوں۔ ان دونوں کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔

☆

مولانا محمد میاں نے 'عہد زریں' میں مشرکین مکہ کی طرف سے اپنے لئے ایک وقت میں دس اونٹ ذبح کرنے کا لکھا ہے کیونکہ عام دستور یہ تھا کہ سو آدمیوں کے لئے ایک اونٹ ذبح کیا جاتا تھا۔

یہی بات تو میں نے عرض کی ہے کہ حضور نے اونٹوں کی تعداد سے اندازہ لگایا کہ لشکر کی تعداد کتنی ہے۔ ایک دن نو اونٹ اور ایک دن دس اونٹ ذبح کئے گئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ دشمن کی تعداد نو سو اور ہزار کے درمیان ہے۔

☆

ہمارے دین نے ہمیں یہ سکھایا کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر ایمان لائے تو ٹھیک ورنہ ذمی بن کر رہے یا پھر اس کے ساتھ جنگ ہے۔ امریکہ بھی آج کل یہی کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنا سب کچھ میرے حوالہ کر کے ذمی بن کر رہو اور اگر نہیں مانتے تو جنگ کر دیتا ہے۔ اگر ہمارا دین یہ کہے تو ٹھیک ہے اور اگر امریکہ کہے تو غلط ہے؟

اسلام نے کبھی وہ کام نہیں کیا جو امریکہ کر رہا ہے۔ اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے دوست ہیں یا دشمن۔ دوست ہیں تو بلا تامل ہر اچھی بری بات میں ہمارا ساتھ دیں اور دوست نہیں ہیں تو دشمن ہیں اور ہم آپ کو تہس نہس کر دیں گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جو غیر مسلم آپ کے ملک میں رہتے ہوں تو یا تو وہ کسی مصالحت کے نتیجے میں آپ کے شہری بنے ہوں جس طرح کہ پاکستان کے غیر مسلم ہیں۔ یا کسی جنگ کے نتیجے میں بنے ہوں جیسا کہ کئی علاقوں میں غیر مسلم تھے۔ ان کے حقوق متعین اور محفوظ ہیں۔ جو معاہدہ کیا جائے اس پر عمل کیا جائے۔ شرائط اور حقوق وہ ہیں جو متعین ہیں ان میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ وہ مفتوحہ علاقہ کے غیر مسلم شہری ہوں یا صلح کے علاقہ کے غیر مسلم ہوں۔ لیکن مصالحت یا معاہدہ کے نتیجے میں اگر غیر مسلموں کو مزید حقوق دیئے گئے ہوں تو ان کی پابندی بھی کرنی ہوگی۔ یہ اسلام کا حکم ہے۔ میرے خیال میں دوسرے عقائد کے ماننے والوں کو یا اقلیتوں کو اتنے حقوق آج تک کسی اور مذہب نے نہیں دیئے۔

☆

کیا موجودہ صدارتی یا پارلیمانی نظام اسلام سے مطابقت رکھتا ہے؟

میری ذاتی رائے میں صدارتی نظام اسلام سے زیادہ قربت رکھتا ہے۔ لیکن آج کل کے ماحول میں پاکستان کے بہت سے سیاسی لوگ اس کو قبول نہیں کرتے۔ شاید اس لئے کہ یہاں صدارتی نظام کا تجربہ خوش آئند نہیں رہا۔ یہاں صدارتی نظام کے نام پر فرد واحد کی آمریت مسلط کی گئی جس نے ملک کو دو ٹکڑے کر کے چھوڑا۔

اسلامی نظام میں اصل چیز حکمرانوں پر عامۃ الناس کا اعتماد ہے۔ قرآن وسنت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کے مستند شارحین نے بھی یہی لکھا ہے۔ برصغیر کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے 'المهم في الخلافة رضا الناس به '۔ خلافت کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ اس پر راضی ہوں۔ امام غزالی نے اپنی کتاب 'فضائح باطنیہ' میں لکھا ہے کہ 'فالشخص المتبوع المطاع اذا بايع كفا' کہ اگر کسی شخص سے جو یہ حیثیت

رکھتا ہو کہ لوگ اس کی تابعداری کریں، جب عامۃ الناس اس سے بیعت کرلیں تو یہ کافی ہے۔ اس طرح کے درجنوں حوالے دیئے جاسکتے ہیں جس میں عامۃ الناس کے اظہار اعتماد کو ریاست کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ نبی ﷺ کے عہد میں خاندانوں میں عہدے تقسیم کئے جاتے تھے۔ خاندانوں کی اہلیت کس بنیاد پر طے کی جاتی تھیں؟

اسلام سے بہت پہلے، حضور کے جد امجد جناب قصی کے زمانے سے یہ تقسیم شروع ہوئی تھی۔ قبیلے کا سربراہ اپنی شخصی اور ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے چنا جاتا تھا۔ اس میں اس کا تجربہ، سنیارٹی، علم، فہم اور سمجھ یہ ساری چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اس کی مثال آپ حضرت عمر فاروق، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی شخصیتوں میں ملے گی۔ ان حضرات کی خوبیوں سے اندازہ کرلیں کہ وہ کس شان کے لوگ تھے۔ یہ سب اسلام لائے تو اپنے اپنے قبیلے کے سربراہ تھے۔ ابوجہل اپنے خاندان کا سربراہ تھا اور ایسی شخصی صفات اور صلاحیتوں کا حامل تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے قبول اسلام کی دعا مانگی تھی۔ اگر اسلام لانا اس کی قسمت میں ہوتا تو شاید حضرت عمر فاروق کے مقام اور مرتبے کا حامل ہوتا۔ یہ طریقہ تھا سربراہ چننے کا۔ جو قبیلے کا سربراہ ہوتا تھا وہ اس قبیلے کو حاصل روایتی منصب کا حامل بھی ہوتا تھا۔

☆

بیت اللہ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ ابھی تک یہ اسی خاندان کے پاس چلی آرہی ہے۔ کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ یہ چابی نسل در نسل منتقل ہوگی؟

آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ چابی تمہارے خاندان میں رہے گی 'خالدۃً تالدۃً'، اسی لئے یہ چابی اسی خاندان میں چلی آرہی ہے۔

آپ نے فرمایا تھا کہ نبی کریم کے زمانے میں عریف اور نقیب کا ادارہ موجود تھا۔ کیا اس کو آج کے دور میں لوکل گورنمنٹ سسٹم کہا جاسکتا ہے؟

جی ہاں، کہا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق نے 82-1981 میں ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کو یہ کام کرنے کے لئے بھی کہا گیا تھا۔ اس کمیٹی میں میں نے عریف اور نقیب کی بنیاد پر لوکل گورنمنٹ کا ایک اسٹرکچر بنایا تھا۔ اب بھی اس کی کاپی میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ وہ خاکہ جنرل ضیاء صاحب کو بھیجا بھی تھا، لیکن شاید انہوں نے یا ان کے رفقاء نے اس کو پاکستان کے لئے قابل عمل نہیں سمجھا۔

☆

حضور رحمۃ للعلمین تھے تو ان کو غزوات کی کیا ضرورت تھی؟

رحمۃ للعلمین ہی کا تقاضا ہے کہ بدمعاشوں، بدکرداروں اور ظالموں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔ یہ رحمت کے خلاف ہے کہ آپ ظالم اور مظلوم کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کریں۔ جس نے چوری کی ہے اور جس کے ہاں چوری ہوئی ہے ان دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولنا، جس نے قتل کیا ہے اور جو قتل ہوا ہے ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا عدل کے خلاف ہے۔ حضور رحمۃ للعلمین تھے۔ آپ کی رحمت کا سب سے بڑا تقاضا عدل ہے۔ جس کے قرآن میں بار بار اشارے ہیں۔ عدل اور رحمت کا تقاضا ہے کہ بدکاروں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔

☆

موجودہ دور کی سب سے بڑی اسلامی مملکت سعودی عرب کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

آپ ہی بتائیے کہ وہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کس اعتبار سے ہے۔ اگر اس اعتبار سے ہے کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں تو پھر تو انڈونیشیا اور پاکستان زیادہ بڑی مملکتیں ہیں۔ اگر اس اعتبار سے کہ وہاں حرمین واقع ہیں تو بلاشبہ وہ سرزمین مقدس اور یقیناً قابل احترام ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق افسوس ہے کہ آج کی کوئی مملکت اسلامی مملکت نہیں ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام ہم سب کی آرزو ہے۔ وہ جب قائم ہوگی کہ معاشرہ اسلامی ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جب معاشرہ کے افراد کی اکثریت اسلام سے بے بہرہ ہو۔ عبادات کی پابند نہ ہو۔ چوری بدکاری جھوٹ اور اس طرح کے جرائم میں مبتلا ہو اور حکومت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسی قائم ہو جائے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

کسی نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے میں بہت امن تھا۔ آپ کے زمانے میں بدامنی کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ میرے جیسے لوگوں پر حاکم تھے میں تم جیسے لوگوں پر حاکم ہوں۔

☆

عہد حاضر میں یہودنواز علما فرماتے ہیں کہ بیت المقدس میں جہاں پہلے ہیکل سلیمانی تھا۔ اسلامی رواداری کی بنیاد پر وہاں یہودی عبادت گاہ کی تعمیر کا حق تسلیم کیا جانا چاہئے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ جب حضرت عمر فاروق کے دور میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس وقت عیسائیوں سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدہ پر سیدنا عمر فاروق، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت خالد بن ولید اور حضرت معاذ بن جبل جیسے بڑے بڑے صحابہ کے دستخط تھے۔ اس میں عیسائیوں کے کہنے پر یہ شرط رکھی گئی تھی کہ یہودیوں کو بیت المقدس میں داخلہ کی اور آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ شرائط نامہ 'عہدہ عمریہ' کہلاتا ہے۔ دستاویز آج بھی موجود ہے۔ مسلمانوں نے اُس دور سے لے کر 1908ء میں سلطان عبدالحمید خان کی خلافت کے خاتمہ تک اس کی پابندی کی۔ اس کے بعد مغربیت اور روشن خیالی کے نام پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع ہوئی جس کے نتائج آپ کے

سامنے ہیں۔

ہیکل سلیمانی یا بیت المقدس پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر یہودیوں کا کوئی حق تھا تو عیسائی یہ حق کب کا ان سے لے چکے تھے۔ مسلمانوں نے ایک معاہدہ کے تحت بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا اور مسلمانوں کو اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہئے۔ اگر آج کچھ پست ہمت اور پست حوصلہ لوگ تاریخ کو بھلانا چاہتے ہیں تو یہ ان کی پست حوصلگی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ قوموں کی تاریخ میں چالیس پچاس سال کوئی مدت نہیں ہوتی۔ چین کے ایک جزیرے پر پانچ سو سال سے پرتگال کا قبضہ ہے۔ ایک دوسرے جزیرے پر چار سو سال تک انگریزوں کا قبضہ رہا۔ لیکن چین نے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا اور بالآخر وہ جزائر خالی کرا لئے گئے۔ جزیرہ مکاؤ پر پانچ سو سال تک قبضہ رہا۔ پانچ سو سال گزرنے کے بعد خالی کرالیا گیا۔ فاکس لینڈ پر برطانیہ دو سو برس سے قابض ہے لیکن ارجنٹائن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہ تو بزدل اور پس ہمت مسلمان قیادتیں ہیں جو دو چار پانچ دس سال ہی کے بعد حوصلہ ہار کر مسلمانوں کی ہر چیز دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے مقدس علاقے ہیں، کسی مسلمان لیڈر کی ذاتی یا خاندانی جاگیر نہیں ہیں۔ نہ کسی بزدل اور پست حوصلہ لیڈر کے فیصلہ کی دنیائے اسلام پابند ہے۔

☆

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمانہ جاہلیت کی جو باتیں اسلام میں رائج ہونے کی اجازت دے دی تھی وہ کون سی باتیں تھیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دور جاہلیت کی ہر اچھی بات، ہر اچھا اخلاق اسلام میں رائج رہنے کی اجازت دی تھی۔ کاروبار کے تمام جائز طریقے مثلاً مشارکہ، مضاربہ، حضور نے ان کی اجازت دی۔ شادی بیاہ کے بہت سے طریقے تھے۔ ان میں سے جو طریقے اسلام کے مزاج کے مطابق تھے اس کی حضور نے اجازت دی۔ اس طرح کے جائز امور کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔

جب مقامی لوگوں کو اپنے اپنے وسائل کے حقوق حاصل
ہوں گے تو مرکز کے ذرائع آمدنی کیا ہوں گے؟

مرکز کو زکوٰۃ کی آمدنی سے حصہ ملے گا۔ اس کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا۔ کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جائے گی۔ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جایا کرتی تھی۔ زکوٰۃ کا نظام حضور کے زمانے سے یہ چلا آ رہا ہے کہ اس کا ایک حصہ مرکز کو ملتا تھا۔ مرکز کے پاس ان شاءاللہ وسائل کی کمی نہیں ہوگی۔ اسلام پر عمل درآمد سے وسائل میں کمی نہیں آئے گی۔ اسلام سے انحراف کے نتیجے میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام سے وابستگی کی صورت میں مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔

☆

حکومت ضرورت ہے مقصد نہیں'۔ یہ بات ذرا وضاحت کے
ساتھ بیان کر دیں۔

حکومت مسلمانوں کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ اے مسلمانو تم حکومت قائم کرو۔ یہ کہا گیا ہے کہ تم امت قائم کرو۔ تم میں سے ایک امت ہونی چاہئے جو اچھائی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے۔ تم لوگوں کو اخلاق سکھاؤ۔

اس کام کو کرنے میں اگر حکومت رکاوٹ بنتی ہے تو اس کی اصلاح کرو۔ اور اگر تم میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ حکومت دے دے تو وہ اس کو اسلام کے مطابق چلائے۔ اس لئے اصل اور بنیادی ذمہ داری معاشرہ کی اصلاح اور دین داری کا قیام ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ایک ہوتا ہے 'مطلوب لعینہٖ' اور ایک ہوتا ہے 'مطلوب لغیرہٖ'، یعنی مقصود لعینہٖ اور مقصود لغیرہٖ، یعنی وہ چیز جو per se مقصود ہے۔ Some thing to be required or to be done per se. ایک وہ چیز ہے جو کسی اور مقصد کی خاطر ایک ذریعہ کے طور پر ضرورت کی وجہ سے اختیار کی جائے۔ تو حکومت کی ضرورت بطور وسیلہ اور ذریعہ کے ہے بطور خود مقصود

نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر حکومت مقصود لعینہ نہیں، مقصود لغیرہ ہے۔

☆

ہماری آج کی نسل جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کثرت سے تعلیم حاصل کر رہی ہے، ان تک یہ پیغام پہنچانے کے لئے آپ لوگ کیا کوششیں کر رہے ہیں؟ کیا موبائل یونٹس بنا کر اس طرح کے پروگرام کالج اور یونیورسٹی سطح پر ہو سکتے ہیں؟

بالکل ہونے چاہئیں۔ آپ ضرور کریں۔ کالجوں میں موبائل یونٹ بنائیں۔ دعوۃ اکیڈمی اس طرح کے بہت سے پروگرام منعقد کرتی ہے۔ دعوۃ اکیڈمی نے لائبریریاں قائم کی ہیں۔ اور بہت سے پروگرام کئے ہیں۔ آپ اگر کوئی موبائل لائبریری بنانا چاہیں یا lending library بنانا چاہیں تو دعوۃ اکیڈمی سے رابطہ کریں۔

☆

جو لوگ رسول اللہ کے طریقہ کار کے مطابق اپنی زندگیوں کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں حکومت وقت کی اسلام مخالف پالیسیوں کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟

مسلمان کا رویہ ہر چیز میں یہ ہونا چاہئے کہ اچھی چیز میں تعاون کرے اور بری چیز میں تعاون نہ کرے۔ وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوانْ۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور برائی اور سرکشی کے کام میں تعاون نہ کرو۔ یہ رویہ ہر شخص کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حکمرانوں کو اخلاص اور دردمندی سے نصیحت کرنی چاہئے۔ اگر دردمندانہ نصیحت جو شرعی آداب واحکام کے مطابق کی جائے تو وہ بے نتیجہ نہیں رہتی۔

☆

جب ریاست خود مقصود نہیں تو آیت کریمہ میں جو ذکر ہوا ہے کہ واجعل لی من لدنک سلطانا نصیراً۔

سلطان کے معنی حکومت نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اختیار یا اقتدار کو میرا مددگار بنادے۔ وہ خود براہ راست حکومت کی شکل میں ہو یا کسی حکومت سے مدد کی شکل میں ہو۔ دونوں چیزوں کی اجازت ہے۔ اس آیت کے الفاظ سے بھی ریاست کا ذریعہ اور وسیلہ ہونا اور خود مقصود نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

☆

رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی عمل مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے کیا جس کی بنا پر مختلف فقہیں پیدا ہوئیں اور ہر فقہ نے ایک طریقہ کو اپنا لیا۔ وہی طریقے جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمائے وہ سنت کہلاتے ہیں۔ کیا اس کی یہ تاویل درست نہیں ہوگی کہ طریقے سے زیادہ تبدل سنت ہے۔ یعنی ان مخصوص طریقوں کے علاوہ بھی موقع محل کے مطابق دیگر طریقوں کو اختیار کرنا سنت ہی کہلائے گا؟

نہیں۔ اس بات کو تھوڑا سا کوالیفائی کرلیں۔ جو چیزیں اسلام میں مقصود اصلی ہیں۔ جن کا شریعت میں باقاعدہ حکم ہے۔ اس میں تو شرعی طریقے کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا درست نہیں ہے اور کوئی نیا طریقہ اپنایا گیا تو وہ بدعت کہلائے گا۔ لیکن جو طریقے means یا وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں نئے نئے ذرائع آپ اختیار کرسکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے میں تیروں اور تلواروں کے ذریعے جنگ لڑی۔ آپ بم اور جہاز سے لڑ سکتے ہیں۔ حضور نے اپنے زمانے میں صفہ کی درسگاہ قائم کی۔ آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بنادیں۔ حضور نے گھوڑوں پر سفر کیا آپ جہازوں پر کرسکتے ہیں۔

لیکن جو مقاصد ہیں ان میں ترمیم واضافہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کہیں کہ میری چار رکعتوں سے تسلی نہیں ہوتی میں چھ پڑھوں گا۔ فجر کے وقت ساری رات آرام کرکے اٹھا ہوتا ہوں تو دو کی بجائے زیادہ رکعت پڑھوں گا۔ یہ بدعت ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔

☆

حکومت پاکستان نے حدود آرڈیننس کے حوالے سے ایک تحریک شروع کی ہے، جو مغربی سازش ہے۔ قرآن وحدیث کی رو سے ذرا وضاحت فرمائیے۔

جب حکومت پاکستان کا ترمیمی آرڈیننس آئے گا پھر اس پر رائے دی جاسکے گی۔ ابھی رائے دینا قبل از وقت ہے۔ ممکن ہے کہ جو ترامیم آئیں وہ اچھی ہوں۔ اگر اچھی ہیں تو ان کو قبول کرنا چاہئے اور اگر ان میں کوئی خامی ہے تو اس کی نشاندہی کرنی چاہئے۔

☆

میثاق مدینہ اور دستور مدینہ میں کیا فرق ہے؟

میثاق مدینہ ہی کو دستور مدینہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے حضور نے 'کتاب' کی اصطلاح استعمال کی، ہذا کتاب من محمد عبداللہ ورسولہٗ۔ کتاب کا لفظی معنی چارٹر ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو دستور کہا ہے۔ بعض نے معاہدہ کہا ہے۔ یہ محض تعبیرات ہیں۔

☆

کاؤنٹر انٹیلی جنس جب دشمن کے جاسوسوں کو غلط معلومات دیتے ہیں تو کیا جھوٹ کے زمرے میں آتے ہیں؟

یہ جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔ کسی مسلمان نے جھوٹ نہیں بولا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا لعلنا امرنا ھم بذالک، شاید ہم ہی نے انہیں یہ کام کرنے کے لئے کہا ہو۔ حضور نے کوئی بات غلط نہیں فرمائی۔ لیکن اس سے دشمن نے وہی مفہوم لیا جو حضور دینا چاہتے تھے۔

آپ نے فرمایا کہ میثاق مدینہ میں چار قبائل نے شرکت نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ ان قبائل میں مسلمان بھی شامل

تھے؟

جی ہاں! ان قبائل میں اکادکا مسلمان بھی شامل تھے۔ بنی اوس کے جو چار قبائل شروع شروع میثاق مدینہ میں شامل نہیں ہوئے، ان کی اکثریت اس وقت تک مسلمان نہیں تھی۔ وہ بعد میں مسلمان ہوئے۔

☆

کل آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ جب حضور ﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے تو کیا آپ کی روح مبارک موجود ہوتی ہے؟ میری ایک درخواست ہے کہ اس بات کی وضاحت فرمائیں۔ اس بات سے بہت سے لوگ بہت سی بدعات اور خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟

میری گزارش ہے کہ آپ فرقہ وارانہ بحثیں نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔ آپ کی روح مبارکہ کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ ہم جیسے لوگوں کی محفل میں موجود ہے، یا ہر کس و ناکس کی مجلس میں آتی ہے، یہ شاید گستاخی ہو۔ لیکن ہمارا درود و سلام حضور تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے۔

☆

آج کل جو پولیس encounter ہوتے ہیں، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ کیا اس سے معاشرے کو مظالم سے نجات ملتی ہے۔

میرے خیال میں بغیر عدالتی تحقیق کے کو کسی قتل نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت سے ثابت نہ ہو کہ مجرم مستوجب قتل ہے اس وقت تک اس کے خلاف کوئی یک طرفہ کارروائی کی اجازت کسی بھی قانون میں نہیں ہے۔ اسلام میں بھی نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں تین بڑے فرق ہیں۔ اسلامی جمہوریت شریعت کی بالادستی کی پابند ہے۔ شریعت کے احکام کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جبکہ مغربی جمہوریت کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے بہترین لوگ مسلمانوں کے قائد ہونے چاہئیں۔ مغربی جمہوریت میں یہ شرط نہیں ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ عامۃ الناس جب اعتماد کا اظہار کریں تو اس میں اخلاقی اور روحانی considerations کو پیش نظر رکھا جائے۔ مغربی جمہوریت میں اس کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

☆

کیا سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیئے جاتے تھے؟

جی ہاں! سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیئے جاتے تھے۔ سفیر حکومت کے مہمان ہوتے ہیں فرد کے نہیں۔ اس لئے سفیروں کو سرکاری خزانے سے تحائف دیئے جانا شریعت کے مطابق ہے۔

☆

یہ ایک لمبا سوال ہے جس میں شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ اشعار پر اعتراض کیا گیا ہے کہ

یاصاحبَ الجمال ویاسید البشر
من وجھک المنیر لقد نور القمر
لایمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ایسی ذات کے بارے میں یہ کہنا کہ نعت پڑھنی چاہئے یا نہیں حالانکہ نعت پڑھنا تو تعریف کا ایک طریقہ ہے۔ جس کا رب اس ذات پر درود بھیجتا ہو ....

یہ اشعار پتہ نہیں شیخ سعدی کے ہیں یا شاہ عبدالعزیز کے ہیں۔ دونوں سے منسوب ہیں۔ کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے یہ بالکل نہیں کہا کہ نعت نہیں پڑھنا چاہئے۔ نعت کہنا اور نعت پڑھنا تو بہت اچھی بات ہے۔ صحابہ کی سنت ہے۔ حضور کے زمانے میں آپؐ کی موجودگی میں صحابہ کرام نعت پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جو چیز شرعاً لازم اور واجب نہ ہو، اس کو شریعت کی رو سے لازم اور واجب سمجھنا محل نظر ہے۔ اس لئے نعت خوانی کی کسی خاص صورت یا کوئی خاص شکل متعین کر کے اس کو شرعی حیثیت دینا ناپسندیدہ ہے۔

☆

قرآن پاک کے تیس پاروں کی تقسیم صحابہ کرام کے دور میں ہوئی یا بعد میں ہوئی؟

قرآن کے تیس پاروں کی تقسیم بعد میں ہوئی ہے۔ شروع میں صحابہ کرام کی تربیت یہ تھی کہ وہ تین یا سات دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا معمول یہ تھا کہ وہ سات دنوں میں پورے قرآن کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سات منزلیں پڑ گئیں جو اب بھی مشہور و معروف ہیں اور اکثر قرآن پاک کے نسخوں میں ان کی علامات موجود ہیں۔ بعد جب کچھ تساہل پیدا ہوا تو لوگ تیس دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرنے لگے۔ اس وقت لوگوں کی سہولت کی خاطر یہ تیس پارے تجویز کئے گئے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ محض تلاوت کی سہولت اس کا مقصد ہے اور قرآن پاک کے مضامین اور مطالب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بیعت اسلام اور بیعت جہاد کا ذکر تو احادیث سے ملتا ہے۔ کیا صوفیا کے ہاں مروجہ بیعت طریقت کا بھی کوئی ذکر قرآن و حدیث میں آتا ہے؟

قرآن و حدیث میں براہ راست تو ایسا کوئی حکم نہیں۔ لیکن ایسا ذکر آتا ہے کہ صحابہ کرام

نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کے معنی کسی وعدے یا عہد نامہ کے ہے۔ آپ کسی نیک اور بزرگ انسان کے ساتھ یہ وعدہ کریں کہ آپ شریعت کے مطابق فلاں کام کریں گے۔ اس کو بیعت کہتے ہیں۔ بیعت کا زیادہ رواج اسلام، جہاد اور دعوت وتبلیغ کے کاموں میں ہوتا تھا۔ اگر کوئی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہ کہے کہ میں شریعت کی پابندی کروں گا اور آپ جو تربیت کریں گے اس کے مطابق اپنی زندگی سنواروں گا تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆

آپ نے رسول اللہ ﷺ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ قبائل سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے حکمراں تم میں سے ہی ہوں گے۔ کیا آج ایسا کرنا ضروری نہیں؟

آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ حضور جن قبائل کو دعوت دیا کرتے تھے تو ان سے یہ کہا کرتے تھے۔ بلکہ بعض قبائل کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو چارٹر لکھ کر دیا تو اس میں یہ لکھا کہ تمہارے امیر تم میں سے ہوں گے۔ یہ سب کے ساتھ نہیں ہوا۔ جہاں یہ خیال ہوا کہ کسی خاص قبیلے میں اس پر ردعمل ہوگا یا وہ زیادہ حساس تھے تو آپ نے ان کو یہ یقین دہانی کرادی۔ جہاں ایسا نہیں تھا وہاں ایسا نہیں ہوا۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار تھا۔

حضور ﷺ کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی قبیلہ کے لوگ کسی معاملہ میں حساس ہوں تو ان کے جائز احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ یا باہر والوں کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہوں وہاں باہر والوں کو نہیں بھیجنا چاہیے۔ یہ ان معاہدات سے ثابت ہو جاتا ہے۔

☆

رسول اللہ ﷺ اپنے سفیروں کو کس طرح کی ہدایات عطا فرماتے تھے؟

حضورﷺ جو ہدایا دیتے تھے ان میں کپڑا بھی ہوتا تھا، کھجوریں بھی ہوتی تھی، خوشبو بھی ہوتی تھی۔ اس میں جانور یا تلواریں بھی ہوتی تھیں۔ جس شخص کو جس طرح کا ہدیہ مناسب یا موزون ہوا کرتا تھا وہ آپ دیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابئی کا تعلق میری معلومات کے مطابق خزرج کے قبیلے سے تھا۔ میں نے تحقیق نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خزرج سے تھا۔

☆

گزارش یہ ہے کہ یہاں ہال میں داخل ہونے کے لئے
خواتین کے لئے الگ راستہ مقرر کیا جائے۔

ڈاکٹر زمان صاحب سے میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ خواتین کے لئے الگ راستہ مقرر کردیں۔

☆

کیا مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر بھی ممکن ہے؟

بعض مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر ممکن ہے، بعض کا ممکن تو ہے لیکن مشکل ہے، بعض کا ممکن نہیں ہے۔ شریعت اور ریاست لازم وملزوم نہیں ہیں۔ ریاست شریعت کی ضرورت ہے۔ کیا امریکہ میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ شریعت پر عمل نہیں کررہے؟ کیا مکہ میں فتح مکہ سے پہلے رہنے والے مسلمان شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے؟ بالکل کرتے تھے۔ کیا حبشہ میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہاں شریعت پر عمل نہیں کررہے تھے۔ حالانکہ وہاں ریاست نہیں تھی۔ شریعت پر عمل ریاست کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ ریاست نہ ہوتو شریعت کی ریاستی ذمہ داریاں پوری نہیں ہوسکیں گی البتہ فرد اپنی ذمہ داریاں ریاست کے بغیر بھی انجام دے سکتا ہے۔

☆

غیر مسلموں کے بارے میں ' فاقتلوا هم حیث

وجدتموا ھم' پر اس دور میں کیونکر عمل ہوگا؟

اگر اس کا یہی مفہوم ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو بہت افسوس کی بات ہے۔

دیکھیں قرآن وحدیث کا مطالعہ اور تعبیر وتشریح بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اس طرح سے تھوڑی سی عربی سیکھ کر مفتی نہیں بن بیٹھنا چاہئے۔ فاقتلوا ھم حیث وجدتموھم کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس سیاق وسباق کو سامنے رکھیں جس میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ آیت آئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے تم پر حملہ کیا ہے، تمہیں گھروں سے نکال دیا ہے، تمہارے اوپر بیس سال سے مظالم کر رہے ہیں جب ان کے ساتھ میدان جنگ میں مقابلہ کی نوبت آئے تو پھر بزدلی مت دکھاؤ۔ جہاں پاؤ قتل کرو۔

یہ حکم تمام غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ بہت سے غیر مسلموں کے ساتھ تو حضور نے معاہدے کئے۔ مدینہ میں اور پورے جزیرہ عرب میں غیر مسلم رہتے تھے۔ یہ سارے معاہدات حدیث میں موجود ہیں۔ اس سارے ذخیرے کو نظر انداز کر کے آپ کہیں کہ فاقتلوھم حیث وجدتموھم، کا حکم ہر غیر مسلم کے لئے ہے، یہ تفسیر کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یہ تو تحریف قرآن ہے۔

☆

ریاست مدینہ میں کھیل اور اس طرح کی دوسری ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا کوئی انتظام تھا یا نہیں؟

ریاست مدینہ میں تفریح اور کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔ صحابہ کرام کھیلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ گھڑ دوڑ، اونٹ دوڑ، تلوار بازی اور تیراندازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ یہ مقابلے بچوں کے درمیان بھی ہوتے تھے اور جوانوں کے درمیان بھی۔ یہ چیزیں حضور کے زمانے میں رائج تھیں۔ آج بھی ہونی چاہئیں۔ اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

☆

ریاست مدینہ میں ابلاغ یا اخبار کے ادارے تھے؟

اخبار تو اس زمانے میں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جو کام اس زمانے میں اخبار نویس کیا کرتے ہیں وہ اُس زمانے میں شاعر کیا کرتے تھے۔ حضور نے شعر و شاعری کے ادارے سے کام لیا ہے۔ دربار رسالت میں شعرا موجود ہوتے تھے۔ اسلام کے نقطہ نظر کو عرب میں عام کرنے کے لئے صحابہ کرام نے اس ذریعے سے کام لیا۔ اس لئے ہم ابلاغ اور تشہیر ہر جائز ذریعے سے جائز کام لے سکتے ہیں۔

☆

اگر ریاست میں مکمل اسلام نافذ کرنے کا موقع میسر آ جائے تو نافذ کرنے کے لئے کیا اسلامی شریعت codified حالت میں موجود ہے؟

اس وقت تو موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ملک کے حالات مختلف ہیں۔ شریعت کے احکام ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ کوڈیفائی ہوں گے۔ بیشتر حصہ کوڈیفائڈ شکل میں موجود ہے۔ بہت سے احکام تحریری اور کوڈیفائڈ شکل میں موجود ہیں۔ جو کوڈیفائڈ موجود ہیں ان کو پہلے نافذ کر لیں بعد میں بقیہ احکام کوڈیفائی بھی ہو جائیں گے اور نافذ بھی۔

☆

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ریاست میں نفاذ شریعت کا کام تدریجی انداز میں کرنا چاہئے۔ آپ کی رائے اس بارہ میں کیا ہے؟

میں تدریجی انداز کا ہی قائل ہوں۔ دور نبوی میں بھی اسلامی شریعت کا نفاذ تدریجی انداز میں ہوا تھا۔ شراب ایک دن میں حرام نہیں ہوئی تھی۔ سود کی حرمت ایک دن میں نافذ نہیں

ہوئی تھی۔ یہ جو بہت سارے احکام ہیں یہ تقریباً سب ہی ایک ایک کر کے تدریجاً ہی نافذ ہوئے تھے۔ قرآن پاک کا نزول تئیس سال میں ہونا خود اس بات کی دلیل ہے۔ اگر ساری شریعت کو یکدم سے نافذ ہونا ہوتا تو یہ سارے احکام ایک ہی دن میں نازل ہو جاتے۔ جب آخری دن تک قرآن پاک نازل ہوتا رہا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ کام تدریج کے ساتھ ہونا چاہئے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ قیدیوں کو قتل کرنا منع تھا تو بدر سے واپسی پر امیہ جاہلیت کے زمانے کے قتل کے بدلے میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

دیکھیں! جنگی مجرموں کا مسئلہ دوسرے قیدیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جنگی مجرموں کا قتل دنیا کے ہر قانون میں جائز ہے۔ حضور نے غزوہ بدر، فتح مکہ اور اس طرح کے کچھ اور مواقع پر کچھ لوگوں کو جنگی مجرم قرار دیا تھا۔ تین چار آدمی جو جنگی مجرم تھے ان کو قتل کیا گیا۔ عام قیدیوں کو حضور کے زمانے میں کبھی بھی قتل نہیں کیا گیا۔

☆

سوشل کنٹریکٹ یا عقد اجتماعی کی روشنی میں جو معاشرہ بنتا ہے اس کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالیں۔

یہ تو بہت لمبی بات ہو جائے گی۔ سوشل کنٹریکٹ پر تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے صرف یہ حوالہ دیا تھا کہ مغرب میں سوشل کنٹریکٹ کی بات تو بہت ہوتی ہے۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ واقعی سوشل کنٹریکٹ ہوا ہو۔ یہ واحد مثال ریاست مدینہ کی ہے جہاں قبائل کے نمائندوں نے ایک معاہدہ کیا اور اس کے نتیجے میں ایک معاشرہ قائم ہوا اور ایک ریاست بنی۔ لہٰذا اگر سوشل کنٹریکٹ کی کوئی حقیقت ہے تو اس کا اطلاق مدینہ کی ریاست پر ہی ہو سکتا ہے۔ کسی اور ریاست پر اس کا اطلاق مشکل ہے۔

کل آپ نے جرمن مورخ ووسٹن فیلڈ کا ذکر کیا تھا۔ اس کی تحقیق کے مطابق حجۃ الوداع بروز ہفتہ بنتا ہے۔ کیا یہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک دانستہ کوشش تھی یا اسلامی تاریخ سے لاعلمی تھی۔

میرے خیال میں لاعلمی اس غلطی کی وجہ تھی۔ دانستہ ایسا کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے جان بوجھ کر کیا ہو۔ ووسٹن فیلڈ پر تو بہت تنقیدیں لکھی گئی ہیں۔ اس کی تنقید ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی کی۔ ووسٹن فیلڈ کی تقویم کو کبھی بھی قبول عام کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ قبول عام کا زیادہ درجہ زمباور کی تحقیق کو حاصل ہوا جس کے مطابق حجۃ الوداع جمعہ ہی کو آتا ہے۔

☆

آپ کے نزدیک میثاق مدینہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے، حالانکہ اس سے پہلے جسٹینین کوڈ موجود تھا۔

آپ نے پتہ نہیں جسٹینین کوڈ پڑھا ہے کہ نہیں۔ وہ ایک ملک کا داخلی قانون ہے کوئی آئین اور دستور نہیں ہے۔ جسٹینین کے کوڈ میں بادشاہ کے حقوق نہیں لکھے گئے۔ شہریوں کے حقوق نہیں لکھے گئے۔ Constitution فرد اور ریاست کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کو کہتے ہیں۔ قانون افراد کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کو کہتے ہیں۔ جسٹینین کوڈ چھپا ہوا موجود ہے اس میں افراد کے درمیان کے باہمی تعلق یعنی آپس کے لین دین، شادی بیاہ اور تجارت وغیرہ کو مربوط کیا گیا ہے اور اس میں ریاست اور فرد کے تعلقات کو منضبط نہیں کیا گیا۔ اس لئے آپ اس کو دستور نہیں کہہ سکتے۔ وہ خود بھی اس کوڈ کو دستور نہیں کہتے۔ رومن بھی اپنے اس کوڈ کو پہلا دستور نہیں کہتے۔

اسلامی تعلیمات سے عاری نظام زندگی یا حکومت میں تزکیہ نفس، عدل اجتماعی اور نمونہ نبوت جیسے عظیم مقاصد کیسے حاصل

کیے جاسکتے ہیں؟

تعلیم و تبلیغ سے، تربیت سے۔

☆

مزید برآں تلاوت آیات سے مراد صرف تلاوت تک محدود ہے یا آیات قرآنی کے اوپر نظام زندگی کا قیام بھی مقصود ہے۔

تلاوت آیات سے قرآنی پیغام پہنچانا مقصود ہے۔ تزکیہ سے اپنی اصلاح مقصود ہے۔ آپ پہلے حکومت کو چھوڑ کر اپنی اور لوگوں کی اصلاح کریں۔ حکومت کی اصلاح بعد میں کریں۔ جو لوگ حکومت کی اصلاح کرنے نکلے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں ایسی چیزیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں جس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پہلے ان کو اپنے تزکیہ کی ضرورت ہے۔

☆

پاکستان کے خفیہ اداروں کو قرآن وسنت کے مطابق کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ جبکہ ملکی بحران اور تحریک کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔

میرے علم میں تو نہیں کہ ملک میں بحران خفیہ اداروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر آپ کے علم میں ایسی کوئی بات ہے تو ان کو توجہ دلا یئے۔

☆

تعسس سے کیا مراد ہے؟ دوبارہ وضاحت فرمایئے۔

تعسس کسی ایسی سراغ رسانی کو کہتے ہیں جس کا مقصد معاشرہ میں امن وامان قائم کرنا ہو۔ معاشرے میں مجرموں کا پتہ چلانا ہو۔ عسس پولیس اور مجسٹریسی کو بھی کہتے ہیں۔

عسس وہ ادارہ تھا جو مجرموں پر قابو پانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

تحسس اگر ح سے ہو یعنی تحسس تو اس کا مطلب ہے کسی اچھی چیز کی تلاش اور اچھی چیز کے بارے میں معلومات جمع کرنا۔ اس میں مثبت جاسوسی شامل ہے یعنی اپنے دفاع کے لئے معلومات تلاش کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

تجسس کا مطلب ہے کسی منفی مقصد کی خاطر لوگوں کی برائیوں کی تلاش کرنا۔ جیسا کہ بعض حکومتوں میں مخالفین کی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں۔ مخالفین کے اخلاقی جرائم کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ تصویریں بنا کر پھر ان کو بلیک میل کرتے ہیں، یہ تجسس میں آتا ہے جس کی ممانعت ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر فراہم کرتا ہے اور برے حاکم کو برے وزیر فراہم کرتا ہے۔ آپ خود بھی وزیر رہ چکے ہیں۔ اس تجربہ کی روشنی میں آپ حاکم وقت کو کیسا سمجھتے ہیں؟

میں جب یہ بات کہہ رہا تھا تو میرے ذہن میں وسوسہ آیا تھا کہ یہ سوال کیا جائے گا۔ میرے خیال میں اس کا اصل جواب تو خود اس حدیث کے الفاظ میں پنہاں ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو اچھے وزیر فراہم کر دیتا ہے۔ اور جب کسی حاکم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اس کو برے وزیر عطا کر دیتا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اپنے سوال کا جواب آپ خود ہی دیجئے۔ میں تو نیک نیت اور نیک عزائم سے گیا تھا اور نیک کام ہی کرنا چاہتا تھا۔ جب تک میں محسوس کرتا رہا کہ میں کچھ اچھے کام کر سکتا ہوں تو میں وابستہ رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ ایسا کرنا مشکل ہے تو میں الگ ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆

جدید مورخین سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس پر ان شاء اللہ دور جدید کے عنوان کے تحت بات ہو گی۔ جدید مورخین سے مراد وہ

سب لوگ ہیں جو بیسویں صدی کے آغاز سے تاریخ اسلام اور سیرت پر کام کرتے آئے ہیں وہ سب جدید مورخین ہیں۔

☆

جس ریاست مدینہ کا آپ نے ذکر کیا وہ جمہوری تھی، پارلیمانی، صدارتی یا کوئی اور طرح کی؟

میرے خیال میں حضورﷺ کے زمانے کی حد تک تو وہ ریاست نبوی تھی۔ اس کو صرف نبوی اور پیغمبرانہ ریاست کہنا چاہئے۔ جب حضور دنیا سے تشریف لے گئے اور صحابہ کرام نے ذمہ داریوں کو سنبھالا تو اس وقت سے وہ جمہوری اور شورائی ریاست تھی۔ حضرت صدیق اکبر نے صحابہ کرام کے مشورہ اور رضامندی سے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں کیا کہنا چاہئے، اس بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ میرے خیال میں اس کو صدارتی نظام کے قریب کہنا چاہئے۔

☆

ساتواں خطبہ

ریاست مدینہ

معاشرت و معیشت

ساتواں خطبہ

ریاست مدینہ
معاشرت ومعیشت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

محترم جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب، صدر جلسہ
جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
برادران مکرم،
خواہران محترم،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ریاست مدینہ، معاشرت ومعیشت۔ ریاست مدینہ پر یہ گفتگو گزشتہ ہفتے پیش کی جانے والی گفتگو ہی کا ایک حصہ یا تتمہ ہے۔ وہ چیزیں جو پچھلی گفتگو میں اس موضوع پر عرض کی گئیں، ان کو آج دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ریاست مدینہ کے دو اہم پہلوؤں پر بعض گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

۱: مدینہ منورہ میں معاشرت اور اس سے متعلق چند مسائل،

۲: مدینہ منورہ میں بعض انتظامی شعبہ جات، خاص طور سے وہ شعبہ جات جن کا تعلق معیشت سے تھا۔

مدینہ منورہ کی قبل از ہجرت زندگی کے بارے میں مختصر اور سرسری سا اشارہ کیا گیا تھا کہ یہ جزیرہ نمائے عرب کے وسیع سلسلہ ریگستان میں واقع ایک چھوٹا سا نخلستان تھا۔ حجاز اور تہامہ جو مغربی عرب کے دو بڑے اہم صوبے ہیں۔ قریش کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ عموماً پہاڑی اور ریگستانی علاقے پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں میں جا بجا چھوٹے چھوٹے نخلستان پائے جاتے ہیں۔ ان میں نسبۃً ایک بڑا نخلستان وہ تھا جس کو مدینۃ النبی اور دار الہجرت ہونے کا لازوال شرف حاصل ہوا۔

یہ نخلستان ایک ایسے خطہ میں واقع ہے جہاں ایک طویل زمانے تک ایک بہت بڑے لاوے کی چٹانیں پھٹتی رہتی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت سے کچھ سال پہلے، غالباً دس یا بارہ سال پہلے بھی لاوے کی چٹانیں پھٹی تھیں اور ان چٹانوں کے پھٹنے کے اثرات آج چودہ سو چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی مدینہ منورہ جانے والوں کو نظر آتے ہیں۔ یہ لاوے کی چٹانیں وہ ہیں جن کو عربی میں 'لابہ' کہا جاتا ہے۔ لاوا شاید اسی لفظ سے نکلا ہوگا، مجھے صحیح معلوم نہیں ہے لیکن عربی زبان میں لاوے کی ان چٹانوں کو لابہ کہا جاتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے قرب و جوار کو حرم قرار دیا تھا، اسی طرح میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔ پھر آپؐ حرم مدینہ کی حدود مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ 'مابین لابتی المدینہ' ۔ یعنی میں مدینہ کے دونوں لابوں کے درمیان کی سرزمین کو مقدس اور محترم قرار دیتا ہوں۔

یہ لابہ کب پھٹا تھا یا کب سے پھٹنا شروع ہوا تھا۔ اس بارے میں بہت سے مورخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

علامہ سمہودی نے 'وفاء الوفاء' میں لاوے کے بارے میں خاصی معلومات دی ہیں۔ اس لاوے کے پھٹنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے قرب و جوار کی زرخیزی میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی سرزمین کے اندر سے معدنیات نکال کر مدینہ منورہ کی سرزمین پر ڈال دیں جس سے وہاں کی پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اور آج تک عرب کی سرزمین میں مدینہ کی زرخیزی ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

یہ علاقہ جس کے رقبہ اور وسعت کے بارے میں میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا۔ اس

کی لمبائی تقریباً بارہ سے چودہ میل تک اور چوڑائی آٹھ سے دس میل تک ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل تھا جن کی تعداد بیس بائیس بتائی جاتی ہے۔ ہر بستی میں چھوٹے چھوٹے قلعے یا گڑھیاں موجود تھیں جن کا تذکرہ مدینہ منورہ کے تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے کیا ہے۔ ان گڑھیوں یا آطام کی تعداد کا اندازہ 55، 56 سے لے کر 72 اور 75 تک لگایا گیا ہے۔ جس مورخ نے سب سے زیادہ تعداد بتائی ہے انہوں نے 78 آطام یعنی قلعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان قلعوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے آثار اب بھی مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ خاص طور سے کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مسجد نبوی سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر اب بھی موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان آطام کی نوعیت کیا تھی۔ یہ آطام جن کے اندر بستی کا سربراہ بھی رہتا تھا، قبیلہ کے اور ذمہ دار بھی رہتے تھے۔ ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا۔ بعض صورتوں میں اگر اُطم بڑا ہوتا تھا تو پورا قبیلہ اُسی میں رہتا تھا۔ اس کے باہر کی سرزمین جو اکثر وبیشتر باغات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی، وہ اس قبیلہ یا اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی تھی۔ اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا۔ ضرورت کی چیزیں محفوظ کرنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں جو اس رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں، بعد میں ان سب کا نام مدینۃ النبی قرار پایا۔ تاہم یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں ایک گاؤں یثرب بھی کہلاتا تھا۔ یثرب جغرافیائی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور آبادی کے لحاظ سے بڑا بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج مدینہ کہلائے جانے والے پورے علاقہ کو اُس دور کی عام بول چال میں یثرب کہا جاتا تھا۔

جزیرۂ عرب کے باشندوں کے بارے میں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں؛ دو طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک طبقہ وہ تھا جس کو قدیم عربی ادب اور شعر ونثر میں اہل المدر کہا گیا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے 'اینٹوں والے'۔ اس سے مراد وہ عرب لوگ ہیں جو settlled بستیوں میں آباد تھے اور پختہ مکانات میں رہتے تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ، طائف، مدینہ منورہ، خیبر، ۔ یہ لوگ اہل المدر کہلاتے تھے۔ ان کی بستیوں کے الگ الگ مشہور نام تھے، یہ گویا باقاعدہ شہر تھے اور وہاں آبادی کے لحاظ سے زندگی کی ضروریات بھی میسر تھیں۔

اس کے علاوہ آبادی کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کو اہل الوبر کہا جاتا تھا۔ اس کا لفظی

ترجمہ ہے اون والے۔ اون والوں سے مراد خیموں میں رہنے والے وہ خانہ بدوش لوگ ہیں جو اونٹ کے بالوں سے خیمے بناتے تھے۔ یہ وہ خیمے ہوتے تھے جو موسم کی شدت سے محفوظ رکھتے تھے۔ یا تو اونٹ کی کھال اور بالوں میں گرمی اور سردی کو جذب کرنے کی کوئی صلاحیت ہوتی ہوگی، یا کسی اور وجہ سے اونٹ کی کھال اور اون سے خیمے بنائے جاتے تھے۔ عمدہ اونٹ کی کھال سے عمدہ قسم کے خیمے بنائے جاتے تھے۔ خاص طور جب پر کسی بڑے معزز اور محترم انسان کے لئے خیمہ بنایا جاتا تھا اس کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے اُقیمت علیه قبقمن أدم، سرخ کھال کا ایک خوبصورت خیمہ اس کے لئے لگایا گیا۔ یہ بھی اونٹ کی کھال سے بنایا جاتا تھا۔ یہ لوگ اہل وبر کہلاتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یوں تو خانہ بدوش تھے لیکن ان کا علاقہ متعین تھا اور وہ اسی میں خانہ بدوشی کرتے تھے۔ جہاں پانی کے ذخائر موجود ہوتے تھے وہاں جا کر بس جایا کرتے تھے اور جب وہاں پانی کے ذخائر ختم ہو جاتے تھے تو کسی اور جگہ چلے جاتے تھے۔

کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی تھے جن کا علاقہ متعین نہیں تھا اور وہ پورے جزیرہ عرب میں پھرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض قبائل وقتاً فوقتاً شام اور عراق میں بھی جا کر آباد ہوئے۔ چنانچہ شام اور عراق میں آج تک عربی النسل آبادیاں اور قبیلے موجود ہیں اور ان کے اثرات بھی موجود ہیں۔ یہ سب اہل الوبر کہلاتے تھے۔

عرب کے پورے معاشرہ کی طرح مدینہ منورہ کا معاشرہ بھی قبائلی تھا۔ اگرچہ قبائلیت کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے معاشرہ میں شہری اور تمدنی مظاہر بھی پائے جاتے تھے۔ قبائل اس انداز سے مل جل کر رہتے تھے کہ ان کے آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں اور تعلقات، لین دین اور تجارتی روابط بھی ہوتے تھے۔ لیکن وہ الگ الگ قبیلوں کے طور پر بھی منظم اور منفرد طور پر معلوم اور متعین تھے۔ عربی زبان میں قبیلہ کے علاوہ ان گروہوں کے لئے بعض اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اردو میں ان کا کوئی الگ الگ ترجمہ نہیں ہے اس لئے اردو مترجمین ہر لفظ کا ترجمہ قبیلہ ہی کر دیتے ہیں، جس سے بعض اوقات یہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کہ قبیلہ اور قبیلہ کی ذیلی تقسیموں میں کیا فرق ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں قبیلہ بنی ہاشم بھی کہا جاتا ہے۔ قبیلہ قریش بھی کہا جاتا ہے۔ قبیلہ مضر بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سب قبیلے نہیں

کہلاتے تھے۔ قبیلہ سے مراد وہ بڑا گروپ تھا جو عموماً پانچ، دس یا پندرہ ہزار کی آبادی پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ کسی بڑے جدامجد کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کے نام سے مشہور ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے تک قریش ایک معلوم اور متعین قبیلہ کے طور پر معروف تھے۔ خاص طور پر عرب کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں قریش کا اپنا ایک الگ وجود، ایک الگ تشخص اور ایک الگ شناخت موجود تھی۔ یہ سب کے سب فہر بن مالک کی اولاد میں تھے اور فہر بن مالک ہی کا لقب قریش بتایا جاتا ہے۔ ان کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے یہ آپس میں مختلف ذیلی قبائل میں تقسیم ہونے کے باوجود باہر والوں کی حد تک ایک مشترک شناخت اور ایک نام رکھتے تھے۔

قبیلہ کے بعد اس کی دوسری تقسیم عشیرہ کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ عموماً ایک ہزار سے تین ہزار تک افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک بڑے قبیلہ کے مختلف خاندان جو کسی جدامجد کی اولاد میں ہوں۔ عشیرہ کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قریش کے وہ لوگ جو قصی کی اولاد میں تھے یا قصی کے بیٹوں کی اولاد میں تھے وہ الگ الگ عشیرہ کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ عشیرہ کے بعد ایک بطن ہوتا تھا جو بعض صورتوں میں ایک دادا یا ایک پردادا کی اولاد کو کہا جاتا تھا۔ بنی ہاشم ایک بطن تھا جو قریش کے بہت سے بطون میں سے ایک تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے جدامجد جناب ہاشم بن عبد مناف اپنی غیر معمولی شخصیت اور غیر معمولی احترام کی وجہ سے ایک بطن کے جدامجد قرار پائے۔ اگرچہ وہ بہت کم سنی میں انتقال کر گئے۔ غالباً 27، 28 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود انہوں نے اپنی شہرت اور نیک نامی جزیرہ عرب کے اندر اور باہر اس طرح قائم کر دی تھی کہ ان کے نام سے آج تک رسول اللہ ﷺ کا بطن یعنی قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ بنی ہاشم کے نام سے مشہور ہے۔ پھر بطن میں چھوٹے چھوٹے خاندان یا اسرے ہوتے تھے جو ایک باپ کی اولاد یا ایک دادا کی اولاد پر مشتمل ہوتے تھے۔ بنی ہاشم میں آپ نے سنا ہوگا کہ بنی عبدالمطلب، بنی المطلب اور یہ سارے کے سارے مختلف خاندان اور برادریاں تھیں جن میں آپس میں اسی طرح گرم و سرد تعلقات چلتے رہتے تھے جس طرح ہر انسانی معاشرہ میں چلتے ہیں۔ عرب کے قبائل میں ایک خاص بات تھی کہ ہر شخص میں قبیلہ سے وابستگی، اپنے بطن اور عشیرہ سے غیر معمولی محبت اور تعلق

اور غمی اور خوشی میں ان کا پوری طرح ساتھ دینا اور ہر مشکل مرحلہ میں ان کی پوری مدد کرنے کا غیر معمولی جوش و جذبہ! یہ ان میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔

یہ بات کہ دو بھائیوں میں باہمی منافست ہو یا ایک دادا کی اولاد میں دو خاندانوں میں آپس میں مسابقت ہو، یہ نہ کوئی انہونی بات ہے نہ بری بات ہے، نہ اس میں کوئی قباحت ہے۔ اس طرح کی بعض منافستیں خاندان بنی ہاشم میں بھی اور بطن بنی ہاشم میں اور دوسرے بطون اور عشیروں میں بھی پائی جاتی تھی اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے۔ بعض مغربی مصنفین نے اسلام کے بعد کی تاریخ کو ایک مفروضہ اور خود ساختہ منافست کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تاریخ کے بہت سے واقعات کی غلط اور بے بنیاد تاویلیں کر دی ہیں۔ اس لئے یہ بات پہلے دن سے واضح رہنی چاہئے کہ اگر کسی مرحلہ پر دو بھائیوں میں مسابقت رہی ہو یا دو خاندانوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ رہا ہو تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر اچھائی کے کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ہو، کسی نیک کام میں مسابقت ہو تو یہ قرآن پاک کی نظر میں بھی ایک پسندیدہ چیز ہے اور قرآن پاک کی نظر میں مطلوب ہے۔ **و فی ذالک فلیتنافس المتنافسون**، ایسے ہی نیک کاموں میں مقابلہ کرنے والوں کو ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

مدینہ منورہ کی آبادیوں میں بھی اسی طرح کے عشائر، قبائل، خاندان اور بطون موجود تھے۔ جن کو ہم اوس اور خزرج کہتے ہیں اس کی نوعیت وہی تھی جو مکہ مکرمہ کے حوالہ سے قریش کی تھی۔ اوس چند بہت بڑے قبائل کا مجموعہ تھا جن کے نام تذکرہ نویسوں نے محفوظ رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام میثاق مدینہ میں بھی آئے ہیں۔ اوس کے بہت سے قبائل (یعنی عشائر اور بطون) پہلے دن سے ہی میثاق مدینہ میں شامل تھے۔ کچھ قبائل اور بطون جن کی تعداد غالباً چار تھی، پہلے مرحلہ میں میثاق مدینہ میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ کئی سال کے بعد جا کر میثاق مدینہ میں شریک ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس کو اوس کہتے ہیں وہ چند بڑے قبائل کا مجموعہ تھا جن میں عشائر بھی تھے، بطون بھی تھے اور خاندان بھی تھے۔ سیرت کی کتابوں میں سب کے نام ملتے ہیں اور یہ سمجھنے اور جاننے میں بہت وقت لگانا پڑتا ہے کہ کس خاندان کا تعلق کس بطن سے ہے، کس بطن کا تعلق کس عشیرہ سے اور کس عشیرہ کا تعلق کس قبیلہ سے تھا۔

علامہ نور الدین سمہودی نے وفاء الوفاء میں بہت قیمتی معلومات ان سب باتوں کے بارے میں دی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مدینہ میں کون کون سی آبادیاں قیام پذیر تھیں۔ بستیوں کے نام کیا تھے۔ کھیتیوں اور باغات کے حدود کیا تھے۔ ان کے باغات میں کیا چیز کاشت ہوتی تھی۔ کھجوریں کس قسم اور کس سطح کی تھیں۔ کون شخص اپنی کھجوروں کو کس بازار میں فروخت کرتا تھا۔ اس طرح کی بہت سی اہم اور دلچسپ معلومات انہوں نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہجرت کے وقت مدینہ منورہ میں جو 70 یا 78 یا 72 آطام تھے ان میں سے جن جن کی تفصیلات علامہ سمہودی کو مل سکیں انہوں نے بیان کر دیں۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو ہر بستی میں، ہر قبیلے اور ہر عشیرے میں اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل میں کوئی بطن ایسا نہیں تھا جس میں کافی تعداد میں خاندان اور افراد مسلمان نہ ہو گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو مسجدیں قائم ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے کا فاصلہ بارہ پندرہ میل ہو اور چوڑائی آٹھ دس میل ہو تو وہاں کے سب رہنے والوں کے لئے مسجد نبوی میں پانچ وقت حاضری ممکن نہیں تھی۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ کا آخری وقت تھا اور طبعیت مبارک چند لمحوں کے لئے بہتر ہو گئی اور آپؐ نے پردہ اٹھا کر مسجد نبوی میں بھی دیکھا اور صحابہ خوش ہوئے تو عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب صحت مبارک اچھی ہو رہی ہے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق نے حضور سے گھر جانے کی اجازت مانگی کیونکہ وہ کئی دن سے گھر نہیں گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ہجرت کے بعد ایک انصاری خاتون خارجہ بنت زید سے شادی کی تھی۔ ان کا مکان مسجد نبوی سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ قبا کے قریب عوالی نام کی ایک بستی تھی جس میں ایک چھوٹا سا گاؤں سنح تھا جہاں وہ رہتے تھے اور جہاں جانے کی آپ نے اجازت مانگی۔ یہ جگہ مسجد نبوی سے ساڑھے تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اسی طرح سے مختلف صحابہ کرام مختلف جگہوں پر قیام پذیر تھے اور ہر جگہ ایک نہ ایک مسجد موجود تھی۔ ان نو مسجدوں کی تعداد میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آٹھ سالہ مدنی زندگی میں غزوہ بدر کے بعد سے لے کر دنیا سے تشریف لے جانے تک اضافہ ہوتا رہا اور جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے

تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں چالیس مساجد قائم ہو چکی تھیں، جن کا تذکرہ مورخین اور سیرت نگاروں نے کیا ہے۔

مدینہ منورہ کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ مکہ مکرمہ سے کئی سو مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جو صحابہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے ان کی تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا تو بڑا دشوار ہے لیکن ان کی تعداد کم از کم چھ سات سو کے لگ بھگ ضرور تھی۔ مدینہ کی آبادی میں تیزی سے ہونے والے اس اضافہ کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ آس پاس قبائل میں جو لوگ اکا دکا مسلمان ہوتے تھے، ان کے بارے میں ہدایت تھی کہ وہ مدینہ منورہ ہجرت کر کے آجائیں۔ فتح مکہ سے پہلے تک ہجرت لازمی تھی اور ہر نئے مسلمان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائے۔ اس دور کی اکثر آیات میں **الذین امنوا وھاجروا، الذین آمنوا وجاھدوا وھاجروا، ھاجروا وجاھدوا**، یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد تینوں کا تذکرہ ایک ساتھ ملتا ہے۔ جہاد میں تو ہر مسلمان حصہ لیتا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں جہاد جیسی فضیلت حاصل کرنے کا موقع ہو اور کوئی مسلمان پیچھے رہے۔ لیکن ہجرت میں کچھ حضرات ایسے تھے جن کو شرکت کا موقع نہیں مل سکا۔ یا تو ان کو معاملات اور مسائل ایسے درپیش تھے کہ وہ ہجرت نہیں کر سکتے تھے یا کسی اور وجہ سے ان کو ہجرت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جن جن کو موقع ملتا گیا وہ ہجرت کرتے گئے۔ اور مدینہ آتے گئے یوں مدینہ منورہ کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔

علامہ سمہودی نے مدینہ منورہ کے جغرافیہ سے بھی بحث کی ہے اور کون سا خاندان یا عشیرہ کس علاقہ میں رہتا تھا اس علاقہ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان علاقوں کو خطہ کہا جاتا تھا۔ خطہ کی جمع خطط ہے۔ ہر عشیرہ کے خطط جہاں جہاں واقع تھے اس کی بھی نشاندہی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ بعض عشائر مختلف اسباب کی بنا پر اپنے خطے تبدیل کرتے رہتے تھے۔ کسی ایک خطہ کے باشندے کی زمین ایک جگہ ہے۔ اس نے اس زمین کو فروخت کر کے دوسری جگہ زیادہ بہتر زمین خرید لی۔ تو وہ پورا عشیرہ وہاں منتقل ہو گیا۔ ایک اطم کسی وجہ سے خالی ہو گیا اور کسی دوسرے قبیلہ نے خرید لیا تو اس قبیلہ کا ایک بطن یا عشیرہ وہاں منتقل ہو گیا۔ ان اسباب کی وجہ سے عشیروں

کے خطط تبدیل ہوتے رہتے تھے اور رقبے آپس میں تبدیل کرنے کی روایت بھی مدینہ منورہ میں موجود تھی۔

عشائر کے بارے میں بہت سے لوگوں نے معلومات جمع کی ہیں۔ ان میں ابن سعد کا نام بڑا نمایاں ہے۔ ابن سعد نے عشائر کے بارے میں جو معلومات جمع کی ہیں وہ دوسرے سیرت نگاروں کی بہ نسبت زیادہ مستند قرار دی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ابن سعد اور ان کے استاد واقدی نے حضرت عمر فاروق کے زمانہ کے مرتب کردہ دیوان کی دستاویزات کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ دیوان میں لوگوں کی تنخواہیں قبائل اور عشائر کی بنیاد پر مقرر ہوئی تھیں۔ پہلے قبیلہ یا عشیرہ بنی ہاشم، پھر ایک ایک کر کے بقیہ خاندان اور قبائل۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قربت اور رشتہ داری کی ترتیب کے لحاظ سے ان کے نام لکھے گئے۔ اس لئے وہ نام انتہائی مستند ترین تھے اور اس میں عشائر اور قبائل کے بارے میں جو معلومات دی گئی تھیں وہ بہت صحت کے ساتھ مرتب کی گئی تھیں۔ چونکہ یہ معلومات ابن سعد اور واقدی کو حاصل تھیں اس لئے انہوں نے جو معلومات دی ہیں وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مستند مانی جاتی ہیں۔

ابن سعد نے اس موضوع پر بھی تفصیل سے معلومات جمع کی ہیں کہ جو عشائر بعد میں ختم ہو گئے وہ کون کون سے تھے اور ان کے ختم ہونے کے اسباب کیا تھے۔ اگرچہ یہ تفصیل براہ راست ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے، تاہم ایک حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ معلومات کارآمد ہیں۔ مدینہ منورہ کے بہت سے عشائر خاص طور پر انصاری عشائر مدینہ منورہ چھوڑ کر چلے گئے اور ان کی آبادیاں مدینہ منورہ میں تقریباً ختم ہو گئیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک حدیث میں اشارہ فرمایا تھا۔ اس کو پیشن گوئی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ نے اپنے آخری ایام میں مہاجرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں انصار کے بارے میں تمہیں نیک سلوک اور احسان کی وصیت کرتا ہوں۔ لوگوں کی آبادیاں بڑھتی جائیں گی، انصار کی آبادی کم ہوتی جائے گی، اس لئے انصار کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا اور میرے ساتھ انہوں نے جو نیکی کی ہے اس کا پورا پورا اجر دینے کی کوشش کرنا۔ غالباً اس پیشین گوئی کی وجہ سے، بلکہ یقیناً اس پیشین گوئی کی وجہ سے انصار کے بہت سے عشائر ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ یا تو ان میں سے بہت سے لوگ نوجوانی میں جہاد

کے لئے گئے اور شہید ہو گئے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو جہاد میں شریک ہونے کے لئے کسی دور کے علاقہ میں گئے اور وہاں بس گئے۔ کچھ لوگوں کی اولاد مدینہ منورہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس طرح ایک ایک کر کے ان کے بہت سے عشائر ختم ہو گئے۔ ان کا تذکرہ اب صرف تاریخ میں ملتا ہے۔ مدینہ منورہ میں دوسروں کی آبادیاں بدستور بڑھتی گئیں۔ اس میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ کوئی بھی مرحلہ ایسا نہیں آیا کہ مدینہ منورہ ایک بہت آباد اور زندگی سے بھرپور شہر نہ رہا ہو اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا اس کی طرف رجوع نہ رہا ہو۔

مدینہ منورہ کی حدود ایک طرف جبل احد سے جبل عیر تک تھیں۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان بارہ سے چودہ میل تک کا فاصلہ ہے۔ موجودہ مدینہ منورہ کا جو ائر پورٹ ہے اس سے نکلتے ہی جبل عیر آ جاتا ہے۔ جبل عیر سے اگر سیدھے چلتے جائیں تو تیرہ چودہ میل کے فاصلہ پر جبل احد آتا ہے۔ یہ لمبائی میں مدینہ منورہ کے حدود ہیں۔ چوڑائی میں حدود دونوں لابوں کے درمیان ہے جس فاصلہ کہیں آٹھ میل، کہیں دس میل کے لگ بھگ ہے۔ اس کے درمیان کا علاقہ مدینہ منورہ کہلاتا تھا۔ یہ رحلۃ الصیف کے راستے پر تھا۔ مدینہ منورہ مکہ مکرمہ سے ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اور قریش کے جو تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے وہ جس راستہ سے جایا کرتے تھے وہ راستہ مدینہ منورہ کے قریب سے گزرتا تھا۔ مدینہ منورہ بحر قلزم سے 70 میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ اُس زمانے میں بھی کوئی ایسا فاصلہ نہیں تھا کہ جس میں گزرنے والے قافلوں اور کاروانوں پر نظر نہ رکھی جا سکے۔

مدینہ منورہ میں یہ جو چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں ان کی تعداد بیس بائیس کے قریب تھی۔ آطام کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ 78 کے قریب آطام کا ذکر سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ ایک بات بڑی قابل ذکر ہے کہ یہ 78 کے 78 اطام ہجرت سے پہلے کے بنے ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی نیا قلعہ یا اطم نہیں بنا۔ اس کا سب سے بڑا سبب تو غالباً وہ امن وامان اور سکون واطمینان ہے جو مدینہ منورہ کے لوگوں کو اسلام کے آ جانے سے حاصل ہوا۔ اطم بنانے کا بڑا مقصد دفاع اور حفاظت بھی ہوتا تھا۔ مدینہ منورہ جب اسلام کا مرکز بن گیا اور دارالہجرت قرار پایا تو وہاں امن وسکون کی ایسی فضا قائم ہوئی اور آج تک قائم ہے کہ کسی شخص کو اپنے جان ومال کی حفاظت کے لئے قلعے بنانے کی ضرورت نہیں پڑی، اس لئے مدینہ منورہ

کے آطام میں اسلام کے آنے کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے، بلکہ انتیس سال پہلے جامعۃ الملک سعود کے ایک رسالہ میں مدینہ منورہ کے آطام کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جو بڑی تحقیق سے لکھا گیا تھا۔ غالباً ادارہ تحقیقات اسلامی کے کتب خانہ میں وہ رسالہ موجود ہے جس میں وہ ساری تفصیل ہے اور بعض اطام کی تصویریں بھی دی گئی تھیں۔ اس وقت جو آطام موجود ہیں ان کے بارے میں بھی معلومات موجود تھیں۔

یہ وہ محل وقوع تھا جس میں انصار کے بہت سے قبائل آباد تھے۔ یہودیوں کے بھی بہت سے قبائل آباد تھے۔ یہودیوں کے عموماً تین قبائل سے تو ہم سب واقف ہیں۔ بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل موجود تھے۔ بعض عرب قبائل میں بھی یہودی موجود تھے۔ اوس وخزرج کے بعض خاندانوں میں یہ دستور اور روایت کافی عرصہ سے چلی آرہی تھی کہ جب کوئی شخص منت مانتا تھا یا کسی ماں کا کوئی بچہ بیمار ہوتا تھا تو وہ یہ منت مان لیا کرتی تھی کہ اگر بچہ صحت مند ہو گیا تو میں اس کو یہودیوں کے مدراس میں بھیج دوں گی۔ یوں مائیں اپنے بچوں کو صحت یاب ہونے کے بعد یہودیوں کے مدراس میں بھیج دیا کرتی تھیں جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور بہت سی صورتوں میں یہودی بھی ہو جایا کرتے تھے۔ چونکہ یہودیوں کے علم اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے یہودیوں کے لئے مدینہ منورہ میں خاصا احترام پایا جاتا تھا۔ اس لئے ماں باپ اس کو خاص برا نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے بچے یہودیت اختیار کرلیں۔ اس طرح ہوتے ہوتے بہت سے خاندانوں میں یہودیوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

لیکن یہودیوں کے اتنے گہرے اثر اور ان کے ہمیشہ سے توحید کا قائل رہنے کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ یہودیوں میں کبھی اس انداز کا شرک پیدا نہیں ہوا کہ بت پرستی یا اس کے مظاہر ان میں جنم لیتے، اس کے باوجود مدینہ منورہ کی آبادیوں میں بت پرستی کم نہیں ہوئی۔ ہر قبیلہ کا بت اسی طرح تھا جس طرح باقی عرب میں تھا۔ ہر بڑے خاندان نے اپنے گھر میں ایک بڑا بت رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیویاں تھیں جن کے مجسمے گھروں میں رکھے جاتے تھے۔ حضرت عمرو بن الجموح جو بڑے مشہور صحابی تھے۔ ان کے بت اور دیوتا کا قصہ ابن ہشام سمیت تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان جو مسلمان ہو گئے تھے، وہ روزانہ

ان کے بت کو، جس کو وہ بہت صاف ستھرا رکھتے تھے، گندا کر دیتے تھے۔ جب وہ آ کر دیکھتے تھے تو غصہ ہوا کرتے تھے اور دھو دھلا کر صاف کرتے اور خوشبو لگا دیتے۔ وہ نوجوان پھر آ کر اس کو گندا کر دیتے تھے۔ یہ پھر اس کو صاف کر دیتے تھے اور پوچھتے تھے یہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ جب چار پانچ مرتبہ ایسا ہوا تو انہوں نے اپنی تلوار اس بت کے قریب رکھ کر کہا کہ تجھ میں اگر اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت ہے تو لے یہ تلوار! اور اب اپنا دفاع خود کر۔ اس رات کو وہ نوجوان صحابی پھر آئے اور بت کو اٹھا کر مدینہ سے باہر کسی گندگی میں پھینک آئے۔ جب اگلی صبح حضرت عمرو بن الجموح اپنا بت تلاش کرنے نکلے تو اللہ نے ان کا دل کھول دیا اور جو بات پہلے ان کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی اب آ گئی کہ یہ بت اپنا دفاع نہیں کرسکتا تو ہمارا دفاع کیسے کرے گا۔ وہ سیدھے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے بھیجے گئے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر کے پاس گئے اور اسلام قبول کرلیا۔

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ منات، جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے، قبائل مدینہ منورہ کی دیوی تھی۔ اسی کے بت مدینہ منورہ کے مختلف خاندانوں اور گھروں میں پائے جاتے تھے۔ لیکن بت پرستی کے ساتھ جس طرح مکہ مکرمہ میں حنفاء تھے، توحید پر عقیدہ رکھنے والے، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وابستگی کا دعویٰ کرنے والے، شرک سے بےزار اور حق پر کاربند رہنے کے خواہاں، ایسے حنفاء مدینہ منورہ میں بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں کئی لوگ ایسے تھے جو حنفاء کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں ایک بڑا نام تو انہی سوید بن صامت کا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مکہ مکرمہ میں ملے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کے جواب میں حکمت لقمان کا ایک صحیفہ پڑھ کر سنایا۔ وہ بھی حنفاء میں سے تھے۔ جو حضرات بیعت عقبہ میں شریک تھے، ان میں سے دو حضرات ایسے تھے جو پہلے سے بت پرستی سے تائب تھے اور حنیف کہلاتے تھے۔ اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم بن تیہان۔ یہ دونوں حضرات بیعت عقبہ میں بھی شامل تھے اور مدینہ منورہ میں پہلے سے ہی بت پرستی سے اجتناب کی شہرت رکھتے تھے۔ یہ دونوں حضرات اسلام لائے اور مسلمانوں میں صف اول کی شخصیات قرار پائے۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سب سے پہلا کام جس کا آپؐ نے اہتمام فرمایا وہ مسجد نبوی کی تعمیر کا تھا۔ مواخاۃ کے ذریعے

مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے سے وابستہ قرار دیا اور منشور مدینہ یا دستور مدینہ مرتب فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مدینہ منورہ کے مقامی نظم نسق پر بھی توجہ دی۔ ٹاؤن پلاننگ کے بارے میں بعض ہدایات دیں۔ مدینہ منورہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تعمیرات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ مکرمہ سے آنے والے بہت سے حضرات نے وہاں زمینیں خریدیں اور اپنے مکانات بنائے۔ چھوٹے مکان بھی بنائے گئے، بڑے مکان بھی بنائے گئے اور بعض صورتوں میں یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ مکانات کے نقشے اس طرح سے بنائے جائیں کہ مدینہ منورہ کی آبادی کے لئے کسی مشکل کا ذریعہ نہ ہوں۔ چنانچہ گلیاں کیسے بنائی جائیں اور مکانوں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ہدایات جاری فرمائیں۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ گلی میں کم از کم سات ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہئے۔ گلی میں ایک طرف کے مکان اور دوسری طرف کے مکان کے درمیان فاصلہ کو ہاتھ کی لمبائی سے ناپا جاتا تھا۔ اگر ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ لمبا ہوتا ہے تو سات ہاتھ سے مراد یہ ہے کہ ساڑھے دس فٹ کے قریب چوڑی گلیاں ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے اس زمانے میں گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ تانگے بھی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے۔ اس لئے اتنے فاصلہ میں دو سواریوں کا آسانی سے گزرنا ممکن ہے۔ اگر اس سے کوئی سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ گلیوں اور سڑکوں میں اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ آمنے سامنے سے آنی والی دو گاڑیاں بیک وقت گزر سکیں۔

مہاجرین کی آمد کا سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا۔ ان کی آباد کاری بھی ہوتی رہی۔ اس مقصد کے لئے مکانات بنانے کی ضرورت بھی پیش آتی رہی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے بڑی بڑی اور عالیشان عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ بعض صحابہ جو بڑے اصحاب ثروت میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ذرا بڑے مکان بنانے کی خواہش ظاہر کی تو حضور علیہ السلام نے اس کو ناپسند فرمایا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، جو رشتہ میں حضور کے ماموں بھی ہوتے تھے، مکہ مکرمہ کے مالدار لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا مکان بنانا چاہا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو ناپسند فرمایا۔ جب ان کو حضور کی ناپسندیدگی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مکان کا وہ حصہ گرا دیا جس کو دیکھ کر حضور نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس

لئے تھا کہ شہر میں آبادی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ بہت سے لوگ جو شہر میں آکر بس گئے تھے ضروری مالی وسائل نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پاس اتنے امکانات نہیں تھے کہ بڑے بڑے مکانات تعمیر کرسکیں۔ اس لئے ان حالات میں اگر بڑی بڑی عمارتیں بنانے کی اجازت دیدی جاتی تو ایک ایسی روِیا ایسی مسابقت کے پیدا ہونے کا امکان تھا کہ دولت مند اور اہل ثروت لوگ بڑے بڑے مکانات بنانے لگیں اور مدینہ منورہ میں جگہ کی قلت ہو جائے اور یوں اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کے لئے مکانات کی تعمیر مشکل ہو جائے۔ کشادہ اور آرام دہ مکان کی آپؐ نے تعریف فرمائی اور ایک حدیث میں ایک مکان کی ضروریات کی نشاندہی بھی فرمائی کہ ایک مکان میں آدمی کے اپنے رہنے کے لئے کمرہ ہونا چاہئے۔ اس کے بچوں کے لئے کمرہ، مہمانوں کے لئے کمرہ، ملازموں اور خادم کے لئے کمرہ، اس کے علاوہ اگر غیر ضروری کمرے بنائے جائیں تو اس کو پسند نہیں فرمایا گیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جو ناگزیر ضروریات ہیں ان کا بندوبست مکان میں ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ غیر ضروری طور پر بڑے بڑے مکان بنانا اور شان وشوکت کا اظہار کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔

مدینہ منورہ کے قبائل میں اسلام سے پہلے سے دوستی کے بعض تعلقات چلے آرہے تھے۔ بعض تعلقات دشمنی کے چلے آرہے تھے۔ بعض اچھے طور طریقے تھے۔ بعض ناپسندیدہ طور طریقے تھے۔ جو طور طریقے ناپسندیدہ تھے، ان کو رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کرکے ختم کردیا۔ اگر کبھی کوئی ایسا موقع آیا کہ قبل اسلام کے زمانہ کی کسی عصبیت نے سر اٹھایا تو آپ نے فوراً اس رویہ کو ختم کردیا اور صحابہ کرام کو تنبیہ فرمائی۔ منافقین ہر وقت اس طرح کے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی ایسا موقع ملے کہ وہ پرانی عصبیت کو کھڑا کرکے مسلمانوں کے اس اتحاد کو کمزور کردیں۔

غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ واپس تشریف لارہے تھے۔ اس وقت ایسا ہی ایک تکلیف دہ واقعہ پیش آیا۔ یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ ایک جگہ قافلہ نے پڑاؤ کیا۔ لوگ کنویں سے پانی بھر رہے تھے۔ رش بہت تھا۔ لوگ پانی کے لئے قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروق کے ملازم جہجاہ بن عمرو کے پیچھے ایک انصاری بزرگ کھڑے تھے۔ یہ ایک قابل احترام بزرگ تھے۔ جب قطار میں جہجاہ بن عمرو الغفاری کی

باری آئی تو ان انصاری صحابی نے یا تو خیال نہیں کیا یا کوئی وجہ ہوئی، لیکن وہ آگے بڑھے اور ڈول کی رسی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حضرت عمر فاروق کا ملازم بھی حضرت عمر فاروق کا ملازم تھا۔ اس نے کہنی سے ان انصاری صحابی کو پیچھے کیا اور کہا کہ باری میری ہے اور رسی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ بزرگ انصاری صحابی شاید اس کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے جب جہجاہ نے ان کو اچانک کہنی سے ہٹایا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ اس پر کچھ انصاری نوجوانوں نے خفگی کا اظہار کیا کہ ہمارے سردار کے ساتھ ایسا سلوک ہوا ہے۔ اس موقع پر کہیں قریب ہی عبداللہ بن ابیؑ رئیس المنافقین بھی کھڑا تھا۔ اس نے کہا 'اور کھلاؤ ان کو، میں نہیں کہتا تھا کہ تمہارا کھائیں گے اور تمہیں پر غرائیں گے۔ اسی طرح کی کوئی بات اس نے کہی۔ اس بات پر کچھ لوگ انصاری صحابی کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور کچھ مہاجرین حضرت عمر فاروق کے ملازم کی حمایت میں کھڑے ہو گئے کہ ہمارے آدمی کو کمزور دیکھ کر اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ اس طرح کے مواقع پر ایسا ہو جانا فطری سی بات ہے۔ ایسا ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ گرمی بھی تھی، پیاس بھی تھی اور سفر کی تھکان بھی تھی۔ ایسے موقع پر انسان کو جلدی غصہ آ جاتا ہے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ عبداللہ بن ابیؑ نے اس منظر کو دیکھا اور خوش ہوا کہ اب فساد پھیلانے کا ایک نیا موقع ہاتھ آیا ہے۔ وہ انصاری حضرات سے مخاطب ہو کر بولا کہ یہ موقع نہیں ہے۔ جب مدینہ جائیں گے تو ان سے بدلہ لیں گے اور ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ ایک ننھے منے صحابی تھے جو یہ بات سن رہے تھے۔ غالباً زید بن ارقمؓ ان کا نام تھا۔ انہوں نے یہ بات رسول اللہ کو جا کر بتائی۔ حضور نے بعض انصاری صحابہ کو بلا کر فرمایا کہ ایسی بات کیوں ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سی بات تھی، وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ آپ بچے کی بات پر نہ جائیں۔ انصاری صحابہ میں سے بعض نے کہا کہ عبداللہ بن ابیؑ اسلام سے پہلے بڑا سردار تھا اور اس کو بادشاہ بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ تو اگر اس کی زبان سے ایسی کوئی بات نکل گئی ہو تو آپ محسوس نہ فرمائیں، یہ معاملہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے عبداللہ بن ابیؑ کو بتایا کہ تمہاری یہ بات حضور ﷺ تک پہنچ گئی ہے۔ وہ بہت غصہ کے عالم میں حضور ﷺ کی محفل میں پہنچا اور حضور سے کہنے لگا کہ آپ کو میرا کوئی لحاظ نہیں اور بچوں کے کہنے میں آ کر میرے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے تیزی اور سخت

کلامی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ حضورﷺ سن کر خاموش رہے۔ صرف اتنا فرمایا کہ کوئی بات نہیں۔

تھوڑی دیر میں حضور نے محسوس فرمایا کہ اس واقعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں ایک شدید اختلاف کا خدشہ پیدا ہوگیا ہے اس لئے لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے فوراً روانہ ہوجانا چاہئے اور یہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ آپ نے جلدی روانگی اور کوچ کا اعلان کردیا۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ لوگ سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوجائیں گے اور اختلاف اور جھگڑے سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ صحابہ روانہ ہوگئے۔ عام طور سے یہ وقت حضور علیہ السلام کے کوچ کرنے کا نہیں تھا۔ کئی صحابہ نے پوچھا بھی کہ عام طور پر تو آپؐ اس وقت کوچ کا حکم نہیں دیتے؟۔ لیکن آپ نے حکم دیا کہ روانہ ہوجائیں۔ کافی لمبے اور معمول سے نسبتۃً زیادہ طویل سفر کے بعد جب اگلی منزل پر رکے تو سب لوگ تھکان سے اتنے چور تھے کہ سب جلدی سو گئے اور اس واقعہ کو بھول گئے۔ جن کم سن صحابی نے حضورﷺ سے یہ بات کی تھی ان کو اس پورے واقعہ کا بہت دکھ ہوا اور اس بات سے خاص طور پر شدید تکلیف ہوئی کہ کہیں میری بات کو حضورﷺ نے جھوٹا نہ سمجھا ہو اور میرے بارے میں یہ خیال نہ فرمایا ہو کہ میں نے غلط بیانی کی ہے۔ ابھی اس اگلی منزل سے کوچ نہیں ہوا تھا کہ سورۃ منافقین نازل ہوئی۔ اس سورت میں یہ سارا واقعہ بیان کردیا گیا۔ وہی بات کہ منافقین یہ کہتے ہیں کہ ہم میں عزت والا ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ رسول اللہﷺ نے ان انصاری نوجوان کو بلایا۔ ان کا کان پکڑ کر ایسے فرمایا کہ بچے کے کان نے صحیح سنا تھا۔ بچے کے کان نے صحیح سنا تھا۔ بچے کے کان نے صحیح سنا تھا۔ اس کے بعد وہ صحابی جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تھے تو اپنا کان یا کسی بچے کا کان پکڑ کر کہتے کہ حضور نے کہا تھا کہ بچے کے کان نے صحیح سنا تھا۔

یہ محض ایک کوشش کی مثال ہے۔ منافقین کی طرف سے اس طرح اختلاف اور جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش ہمیشہ رہتی تھی۔ مدینہ منورہ میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ اس طرح کی کوئی بات، کوئی سازش، کوئی کاوش منافقین اور دشمنان اسلام کی طرف سے نہ ہوتی ہو۔ اس کے برعکس جو معاملات دو قبیلوں کے درمیان دوستی اور تعلق سے متعلق تھے۔ یا کوئی برادری یا حلف کا معاملہ تھا یعنی دو قبیلوں کے درمیان اتحاد کا معاملہ تھا اس کو رسول اللہﷺ نے مزید پختہ

کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام سے پہلے جتنے بھی حلف یا ولاء ہیں، 'لم یزده الاسلام الا شدة'، اسلام نے اس کو مزید پختہ بنا یا دہے۔ اس کی مضبوطی اور پختگی میں اسلام کی وجہ سے اضافہ ہی ہوگا، کمی نہیں ہوگی۔

مدینہ منورہ کی خاص ان عرب آبادیوں کے ساتھ ساتھ یہودی بھی رہتے تھے۔ یہودیوں کے تین قبائل تو مشہور تھے۔ ان داخلی تین بڑے قبائل اور چند اور دس بارہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں اور قبیلوں کے علاوہ مدینہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر، غالباً پونے دوسو، دوسو اور ڈھائی سو میل کے فاصلے پر خیبر، فدک اور وادی القریٰ کی آبادیاں تھیں جہاں یہودی آباد تھے۔ خیبر مدینہ کے شمال میں 250 میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ آج بھی انتہائی سرسبز آبادی ہے۔ پانی وافر ہے۔ چشمے کثرت سے ہیں۔ اب بھی ہیں، لیکن پہلے بہت تھے۔ دریائی نالے کثرت سے گزرتے ہیں۔ پورے حجاز میں اُس وقت اس سے زیادہ سرسبز کوئی اور مقام نہیں تھا۔ حجاز میں جتنی زرعی پیداوار ہوتی تھی اس کا مرکز یہی تین علاقے تھے۔ پورے حجاز میں وہاں سے خوراک کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ خیبر اور اس کے مضافات میں سات بڑے بڑے قلعے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قلعے اس کے علاوہ تھے۔ ایک فرق کے ساتھ کہ مدینہ منورہ کے آطام اور خیبر کے حصون میں خاصا فرق تھا۔ خیبر کے حصون یا حصن باقاعدہ بڑے بڑے قلعے تھے۔ فدک خیبر سے شمال مشرق میں دودن کی مسافت پر یعنی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی ایک بہت بڑا قلعہ تھا۔

جب جنگ خیبر ہوئی تو اہل فدک نے خیبر کے یہودیوں کی مدد کے لئے آنا چاہا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے ایک دستہ بھیج کر اس راستہ کو بند کر دیا تھا۔ خیبر کا محاصرہ کرنے والے مسلمانوں کی تعداد 18 سو تھی۔ ایک چھوٹا دستہ جس کی تعداد سو سے ڈیڑھ سو کے درمیان تھی، وہ فدک اور خیبر کے راستے میں مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر فدک سے کوئی فوج خیبر کی مدد کے لئے آنا چاہے تو اس کو روکا جائے۔ خیبر جنگ کے نتیجے میں فتح ہوا۔ اس کی تفصیلات سے ہم سب واقف ہیں۔ فدک کے لوگوں نے مصالحت کر لی۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ ہماری پیداوار کا آدھا حصہ مدینہ منورہ کی حکومت کو ادا کیا جائے گا۔ یہ زمین سرکاری ملکیت قرار پائے گی۔ یہاں کے یہودی بطور مزدور یا مزارع کے کام کریں گے۔ آدھا حصہ کاشت

کاروں کو دیا جائے گا اور آدھا حصہ سرکاری خزانے میں بھیجا جائے گا۔

ان شرائط پر جس کے لئے مخابرہ، مناصفہ، مزارعہ بہت سی اصطلاحات محدثین نے استعمال کی ہیں۔ فدک کی اراضی کا بندوبست ہوا۔ یہی انتظام خیبر کے بعض علاقوں کے لئے بھی کیا گیا۔ یہی انتظام ام القری کے بعض علاقوں کے لئے بھی کیا گیا۔ جب ایک سال کے بعد فدک میں پیداوار کا وقت آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے مشہور انصاری صحابی نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا۔ یہودیوں نے حسب عادت اور حسب روایت ان کو رشوت دینے کی کوشش کی اور ان کو ورغلانا چاہا کہ پیداوار کا اندازہ کم قرار دیں اور جو فرق ہے اس میں سے آدھا حصہ یہودی لے لیں اور آدھا عبداللہ بن رواحہ لے لیں۔ جلد ہی ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ ان کو اس طرح ورغلانا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے تمام پیداوار کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا۔ درختوں کی مختلف قسمیں مقرر کیں۔ اچھی پیداوار کے درخت الگ، درمیانی پیداوار کے درخت الگ، ردی پیدوار کے الگ، کچی پیداوار کے الگ، پکی اور پختہ پیداوار کے الگ، غرض اس طرح الگ الگ قسمیں مقرر کیں۔ تمام پیداواری چیزیں جو تیار تھیں ان کو برابر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اچھی کھجوریں برابر کچھ ایک حصے میں کچھ دوسرے حصہ میں۔ ردی اور کچی کھجوروں کا آدھا حصہ ایک طرف آدھا دوسری طرف۔ تول تول کر کئی دنوں میں پیداوار کے دو حصے تیار کئے۔ پھر یہودیوں سے کہا کہ پیداوار کا آدھا آدھا حصہ الگ الگ ہو گیا ہے۔ اب تم اس میں سے منتخب کر لو کہ تم کون سا حصہ لینا چاہتے ہو۔ حصے میں نے کر دیئے انتخاب تم کرو گے کہ کون سا حصہ تمہیں لینا ہے اور کون سا حکومت کو دینا ہے۔ یہودیوں نے یہ صورت حال دیکھ کر کہا' بھذا قامت السموات و الارض' اسی عدل و انصاف کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ اس سے بڑھ کر عدل و انصاف ہم نے نہیں دیکھا۔ یہ الفاظ ان کے قائدین نے کہے۔

یہ جو بندوبست یہودیوں کی اس پیداوار کے ساتھ ہوا تھا وہی فدک کے ساتھ چلتا رہا۔ وادی القریٰ جو ایک سرسبز وادی تھی۔ وہاں باغ بھی تھے، کھیت بھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ خیبر کے لوگوں نے چونکہ مقابلہ کیا تھا اور وہ مفتوحہ علاقہ تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور وہ زمینیں مفتوحہ قرار دے کر سپاہیوں

اور صحابہ میں تقسیم کر دیں۔

اس تقسیم کے نتیجہ میں ایک زمین حضرت عمر فاروق کے حصہ میں آئی۔ حضرت عمر فاروق نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اس زمین کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب مہاجرین اور سب سپاہیوں کو اس زمین میں سے حصہ ملا ہے تم بھی لے لو۔ حضور کے ارشاد پر انہوں نے وہ زمین لے لی۔ اگلے دن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ زمین میرے پاس اب تک آنے والے مال و دولت میں سے بہترین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دوں۔ آپ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اس کو وقف کر دو۔ اس طرح وقف کر دو کہ اس کی اصل ملکیت موجود رہے۔ وہ خرچ نہ ہو اور آمدنی یتیموں، بیواؤں اور مسافروں پر خرچ ہوتی رہے۔ یہ اسلام میں پہلا وقف تھا جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور نے قائم کیا۔ پہلا وقف خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

بنی نضیر کے یہودیوں میں ایک صاحب تھے جن کا نام تھا مخیریق۔ مخیریق کے بارہ میں عام خیال یہی ہے کہ انہوں نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا جس کا اعلان انہوں نے بعد میں کیا تھا۔ وہ بنو نضیر کے یہودیوں میں بہت صاحب جائداد اور صاحب دولت آدمی تھے۔ وہ انتقال سے پہلے بیمار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے اپنی بہت سی زمینوں اور باغات کے بارے میں وصیت کر دی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دے دی جائیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثا نے آپ کو بتایا کہ یہ باغات مخیریق نے آپ کے لئے وصیت کر دیئے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہ سارے باغات اور زمینیں لے کر اپنی طرف سے وقف کر دی تھیں اور اسلامی ریاست کے کئی قسم کے ضروری اخراجات اس سے ادا ہوتے تھے۔ غریبوں اور ناداروں اور اصحاب صفہ کی ضروریات بھی اس سے پوری ہوتی تھیں۔ یہ پہلا وقف تھا جو اسلام میں خود سرکار دو عالم ﷺ نے قائم فرمایا۔ دوسرا وقف حضرت عمر فاروق نے فرمایا۔ یہ اس آمدنی کی بنیاد پر تھا جو حضرت عمر فاروق کو خیبر کی فتح کے نتیجے میں مال غنیمت میں حاصل ہوئی۔

مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ کے خدوخال میں سے بہت سے پہلوؤں کا ذکر قرآن

پاک میں ہوا ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا صحابہ کرام کی خوبیاں اور اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ مہاجرین اور انصار کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کا وہ حصہ جو مدینہ منورہ میں نازل ہوا۔ اس میں سینکڑوں آیات ہیں جن میں اشارۃً، کنایۃً یا صراحۃً مدینہ منورہ کے معاشرہ کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔ صحابہ کرام نے کس طرح قربانیاں دیں۔ کس طرح مال و دولت میں دوسروں کو شریک کیا۔ کس طرح ان میں معاشرتی تبدیلی آئی اور کس طرح ان میں بہتری آئی۔ ان سب باتوں کے اشارات قرآن پاک میں موجود ہیں۔

مواخاۃ کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ مواخاۃ مکہ مکرمہ میں بھی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان تمام صحابہ کرام کو جو مکہ میں اسلام لائے تھے، ان کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ تاکہ عرب کے اس قبائلی معاشرہ میں ایک الگ اسلامی برادری قائم کی جاسکے جو ایک دوسرے کی مددگار ہو۔ تاکہ اگر قبائل اپنے کسی مسلمان بھائی کی مدد نہ کریں تو مسلمان برادری ان کی مدد کے لیے موجود ہو۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بھی آپ نے مواخاۃ قائم فرمائی تھی۔ مسجد نبوی کی تکمیل سے پہلے یہ کام ہو گیا تھا۔ یہ گویا ایک نئے معاشرہ کی طرف ایک قدم تھا۔ وہ معاشرہ جس کو ایک غیر قبائلی یا کاسموپولیٹن معاشرہ بننا تھا۔ اس سے پہلے تک مدینہ منورہ میں قبائلی نظام سے ہٹ کر کوئی بنیاد نہیں تھی۔ یہ پہلی معاشرتی بنیاد تھی جس میں غیر قبائلی بنیاد پر مختلف اور متنوع قبائل کے افراد کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا اور ان میں جو اخوت قائم کی گئی وہ بعض صورتوں میں حقیقی اخوتوں سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ اس بنیاد پر پھر میثاق مدینہ کی تشکیل ہوئی۔ میثاق مدینہ میں ایک اور قدم آگے بڑھ کر غیر قبائلی معاشرہ کی بنیادوں کو اور گہرا کیا گیا۔

ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کی آبادی کتنی تھی؟ اس کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ بعض مورخین نے اس کا اندازہ دس اور پندرہ ہزار کے درمیان کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے 'دس ایک ہزار'۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دس گیارہ ہزار یا اس کے لگ بھگ ہوگی۔ بعض حضرات نے پندرہ ہزار لکھا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قبائل کی وہ تفصیل جو سمہودی کے ہاں ملتی ہے اس میں جہاں قبیلہ اور عشیرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس یا پندرہ ہزار سے کم آبادی نہیں رہی ہوگی۔ یہودی قبائل کی تعداد دس اور عرب قبائل کی تعداد بارہ تھی۔ یہ وہ قبائل تھے جو مدینہ منورہ میں پہلے سے

آباد تھے۔ جن کی تعداد بائیس سے کم نہیں تھی اور پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد آپ (ﷺ) نے مردم شماری بھی کروائی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ آپ نے فرمایا 'اکتبوا لي من تلفظ بالاسلام'، میرے لئے ان تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کردو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ گویا مسلمان باشندوں کی پہلی مردم شماری ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس کی تاریخ کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد اور دوسری مرتبہ بعد میں۔ ممکن ہے یہ واقعہ دو مرتبہ ہوا ہو۔ ممکن ہے تین مرتبہ ہوا ہو۔ لیکن مدینہ منورہ آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مردم شماری کرائی۔ اور صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کا پہلی مرتبہ ریکارڈ مرتب کیا گیا۔

یہودیوں کے جو تین بڑے قبائل تھے ان میں مسجدِ نبوی سے قریب ترین تو بنو قینقاع تھے جو مسجد نبوی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر بنو نضیر تھے۔ بنو قریظہ نسبتاً زیادہ فاصلہ پر آباد تھے۔ بنو قریظہ کے ساتھ سب سے اخیر میں جنگ کی نوبت آئی۔ انہوں نے غزوہ خندق میں غداری کی تھی۔ جبرئیل امین کے حکم پر ان کے خلاف کاروائی کی گئی۔ وہ تمام صحابہ جو غزوہ خندق میں شریک تھے وہ سب کے سب بنو قریظہ کے محاصرہ میں بھی شریک رہے۔ پندرہ روز کے محاصرہ کے بعد یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان کے بارے میں اسی فیصلہ پر عمل کیا گیا جو سعد بن معاذ نے ان کے بارے میں کیا تھا۔

بنی قریظہ کے بارے میں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ وہ یہ کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر دونوں نے پیشکش کی کہ وہ مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہونے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں قبائل اپنا ساز و سامان لے کر خیبر چلے گئے اور وہاں پر بقیہ یہودیوں کے ساتھ آباد ہو گئے۔ بنو قریظہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی یہ پیشکش کی لیکن قبول نہیں کی گئی۔ بعد میں ان کے اپنے مطالبہ پر حضرت سعد بن معاذؓ ان کے معاملہ کا فیصلہ کرنے لئے ثالث مقرر ہوئے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ توراۃ کے حکم کے مطابق ان کے سپاہیوں کو قتل کیا جائے۔ مال اور جائداد کو غنیمت قرار دیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو غلام قرار دیا جائے۔ توراۃ میں آج بھی لکھا ہوا ہے کہ مفتوحین کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ چنانچہ

یہودیوں کے ساتھ ان کے اپنے مذہبی قانون کے مطابق عمل کیا گیا۔ یہودیوں نے خود حضرت سعد بن معاذ کو حکم تسلیم کیا تھا۔

اس واقعہ کا یہ بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ حضرت سعد بن معاذ بیمار تھے۔ غزوہ خندق میں زخمی ہو گئے تھے اور اس وقت تک ان کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے۔ جب غزوہ خندق کے کچھ روز بعد یہ واقعہ پیش آیا تو ان کو ایک سواری پر سوار کر کے وہاں لایا گیا جہاں رسول اللہ ﷺ اور بنی قریظہ کے سرداروں کے درمیان یہ بات چیت ہو رہی تھی۔ سعد بن معاذ کو جب یہودیوں نے حکم بنانا تجویز کیا تو وہ کھڑے ہو گئے اور پوچھا کہ کیا سب لوگ مجھے حکم بنانے پر راضی ہیں۔ انہوں نے احتراماً رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ کیا آپ بھی مجھے حکم مانتے ہیں۔ دو تین مرتبہ کہا کہ کیا آپ سب لوگ مجھے حکم مانتے ہیں؟ انہیں یہ توقع تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنی زبان مبارک سے فرمادیں کہ ہاں، تو پھر میں آگے بات کروں۔ جب حضور نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تو جس طرف حضور تشریف فرما تھے، حضرت سعد نے اس کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ کیا اس طرف کے لوگ بھی مجھے حکم مانتے ہیں؟ جب انہوں نے کہا کہ ہاں تو پھر حضور کی طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ کیا اس طرف کے لوگ بھی مجھے حکم مانتے ہیں؟ تو حضور نے فرمایا کہ ہاں، اس طرف کے لوگ بھی آپ کو حکم مانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت سعد نے فیصلہ کیا جس پر ان لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔

ماضی قریب کے بعض مسلمان اور بعض غیر مسلم مورخین اور سیرت نگاروں نے بنو قریظہ کے اس انجام کو بیان کرنے والی روایات کے بارے میں تامل کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں ان روایات میں بنو قریظہ کے مقتولین کی تعداد کے بارہ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس رائے کی تائید میں کئی باتیں کی جاتی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں جس طرح سیرت کے واقعات پر بہت تفصیلی تبصرے ہیں اور جزئیات کی طرف بھی اشارے ہیں، اس طرح کے تفصیلی اشارے بنو قریظہ کے بارے میں نہیں ہیں۔ سورۃ احزاب میں جزوی اشارہ ملتا ہے 'تقتلون فریقاً وتاسرون فریقاً'، کہ تم ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو گرفتار کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ گہرا اور نمایاں اشارہ کوئی نہیں ملتا۔ دوسری وجہ یہ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں بنو قریظہ کے اس واقعہ کے بعد بھی بہت سے یہودی رہتے

رہے۔ ان کا تذکرہ ملتا ہے کہ بنی قریظہ کے فلاں یہودی نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ۔ تو اگر وہ سارے کے سارے قتل کر دیئے گئے ہوتے تو مدینہ منورہ میں بنوقریظہ کے یہ یہودی کہاں سے آئے۔ اس طرح کے بہت سے اور شواہد کچھ لوگوں نے بیان کئے ہیں اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ بنوقریظہ کے صرف سردار اور جنگی مجرمین جن کی تعداد پندرہ بیس یا پچیس کے قریب تھی، صرف ان کو قتل کیا گیا اور باقی لوگوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا گیا۔ بہر حال حقیقت جو بھی ہو اس رائے کا اظہار کچھ لوگوں نے کیا ہے۔ بعض قدیم مورخین نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔ مجھے اس وقت نام یاد نہیں آ رہا۔ کسی مستند مفسر کی رائے میں نے پڑھی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بنوقریظہ کے 43 آدمی قتل کئے گئے۔ بعض نے کہا کہ 400 قتل کئے گئے۔ بعض نے کوئی تعداد مزید مختلف بتائی ہے۔ لیکن یہ بحث ابھی پچھلے تیس چالیس سال دوبارہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان کے ایک مصنف تھے۔ مسلکاً تو بہت گڑبڑ آدمی تھے۔ برکات احمد قادیانی۔ ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔ ان کی کتاب Muhammad and the Jews of Madinah بہت اچھی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بنوقریظہ پر بہت تفصیلی باب لکھ کر یہ سارے دلائل اور شواہد بیان کئے ہیں۔ شاید ان کی کتاب سے متاثر ہو کر یا از خود کسی تحقیق کے نتیجہ میں بعض مسلمان مصنفین نے بھی اس پر مزید اظہار خیال کیا ہے اور اس رائے کی تائید کی ہے۔ لیکن یہ بات کہ بنوقریظہ کے سارے مردان جنگی قتل کئے گئے یا نہیں، اس پر سیرت نگار ایک سے زائد آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مفسر نے 43، ایک نے 400، ایک نے 600 آدمیوں کے قتل کی بات کی ہے۔ تعداد تو ان کی زیادہ ہوگی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام سپاہیوں یا تمام قابل جنگ افراد کو قتل نہیں کیا گیا۔

بنونضیر قبا کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ ان کے بھی متعدد آطام تھے۔ ان کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ زرعی زمینیں زیادہ تر انہی کی تھیں۔ مدینہ منورہ کی زراعت کے بڑے حصہ پر وہی قابض تھے۔ یہودیوں کا طریقہ شروع سے یہی رہا ہے۔ مدینہ میں بھی یہی طریقہ رہا کہ تجارت اور کاروبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے پاس وسائل کی کثرت اور بہتات تھی۔ اس دولت کی مدد سے وہ ضرورت مندوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ اس پر سود عائد کرتے تھے۔ سود در سود کی وجہ سے مقروض پھنس جاتا تھا تو قرض دار اس کی زمینیں

رہن رکھ لیتا تھا۔ زمینیں رہن رکھنے کے باوجود جب مقروض قرض اداء نہ کر پاتا تو اس کی زمین ہتھیالی جاتی۔ اس طرح ایک ایک کر کے عربوں اور دوسرے مسلمانوں اور انصاریوں کی بہت سی زمینیں یہودیوں نے ہتھیا رکھی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ان میں سے بہت سے عرب قبائل کی زمینیں یا تو یہودیوں کے پاس رہن تھیں یا وہ ان کو پہلے ہی اپنی ملکیت قرار دے کر قبضہ کر چکے تھے۔

یہودی قبیلہ بنوقینقاع مسجد نبوی کے قریب ترین خطہ میں رہنے والا قبیلہ تھا۔ یہ لوگ تاجر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دستکاری یعنی ہینڈی کرافٹ کے بھی ماہر تھے۔ سونے، لوہے اور بڑھئی کا کاروبار سب بنوقینقاع ہی کے یہودی کرتے تھے۔ اس طرح سے مدینہ منورہ کے پورے بازار اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ مدینہ منورہ کا سب سے بڑا بازار بھی انہی کا تھا۔ یہ لوگ تعداد میں ساڑھے تین چار ہزار کے قریب تھے۔ ان میں سات سو قابل جنگ مرد اور باقی بوڑھے، عورتیں اور بچے تھے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بازار لگتے تھے وہاں بھی انہی کا ساز و سامان آیا کرتا تھا۔ بنوقینقاع کا ایک قبیلہ ایک الگ گاؤں میں آباد تھا۔ یہ سارا قبیلہ پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا۔ اس بستی میں تین سو سنار تھے جو نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ قرب و جوار میں بھی اپنی مصنوعات کو فروخت کیا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ کی اس آبادی کے علاوہ قرب و جوار کے لوگ بھی ایک ایک کر کے اسلام قبول کر رہے تھے اور مدینہ منورہ میں آ آ کر آباد ہو رہے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد اور مدینہ منورہ کی آبادی میں کثرت سے اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ قبائل چونکہ ہجرت کر کے آ رہے تھے اس لئے کا واسطہ مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس امت کے واسطہ سے تھا جو میثاق مدینہ کی شکل میں قائم ہو گئی تھی۔ اس لئے ان کو مدینہ منورہ میں آباد ہونے میں اور وہاں کے ماحول میں گھل مل جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

مدینہ منورہ میں سب سے پہلا انتظامی معاملہ جو حضور کے سامنے پیش تھا، وہ امن و امان کا مسئلہ تھا کہ ان متنوع قبائل کی موجودگی میں، جن میں لگ بھگ آدھے دشمن قبائل تھے، شروع میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، ان سب میں امن و امان کیسے قائم کیا جائے۔ خاص طور پر باہر سے آنے والے مسلمانوں کو سیکیورٹی کیسے فراہم کی جائے۔ مدینہ منورہ میں جرائم

کے واقعات پہلے کثرت سے ہوتے رہتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد کے بعد جرائم میں بہت کمی آ گئی۔ لیکن پھر بھی قتل، چوری، بدکاری، شراب خوری، ڈاکہ اور اغوا وغیرہ کے اکادکا واقعات یہودی کرتے رہتے تھے۔ ایک ایک کرکے رسول اللہ ﷺ نے ان واقعات کا سدباب کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ میں پہرے کا انتظام بھی کیا۔ بعض افسران کا تقرر بھی کیا جن کو ہم پولیس افسران کہہ سکتے ہیں۔

تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری، جو ایک نمایاں انصاری سردار تھے، ان کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے امن وامان کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس طرح ان کو ہم مدینہ کا پہلا پولیس افسر کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مقرر کردہ کارندے ہوتے تھے جو شہر کے مختلف علاقوں اور قریب کے دیہاتوں میں جا کر امن وامان کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان علاقوں میں امن وامان کا فریضہ انجام دیتے تھے جہاں مسلمان آبادیاں زیادہ تھیں۔ جیسے جیسے مسلمان آبادیاں بڑھتی گئیں، امن وامان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غیر مسلم آبادیاں جیسے جیسے کم ہوتی چلی گئیں، خاص طور پر تین بڑے یہودی قبائل کو نکالنے کے بعد جرائم میں بڑی نمایاں کمی آ گئی۔ جرائم اور اس طرح کے واقعات کی بیشتر مثالیں ہجرت کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ بعد میں اس طرح کی مثالیں نسبتاً کم ہیں۔

ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ مدینہ منورہ میں شروع میں نو مساجد اور بعد میں چالیس مساجد قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مساجد میں درس وتدریس کا انتظام بھی تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت اس پورے درسی نظام کے سربراہ تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اس ریاست کے پہلے وزیر تعلیم تھے تو شاید درست ہوگا۔ وہ تمام مساجد میں خود تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں جہاں قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی، اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ خود براہ راست صفہ میں جو صحابہ زیر تعلیم تھے، ان کی نگرانی بھی فرمایا کرتے تھے۔ صفہ مسجد نبوی میں ایک حصہ تھا جہاں صحابہ کرام بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ باہر سے آنے والے صحابہ کرام اکثر و بیشتر صفہ میں ٹھہرتے تھے جہاں ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ یہ صحابہ کرام وہ تھے جو بعد میں بڑے بڑے فاتحین اور سردار بنے۔ فاتح شام حضرت عبیدہ بن الجراح بھی صفہ میں مقیم رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی بھی ایک زمانے میں صفہ میں مقیم رہے۔ مشہور راوی حدیث

حضرت ابو ہریرہ بھی صفہ میں مقیم رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفہ میں ملنے والی تربیت کس انداز کی تھی۔

مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج پہلے سے تھا۔ سوید بن صامت کا تذکرہ ہو چکا ہے جو حضرت لقمان حکیم کے حکمت نامہ سے واقف تھے اور اس کو پڑھتے بھی تھے۔ مدینہ منورہ میں بہت سے صحابہ تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کئی حضرات ایسے تھے جو کامل کہلاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بندوبست اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہجرت کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کفار مکہ میں جو قیدی جنگ بدر میں ہاتھ آئے تھے ان میں سے بہت سوں نے مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ یہ ان کا فدیہ تھا جس کے بدلے میں ان کو رہا کر دیا گیا۔

جو حضرات مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے ان میں ایک نمایاں نام حضرت معاذ بن جبل کا بھی ہے۔ جیسے جیسے دوسرے علاقے فتح ہوتے گئے، رسول اللہ ﷺ وہاں تعلیم کے لئے لوگوں کو بھیجتے رہے۔ عمرو بن حزم کو سترہ سال کی عمر میں یمن بھیجا تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ لیفقہهم فی الدین و یعلمهم القران، تاکہ ان کو دین کی سمجھ سکھائیں اور قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ حضرت معاذ بن جبل کو فتح مکہ کے بعد کچھ دن کے لئے مکہ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر کو ہجرت سے پہلے ہی مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ تعلیم قرآن کے گشتی معلمین حضور نے مکہ میں بھی مقرر فرمائے اور مدینہ میں بھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو تعلیم قران کے لئے عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں میں بھیجا گیا تھا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مدینہ منورہ کی مسجدوں اور تعلیمی مراکز میں جو صحابہ تعلیم دیا کرتے تھے ان میں زید بن ثابت، ابیّ بن کعب، حضرت ابو درداء، اسید بن حضیر، خالد بن سعید بن العاص، حضرت ابوعبیدہ، عمرو بن حزم اور معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کے نام بڑے نمایاں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص جو ایک مہاجر صحابی تھے، کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وکان کاتباً محسناً، وہ بہت اچھے کاتب تھے۔ وہ بچوں کو کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت بھی خوش نویسی کے استاد

تھے اور خوش نویسی سکھایا کرتے تھے۔ حضور نے غیر مسلموں سے فنی اور تجربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کے لئے یہودیوں کے مدراس میں بھیجا۔ منجنیق میں مہارت حاصل کرنے کے لئے صحابہ کرام کو یمن بھیجا۔ مدینہ منورہ میں دارالقراء کے نام سے ایک بڑا مکان تھا جہاں بڑی تعداد میں قرآن پاک کی تعلیم وتربیت ہوتی تھی۔ وہاں بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ ٹھہرا کرتے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر کے بارے میں ملتا ہے کہ جب مدینہ آئے تو اس مکان میں ٹھہرے جس کو بعد میں دارلقراء کہا گیا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم بھی اس مکان میں ٹھہرے۔

قرآن پاک، دین اور فقہ کے ساتھ ساتھ جن دوسری چیزوں کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی فہرست التراتیب الادار یہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ چیزیں شامل ہیں: فلکیات، تیراندازی، تیراکی، عربی زبان وادب، طب، قیافہ، طریقہ حرب، تجارت، ترجمہ اور مختلف زبانیں۔

مدینہ منورہ میں حضور نے اپنے زمانے میں مفتی اور قاضی بھی مقرر فرمائے تھے۔ اس زمانے میں مفتی اور قاضی کا منصب ایک ہی ہوتا تھا۔ خلفائے اربعہ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، ابیّ بن کعب، معاذ بن جبل اور عمار بن یاسر مدینہ منورہ کے مفتی اور قاضی بھی تھے۔ ان میں حضرت ابو ہریرہ، ابو درداء، حذیفہ بن الیمان، ابوموسیٰ اشعری اور سلمان فارسی کے اسمائے گرامی بھی نمایاں ہیں۔

دستاویزات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں کہ حضور نے دستاویزات کا شعبہ قائم فرمایا تھا۔ صحابہ کرام کو اس پر مقرر کیا۔ یہ سب حضرات بلا معاوضہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن الارقم الزہری حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے اور تنخواہ نہیں لی۔ حضرت عثمان نے ان کے پورے کام کا اندازہ لگا کر ایک تخمینہ لگایا اور ان کو تیس ہزار درہم تنخواہ بقایا جات سمیت دینی چاہی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ 'انما عملت لله انما اجری علی الله' میں نے تو یہ سب کام اللہ کے لئے کیے ہیں اور اللہ ہی سے اس کا اجر لوں گا۔

تعلیم اور انتظامی امور کی باقی تفصیلات کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

مدینہ منورہ اس اعتبار سے پورے جزیرہ عرب میں نمایاں تھا کہ وہاں تجارت اور زراعت دونوں کے مراکز تھے۔ طائف میں زیادہ تر زراعت ہوتی تھی تجارت کم تھی۔ مکہ مکرمہ میں صرف تجارت ہوتی تھی زراعت نہیں تھی۔ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت دونوں ہوتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے باغات اور کھیت تھے۔ کھجور اور انگور کے علاوہ بھی بہت سی دوسری پیداوار ہوتی تھی۔ تجارت میں اگرچہ اب مسلمان بھی شریک تھے۔ لیکن زیادہ تر تجارت اب بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک ایک کر کے ان میں سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ جو چیز اسلام کے نقطہ نظر سے قابل قبول تھی یا غلط نہیں تھی، اس کو حضور نے جاری رہنے دیا اور اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

یہ اسلام کی حکمت تشریع کا ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات اور تجارت کے ابواب میں اصل چیز حلت ہے، حرمت نہیں۔ بالفاظ دیگر اصول یہ ہے کہ لوگ جو کاروبار لوگ کر رہے ہیں اگر وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہیں ہے تو وہ کاروبار جائز ہے۔ شریعت نے بعض احکام مثبت طور پر دیئے۔ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ میں جو ہجرت کے ایک دو سال بعد نازل ہوئی اس میں تجارت کے بارے میں بعض بنیادی احکام دیئے گئے۔ یہ کہا گیا کہ تجارت وہ ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو۔ جائز معاملات میں ہو۔ اس میں کسی کو دھوکہ نہ دیا گیا ہو۔ تراضی سے ہو۔ ایک دوسرے کے طیب نفس سے ایک دوسرے کے مال کا تبادلہ کیا گیا ہو۔ جو تجارت ان ہدایات کے مطابق تھی وہ جائز قرار پائی اور جو ان ہدایات کے خلاف تھی یا ان میں ان ہدایت کی خلاف ورزی کا امکان تھا وہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دی۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ منفی چیزوں کی صراحت کر دی گئی کہ یہ چیزیں ناجائز ہیں اور تجارت اور کاروبار سے ان کو ایک ایک کر کے ختم کیا جائے۔ اس لئے عرب میں تجارت کی جتنی شکلیں تھیں ان میں سے ایک ایک کر کے کچھ شکلیں جو خالص منفی اور غیر منصفانہ تھیں وہ ناجائز قرار پائیں اور بہت سی رائج الوقت شکلوں کو جزوی اصلاحات کے ساتھ جائز قرار دے دیا گیا۔

مدینہ منورہ کی بڑی بڑی پیداوار کھجور، جو، انگور، انجیر کی تھی اور کچھ پھل جن میں انار اور کیلا بہت نمایاں ہیں، کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ گندم پیدا ہوتا تھا لیکن تھوڑا تھا۔ عام طور پر

لوگوں کی غذا جو ہوا کرتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی جو مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اہل خاندان نے کبھی مسلسل کئی دن تک گندم استعمال نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی گندم مدینہ منورہ کی بڑی پیداوار نہیں تھا۔ گندم کا بیشتر حصہ خیبر سے لایا جاتا تھا۔ یہ دور سے لانے کی وجہ سے مہنگا بھی تھا اور کم بھی تھا۔ مصنوعات میں زیادہ تر کپڑا، ہتھیار، لکڑی کا سامان شامل تھا۔ انگور کی پیداوار کی وجہ سے شراب کی پیداوار بھی تھی۔ اکثر شراب خانے یہودیوں کے تھے۔ وہ خود بھی شراب کا کاروبار کرتے تھے اور ان سے لے کر دوسرے لوگ بھی قرب و جوار میں شراب کا کاروبا کیا کرتے تھے۔ جب شراب حرام قرار پائی تو مہاجرین اور انصار دونوں میں شراب کا کاروبار کرنے والوں نے شراب کے کاروبار سے ہر قسم کا تعلق ختم کردیا۔ چونکہ مدینہ منورہ میں مارکیٹ ختم ہوگئی اس لئے غیر مسلموں نے بھی ایک ایک کرکے شراب کا کاروبار ختم کردیا۔

مدینہ منورہ میں جو افراد زمینوں کے مالکان تھے ان میں سے کچھ لوگ بڑے بڑے قطعوں کے اور بعض چھوٹے چھوٹے قطعوں کے مالکان تھے۔ چھوٹے قطعوں کے مالکان اپنی زمینوں پر خود کام کرتے تھے۔ بڑی زمینوں کے مالکان مختلف طریقوں سے اپنی زمینوں پر کام کرایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مزدوری دے کر کام کراتے تھے۔ کچھ لوگ مزارعت اور محاقلہ کی بنیاد پر کام کراتے تھے۔ یہ مختلف طریقے عرب میں رائج تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مزارعت کی بعض شکلوں کو ناجائز قرار دیا اور بعض کی اجازت دی۔ جن شکلوں میں سود، دھوکہ، استحصال یا اس طرح کی کوئی اور خرابی پائی جاتی تھی، ان شکلوں کو آپؐ نے ناجائز قرار دیا اور جن شکلوں میں استحصال یا ربوٰ نہیں پایا جاتا تھا ان کی آپ نے اجازت دے دی۔ مدینہ منورہ کی زمین اکثر بارانی تھی اس لئے سال میں ایک ہی فصل ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کنویں بھی تھے جن سے رہٹ اور اونٹ کے ذریعے پانی نکالا جاتا تھا۔ جن باغات میں کنویں تھے ان میں سال میں دو فصلیں بھی ہوجایا کرتی تھیں۔ اکثر باغات میں سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی۔

دستکاری میں گھریلو دستکاری بھی تھی اور اجتماعی دستکاری بھی تھی۔ گھریلوں دستکاری میں عموماً کپڑے، سوت کاتنے، دھاگہ بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ جو بڑے کاروبار تھے اور جس میں ایک سے زائد لوگ کام کرتے تھے جس کو آپ فیکٹری یا کارخانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں

زراعت، نجاری اور لوہاری کے آلات بنائے جاتے تھے۔ یہ سرگرمی عموماً بنوقینقاع کے ہاتھ میں تھی۔قرب وجوار کی آبادیاں زرعی آبادیاں تھیں اس لئے وہاں آلات زراعت کے کام کی خاصی گنجائش تھی۔ مدینہ منورہ کے تاجر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتے تھے۔شام سے کپڑا اور استعمال کی دیگر اشیاء منگوایا کرتے تھے۔ گندم کا بیشتر حصہ اردن سے آیا کرتا تھا۔کاروبار میں یہودی بھی پیش پیش رہتے تھے اور شام کے مختلف علاقوں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں اور مراکز تھے جہاں سے وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ بنونضیر کے یہودی اس کام میں بڑے نمایاں تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا۔اور یہ ہجرت کے فوراً بعد کی بات ہے۔ہجرت کے چند مہینے یا ایک ڈیڑھ سال کے بعد۔کہ مسلمان بڑی تنگ دستی کے عالم میں تھے۔ یہودیوں کا ایک بڑا تجارتی قافلہ آیا۔اس میں خوشبوئیں، جواہرات اور سمندری سامان غالباً موتی وغیرہ مدینہ کے بازار میں آکر اترا۔ مسلمان خواتین اور نوجوانوں نے حسرت کی ایک نظر سے ان سب چیزوں کو دیکھا اور دل میں محسوس کیا کہ تمام مال و دولت یہودیوں کے پاس ہے۔مسلمانوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔اس وقت مسلمانوں کی تسلی کے لئے قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی **'ولقد اٰتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم لا تمدن عینیک الی مامتعنا به ازواجا منهم '**،ہم نے آپ کو قرآن اور سات مثانی عطاء کئے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کی اس عارضی نعمت پر آپ زیادہ دل میلا نہ کریں۔ یہ ایک وقتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر ان کو دی ہے۔

غرض یہ تجارت بیشتر یہودیوں کی تجارت تھی۔جس پر ان کا قبضہ تھا۔انصار یعنی اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ان کے مقروض تھے۔اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان کی زمینیں ایک ایک کر کے یہودیوں کے قبضے میں جارہی تھیں۔اس صورت حال پر مہاجرین کے آنے سے بہت فرق پڑا۔مہاجرین تجارت کے بڑے ماہر تھے۔مکہ مکرمہ میں اصل کام تجارت تھا۔مہاجرین میں بڑے بڑے نامی گرامی تاجر تھے۔سیدنا عثمان غنیؓ،سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر بن العوام، یہ بڑے بڑے صحابہ تھے اور تجارت کے فن میں طاق تھے۔ جب انہوں نے مدینہ منورہ کے بازاروں میں تجارت شروع کی تو یہودیوں کا زور بازار پر سے کم

ہوتا چلا گیا اور ان کی بالادستی متاثر ہوئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بنوقینقاع کے بازار میں ہی کاروبار شروع کیا تھا۔ وہاں کے تاجروں نے بازار پر اپنی اجارہ داری بنائی ہوئی تھی۔ ایک شخص ابورافع تھا۔ وہ تاجر حجاز کہلاتا تھا۔ پورے حجاز کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ بنوقینقاع کے پورے بازار بلکہ مدینہ منورہ کے بازار پر اس کا کنٹرول تھا۔ جو قیمت وہ قرار دیتا تھا وہی قیمت بازار کی ہوتی تھی۔ سب یہودی تاجر متحد ہو کر اس کے فیصلوں کی پابندی کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ایکا کر کے کسی غیر یہودی تاجر کو بازار میں پنپنے نہیں دیتے تھے۔ اس نے دو پیمانے بنا رکھے تھے۔ ایک پیمانہ دینے کے لئے اور ایک لینے کے لئے ہوتا تھا۔ اسلام نے بعد میں دو پیمانے رکھنے کی ممانعت کر دی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پہلے تاجر تھے جنہوں نے ابورافع تاجر حجاز کی اس بالادستی کو ختم کر دیا۔ اور ایک ایک کر کے اس کے غلط تجارتی طریقوں کو ختم کیا اور اس کے کنٹرول کو کمزور کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بڑا اہم فیصلہ یہ کیا کہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ایک نیا بازار قائم کیا جو مسجد نبوی کے قریب ہی تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لئے ایک متبادل بازار قائم ہو جائے اور یہودیوں کی شرارتوں اور اجارہ داری سے مسلمانوں کو نجات مل جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو دنیاوی اعتبار سے بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ بڑی محترم شخصیت تھے۔ اللہ نے وسائل بھی دیئے تھے اور تجارت کی مہارت بھی دی تھی۔ ان کو شکست دینا اور ان کے کاروبار کو خراب کرنا تو یہودیوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔ لیکن چھوٹے مسلمان تاجروں کو یا ایسے لوگوں کو، جن کا رسوخ کم تھا، ان کو یہودی تاجر تنگ کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اپنے مسلمان خریداروں کو بھی یہودی دکاندار تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کا مشہور واقعہ بھی اسی پس منظر میں ہوا جس کی وجہ سے غزوہ بنوقینقاع ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

ان ساری چیزوں کا سدباب کرنے کے لئے اور ایک متبادل تجارتی پلیٹ فارم قائم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بازار قائم کیا جس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ تمہارا اپنا بازار ہے۔ اس میں کوئی بھی تمہارے ساتھ زیادتی یا کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تم سے کوئی ظالمانہ ٹیکس نہیں لے گا۔ یہودی اپنے بازار میں بیٹھنے والے مسلمانوں سے غیر ضروری

ٹیکس بھی لیا کرتے تھے اور ان پر طرح طرح کے مالی تاوان اور بوجھ ڈالا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گویا رسول اللہ ﷺ نے نئے بازار میں کاروبار کرنے والے مسلمان تاجروں کے لئے ٹیکس ریبیٹ کا اعلان کیا کہ کوئی اضافی بوجھ تم پر نہیں ڈالا جائے گا۔ مزید فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس بازار میں مال لا کر بیچے گا وہ اسی اجر کا مستحق ہوگا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے۔ **الجالب الی سوقنا کالمجاهدفی سبیل الله**، جو ہمارے اس بازار میں مال لے کر آئے گا وہ اسی طرح کے اجر کا مستحق ہوگا جس طرح کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کے بازار کو کامیاب بناتا ہے وہ مسلمانوں کی معاشی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ مسلمانوں اور امت مسلمہ کی آزادی کو یقینی بنانے والا کوئی بھی عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ نے فرمایا کہ ہمارے اس بازار میں کوئی شخص اگر ذخیرہ اندوزی کرے گا تو اس کو اتنا ہی مجرم سمجھا جائے گا جس طرح کہ کتاب اللہ میں الحاد کرنے والا، کتاب اللہ کی معانی میں غتر بود کرنے والا یا کتاب اللہ کے معانی کو غلط بیان کرنے والا۔

جب بنو قینقاع اور بنو النضیر کے خلاف کاروائی کا فیصلہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ ان کو خیبر جلاوطن کر دیا جائے۔ اس وقت یہودیوں کے بہت سے سودی قرضے اور رقوم انصاری صحابہ پر واجب الادا تھیں۔ اس وقت سود مکمل طور پر حرام نہیں ہوا تھا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر یہودی خیبر چلے جاتے ہیں تو ان کی رقوم اور قرضوں کا کیا ہوگا۔ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپؐ نے حکم دیا، جس پر فقہا میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ آپؐ نے دست مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا **ضعوا و تعجلوا**، یعنی اصل دعاوی میں تھوڑی سی کمی کر کے جلد لے لو۔ یعنی اگر رقم ایک سال کے بعد واجب الادا ہے اور اس کی مالیت ایک لاکھ ہے تو پھر نوے ہزار لے لو اور آج وصول کر لو۔ اس حکم کے بارے میں فقہا کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم ربٰو کی مکمل حرمت سے پہلے کا ہے۔ اس لئے ربٰو کی حرمت کے بعد یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا جو آپ نے ایک مسئلہ کے حل کے لئے فرمایا۔ اکثریت کی یہی رائے ہے۔ اس میں بھی ایک نوعیت کا منفی سود ہے۔ وقت کی قیمت ہے۔ قیمت میں وقت کی کمی کے مطابق کمی کرنا منفی سود ہی کے مترادف ہوگا۔ اس لئے اب حرمت سود کی آیت کے بعد فقہائے اسلام کی غالب

ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ضعوا و تعجلوا، پر عمل کرنا اب جائز نہیں ہے۔ بعض حضرات جو اقلیت میں ہیں، ان کی اب بھی یہ رائے ہے کہ ضعوا و تعجلوا، کے حکم پر آپس کی آزادانہ رضامندی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً اس کی ممانعت بعد میں نہیں فرمائی۔

اسی طرح سے کچھ یہودی ایسے تھے جن کی زمینیں دوسری آبادیوں اور دوسری بستیوں میں واقع تھیں۔ جب یہودی مدینہ منورہ سے نکلنے لگے تو انہوں نے شور مچایا کہ اب مختلف گاؤں میں واقع ہماری زمینوں کا کیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا اور دوسرے فریقوں کا موقف سننے کے بعد فیصلہ فرمایا کہ ان زمینوں کو جبری طور پر فروخت کر دا دیا جائے۔ اور جو شخص زمین کی قیمت یہودیوں کو دے دے وہ اس زمین کا مالک بن جائے۔ یہودیوں کو یہاں زمین رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ یہودیوں نے وہ زمینیں ناجائز طور پر ہتھیائی تھیں۔ سودی کاروبار کے ذریعے قبضہ میں لی تھیں۔ دوسرے عملاً اس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ ایک یہودی تاجر جو خیبر میں بیٹھا ہو اور مدینہ میں اس کی زمین ہو تو اس کو سازشیں کرنے کا بڑا موقع ملے گا، اس لئے بہتر یہی تھا یہودیوں کو مدینہ سے لاتعلق کر دیا جائے۔

مدینہ میں اس زمانے کے بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح بارٹر کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ لوگ ایک چیز دے کر دوسری چیز لے لیا کرتے تھے۔ ابتدائی معیشت میں ہر جگہ بارٹر کا سسٹم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں بھی تھا۔ یہودیوں نے اس بارٹر سسٹم کو بھی اپنی بالادستی کا اور اپنے معاشی کنٹرول کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ زرعی پیداوار پر قبضہ اور کنٹرول عموماً یہودیوں ہی کا ہوتا تھا۔ صنعت اور تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے جب فصل کٹنے میں ابھی کافی وقت ہوتا تھا تو لوگوں کو چیز دیتے وقت کہتے تھے کہ یہ اچھی چیز ہے اور جب لوگوں کی پیداوار وصول ہو جاتی تھی اور وہ قرض وصول کرنے آتے تو کہتے کہ تمہاری پیداوار گھٹیا ہے اس لئے تمہیں زیادہ دینا پڑے گا۔ اپنی پیداوار کو اعلیٰ اور دوسروں کی پیداوار کو گھٹیا قرار دیتے تھے، اور مثلاً ایک کلو کے بدلے میں دو کلو لے لیا کرتے تھے۔ یہ بھی استحصال کا ایک طریقہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ربا کے احکام کے تحت کاروبار کی بہت سی

شکلوں کو ناجائز قرار دیا تو آپ نے اس شکل کو بھی ناجائز قرار دیا۔ اس کو ربا الفضل کہا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں چھ چیزوں کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ 'الذهب بالذهب والفضة بالفضة والشعر بالشعير والملح بالملح والتمر بالتمر والحنطة بالحنطة مثلاً بمثلٍ يداً بيدٍ والفضل ربو'۔ یعنی سونا اور چاندی، جو، کھجور، گندم اور نمک کا جب باہمی لین دین کیا جائے تو دست بدست کیا جائے، فوراً دیں اور فوراً لیں اور برابر سرابر کی بنیاد پر لین دین کیا جائے۔ زیادتی ہوگی تو اس کو ربا سمجھا جائے گا۔ اس حکم نے دو اچھے نتائج پیدا کیے۔ ایک تو یہ کہ اس کے نتیجہ میں بارٹر کے کاروبار میں خود بخود کمی آئی اور زری معیشت یعنی مانیٹری اکانومی کو فروغ ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے استحصال کا ایک بہت بڑا طریقہ ختم ہوگیا۔ اور وہ جس انداز سے مسلمان تاجروں اور ساہوکاروں کو نقصان پہنچا رہے تھے وہ سلسلہ رک گیا۔ یہ ربا کی وہ قسم ہے جس کو فقہا نے ربا البیع یا ربا الفضل یا ربا الحدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس پر فقہائے کرام کے ہاں بڑی بحث ہوتی رہی ہے کہ یہ ربا ان چھ چیزوں تک محدود ہے یا ان کے علاوہ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں سب کی رائے یہ ہے کہ یہ حرمت ان چھ چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔ کس اصول کی بنیاد پر ہوگا، اس پر ائمہ اربعہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ صرف ایک رائے ابن حزم کی ائمہ اربعہ سے مختلف ہے، جن کا موقف یہ ہے کہ نصوص کی لفظی تعبیر ہونی چاہئے اور قیاس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اس ممانعت کو ان چھ چیزوں تک محدود سمجھتے ہیں اور باقی چیزوں کے لین دین میں ربا الفضل کو وہ ربا نہیں کہتے۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا الگ بازار قائم فرمایا تو اس کو اور آئندہ کی معاشیات کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لئے آپ نے بعض ہدایات دیں جو ابھی تک اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا کہ بازار میں جو لوگ کاروبار کریں، وہ آزادانہ رضامندی کے ساتھ کاروبار کریں اور کوئی بیرونی قوت ان کو کسی خاص انداز پر چلنے کے لئے مجبور نہ کرے۔ یعنی مصنوعی طور پر قیمتوں میں کمی بیشی نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی نہ ہو اور کسی کو اپنا سامان بازار میں لانے سے روکا نہ جائے۔ اس زمانے میں

یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ یہودیوں کے بازار میں باہر سے جو لوگ آتے تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں چمڑے کی مصنوعات کا بڑا رواج تھا۔ وہاں سے کوئی تاجر اپنا چمڑہ فروخت کرنے کے لئے آیا۔ تو جب یہودی ساہوکاروں کو پتہ چلتا تھا کہ چمڑہ آ رہا ہے تو یہودی ساہوکاروں کے نمائندے باہر سے آنے والے تاجر سے راستے ہی میں سارا ذخیرہ خرید لیتے تھے اور بازار تک اس کو آنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ یہ تاجر اگر خود بازار آئے تو اس کو قیمتوں کا پتہ چل جائے گا اور وہ اپنے مال کو بہتر قیمت پر بیچ سکے گا۔ اس سے روکنے کے لئے پہلے ہی جا کر اس کا مال خرید لیتے تھے اور پھر لا کر من مانی قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ اس طرح ان کو ذخیرہ اندوزی کا موقع بھی ملتا تھا۔ قیمتوں کے تعین میں بھی اپنی مرضی چلاتے تھے۔ اور اس شخص کو جو اصل مال لے کر آیا ہے اس کو ایک معقول قیمت سے محروم کر دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی اور اس مداخلت کو ناجائز قرار دیا۔ حدیث میں کئی مواقع پر آیا ہے کہ **نهىٰ رسول الله ﷺ عن تلقي الجلب**، اس سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو بازار میں آنے سے پہلے ہی جا کر اونے پونے داموں خرید لیا جائے، اس کی حضور نے ممانعت فرمائی۔ تلقی جلب کے معاملہ کو آج کی معاشیات کے نظام میں کیسے بیان کیا جائے گا۔ اس کے لئے حکومت کو قواعد بنانے چاہئیں۔ سرکاری ریگولیٹری اداروں کو یہ بات یقینی بنانی چاہئے کہ مارکیٹ تک رسائی ہر شخص کو یکساں طور پر حاصل ہو۔ کوئی ایسا گروہ نہ ہو جو نئے آنے والوں کو مارکیٹ میں آنے سے روکے۔ اسی طرح سے آپؐ نے فرمایا کہ 'لا يبيع حاضر لباد'، لغوی اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شہری آدمی دیہاتی کے لئے مال فروخت نہ کرے۔ یہ بھی تلقی جلب کی ایک شکل ہے۔ دیہات میں لوگ بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مثلاً اونٹ کے اون سے لوگ خیمے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح سے خوراک کا بہت سا سامان بدوؤں کے ہاں تیار ہوتا تھا۔ شہری لوگ جا کر وہاں سے بہت معمولی قیمت پر سامان خرید لیا کرتے تھے۔ آج بھی ہمارے دیہاتوں میں یہ ظلم بہت ہوتا ہے۔ دیہاتوں میں اونے پونے داموں چیز خرید کر بڑے شہروں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ حکم ایسے ہی معاملہ کے لئے ہے کہ کوئی شہری آدمی دیہاتیوں سے چیز معقول قیمت سے کم پر خرید کر مہنگی فروخت نہ کرے۔

پاکستان میں دستکاری کے بعض نمونے ہیں۔ ان کو دیہی خواتین اپنے ہاتھ سے بناتی ہیں۔ وہ اتنے نفیس ہوتے ہیں کہ لندن اور پیرس کے بازاروں میں ہزاروں ڈالر کے بکتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں جو خواتین یہ نمونے بناتی ہیں ان کو روز کے حساب سے بھی چند روپے سے زیادہ معاوضہ نہیں ملتا۔ ایک روپیہ اور بعض صورتوں میں کارکن خواتین کو آٹھ آنے یومیہ معاوضہ ملتا ہے۔ اور وہ ایسا کام کرتی ہیں جو پیرس میں ہزاروں ڈالر کا بکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان خواتین کو براہ راست مارکیٹ تک رسائی نہیں ہے اور جو لوگ مارکیٹ کی قیمتوں کی ان کو اطلاع دیئے بغیر ان سے مال لے جاتے ہیں۔ وہ ان کی سادگی اور ناواقفی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ ظلم ہے اور حدیث کی رو سے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ 'نهى رسول الله ﷺ عن بيع الكالئ بالكالئ'، یعنی ادھار کی خرید و فروخت ادھار کے ساتھ درست نہیں ہے۔ آپ کا کسی کے ذمہ کوئی قرض ہے۔ اس شخص کی رقم کسی اور کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ان دونوں رقموں کا آپس میں تبادلہ ہو جائے یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ کم از کم ایک طرف کی چیز نقد ہونی چاہئے اور اس کو موقع پر موجود ہونا چاہیے۔

ان ساری اصلاحات کو ایک ایک کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نافذ فرمایا۔ پھر جب یہ اصلاحات نافذ ہو گئیں تو آپ نے بازاروں پر نگران مقرر فرمائے۔ حضرت سعید بن العاص کے بارے میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فتح مکہ کے بعد ان کو وہاں بازار کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا تاکہ ان تمام شرائط اور قواعد کی پابندی کرائیں۔

اس زمانے میں ایک عام طریقہ یہ بھی تھا کہ ہر بااثر شخص یعنی کوئی قبائلی سردار یا چند افراد کا ایسا گروہ جن کے پاس اسلحہ، قوت اور تعداد ہو، وہ جنگلات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ اپنے اثر و رسوخ کے زور پر چراگاہوں یا ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا کرتے تھے جہاں پانی اور زراعت کی بہتات ہو اور اس کو اپنے جانوروں کے چرنے کے لئے خاص کر دیا کرتے تھے۔ اس جگہ کو حمیٰ کہا جاتا تھا۔ کہ فلاں سردار کی حمیٰ ہے۔ عربوں میں بہت پہلے سے یہ رواج تھا۔ اس پر جنگیں بھی ہوئیں۔ ایک مشہور جنگ جو داحس اور غبراء کی جنگ کہلاتی ہے وہ بھی اس حمیٰ کی وجہ سے ہوئی۔ کسی سردار کے حمیٰ میں کسی کی اونٹنی چلی گئی۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ اس

کے جواب میں اس کے گھوڑے کو قتل کر دیا گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اس جنگ کی داستان عربی زبان کے ادب میں تفصیل سے ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہر حمیٰ کو ختم کر کے حکم دے دیا کہ **لا حمی الا للہ و رسولہ** ' حمیٰ قائم کرنے کا اختیار صرف حکومت یا ریاست کو ہے۔ حکومت اپنے سرکاری جانوروں، صدقہ کے جانوروں کے لئے یا فوجی جانوروں کے لئے حمیٰ یعنی سرکاری چراگاہ مقرر کر سکتی ہے۔ باقی کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ پبلک کی زمین کو اپنے لئے خاص کر لے اور اس کو عام انسانوں کے لئے ممنوعہ علاقہ قرار دے دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ کے قریب بعض چراگاہوں کو حمیٰ قرار دے دیا جہاں صدقے کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ ان میں ایک چراگاہ وہ تھی جہاں بنی عرینہ کے بعض لوگ بھیجے گئے تھے جنہوں نے حضور کے کارندے کو شہید کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ قبیلہ عرینہ کے غالباً آٹھ دس آدمیوں کا ایک گروہ مدینہ منورہ آیا۔ اسلام قبول کیا۔ لیکن مدینہ منورہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی اور وہ سب یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہماری ایک چراگاہ ہے تم وہاں جا کر رہو بھی اور اپنا علاج بھی کراؤ۔ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کارندے کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھوں میں گرم سلائیاں ڈال کر اندھا کر دیا اور تپتی ہوئی ریت میں چھوڑ کر سرکاری اونٹوں کے ساتھ فرار ہو گئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پتہ چلا تو آپ نے ایک دستہ بھیج کر ان کو گرفتار کرایا اور ان کو سزائے موت دے دی گئی۔ یہ واقعہ عرینیین کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے اور محدثین نے بہت تفصیل سے اس کو بیان کیا ہے۔

بازار کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بازار میں اوزان اور پیمانے متعین ہوں۔ اگر ہر شخص الگ الگ اپنے اوزان اور پیمانے رکھے گا تو بازار میں سنٹرلائزیشن اور معیار بندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے مانیٹری اکانومی کی حوصلہ افزائی کر کے بازار اور تجارت میں اسٹینڈرڈائزیشن کو بہتر اور مقبول قرار دیا۔ معیار بندی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ پیمانوں اور اوزان کو متعین کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ بھی تھا کہ مختلف علاقوں میں مختلف

پیمانے اور اوزان مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ کا پیمانہ اور تھا مدینہ منورہ کا پیمانہ اور تھا۔ اب مکہ کے لوگ چونکہ تجارت میں نمایاں تھے۔ دور دراز کی تجارت میں نقد رقم لے کر جایا کرتے تھے۔ سونا اور چاندی کی صورت میں ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں ہوتی تھیں، اس لئے سونے اور چاندی کی پرکھ کا معیار مکہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھا۔ مدینہ میں زراعت زیادہ تھی اس لئے چیزوں کو ناپنے کے پیمانے مدینہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ المکیال مکیال اہل المدینہ، ناپنے کے پیمانے مدینہ کے معیاری مانے جائیں گے اور 'والوزن وزن اہل مکہ' اور سونے چاندی کو تولنے یا گننے کے پیمانے اہل مکہ کے معیاری مانے جائیں گے۔ یعنی سکوں اور سونے چاندی کا معیار مکہ کے معیار کے مطابق ہوگا اس لئے کہ وہ تجارت کا مرکز ہے۔ زرعی پیمانے مدینہ کے ہوں گے کیونکہ وہاں زرعی کاروبار زیادہ تھا۔

یہ بات کہ مکہ مکرمہ میں رائج پیمانوں اور اوزان کی موجودہ پیمائش کیا تھی۔ اس کی کتنی قسمیں رائج تھیں۔ مدینہ منورہ میں ناپنے کے کیا پیمانے رائج تھے۔ یہ موضوع بڑی تحقیق کا ہے۔ یہ محض تاریخی دلچسپی کا مضمون نہیں ہے بلکہ یہ فقہیات سیرت کا مضمون بھی ہے۔ فقہیات سیرت کا مضمون اس لئے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قسم کی لازمی ادائیگیوں کے لئے بعض احکام بیان فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر صدقہ فطر کے بارے میں ایک پیمانے کا ذکر ہے۔ اسی طرح سے بعض چیزوں کے پیمانے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ متعین نہ ہو کہ حضور نے اپنے زمانے کے پیمانے لحاظ سے جو حکم دیا تھا آج کے وقت میں وہ کتنا بنتا ہے۔ اس وقت تک ان احکام پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ بہت سے حضرات نے اس پر کتابیں لکھی ہے۔ ایک مالکی فقیہ نے کتاب لکھی ہے جس کا نام بڑا دلچسپ ہے: 'اثبات ما لیس منه بد لمن اراد الوقوف علی حقیقة الدینار والدرهم والصاع والمد' کہ حضور کے زمانے میں جو صاع، مد اور دینار رائج تھے اس کو کیسے ثابت کیا جائے۔ ہمارے پاکستان میں بھی مفتی محمد شفیع صاحب نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا تھا 'رسالہ اوزان شرعیہ'۔ اس میں انہوں نے اپنی تحقیق سے ان تمام اوزان کا آج کل کے رائج الوقت پیمانوں سے الگ الگ وزن مقرر کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بازار میں نگران اور انسپکٹروں کے علاوہ بہت سے اور افراد بھی

مقرر فرمائے۔ ایک صاحب الاعشار ہوتا تھا۔ یہ تاجروں کے سرمائے کا اندازہ کر کے ان سے عشر لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب الخراج مقرر فرمایا۔ یہ زمین کی پیداوار سے حصہ وصول کرتا تھا۔ ایک صاحب الجزیہ مقرر فرمایا۔ یہ غیر مسلموں سے ٹیکس لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب المساحہ مقرر فرمایا تھا جو زمین کی جانچ اور پیداوار کا اندازہ، یعنی assessment کرتا تھا۔ کئی صوبوں میں الگ الگ عامل زکوٰۃ مقرر فرمائے۔ کاتب صدقات الگ مقرر فرمائے۔ عبداللہ بن رواحہ کی مثال دی جا چکی ہے جو زمینوں اور زرعی پیداوار کا تخمینہ اور assesment کرنے کے لئے خیبر بھیجے گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل سے معاہدات فرمائے تھے۔ حرمت سود کے بعد سے جتنے معاہدات فرمائے ان میں یہ بھی فرمایا کہ تم سودی کاروبار نہیں کرو گے۔ اور بعض غیر مسلم قبائل سے کئے جانے والے معاہدہ میں یہ بھی لکھا کہ تم میں سے جو سودی کاروبار کرے گا تو اس کے ساتھ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدہ کیا گیا اس میں ان کو بہت سی مراعات اور حقوق دیئے گئے۔ آج مذہبی آزادی کے جتنے حقوق کی بات ہوتی ہے اس معاہدہ میں ان تمام حقوق کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس میں یہ بھی لکھا کہ 'ومن اربیٰ منکم فذمۃ اللہ بریئۃ'، تم میں سے جو کوئی ربا کا کاروبار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ یعنی یہ معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربا کا کاروبار کر رہے ہیں۔ اور سود میں ملوث ہیں۔ یہ اطلاع صحیح ثابت ہونے پر حضرت عمر فاروق نے اس معاہدہ کو منسوخ کر دیا اور انہیں جلا وطن کر کے شام بھیج دیا۔

☆

سوال و جواب

موجودہ دور میں اگر کسی دور کے مضافات میں تیار ہونے والی چیز اگر اس وجہ سے سستے داموں بیچی جائے کہ مارکیٹ تک پہنچانے میں انفرادی طور پر خرچہ زیادہ آتا ہو تو اس کا لینا کیا حرام ہوسکتا ہے جبکہ بیچنے والے کو مارکیٹ کی اصل قیمت اندازہ ہو؟

ظاہر ہے کہ حدیث میں جس چیز کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جہاں کسی شخص کو مارکیٹ کی اصل قیمتوں کا اندازہ نہ ہو اور اس کی ناواقفیت کا استحصال کرتے ہوئے اس کو جائز منافع سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جہاں یہ بات نہ ہو تو وہاں ایسا کرنا جائز ہوگا۔

☆

بعض اسلامی رسالے جو کہ نقد قیمت پر کم اور قسطوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا اسلام میں کیا حکم ہے؟

آج کے علما اور فقہا کی بڑی تعداد اس کو جائز قرار دیتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی نقد قیمت الگ سے متعین ہو اور وہ کم ہو۔ اور بالاقساط قیمت الگ سے متعین ہو اور وہ زیادہ ہو تو یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ خریدار پہلے سے طے کرے کہ وہ بالاقساط قیمت پر خرید رہا ہے یا نقد قیمت پر خرید رہا ہے۔ اس صورت میں اس کی ممانعت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر معاملہ ایسا ہو کہ متعین طور پر یہ طے نہ ہو کہ وہ کس انداز کی قیمت اور کس انداز کی ادائیگی کی بنیاد پر معاملہ کر رہا ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اسٹاک ایکسچینج کا شرعی متبادل کیا ہو سکتا ہے؟

اسٹاک ایکسچینج کے شرعی متبادل کی بات تب ہو گی جب اسٹاک ایکسچینج کے سارے کاروبار کو آپ ناجائز قرار دیں گے۔ میرے خیال میں اسٹاک ایکسچینج کا سارا کاروبار ناجائز نہیں ہے۔ اسٹاک ایکسچینج تجارتی کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت کے لئے ایک سہولت ہے۔ حکومت نے اس کو ریگولیٹ کیا ہے۔ اگر اس میں ایسے حصص فروخت ہو رہے ہوں (۱) جو کسی ناجائز کاروبار کے نہ ہو۔ (۲) ان حصص میں بیع الدین بالدین کی ممانعت کے اصول کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ (۳) زر کی فروخت زر کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ نہ ہو رہی ہو۔ اور (۴) جس میں قمار اور سٹہ نہ ہو۔ اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو یہ کاروبار جائز ہے۔ قواعد و ضوابط کی رو سے ان خرابیوں کو ختم کرنا چاہئے۔ اگر یہ خرابیاں اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں نہ ہوں تو اس کی موجودہ شکل کے برقرار رہنے میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆

کیا مدینہ کے یہودی مسلمانوں کا مال و متاع خریدا کرتے تھے یا نہیں؟

یہودی مسلمانوں کے بازاروں میں اپنا مال و متاع لایا کرتے تھے۔ اس کی ممانعت نہیں تھی۔ کسی بھی شخص کو کبھی مسلمانوں کے ساتھ کاروبار کرنے یا ان کے بازار میں بیٹھنے سے نہیں روکا گیا۔ ہر دور میں غیر مسلم تاجر مسلمانوں کے بازاروں میں تجارت کرتے رہے ہیں۔ یہ چیز شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہے تو اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب کا قول ہے کہ **لھم ما لنا وعلیھم ما علینا** 'جو ہمارے حقوق ہیں وہ ان کے بھی ہیں اور جو ہماری ذمہ داریاں ہیں وہ ان کی بھی ہیں۔

☆

آپ نے فرمایا تھا کہ قادیانی بڑا گڑبڑ مسلک ہے۔ کیا یہ حنفی

اور شافعی کی طرح مسلمانوں ہی کا ایک مسلک یا فرقہ
نہیں ہے؟ یا الگ مذہب ہے؟

یہ سوال ایک نوجوان نے کیا ہے جو کلیۃ الشریعۃ والقانون کے طالب علم ہیں۔ سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو نہ شریعت کا پتہ ہے نہ قانون کی خبر ہے۔ شریعت کی رو سے ہر منکر ختم نبوت اور مدعی نبوت دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ قادیانی ایک مدعی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ تو شریعت کی بات ہوئی۔ پاکستان کا قانون یہ ہے کہ ہمارے ہاں قومی اسمبلی کی متفقہ رائے سے ان کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے۔ اور پاکستان میں 1947 سے لے کر آج تک اتنے بڑے پیمانے پر اتفاق رائے کی کوئی اور مثال نہیں ہے۔ نیشنل اسمبلی جب یہ ترمیم کر رہی تھی تو اس میں اس وقت 100 فیصد حاضری تھی۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ 100 فیصد ووٹ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ڈالے گئے۔ سینٹ میں بھی 100 فیصد حاضری اور 100 فیصد ووٹ تھا۔ کوئی ایک ووٹ بھی غیر حاضر تک نہیں تھا۔ سب نے اتفاق رائے سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا۔ اس لئے آپ اپنی اصلاح کیجئے۔ ایسا غیر مسلم گروہ حنفی شافعی کی طرح اسلامی مسلک کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اسلامی یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو یہ بڑی غلط فہمی ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے۔

پاکستان کے علاوہ بہت سے دوسرے ممالک بھی قادیانیوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ پاکستان سے بہت پہلے یہ فیصلہ متعدد دوسرے ممالک میں کیا جا چکا ہے۔ مصر میں 1935 میں یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ سعودی عرب میں 1974 کے اوائل میں یہ فیصلہ ہوا تھا۔ کئی اور ممالک میں اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

☆

آپ نے کہا کہ عرب کے بعض لوگ خاص طور پر یثرب کے
نوجوان مدراس میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے اور یہودی
ہو جاتے تھے۔ جب کہ یہودی صرف اس کو یہودی مانتے
ہیں جو نسلاً یہودی ہو۔

اصل میں یہودی تو وہی مانا جاتا ہے جو نسلاً یہودی ہو۔ یہودی اس کے علاوہ کسی اور کو یہودی نہیں مانتے۔ لیکن یہودی دوسروں کو گمراہ کرنے میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اگر کوئی عرب اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے آپ کو یہودی کہلوانا شروع کرتا تھا تو یہودی اس کو نہ روکتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں یہودیوں کا فائدہ تھا۔ ان کے ہمدردوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ کم سے کم عامۃ الناس کی نظر میں ان کی تعداد بڑھتی تھی۔

☆

مدینہ منورہ میں شادی بیاہ کی رسومات کے بارے میں کچھ وضاحت فرمائیں۔

مدینہ منورہ میں شادی بیاہ کی وہی رسومات تھیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں۔ ان میں کچھ طریقے اسلام کے نقطہ نظر سے ناجائز تھے، اس لئے اسلام نے ان کی ممانعت کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تمام غیر اخلاقی طریقوں کو منع فرما دیا۔ جو طریقہ اب مسلمانوں میں رائج ہے اس کی آپ نے اجازت دے دی۔ اس لئے نکاح و طلاق کے احکام میں جو اصلاحات آپؐ نے فرمائی ہیں وہ شریعت کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نکاح رضامندی سے ہونا چاہئے۔ نکاح اعلان کے ساتھ ہونا چاہئے۔ نکاح میں جو شرائط اور قیود رکھنی چاہئیں ان کا ذکر قرآن اور حدیث میں صراحت سے ہوا ہے۔ جو چیزیں سراسر ناجائز تھیں ان کی آپ نے ممانعت فرمائی۔

☆

ہول سیل اور ایجنسی سسٹم کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

ہول سیل اور ایجنسی سسٹم میں شرعاً کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ ایجنسی سے مراد اگر یہ ہے کہ اگر آپ کسی پروڈیوسر یا کسی مینوفیکچرر کے نمائندے کے طور پر اس کا مال بیچیں اور وہ اس پر آپ کو معاوضہ دے یا پرسینٹیج کے حساب سے آپ کو پیسے دے تو یہ جائز ہے۔ اس میں کوئی

چیز حرام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بڑے پیمانے پر فرنیچر بنانے والا ہے۔ آپ اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ کسی اور شہر میں دکان کھول لیتے ہیں۔ وہ قیمت مقرر کر کے آپ کو دس فیصد نفع لینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ آپ اپنا خرچہ نکالنے اور نفع کے حصول کے لئے یہ خرید و فروخت کریں تو یہ بالکل جائز ہے۔

ایجنسی کی جائز شکلیں یہی ہیں۔ ہول سیل کا کاروبار بھی جائز ہے۔ ہول سیل میں صرف یہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر ایک سپلائر سامان خریدتا ہے اور چھوٹے تاجروں کو فراہم کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ بڑے پیمانے پر خریدتا ہے اس لئے اس کے نفع کا ریشو نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اور چھوٹا تاجر چھوٹے پیمانے پر بیچتا ہے اس لئے نفع کا ریشو نسبتاً زیادہ رکھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ ریٹیلر اور ہول سیلر کے درمیان نفع کا سبب بنتا ہے۔

☆

مخابرہ، مضاربہ، مساقاہ اور مزارعہ کی وضاحت فرمائیں۔

یہ موضوعات بڑی لمبی بحث کے متقاضی ہیں۔ یہ سارے کے سارے نفع میں شراکت کی بنیاد پر ہونے والے کاروبار ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مالک زمین کسی شخص کو مزارعت پر زمین دے دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ طے ہوتا تھا کہ جو پیداوار ہوگی اس کا آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا، یا ایک تہائی تمہارا وغیرہ۔ اس بنیاد پر سودا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ کچھ قسموں کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اجازت دے دی۔ بعض لوگ یہ کرتے تھے کہ وہ یہ طے کرتے تھے کہ جو پیداوار ہوگی اس میں سے ایک ہزار من ہمارا ہوگا باقی تمہارا ہوگا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ تمام پیداوار ہی ایک ہزار من ہو۔ متعین مقدار کے ساتھ کسی ایک فریق کے حق میں شرط رکھنا جائز نہیں ہے۔ فیصد کے حساب سے جائز ہے۔ اسی طرح سے اگر زمین مزارعہ پر دی ہے اور آپ کہیں کہ زمین کے اس حصہ کی ساری پیداوار فلاں فریق کی ہوگی۔ اور دوسرے حصہ کی دوسرے فریق کی ہوگی۔ یہ بھی جائز نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی حصہ میں پیداوار ہو اور دوسرے حصہ میں پیداوار نہ ہو۔ فیصد کے حساب سے بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اسی بندوبست کی مختلف قسموں کے نام ہیں: محاقلہ،

مزارعہ، مساقاہ۔

مساقاہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی شخص کو مقرر کریں کہ وہ آپ کی زمین کو پانی دے دیا کرے اور اس کے معاوضہ میں آپ اس کے لئے پیداوار کی ایک پرسینٹیج مقرر کر دیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

☆

ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ غربت کی چکی میں پس رہے ہوں۔ خودسوزی پر آمادہ ہوں اور فحاشی کا پرچار ایک بڑے پیمانے پر ہو۔ آپ کے خیال میں ایک ایسے معاشرہ میں بڑے پیمانے پر حدود اللہ کو نافذ کرنا اسلامی قانون کی روح سے متصادم نہیں ہے؟

میرے خیال میں ایسے ہی معاشرہ میں حدود اللہ کو نافذ ہونا چاہئے۔ یہ تو ایک عجیب سا سوال ہے کہ پہلے معاشرہ اسلامی ہو پھر حدود نافذ ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے انڈہ پہلے یا مرغی پہلے۔

آپ دونوں کام ایک ساتھ شروع کریں۔ معاشرہ کی اصلاح بھی کریں اور قوانین بھی نافذ کریں۔ اسلامی قوانین معاشرہ کو بہتر بنانے میں مدد دیں گے۔ اچھا معاشرہ اسلامی قوانین کو موثر ہونے میں مدد فراہم کرے گا۔ دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیں گے۔

☆

جبرئیل امین جب غار حرا میں آپ کے پاس آئے اور کہا کہ پڑھو، اس کے نام سے جس نے تخلیق کی۔ ہمارے علم کے مطابق تو آپؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ پھر اس جملہ سے کیا مراد ہے؟

اس جملہ کی وضاحت کے بارے میں ایک دلچسپ لیکن نسبۃً کم مستند روایت آئی ہے۔

یہ غالباً واقدی کی روایت ہے۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ جب جبرئیل امین غار حرا میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی کپڑے پر لکھی ہوئی عبارت دیتے ہوئے کہا کہ پڑھو۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ماانابقاری۔ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر جبرئیل امین نے دوبارہ یہی کہا تو آپ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ چوتھی مرتبہ جبرئیل امین نے پڑھنا شروع کیا تو آپ نے بھی ساتھ ساتھ پڑھا۔ بظاہر اس روایت کو ماننے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ حضور نے جو جواب ارشاد فرمایا تھا وہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی تحریر سامنے رکھی گئی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی شخص کسی ایسی زبان کی تحریر لے آئے جو آپ نہیں جانتے تو آپ کہیں گے کہ یہ زبان تو میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، یا یہ تحریر تو میں نہیں جانتا۔ لیکن کوئی آپ کے سامنے کچھ الفاظ دہرا کر کہے کہ ان کو پڑھو تو شاید آپ یہ جواب نہیں دیں گے، بلکہ آپ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

☆

اسلامی معیشت میں منافع خوری کس حد تک جائز ہے؟

منافع خوری ایک ایسا لفظ ہے جو اردو میں منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تجارت کرنے کا مقصد ہی منافع کمانا ہوتا ہے۔ ہر دکاندار نفع لیتا ہے۔ اگر کمایا جانے والا نفع جائز حدود میں ہو۔ مارکیٹ کے نرخوں کے مطابق ہو۔ بازار میں رائج نفع کی سطح کے مطابق ہو۔ اس میں دھوکہ اور ظلم نہ ہو، کسی کا استحصال نہ ہو تو یہ جائز ہے۔ اس کو اردو میں منافع خوری نہیں کہتے۔ منافع خوری بازار کی سطح سے زیادہ قیمت لے کر ناجائز نفع کمانے کو کہتے ہیں۔ یا ذخیرہ اندوزی کر کے زبردستی زیادہ نفع وصول کرنے کو منافع خوری کہتے ہیں۔ یا لوگوں کو دھوکہ دے کر زیادہ نفع کمانے کو منافع خوری کہتے ہیں۔

☆

اسلام کے معاشی نظام کی روشنی میں اسلامی بنکاری کا مختصر خاکہ بیان کر دیجئے۔ چونکہ بنک کے اخراجات، تنخواہیں، مشینری، کمپیوٹر، ائرکنڈیشن وغیرہ کے اخراجات بہت کم

ہوتے ہیں۔

اس پر تو الگ سے ایک سلسلہ خطبات کی ضرورت ہے۔ یہ خاکہ ایک آدھ لیکچر میں بھی بیان نہیں ہوسکتا۔ اسلامی بنکاری کے خاکے بارہا بیان ہوئے ہیں۔ اس پر بہت سا کام ہوا ہے۔ اس پر بہت سی دستاویزات تیار ہوئی ہیں۔ اب تو بات خاکے سے بہت آگے چلی گئی ہے۔ خاکہ کا سوال آج سے ستر اسی سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اب تو اسلامی بنکاری کے میدان میں عملاً کام ہو رہا ہے۔ دنیا میں ساڑھے تین چار سو اسلامی بنک کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں 14 اسلامی بنک موجود ہیں جو اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات، دستاویزات اور مصنوعات بھی تیار ہوگئی ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے فنانسنگ کے تمام essential modes کے بنیادی عناصر واضح کر دیے ہیں۔ اسٹیٹ بنک نے ایزینشل پروڈکٹس کے بنیادی فیچرز بھی ڈیفائن کر دیے ہیں۔ اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ خاکے وغیرہ کی بات تو اب بہت پرانی ہوگئی ہے۔

☆

آج کل کا یہ گندا معاشی نظام جس کے نتیجہ میں غریب غریب سے غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا حضور کے زمانے میں بھی یہ نظام موجود تھا؟

جی ہاں حضور کے زمانے میں بھی یہ ظالمانہ نظام موجود تھا۔ اور اسی کی اصلاح کرنے کے لئے حضور ﷺ تشریف لائے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفع خور سرمایہ دار ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ یہودی اُس زمانے میں بھی تھے۔ اس زمانے میں بھی یہودیوں نے سود کے ذریعے دنیا کے معاشی نظام کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ آج بھی دنیا کا مالیاتی نظام اور معاشی زندگی یہودیوں کے کنٹرول میں ہے۔ اس وقت بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ آج بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جو اصلاحات حضور ﷺ نے اس وقت فرمائی تھیں وہ آج

دوبارہ نافذ ہونی چاہئیں۔

☆

غزوہ بدر کے اسباب میں کچھ مورخین نے اہل مکہ کے تجارتی قافلہ میں رکاٹ ڈالنے کی بات کی ہے۔ یہ بات کہاں تک مستند ہے؟

آپ غزوہ بدر پر چلے گئے۔ میں نے تو آج غزوہ بدر کی بات نہیں کی۔ لیکن یہ بات بالکل مستند ہے۔ غزوہ بدر سے پہلے کفار مکہ نے حضور کے خلاف جنگی تیاریوں کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے لشکر کی تیاری کر رہے تھے۔ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالنا دنیا کے ہر بین الاقوامی قانون کے مطابق جائز ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ قریش پر معاشی دباؤ ڈالا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دنیا کے ہر قانون کے مطابق آپ کو یہ حق حاصل تھا۔ اس لئے اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ بعض مصنفین نے اگر اس کو ماننے میں کسی تامل کا اظہار کیا ہے تو میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

☆

جناب مولانا تقی عثمانی صاحب نے شیئرز کے کاروبار کے حوالہ سے بیان کردہ نکات میں ....(سوال پڑھا نہیں جاسکا)۔

نہیں پتہ کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ میں نے تو کبھی یہ لفظ نہیں پڑھا۔ اگر انہوں نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے تو آپ انہی سے پوچھئے۔ مولانا کو خط لکھیں۔ ممکن ہے کوئی نامانوس لفظ ہو یا پرنٹنگ مسٹیک ہو۔ اگر پرنٹنگ مسٹیک نہ ہو تو میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے یہ لفظ نہیں پڑھا۔

☆

ملٹی نیشنل کمپنیوں اور خاص طور پر یہودیوں کی کمپنیوں کی پیداوار سے آج کل بائیکاٹ کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔کیا یہ بائیکاٹ شرعاً جائز ہے؟

میرے خیال میں تو دشمنان اسلام کا اقتصادی مقاطعہ کرنا شرعاً مطلوب ہے اور لازمی ہے۔ایسے ممالک اور اقوام کا ضرور بائیکاٹ ہونا چاہئے۔جو قومیں مسلمانوں کے مقدس شعائر کا لحاظ نہیں کرتیں۔جو قومیں مسلمانوں کی انتہائی محترم شخصیات کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو تحفظ دیں،تو مسلمانوں کو ان کا کم از کم بائیکاٹ تو کرنا چاہئے۔

☆

Explain access in Riba

ربا میں چاہے ایکسس ہو یا نہ ہو،ربا دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ربا وہ ہے جس میں کسی قرض دار یا کسی ایسی رقم پر جو کسی کے ذمہ واجب الادا ہو،کوئی ایسا اضافہ وصول کرنا جو وقت کی توسیع کے مقابلہ میں ہو،وہ ربا کہلاتا ہے۔اس میں اگر ایک فی ہزار اضافہ ہے تو یہ بھی ربا ہے اور اگر اس سے زیادہ ہے تو وہ بھی ربا ہے۔

☆

When gold is exchanged with gold it should be equal in quantity. When gold is exchanged with silver the quantity may vary, but counter values will be exchanged simultaniously. Is it correct?

بات آپ نے صحیح کہی ہے۔اگر یہ دونوں الگ الگ کرنسیاں یا سونا چاندی ہوں تو

ان کا آپس میں لین دین نقد بنیادوں پر کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ سونے کا چاندی کے ساتھ۔ ایک کرنسی کا دوسری کرنسی کے ساتھ یہ اسی حدیث میں اجازت دی گئی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ اسی کے الفاظ ہیں **'فاذا اختلفت الاصناف فبیعوا کیف شئتم'**، جب صنفیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو۔ **'اذا کانت یدا بید'** اگر وہ ہاتھ در ہاتھ ہوں۔

☆

آپ نے ایک حدیث کا تذکرہ فرمایا جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آٹھ لوگوں کو مدینہ سے باہر کسی جگہ ٹھہرنے کو کہا گیا تھا۔ روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ انہیں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اونٹ کا پیشاب دوا کے طور پر استعمال کریں۔ پچھلے مہینے طلوع اسلام رسالہ نظروں سے گزرا۔ اس میں اس واقعہ پر شدید تنقید کی گئی ہے۔

طلوع اسلام منکر حدیث لوگوں کا رسالہ ہے۔ اس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ اس کے پیچھے زیادہ نہ جائیں۔ اسلامی علوم اور بالخصوص علم حدیث سے ناواقف لوگ ہیں اور منکرین حدیث ہونے کے ناطے حدیث کے بارے میں غلط بیانی کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کے مستحق نہیں کہ ان کو جواب دیا جائے۔

☆

خیبر کے یہودی حضرت عمر کے زمانے میں جلاوطن ہوئے نہ کہ رسول اکرم کے زمانے میں۔ اس حدیث کی بنیاد پر کہ عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے۔

خیبر کے یہودیوں میں سے کچھ یہودی جلاوطن ہوگئے تھے۔ کچھ یہودی انہی زمینوں پر رہے۔ جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے مزارعت کی بنیاد پر معاملہ کرلیا۔ فدک کے بھی کچھ لوگ

جلاوطن ہوگئے اور کچھ موجود رہے۔ پھر جو بچ گئے تھے ان کو حضرت عمر فاروق نے جلاوطن کردیا تھا۔

☆

حلف الفضول کی بنیادی باتیں کیا تھیں؟

حِلف الفضول کے دو بنیادی مدیں تھیں کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد کی جائے گی۔ اس حلف کو آپ نے برابر قائم رکھا۔

☆

فتح خیبر میں صرف مہاجرین میں 1800 برابر حصے تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد شاید مواخات ختم کردی گئی، کیونکہ مہاجرین کو کافی حصہ مل گیا۔ تو وراثت مواخات سے الگ ہوگئی۔ ہاں وصیت میں ثلث کی گنجائش رکھی گئی تا کہ مہاجرین اور لے پالک اولاد کو وصیت سے حصہ مل سکے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ربا کو ختم کرنے میں اصل مقصد معیشت میں مساوات کو قائم رکھنا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔

میرے خیال میں آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ربا کا مقصد یہ ہے کہ معیشت میں لوگوں کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ کسی شخص کو وسائل کی بنیاد پر دوسروں کو محروم کرنے موقع نہ ملے۔ ہر شخص کو کاروبار اور تجارت کی آزادی ہو۔ اس حد تک حرمت ربا کا نظام آزادی دیتا ہے۔

☆

سرکار دوعالم ﷺ کی انفرادی معیشت کا سوال جو گزشتہ نشست میں اٹھایا گیا تھا۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی معاشی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ بلکہ زیادہ بہتر الفاظ میں تین دور ہیں۔ ایک وہ دور جو نبوت سے پہلے یعنی آپ کی عمر مبارک کے چالیس سال ہونے تک تھا۔ دوسرا دور وہ تھا جب آپؐ نبوت ملنے کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام فرما تھے۔ تیسرا دور وہ تھا جب آپ مدینہ تشریف لے آئے۔

حضور ﷺ اپنی نوجوانی میں مکہ مکرمہ کے ایک نہایت دیانت دار تاجر کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ الصادق الامین آپ کا لقب تھا۔ لوگ حضورؐ کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا پسند کرتے تھے۔ بہت سے صحابہ اور دوسرے لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ وہ حضور ﷺ کے کاروبار میں شریک تھے۔ کئی لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد گواہی دی کہ ہم حضور کے کاروبار میں شریک تھے۔ اور جو دیانتداری انہوں نے آپؐ میں دیکھی وہ بے مثال تھی۔

تجارت اور کاروبار کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے عرب کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ تجارت اور کاروبار کے لئے مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔ حضرت خدیجہ کے سامان تجارت کے ساتھ بھی حضور نے مضاربت فرمائی۔ حضرت خدیجہ اپنا سامان لوگون کو تجارت کے لئے دیا کرتی تھی۔ ان کا پیسہ لے لوگ تجارت کے لئے جایا کرتے تھے اور نفع میں شامل ہوتے تھے۔

حضرت خدیجہ نے جب حضور کی دیانت داری اور مہارت کا شہرہ سنا تو خود درخواست کی کہ میرا سامان بھی آپ لے جائیں۔ اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ بھیجا۔ میسرہ نے جب حضور کی مزید خوبیاں بیان کیں تو سیدہ خدیجۃ الکبریٰ نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شادی کی یہ تجویز انؓ کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے بعد حضور ان کے کاروبار کی بھی نگرانی کرتے اور اپنے کاروبار کی بھی۔ حضور نے کپڑے کا کاروبار بھی کیا ہے۔ حضور کے چچا ابوطالب کی مکہ مکرمہ میں دکان تھی جس میں کپڑا اور عطر دو چیزیں بکتی تھیں۔ حضور نے ان کی دکان کی نگرانی بھی کی۔ یہ سارا سلسلہ نبوت تک جاری رہا۔ نبوت کے بعد حضور نے کاروبار کی اکثر ذمہ داری حضرت زید بن حارثہ اور اپنے دو اور ملازمین یا غلاموں کے سپرد کر دی۔ حضور کا بیشتر وقت دعوت و تبلیغ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا اور وہ لوگ حضور کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ایسی مثالیں بھی اکا دکا ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کو اس کاروبار کی کبھی کبھی

نگرانی کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ یہ حضرات انتہائی دیانت داری کے ساتھ حضور ﷺ کے اس کام کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ جب حضور مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اپنا سارا کاروبار، مکان، گھر اور حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کا مکان ساری چیزیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جو مکہ مکرمہ میں لوگوں نے قبضہ میں لے لیں۔ حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کے بارہ میں وضاحت ملتی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی ساری جائیداد اور مکانات پر قبضہ کرلیا۔ اور یہ چیزیں دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ، آپ اپنے مکان میں ٹھہریں گے یا فوج کے ساتھ خیمے میں ٹھہریں گے۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لئے مکان چھوڑا کہاں ہے جو ہم وہاں جا کر ٹھہریں۔ تو حضور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمے میں ہی قیام فرمارہے۔ کبھی کبھی اپنے چچا کے گھر والوں سے ملنے ان کے مکان میں تشریف لے جاتے۔ ایک آدھ مرتبہ دوپہر کے وقت وہاں آرام بھی فرمایا۔ لیکن عام طور پر حضور کا قیام خیمہ ہی میں رہا۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ابتدائی ایک دو سال تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی مستقل بالذات کاروبار نہیں تھا۔ غالباً مکہ مکرمہ سے سیدنا علی بن ابی طالب آتے وقت کچھ نقد رقم ساتھ لائے تھے، جو حضورؐ نے ان کے سپرد کی تھی اور فرمایا تھا کہ امانتداروں کی امانتیں ادا کرکے بقیہ رقم ساتھ لے آئیں۔ اس کے باوجود یہ ایک دو سال نسبتاً مشکل اور مشقت کے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس مناسب بندوبست ہوگیا۔ جس میں سب سے پہلے بنو نضیر کی جو زمین فتح ہوئی تھی، قرآن پاک کی سورۃ حشر میں اس کے احکام دیئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ اس زمین کا پانچواں حصہ سربراہ ریاست کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے تصرف میں آئے گا۔ چنانچہ حضور نے ان جائداد کے پانچ حصے کرکے چار حصے بیت المال کے قرار دیئے۔ پانچواں حصہ حضور کے ذاتی استعمال کا حصہ قرار پایا جس سے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی مصارف پورے ہوتے رہے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ ازواج مطہرات اور اپنے خاندان کے لوگوں کو اس کی آمدنی سے پورے سال کے اخراجات دے دیا کرتے تھے اور وہ اخراجات ازواج مطہرات اپنے صوابدید سے خرچ کیا کرتی تھیں۔ بعض ازواج مطہرات کا ہاتھ کھلا تھا وہ

بہت جلدی صدقہ وخیرات میں اپنا ذخیرہ سال پورا ہونے سے بہت پہلے ہی ختم کر دیا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انفاق فی سبیل اللہ کا ایک عجیب وغریب جذبہ دیا تھا۔ البتہ حضور کی طرف سے پورا بندوبست موجود تھا۔ سن دو ہجری کے اواخر یا تین ہجری کے اوائل میں یہ بندوبست قائم ہو گیا تھا۔

شروع کے دو سال جس طرح کہ باقی صحابہ نے تنگی سے گزارے، حضور نے بھی گزارے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ اپنے لئے کوئی خصوصی انتظام کر لیں اور باقی صحابہ کے لئے انتظام نہ کریں۔ ایک ہنگامی انتظام جو حضور کی ذات کے لئے ہوا تھا وہی انتظام باقی صحابہ کے لئے بھی ہوا تھا۔ اس کی تفصیلات سے ہم سب واقف ہیں۔

یہ تاثر کہ حضور کی پوری زندگی لوگوں کے عطیات پر بسر ہوئی، یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ حضور ﷺ نے دوسروں سے لے کر زندگی گزاری۔ یہ کہنا درست نہیں ہے۔ جن لوگوں نے حضور کی معاشی زندگی پر تحقیق کی ہے انہوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے۔ حضور کسی پر بوجھ بننے کے لئے تو آئے ہی نہیں تھے۔ آپ تو دینے کے لئے آئے تھے۔ دنیا کو دے کر ہی تشریف لے گئے۔ آپ لینے کے لئے نہ آئے تھے نہ کسی سے کچھ لے کر گئے۔

☆

جیسا کہ آپ نے ریاست مدینہ کی معیشت و معاشرت کو بیان کیا۔ پاکستان کو مدنظر رکھ کر ہم اس کو آئیڈیل اسٹیٹ کس طرح بنا سکتے ہیں؟

پاکستان کو آئیڈیل اسٹیٹ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے مقاصد پر اخلاص، جذبہ اور محنت سے عمل کیا جائے۔ جن مقاصد کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا ان کو پورا کیا جائے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے بارہا فرمایا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں اور دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصول آج بھی اسی طرح موثر ہیں جس طرح چودہ سو سال پہلے موثر تھے۔ قائداعظم نے یکم جولائی 1948 کو اپنی زندگی کی جو آخری

تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا کہ دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں نے انسانیت کو مصائب اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اب زمانہ آگیا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو زندہ کیا جائے اور اسلام کی بنیاد پر معیشت اور بنکاری کا ایک نیا نظام قائم کیا جائے تاکہ دنیا کو ان مصائب سے نجات دلائی جا سکے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی یہ وصیت پوری قوم کے لئے ہے۔ ہم سب کو اس کام کے لئے آگے آنا چاہئے۔ میرا اور آپ سب کا فریضہ ہے کہ ہم سب مل کر اس کام کو کریں۔

☆

کیا سودی بنک میں انٹرن شپ جائز ہے؟

میرے خیال میں اگر کسی بنک کے ایسے شعبہ میں آپ کام کریں جو براہ راست سودی معاملات سے وابستہ نہ ہو تو شاید اس کی گنجائش ہے۔ بنک بہت سے کام ایسے کرتے ہیں جو سودی نہیں ہوتے۔ مثلاً بنک ایل سی کھولنے میں مدد کرتا ہے۔ آپ ایمپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کر رہے ہوں تو آپ کو ایل سی کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایل سی کھولنا جائز ہے۔ بنک consultancy کرتا ہے اور لوگوں کو مشورے دیتا ہے۔ کاروباروں کی assesment کرواتا ہے۔ feasability report تیار کرواتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں حصہ لینا میرے خیال میں درست ہوگا۔ جو معاملات ناجائز ہیں ان میں حصہ لینا بھی ناجائز ہوگا۔

☆

جو لوگ ہماری مقدس ہستیوں کی تقدیس کو پامال کرتے ہیں ان کے ساتھ کم از کم بائیکاٹ تو کرنا چاہئے۔ لیکن آپ کی ٹیبل پر نیسلے کی بوتل میں پانی رکھا ہوا ہے۔ اس کا بھی بائیکاٹ ہونا چاہئے کیونکہ یہ بوتل ڈنمارک کی ایک کمپنی نے بنائی ہے۔

یہ پانی جو اس وقت بوتل میں ہے کم از کم یہ نیسلے کا نہیں ہے۔ نل کا عام پانی نیسلے کی

خالی بوتل میں بھرا ہوا ہے۔ یہ مسلے کا نہیں اسلام آباد کا پانی ہے۔ مزید برآں پانی کا یہ بندوبست میں نے نہیں کیا۔

☆

جب ہم اسلامی معاشی نظام کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام نافذ ہونا چاہیئے تو کیا تمام مسائل کے حل کے لئے قرآن وحدیث میں مختلف جگہوں پر جو احکام دیئے گئے ہیں، کسی نے ان کو جمع کیا ہے کہ ہم دکھا سکیں۔

یہ احکام بارہا جمع کئے گئے ہیں۔ ان پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسلامی ریاست کے معاشی تقاضوں پر لوگوں نے تحقیقات کر کے کتب خانے تیار کر دیئے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے نفاذ کے لئے قوانین بھی تیار کئے جا چکے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ تو خوئے بدرا بہانہ بسیار والا معاملہ ہے۔ جو نہ کرنا چاہے اس کے لئے کچھ بھی تیار نہیں ہے، اور جو کرنا چاہیں ان کے لئے سب کچھ تیار ہے۔

☆

اسلام اور اشتراکیت دونوں مساوات فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی فرق بتادیجئے۔ علامہ اقبال نے بھی مساوات کی بات کی ہے۔

اشتراکیت وہ مساوات فراہم کرتی ہے جو جیل خانہ میں تمام قیدیوں کو میسر ہوتی ہے۔ جیل خانہ میں سارے قیدی برابر ہوتے ہیں۔ سب کو دو وقت کی دال روٹی ملتی ہے۔ سب کو کوٹھے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اسلام جس مساوات کا درس دیتا ہے وہ آزادی، تحفظ اور عزت کے ساتھ ہے۔ جو مساوات آزادی اور عزت کے ساتھ نہ ہو وہ مساوات نہیں ہے۔ پھر مساوات میں آپ نے علامہ اقبال کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ اقبال اشتراکیت سے متاثر نہیں تھے۔ کسی نے غلط کہا ہے۔ علامہ اقبال نے تو اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ کارل

مارکس مساوات بطون پر مساوات قلوب و اذہان کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو غلط ہے۔

☆

نبی علیہ السلام نے مسلمانوں کے لئے الگ بازار بنایا لیکن آج کے دور میں مسلمانوں کے لئے الگ بازار بنانا چاہئے یا اصل مارکیٹ میں کاروبار کرنا چاہے؟

حضور نے مسلمانوں کے لئے اس وجہ سے علیحدہ بازار بنایا تھا کہ یہودی اپنے بازار میں مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیتے تھے۔ آج کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی یہی حال ہے۔ مسلمان ممالک کو اپنی انٹرنیشنل مارکیٹ الگ بنانی چاہئے اور مسلمانوں کو انٹرنیشنل مارکیٹ کی محتاجی سے آزاد کرانا چاہئے۔ یہ آزاد مسلم ممالک اور خاص طور پر باوسیلہ مسلم ممالک کا فرض ہے کہ وہ یہ کام کریں۔

☆

اگر کوئی شخص دوسرے کو قرض دیتا ہے اور وہ سود نہیں لیتا تو time value of money کے تصور کے مطابق اس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ تو قرض دینے والے کے نقصان کی تلافی کیا ہے؟

دیکھئے! اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی تو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ اسلام نے اس کمی بیشی کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ جب لوگ جو اور کھجوریں قرض دیا کرتے تھے تو جس زمانے میں کھجوروں کی فصل آنے میں دیر ہوتی تھی تو کھجوریں مہنگی ہو جاتی تھیں اور فصل پہنچنے کے بعد سستی ہو جاتی تھیں۔ لیکن کھجور کی قیمتوں میں کمی بیشی سے قطع نظر آپؐ نے اس کی مقدار کو برابر رکھنے کا حکم دیا کہ جتنا لیا ہے اتنا ہی دو۔ جتنا لیا ہوا اس سے زیادہ نہ دینے کی اجازت ہے نہ لینے کی۔ قیمتوں میں کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے۔

ایک اور بات یاد رکھئے کہ قرآن مجید کا ایک اصول ہے 'لا تزر وازرة وزر اخرى'

کوئی شخص دوسرے کی غلطی کا بوجھ اٹھانے کا مکلف نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی چیز یا کرنسی کی قیمت کم ہورہی ہے تو کیا وہ قرض لینے والے کی کسی کمزوری یا غلطی سے کم ہورہی ہے؟ اگر وہ قرض نہ لیتا تو کیا قیمت کم نہ ہوتی۔ جب قیمت کم ہونے میں قرض لینے والے کی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو وہ کیوں اس کا تاوان دے۔ اگر آپ کے پاس آج سو روپے ہیں اور دس سال کے بعد اس سو روپے کی قیمت پچاس روپے رہ جائے گی تو اگر یہ سو روپے آپ کے گھر میں ہوتے تو تب بھی قیمت میں یہ کمی ہوتی اور اگر آپ نے کسی کو قرض دے دیئے تو تب بھی اس میں یہ کمی ہونی تھی۔ اس میں قرض لینے والے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ چونکہ قیمت قرض لینے سے کم نہیں ہوئی اس لئے قرض دار پر کیوں تاوان ڈالا جائے۔ یہ قرآن پاک کے اصول کے خلاف ہے۔

پھر اسلام کا ایک اصول ہے 'الخراج بالضمان'، جس چیز کا آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس چیز کا نقصان بھی آپ کو اٹھانا چاہیے۔ تو اگر inflation کی بجائے deflation ہو جائے ،تو کیا قرضدار اصل رقم سے کم لینے کو تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ جس طرح پاؤنڈ اسٹرلنگ میں deflation ہوئی ہے۔ 1984 میں پونڈ اسٹرلنگ 17 روپے کا تھا آج 117 روپے کا ہے۔ تو اگر اس زمانے میں کسی نے پونڈ اسٹرلنگ میں قرض لیا ہوتا تو کیا قرض دینے والا اس کے لئے تیار تھا کہ وہ سترہ روپے کے حساب سے آج اپنا قرض وصول کر لے۔ کیا جس نے اس وقت ایک ہزار روپے کی مالیت کے اٹھاون پونڈ دیئے تھے وہ آج کے ماحول میں نو دس پونڈ لینے پر تیار ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی قرض دینے والا اس کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ تو اگر تفریط زر کی شکل میں ہونے والا کوئی نقصان وہ اٹھانے کو تیار نہیں ہے تو افراط زر کی صورت میں فائدہ اٹھانے پر کیوں مصر ہے؟

یہ معاملہ شریعت کے بہت سارے اصولوں سے ٹکراتا ہے۔ پھر اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ افراط زر کو دور کرنے کے بجائے اس کے نام پر سود کا راستہ کھول دیں۔ آپ افراط زر کو روکیں۔ بعض ممالک نے یہ کام کامیابی سے کیا ہے۔ اس کے معاشی طریقے ہیں۔ برازیل، ارجنٹینا اور سعودی عرب میں کامیابی سے روکا گیا ہے۔ سعودی عرب میں روپے پیسے کی اتنی ریل پیل اور بہتات کے باوجود میں پچھلے تیس سال کا ذاتی تجربہ بتاتا ہوں۔ میں گزشتہ تیس سال سے تقریباً ہر سال دو تین مرتبہ سعودی عرب جاتا ہوں۔ تیس سال پہلے چائے کی ایک

پیالی کی قیمت ایک ریال تھی۔ آج بھی ایک ریال ہے۔ تیس سال پہلے ٹھنڈے مشروب کا ڈبہ ایک ریال میں ملتا تھا، آج بھی ایک ہی ریال میں ملتا ہے۔ جو چیز تیس سال پہلے جس قیمت پر ملتی تھی آج بھی اسی قیمت پر ملتی ہے۔ وہاں کیوں افراط زر نہیں ہوا؟ لوگ کہتے ہیں کہ پیسے کی کثرت سے افراط زر ہوتا ہے، لیکن سعودی عرب میں ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی پالیسیوں سے اس کو کنٹرول کیا ہے۔ ہمارے ہاں چیزوں پر کنٹرول نہیں ہے۔ حکومتیں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور ان کی اصلاح کی بجائے ان کے نتائج بد کا ملبہ شریعت پر ڈالنا چاہتی ہیں۔ کوتاہی حکومت کی ہے۔ مالیاتی پالیسی حکومت کی ناکام ہوئی ہے لیکن اس کا ملبہ شریعت پر ڈالنا چاہتے ہیں کہ شریعت نے inflation کے اس خودساختہ حل کو حرام قرار دیا ہے ورنہ ہم یہ کر دیتے اور وہ کر دیتے۔

☆

سود اسلام میں منع ہے جبکہ ایک ملازم کی تنخواہ بنک میں آتی ہے تو وہ ملازم جس ادارہ میں ملازمت کرتا ہے وہ بھی بنک سے ٹرانزیکشن کرتا ہے تو اس صورت میں اسلام کیا کہتا ہے؟

اسلام یہ کہتا ہے کہ آپ کی تنخواہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ بلا جھجک بنک سے تنخواہ وصول کریں۔ بنک ہی میں اپنا اکاؤنٹ رکھیں۔ گھر میں رکھنا غیر محفوظ ہے۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جو جائز ہے۔ اس کے بدلے میں بنک آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔ اس لئے اگر آپ کو یہ تامل ہو کہ موجودہ پی ایل ایس اکاؤنٹ شریعت کے ساتھ سو فیصد مطابق نہیں ہے تو آپ کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنا پیسہ رکھیں۔

☆

مسلمانوں کے بازار آباد کرنے کے لئے حضور نے بہت سے اقدامات کئے۔ ان میں ایم این سیز (ملٹی نیشنل کمپنیوں) کا کیا رول تھا۔ کیا ہمیں ان کی مصنوعات نہ خرید کر انہیں اس طرح نقصان پہنچانا چاہئے؟

بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں میں جن سے آپ لاتعلق رہ سکتے ہیں ان سے لاتعلق رہنا چاہئے۔ ان کے بجائے مسلمانوں کی اپنی کمپنیوں کو موقع دینا چاہئے۔ مسلمان تاجر اور ممالک اگر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور باہمی تجارت میں حصہ لیں گے تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کردار اسلامی ممالک میں کم ہو جائے گا۔

☆

کیا یہ صحیح ہے کہ یہودی صرف وہ ہوتا ہے جس کو یہودی ماں نے جنم دیا ہو؟

جی ہاں یہ بالکل درست ہے۔ لیکن یہودیت کی تاریخ میں بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جنہوں نے یہودیت کو اختیار کیا۔ عربوں میں کئی قبائل نے یہودیت اختیار کی۔ عرب کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے یہودیت اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہودی سمجھے جانے لگے۔ آج یہ تعین کرنا کہ سائبیریا سے لے کر امریکہ تک جتنے یہودی ہیں وہ سارے یہودی ماؤں کی اولاد ہیں، یہ بڑا مشکل ہے۔

☆

محترم نعیم صدیقی نے احابیش کا ذکر کیا ہے یہ کون تھے اور اس سے کیا مراد ہے؟

احابیش سے مراد بعض غیر قریشی قبائل کا ایک مجموعہ تھا جو مکہ مکرمہ کے باہر آباد تھا۔ قبیلہ قریش سے ان کا معاہدہ تھا۔ ان کا سردار ابن الدغنہ قبیلہ قریش میں اثر رسوخ رکھتا تھا، یہ لوگ احابیش کہلاتے تھے، مکہ کے باشندے تھے، لیکن قریش میں شامل نہیں تھے۔

☆

کیا بنک کی کمائی حلال ہے؟

بنک کے ان شعبوں کی کمائی جہاں براہ راست سودی کاروبار نہیں ہوتا، قابل اعتراض

معلوم نہیں ہوتی۔ شریعت میں اس کی گنجائش ہے۔

☆

کیا ہم اسلام کے اقتصادی نظام کو controlled capitalism کہہ سکتے ہیں؟

اصطلاح کی بات ہے۔ اگر آپ یہ اصطلاح استعمال کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن کنٹرول کی تعریف کی ضرورت ہوگی کہ اس سے کیا مراد ہے؟ what shall be the extent of the control?, what would be the kind of the control?, who will control and under what law? کنٹرول اگر شریعت کے مطابق ہوگا تو ٹھیک ہے۔ لیکن کنٹرولنگ اتھارٹی اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو اس کو اسلامی اکانومی کہنا مشکل ہوگا۔

Free Access to market کے حوالہ سے سوال ہے کہ آج کل مختلف حوالوں سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات پر پابندیوں کا مطالبہ کیا جارہا ہے؟ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ کہاں تک درست ہے؟

یہ اس لئے درست ہے کہ جن ممالک کی کمپنیوں کے بائیکاٹ کا مطالبہ کیا جارہا ہے یہ وہ ممالک ہیں جو مسلمانوں کے خلاف ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسرائیل کو لبنان میں مظالم کا آج بیسواں دن ہے، سینکڑوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں، آج تک اسرائیل کی مذمت تو کیا کرتے، ان ممالک نے اسرائیل کی تائید میں بھی کمی نہیں کی۔ اس لئے جو ہمارے بھائیوں کا خون بہا رہے ہوں۔ جو دن رات ہمارے بھائیوں کو قتل کررہے ہوں، وہ ان کی تائید کررہے ہوں اور ہم ان کا اتنا بھی بائیکاٹ نہ کریں، میرے خیال میں یہ تو غیرت کا کم سے کم درجہ ہے۔

برکات احمد قادیانی کی کتاب کا نام بتادیں۔

Muhammad and the Jews of Madina

☆

کیا نبی ﷺ نے یہ وصیت کی تھی کہ مدینہ کی آبادی بڑھ جائے تو اس کے قریب نئے شہر بسانا؟

یہ میں نے سنا ہے لیکن حدیث کی کسی کتاب میں یہ حوالہ نہیں پڑھا۔ سچی بات یہی ہے کہ یہ حوالہ میں نے علامہ اقبال کی سوانح عمری میں پڑھا ہے جس میں لکھا ہے کہ جب علامہ اقبال مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے تو گفتگو کے دوران انہوں نے مسولینی سے یہ حدیث بیان کی اور کہا کہ جب آبادی ایک حد سے بڑھ جائے مثلاً 25 ہزار، تو نیا شہر بسانا۔ مسولینی یہ سن کر اچھل پڑا تھا اور علامہ اقبال سے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے۔

علامہ اقبال نے اس بات کو بطور حدیث کہیں پڑھا ہوگا۔ میرے علم میں نہیں۔ میں نے حضرت عمر فاروق کے حوالہ سے پڑھا ہے۔ جب کوفہ اور بصرہ نئے شہر آباد کئے گئے تو انہوں نے کہا تھا کہ جب یہ آبادی 25 ہزار سے بڑھ جائے تو پھر مزید لوگوں کو وہاں نہ بسایا جائے بلکہ نیا شہر آباد کیا جائے۔

☆

جب سود کو حرام قرار دیا گیا تو سود کی وہ رقمیں جو کفار کی تھیں اور مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھیں تو ان کا کیا معاملہ ہوا؟

سود کو تین مراحل میں حرام قرار دیا گیا تھا۔ پہلے مرحلہ میں سابقہ واجب الادا دعاوی ادا کئے جاتے تھے اور وصول بھی کئے جاتے تھے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کیا تھا کہ آج سے تمام سابقہ سودی دعاوی کالعدم ہیں اور سب سے پہلے جس سود کو میں کالعدم قرار دیتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ اس وقت

سے سابقہ سودی دعاوی سابقہ کی ممانعت کر دی گئی، چاہے مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے ہوں۔

سود کو ایک دم اس لئے حرام قرار نہیں دیا گیا کہ لوگوں کے مالی معاملات میں کئی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ کئی کئی سالوں کے معاہدے چل رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس کو بیک جنبش قلم منع کر دیں گے تو اس سے بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے اور لوگوں کے لئے مشکلات کا سبب بنیں گے۔ اور بہت سے لوگوں کے لئے معاشی نقصان کا برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا کہ

اگر جان طلبی مضائقہ نیست
اگر زر طلبی سخن درین است

اگر جان مانگتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، دینے کو تیار ہوں۔ پیسہ مانگتے ہو تو سوچنا پڑے گا۔

میرے خیال میں جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کا سر دست کوئی اور متبادل نہیں ہے۔ اب اسلامی بنک بن رہے ہیں۔ کچھ بن چکے ہیں آپ اپنا پیسہ ان میں رکھوا دیں۔

☆

سیدنا معاذ کی تحکیم کو کیا حضور کی تائید حاصل تھی؟ کیا یہ تحکیم کتاب اللہ کے مطابق تھی یا تورات کے؟ کیا قانون سازی کے لئے اس فیصلہ کو ماخذ کے طور پر لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قرآن پاک کا حکم یہ ہے کہ اگر غیر مسلم تمہارے پاس اپنا فیصلہ کرانے کے لئے آئیں تو تمہارے سامنے تین راستے ہیں۔ یا تو اس کا فیصلہ قرآن پاک کے مطابق کر دو۔ یا فیصلہ کرنے سے معذرت کر دو اور کہہ دو کہ میں تمہارے جھگڑوں کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یا ان کے اپنے

قانون کے مطابق فیصلہ کرو۔ تینوں صورتیں درست ہیں۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے اس واقعہ میں اُن کے اپنے یہودی قانون کے مطابق فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ تورات کے مطابق تھا اور یہ حکم تورات میں شروع سے چلا آرہا تھا۔ آج بھی یہ حکم تورات میں موجود ہے۔ اس لئے یہودیوں پر یہودیوں کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا گیا۔ جو قرآن پاک کے اس حکم کی تعمیل تھی 'فلیحکم علی الانجیل بماانزل اللہ فیہ'، اہل انجیل انجیل کے مطابق فیصلہ کریں۔ اہل تورات تورات کے مطابق فیصلہ کریں۔ توراتیوں پر تورات کے مطابق فیصلہ کرنا میرے خیال میں مناسب تھا۔ پھر یہ معاملہ ثالثی اور تحکیم کا تھا، کوئی عدالتی فیصلہ نہ تھا۔

☆

عرب معاشروں میں بت پرستی کیوں رواج پائی؟

میں نے عرض کیا ہے کہ عرب معاشرہ طویل عرصہ تک ملت ابراہیمی پر قائم رہا۔ بعد میں عمرو بن لحی نام کے ایک شخص نے مکہ مکرمہ میں بت پرستی کو رواج دیا اور پھر ایک ایک کر کے بت پرستی وہاں آتی گئی اور ملت ابراہیمی کے آثار ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔

☆

کسی مکان کو کرائے پر یا ایک خاص رقم کو سود پر دیا جائے تو دونوں میں کیا فرق ہے؟ (بی بی اے کا ایک طالب علم)

کیا آپ کو بی بی اے میں یہی پڑھاتے ہیں؟

سود کے یہ معنی نہیں کہ جہاں بھی جس چیز پر بھی زائد رقم وصول کی جائے وہ سود قرار دے دیا جائے۔ کرایہ مکان اور سود دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ آپ اس چیز کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس چیز کا نقصان بھی آپ اٹھا سکیں۔ ابھی میں نے حدیث عرض کی کہ الخراج بالضمان۔ جب آپ کسی کو سود پر قرض دیتے ہیں تو آپ کی اصل رقم بالکل محفوظ رہتی ہے۔ اگر مقروض کے گھر چوری ہو جائے، ڈاکہ پڑ جائے یا سیلاب آجائے تو آپ کی رقم آپ کو ہر صورت میں واپس ملے گی۔ آپ اس نقصان

کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ لیکن جب آپ کوئی چیز کرائے پر دیتے ہیں۔ آپ کار خرید کر ٹیکسی کے طور پر کرائے پر دے دیں تو اس کا جو وئر اینڈ ٹیئر ہوگا، حادثہ ہوگا، خرابی ہوگی اور مسائل ہوں گے، وہ سارے تاوان آپ کے ذمہ آئیں گے، آپ اس کے نقصان کے ذمہ دار ہیں اس لئے آپ اس کا فائدہ کرایہ کی صورت میں لے سکتے ہیں۔

مکان جب آپ کرائے پر دیتے ہیں تو استعمال سے وہ پرانا بھی ہوگا۔ اس کی چیزیں بھی استعمال ہوں گی۔ اس میں خرابی بھی پیدا ہوگی۔ آپ کو اس میں وقتاً فوقتاً کام بھی کرنا پڑسکتا ہے۔ مرمت بھی ہوگی۔ مکان کا ٹیکس بھی ادا کرنا ہوگا۔ زلزلہ میں گر گیا تو نقصان بھی ہوگا۔ یہ سارا نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے آپ اس کے فائدے کے بھی حقدار ہیں۔

☆

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں بلند وبالا گھر بنانے کی جو ممانعت فرمائی کیا اس میں دوسری عمارتیں بھی شامل ہیں؟

اس زمانے میں دوسری عمارتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ گھر ہی بناتے تھے اور گھروں کے علاوہ کوئی اور تجارتی دفتر یا عمارتیں بنانے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے ہدایات گھروں ہی کے بارہ میں دی گئیں کہ رہائش سادہ ہونی چاہئے۔ سادگی کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق ہوگا۔ سادگی کا ایک تصور اسلام آباد میں ہے۔ ایک تصور ان قصبوں میں تھا جو آج سے پانچ سو سال پہلے یہاں آباد تھے۔ جس زمانے اور علاقے میں آپ ہیں اس کے لحاظ سے سادہ عمارتیں ہونی چاہئے۔ پیسے اور دولت کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی اس پابندی کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔

☆

شراب پر پابندی کے باعث لوگ اس کو ترک کرتے گئے اور یہودیوں کو خسارہ کے باعث اس کاروبار کو ترک کرنا پڑا۔ کیا حضور نے شراب کشید کرنے والوں کو از خود نہیں روکا؟

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو شراب رکھنے اور پینے کی اجازت ہے۔ وہ شراب بنا بھی سکتے ہیں۔ آپس میں اس کا لین دین بھی کر سکتے ہیں۔ اسلام اس کی ممانعت نہیں کرتا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو، جن میں شراب بنانے والے کم تھے، لیکن آپ ؐ نے ان کو بھی شراب بنانے سے نہیں روکا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مارکیٹ ختم ہوگئی تو ان کا کاروبار بھی ختم ہوگیا۔ لیکن مدینہ منورہ سے باہر جہاں یہودی اور عیسائی آبادیاں تھیں، عیسائیوں میں زیادہ اور یہودیوں میں کم شراب کا کاروبار جاری تھا۔ وہ شراب رکھ سکتے تھے، پی سکتے تھے اور بیچ بھی سکتے تھے۔ آج بھی رکھ سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں بعض حضرات خواہشمند کاروباری حضرات کو نقد رقم دیتے ہیں جس پر انہیں پہلے سے طے شدہ منافع دیا جاتا ہے......

یہ جائز نہیں ہے۔ طے شدہ منافع ہی تو سود ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کہے کہ اس وقت میں ایک یا دو ہزار روپے ماہوار دوں گا اور سال کے ختم ہونے پر جب کاروبار کا سالانہ حساب کریں گے تو اس وقت یہ معاملہ بھی طے کر کے حساب برابر کردیں گے۔ یہ جائز ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ پورا سال نفع کا انتظار کریں اگر پہلے سے کوئی رقم بطور ایڈوانس کے ملتی رہے، وہ متعین رقم بھی ہوسکتی ہے اور سال کے اخیر میں فی صد کے حساب اس کا حساب صاف کرلیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن متعین رقم لینا سود ہے۔

ربا الفضل میں، جو حدیث میں آیا ہے، جس میں چھ چیزوں کا ذکر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ ان چیزوں کی کوالٹی برابر ہو؟

معیار ایک جیسا ہو یا نہ ہو لیکن مقدار ایک ہونی چاہئے۔ کوالٹی تو برابر نہیں ہوتی تھی۔ جب کمی بیشی ہوتی تھی تو چیزوں کی کوالٹی ہی کے فرق کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ اس کی حضور نے

ممانعت فرمادی۔

☆

موجودہ بنکاری کے ہوتے ہوئے سود سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

بالکل بچا جا سکتا ہے۔ سود سے بچنے کی شکل یہی ہے کہ آپ سودی کاروبار میں پیسہ نہ لگائیں۔ حتی الامکان سود میں ملوث نہ ہوں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جو سود سے بچنا چاہے وہ بھی سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ تو آج کل وہی زمانہ ہے۔ سود کے غبار سے بچنا مشکل ہے۔ اس کے لئے وہ کام کریں جو امام مالک نے کیا تھا۔

امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ آپ تو بڑے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ حالانکہ اہل اللہ تو بہت سادہ ہوتے ہیں۔ (لوگ بھی طرح طرح کے سوال پوچھ لیتے ہیں۔ امام مالک جیسی بزرگ شخصیت کو بھی نہیں چھوڑا۔) انہوں نے کہا کہ **نفعل ونستغفر**، کہ جی غلطی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتے ہیں۔ تو اگر غبار آپ تک پہنچتا ہو تو **نفعل ونستغفر** پر عمل کریں۔

☆

حضرت عمر کے دور میں حالات اتنے اچھے ہو گئے کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ رہا۔ تو انہوں نے کیا طریقہ معیشت اختیار کیا تھا؟ اور ایسی اچھی حالت حضور اکرمؐ اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں کیوں نہیں آئی؟

بڑے کاموں کے اثرات کو ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پورا دس سالہ مدنی دور اصلاحات کا دور ہے۔ آپؐ نے ایک ایک کر کے تدریجی اصلاحات فرمائیں۔ آخری اصلاح ربا کے دعاوی کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد اس کے ثمرات ایک ایک کر کے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق کا تو دو سال کا زمانہ ہے، حضرت عمر

کے زمانہ میں یعنی حضور کی ان اصلاحات کے آٹھ دس سال بعد ان کی برکات اور ثمرات آنا شروع ہو گئیں۔ آج بھی جب آپ یہ اصلاحات مکمل کرلیں گے تو اس کے ثمرات سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔

کیا اسٹاک ایکسچینج کا تصور نبی کریم ﷺ کے دور میں تھا؟

میرے خیال میں تو نہیں تھا۔ اسٹاک ایکسچینج تو کارپوریٹ فنانسنگ کی ایک شکل ہوتی ہے۔ کارپوریٹ فنانسگ کا یہ تصور اس زمانے مین نہیں تھا۔ collective financingالبتہ ہوتی تھی۔ لیکن کارپوریٹ فنانسنگ کا تصور نیا ہے۔ اس میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ تین چار قواعد کی پابندی کی جائے تو اس کو شریعت کے مطابق چلایا جا سکتا ہے۔

حضور کے دور کے یہودیوں کا موجودہ دور کے یہودیوں سے
موازنہ کیا جائے تو کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟

یہی مماثلت اور موافقت پائی جاتی ہے کہ جو حرکتیں وہ حضور ﷺ کے دور میں کرتے تھے آج بھی کرتے ہیں۔ مسلمانوں سے دشمنی اور ان کے خلاف منفی عزائم اُس وقت بھی رکھتے تھے، اور آج بھی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے تسلط میں رکھنا چاہتے ہیں۔ سازشی لوگ ہیں۔ یہ ہر زمانے میں کرتے آئے ہیں۔ آج بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

☆

مسلمانوں کو یہودیوں کے معاشی تسلط سے آزادی کے لئے
کیا راہ اختیار کرنی چاہیے؟

وہی راہ جو حضور علیہ السلام نے اختیار کی۔ امام مالک نے فرمایا تھا کہ 'لا یصلح آخر

ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا، جس طریقہ کار سے اس امت کے آغاز میں میں اصلاح ہوئی تھی اسی طریقہ کار سے انتہا میں بھی اصلاح ہوگی۔ اس لئے وہی طریقہ اختیار کریں۔

☆

مدینہ منورہ میں کرنسی کا نظام کیسا تھا؟

مدینہ منورہ میں پیپر کرنسی تو نہیں تھی۔ سونے چاندی اور درہم و دنانیر کا نظام تھا۔ دنانیر کا پیمانہ حضور نے مقرر کردیا تھا کہ یہ مکہ کے معیار کے مطابق قبول کئے جائیں گے۔

☆

غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب کیا تھے؟

غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب یہ تھے کہ خیبر کے یہودیوں نے کفار مکہ کا ساتھ دیا تھا۔ غزوہ احزاب کے بڑے حصہ کے اخراجات برداشت کئے تھے۔ اس لئے ان کے معاشی زور کو توڑنا ضروری تھا۔

☆

حضور کے زمانے میں کونسی زبان بولی جاتی تھی؟

حضور کے زمانے میں عربی بولی جاتی تھی۔ وہی زبان جس میں ابھی ایک بچے نے سوال کیا ہے۔ بالکل یہی زبان بولی جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں بھی عربی بولی جاتی تھی۔ حضور کے زمانہ سے تقریباً ساڑھے تین چار سو سال پہلے سے وہاں عربی زبان بولی جاتی تھی۔ حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ سے ساڑھے تین سو سال پہلے تک کے اشعار محفوظ ہیں۔ لبنان کے ایک صاحب علم نے آج سے دس بارہ سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے قدیم ترین عربی اشعار کا نمونہ جمع کیا تھا۔ اس میں قدیم ترین اشعار حضور کی ولادت مبارکہ سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کے ہیں۔ غالباً 240 عیسوی کے اشعار ہیں۔ ان میں سے ایک شعر ہے۔

اذا الجوزاء اردفت الثریا

ظننت بآل فاطمة الظنونا

یہ جوزا اور ثریا برجوں اور ستاروں کے نام ہیں۔ ہر ہفتہ کو اخبارات میں یہ شرکیات چھپی ہوتی ہیں کہ آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا۔اس میں جوزا اور ثریا کے نام بھی ہوتے ہیں۔ فاطمہ نام بھی بہت عام ہے۔یہی زبان بولی جاتی تھی۔

☆

آٹھواں خطبہ

کلامیات سیرت

آٹھواں خطبہ

کلامیات سیرت

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

قابل احترام جناب ڈاکٹر خالد مسعود
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی
برادران محترم
اور خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا عنوان ہے کلامیات سیرت۔ کلامیات سیرت سے مراد وہ موضوعات ہیں جو اصلاً علم کلام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سیرت کے واقعات یا سیرت کے حقائق سے ان کا گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ اسی طرح کلامیات سیرت میں وہ واقعات بھی شامل ہیں جو اصلاً سیرت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے معانی اور مطالب کو سمجھنے کے لئے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیرت کے بعض اہم واقعات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو علم کلام سے تعلق رکھتے ہیں اور علم کلام کے میں مباحث میں گئے بغیر ان سے واقفیت دشوار ہے۔ یہ مشترک موضوعات جو علم کلام اور سیرت دونوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو کلامیات سیرت کے عنوان سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

اس موضوع پر مفصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان اہم مسائل کی

نشان دہی کردی جائے جو سیرت نبوی کے سیاق وسباق میں زیر بحث آتے ہیں اوران کی نوعیت کلامی مسائل کی ہے یا اب ہوگئی ہے، وہ اہم مسائل اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں:

۱۔ نبوت ورسالت کی حقیقت اور ضرورت
۲۔ نبی اور رسول کے فرائض اور ذمہ داریاں
۳۔ وحی کی حقیقت، ضرورت اور اقسام
۴۔ دیگر ذرائع علم
۵۔ ختم نبوت اور حقیقت محمدیہ
۶۔ خصائص نبوی وفضائل نبوی
۷۔ کلام الٰہی کی حقیقت اور مسئلہ خلق قرآن
۸۔ معجزات رسول
۹۔ معراج رسول
۱۰۔ معراج اور اسراء
۱۱۔ مسئلہ عصمت انبیاء
۱۲۔ بشائر الانبیاء یا شواہد نبوت

آج کی مختصر مجلس اور محدود وقت میں ان سب موضوعات پر مفصل گفتگو تو ممکن نہیں۔ البتہ ان میں سے نسبۃً زیادہ اہم موضوعات کا عمومی تعارف کرایا جاسکتا ہے۔

جب سیرت نگاروں نے سیرت کی ترتیب وتدوین کا کام شروع کیا اور اس کا ایک ابتدائی مرحلہ مکمل ہوگیا، جس کا ہم گزشتہ ایک گفتگو میں جائزہ لے چکے ہیں، تو تقریباً دو سو سال کے سلسلہ تصنیف وتالیف کے بعد، دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مطالعہ سیرت کی ایک نئی جہت سمت سامنے آئی۔یعنی سیرت کے واقعات اور موضوعات کا کلامی اور عقلی انداز سے مطالعہ کیا جانے لگا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ ان دنوں یونانی علوم وفنون کا بڑے پیمانے پر عربی زبان میں ترجمہ شروع ہوا۔ مسلمان اہل علم نے یونانی منطق اور فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کا مطالعہ کیا اور بہت سے معاملات پر یونانی نقطہ نظر سے، یونانی اسلوب تفکیر اور یونانی انداز استدلال سے غور وخوض کرنا

شروع کیا۔ انہی دنوں غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ ساتھ مسلمان دانشوروں کا ایک خاصا بڑا طبقہ بھی یونانی منطق اور یونانی علوم وفنون سے متاثر ہوا۔

اس طبقہ کی طرف سے جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، بہت سے ایسے سوالات اسلام کے عقائد کے بارے میں اٹھائے گئے جن کا جواب یونانی اسلوب استدلال کو اختیار کیئے بغیر دینا مشکل تھا۔ اس لئے علمائے اسلام نے یونانی منطق اور علوم وفنون سے واقفیت پیدا کی اور یونانیوں کے اسلوب استدلال کے مطابق اسلامی عقائد کو بیان کرنے اور اسلامی عقائد پر کیئے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ان حالات میں ان حضرات نے جو سیرت نگاری کی مقدس مہم سے وابستہ تھے، یہ محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ سیرت کے عام تاریخی، فقہی اور قانونی پہلوؤں کے علاوہ، سیرت کے ان پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے جن کا تعلق عقائد اور علم کلام کے مسائل سے ہے۔

اس کام کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت کے دلائل اور شواہد پر جب غور وخوض اور تصنیف وتالیف کا آغاز ہوا، اور دوسرے انبیائے کرام کے معجزات اور ان کے لائے ہوئے شواہد ودلائل سے حضور کے شواہد ودلائل کا مقابلہ کیا گیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس مضمون کو زیادہ موثر اور زیادہ واضح انداز میں بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نبوت، رسالت اور وحی والہام پر خالص عقلی نقطہ نظر سے بھی غور کیا جائے اور ان لوگوں کے اطمینان قلب کے لئے عقلی دلائل بھی مرتب کیئے جائیں جو محض قرآن وسنت کے دلائل کی بنیاد پر شرح صدر یا اطمینان قلبی محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر آئندہ ایک طویل عرصہ تک کے لئے یہ موضوعات سیرت کا ایک جزوی حصہ رہے اور اب بھی سیرت کا ایک اہم باب ہیں اور تقریباً ہر بڑے سیرت نگار نے ان مسائل پر گفتگو کی ہے۔

نبوت اور رسالت کی حقیقت کیا ہے؟، نبی اور رسول میں فرق کیا ہے؟، نبی کس کو کہتے ہیں؟، رسول کس کو کہیں گے؟، پھر نبی اور رسول کا ذریعہ علم کیا ہے؟، پھر ذرائع علم کی کتنی قسمیں ہیں۔ وحی اور الہام میں کیا فرق ہے؟، وحی کا ماخذ علم کیا ہے؟، پھر چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خاتم النبیین ہیں، اس لئے ختم نبوت کیا ہے؟ ختم نبوت کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے؟، حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟، وہ امتیازی اوصاف جوان کو عام مسلمانوں سے ممتاز کرتے ہیں وہ کیا ہیں؟ اور وہ امتیازی اوصاف جوان کو دوسرے انبیائے کرام سے ممیز کرتے ہیں وہ کیا ہیں؟، ان سب سوالات پر بحث ہوئی اور ان میں سے بہت سے سوالات پر کتابیں لکھی گئیں۔

امتیازی خصائص اور اوصاف پر جب گفتگو شروع ہوئی تو معجزہ پر بھی گفتگو ہوئی۔ معجزہ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انبیا علیہم السلام اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات میں اگر کوئی باہمی، جوہری فرق ہے تو وہ کیا ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کی تعداد تو بہت ہے۔ لیکن ان معجزات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے، جس کو آپؐ نے اپنی نبوت کے ثبوت میں معجزہ اور دلیل کے طور پر پیش فرمایا تھا۔ پھر خود قرآن مجید میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعدد معجزات کا تذکرہ ہے، جن میں سب سے بڑا معجزہ اسرا اور معراج کا ہے۔

اسرا اور معراج کے موضوع پر مسلمانوں میں طویل عرصہ سے غور وخوض اور گفتگو کا عمل جاری ہے۔ معراج کے روحانی پہلوؤں پر بھی اکابر اسلام نے لکھا ہے۔ معراج کے کلامی اور فقہی پہلوؤں پر بھی لکھا گیا ہے۔ معراج کے ادبی پہلوؤں پر ایک الگ سلسلہ کتب ہے۔ اس میں برصغیر کا حصہ انتہائی غیر معمولی ہے۔ واقعہ معراج سے متاثر ہو کر صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی بہت سی کتابیں مرتب کی گئیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ یہ بات کہ کائنات کے مختلف حصوں کا ایک روحانی اور تصوراتی سفر معراج کے واقعہ سے متاثر ہو کر کیا جائے اور اس سفر کی داستان میں ادبی علامتوں اور رمز کے انداز میں مختلف حقائق کو بیان کیا جائے۔ یہ روایت مسلمانوں کی ادبی تاریخ میں مقبول رہی ہے۔ اس کا سب سے آخری اور برصغیر کا انتہائی ممتاز اور قابل فخر نمونہ علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ ہے۔ اس میں انہوں نے سیارگان فلک کا ایک روحانی اور تصوراتی سفر مولانا رومی کی معیت میں کیا۔ مختلف تاریخی شخصیات سے تصوراتی ملاقاتیں کیں۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کی شخصیات شامل ہیں۔ ان کی زبان سے مختلف حقائق بیان فرمائے اور یوں یہ کتاب علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ اور ادبیات کے ایک انتہائی اعلیٰ اور منفرد نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جو کلامیات سیرت

کا ایک ثمرہ یا کلامیات سیرت کی برکات میں سے ایک برکت ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص پر جب صوفیائے کرام نے غور و خوض شروع کیا تو انہوں نے روحانیات سیرت کے موضوعات پر بھی گفتگو کی، اور یوں روحانیات سیرت کے موضوع پر وقیع مباحث کے دفتر تیار کئے۔ اس ضمن میں انہوں نے حقیقت محمدیہ اور نور محمدی کی حقیقت پر گفتگو کی، پھر مختلف انبیاء علیہم السلام کے نور اور نسبتوں پر اظہار خیال کیا۔ اپنے غور و فکر اور اپنے ذرائع علم سے کام لے کر مختلف انبیاء علیہم السلام کی مختلف نسبتیں متعین کیں۔ ان نسبتوں کا رسول ﷺ سے کیا واسطہ تھا۔ آپ کی ذات مبارک کا بقیہ انبیا علیہم السلام سے کیا رابطہ تھا۔ اس پر بہت سے صوفیائے کرام نے غور و خوض کیا۔ اس موضوع پر بڑی فاضلانہ تحریریں لکھی گئیں۔ اس میں بھی ہمارے برصغیر کا حصہ کم نہیں ہے۔ مجدد الف ثانیؒ حضرت شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات میں جا بجا ان موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور صوفیانہ زبان میں روحانی تجربات کے پس منظر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اخلاقی برتری کو نہایت نفیس اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت اور متعلقات نبوت پر شروع سے غور و خوض جاری ہے۔ کچھ حضرات نے نبوت کے مسئلہ پر خالص عقلی انداز سے غور کیا اور فلسفہ اور عقلیات کے میدان میں ایک نیا مضمون اور ایک نیا انداز متعارف کرایا۔ ابو نصر فارابی جو مسلمان فلاسفہ اور مفکرین میں اتنا اونچا مقام رکھتا ہے کہ مسلم فلسفیوں اور مفکرین نے اس کو معلم ثانی کا لقب دیا۔ ارسطا طالیس کو پہلا معلم تسلیم کرتے ہوئے فارابی کو دوسرا بڑا معلم عقلیات تسلیم کیا ہے۔ فارابی نے پہلی بار اس بات کی کوشش کی کہ یونانی منطق اور فلسفہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اسلامی عقائد اور تصورات سے متعارض نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فلسفہ اور عقلیات پر جو تحریریں چھوڑی ہیں ان میں اس نے نبوت، مقام نبوت، منصب نبوت پر فلسفیانہ اور عقلی انداز سے غور و خوض کیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان فلاسفہ نے صرف یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے پر اکتفا کیا۔ یقیناً یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ یقیناً یونانیوں اور نو افلاطونیوں کے علوم و فنون سے مسلمان قارئین اور دانشوروں کو آگاہ کیا گیا۔ لیکن یہ محض ترجمہ اور نقل نہیں تھا۔ یہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ نظر ثانی اور تدوین نو بلکہ تعمیر نو کا کام تھا۔ اس کام میں مسلمان فلاسفہ نے اسلامی

تصورات کی روشنی میں یونانی افکار کا جائزہ لینے کی بھی کوشش کی۔ مثال کے طور پر یونانیوں کے علوم وفنون میں نبوت، رسالت اور وحی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یہ مضامین افلاطون اور ارسطاطالیس کے ہاں نہیں ملتے۔ یہ فلسفہ اور عقلیات کے میدان میں، کم از کم مسلمانوں میں، پہلی مرتبہ ابونصر فارابی نے متعارف کرائے ہیں۔ اسی طرح سے نبوت اور وحی والہام کے موضوع اور ذریعہ علم کے سوال پر خالص عقلی اور فلسفیانہ انداز میں جس شخص نے غور وخوض کی طرح ڈالی وہ بھی ابونصر فارابی ہے۔ اس عمل کو پھر حکیم ابن سینا نے مزید گہرائی اور گیرائی بخشی اور خاص نبوت کے ماخذ علم ہونے کا تصور ابن سینا کے اہم مسائل اور مضامین میں سے ایک ہے۔ پھر آگے چل کر حکیم ابن رشد نے جو منطقی، فلسفی اور حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ نامور اصولی، فقیہ اور متکلم بھی تھے، انہوں نے اس کو شریعت سے زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ شریعت کے موقف کو اس طرح خالص عقلی انداز میں مرتب کیا جائے کہ عقلیات کے نمائندے اس پر عقلی نقطہ نظر سے کوئی اعتراض نہ کرسکیں۔ یہ کلامیات سیرت کا خالص عقلی اور فلسفیانہ پہلو ہے۔ جو ایک دوسری روایت علم میں بڑی کثرت اور تسلسل کے ساتھ زیر بحث رہا ہے۔

کچھ اور حضرات نے روز اول سے یہ کوشش کی کہ خالص عقلی دلائل سے کام لے کر اسلامی نقطہ نظر کو ٹھیک ٹھیک انداز میں بیان کیا جائے جس میں بنیادی حوالہ قرآن مجید، سنت رسول اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ ہو۔ دلائل کا انداز عقلی اور اسلوب منطقی ہو اور مخاطبین فلسفہ اور عقلیات کے طلبہ ہوں۔ یہ اسلوب بہت کامیابی کے ساتھ اور نہایت بھرپور انداز میں امام غزالی کے ہاں ملتا ہے جنہوں نے اس میں روحانیات اور اخلاقیات کی جہت بھی پیدا کی اور خالص دینی مصادر سے کام لے کر عقلی دلائل اور اسلوب، یونانیوں کا طرز استدلال، روحانیات اور اخلاقیات، غرض سب کو ملا کر کوشش کی کہ اسلامی نقطہ نظر کو ایک جامع انداز میں پیش کر دیا جائے۔ ان کی کتاب معارج القدس میں نبوت، فلسفہ نبوت اور وحی والہام کے بارے میں انتہائی وقیع اور عالمانہ بحثیں موجود ہیں۔

کچھ اور حضرات نے خالص روحانی انداز میں ان مضامین کو بیان کیا، اور قرآن مجید اور سنت کی تعلیم کو روحانیات سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا انداز اپنایا۔ اس کی ایک بڑی مثال

مولانا جلال الدین رومی ہیں۔انہوں نے محسوس کیا کہ عقلیات کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں، یونانی علوم وفنون کے ان بڑھتے ہوئے اثرات کے ماحول میں خالص روحانی اور اخلاقی نقطہ نظر کو مسلمانوں میں فروغ دیا جانا چاہئے۔ اور بجائے انسانوں کی عقل کو اپیل کرنے کی انسانوں کے قلب کو اپیل کیا جائے۔ یوں اسلامی فکر میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی۔ اس طرح سے کلامیاتِ سیرت کے دو اہم نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ایک وہ نمونہ جس کے نمائندہ مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ان کی کتابوں میں خاص طور پر مثنوی میں سیرت کے واقعات کو اتنی کثرت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ خود مثنوی مولانا روم سے اگر سیرت کے واقعات نکالے جائیں تو سیرت کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ پھر نہ صرف سیرت کے واقعات میں بلکہ سابقہ انبیاعلیہم السلام کے واقعات اور حالات کا تذکرہ کرکے ان کے روحانی پہلو اور پیغام کا اخلاقی سبق مولانا روم کے ہاں ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔

امت مسلمہ نے سب سے زیادہ جن اثرات کو قبول کیا یہ وہ اثرات تھے جن کے نمائندہ امام غزالی ہیں۔ امام غزالی بیک وقت اخلاقیات، روحانیات، فقہ اور اصول فقہ، عقلیات، منطق اور فلسفہ سب کا ایک مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ان سارے علوم وفنون کے دلائل سے کام لے کر اسلامی عقائد کی توضیح اور ان پر اعتراضات کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک طرف یونانیوں کے زیر اثر عقلیات کا یہ رجحان کارفرما تھا۔ دوسری طرف خود محدثین اور خالص سیرت نگاروں کے حلقے میں بعض ایسے مسائل اور سوالات پیدا ہو رہے تھے جن کا جواب وہ علم حدیث کی روشنی میں دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے خالص کلامی مسائل اول اول محدثین کے حلقوں میں پیدا ہوئے اور سب سے پہلے محدثین نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق، یہ خالصتاً عقلی اور کلامی مسئلہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خلق قرآن کا مسئلہ بنیادی طور پر فلسفہ کا مسئلہ تھا، لیکن محدثین کے حلقے میں پیدا ہوا۔ جب قرآن مجید کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا ہوا تو پہلا اہم مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ خود کلام الٰہی کیا ہے اور ذات باری سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے، پھر خود کلام الٰہی کی حقیقت کیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ صفات الٰہی کی حیثیت

کیا ہے۔ ذات اور صفات میں تعلق کیا ہے۔ یہ عقلی اور فلسفیانہ سوالات سب سے پہلے محدثین نے اٹھائے۔ انہوں نے خالص معارف نبوت کی روشنی میں ان کا جواب دیا اور امت کے ایک بہت بڑے حصے کو اس اساس پر قائم رکھا جو قرآن مجید اور سنت نے قائم کی تھی۔ لہٰذا علم حدیث کے حوالے سے جو سوالات پیدا ہوئے، ان میں نبوت کی حقیقت، معجزہ، وحی، رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید اور احادیث قدسیہ اور آپ کی اپنی احادیث کی شکل میں جو کلام نکلتا تھا ان تینوں میں کیا فرق ہے؟ ان تینوں کا دوسری مذہبی کتابوں سے تقابل، یہ سارے معاملات محدثین کے حلقوں میں سامنے آئے اور انہوں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔

یہ وہ مسائل ہیں جن کا یونانیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ یہ یونانیوں کے زیر اثر اٹھے۔ یہ خالص اسلامی اور دینی مسائل تھے۔ یونانیوں کے ہاں نہ یہ مسائل موجود تھے اور نہ ان سے ملتے جلتے کوئی اور مسائل ان کے ہاں کبھی زیر بحث آئے۔ یہ خالص اسلامی سوالات تھے جو محدثین نے اٹھائے اور سب سے پہلے خود محدثین نے ہی ان کا جواب دیا۔ ابونصر فارابی کی پیدائش سے بھی پہلے سے محدثین ان سوالات کو اٹھا رہے تھے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سوالات میں سب سے پہلا سوال جس کا سیرت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ خود نبوت کیا ہے؟ نبوت کی ضرورت کیا ہے؟ نبوت کی ضرورت اور حقیقت پر متکلمین، صوفیا، فلاسفہ، محدثین، مفسرین، سیرت نگاروں سب نے اظہار خیال کیا ہے اور اس رہنمائی کی روشنی میں جو قرآن وسنت اور ان کی اپنی عقل کی صورت میں ان کے پاس موجود تھی، ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی۔

پھر جب نبوت کی حقیقت اور نبوت کے ذریعہ علم پر بات ہوگی تو پھر عقل اور دل کے باہمی تعلق پر بھی بات ہوگی۔ قرآن مجید نے جہاں عقل وفکر پر زور دیا ہے وہاں قلب اور فواد پر بھی بہت زور دیا ہے۔ قلب اور فواد کی حقیقت کیا ہے، اس پر متکلمین اسلام اور صوفیائے کرام تفصیل سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ وقت کے بعد یہ دو رمز قرار پائے۔ عقل اس علم کا رمز قرار پایا جو خالص تجربہ، مشاہدہ اور استدلال پر مبنی ہو۔ اس کے لئے مولانا رومی علم حصولی کی اصطلاح استعمال فرماتے تھے۔ یہ وہ علم ہے جو انسان اپنی کاوش اور استدلال سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں قلب ایک رمز ہے جو دوسرے ماخذ علم اور مصدر علم سے بحث

کرتا ہے جس کے لئے مولانا رومی نے علم حضوری کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں جابجا ان دونوں کے درمیان مقابلہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

کہ عقل کی بنیاد پر راستہ چلنے اور صحیح راستہ اختیار کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کی کیفیت وہی ہے جو کسی لنگڑے کے پاؤں کی ہوتی ہے جو لکڑی کی بیساکھیوں پر چلتا ہے۔ بیساکھیوں سے لنگڑے کی وقتی اور فوری ضرورت تو پوری ہو جاتی ہے، وقتی تقاضا تو پورا ہو جاتا ہے، لیکن طویل اور کھٹن منزل مقصود لکڑی کے پاؤں کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہی بات علامہ اقبال نے بھی کہی ہے اور غالباً ان تمام مباحث کے پیش نظر جو متکلمین اسلام اور صوفیائے اسلام شروع سے بیان کرتے چلے آرہے تھے، انہوں نے اس کا ایک خلاصہ اپنے ایک قطعہ میں بیان کیا ہے۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

یہ بات صوفیائے کرام مولانا رومی کے زمانے سے لکھتے چلے آرہے تھے کہ انسانی عقل کی ذمہ داریاں محدود ہیں۔ ایک جگہ مولانا روم نے لکھا ہے کہ جس ترازو سے سونا اور ہیرے تولے جاتے ہیں اس سے پہاڑ نہیں تولے جاسکتے۔ عقل بلاشبہ ایک ترازو ہے، لیکن وہ کچھ خاص قسم کی چیزوں کو تولنے کے لئے انسان کو دی گئی ہے۔ اگر اس سے وہ چیزیں تولنے کی کوشش کی جائے جو اس کی دائرہ کار سے باہر ہیں تو یہ عقل کا صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ یہ مضمون مولانا روم کے ہاں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کو جس مرحلہ کو طے کرنے اور جس مشکل کو حل کرنے کے لئے امامت اور رہنمائی درکار ہے وہ محض عقل کی بنیاد پر حل نہیں ہوسکتی۔

عقل بے مایہ امامت کی سزا وار نہیں
رہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

عقل کی بنیاد تو اس کے اپنے اندازے اور استدلال پر ہوتی ہے۔ عقل کا اندازہ اور استدلال ان معلومات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو کسی انسان کے پاس موجود ہوتی ہے۔ معلومات

غلط ہوں گی تو اندازہ غلط ہوگا۔ معلومات درست ہوں گی تو اندازہ درست ہوگا۔ معلومات مکمل ہوں گی تو اندازہ مکمل ہوگا اور معلومات نامکمل ہوں گی تو اندازہ نامکمل ہوگا۔ عقل کا سارا سرمایہ ظن وتخمین سے زیادہ نہیں ہے۔ جن معاملات میں قطعیت اور یقینیات درکار ہیں۔ ان میں بھی عقل کا سرمایہ محض ظن وتخمین اور اندازے ہیں۔

خوب وناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گرحیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

لیکن یہ بات کہ انسان کے اعمال اور اس کی سرگرمیوں میں حق وباطل اور حسن وقبح کا معیار کیا ہونا چاہئے، وہ خالص عقل ہو یا شریعت ہو۔ اللہ کے رسول کا ارشاد ہو یا انسان کا اپنا تجربہ ہو، یہ بات روزِ اول سے ہی زیر بحث رہی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے منسوب کتاب الفقہ الاکبر میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہر متکلم، ہر فقیہ اور ہر اصولی نے اس مضمون کو اٹھایا ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز اس روئے زمین پر موجود ہے۔ انسانی زندگی کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب کی سب روئے زمین پر فراہم کردی گئی ہیں۔ اب اگر انسان کے لئے کھانے پینے سمیت تمام ضروریات یہاں دستیاب ہیں اور موجود ہیں۔ انسان ان کو استعمال کرسکتا ہے تو انسان کی حقیقی، روحانی ضرورتوں کا سامان کیوں موجود نہیں ہوگا۔ لہٰذا نبوت اس سوال کا جواب ہے جو ہر انسان کے ذہن میں آتا ہے اور عقل سے اس کا قطعی اور یقینی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان کبھی نہ کبھی اپنے مقصد وجود کے بارے میں سوالات پوچھتا ہے۔ ان سوالات کا جواب نبوت ہی سے مل سکتا ہے۔

علامہ اقبال کو اس موضوع سے طویل دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے اپنے منظوم اور منثور دونوں کلاموں میں اور انگریزی خطبات اور تحریروں میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کو بیان کرنے کا وقت نہیں۔ ایک چھوٹی سی لیکن انتہائی وقیع تحریر ہے اور متکلمین کے تمام مباحث اور کاوشوں کا خلاصہ ہے۔ انہوں نے 35-1934 میں راجہ حسن اختر کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ نبوت کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ پہلا بنیادی عنصر یہ ہے کہ اس کو مابعد الطبیعی ذرائع سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ان ذرائع سے علم ہوتا ہے جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہیں ہیں۔ جس شخص کو علم کا ایسا ذریعہ حاصل ہو جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہ ہو تو یہ نبوت کا پہلا عنصر

ہے۔دوسرا عنصر یہ ہے کہ جس علم کو وہ حاصل کرتا ہے وہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔تیسرا عنصر یہ کہ وہ اس علم کو اپنے اور دوسروں کے لئے واجب التعمیل سمجھتا ہو۔انہوں نے لکھا کہ جو شخص ان تینوں چیزوں کا مدعی ہے، چاہے وہ نبوت کا لفظ استعمال نہ بھی کرے تب بھی وہ مدعی نبوت ہے اور حضور علیہ السلام کے بعد ایسا دعویٰ کرنے والا ہر شخص دائرہ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے۔یہ علامہ اقبال کی تحریر ہے۔اس میں متکلمین کی بحث کا کوئی نقطہ باقی نہیں رہتا اور نبوت کی حقیقت کے خلاف اس میں کوئی چیز نہیں آئی۔یہی تینوں چیزیں یکجا ہوں تو نبوت کہلاتی ہے۔یعنی علم ایسے ذریعے سے حاصل ہو جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے۔وہ علم قطعی اور یقینی ہو اور حاصل کرنے والے کے لئے یا دوسرے انسانوں کے واجب التعمیل ہو۔

نبوت اور تصور نبوت کا سیرت سے ایک اور تعلق بھی ہے۔اس کو تمام سیرت نگاروں نے سمجھا اور اس کو سیرت کی کتابوں میں ظاہر بھی کیا۔وہ یہ کہ سابقہ انبیاء کا سلسلہ نبوت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی تمہید ہے۔آپؐ سے پہلے جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں، جن کے بارے میں میں نے عرض کیا کہ They were all Muhammad in the making. وہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے اسٹیج تیار کرنے کے لئے بھیجے گئے۔مختلف اقوام کو اس دینی، فکری، ذہنی اور روحانی سطح پر لانے کے لئے بھیجے گئے تھے جس سطح پر رسول اللہ ﷺ کو بھیجا جانا تھا۔اسی لئے تمام بڑے اور قدیم سیرت نگاروں نے پچھلے انبیاء اور نبوتوں کے تذکرے سے سیرت کا بیان شروع کیا ہے۔کسی نے حضرت آدم سے شروع کیا۔کسی نے حضرت ابراہیم سے شروع کیا۔کسی نے حضرت اسماعیل سے شروع کیا۔سابقہ انبیا کا تذکرہ تمام سیرت نگار عروہ بن زبیر کے زمانے سے لے کر ہمارے دور کے سیرت نگاروں تک سب کرتے چلے آرہے ہیں۔ماضی قریب کے بھی ہر قابل ذکر سیرت نگار نے سلسلۂ نبوت کو سیرت کا مقدمہ اور تمہید ہی سمجھا ہے۔یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سلسلہ نبوت، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین سیرت النبی کا مقدمہ اور تمہید تھے اور اس ضروری مقدمہ اور تمہید کو سمجھے بغیر سیرت النبی کو سمجھنے کی کوشش کرنا مقام نبوت کی فہم میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا۔یہی وجہ ہے کہ دلائل نبوت اور کلامیات سیرت علم سیرت کا ایک لازمی حصہ قرار پائے۔

جن حضرات کے پیش نظر سیرت کے صرف تاریخی واقعات تھے۔مثلاً ابن ہشام،

انہوں نے بھی اشارۃً اور ان کے شارحین نے صراحتاً ان تمام مسائل سے اعتنا کیا ہے۔ علامہ سہیلی جن کی کتاب الروض الانف ابن ہشام کی مستند ترین شرحوں میں سے ہے، انہوں نے کلامی مسائل جا بجا اٹھائے ہیں۔ روح اور نفس کی بحث میں انہوں نے کہا ہے کہ روح اور نفس سے کیا مراد ہے۔ اسرار معراج پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ محکمات اور متشابہات کا سیرت سے کیا تعلق ہے۔ یہ سب کچھ علامہ سہیلی نے بیان کیا ہے۔ حالانکہ سہیلی ابن ہشام کی شرح لکھ رہے تھے۔ ابن ہشام کا انداز خالص مورخانہ تھا۔ ان کو تاریخی واقعات اور تفصیلات کے علاوہ بقیہ موضوعات سے براہ راست دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ان کے شارح نے ان مسائل کا بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ یہ چیزیں سیرت کا ایک لازمی حصہ ہیں۔

جن حضرات نے ان موضوعات پر مستقل بالذات کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک دو کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔ ان میں سے ایک نمایاں نام قاضی عیاض کا ہے۔ انہوں نے الشفاء فی تعریف حقوق المصطفیٰ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے وہ خالصتاً بلکہ تقریباً پوری کتاب ہی کلامیات سیرت پر ہے۔ انہوں نے کتاب کی بنیاد اس قرآنی آیت پر رکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اب وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کا جو یہ قرآنی وعدہ کیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اس سے چار قسم کی حفاظتیں مراد ہیں۔ آپؐ کی جسمانی حفاظت، کہ دشمن آپ کو زک نہ پہنچا سکے۔ پھر عقلی طور پر اس بات کی ضمانت اور حفاظت کہ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب یعنی قرآن مجید صحیح اور مکمل طریقے سے انسانوں تک پہنچ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت انسانوں تک پہنچ جائے۔ اس میں کوئی شخص دخل اندازی نہ کر سکے۔ روحانی تحفظ کہ روحانی طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو مرتبہ ہے اس کا تحفظ کیا جا سکے اور اس کو بیان کیا جا سکے۔ اس کی تفصیلات کو محفوظ رکھ کر امت تک پہنچائی جا سکیں۔ چوتھی چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قلبی عصمت اور حفاظت۔ پھر انہوں نے ایک ایک کر کے ان پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک اعتبار سے پوری کتاب ہی اس قرآنی آیت کی تفسیر اور شرح ہے۔

حافظ ابن قیم نے ان میں سے بعض مسائل پر مزید تفصیلی بحث کی۔ ابن قیم جن کا تذکرہ تفصیل سے میں پہلے کر چکا ہوں اسلامی علوم کی تاریخ ایک نہایت معتبر اور محترم نام ہے۔

ان کی کتاب زادالمعاد دبیات سیرت کی منفرد کتاب ہے۔ اس اعتبار سے کہ انہوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو بقیہ سیرت نگاروں نے بیان نہیں کیے۔ سیرت کی عملی رہنمائی، سیرت کی فقہیات، سیرت کی روحانیات اور سیرت کی قانونیات ان کی خاص دلچسپی کے موضوعات ہیں۔ لیکن اس کتاب میں انہوں نے کلامیات سیرت کے بہت سے مسائل بھی اٹھائے ہیں۔ بعض خاص مسائل جو سیرت نگاروں کے ہاں زیر بحث رہے ہیں ان پر ابن قیم نے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ حضور کے معجزات اور خاص طور پر حضور کے سب سے بڑے معجزے یعنی معراج اور اسرا کا اور اسرا کی نوعیت اور کیفیت کا ہے۔

اسرا پر ابھی آگے چل کر بات کرتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا مسئلہ جو ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے وہ پہلے دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ رسول اللہ ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو یہ معراج جسمانی تھی یا روحانی۔ معراج کے روحانی یا جسمانی ہونے کا سوال شروع سے زیر بحث رہا ہے۔ صحابہ کے زمانے سے ہی اس پر بات ہوتی رہی ہے کہ معراج کی نوعیت کیا تھی۔ صحابہ کرام سے جو کچھ منقول ہے اور متقدمین نے اس پر جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی پچھلے چالیس پچاس سوسال سے ایک خاص انداز سے تعبیر ہونے لگی ہے۔ برصغیر میں ایک خاص رجحان ایک خاص طبقہ میں یہ پیدا ہو چلا ہے اور برصغیر سے باہر بھی یہ رجحان موجود ہے کہ معراج کی نوعیت بس ایک خواب کی سی تھی۔ یہ ایک خواب تھا جس میں حضورؐ نے بہت سے مناظر مشاہدہ فرمائے۔ جس طرح اور لوگ خواب دیکھتے ہیں اس طرح حضور نے بھی خواب دیکھا اور آپ کو وہ سارے مناظر دکھا دیے گئے۔

یہ بات بعض اہل علم نے اس بنیاد پر کہی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو '**ما فقد جسمه**' آپ کا جسم مبارک یہاں موجود رہا اور مفقود نہیں رہا۔ اس کی ایک تعبیر تو یہ ہو سکتی تھی جو بعض لوگوں نے کی کہ یہ سارا معاملہ ایک خواب تھا۔ لیکن علمائے امت کی غالب ترین اکثریت صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک اس بات کی قائل رہی ہے کہ معراج کا واقعہ یا تجربہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اس لئے کہ معراج اور اسراء کی حیثیت حضورؐ کے ایک نمایاں ترین معجزہ کی ہے۔ اگر یہ محض کوئی خواب تھا تو محض کسی خواب کو کوئی نشانی اور معجزہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خواب میں ہر کوئی ہر

کہیں پہنچ سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر کسی کو تجربہ ہوا ہوگا کہ وہ انگلستان، برطانیہ اور مکہ اور مدینہ کی سیر کر آیا ہے۔ اگر واقعہ معراج محض یہی بات تھی تو یہ کوئی معجزہ نہیں ہے۔

قرآن مجید جس غیر معمولی انداز میں اس واقعہ کو بیان کرتا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو اس مسجد تک لے گیا، یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس کا اس غیر معمولی انداز میں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ محض خواب کا معاملہ ہوتا تو اس میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں ہے۔ اس لئے اس بات کو تمام محدثین اور مفسرین نے صراحتہً کہا ہے کہ یہ محض خواب کا معاملہ نہیں تھا۔ اب ایک اہم اور ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اس قول کی کیا تعبیر کی جائے کہ حضور کا جسم مبارک موجود رہا اور ایک لمحے کے لئے بھی مفقود نہیں ہوا۔ حافظ ابن قیم نے اس پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور نفسیات، روحانیات، عقلیات اور منطق کے دلائل دے کر یہ بتایا ہے کہ اگر یہ رائے درست مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح مبارک کو لے جایا گیا تھا۔ اور آپ کا جسم مبارک یہیں موجود رہا۔ اس صورت میں بھی یہ خواب سے بہت مختلف چیز ہے۔ اس لئے کہ جب انسان سوتا ہے تو اس سے اس کی روح الگ نہیں ہوتی۔ اس کی روح اس کے جسم ہی میں رہتی ہے۔ انبیاء کے بارے میں ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ ان کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی ان کے جسم سے ان کی روح کا تعلق رہتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق حضور کے جسم مبارک سے آپؐ کی روح کا رہا۔ روح مبارک کو لے جایا گیا اور یہ تمام مشاہدات کرائے گئے۔ اس کا خواب یا سونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا روحانی تجربہ ہے جو صرف انبیا کے ساتھ خاص ہے۔

یہ بات میں نے اس لئے ذرا تفصیل سے بیان کی کہ یہ اس بحث کا خلاصہ ہے جو حافظ ابن قیم نے کی ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ ان تمام احادیث کو جمع کریں جو اسرا اور معراج کو خالصتاً جسمانی واقعہ بھی قرار دے رہی ہیں اور ان احادیث سے اس کی تطبیق کریں جو حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہیں جن میں اس کو روحانی واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ دراصل علامہ ابن قیم روحانی واقعہ کے بارے میں یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی خواب کی طرح کا کوئی واقعہ یا محض تصوراتی چیز نہیں تھی۔ حافظ ابن قیم کے اصل الفاظ ہیں "ولکن ینبغی ان یعلم الفرق

بین ان یقال کان الاسراء مناماً وبین ان یقال کان بروحہ دون جسدہ وبینھما فرق عظیم، مناسب یہ ہے کہ یہ یاد رکھا جائے اور ان دونوں کے درمیان فرق کیا جائے کہ اسراء ایک خواب تھا اور یہ کہا جائے کہ اسراء روح مبارک کے ساتھ ہوئی جسم مبارک کے ساتھ نہیں۔ دونوں کے درمیان بڑا عظیم فرق ہے۔

یہاں علامہ ابن القیم نے نفس اور روح کے مسئلہ پر بہت نفیس اور عمدہ بحث کی ہے۔ انھوں نے اس بحث کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انبیاء کرام کے جسم مبارک کا ان کی روح سے کیا اور کس نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ یہاں علامہ ابن قیم نے نفسیات، روحانیات اور کلام اور فلسفۂ مذہب کا ایک نفیس امتزاج پیش کیا ہے۔

کلامیات سیرت پر ہمارے برصغیر میں متعدد شخصیتوں نے وقیع کام کیا۔ سب سے اہم کام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتابوں میں سب سے نمایاں کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ ایک اعتبار سے اس ساری کتاب کا پورا موضوع ہی کلامیات سیرت ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت اور سنت کے وہ حقائق اور معارف بیان کیے ہیں جو عام انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان حقائق کی بنیاد پر جن کو وہ اسرار حدیث کہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک ایسا عقلی اور روحانی نظام مرتب کیا ہے جو اسلامی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ابھی تک کوئی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس کام میں مزید اضافہ نہیں کر سکا۔ وہ ابھی تک اپنے کام کے فاتح بھی ہیں اور خاتم بھی۔ شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ جو بنیادی کلیات اور اصولوں سے بحث کرتا ہے، اس میں وہ تمام بنیادی مسائل دینی اور شرعی دلائل کے ساتھ ایک عقلی اور منطقی انداز میں بیان کیے ہیں جن کی بنیاد پر منصب نبوت نے کام کا آغاز کیا اور جن کی اساس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ اس حصہ میں شاہ صاحب نے بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کیوں مکلّف قرار دیتا ہے۔ جزا وسزا کا نظام کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ جزا اور سزا کس نوعیت کی ہیں۔ انسان کی کامیابی اور کامرانی کی حقیقت کیا ہے۔ کس چیز کو اصل میں کامیابی اور کامرانی کہتے ہیں اور کس چیز کو ناکامی کہتے ہیں۔ پھر نیکی اور بدی کیا ہے۔ کس چیز کی بنیاد پر نیکی کو نیکی کہا جائے اور کس کام کو کس بنیاد پر

بدی کہا جائے۔ پھر مسلمانوں کی اجتماعیات بالخصوص اور بقیہ انسانوں کا اجتماعی نظام کیوں اور کیسے قائم ہوتا ہے اوراس کی کیا ضرورت ہے اور علوم نبوت نے اس نظام کے قائم ہونے میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس طرح شاہ ولی اللہ نے علوم نبوت کو، جو سیرت کا ایک حصہ ہیں، پوری معاشرت کی اساس اور انسانی کامیابی کی ایک بنیادی اور لازمی شرط قرار دیا ہے۔

پھر حجۃ اللہ البالغہ کے دوسرے حصہ میں جس میں شاہ صاحب نے اسرار نبوت وشریعت بیان کئے ہیں وہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کے بنیادی مقاصد میں میرے پیش نظر جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات کواس طرح نمایاں اور منقح کر کے سامنے لایا جائے کہ حضور کی لائی ہوئی شریعت اوراس کا اصل کارنامہ لوگوں کے سامنے آجائے۔ یعنی اسلامی شریعت کا کمال، متشککین کی تردید اور اہل ایمان کے لئے اطمینان جس چیز سے حاصل ہوجائے وہ میں ان کے سامنے رکھ دوں۔ یوں یہ کتاب کلامیات سیرت کی ایک اسی اساسی کتاب کے طور پر سامنے آتی ہے جو بلاشبہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے اور اسلامی تاریخ میں اس انداز اور نوعیت کی کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔

نبوت کی ضرورت واہمیت واضح کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے لئے ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو ملتیں قائم کرسکیں، جن کی تعلیم کی بنیاد پر امت کی تشکیل کی جاسکے اور وہ ایسا دائمی اور دیرپا نظام امت کو دے سکیں جو امت کے لئے حقیقی سعادت اور کامرانی کا ذریعہ اور ماخذ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے تاریخی، معاشرتی اور فلسفیانہ دلائل دیئے ہیں۔ ایک دلیل اس ضمن میں شاہ صاحب نے یہ دی ہے کہ ہر معاملہ میں ماہرین اور متخصصین کی ضرورت انسانوں نے ہر دور میں محسوس کی۔ ہر دور میں انسان متخصصین سے رجوع کرتا ہے اور زندگی کے خاص گوشوں میں ان لوگوں سے رہنمائی لیتا ہے جو کسی خاص فن میں مہارت اور علم کا ایسا ذریعہ رکھتے ہیں جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہو۔ یہ ضرورت انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں بھی ہے۔ ان کو ایک ایسے علم تک رسائی حاصل ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے اوراس علم کی بنیاد پر ایک امت کی تشکیل اور شریعت کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔

پھر شاہ ولی اللہ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں جو ارتقا ہوا ہے اس کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ اخیر میں کہا ہے کہ جب انسانیت ایک ایسے مرحلے پر آ گئی جب ایک بین الاقوامیت اور عالمگیریت کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ایک ایسا دین بھیجا جائے جو تمام ادیان کا ناسخ ہو۔ ایک ایسی شریعت اتاری جائے تمام شریعتوں کو مکمل کرنے والی ہو اور عدل وانصاف کے جتنے پہلو پہلے نامکمل رہ گئے تھے۔ ان کو مکمل کر دے۔ اور عدل وانصاف کے سب پہلوؤں کی تکمیل کر دے اور لیظہر علی الدین کلہ کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔ یہ ختم نبوت کا وہ تصور ہے جو شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

جس چیز کو شاہ ولی اللہ صاحب تکمیل کا نام دے رہے ہیں یا جس کو لیظہر علی الدین کلہ کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی وضاحت کرنے کی اجازت دی جائے تو میں عرض کروں گا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم عطا فرمائی اس کے دو پہلو بہت اہم ہیں:

ایک تو یہ کہ حضور ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے بعض ایسے مسائل اور مشکلات انسانوں کو درپیش تھیں جن کا جواب انسانوں کے پاس نہیں تھا۔ انسان ایسی مشکلات کا شکار تھا جس کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان مشکلات کو دور فرمایا اور ان مسائل کا قابل عمل، عادلانہ، متوازن، فطری اور دائمی حل پیش کیا۔ ان مسائل اور مشکلات میں ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ علوم اور بالخصوص مذہبی علوم مختلف اقوام اور طبقات کی اجارہ داری میں محصور اور مقید تھے۔ دینی علوم تک عام انسان کی رسائی نہیں تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کے درمیان ایک بعد تھا۔ کچھ گروہ مذہبی تعلیم کے اور کچھ غیر مذہبی تعلیم کے علمبردار تھے۔ ان دونوں کے ہاں اس علم کی بنیاد پر الگ الگ بنیادوں پر تہذیب وتمدن پرورش پا رہی تھی۔ ایک تہذیب وتمدن خالص مذہبی بنیادوں پر اور دوسرا خالص غیر مذہبی بنیادوں پر پرورش پا رہا تھا۔ ایسی تہذیب جس میں دونوں پہلوؤں کو یکجا کیا گیا ہو، انسانیت کی اشد ضرورت تھی۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم میں یکجائی اور یکسانیت پیدا کرنے کا کام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے نہیں تھا۔

مختلف اقوام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے اوہام پرستی موجود تھی۔ اس کے نتیجے میں انسان کے لئے تحقیق میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ انسان کائنات کے

حقائق پر اسی وقت غور کر سکتا ہے جب وہ اوہام پرستی سے نجات پا جائے۔ اوہام پرستی اور مظاہر پرستی کے ساتھ کائنات کے حقائق پر آزادانہ غور وخوض نہیں ہوسکتا۔ یہ آزادانہ غور وخوض اسی وقت شروع ہوسکا جب رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ایک ایک کر کے ان ساری خرافات کو ختم کر دیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس تعلیم کو فروغ دیا وہ ایک عملی، حقیقی اور مفید علم تھا۔ غیر حقیقی، غیر عملی اور مجرد نظریات کی بنیاد پر کسی علم کو اسلام میں حوصلہ افزائی کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے لئے بھی اور اپنی امت کے لئے بھی علم نافع کی دعا مانگی اور اپنی امت کو بھی اس کی تعلیم دی کہ وہ علم نافع کی دعا کرے اور علم ضار سے پناہ مانگے۔ گویا علم کے دو درجات ہوسکتے ہیں یعنی وہ علم جو انسانیت کے لئے مفید ہو اور دوسری وہ جو انسانیت کے لئے ضرر رساں ہو۔

اس کام کے لئے عقل اور نقل میں توازن پیدا کرنا ضروری تھا۔ عقل اور نقل میں توازن پیدا کئے بغیر نہ دین کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں اور نہ دنیا کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں۔ جن اقوام نے نقل کے تقاضوں پر زیادہ زور دیا ان اقوام میں عقل کے تقاضے مجروح ہو گئے۔ جن اقوام نے عقل کے مطالبات پر زیادہ زور دیا ان میں مذہب کے تقاضے مجروح ہو گئے۔ کوئی ایسی کاوش کہ یہ دونوں تقاضے بیک وقت جمع کئے جاسکے اور ان دونوں قسم کے مطالبات کو توازن اور جامعیت کے ساتھ بیک وقت پورا کیا جاسکے، یہ صرف اور صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم سے ممکن ہوسکا۔

یہ اس فن کا ایک عام پس منظر تھا جس کو ہم کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں۔ اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس میں کون کون سے مسائل زیر بحث آئے۔ کن مصنفین نے کس انداز سے اس فن پر گفتگو کی، میں نے اس کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کیں۔

اب میں دو مزید سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ معجزہ جو کلامیات سیرت کا ایک اہم مضمون ہے، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس پر اکابر اسلام نے کیا لکھا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بڑے معجزات جو سیرت سے ثابت ہیں ان کے بارے سیرت کے ادب میں کیا معلومات ہیں۔ نبوت قرآن مجید کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ نبوت ایک ایسا لفظ ہے جو عربی

کی طرح عبرانی میں بھی قریباً اسی مفہوم اور تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے نبی سے مراد وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے براہ راست علم حاصل ہو۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ایسا علم جو قطعی اور یقینی ہو اور مابعد الطبیعی ذرائع سے حاصل ہوا ہو اور ایک یا بہت سے انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہو۔ اس کے حامل اور وصول کنندہ ذات کو نبی کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں مفسرین اور متکلمین کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ کیا نبی اور رسول ایک مفہوم رکھتے ہیں یا ان کا الگ الگ مفہوم ہے۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ نبی اور رسول کے مفہوم ایک ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ اکثریت کے خیال میں نبی اور رسول کا مفہوم الگ الگ ہے۔ دونوں اصطلاحات کے مابین فرق پر بہت سی بحثیں ہیں لیکن ہمارے برصغیر کے ترجمان القرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے ایک جملے میں اس فرق کو بیان کردیا ہے کہ نبی وہ ہے جس کو وحی ملے اور رسول وہ ہے جس کو نئی کتاب یا نئی امت یا نئی شریعت یا تینوں دی جائیں۔ اگر کسی کو نئی شریعت اور نئی کتاب دی گئی۔ یا شریعت اور کتاب تو نئی نہیں دی گئی لیکن نئی امت کے پاس اس کو بھیجا گیا وہ رسول ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہی تھی جو حضرت ابراہیم کی شریعت تھی۔ ان کی کتابیں وہی تھیں جو حضرت ابراہیم کی طرف اتاری گئیں تھی لیکن ان کو نئی امت کی طرف بھیجا گیا تھا اس لئے وہ رسول کہلائے۔ یہ فرق ہے رسول اور نبی میں۔

نبی کا لفظ لغوی اعتبار سے دو مفہوم رکھتا ہے اور متکلمین نے ان دونوں مفاہیم کو لیا ہے۔ نبی کا ایک مطلب تو ہے 'خبر دینے والا'، نباء عربی زبان میں کسی اہم خبر کو کہتے ہیں 'عمَّ یتسائلون عن النباء العظیم'، چونکہ نبی اللہ کی طرف سے بڑی اہم خبریں دیتا ہے اور وہ اللہ کا ترجمان ہے اس لئے اس کو نبی کہا گیا اور قرآن پاک میں جہاں بھی نبی کا لفظ آیا ہے وہ انہی معنوں میں آیا ہے۔ لیکن ہمزہ کو اس میں تخفیف کی وجہ سے حذف کردیا گیا۔ لیکن ورش کی روایت میں اب بھی ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ روایت حفص میں ہم پڑھتے ہیں یاایھا النّبی، جبکہ ورش کی روایت میں پڑھتے ہیں یاایھا النّبیء۔ یہ صرف تلفظ کا فرق ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کا لفظ نبوہ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے بلند مرتبہ۔ انسانوں میں سب سے بلند مرتبہ کی شخصیت نبی ہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبی کہا گیا۔

دونوں مفہوم بیک وقت بھی درست ہو سکتے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے نبی کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا سفیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ترجمان ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں اور مخلوقات کو اللہ کی مرضی اور پیغام سے آگاہ کرتا ہے۔ ابونعیم نے دلائل نبوت میں لکھا ہے **النبوة هو سفارة العبد بين الله وبين ذوى الالباب من خليقته**، نبوت ایک سفارت ہے جو اللہ اور اللہ کی ان مخلوقات میں جو صاحب عقل ہوں ان کے درمیان پیغام رسانی سے عبارت ہے۔

یہ نبوت جو دراصل رسالت کی ایک شکل ہے۔ یہ بعض خصائص کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ خصائص پر ابونعیم اور بقیہ حضرات نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ نبوت کے لئے ضروری ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کا خاص مقرب انسان اور مقرب شخصیت ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام سے چنا ہو۔ **الله يجتبى من الملئكة رسلاً ومن الناس**، اللہ تعالیٰ انسانوں اور فرشتوں میں سے اپنے رسولوں کو خود چنتا ہے۔ اسی طرح سے ایک اور جگہ ہے کہ اللہ ہی اس بات کو جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں بھیجے اور کہاں اتارے۔

رسالت یا نبوت کے منصب میں ولایت شامل ہے۔ ہر نبی ولی ہوتا ہے۔ اللہ کے اولیا میں سب سے اونچا درجہ نبی ہی رکھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ہر ولی نبی نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے بعض صوفیا میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ولی کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے۔ وہ رو بہ حق ہوتا ہے۔ نبی کا تعلق مخلوقات سے ہے اور رو بہ خلق ہوتا ہے۔ تو رو بہ حق ہونا رو بہ خلق ہونے سے افضل ہے۔ جب اس پر اعتراض ہوا تو بعض صوفیاء نے اس کا جواب دیا کہ نبی کی ولایت اس کی اس کی نبوت سے افضل ہے۔ یعنی غیر نبی کی ولایت سے نبی کی ولایت افضل ہے۔ یہ تاویل بھی اس میدان کے مزاج شناسوں نے پسند نہیں کی۔ اس پر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے جن کو علامہ اقبال نے مسلم انڈیا کا سب سے بڑا مذہبی عبقری قرار دیا تھا۔ (علامہ اقبال نے ان کے بارہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ The greatest religious genius of Muslim India. مسلم ہندوستان کا سب سے بڑا مذہبی عبقری)۔

حضرت مجدد الف ثانی نے نبوت اور حقیقت نبوت پر جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف برصغیر کی بلکہ پوری امت مسلمہ کی فکری اور کلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ انہوں نے اپنے

مکتوبات میں جا بجا نبوت اور معارف نبوت پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے جس سے ان تمام عقلی اور غیر عقلی الجھنوں کو صاف کرنے میں مدد ملی جو گیارہویں صدی ہجری کے ہندوستان میں پھل پھول رہی تھیں۔ مکتوبات میں بکھرے ہوئے اس قیمتی مواد کے علاوہ مجدد صاحب نے اثبات نبوت پر ایک باقاعدہ رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔

نبوت وولایت کے درمیان افضل اور مفضول کی بحث کا ذکر کرتے ہوئے مجدد صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے بعض صوفیائے کرام جذب کے عالم میں بات کرتے رہے ہیں جو زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ جذب کی کیفیت میں انسان کو اپنے احساسات اور عقل پر کنٹرول نہیں رہتا۔ ایسی کیفیت میں زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو درست نہیں ہوتے۔ یہ مضمون بیان کرتے ہوئے مجدد صاحب فرماتے ہیں: 'واز یں عالست سخن بعضے کہ گفتند الولایت افضل من النبوۃ'، اور اسی کیفیت میں بعض لوگوں کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ مجدد الف ثانی نے سختی سے اس کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ نبوت انسانوں کو حاصل ہونے والے درجات میں سب سے افضل درجہ ہے۔ اور ولایت سے بدرجہا بلند ہے، چاہے اسی نبوت کی ولایت ہو یا کسی اور کی ولایت ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ نبوت انسانوں کو حاصل ہوسکنے والے درجات میں سب سے افضل ہے۔ ایک اور جگہ اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ بعض لوگ اپنی فکری نارسائی اور فکری کوتاہی کی وجہ سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتابوں میں اس کی تحقیق کی ہے اور دکھایا ہے کہ کمالات نبوت کی حیثیت ایک دریائے محیط کی ہے۔ ایک سمندر کی ہے۔ اور کمالات ولایت کی حیثیت اس کے مقابلہ میں ایک حقیر قطرہ کی ہے۔ مجدد صاحب کی نظر میں کمالات نبوت اور کمالات ولایت میں یہ نسبت ہے۔

کمالات وخواص نبوت پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی روشنی ڈالی ہے جس کی تفصیل وقت کی تنگی کی وجہ سے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث میں حقیقت نبوت، خواص نبوت، وحی والہام اور معجزات کی حقیقت پر بہت عالمانہ گفتگو فرمائی ہے جو قابل دید ہے۔

نبی کا ذریعہ علم وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کی حقیقت اور نوعیت اور مقام ومرتبہ کے بارہ

میں قرآن مجید میں واضح اشارات ملتے ہیں۔علم وحی کی عظمت پر قرآن پاک میں اور سابقہ مذہبی کتابوں میں رہنمائی ملتی ہے۔ وحی کا لفظ دو مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ایک مفہوم جو بہت عام ہے، وہ یہ کہ خاموشی کے ساتھ اور جلدی کے ساتھ کسی کو ایسا اشارہ کر دینا کہ وہ اس سے مطلوبہ پیغام سمجھ لے۔ یہ اشارہ عربی زبان میں وحی کہلاتا ہے۔ چونکہ انبیا علیہم السلام تک انتقال علم اتنا لطیف ہوتا ہے کہ عام انسان کی اس تک رسائی نہیں ہوسکتی اور اتنی جلدی ہوتا ہے کہ صرف انبیا ہی اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔اس لئے اس ذریعہ علم کے لئے وحی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

وحی کا ایک دوسرا مفہوم کسی پتھر یا کسی دوسری چیز پر ایسا نقش ثبت کر دینا کہ جو مٹ نہ سکے،اس کو بھی وحی کہتے ہیں۔لبید بن ربیعہ العامری جو مشہور شاعر ہیں۔معلقات کے شاعروں میں آخری شاعر ہیں۔ان کا شعر ہے:

فمدافع الريان عري رسمها
خلقا كما ضمن الوحي سلامها

منظر یہ بیان کر رہے ہیں کہ جس جگہ میرے جاننے والے ٹھہرے ہوئے تھے جب ان کا قافلہ روانہ ہوا تو ان کے آثار پر بھی گرد پڑ گئی اور وہ مٹ گئے۔ جب بارش ہونے کے بعد وہ گرد بیٹھ گئی تو وہ آثار دوبارہ نمایاں ہو گئے۔ اس طرح نمایاں ہو گئے جیسے پتھر پر کندہ کوئی تحریر مٹی میں چھپی ہو اور پھر بارش ہونے سے دوبارہ روشن ہو جائے۔اسی طرح میرے محبوبوں کے آثار بھی نمایاں اور روشن ہو گئے۔ یہاں پر انہوں نے وحی کا لفظ اس نقش کے لئے استعمال کیا ہے جو پتھر پر ہو، نا قابل شکست ہو اور جس کو مٹایا نہ جا سکے۔

دلائل نبوت پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں سب سے قدیم اور مستند کتاب ابونعیم اصفہانی کی ہے جنھوں نے پہلے دلائل نبوت کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی تھی۔اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہونے والی بشارتیں، آپ کے فضائل، قرآن مجید کی تاثیر سب کا ذکر کیا تھا۔ بعد میں ابونعیم نے خود ہی اپنی کتاب کا خلاصہ لکھا جو دو جلدوں میں چھپا ہے۔اس خلاصہ میں انہوں نے حضور کے ان فضائل کا تذکرہ کیا ہے جو قرآن پاک میں آئے ہیں۔ اور وہ خصائص بھی بیان کئے ہیں جو سیرت، آپ کے ارشادات، سابقہ آسمانی

کتابوں سے سامنے آتے ہیں۔

افسوس ہے کہ علامہ ابونعیم اصفہانی کی اصل اور ضخیم تر کتاب آج دستیاب نہیں ہے۔ آج اس کی یہ تلخیص ہی دستیاب ہے جو انہوں نے خود تیار کی تھی۔ یہ تلخیص بعض طلبہ کے کہنے پر تیار کی گئی جو غالباً یہ کتاب ان سے پڑھنا چاہتے تھے۔ کتاب میں ۳۵ ابواب یا فصلیں ہیں۔ شروع میں ایک بہت فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں انسانی نفسیات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ انسانوں میں چار قسم کی اخلاقی اور روحانی خوبیاں اور اور چار قسم کی کمزوریاں (فضائل اور آفات) پائی جاتی ہیں۔ عقل مندوہ ہے جو ان چاروں آفات سے پاک ہو۔

نبوت کی نفسیاتی اور روحانی تعبیر کرتے ہوئے علامہ ابونعیم نے لکھا ہے کہ نبی ان چاروں سے فضائل کے ہر اعتبار سے مزین اور چاروں آفات سے ہر اعتبار سے پاک ہوتا ہے۔

کتاب کے اہم مباحث میں قرآن مجید کے فضائل، آپ کا سردار انسانیت ہونا، کتب مقدسہ میں آپؐ کے تذکرے، آپ کے اخلاق عالیہ، آپؐ کی صفات فاضلہ، وحی نبوت، تاثیر قرآن اور آپؐ کے معجزات شامل ہیں۔

دلائل نبوت پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم مضمون سابقہ کتابوں میں آنے والی بشارتیں بھی ہیں۔ مختلف آسمانی کتابوں میں حضورﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں کس قسم کی بشارتیں بیان کی گئیں۔ کس انداز سے حضور کی تشریف آوری کو بیان کیا گیا۔ یہ مضمون شواہد نبوت کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

شواہد نبوت پر ہمارے برادر اور پڑوسی ملک افغانستان کے ایک بزرگ مولانا نورالدین جامی نے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ مولانا جامی عربی زبان کے مشہور ادیب، قرآن کے مفسر، محدث اور متکلم بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب شواہد النبوت میں اس موضوع پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے اور وہ سب صفات بیان کی ہیں جو حضورﷺ کی ذات مبارکہ میں پائی جاتی ہیں۔ مولانا جامی نے سات ابواب میں شواہد نبوت کو بیان کیا ہے۔ شواہد نبوت قبل ولادت، شواہد نبوت وقت ولادت، شواہد نبوت از بعثت تا ہجرت، شواہد نبوت از ہجرت تا وصال، شواہد نبوت بعد از وصال، شواہد نبوت بدست صحابہ کرام، شواہد نبوت بدست تابعین، تبع تابعین اور

صوفیائے کرام۔

مولانا جامی بہت بڑے شاعر اور ادیب بھی تھے، اس لئے ان کی کتاب ادبی اعتبار سے بھی بہت اونچے درجہ کی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے معجزات بھی بیان کئے ہیں اور جہاں مناسب سمجھا ہے وہاں معجزہ کی تفصیل بھی دے دی ہے۔ لیکن ان تمام تر خوبیوں کے باوجود کتاب میں شامل بعض بیانات غیر مستند یا کم مستند ہیں۔ کتاب الحاقات سے بھی پاک معلوم نہیں ہوتی۔ فارسی میں لکھی جانے والی دوسری بہت سی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی کہیں کہیں الحاقات کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔

ان کے بعد سب سے آخری اور جامع ترین کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی خصائص کبریٰ ہے۔ اس میں انہوں نے معجزات کے بارے میں بہت سی معلومات جمع کی ہیں۔ علامہ سیوطی بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ ان کی کتابوں کا معیار خاصا بلند اور تحقیقی ہوتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کا یہ مزاج ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے محبت اور عقیدت میں بعض اوقات تحقیق کے دامن کو چھوڑ دیتا ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی بعض روایات کے بارے میں تحقیق نہیں کی ہے اور بعض ایسی روایات کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے جو علم حدیث، روایت ودرایت اور تحقیق کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی ایک جلد میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، وہاں خصائص نبوت کا بھی جو علامہ سیوطی کی تصنیف ہے، تفصیلی جائزہ لیا ہے اور جہاں جہاں علامہ سیوطی نے کمزور روایات بیان کی ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ سیوطی کی یہ کتاب بہت سی کتابوں کا ماخذ رہی ہے۔ اردو اور فارسی میں جتنے میلاد نامے لکھے گئے ہیں ان میں بہت سی تفصیلات اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔

شواہد نبوت اور معجزات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں مختلف اصطلاحات استعمال ہوئیں۔ بینہ کی اصطلاح استعمال ہوئی جس کے معنی واضح دلیل اور نشانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی اسی مفہوم میں بینات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ **ولقد اتینا موسیٰ بینات**، '**ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات**'، ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا۔ آیت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی نشانی کے ہے۔ معجزہ کا لفظ بھی قرآن پاک میں براہ راست

نہیں لیکن بالواسطہ طور پر استعمال ہوا ہے۔قرآن پاک میں برہان اور دلیل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔بعض احادیث میں علامات اور شواہد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔لیکن عام طور پر اسلامی ادب میں معجزہ کا لفظ مشہور ہے۔اگرچہ قرآن پاک میں معجزہ کا لفظ خاص اس مفہوم کے لئے براہ راست استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی احادیث میں استعمال ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو جن جن حضرات نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے معجزات کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

سب سے بڑا معجزہ تو قرآن پاک ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے۔آپؐ نے جب بھی اپنی نبوت کی تائید اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش فرمایا تو قرآن پاک ہی کو پیش فرمایا۔یوں تو بہت سے معجزات آپ کے دست مبارک سے صادر ہوئے جن کی ابھی میں مثالیں بھی دیتا ہوں۔لیکن ان میں سے کسی معجزہ کو بھی حضورؐ نے کسی چیلنج کے جواب میں پیش نہیں کیا۔جب کسی طرف سے کوئی چیلنج دیا گیا اور آپ کی نبوت کی نشانی مانگی گئی تو آپ نے قرآن پاک کو جواب میں پیش کیا۔قرآن مجید میں کفار مکہ کا ایک اعتراض نقل ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے'وقالوا لولا انزل علیه آیات من ربه '،یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں کی گئیں۔اس کا جواب حضور پاک کی طرف سے قرآن مجید نے یہ دیا کہ 'اولم یکفهم أنا انزلناعلیک الکتاب یتلی علیهم' کیا ان کے لئے بطور نشانی کے یہ کافی نہیں کہ قرآن کی یہ آیات ان کے لئے تلاوت کی جارہی ہیں۔گویا قرآن کی آیات اور قرآن مجید کو حضور نے اپنی نبوت کے ثبوت اور معجزہ کے طور پر ہمیشہ پیش کیا۔قرآن مجید کس اعتبار سے معجزہ ہے۔اس کے اعجاز کے کون کون سے پہلو ہیں۔اس پر گزشتہ چودہ سو سال سے اہل علم غور کرتے چلے آرہے ہیں اور اس کے اعجاز کے نئے نئے پہلو سامنے لا رہے ہیں۔یہ بات علوم قرآن سے تعلق رکھتی ہے اس لئے میں اس کی مزید تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

دوسری چیز جو رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں بڑی نمایاں ہے اور خود قرآن پاک نے بیان کی ہے۔وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسرا کا معجزہ ہے۔معجزہ معراج یا اسراء۔قرآن پاک میں جس انداز سے سورۃ اسراء کی ابتداء میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جس زور بیان اور

عالیشان انداز سے اس کا آغاز ہوا ہے اس سے خود ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی غیر معمولی بات بیان فرمائی جا رہی ہے۔ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تاکہ ہم اپنی بڑی بڑی نشانیاں ان کو دکھائیں۔" بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جانا اور بڑی بڑی نشانیاں دکھانا اور وہ ذات جس کے بارے میں آغاز ہی میں کہا گیا کہ وہ بہت پاکیزہ اور مبارک ذات ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی خواب یا منام کی کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسی غیر معمولی چیز ہے جو دوسرے انسانوں کو پیش نہیں آئی۔ اگر یہ محض خواب ہوتا تو کفار مکہ کی طرف سے اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص خواب دیکھتا ہے اور کوئی بھی کسی کے خواب کی تردید نہیں کرتا کہ فلاں چیز دیکھی اور فلاں چیز نہیں دیکھی۔ صحابہ کرام میں جنہوں نے سب سے پہلے اس واقعہ کی تصدیق کی اس کی بنیاد پر ان کو صدیق کا لقب دیا گیا۔ خواب کی تصدیق پر صدیق کا لقب دیئے جانے کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ واقعی یہ ہے کہ صدیق کے لقب کی معنویت اس وقت تک اس اہمیت کی حامل قرار نہیں دی جاسکتی جب تک کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی تصدیق عام انسانوں کے لئے آسان نہ ہو اور خالص ایمان یقین کے بجائے محض عقل کی بنیاد پر جس کی تصدیق کی جاسکتی ہو۔

اسرا اور معراج کے علاوہ جس معجزہ کا ذکر قرآن اور احادیث میں آیا ہے وہ شق قمر کا معجزہ ہے۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر، ان کے علاوہ جتنے معجزات بیان ہوئے ہیں وہ اکثر و بیشتر کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ جن میں بڑی تعداد میں کتب صحاح، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، سنن نسائی میں بیان کردہ معجزات کو استناد کا اونچا درجہ حاصل ہے۔ ان معجزات کی تعداد کیا ہے اور ان کی تفصیلات کیا ہیں اس پر سیرت نگاروں نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ حضور علیہ السلام کے معجزات کا اندازہ چند سو سے لے کر تین ہزار تک کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کو بطور مثال پیش کر دیتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی سوال کا ذکر ضروری ہے، جو متکلمین نے اٹھایا۔ وہ یہ ہے کہ معجزہ کا مقصد کیا ہے۔ اگر معجزہ کا مقصد یہ ہو کہ اس سے نبوت کی تائید اور ثبوت حاصل ہو اور معجزہ دیکھنے والوں کو نبوت کی صداقت کا یقین آجائے تو یہ مقصد بہت کم پورا ہوا ہے۔

تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان نہیں لائے۔ان کے برعکس بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لے آئے۔حضرت خدیجہؓ کو حضور نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ جب پہلی مرتبہ آکر بیان کیا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے۔ انہوں نے فوراً آپ کی نبوت اور صداقت پر ایمان کا اعلان کر دیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کو بھی دین کی طرف بلایا اس نے کوئی نہ کوئی تامل ضرور کیا سوائے ابوبکر کے۔ جیسے ہی میں نے ان کو اسلام کے بارے میں بتایا انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا۔ بڑے بڑے صحابہ کرام میں سے شاید کسی نے بھی کوئی ثبوت یا معجزہ طلب نہیں کیا۔لیکن جو لوگ معجزے طلب کرتے تھے اور جن کو معجزات دکھائے بھی گئے ان میں سے شاذ ونادر ہی کوئی مسلمان ہوا ہو۔ ابولہب، ابوجہل ،عبداللہ بن ابیؔ اور بڑے بڑے سرداران قریش اور سرداران یہود۔

اس لئے معجزہ کے حوالہ سے متکلمین نے تین نوعیت کے انسانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ انسان تو وہ ہوتے ہیں جو ہر نبی کے ساتھیوں میں سابقون الاولون میں شمار ہوتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعید روح، سلیم عقل وطبیعت لے کر آتے ہیں اور وہ نبی کی شخصیت اور کردار کو ہی اصل معجزہ سمجھتے ہیں۔ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ نبی کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کا اندازہ کر سکیں۔اس کے کردار اور شخصیت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کریں کہ یہ شخص غلط بیانی نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ اس نے کیا ہے یہ صداقت اور حق پر مبنی ہے۔اس لئے جوں ہی وہ اس کے منہ سے پیغام نبوت کو سنتے ہیں تو وہ فوراً دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ دراصل نبوت کا ادراک کرنے کا واحد اور حقیقی راستہ ذوق سلیم یعنی فطرت سلیمہ ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اندر سے نفرت اور دشمنی کا ایک رویہ رکھتے ہیں اور ان کو چاہے ہزار معجزات دکھائے جائیں وہ نبوت کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔کسی ذاتی مفاد، تعصب یا کسی بھی وجہ سے ان کے لئے معجزہ کا ہونا نہ ہونا بے کار ہے۔

ان دونوں کے علاوہ انسانوں کا ایک طبقہ اور ہوتا ہے اور یہ تعداد میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ متامل اور متردد ہوتے ہیں اور معجزہ دیکھنے کے بعد ان کی آنکھ پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جاتا ہے

اور وہ نبوت کی صداقت پر ایمان لے آتے ہیں۔ یا کچھ لوگ جو دل سے ایمان لا چکے ہوتے ہیں لیکن کسی وجہ سے ایک حد میں رہتے ہیں اور قریب نہیں آتے۔ وہ معجزہ دیکھتے ہیں تو ان کے ایمان میں پختگی آجاتی ہے اور وہ گمراہ ہونے اور کسی شک میں مبتلا ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس لئے معجزہ کے اصل مخاطب تیسرے طبقہ کے لوگ ہیں جو معجزہ سے ایمان کی کمزوری کا علاج حاصل کر لیتے ہیں۔

جو باکردار، سعید اور سمجھدار لوگ ہوتے ہیں ان کے لئے اصل معجزہ پیغمبر کی بلند شخصیت اور کردار اور خود ماننے والے کی سلامت طبع ہوتا ہے۔ انسان اگر سلیم الطبع ہو تو اس کے اندر سے اس کی روح اور قلب گواہی دیتے ہیں کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ ہر انسان ماں کو ماں اور باپ کو باپ مانتا ہے۔ اور بغیر کسی ظاہری دلیل کے مانتا ہے۔ ڈی این اے ٹسٹ تو اب ہونے لگے ہیں۔ یہ بھی ہر ایک کے پاس نہیں ہوتے۔ لیکن اندر سے ہر انسان کی روح اور اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ میرے ماں باپ ہیں۔ اس کے لئے کوئی عقلی ثبوت اور دستاویزی ثبوت کبھی کسی نے نہیں مانگا۔ اگر کسی سے ماں باپ کے بارے میں گواہی مانگی جائے تو وہ شاید لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس لئے کہ اندر قلب سلیم ہے اور جس محترم خاتون کے ساتھ وہ سالہا سال بیٹا بن کر رہا ہے جس کی بنیاد پر اس کو وہ ماں مانتا ہے۔ اسی طرح کی ایک قلبی اور داخلی بنیاد پر ایک سعید روح پیغمبر کو پیغمبر مانتی چلی آرہی ہے۔ ماننے والے اس زمانے میں بھی مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں۔ اسی لئے اللہ کے پیغمبروں نے ہمیشہ اپنی شخصیت اور کردار کو اپنی پیغمبری کے دلیل کے طور پر سب سے پہلے پیش کیا۔ وقد لبثت فيكم عمراً من قبله، میں ایک طویل عمر تک تمہارے درمیان رہا ہوں۔ میرا پورا کردار اور رویہ تمہارے سامنے ہے۔ تم اس کو دیکھ سکتے ہو۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو معجزے پیش فرمائے وہ کسی تحدی کے جواب میں نہیں ہوتے تھے۔ البتہ اگر کسی سوال کے جواب میں معجزہ پیش کیا تو قرآن پاک کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو معجزات حضور کی ذات پر ظاہر ہوئے وہ کسی خاص سیاق وسباق میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر جاری فرما دیئے۔

معجزہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ پیغمبر کی طرف سے نہیں ہوتا۔ پیغمبر جب

چاہے اور جہاں چاہے معجزہ تخلیق کر کے دکھا دے، یہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ذات پر ظاہر کر دیتا ہے۔ معجزہ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، پیغمبر نہیں ہے۔ پیغمبر اس کا مظہر، ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ قرآن پاک کے اندر کچھ ایسے پہلو ہیں جن کی وجہ سے اس کو ہمیشہ معجزہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ماضی کے بعض واقعات بیان ہوئے ہیں جو قبل ازیں رسول اللہ ﷺ کے علم میں نہیں تھے۔ ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک، ۔ سابقہ مذاہب اور انبیا کی بہت سی تفصیلات پہلے سے حضور کے علم میں نہیں تھیں۔ کفار مکہ اور قریش میں بھی معروف نہیں تھیں۔ جہاں قرآن میں ایسی چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے تو ساتھ میں یہ بھی یاد دلایا گیا ہے کہ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں۔ آئندہ آنے والے بعض واقعات کی خبریں قرآن پاک میں دی گئی ہیں، جو قرآن پاک میں دی گئی پیش گوئی کے مطابق واقع ہوئے۔ مثلاً رومیوں کی کامیابی کی خبر ایک مشہور خبر ہے۔

شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں جو کامل شریعت رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں جس کا مبنی بر عقل ہونا، مکمل ہونا اور زندگی کے ہر پہلو کے لئے رہنما خطوط فراہم کرنا یہ خود اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ ایک دوسرے مصنف نے لکھا ہے کہ یوں تو پوری شریعت ایک معجزہ ہے لیکن شریعت کا قانون میراث ایک ایسا معجزہ ہے جس کی مثال خود احکام شریعت میں بھی نہیں ملتی۔ قرآن پاک کی صرف تین آیتوں میں چند بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان بنیادی اور اساسی احکام کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے اتنے تفصیلی احکام مرتب بیان کئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہمارے بزرگ دوست جناب ملک بشیر احمد بگوی صاحب یہاں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کمپیوٹر پر قانون میراث کو فیڈ کیا ہے۔ چند سال پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کوئی ایک کروڑ ممکنہ صورتیں سوچ سوچ کر کمپیوٹر میں فیڈ کر دی ہیں اور ان میں سے ہر صورت کا جواب کمپیوٹر میں موجود ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی ان تین آیات سے نکلنے والے احکام کو جب کمپیوٹر کے ذریعے شمار کیا تو لاکھوں کروڑوں مسائل کا حل ان تین آیات سے ان کے سامنے آیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت جس کو بجا طور پر شاہ ولی اللہ نے معجزہ قرار دیا ہے فی الواقع اپنے اندر غیر معمولی اعجازی پہلو رکھتی ہے۔ یہ وہ معجزات ہیں جن کو عقلی یا علمی معجزات کہا جاتا ہے۔

جو حسی معجزات ہیں۔ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والے معجزات۔ان کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں نے بہت سی باتیں کی ہیں۔علامہ سیوطی نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں ایک ہزار معجزات کی تفصیل بیان کی ہے۔امام بیہقی بھی ایک ہزار معجزات کے قائل ہیں۔امام نووی نے ان معجزات کی تعداد ۱۲ سو قرار دی ہے۔بعض نے تین ہزار، کسی نے ساڑھے تین ہزار کی تعداد بتائی ہے۔یہ وہ واقعات اور معجزات ہیں جن کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔ان میں سے بعض واقعات ایسے بھی ہیں جس کے معجزہ ہونے یا نہ ہونے میں علمائے سیرت کے مابین اختلاف ہے۔ایک واقعہ ایک خاص انداز سے پیش آیا۔کسی شخص نے اس کو معجزہ سمجھا، دوسرے سیرت نگار نے اور نظر سے دیکھا تو اس کو عام واقعہ سمجھتے ہوئے معجزہ قرار نہیں دیا۔اس وجہ سے تعداد میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ان میں سے چند معجزات کا میں بطور نمونہ ذکر کرنا چاہوں گا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک بڑا معجزہ جس کو صحابہ کرام نے بار بار دیکھا اور محسوس کیا اور مختلف واقعات اور مواقع پر سامنے آیا وہ آپ کا مستجاب الدعا ہونا تھا۔آپ جو دعا مانگتے تھے وہ اسی طرح پوری ہوجاتی تھی۔یہ بات نہ صرف صحابہ کرام بلکہ خود مخالفین کے علم میں بھی تھی۔مخالفین میں مشہور سردار قریش عتبہ بن ولید ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کفار مکہ کی طرف سے بات کرنے کے لئے آیا۔وہ کفار مکہ کی طرف سے حضور سے کوئی معاملہ کرنا چاہتا تھا۔جب اس نے اپنی پوری بات کہہ دی تو حضور نے جواب دیا کہ چچا!،آپ کو جو کہنا تھا کیا آپ وہ کہہ چکے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں کہہ چکا۔اس کے جواب میں آپ نے سورۃ حم السجدہ پڑھنا شروع کی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔اس سورت میں جب یہ آیت آئی کہ 'فان عرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عادٍ وثمود '،اگر یہ لوگ ماننے سے انکار کریں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں جس سے عاد وثمود کو تباہ کیا گیا تھا۔یہ سننا تھا کہ عتبہ نے حضور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ بھتیجے ایسا نہ کہو۔تم جو کہتے ہو وہ ہوجاتا ہے۔اپنی قوم کا برا نہ چاہو۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ حضور مستجاب الدعوات ہیں اور آپ کی زبان مبارک سے جو بات نکلتی ہے وہ پوری ہوجاتی ہے۔اس کی درجنوں مثالیں سیرت اور احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مختلف حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے تو کسی نے آپ کے نامۂ مبارک کو احترام کے ساتھ وصول کیا۔ کسی نے جواباً احترام کا خط لکھا۔ سب سے زیادہ بدبخت شخص ایران کا کسریٰ خسرو پرویز تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑ کر پھینک دیا اور جو صحابی اس کے دربار میں خط لے کر گئے تھے ان کو سفارتی آداب کے برخلاف اپنے دربار سے نکال دیا۔ انہوں نے آ کر حضور کو رپورٹ دی کہ میں نے خط دیا تو اس نے آپ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک طرف پھینک دیا اور بہت گستاخی سے پیش آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے اللہ! اس کو بھی اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ پھر دنیا نے حضور کی یہ بددعا پوری ہوتے دیکھی۔ جلد ہی اس کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا۔ بیٹے کو بھی لوگوں نے قتل کر دیا اور بیٹی کو تخت پر بٹھا دیا۔ حضور کی وفات تک پے درپے ایران کے حکمران بدلتے رہے اور آپ کے جانشینوں نے تقریباً دس سال کے قلیل عرصہ میں کسریٰ کی سلطنت کو ختم کر دیا اور اس کی ریاست سلطنت اسلام کا حصہ بن گئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو سارا سامان مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ مدینہ آئے تو خالی ہاتھ تھے اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ حضور نے ان کو ایک انصاری صحابی کا بھائی بنا دیا۔ انصاری بھائی نے ان سے کہا کہ میری آدھی زمین، آدھا گھر سب کچھ حاضر ہے۔ اس میں سے اپنا حصہ لے لیں۔ میری دو بیویاں ہیں، آپ جس کو چاہیں اس کو میں طلاق دے دیتا ہوں۔ عدت گزرنے پر اس سے آپ نکاح کر لیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے، مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیں۔ پھر حضور سے جا کر عرض کیا کہ میں کاروبار اور تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ! عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت میں برکت عطا فرما۔ اس دعا کا انتہائی غیر معمولی اثر ہوا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت میں اتنی برکت ہوئی کہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی جگہ سے پتھر بھی ہٹاتا تو یہ گمان ہوتا کہ اب یہاں سے سونا برآمد ہو جائے گا۔ چند سال کے اندر اندر ان کا شمار مدینہ منورہ کے دولت مندترین انسانوں میں ہونے لگا۔ صحابہ کرام اپنے پیسے ان کو دیتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ہماری دولت بھی اپنے کاروبار میں لگا دیں، اس لئے کہ جو فائدہ اور جو نفع آپ کے کاروبار میں ہوتا ہے اتنا نفع کسی اور کے کاروبار میں نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس جب اسلام قبول کر کے حضور کے پاس آئے تو ان کی عمر ۱۳ سال تھی۔ تین سال حضور کی معیت میں رہے۔ سولہ سال کے تھے جب حضور دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کے لئے حضور نے دعا فرمائی تھی کہ اللھم علّمه التاویل، اے اللہ ان کو قرآن کا علم سکھا، وفقهه فی الدین، اور ان کو دین میں سمجھ عطا فرمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ خود بڑے بڑے صحابہ کرام ان سے رہنمائی اور مشورہ لیا کرتے تھے۔ آج قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت اور کلام، عقیدہ، عربی ادب، عربی زبان کی نزاکتیں، غرض اس زمانے کے علوم وفنون میں کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس سند کی حیثیت نہ رکھتے ہوں اور ان کے اقوال وارشادات اُس زمانے کے علوم وفنون کی ہر کتاب میں موجود نہ ہوں۔

ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ، مدینہ منورہ میں بارش نہیں ہوئی اور ہمارے سارے کھیت اور باغات سوکھ رہے ہیں۔ مدینہ بارانی علاقہ ہے۔ یہاں کوئی دریا نہیں ہے، دو ایک برساتی نالے ہیں۔ بارش ہو جائے تو ان میں پانی آتا ہے ورنہ سوکھے پڑے رہتے ہیں۔ سارا دارومدار ایک حد تک تو کنوؤں پر ہوتا تھا، جو خاصا گراں بھی تھا اور محدود بھی، بیشتر دارومدار بارش پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن بارش نہیں ہوئی۔ حضور اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے خطبہ کے دوران دعا کی۔ صحابہ کہتے ہیں کہ مدینہ کے آس پاس بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن حضور نے ابھی دعا ختم نہیں کی تھی کہ بادل آ گئے اور اتنی کثرت سے برسنے لگے کہ لوگ نماز سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ سارا مدینہ جل تھل ہو گیا۔ اسی صحابی نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ! اتنی بارش میں تو ہمارے درخت ضائع ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اللھم حوالینا لاعلینا، اے اللہ ہمارے چاروں طرف برسا۔ ہمارے اوپر نہ برسا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نکلے تو دیکھا کہ مدینہ کا آسمان صاف ہو گیا ہے اور چاروں طرف بارش برس رہی تھی۔ نالوں میں پانی بہہ رہا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے بہت سی پیشن گوئیاں بھی جاری ہوئیں۔ ان میں قرآن پاک میں سورۃ روم کی پیشن گوئی تو الگ حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن حضورؐ نے روم وفارس کی فتح کی بھی پیشن گوئی فرمائی۔ جس زمانے میں حضور نے یہ پیشین گوئی فرمائی

تھی یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان مدینہ کے اندر بھی محفوظ نہیں تھے۔ خود منافقین نے طعنہ دیا تھا کہ اپنے گھر میں تو ڈر لگتا ہے، اتنی بدامنی ہے اور خبر دے رہے ہیں قیصر و کسریٰ کی۔ اس وقت حضور نے غزوہ خندق کے دوران یہ پیشین گوئی بھی فرمائی تھی کہ 'اذا هلک قیصر فلا قیصر بعده واذا هلک کسریٰ فلا کسریٰ بعده'، جب یہ قیصر ہلاک ہو جائے گا تو کوئی قیصر اس کی جگہ نہیں لے گا اور جب یہ کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو کوئی کسریٰ اس کے بعد نہیں ہوگا۔ چنانچہ آج تک رومیوں کے عرب مقبوضات میں قیصر اور ایران میں کوئی کسریٰ نہیں آیا اور یہ دونوں علاقے سو فیصد مسلمان ہو گئے ہیں۔

حضور نے استنبول کی فتح کی پیشین گوئی کی تھی۔ اس زمانہ میں ترکی کو روم اور وہاں کے فرمانروا کو قیصر کہا کرتے تھے۔ آپ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ 'لتفتتحن مدینة قیصر'، مسند امام احمد میں ہے کہ تم قیصر کے دارالحکومت کو لازماً فتح کرو گے۔ ولنعم الامیر امیرها ونعم الجیش ذالک الجیش'، وہ سردار کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا اور وہ لشکر کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا۔ یہ پیشین گوئی بالآخر پوری ہوئی اور 1453ء میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں استنبول فتح ہوا۔ مجھے نہیں معلوم سلطان محمد فاتح کی کیفیت کیا ہوئی ہوگی جب اس کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ حضور نے ان کو بہترین امیر اور ان کے لشکر کو بہترین لشکر قرار دیا تھا۔

جب سلطان محمد فاتح سے کہا گیا کہ آپ وہ بہترین امیر ہیں جن کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیشین گوئی کی تھی تو محمد الفاتح نے انتہائی تواضع سے جواب دیا کہ نہیں میں وہ بہترین امیر نہیں ہوں۔ بہترین امیر تو حضرت ابوایوبؓ انصاری ہیں جو مسلمانوں کی پہلی فوج کے ساتھ یہاں آئے تھے اور یہیں انتقال فرما گئے تھے۔ اور جن کا مزار یہاں موجود ہے۔ سلطان محمد فاتح نے حضرت ابوایوب کے مزار پر جا کر حاضری دی اور ان کو فاتح استنبول قرار دیا۔ جس علاقہ میں حضرت ابوایوب انصاری کا مزار ہے اس کو استنبول میں فاتح کہتے ہیں۔ اور استنبول میں حضرت ابوایوب انصاری کو سلطان ایوب کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل حکمران تو یہ ہیں جنہوں نے استنبول فتح کیا تھا۔

ایک جدید سیرت نگار نے بہت خوب لکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی گواہی نباتات، جمادات، حیوانات، کائنات اور سیارگان فلک نے بھی دی۔ پھر ایک

ایک کر کے انہوں نے معجزات کو اس کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے تو حضرت علی نے کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ فلاں چٹان کے قریب یہ واقعہ ہوا۔ آپؐ نے کہا کہ ہاں میں اس چٹان کو جانتا ہوں، نبوت سے پہلے وہ مجھے سلام کیا کرتی تھی۔ جب میں گزرتا تھا تو اس چٹان سے آواز آتی تھی کہ السلام علیک یا محمدؐ۔ یہ صحیح بخاری میں ہے اور بھی کئی جگہ ہے۔

استوانہ حنانہ کی روایت سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ ستون آج بھی مسجد نبوی میں موجود ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ استوانہ حنانہ۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آغاز میں ایک خاص ستون سے حضور ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب منبر بن گیا اور حضور منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس ستون سے رونے کی آواز آئی۔ جیسے کوئی ہچکی لے کر روتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے جا کر اس کو تسلی دی اور وہ ستون ایسے خاموش ہو گیا جیسے بچہ ہچکی لے کر رو رہا ہو اور کوئی اس کو دلاسہ دے کر چپ کرا دے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ جبل احد پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق بھی تھے۔ میں نے بھی وہ جگہ ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب کی معیت میں دیکھی ہے۔ وہ پتھر بھی موجود ہے جس پر حضور تشریف فرما تھے۔ دونوں صحابہ بھی ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو دیکھا کہ جبل احد تھوڑا سا ہلا۔ اب بھی اس میں زلزلہ کے آثار موجود ہیں۔ جب پہاڑ ہلنے لگا تو آپؐ نے قدم مبارک زمین پر مار کر کہا کہ ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید کھڑے ہیں۔ یہ حضرت عمر فاروق کی شہادت کی خبر بھی ہے۔ حضور نے بات ختم کی تو پہاڑ ٹھہر گیا۔

ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی سفر سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں ایک بدو ملا۔ اس کو حضور نے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ آپ اپنی نبوت کا کوئی ثبوت دے سکتے ہیں؟ حضور نے پوچھا کہ کیا ثبوت چاہئے۔ بدو نے پوچھا کہ کیا یہ درخت آپ کی نبوت کی گواہی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں۔ درخت کو بلا کر کہا کہ ادھر آؤ۔ درخت حرکت کر کے قریب آیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اللہ کے حضور سجدہ کرو۔ وہ سجدہ ریز ہو گیا۔ آپ نے کہا کہ اب واپس جاؤ، درخت اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ بدو اسلام لے

آیا۔ امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے اور اس کو مستند کہا ہے۔

ابوطلحہ انصاریؓ کے پاس ایک بہت ازکار رفتہ گھوڑا تھا۔ اس کو وہ بیچ نہیں سکتے تھے کیونکہ کوئی خریدنے والا نہیں تھا۔ اس کو مار ڈالنے یا ریگستان میں بھوکا پیاسا چھوڑ دینے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ حضورؐ کے پاس آئے اور پوچھا کہ ایسے گھوڑے کا کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا میرے پاس لے آؤ۔ وہ گھوڑا حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ آپؐ نے گھوڑے کو لگام ڈلوائی اور سوار ہو کر نکل گئے۔ واپس آئے تو فرمایا کہ 'ان فرسک لوجدناہ بحرا' تمہارے گھوڑے کو تو ہم نے دریا پایا۔ اس کے بعد وہ مدینہ کے تیز رفتار ترین گھوڑوں میں سے ایک بن گیا اور اس کا لقب بحر پڑ گیا۔

ایسی مثالیں بہت کثرت سے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا سے پانی کی کثرت ہوگئی۔ مردہ کنویں سے پانی نکل آیا۔ تھوڑا پانی ہزاروں آدمیوں کے لئے کافی ہوگیا۔ ایسے درجنوں واقعات ہیں۔ بہت سے غزوات میں ایسا ہوا۔ بارہا ایسا ہوا۔ ابوقتادہ ابن نعمان صحابی جن کے ایک پڑپوتے سیرت نگار تھے، ان کا واقعہ میں بیان کرچکا ہوں۔ غزوہ احد میں ان کی آنکھ تیر لگنے سے باہر لٹک آئی۔ حضور نے اپنے دست مبارک سے وہ آنکھ اپنی جگہ پر واپس رکھ دی اور فرمایا کہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ آنکھ اتنی صحت مند ہوگئی کہ بقیہ زندگی میں دوسری آنکھ میں شکایتیں پیدا ہوتی رہیں اس آنکھ میں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

حضرت ابوہریرہؓ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک توشہ دان دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کو اپنے پاس رکھو، اس میں برکت ہوگی۔ ان کی جیب میں توشہ دان رہتا تھا۔ اس میں کھجوریں تھیں۔ جب بھی ضرورت ہوتی، نکال کر کھاتے رہتے تھے۔ حضور کی پوری زندگی کھاتے رہے، حضور ابوبکر صدیق کے پورے دور حکومت اور حضرت عمر فاروق کے ساڑھے دس سالہ دور میں کھاتے رہے۔ حضرت عثمان غنی کے ساڑھے بارہ سالہ دور میں جب بھی ضرورت پڑتی تھی تو اسی توشہ دان سے کھجوریں نکال کر کھالیا کرتے تھے۔ جس دن حضرت عثمان کی شہادت ہوئی اور مدینہ منورہ میں ہنگامہ فساد برپا ہوا تو وہ توشہ دان بھی افراتفری میں گم ہوگیا۔ حضرت ابوہریرہؓ ایک شعر کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو تو ایک غم ہے جبکہ مجھے دو غم ہیں۔ لوگوں کو یہ غم ہے کہ عثمانؓ شہید ہوگئے مجھے یہ بھی غم ہے کو میرا توشہ دان گم ہوگیا۔

اصحاب صفہ جن کی تعداد ستر اسی کے قریب ہوا کرتی تھی۔ اکثر وبیشتر ان کے پاس اپنے وسائل نہیں ہوا کرتے تھے۔ صحابہ کرام ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ کوئی کسی صحابی کے ساتھ اور کوئی کسی اور صحابی کے ساتھ چلا جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی دن کے وقفہ تک ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا۔ اصحاب صفہ ضرورت مند تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی ضرورت مند تھے اور آپؐ کے گھر میں بھی کھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک صحابی دودھ کا ایک پیالہ لے کر آئے۔ حضرت ابوہریرہؓ موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ میں کئی روز کے فاقے سے تھا۔ دودھ کا پیالہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ اصحاب صفہ کو بلا کر لے آؤ۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دل ہی دل میں کہا مجھے کیا ملے گا، اصحاب صفہ کو بلا کر لے آئے۔ وہ ستر آدمی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ایک کو باری باری پلانا شروع کردو۔ چنانچہ پیالہ ایک آدمی کو دے دیا گیا۔ اس نے پیا تو دوسرے کو، اس نے تیسرے کو دیا اور اس طرح ستر کے ستر آدمی سیر ہوگئے۔ پھر حضور نے مسکرا کر حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا 'بقیت انا و انت؟' میں اور تم رہ گئے؟ پھر حضرت ابوہریرہ سے فرمایا تم پیو۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے پیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ اور پیو۔ جب میں مزید پینے قابل نہیں رہا اور اصرار کیا کہ مزید نہیں پی سکتا تو حضور نے فرمایا کہ اب مجھے دے دو۔ اور سب کا پس خوردہ خود پی لیا۔

حضور ﷺ غزوہ خندق میں تھے۔ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے۔ پیٹ اتنا خالی ہے کہ سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے چادر میں پتھر لپیٹ کر پیٹ پر باندھ لیا ہے۔ حضور نے بطن مبارک دکھایا، وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھا ایک دوسرے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ جلدی سے اپنے گھر گئے۔ گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا، اس کو ذبح کرکے بیگم سے کہا کہ جلدی سے کھانا پکاؤ، میں رسول اللہ ﷺ کو لے کر آتا ہوں۔

حضرت جابر نے جب حضورؐ کو کھانے کی دعوت دی تو آپؐ نے وہاں موجود سب لوگوں سے کہا کہ چلو، جابر کے ہاں دعوت ہے۔ اسی آدمی حضور کے ہمراہ تھے۔ حضرت جابر پریشانی میں بیگم کے پاس گئے اور کہا کہ حضور کے ساتھ تو اسی آدمی ہیں۔ بیگم نے پوچھا کہ کیا آپ نے کہہ دیا تھا کہ اتنا بندوبست ہے۔ حضرت جابر نے جواب دیا کہ میں نے تو کہہ دیا تھا

کہ بکری کا ایک بچہ ذبح کیا ہے۔ بیگم نے کہا کہ جب تم نے کہہ دیا ہے تو باقی ذمہ داری حضورؐ کی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب تشریف لائے تو فرمایا کہ سالن کو ڈھک دینا اور کھولنا مت۔ روٹیاں پکاتی جاؤ اور ایک ایک کر کے دیتی جاؤ۔ دس دس آدمیوں کی ٹولی اندر آتی، کھانا کھاتی اور چلی جاتی۔ پھر دس مزید آتے۔ ایک اور خاتون بھی روٹیاں پکانے کے لئے آگئیں۔ دونوں خواتین جلدی جلدی روٹیاں پکاتی گئیں اور ڈھکے ہوئے برتن سے سالن نکال کر دیتے رہے اور جب تمام آدمی سیر ہو گئے تو آخر میں رسول اللہ ﷺ نے گھر کے افراد کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت انس کے والد ابوطلحہ کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے بھی چند لوگوں کے کھانے کا بندوبست کیا تھا جو بعد میں ستر اسی افرد کے لئے بخوبی کافی ہو گیا۔

غزدہ خندق کے علاوہ بھی مختلف غزوات میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اگر ان میں سے چیدہ چیدہ واقعات بھی بیان کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جو صحاح ستہ کی عام کتابوں میں موجود ہیں۔ باقی تفصیلات میں چھوڑ دیتا ہوں۔

ایک اور چیز جو کلامیات سیرت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی طرف علامہ شبلی نے اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ پہلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علم کلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن آج بہت سے مسائل جو دراصل تاریخ کے ہیں، لیکن اب ان کا تعلق علم کلام سے بھی ہو گیا ہے، کیونکہ لوگوں نے اس کے بارے میں شکوک اور تامل کا اظہار کیا، اس پر بحثیں شروع ہو گئیں اور یوں وہ تاریخ کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ علم کلام کا بھی مسئلہ بن گیا۔ آج کل اہل مغرب اور ان کے مشرقی تلامذہ توحید پر تو کم ہی لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ زیادہ اعتراض حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت مبارکہ، آپ کے اخلاق وعادات، آپ کے خاندان پر کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کی دوسری باتوں پر اعتراضات کئے جاتے ہیں جن کا جواب مسلمان علما نے بارہا دیا ہے۔ ان کے جواب پر اعتراضات ہوئے، ان کے اعتراضات کے جواب الجواب دیئے گئے اور اس طرح یہ بحث جاری رہی اور آئندہ بھی نہ معلوم کب تک جاری رہے گی۔ اس طرح بہت سے ایسے امور جو

دراصل کلامیات کے مسائل نہیں تھے لیکن اس بحث مباحثہ کی وجہ سے وہ کلامی مباحث بن گئے۔

کچھ کلامی مسائل ایسے تھے کہ جو دراصل کلامی نہیں تھے لیکن مسلمانوں میں بعض موضوعات پر بحث مباحثہ کی وجہ سے وہ معرکۃ الآراء کلامی مسئلہ بن گئے۔ مثلاً حضرت ابو طالب اسلام لائے تھے یا نہیں۔ یہ ویسے تو ایک تاریخی مسئلہ ہے۔ عبدالمطلب جن کا اسلام سے پہلے انتقال ہوگیا، ان کی حیثیت کیا ہے۔ ویسے تو یہ سوال ہم میں سے کسی سے بھی قیامت کے دن نہیں پوچھا جائے گا کہ ہاشم اور عبد مناف وغیرہ کا درجہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نبوت سے پہلے یہ لوگ حیات رہے۔ کس عقیدہ پر رہے، کس مذہب پر تھے، ہم نہیں جانتے۔ یہ ان لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا۔ اس پر بحثیں شروع ہوئیں۔ اس پر دلائل اور جوابی دلائل پیش کئے گئے۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی کلامیات کا ایک تنازعہ اور مسئلہ بن گیا۔ حضرت ابو طالب کے معاملہ میں فرقہ وارانہ رنگ بھی پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اصرار کیا کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ دوسرے گروہ نے اصرار کیا کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ محض تاریخ کا مسئلہ ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ہے۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا ہو، جس طرح کہ ہم سب کا دل چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو۔ تو میری اور آپ کی دینی ذمہ داریوں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر وہ رائے صحیح ہے کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا تو بھی ہماری ذمہ داریاں وہی رہیں گی جو اب ہیں۔ لیکن بہرحال یہ مسئلہ حساس قرار پایا اور اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئیں۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے والدین کا معاملہ ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ صحابیت کے مقام پر فائز ہوئے اور پھر دوبارہ فوت ہوگئے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ بشرطیکہ ایسا ہونا مسلمانوں میں قابل قبول روایات کے مطابق ثابت ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عمومی مشیت اور سنت (چند مستثنیات اور معجزات کو چھوڑ کر) کسی کو زندہ کرنے کی نہیں رہی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ بات بہت کثرت سے مشہور اور معروف ہوتی۔ مستند احادیث میں

آئی ہوتی۔ غیر مستند احادیث میں نہ آئی ہوتی۔ بہر حال بعض غیر معیاری اور غیر مستند یا ثانوی ماٰخذ میں موجود اس بات پر بعض حضرات نے کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی بھی اس کے قائل ہیں اور انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

یہ اور اس طرح کے کئی مسائل بنیادی طور پر تاریخی مسائل تھے۔ لیکن بعض اسباب کی بناء پر وہ تاریخی مسائل نہیں رہے۔ کلامی مسائل بن گئے۔ کچھ اور مسائل ایسے ہیں جو ایک اعتبار سے فقہی مسئلہ تھے۔ لیکن ایک دوسرے اعتبار سے وہ کلامی مسئلہ قرار پا گئے۔ خاص طور پر مغربی مستشرقین نے ایسے چند مسائل کو بہت اچھالا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد کا ہے۔ اسلام سے پہلے تعدد ازواج پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں تھیں۔ بائبل ہی میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں۔ اسی طرح سے مختلف انبیا کی ازواج کی تعداد کے بارے میں بائبل میں آیا ہے۔ ایک ہزار اور تین ہزار اور چار پانچ سو تک کی تعداد بیان ہوئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ بائیبل کی حد تک تعدد ازواج کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہوں نے اپنی دنیوی زندگی کے پہلے دور میں شادی نہیں کی تھی، دوبارہ تشریف لا کر لاتعداد شادیاں کریں گے۔ عیسائی خیال کے مطابق یہ تمام نن ان کی اعزازی بیویاں ہیں۔ نن اس انتظار میں تیار رہتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو یہ ان کی بیوی بن جائے۔ تو ان ہزاروں لاکھوں راہباؤں کو عیسائی نظری طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیویاں سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض سابقہ مذاہب کے پیروکاروں کو تو زیب نہیں دیتا۔ لیکن بہر حال انہوں نے اعتراض کیا۔

ان اعتراضات کا جواب عام طور پر علمائے کرام یہ دیتے چلے آئے ہیں کہ یہ خصائص نبوت میں سے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خاص اجازت دی۔ لیکن خاص اجازت کیوں دی، یہ سوال پھر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاص اجازت کی بات ایک صاحب ایمان مسلمان کے لئے تو قابل قبول ہو سکتی ہے، غیر مسلم پھر بھی اعتراض کرے گا۔ جو شخص حضور کو نبی ہی نہیں مانتا وہ تو قرآن میں اجازت ہونے یا نہ ہونے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ سب پہلے دو باتیں پیش نظر

رکھی جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ قرآن پاک میں چار بیویوں کی تحدید کی آیات کب نازل ہوئیں۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس تحدید کے بعد کوئی نیا نکاح فرمایا کہ نہیں فرمایا۔ ایک عام رائے یہ ہے کہ چار کی تحدید سن 7 ھ کے لگ بھگ نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے جو آخری نکاح فرمایا تھا وہ بھی اسی سال فرمایا تھا۔ اگرچہ اس کا کوئی حتمی تعین نہیں ہوا ہے کہ ان میں سے پہلے کونسا واقعہ ہوا ہے اور بعد میں کون سا ہوا ہے۔ ایک تو یہ بات تحقیق طلب ہے اور اس پر نظر رکھنی چاہئے۔

دوسری بات جو پیش نظر رکھنی چاہئے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو سن 5 ھ میں مسلمانوں کی مائیں قرار دے دیا گیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی حقیقی ماؤں کی طرح ہوں گی 'ولا تنکحوا ازواجه من بعده ابداً'، اور ان کے بعد کبھی بھی کوئی، ان سے نکاح نہ کر سکے گا۔ یہ سب کے لئے حرام ہوں گی اور کسی کے لئے ان سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا۔ یہ سب مسلمانوں کے لئے ماں کے برابر ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ چار کی تحدید آنے کے بعد اس پر عمل فرماتے تو آپ کیا کرتے۔ یک طرفہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ چار کے علاوہ باقی کو طلاق دے ڈالتے، اور ان کو ازواج مطہرات ہونے کے شرف سے محروم کر دیتے۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ یہ ناانصافی کس بنیاد پر کرتے؟ کن ازواج کو جانے دیتے اور کن چار کو رہنے دیتے۔ یہ ایک سوال بہر حال پیدا ہوسکتا تھا۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ ازواج مطہرات نسبتاً کم سن تھیں اور ان میں سے متعدد کی عمریں تیس چوبیس سال تھیں۔ ان کو جانے دیا جاتا تو ان کی باقی ساری زندگی ایک تجرد کے عالم میں گزرتی۔ یہ بھی ناانصافی تھی۔ مزید برآں ان میں سے بعض کے نہ رشتہ دار تھے اور نہ کوئی اور اہل خانہ۔ مثلاً حضرت صفیہ۔ طلاق کی صورت میں وہ کہاں جاتیں۔

اس لئے قرآن پاک نے ایک درمیانی حل یہ پیش کیا اور سورۃ احزاب میں فرمایا گیا کہ تم ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہو اپنے در دولت میں رکھو اور جس کو چاہو، ترجی من تشـــــاء، اور جس کو چاہو ملتوی رکھو۔ اس آیت کی تفسیر میں متکلمین اسلام نے بہت سی بحثیں کی ہیں۔ لیکن اگر اس کو اس سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کی دو قسمیں بنائی۔ ایک وہ جن کو ایوا کا شرف بخشا۔ ایک وہ جن کو

ارجاء کی منزل میں رکھا۔اس میں بھی قرآن حکیم نے فرمایا کہ آپ کوئی ردوبدل کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ 'لایحل لک النساء من بعد'، اس کے بعد آپ کے لئے کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔گویا وہ پابندی جو بقیہ لوگوں پر عائد کی گئی تھی ایک اعتبار سے حضور پر بھی عائد ہوگئی۔اور جو نو ازواج مطہرات اس وقت حیات تھیں وہی عقد نکاح میں رہیں۔ان کے بارہ میں یہ انتظام کر دیا گیا کہ پہلے حضور نے ان کو پیش کش کی کہ تم چاہو تو میں تم کو مال و دولت دے کر فارغ کر دوں۔یہ بھی سورۃ احزاب میں ہے۔ظاہر ہے کوئی خاتون اس شرف کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔پھر کچھ خواتین نے کہا کہ ہم اپنا حق چھوڑنے کو تیار ہیں۔لیکن آپ ہمیں زوجیت رسول کے اس شرف سے محروم نہ کریں۔حضرت سودہ کا اسم گرامی ان میں آتا ہے۔ایک طرح کا انتظام حضور نے یہ کیا کہ ازواج مطہرات میں چار حضور کے ساتھ ایوا کی منزل میں رہیں اور بقیہ پانچ ارجا کی منزل میں رہیں۔یہ ایک بحث ہے جو بعض حضرات نے کی ہے۔اس کا تعلق کلامیات سے ہے اور اس پر کوئی قطعی رائے دینا بہت مشکل ہے۔معاملہ اتنی غیر معمولی شخصیت کا اور اتنا نازک ہے کہ اس پر کچھ کہنا آسان کام نہیں ہے۔میں نے بطور مثال صرف اس لئے عرض کیا کہ یہ مسائل بھی کلامیات سیرت میں شامل ہیں جن کا براہ راست سیرت سے تعلق ہے۔

ایک اور چھوٹی سی بات کہہ کر میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔یہ بھی ایک رائے ہے اور امام جعفر صادق سے منسوب ہے۔حضرت امام جعفر صادق بہت بڑے فقیہ تھے۔اہل بیت میں سے تھے۔قرآن پاک میں جو آیا ہے کہ '**سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ**'، پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندہ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔مسجد اقصیٰ کے بارے میں صحابہ کرام سمیت ایک غالب اکثریت کا نقطہ نظر عام طور پر یہی ہے کہ مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس اور یروشلم کی مسجد مراد ہے۔امام جعفر صادق سے البتہ یہ بات منسوب ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس سے بیت المعمور مراد ہے، ساتویں آسمان والی مسجد۔جن حضرات نے اس بات کی تائید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی یہ بات درست ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک ایک بہت فصیح اور بلیغ کتاب ہے۔اور کلام بلیغ کا ایک تقاضا اور خوبی یہ بھی ہے کہ اگر دو کارناموں کا ذکر ہو اور اس

میں چھوٹے کارنامہ کا تذکرہ کرکے اصل کارنامہ کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بلاغت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت راتوں رات حضور کو بیت المقدس لے گئی۔ یہ بھی بڑا کارنامہ ہے اور بہت بڑا معجزہ ہے، لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ یہ ہے کہ آسمانوں کی سیر کرادی اور بیت المعمور تک کی زیارت کرادی۔ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی حضورؐ کی زندگی کے اس سب سے بڑے معجزہ کے نسبتاً چھوٹے پہلو کا تذکرہ تو ہو اور بڑے پہلو کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہ ہو۔ لہٰذا اگر اس مسجد اقصیٰ سے مراد وہ عبادت گاہِ ملائکہ لی جائے جو بیت المعمور کے نام سے مشہور ہے، تو بلاغت کا یہ تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں روم کو ادنی الارض کہا گیا ہے یعنی قریب کا علاقہ۔ اگر روم قریب کا علاقہ قرار پاتا ہے جو بیت المقدس سے زیادہ دور ہے تو جو قریب کی مسجد ہے اس کو دور کی مسجد کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے دور کی مسجد سے مراد تو وہ مسجد ہونی چاہئے جو روم سے بھی زیادہ دور ہو۔ روما کو تو قریب کی سرزمین کہا گیا۔ تیسری بات یہ کہی گئی کہ الذی بارکنا حولہ، جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا۔ اُس وقت تو بیت المقدس پر بت پرستوں اور مشرکین کا قبضہ تھا۔ انبیا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ تو بارکنا حولہ کی بات جتنی بیت المعمور پر پوری اترتی ہے اتنی کسی اور جگہ پر پوری نہیں اترتی۔ اس طرح کے بہت سے پہلوؤں پر مورخین اور مفسرین نے بات کی ہے جن میں امام جعفر صادق کی یہ رائے بھی شامل ہے۔

کلامیات سیرت میں ایک اہم مضمون بشائرالنبیین بھی ہے۔ مختلف انبیا علیہم السلام نے حضور کی آمد کی بشارتیں دی ہیں۔ مختلف آسمانی کتابوں میں اس مضمون کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ ان اشارات کو بہت سے اہل علم نے الگ سے کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ بشائرالنبیین کے نام سے بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ تمام سیرت نگاروں نے اس مواد کے حوالے دیئے ہیں۔ اردو زبان میں بھی اس حوالے سے کتابیں موجود ہیں۔ کلامیات سیرت پر اردو زبان میں بہت سے مصنفین نے بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ غالباً سب سے زیادہ جامع بحث ہمارے برصغیر کے دو مصنفین نے کی ہیں۔ مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے رحمۃ للعلمین میں اور علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی دو جلدوں میں۔

یہ وہ چند چیزیں تھیں جن کا تعلق سیرت اور علم کلام سے تھا۔ یہ سیرت اور علم کلام کے

مشترک مضامین ہیں۔ سیرت کو سمجھنے کے لئے یہاں علم کلام کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور علم کلام کے اس پہلو کو سمجھنے کے لئے سیرت کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ سیرت پر گفتگو کے اس سلسلہ میں اس موضوع پر بھی ضروری گزارشات پیش کی جائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆

سوال و جواب

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں مسلمان ستر سے زائد فرقوں میں تقسیم ہوں گے۔ اگر واقعی اسی طرح ہے اور یہی ہونا ہے تو ہمیں فرقوں کو ختم کرنے کی کاوشوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

جس حدیث میں یہ بات آئی ہے اس کی فنی حیثیت کے بارے میں بہت باتیں ہوئی ہیں۔ ان بحثوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک چیز یاد رکھنے کی ہے کہ عربی زبان میں ستر کا لفظ کثرت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یہاں ستّر سے مراد ستر کا عدد نہیں، بلکہ کثرت تعداد مراد ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ میری امت میں بہت سے فرقے ہوں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری امت میں لازماً ستر فرقے ہوں گے۔ بیان یہ کیا گیا ہے کہ طرح طرح کی گمراہیاں پیدا کرنے والے آئیں گے۔ تم لوگ میرے طریقے پر قائم رہنا۔ اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ ما انا علیہ و اصحابی۔ کہ ان تمام گمراہیوں کے سیلاب میں میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہی حق کا محفوظ راستہ ہوگا۔ اسی روایت کے مطابق صحابہ نے پوچھا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے، تو آپ نے فرمایا کہ میں اور میرے اصحاب جس طریقے پر ہیں تم اس پر قائم رہنا۔ حضورؐ اور حضور کے صحابہ کے طریقے پر جو رہے گا تو وہ کامیاب رہے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش ضرور ہونی چاہئے۔

☆

رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات جو مسلمانوں کی مائیں قرار دی گئیں، تو کیا ان کا اصحاب کرام سے پردہ کرنا لازم

نہیں تھا؟

ازواج مطہرات کے لئے پردہ لازمی تھا۔ ازواج مطہرات کو پردے کا حکم تھا۔ قرآن مجید میں سخت پردے کا جو حکم ہے وہ براہ راست ازواج مطہرات ہی کے لئے تھا۔ بعض فقہا کا یہ کہنا ہے کہ پردہ کے احکام ازواج مطہرات کے لئے نسبتاً زیادہ سخت تھے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت یا روایت نہیں رہی، جب کہ قرآن میں ہے کہ ثم بعثنا من بعد موتکم ......

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یقیناً بطور معجزہ کے مردے زندہ ہوتے رہے ہیں۔ میری مراد یہ تھی کہ چونکہ عام طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے اس لئے اگر ایسا ہو چکا ہوتا تو بہت کثرت سے اس کو روایت اور نقل کیا گیا ہوتا۔ چونکہ حضورؐ کے والدین کا دوبارہ زندہ کیا جانا کثرت سے نقل نہیں کیا گیا۔ بعض کمزور اور انفرادی روایتوں میں آیا ہے اس لئے بہت سے ماہرین حدیث کی نظر میں وہ محل نظر ہے۔ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا، یا نعوذ باللہ ایسا نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا، اصحاب کہف کو زندہ کیا۔ لیکن قرآن پاک میں آجانے کی وجہ سے یہ واقعات جتنی کثرت اور تیقن کے ساتھ مشہور ہیں اتنے تیقن سے وہ واقعات مشہور نہیں ہیں۔

☆

آپؐ کی بعثت کے وقت دنیا میں کتنے ادیان تھے اور دین ابراہیمی کا کیا مقام تھا؟ قریش میں عبداللہ کا نام کثرت سے ملتا ہے یہاں اللہ سے کیا مراد تھا؟

قریش کے اکثر لوگ دین ابراہیمی کے قائل تھے اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر

قائل ہو چکے تھے۔ عرب میں ملت ابراہیمی کی بہت سی چیزیں مشہور و معروف تھیں۔ خود قرآن پاک سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر عرب اللہ تعالیٰ کے خالق حقیقی ہونے کے قائل تھے۔ قرآن میں آیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اس لئے ملت ابراہیمی کی بہت ساری باتوں کو وہ تسلیم کرتے تھے۔ ان میں بعض گمراہیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کو پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ایک شخص عمرو بن لحی تھا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کئی سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس نے بہت سی گمراہیاں پھیلائیں۔ اس کی وجہ سے لوگ ملت ابراہیمی کے بہت سے طریقے بھول گئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس مضمون کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ عرب میں ملت ابراہیمی کی کون کون سی باتیں رائج تھیں اور کن کن باتوں کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ اس لئے وہ لوگ اللہ کے وجود کے قائل تھے۔ عبداللہ سے ان کی مراد وہی ہوتی تھی جو ہمارے اور آپ کے ہاں ہے۔

☆

فارابی اور ابن سینا نے نبوت وغیرہ کی تشریحات کی ہیں، کیا وہ قرآن مجید کے نصوص سے مطابقت رکھتی ہیں یا یونانی فلسفہ کے زیر اثر ان میں اختراعات اور گمراہیاں ہیں۔

آپ نے الفاظ بڑے خاصے استعمال کئے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ فارابی اور ابن سینا یونانی فلسفہ سے کس حد تک متاثر تھے۔ میں صرف اس بات کی قدر کرتا ہوں کہ فارابی اور ابن سینا نے یونانی فلسفہ سے سو فیصد متاثر ہوئے بغیر قرآن پاک اور اسلام کے احکام کے بموجب ان مسائل کو بحث کے قابل سمجھا اور یونانی فلسفہ کے دلائل کی روشنی میں نبوت اور وحی کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یقیناً ان کا نقطہ نظر مسلمانوں کے روایتی نقطہ نظر سے سو فیصد مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نہیں رکھتا۔ لیکن ان کی یہ کوشش اور ان کا یہ جذبہ اپنی جگہ بہت قیمتی اور قابل قدر ہے۔

☆

برصغیر پاک وہند میں نبی ﷺ کے علم کے بارے میں بحث رہی ہے۔کیا کسی امتی کا یہ منصب اور حیثیت ہو سکتی ہے کہ وہ کہے کہ حضورؐ کو دیوار کے آگے کا علم ہے، پیچھے کا نہیں؟

کم سے کم میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حضور علیہ السلام کے علم کا وزن کر کے اس کی مقدار بیان کر سکوں۔حضور کا علم بہت وسیع اور غیر معمولی تھا۔تمام انسانوں سے زیادہ تھا۔تمام انبیاء کے علم سے بڑھ کر تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین اور آخرین کا علم دیا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں حضورؐ کا علم بہر حال بہت محدود تھا۔اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود، بے نہایت ،یقینی اور قطعی ہے۔حضور کو جو علم دیا وہ اپنی سارے وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود علم الٰہی کے مقابلہ میں محدود علم تھا۔اس لئے جب اللہ اور اس کے رسول کے علم کا تقابل ہوگا (جو میری ناچیز رائے میں ایک غیر ضروری اور بے فائدہ مشغلہ ہے) تو اور بات کہی جائے گی اور جب حضور کے علم کا موازنہ بقیہ انسانوں کے علم سے ہوگا (جو کوئی فضول شخص ہی کرے گا) تو پھر یہی کہا جائے گا کہ حضور کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

☆

جو امور صرف نبی کی ذات سے متعلق تھے وہ قرآن پاک میں کیوں ذکر کیے گئے؟

اس لئے ذکر کیے گئے کہ اگر نبی کو اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے کسی خاص امتیاز کی ضرورت ہے تو لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ امتیاز قرآن پاک نے آپ کو دیا ہے اور آپؐ نے اپنی ذات کے لئے خود کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔اللہ نے جو چیز حضور کو دی تو وہ قرآن میں لکھ دی گئی۔تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی یا بدگمانی کا امکان نہ رہے۔اس لئے قرآن پاک میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

☆

اہل تشیع نبی ﷺ کو معصوم کلی مانتے ہیں۔

نبی ﷺ کو معصوم کُلّی تو ہر مسلمان مانتا ہے۔ ہر پیغمبر کو معصوم کلی ماننا ایمان کا تقاضا ہے۔ اس میں اہل سنت اور کسی اور میں کوئی فرق نہیں ہے۔

☆

علامہ شبلی نعمانی کے نزدیک ازواج مطہرات کی تعداد بیس سے زائد ہے لیکن آپ نے نو ارشاد فرمائی ہے۔

بیس سے زائد تو بہرحال نہیں ہے۔ لیکن میں نے جن نو کا ذکر کیا تو یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کی نکاح میں نو ازواج مطہرات موجود تھیں۔ اُس وقت حضرت خدیجہؓ، زینبؓ بنت خزیمہ اور غالباً ایک دو اور کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت حضور کے نکاح میں نو ازواج مطہرات تھیں۔

☆

معجزے نبی کی طرف بھی منسوب ہیں اور باقی انبیا کی طرف۔ ان میں کس حد تک فرق کیا جا سکتا ہے؟

ایک بڑا فرق تو یہ ہے کہ بقیہ انبیا کے معجزے جو قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں وہ حسی یعنی physical معجزے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ قرآن کریم کی صورت میں ایک intellectual اور معنوی معجزہ ہے۔

☆

واقعہ اسرا میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے۔ کیا کوئی اشارہ قرآن پاک میں آسمان کی سیر کا بھی ہے؟

قرآن پاک میں آسمان کی سیر کے بالواسطہ اور لطیف اشارے ہیں، قرآن پاک میں

اس کی صراحت نہیں ہے۔

☆

واقعہ معراج کے وقت مسجد اقصیٰ کی صورت کیا تھی؟

مسجد اقصیٰ کی جو موجودہ عمارت ہے یہ بنوامیہ کے زمانے میں بنی ہے۔ واقعہ معراج کے وقت یروشلم میں یہ یا کوئی اور مسجد موجود نہیں تھی۔

☆

آپ نے لفظ محمد کا قیصر کے ہاتھوں مسخ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی ہے کہ قیصر نے لفظ محمد کو مسخ کیا ہو۔ پتہ نہیں آپ نے کس بات یا جملہ سے کس طرح یہ مطلب لیا ہے۔ کسریٰ شہنشاہِ ایران نے حضورؐ کا نامہ مبارک پھاڑا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح اس نے میرا خط پھاڑا ہے اس طرح اس کی سلطنت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

☆

عقلیات اسلام اور عقلیات سیرت کے تحت اسلام کی توجیہ کو اسلام کی اصل توجیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن مجید زیادہ تر عقل وفکر کو استعمال کرنے اور سوچنے پر زور دیتا ہے؟

میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں بلکہ ہر قوم میں ہمیشہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو معاملات کے عقلی پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ دینی معاملات میں بھی عقلی انداز سے غور کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ دینی معاملات کو عقلی دلائل کے ساتھ بیان کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ دینی حقائق کی کوئی غیر معقول یا کمزور اور رکیک تاویل نہ کی جائے۔

کلامیات سیرت کی ضرورت تو جب پڑے گی جب مسلمانوں پر لازم ہو کہ غیر مسلموں کو اپنے دلائل سے مطمئن کریں۔ حالانکہ مسلمان پر ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔

میرے خیال میں تو واجب ہے۔ مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے اور ان کے لئے دینی اعتبار سے ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو مطمئن کریں۔ یہ ہمارا دعوتی اور تبلیغی فریضہ ہے۔ اسلام کے عقائد اور تعلیمات کی صداقت کے بارہ میں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مغربی انداز کے دلائل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کو یہ دلائل دینے پڑیں گے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا بہترین معجزہ خود آپ کی سیرت مطہرہ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت ہے جس کا مثالی نمونہ آپ کی شخصیت تھی۔ اگر وقت ہو تو اس ام المعجزات پر مزید روشنی ڈالیں کیونکہ شریعت آپ کی خاص دلچسپی کا مضمون ہے اور شریعت کے بارے میں بڑے فتنے پھیلائے جا رہے ہیں۔

شریعت پر مفصل گفتگو کی جائے یہ بات تو بہت لمبی ہو جائے گی۔ شریعت کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور اتنے مضبوط عقلی دلائل پر استوار ہے کہ چودہ سو سال سے اس پر لوگ غور کر رہے ہیں اور اس کے عقل پر مبنی ہونے کے نئے نئے دلائل سامنے آرہے ہیں۔ اس کے متکامل ہونے کے بارے میں نئے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔ شریعت میں جن موضوعات پر احکام دیئے گئے ہیں ان میں خالص اخلاقی احکام بھی شامل ہیں۔ روحانیات کے اصول بھی ہیں اور خالص قانونی مسائل اور تصورات بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں عملیت یعنی اس کا

practical ہونا بھی ہے۔ شریعت بیک وقت عملی چیز بھی ہے اور مثالی بھی ہے۔ اس میں قانون اور اخلاق کا انسانی تاریخ میں پہلی بار کامیاب اجتماع بھی ہے۔ شریعت کا ہر حکم اخلاقی اصولوں پر مدار رکھتا ہے اور تمام اخلاقی اصول قانون کی شکل میں concretize ہوتے ہیں۔ نہ یہاں اخلاق و قانون محض نظریہ ہے جس کی عملی تشکیل کا سامان نہ ہو، جس طرح کہ دوسرے بہت سے نظاموں میں بعض نظریات ہوتے ہیں کہ نظریاتی حد تک تو وہ بہت خوشنما اور اچھے اخلاقی اصول ہوتے ہیں لیکن عمل کی میزان میں بہت ہلکے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ کوئی تمہارے ایک گال پر چانٹا مار دے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو، تقریر کرنے میں تو اچھی لگتی ہے، لیکن کیا آج تک کوئی ایسا آدمی آیا ہے جس نے ایک گال پر چانٹا کھا کر دوسرا گال بھی واقعتاً دشمن کے سامنے پیش کر دیا ہو۔ کسی دشمن نے ایک شہر فتح کر لیا ہو تو مفتوح ملک کے حکمران نے دوسرا شہر بھی رضا کارانہ خالی کر دیا گیا ہو کہ یہ بھی لے لو۔ ایک کمرے میں ڈاکہ پڑا ہو تو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا ہو کہ میاں چور یہاں کا مال بھی لے جاؤ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نظری حد تک، تقریر کرنے اور شعر و شاعری کے لئے یہ بڑا اچھا نعرہ ہے، لیکن جب تک کسی نعرہ کو قانون کی شکل دے کر عملاً یہ نہ بتایا جائے کہ اس پر عمل کیسے ہوگا وہ محض ایک نظریہ اور ایک نعرہ ہے۔

اسلامی شریعت نے جہاں اخلاقی اصول بتائے ہیں وہاں ان کو قانون سے relate کیا ہے۔ جو قانونی احکام دیئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی اساس اخلاقی ہدایات اور اصولوں پر ہے۔ اسلام میں اخلاق اور قانون دونوں یکجا ہوتے ہیں۔ اسلام میں جو آدمی جتنا مذہبی ہے وہ اتنا ہی قانون کا پابند ہے۔ اسی طرح جو شخص اسلامی قانون پر جتنا کاربند ہے اتنا ہی وہ فکری اور اخلاقی اعتبار سے اونچے مقام پر ہے۔ یہاں روحانیت، spirituality, legality, religiosity اور قانون کی پابندی سب ایک جگہ جمع ہیں جو پہلے کبھی بھی اس طرح توازن سے جمع نہیں تھیں۔ دوسری روایات میں مذہبی لوگ دنیا کے عملی مسائل سے دور ہیں۔ جو عملی مسائل سے قریب ہیں وہ مذہبیات سے دور ہیں۔

☆

اگر بچہ کو پیدائش کے فوراً بعد ماں سے الگ کر دیا جائے اور بعد میں جب اس کو موقع دیا جائے تو کیا وہ اپنے والدین کو پہچانے گا؟

پتہ نہیں آپ نے میری بات کو کیسے سنا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ہر بچہ ہر حال میں اپنے ماں باپ کو پہچان لیتا ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ جو شخص زندگی بھر اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ جس نے تیس چالیس سال ماں باپ کو دیکھا ہو، ان کی محبتوں اور شفقتوں سے بہرہ مند چلا آ رہا ہو، جو ہر دکھ درد میں ان کی ہمدردی اور سرپرستی دیکھتا آیا ہو، اس کو ماں باپ کو ماں باپ ماننے کے لئے کسی اور خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کو بغیر کسی دلیل کے والدین کے اس پورے رویہ اور طرز عمل کی وجہ سے قطعی یقین ہوتا ہے کہ یہی میرے ماں باپ ہیں۔ اس کو مزید کسی دلیل، کسی دستاویزی ثبوت یا نکاح نامہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لئے ماں باپ کا کردار اور رویہ ہی ان کے ماں باپ ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جو شخصیات حضور کی ذات اور کردار سے واقف تھیں۔ جنہوں نے تیس تیس چالیس چالیس سال تک آپ کو قریب سے دیکھا تھا، انہوں نے حضور کی دعوت سنتے ہی قبول کر لیا اور کوئی خارجی ثبوت اور معجزہ طلب نہیں کیا۔

☆

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا نام دوبارہ بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ یہ کس language میں ہے؟

کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ یہ براہ راست سیرت پر نہیں بلکہ علوم سیرت اور علوم حدیث پر ہے۔ انہوں نے اس موضوع کا نام علم اسرار حدیث قرار دیا ہے۔ جگہ جگہ سیرت پر بھی بحث کی ہے۔ ایک حصہ میں سیرت کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے۔ غزوات بھی بیان کئے ہیں۔ جگہ جگہ منصب نبوت، مقام نبوت اور فرائض نبوت کو بیان کیا ہے۔ حضور کی تعلیم میں جو حکمتیں اور سبق پوشیدہ ہیں ان کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ اس کا اردو اور

انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

☆

کیا رسول اللہ ﷺ کے پاس قیامت کا علم تھا؟ کیا آپ نے قیامت کے آنے کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟

حضور کو قیامت کے وقت کا قطعی اور حتمی علم تھا یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مشہور حدیث جبرئیل میں حضورؐ نے فرمایا تھا: ماالمسئول عنها بأعلم من السائل ۔یعنی میرا علم قیامت کے بارہ میں جبرئیل کے علم سے زیادہ نہیں۔ یہ بات بہرحال واضح ہے کہ اس سے زیادہ قیامت کے بارہ میں حضور نے بتایا نہیں۔ اگر کسی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔ مثلاً ایک صحابی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔ تو آپؐ نے جواب میں قیامت کا وقت نہیں بتایا، بلکہ سائل سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے کہا کہ میں نے تو نماز روزہ زیادہ نہیں کیا لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم اس کے ساتھ ہو گے جس کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔

حضور نے قیامت کے دن یا وقت کا تعین نہیں کیا، کیونکہ یہ اللہ کی حکمت اور سنت کے خلاف تھا۔

☆

سائنس اور اسلام کے تصور عقل کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت فرمادیجئے۔

ہمارے ملک کے معروف سائنسدان ڈاکٹر ایم قریشی صاحب یہاں تشریف فرما ہیں وہ مجھ سے کہیں بہتر وضاحت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے بڑے سائنسدانوں میں سے ہیں۔ میں خود کبھی بھی سائنس کا طالب علم نہیں رہا اس لئے سائنس کے تصور عقل کے بارے کچھ میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اسلام کا تصور عقل یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی

بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے اور سمجھنے کا ملکہ دیا ہے۔ وہ جب اس کو استعمال کرتا ہے تو شریعت کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دوسرے شواہد اور وسائل کی روشنی میں چیزوں کے اچھے اور برے ہونے کا فیصلہ کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ کسی مادی مفاد، کسی علاقائی عصبیت یا کسی اور اس طرح کی چیز سے متاثر نہ ہو۔ یہ اسلام کا تصورِ عقل ہے۔

☆

واقعہ معراج کے بارے میں حضرت عائشہ کی روایت کی تفصیل سے یہ سمجھ نہیں سکے کہ کیا واقعی معراج روحانی واقعہ تھا؟

مسلمانوں کا عام نقطہ نظر یہ ہے کہ معراج جسمانی تھی۔ حضرت عائشہ کا ارشاد یہ ہے کہ معراج روحانی تھی۔ روحانی کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ نیند یا خواب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کی روح مبارک کو لے جایا گیا اور حضور کی روح مبارک سارے آسمانوں کی سیر کر کے آ گئی۔ حضور نے تقریباً اسی طرح physically چیزوں کو دیکھا جس طرح انسان اپنے سر اور جسم کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

☆

معجزات کی بنیادی ضرورت بیان فرمائیں۔ آپ کے بیان کے مطابق جو لوگ ایمان لانا چاہتے ہیں وہ معجزات کے بغیر بھی ایمان لائے۔ جو ایمان لانے والے نہیں تھے وہ معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائے۔

میں نے صرف یہ عرض کیا ہے کہ معجزات ان لوگوں کے لئے ہوتے ہیں جو شک اور تذبذب کا شکار ہوں۔ جو پہلے سے سعید اور نیک بخت روح ہوں اور فطرت سلیمہ رکھتے ہیں ان کو معجزات کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے کوئی معجزہ

طلب نہیں کیا۔ حضرت علی نے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔ یہ سب پہلے سے ایک سعادت مندی رکھتے تھے۔ ان کی فطرت سلیم تھی۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگ ساری عمر معجزے ہی طلب کرتے رہے، لیکن مسلمان نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ان کے دل میں کھوٹ تھا۔

جو لوگ درمیان میں تھے ان میں سے اگر کسی نے کوئی معجزہ دیکھا تو ان کی کمزوری دور ہوگئی اور شکوک ختم ہو گئے۔

☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ازواج مطہرات کی جو تقسیم کی اس کی تفصیل بیان فرمادیں۔

یہ سورۃ احزاب میں ہے۔ اس کی تفصیل میں علامہ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب اور حضرت اُمّ سلمہ کو حضور نے قریب رکھا اور بقیہ کو ارجاء کی منزل میں رکھا۔

☆

دورِ نبوی کے بعد اکثر یہ ہوا ہے اور آج بھی یہ ہو رہا ہے کہ مختلف فلسفوں کے مطابق اسلام کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک دفاعی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ کیا ہم aggressive بھی رہے ہیں؟

میرے خیال میں یہ دفاعی اور جارحانہ کی اصطلاحات اسلامی اصطلاحات نہیں، مغربی اصطلاحات ہیں۔ اسلامی تعلیم اور شریعت کے سیاق و سباق میں مغربی اصطلاحات استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں اسلام کی دعوت مثبت طور پر پیش کرنی چاہئے۔ چاہے کسی کے اسلوب کے مطابق وہ قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی اسلام پر علمی اور عقلی انداز سے اعتراض کرے تو اس کا جواب دینا چاہئے۔ یا جو مسلمان کسی اعتراض سے متاثر ہو رہا ہو تو اس کو مطمئن کرنے کے لئے جواب دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کو اہل مغرب دفاعی کہیں یا

جارحانہ کہیں۔

☆

آپ نے فرمایا کہ آپؐ کے خواب عام خوابوں کی طرح ہیں۔
اگر اسرا اور معراج خواب میں ہو تو قابل قبول نہیں۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے خواب نعوذ باللہ دوسرے انسانوں کے عام خوابوں کی طرح ہیں۔ نبی کا خواب بھی وحی کی ایک شکل ہوتی ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ معراج اگر محض خواب ہوتی تو منکرین اور کفار مکہ اتنی شدت سے اس پر اعتراض نہ کرتے اور اس کا استہزا نہ کرتے۔ جس شدت سے انہوں نے انکار کیا اور ردعمل ظاہر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خواب نہیں تھا، بلکہ خواب سے بڑھ کر کوئی چیز تھی۔ جمہور کے نزدیک معراج کا سفر روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں کا سفر تھا اور کچھ کے نزدیک، جن میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی شامل تھیں، معراج روحانی تھی۔ لیکن یہاں روحانی ہونے کا مطلب بھی خواب یا منام کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ خواب میں انسان کی روح اس کے جسم سے جدا نہیں ہوتی۔

☆

قیصر نام رکھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں قیصر کے لفظ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس وجہ سے نہ رکھے کہ ایک غیر مسلم کا نام تھا تو تو اس کو اختیار ہے۔ شرعاً اس نام کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ محض ایک لفظ ہے اور اس کو نام کے طور پر پہچان کے لئے استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس لفظ میں کوئی مشرکانہ بات نہیں اس لئے اس کو نام کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

☆

آپ صرف اہل حدیث کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ
ان کی کتابوں پر بہت تنقید ہوئی ہے۔

میں نے تو کسی متعین مسلک کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر مجدد الف ثانیؒ، قاضی عیاض، شاہ ولی اللہ اور ابن قیم آپ کے نزدیک اہل حدیث ہیں تو پھر بات اور ہے۔ میں تو مسلمانوں کی مشترکہ علمی میراث سے حوالے دے رہا ہوں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر حوالے نہیں دے رہا ہوں۔

☆

اتنے بڑے علمی خطبات کا کیا فائدہ جب آپ میں عمل نظر نہیں آ رہا۔ مثلاً تصویر اتروانا منع ہے، لیکن یہاں آپ کی اور ہم سب کی تصاویر بن رہی ہیں۔ خواتین کے لئے الگ ہال میں خطبہ سننے کا انتظام نہیں ہے۔ کرسیوں کی ترتیب مرد و زن کے اختلاط کے طرز پر ہے۔ یہ آپ کس نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ میں آج پہلی بار خطبہ سننے آئی تھی۔ آئندہ کبھی نہیں آؤں گی اس لئے کہ اس گندگی میں بیٹھ کر حکمت کے موتی نہیں چن سکتی۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی اس گندگی کا حصہ بن جاؤں۔ ہوسکتا ہے کہ جو چیز آج مجھے بہت بری لگ رہی ہے کل کو اتنی بری نہ لگے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں صحابیات نماز کے لئے مسجد نبوی میں آیا کرتی تھیں۔ وہاں مرد صحابہ بھی ہوتے تھے۔ مردوں کی صف آگے اور صحابیات کی صف پیچھے ہوتی تھی۔ [illegible] کا انتظام تھا جیسا یہاں کیا گیا ہے کہ خواتین کے آنے جانے کا راستہ الگ اور مردوں [illegible] تھا۔

تمام صحابہ امہات المومنین کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ امہات المومنین کے علاوہ بھی محدث صحابیات تھیں۔ عمرہ بنت عبدالرحمٰن بڑی معروف محدث صحابیہ تھیں۔ ان کے پاس لوگ جایا کرتے تھے۔ ان کے بعد بھی ہر دور میں فقیہات اور

محدثات ہوتی رہی ہیں جن سے لوگ کسب فیض کرتے رہے۔ یہ کہنا کہ پردہ کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر دین کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا، درست نہیں ہے۔ شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ مرد و زن حجاب کی پابندی کے ساتھ دینی احکام پر عمل نہ کریں۔ آخر طواف، سعی، حج یہ سب عبادات مرد و زن ایک ساتھ ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے دور سے اسی طرح ہوتا آرہا ہے۔ آپ دوبارہ شریعت کا مطالعہ کریں۔ سیرت کو دیکھیں، حدیث کی کتابیں پڑھیں اور آپ کے ذہن میں اگر پہلے سے کچھ تعصبات ہوں تو ان کو نکال دیں۔ آپ نے سیرت کی اس پاکیزہ، بابرکت اور مقدس محفل کو گندگی کہا ہے یہ خود ایک بہت بڑی جسارت اور گستاخی ہے۔ اس پر اللہ کے حضور دو رکعت نماز پڑھ کر توبہ کریں اور ہم سب کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور ہم سب کو نیک ہدایت دے، آمین

☆

دنیا میں ایسے قبائل ہیں جن تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی۔ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

یہ فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کرے گا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ عام طور پر متکلمین اسلام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انسان ایسا ہو جس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو، تو وہ اگر جزوی طور پر بھی توحید پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔

☆

جادو اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟

جادو اور معجزہ میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ جادو کا فن جاننے والے جب معجزہ کا مقابلہ کرنے آئے تو انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا کہ جادو کے مقابلہ میں جو چیز سامنے آئی ہے یہ جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کی نشانی ہے۔ جادو اگر کوئی چیز ہے تو محض نظر کا دھوکہ اور کھیل ہے۔ معجزہ حقیقی چیز ہے۔

☆

جیسے یہ حقیقت ہے کہ کفار یا کوئی بھی قرآن یا اس کی ایک آیت جیسی آیت بنانے سے قاصر رہے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی فصاحب و بلاغت ہے یا کچھ اور؟

اس سے مراد قرآن کی فصاحت اور بلاغت بھی ہے اور بھی بہت کچھ مراد ہے۔ قرآن میں جو کچھ بھی ہے، فصاحت و بلاغت اور معانی و مطالب یہ سب چیزیں اس درجہ کی ہیں کہ ان کا مثل بنانا ور نظیر بنانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔

☆

اللہ تعالیٰ نے فرمایا واللہ یعصمک من الناس ، اس کا ایک مفہوم تو یہ بھی ہے کہ آپ کی جسمانی حفاظت بھی کی گئی لیکن طائف کے موقع پر اور دوسرے غزوات میں آپ زخمی ہوئے اور آپ پر جادو بھی ہوا۔ کیا یہ آیت ان واقعات کے بعد نازل ہوئی تھی یا پہلے؟ کیا ہر رسول نبی ہے؟ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ انبیا کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ان میں سے 313 رسول تھے۔ اگر ایسا ہے تو رسولوں کی تعداد 313 ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دشمنان اسلام سے آپ کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں تشریف لے جاتے تھے تو آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو شہادت کا منصب بھی حاصل ہو۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیاثم اقتل ثم احیاثم اقتل ثم احیاثم اقتل ثم احیاثم اقتل '، یعنی میری دلی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔ گویا شہادت ایک ایسا مرتبہ ہے جس کی آرزو نبی بھی

کرتا ہے۔لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا کہ کوئی شخص نبی آخرالزمان کی جان لینے کا ذریعہ بنے۔یہ بات ہوتی تو شاید پوری امت ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتی۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی خواہش جزوی طور پر پوری کر دی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے راستہ میں کئی بار زخمی ہوئے اور پروردگار کے حضور میں اپنا خون بہایا،اور کئی بار ایسا ہوا۔

☆

جو لوگ اسلام سے پہلے حج کرتے تھے وہ کس عقیدہ اور مذہب کے تحت حج کرتے تھے؟

وہ ملت ابراہیمی کے طریقے کے مطابق حج کرتے تھے۔ملت ابراہیمی کے بہت سے آثار عرب میں موجود تھے۔کچھ چیزیں اس میں غلط شامل ہو گئی تھیں۔بعض قبائل غلط چیزوں میں زیادہ مبتلا تھے بعض کم مبتلا تھے،لیکن حج کے اکثر و بیشتر مراسم ملت ابراہیمی کے مطابق ہی ادا ہوتے تھے۔

☆

کلامی طریقہ سے سیرت کے کسی پہلو یا کسی اور حکم پر ایمان لانا اور یقین کرنے کو عبادت کہہ سکتے ہیں؟

یقیناً یہ عبادت ہے کہ آپ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی عقل سے دستبردار ہو جائیں اور اللہ کی تعلیم کو مانیں۔

☆

نبی علیہ السلام نے بہت سی پیشین گوئیاں فرمائیں جو ہر بار درست ثابت ہوئیں۔کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ غیب کا علم رکھتے تھے؟

جس اور جتنے غیب کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ آپ رکھتے تھے۔اللہ تعالیٰ

نے غیب کا کتنا علم حضور علیہ السلام کو دیا تھا یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

☆

کیا سیرت کا ہر متنازع پہلو کلامیات کے تحت آئے گا؟

سیرت کا کوئی متنازعہ پہلو نہیں ہے۔ متنازع پہلو سے اگر وہ پہلو مراد ہیں جو عقائد اور کلام سے متعلق ہیں وہ کلامیات کے زمرے میں آئیں گے اور جن میں کلامی بحثیں نہیں ہوں گی وہ کلامیات میں نہیں آئیں گے۔

☆

راجہ حسن اختر کے نام علامہ اقبال کے خط کا حوالہ درکار ہے۔

علامہ اقبال کی بعض منتخب تحریروں کا مجموعہ انوار اقبال کے نام سے اقبال اکیڈمی نے 1968 کے لگ بھگ شائع کیا تھا۔ اس میں یہ خط بھی شائع ہوا تھا۔ ایک عجیب بات ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے، اقبال اکیڈیمی اس کی ذمہ دار یا کوئی اور ہے۔ علامہ اقبال کے خط کا اصل جملہ یہ تھا کہ جو شخص ان تین چیزوں کا مدعی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ مدعی نبوت سمجھا جائے گا اور خارج اسلام اور واجب القتل ہوگا۔ اس میں آخری دو جملے کاٹ دیئے گئے ہیں اور اس کی جگہ نقطے ڈال دیئے گئے ہیں۔ لیکن اسی کتاب کے آخر میں بعض منتخب دستاویزات کا فوٹو بھی ہے۔ علامہ اقبال کے اس مذکورہ خط کا فوٹو بھی ہے جس میں یہ الفاظ صاف پڑھے جاسکتے ہیں کہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوگا اور واجب القتل ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرنٹنگ کے کام میں کوئی قادیانی صاحب بیٹھے ہونگے اس لئے یہ حصہ نکال دیا گیا۔ انوار اقبال 1968، اقبال اکیڈمی کراچی۔

☆

یہ بات کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں، یہ بحث کیوں شروع ہوئی اور اس کی وجوہات کیا تھیں؟

اصل میں یہ مسئلہ تو بہت طویل فرصت کا متقاضی ہے۔ اصل بحث یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور ذات میں تعلق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو قدیم ہے، ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ کیا صفات بھی اسی طرح ہیں۔ جب یہ سوال سامنے آیا تو بالاتفاق یہ رائے قائم کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی قدیم ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ذات موجود ہے تو اسی وقت سے وہ خالق بھی ہے، متکلم بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ کیا جب اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں تو کیا ان کے مظاہر بھی اسی طرح قدیم ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ خالق ہے تو کیا مخلوقات بھی ہمیشہ سے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ متکلم ہے تو کیا کلام بھی ہمیشہ سے ہے؟ اس پر محدثین نے رائے ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہمیشہ سے ہے۔ انہوں نے کلام نفسی اور کلام لفظی کی دو قسمیں قرار دیں جن پر ہونے والی بحثیں علم کلام کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ پھر چونکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ بھی پہلے سے اسی طرح محفوظ تھا۔ کچھ حضرات نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ کلام اللہ تو الگ physical چیز ہے۔ اس کو بھی اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح قدیم مانا جائے تو دو قدیم ذاتوں کا ماننا لازم ہو جائے گا۔ یہ تصور توحید کے خلاف ہے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا اور چونکہ حکومت ان لوگوں کے پاس تھی جو اس رائے حامل تھے اس لئے انہوں نے اس عقیدہ کو عام کرنے میں زبردستی سے کام لیا۔ اس سے بعض محدثین اور حکومت کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ دونوں طرف سے اپنے اپنے موقف کو بیان کیا گیا۔ حکومت نے بعض لوگوں پر سختی کی جو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ سختی معتصم کے زمانے میں زیادہ ہوئی۔ اس کے افسوس ناک مظاہر بعض انتہائی محترم اور بزرگ شخصیات کو آزمائش میں ڈالنے کی صورت میں برآمد ہوئے۔

اس سے حدیث کے مطالعہ میں کلامی رجحان کے نام سے ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔

☆

نہ صرف مستشرقین نے بلکہ اب تو تمام اہل مغرب نے اسلام کے نظریہ جہاد کو بڑے شدومد کے ساتھ اپنے شبہات اور اعتراضات کا ہدف بنایا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف

پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا ہے۔کیا یہ بھی کلامیات سیرت کا ایک اہم مبحث ہے؟

یقیناً یہ کلامیات سیرت کا ایک اہم مبحث ہے۔اس پر بات ہونی چاہئے لیکن مختصر وقت میں بات کرنا دشوار ہے۔ جہاد اسلام کا ایک حکم ہے۔ایک حدیث میں اس کو ذروۃ سنام الاسلام یعنی اسلام کی عمارت کا سب سے اونچا برج قرار دیا گیا ہے۔عمارت کا برج اس کی خوبصورتی اور اس کی تعمیر کی تکمیلی شان کا اظہار کرتا ہے۔ جہاد سے اسلام کے تکمیلی شان کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ وہ دین اور شریعت انتہائی نکمل ہے جس میں جہاد کے احکام بھی دیئے گئے ہوں۔ پھر انہوں نے عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی شریعت کس طرح اور کیوں مکمل ہے۔اس لئے جہاد پر تو گفتگو ہونی چاہئے۔اگر آپ پہلے توجہ دلاتے تو میں جہاد پر نسبتاً زیادہ تفصیل سے بات کرتا۔

☆

برصغیر کے کلامیاتی مسائل پر آپ کے ارشادات مطلوب ہیں......

جب برصغیر پر بات ہوگی تو برصغیر کے کلامیاتی مسائل پر بھی بات ہوگی۔تاہم اس باب میں میرے اقوال وخیالات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں اکابر اسلام کے اقوال وارشادات کا ناقل اور مرتب ہوں:

شنیدم آن چہ از پاکان امت
ترا با شوخی رندانہ گفتم

☆

نواں خطبہ

فقہیات سیرت

نواں خطبہ

فقہیات سیرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان صاحب،
محترم جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان صاحب،
محترم امیر البحر جناب افتخار احمد سروہی صاحب،
برادران محترم،
خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا موضوع ہے 'فقہیات سیرت'۔ بظاہر فقہ اور سیرت دونوں الگ الگ موضوعات اور مضامین سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ کا دائرہ کار قانون اور شریعت کے اصول ہیں۔ سیرت کا دائرہ کار عموماً تاریخ اور رسول اکرم ﷺ کی سوانح عمری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ فقہ سے مراد ایک گہری اور عمیق فہم اور profound understanding ہے۔ یعنی گہری فہم قرآن پاک کے احکام کی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت مبارکہ کی، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کی۔ جب تک ان تینوں چیزوں کی گہری فہم حاصل نہ ہو۔ جب تک ان تینوں مصادر ہدایت میں گہری بصیرت حاصل نہ ہو، اس وقت تک شریعت کے قوانین اور احکام پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے فقہ اور سیرت میں انتہائی گہرا اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔ سیرت سے

واقفیت شریعت کے بہت سے احکام کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر جانے بغیر سیرت کی نزاکتوں اور حکمتوں کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ ایک اعتبار سے سیرت ہی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔ اور فقہ سیرت ہی کی گہری فہم کا نام ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ فقہ کی اصطلاح بہت عمومی، جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے دین اور آپ کی عطا فرمودہ شریعت کے ہر ہر پہلو کی گہری فہم، ادراک اور بصیرت کو فقہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ چنانچہ آج جس کو علم کلام یا عقیدہ کہتے ہیں وہ بھی ایک زمانے میں فقہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب الفقہ الاکبر کے نام سے جو کتاب منسوب ہے، اس میں فقہ اکبر کی اصطلاح اسلامی عقائد کی گہری فہم، دین کے بنیادی اصول اور عقائد کے گہرے ادراک کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ بعد کی صدیوں میں بھی فقہ کی اصطلاح کا استعمال ایک عمومی بصیرت کے معنوں میں ہوتا رہا ہے۔ فقہ النفس انسانی نفسیات کی گہری واقفیت کے لئے بہت سے حضرات نے استعمال کیا۔ بہت سے اکابر اسلام کے لئے فقیہ النفس کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یعنی وہ اکابر، وہ صاحب بصیرت شخصیات جن کو انسانی مزاج اور نفسیات کے ادراک میں غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ ان کو فقیہ النفس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

آج بھی، خاص طور پر بیسویں صدی کی ابتدا سے فقہ السیرۃ کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز سامنے آیا ہے۔ اس کا مقصد محض سیرت کے واقعات بیان کرنا نہیں ہے۔ محض سیرت کی تاریخی تفصیلات سے اعتنا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ سیرت کے ان تاریخی واقعات اور تفصیلات میں جو سبق پنہاں ہے اس کو نمایاں کیا جائے۔ جو بصیرتیں اور حکمتیں سیرت پاک کے واقعات میں پوشیدہ ہیں ان کو سامنے لایا جائے۔ اس کاوش کا نام بہت سے حضرات نے فقہ السیرۃ رکھا ہے، جس کا تذکرہ دور جدید میں مطالعہ سیرت کے عنوان سے ہونے والی گفتگو میں ان شاء اللہ کیا جائے گا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ فقہ اور سیرت ان دونوں کے درمیان موجود رابطہ بہت قدیم اور گہرا ہے۔ ایک کو سمجھے بغیر دوسرے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

فقہیات سیرت کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ فقہیات سیرت کا ایک حصہ تو وہ اصول اور قواعد ہیں جو اکابر اسلام نے خود احادیث اور سیرت کی روشنی میں متعین فرمائے ہیں، جن کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، احادیث مبارکہ اور سیرت کے واقعات کو نہ صرف سمجھا جانا چاہئے بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں ان احکام کی تطبیق اور موجودہ دور کے واقعات اور مسائل واحکام کا ان کی روشنی میں تعین کیا جانا چاہئے۔ یہ بڑے بڑے اصول صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے زیر غور آرہے ہیں۔ ان پر فقہائے اسلام نے اور شریعت کے ماہرین نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ فقہیات سیرت کا دوسرا بڑا میدان وہ واقعات یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ ارشادات ہیں جن کی فقہی تعبیر کئے بغیر، یعنی ان کو فقہی نقطہ نظر سے سمجھے بغیر سیرت کے ان احکام کی تعبیر کرنا بہت مشکل ہے۔ چند روز پہلے ایک گفتگو میں میں نے حج کی مثال دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حج ادا فرمایا۔ اس کو ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد صحابہ کرام نے دیکھا۔ اس کی تفصیلات تابعین کو پہنچائیں۔ لیکن دیکھنے والوں کی اس کثرت کے باوجود، راویوں کے اس عظیم الشان جم غفیر کے باوجود، یہ بات مختلف فیہ رہی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حج فرمایا تھا، وہ حج قران تھا، حج تمتع تھا یا حج افراد تھا۔ تینوں صورتوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ اب ان تینوں میں کون سی قسم سنت کے زیادہ قریب ہے، کون سی قسم افضل ہے؟ یہ فقہ کا مسئلہ بھی ہے اور سیرت کا مسئلہ بھی۔

رسول اللہ ﷺ کے حج کی تفصیلات کے لئے فقہی احکام جاننا ضروری ہے۔ اس طرح فقہی احکام جاننے کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حج کی تفصیلات جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع دن سے فقہائے اسلام، محدثین اور ارباب سیرت سب رسول اللہ ﷺ کے حج سے متعلق احادیث اور تفصیلات کو جمع کرنے، ان پر غور وخوض کرنے، ان سے نئے نئے نتائج اور مسائل کا استنباط اور استدلال کرنے میں مصروف رہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں۔ ہر محدث نے، ہر فقیہ اور ہر سیرت نگار نے رسول اللہ ﷺ کے اس حج کی تفصیلات کو ایک نئے انداز سے جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ فقہیات سیرت کا دوسرا میدان ہے۔

۳۔ فقہیات سیرت کا تیسرا بڑا میدان بہت دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف ارشادات اور فیصلوں کو فقہائے اسلام نے مختلف زمروں میں مرتب کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اولین اور سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی مرضی کے ترجمان ہیں۔ حامل وحی ہیں اور آخری شریعت عطا فرمانے والے ہیں۔ اس لئے حضور نے جو کچھ فرمایا وہ اللہ کی رہنمائی میں فرمایا۔ 'وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی'، وہ کوئی لفظ اپنی زبان سے خواہش نفس کے داعیہ سے نہیں نکالتے، بلکہ جو کچھ بولتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ جو کچھ حضور فرماتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارکہ سے بہت سے وہ الفاظ بھی نکلتے تھے جو انسانوں کے مابین عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحابہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری مجلس میں تشریف لاتے تھے، اور ہمیں دیکھتے تھے کہ ہم شعر و شاعری کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں تو آپؐ ہماری گفتگو میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ آپ دیکھتے تھے کہ ہم پرانے واقعات اور ایام العرب کو بیان کر رہے ہیں تو آپ اس میں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کے ذوق، مزاج اور کسی کے انداز کو زبردستی بدلنے کی اور ایک مصنوعی یا متصعانہ مذہبیت کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حضور کی محفل میں لوگ خود بخود اس رنگ میں رنگ جایا کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا رنگ تھا۔

لیکن اگر کوئی بات آپؐ نے ایسی ارشاد فرمائی جو خاص اُس ماحول یا اُس زمانے کے لحاظ سے تھی تو اس کی شرعی حیثیت یا درجہ کے بارہ میں اہل علم میں گفتگو رہی ہے۔ عرب میں بہت سے واقعات، ضرب الامثال، قصے کہانیاں اور تفریح طبع کے کئی قصے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کی دلجوئی کی خاطر ان میں بھی شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح کے مواقع پر حضور نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ بھی شریعت کا اسی طرح حصہ ہے جیسے شریعت کا حصہ وہ احادیث ہیں جن سے سنت ثابت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور عموماً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ حضور کے کون کون سے ارشادات وہ ہیں جو ماخذ و مصادر شریعت ہیں، اور کون کون سے ارشادات گرامی وہ ہیں جو آپ نے بطور ایک عام انسان کے ارشاد فرمائے۔ جو کچھ آپ نے

بطور ایک انسان ارشاد فرمایا، اس میں بھی شریعت کا ایک پہلو موجود ہے۔ اس سے بھی شریعت کے بہت سے احکام نکلتے ہیں اس لئے شریعت کے عمومی دائرہ سے اور عمومی حدود سے کوئی چیز خارج نہیں ہوسکتی۔

اس حد تک تو کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جہاں بحث وتمحیص کی زیادہ گنجائش ہے یہ وہ معاملات ہیں جہاں فقہائے اسلام اور محدثین قطعیت اور اتفاق رائے سے یہ تعین نہیں کر پائے کہ رسول اللہ ﷺ کی کون سی بات بطور نبی اور رسول کے ارشاد فرمائی گئی اور کون سی بات آپ نے بطور سربراہ ریاست اور قاضی کے ارشاد فرمائی۔ جو چیز آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائی، اس کا دائرہ محدود ہے۔ ملک کے صف اول کے قانون دان حضرات یہاں تشریف فرما ہیں، وہ مجھ سے بہتر اس بات کو جانتے ہیں کہ۔ قانون کی اصطلاح میں ایک معاملہ ہوتا ہے in personem، ایک معاملہ ہوتا ہے in rem۔ جو بات آپ نے نبی اور رسول کے طور پر ارشاد فرمائی وہ in rem یعنی تمام انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ جو فیصلہ آپ نے بطور قاضی کے فرمایا وہ in personem یعنی ان دو فریقوں کے لئے واجب التعمیل ہے جن کا مقدمہ درپیش تھا۔ آپ نے کسی جائداد کی ملکیت کا فیصلہ ایک شخص کے حق میں کیا۔ دوسرے صاحب کے حق میں کسی اور حق کا فیصلہ کیا۔ اب یہ فیصلہ صرف ان دونوں کے لئے ہوا ہے اور انہی دونوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ بقیہ لوگوں کا اس کے مندرجات یا لین دین سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض مواقع ایسے آئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی معاملہ میں رہنمائی فرمائی۔ بعد میں محدثین اور فقہا نے اس کی جزئیات اور نزاکتوں پر غور کیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ بات آپ نے کس حیثیت میں ارشاد فرمائی تھی۔ اگر بطور نبی کے ارشاد فرمائی تو اس کے تضمنات اور implications اور ہیں۔ اگر بطور سربراہ حکومت کے ارشاد فرمائی تو اس کے تضمنات اور نتائج اور ہیں۔ اگر بطور قاضی کے ارشاد فرمائی تو اس کے تضمنات اور ہیں۔ اس بارہ میں فقہا میں اختلاف بھی ہوا ہے جس کی ایک دو مثالیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق فقہیات سیرت سے ہے۔ اگر ان سب واقعات و مسائل کو جمع کیا جائے تو ان سب کا ایک عمومی عنوان فقہیات سیرت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

قبل اس سے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک بہت اہم ارشاد گرامی کی طرف اشارہ کرنا ضروری

ہے، ایسا ارشاد گرامی جو محدثین، ارباب سیرت اور فقہائے اسلام کے درمیان ایک طویل بحث کا موضوع رہا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انصاری صحابہ کرام کی بڑی تعداد زراعت سے وابستہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں زراعت کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ وادی غیر ذی زرع کہلاتا تھا۔ گھاس کی پتی بھی نہیں اگتی تھی۔ اس لئے اہل مکہ کو زراعت سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ انہیں نہ زراعت کے تقاضوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کو جانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تشریف لاکر دیکھا کہ جو لوگ کھجور کی زراعت کا کاروبار کرتے ہیں وہ کھجور کے دو پودوں میں قلم لگاتے ہیں اور ان کی تقسیم نر اور مادہ پودوں میں کرتے ہیں۔ بادی النظر میں آپ کو یہ چیز نامناسب معلوم ہوئی۔ آپ نے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ صحابہ کرام تو حضور کے ہر اشارہ کو حکم سمجھتے تھے۔ انہوں نے قلم لگانے کا یہ عمل جس کو عربی میں تأبیر نخل کہتے ہیں، نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن جن حضرات نے تأبیر نخل کا یہ عمل نہیں کیا ان کے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی۔ جن کی پیداوار کم ہوئی انہوں نے احتراماً اور عقیدتاً یہ بات حضور کے سامنے بیان نہیں کی۔ لیکن بعض نوجوانوں نے آکر یہ پوچھا کہ یارسول اللہ آپ نے تأبیر نخل سے منع فرمایا تھا۔ تأبیر نخل نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا ہی ہے؟ اس پر بڑے بڑے صحابہ کرام جو وسیع رقبہ پر زراعت کر رہے تھے انہوں نے تصدیق کی کہ یارسول اللہ ایسا ہی ہوا ہے۔ آپؐ نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے۔ اب صحابہ نے وضاحت کی کہ کھجور کے بعض پودے بارآور ہوتے ہیں اور بعض بارآور نہیں ہوتے۔ جو بارآور ہوتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کا قلم دوسرے پودے میں لگایا جائے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ غیر بارآور پودے میں جو اجزا کم ہوتے ہیں وہ دوسرے پودے سے پورے ہوجاتے ہیں اور اس میں پھل لگ جاتا ہے۔ یہ ایک فنی چیز ہے اور زراعت کی دنیا میں ہر ایک کو معلوم ہے۔

اس پر آپؐ نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا جو یہاں پیش کرنا مقصود ہے، آپ نے فرمایا: 'انتم اعلم بامور دنیاکم' تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ جب میں شریعت یا دین کی کوئی بات تم سے کہوں تو وہ تمہارے لئے واجب التعمیل ہے۔ اگر دنیاوی

معاملہ میں کوئی مشورہ دوں تو اس پر دنیاوی مصلحتوں اور حکمتوں کے مطابق غور کرو اور جو حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہو اس کے مطابق عمل کرو۔

تأبیر نخل کی یہ روایت تمام بڑے بڑے محدثین نے بیان کی ہے۔ اس پر بڑی تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں۔ اصولی حد تک تو یہ بات مختلف فیہ نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات خود سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہے اس لئے سب فقہا اور محدثین اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ کون سی بات جو آپؐ نے ارشاد فرمائی وہ دنیاوی معاملات میں مشورہ کے مترادف ہے اور شریعت کا حکم نہیں ہے، اس کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔

بعض صحابہ کرام ایسے بھی تھے جو عشق رسول کی انتہا پر تھے۔ وہ یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ کون سی بات آپ نے بطور انسان ایک مشورہ کے طور پر فرمائی ہے اور کون سی بات بطور نبی ہدایت ربانی کے طور پر فرمائی ہے۔ صحابہ کرام تو لفظ اور اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کچھ صحابہ مسجد نبوی کے اندر کھڑے تھے اور نماز وغیرہ کی تیاری کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا کہ جو کھڑے ہیں وہ بیٹھ جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں کئی ایسے صحابہ بھی بیٹھ گئے جو ابھی گلی میں تھے اور مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ گلی ہی میں بیٹھ گئے۔ بعد میں حضور نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں بیٹھ گئے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ کی زبان مبارک سے بیٹھ جانے کا حکم سننے کے باوجود کیسے نہ بیٹھتے۔ حضور ﷺ نے اس پر ان کے لئے برکت کی دعا کی اور ان کے اس عمل کو ناپسند نہیں فرمایا۔ تو صحابہ کرام میں تو ایسے عشاق اور فدا کار بھی تھے جو یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ حضور کی کون سی بات بحیثیت انسان کے عام بات ہے اور کون سی بات بطور نبی کے ایک ہدایت ہے۔ انہوں نے تو جو کچھ زبان مبارک سے نکلا اس پر اسی وقت عمل کر لیا۔

بعد میں جب فقہی احکام کو مرتب کرنے مرحلہ آیا اور فقہا نے ایک ایک چیز کو الگ الگ منقح کیا کہ کیا فرض ہے، کیا واجب ہے، کیا مندوب ہے، کیا مستحب ہے اور کیا جائز ہے تو پھر اس اہم سوال کا جواب پانا ناگزیر ہوتا گیا کہ ہر چیز کے بارے میں الگ الگ حکم متعین کیا جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات میں جو شرعی رہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں بھی بعض احکام و ہدایات کی حیثیت فرض اور واجب کی ہے۔ بعض ارشادات میں کسی چیز

کے مستحب یا مندوب ہونے کا بیان ہے۔بعض کا منشا محض کسی چیز کے جائز ہونے کا بتانا تھا۔ بعض ارشادات کے ذریعے حضور کوئی غلط فہمی دور کرانا چاہتے تھے کہ یہ کام کر سکتے ہو، یہ جا ئز ہے۔مثلاً بعض صحابہ کرام بیماری کے دوران علاج کرانے اور دوا استعمال کرنے کو خلاف توکل سمجھنے لگے۔ ایمان اور اللہ پر بھروسہ کی ایک معراج یہ بھی تھی کہ انہوں نے سمجھا کہ اگر بیماری اللہ نے آزمائش کے لئے اتاری ہے تو میں علاج کیوں کروں۔ یہ ایک نیا عاشقانہ انداز ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ عباداللہ تداووا ، اللہ کے بندو! علاج کیا کرو۔اب یہ بات فرض اور واجب کی نہیں۔ بلکہ ایک چیز کو ناپسندیدہ یا مکروہ سمجھا گیا۔توکل اور تقویٰ کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کے منافی سمجھا گیا اس لئے آپ نے وضاحت فرمادی کہ علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ کرنا چاہئے۔اس لئے یہاں جو حکم ہے وہ فرضیت اور وجوب کے لئے نہیں ہے، بلکہ جواز کے لئے ہے کہ اس کو جواز کے درجہ میں سمجھنا چاہئے یا مستحب کے درجہ میں۔

صحابہ کرام کے زمانے میں تو یہ مسئلہ پیش نہیں آیا۔لیکن فقہا نے جب یہ سوال اٹھایا تو یہ پھر کئی جگہ ایسے سوالات پیدا ہوئے۔اکثر و بیشتر معاملات میں یہ بات واضح تھی کہ کون سی بات آپ نے بطور مشورہ کے دنیاوی معاملات میں ارشاد فرمائی ہے،اور کون سی بات آپ نے ایک شرعی رہنمائی کے طور پر ارشاد فرمائی ہے۔ایک دو معاملات میں یہ سوال پیدا ہوا۔شاید وہ احادیث آٹھ دس سے زیادہ نہ ہوں جہاں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ یہ جو بات ارشاد فرمائی گئی یہ کس نوعیت کی ہے۔اور پھر اس بات کی نوعیت کا تعین کرنے میں فقہاء میں مختلف رائیں پیدا ہوئیں۔میں مثالیں دے کر ابھی اس کو واضح کروں گا۔

لیکن اس پر آگے بڑھنے سے پہلے اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ رسول اللہﷺ نے جو باتیں بطور نبی اور شرعی ہدایت کے ارشاد فرمائیں ان کا تعلق عموماً غیبیات اور شرعیات سے ہے،یعنی ان معاملات اور عقائد سے جو عام انسان کی نظروں سے اوجھل ہیں، یا جن کے بارہ میں خالص انسانی تجربہ اور عقل سے کوئی حتمی اور قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کی اللہ کے رسول نے خبر دی۔یعنی عقائد، مکارم اخلاق، عبادات اور حلال و حرام۔ ان چار چیزوں سے جن امور کا تعلق ہے وہ تو سو فیصد شرعی رہنمائی اور ہدایت کے معاملات ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور عبادات کے بارے میں کوئی بات مشورۃً ارشاد

نہیں فرمائی۔ وہ سب پیغمبرانہ ہدایت اور رہنمائی ہے۔ عبادات اور مکارم اخلاق کے بارے میں جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ شرعی ہدایت اور رہنمائی ہے۔

دو معاملات ایسے ہیں جہاں اس بات کی گنجائش ہے کہ آپ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بطور ایک عام انسانی مشورہ کے ارشاد فرمائی ہو۔ ایک کا تعلق عام انسانی رہن سہن اور عادات سے ہے۔ دوسرے کا تعلق معاملات سے ہے۔ انسانوں کے درمیان لین دین اور تجارت کے معاملہ میں شریعت کا مزاج یا حکمت یہ ہے شریعت رائج الوقت معاملات یا تصورات کو سو فیصد ختم نہیں کرتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنے زمانے کے رائج الوقت کاروباری طریقوں کو مکمل طور پر منع نہیں فرمایا۔ کاروبار کے وہ طریقے جو کسی پہلو سے کسی ناجائز عنصر پر مشتمل تھے، اس ناجائز عنصر کو آپؐ نے منع فرما دیا۔ اس طرح سے کاروبار اور تجارت کے تمام منفی پہلوؤں کی نشاندہی فرما کر بقیہ حصوں کو آپؐ نے اسی طرح جاری رہنے دیا۔ یہ مضاربہ اور مشارکہ اور دوسرے متعدد کاروبار سب اسلام سے پہلے سے رائج تھے۔ مضاربہ کو اگر ہم اسلامی طریقہ کار کہتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا حدیث میں آیا ہے کہ اے مسلمانو مضاربہ کیا کرو۔ بلکہ یہ طریقہ عربوں میں اسلام سے پہلے سے رائج تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پندرہ بیس سال قبل حضرت خدیجہ کا مال لے کر مضاربہ فرمایا۔ یہ طریقہ کار عرب میں رائج تھا۔ دنیا میں ہر جگہ sleeping partners کا سسٹم رائج ہے۔

ان معاملات میں جو چیز شریعت سے متعارض تھی اور جن غیر اسلامی عناصر کی آمیزش تھی ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی اور جو پہلو جائز تھے ان کی آپؐ نے اجازت دے دی۔ یوں تجارت اور کاروبار میں جائز اور ناجائز دونوں کو حضورؐ نے الگ کر کے بیان فرمادیا۔ اس لئے معاملات کی حد تک شریعت کا منشا یہ تھا کہ معاملات میں جو ناجائز یا غلط پہلو ہیں ان کی اصلاح کر دی جائے اور بقیہ پہلوؤں کو جاری رکھا جائے۔ اس لئے معاملات میں اس سوال کی قدرے گنجائش تھی کہ حضور ﷺ کا کوئی ارشاد بطور مشورہ کے ہے یا بطور شرعی رہنمائی کے ہے۔ حضور ﷺ خود اپنے زمانے کے کامیاب ترین تاجر تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تجارتی سامان لے کر بارہا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تشریف لے گئے۔ نبوت سے

پہلے آپؐ نے کئی تجارتی سفر فرمائے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جزیرہ عرب کے مشرق میں جو بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں جہاں چین اور ہندوستان سے مال آتا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں بھی تشریف لے گئے اور چینی اور ہندوستانی تاجروں سے ملاقات ہوئی۔

یہاں اگر ہمارے کوئی جاٹ بھائی موجود ہوں تو ان کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ ان تجارتی سفروں کے دوران جاٹوں سے بھی رسول اللہ ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک دلچسپ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معراج کے سفر میں مختلف انبیا سے ملاقات کی تو مختلف انبیا کا حلیہ بھی بیان فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ بیان فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ انہیں دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے ہندوستان کے جاٹ ہوتے ہیں۔ طویل قامت، پختہ قد، ورزشی جسم اور کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ اس طرح آپؐ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد و قامت اور جسمانی ساخت کو ہندوستان کے جاٹوں سے تشبیہ دی۔

اب محدثین نے اس پر بحث کی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جاٹوں کی ساخت اور قد و قامت کا علم کہاں سے ہوا۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے اپنے تجارتی اسفار میں ہندوستان سے آنے والے تاجروں سے معاملہ کیا ہوگا۔ ان کے ساتھ تجارت بھی کی ہوگی۔ اسی طرح چین سے بھی حضور کی واقفیت انہی تاجروں کے ذریعے ہوئی جو یہاں آیا کرتے تھے۔ اب اگر تجارت کے معاملہ میں حضور کوئی بات کسی سے ارشاد فرمائیں تو اس میں دونوں امکان موجود ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک تجربہ کار بزرگ تاجر کی حیثیت سے کسی نوجوان اور نووارد تاجر کو مشورہ دے رہے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور نبی اور پیغمبر کے رہنمائی ارشاد فرما رہے ہوں۔

اسی طرح سے عادات میں یعنی قوموں کے عام رہن سہن کے طریقہ کار میں، لوگوں کے میل جول کے انداز میں، کھانے پینے اور لباس میں ہر علاقے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہر علاقہ کا لباس اس کی آب و ہوا اور موسم کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر علاقہ کے کھانے پینے کا طریقہ اس علاقہ کی پیداوار اور موسم کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے کبھی ان چیزوں میں مداخلت نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ فلاں علاقہ کے لوگو! فلاں چیز کھانا چھوڑ دو۔ یا فلاں چیز کھایا کرو۔ یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، نہ اسلام اس کام کے لئے آیا ہے۔ البتہ کھانے پینے کے

طور طریقوں اور لباس میں جو چیز ناجائز تھی وہ آپ نے کھل کر بیان کردی اور بتادیا کہ یہ ناجائز ہے باقی چیزیں جائز ہیں۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام آداب اور عادات کے باب میں ہیں ان میں شریعت نے انسانوں کو بہت آزادی دی ہے اور مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مباحات کے اس وسیع دائرہ ہی کی وجہ سے فقہا کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ جو بات آپ نے ارشاد فرمائی ہے وہ مباحات کے اس دائرہ میں ایک مشورہ ہے یا علت وحرمت کا کوئی سوال ہے، یہ ایک ایسا میدان ہے کہ یہاں غلط فہمیوں کا امکان بھی ہے۔لہٰذا جہاں جہاں انسان کے غلط فہمی کا شکار ہونے کا امکان تھا وہاں حضور نے اس کا راستہ بند کردیا۔ مکارم اخلاق انسانوں میں مشترک رہے ہیں۔انبیاء علیہم السلام نے ہر دور میں مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ ہر پیغمبر نے بداخلاقی سے روکا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف ان مکارم اخلاق کو برقرار رکھا جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے بقایاجات کے طور پر چلے آرہے تھے۔ بلکہ ان کی تکمیل فرمائی۔آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ، میں اس کام کے لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں۔گویا جو مکارم اخلاق پہلے سے آرہے تھے ان کو برقرار رکھوں، ان کی مزید وضاحت کروں اور ان میں جہاں جہاں کمی یا خامی ہے اس کو پورا کرکے اپنے ماننے والوں کو مکارم اخلاق کا ایک پورا نظام دے دوں۔مکارم اخلاق میں جہاں جہاں انسانی عقل سے غلطی کا امکان تھا وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت فرمادی۔ جہاں مکارم اخلاق میں ماضی کے کسی فرد یا قوم کی وجہ سے کوئی غلطی پیدا ہوگئی تھی اس کو آپ نے دور فرمادیا۔اس اعتبار سے جو اختلافی مباحث ہیں وہ عموماً آداب اور معاملات کے میدان میں ہیں۔مکارم اخلاق، عقائد اور عبادات میں ایسے اختلافی امور نہ ہونے کے برابر ہیں۔

فقہیات سیرت کا ایک پہلو اور بھی ہے جو ان تینوں پہلوؤں سے مختلف ہے اور براہ راست سیرت کا حصہ بھی ہے اور حکمت تشریع کا حصہ بھی ہے۔ حکمت تشریع سے مراد یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں جو ایک مکمل نظام قانون دیا گیا ہے اس کی بنیادی حکمت اور بنیادی تصورات کیا ہیں۔ظاہر ہے کہ شریعت کے تمام احکام ایک حکمت پر مبنی ہیں۔شریعت کے کچھ بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے کچھ احکام دیئے گئے ہیں۔ان احکام پر عمل درآمد کو

آسان بنانے کے لئے بعض مزید دلائل دیئے گئے ہیں۔ اس لئے شریعت کے سارے احکام اس کے بنیادی مقصد یا مقاصد سے وابستہ ہیں۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ بنی نوع انسان کی تاریخ کے مقنن اعظم بھی ہیں۔ بنی نوع انسان کی تاریخ کے مقنن اعظم ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ نے قانون کی بنیادیں بھی عطا فرمائیں۔ قانون کے وہ اعلیٰ تصورات بھی عطا فرمائے جن کو آج مغرب میں meta-jurisprudence کہتے ہیں۔ ایک تو jurisprudence یا اصول قانون کے قواعد ہیں یعنی قانون کا بنیادی اور منظم مطالعہ اور اس کے اصول۔ لیکن اس منظم مطالعہ کے لئے کچھ اعلیٰ اور برتر اخلاقی بنیادیں درکار ہیں جن کو meta-jurisprudence کہا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے دور میں meta-jurisprudence کے اصول عطا فرمائے۔ وہ higher moral ideals یا برتر اخلاقی معیارات عطا فرمائے جن کی بنیاد پر مقاصد شریعت کی وضاحت ہوئی۔ مقاصد شریعت اور مصادر شریعت وہ jurisprudence ہیں جن کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے تفصیلی احکام مرتب فرمائے۔

دنیا کے دوسرے تمام قوانین میں، جتنے بھی قوانین دنیا میں اس وقت رائج ہیں یا ماضی میں رائج رہے ہیں، یہودیوں کے قدیم قوانین اور ہندوؤں کے منوشاستر سے لے کر، اور حمورابی کے قانون اور جسٹینین کے کوڈ سے لے کر آج کے تازہ ترین مغربی قوانین تک، ان سب قوانین میں ایک چیز قدر مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان قوانین کے جو اصول قانون ہیں وہ ایک طویل عرصہ کے بعد سامنے آئے۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ کی تاریخ میں قانون اور اصول قانون اور ماورائے اصول قانون سب قریب قریب ایک ساتھ ہی ظہور پذیر ہوئے۔ دسرے قانونی نظاموں میں اصول قانون کا تصور ایک ایک ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد پیدا ہوا۔ رومن لاء میں کہیں کہیں ڈیڑھ ہزار سال بعد یہ تصور سامنے آیا۔ اس کوڈ کی تدوین سے کوئی نوسو سال پہلے سے، بلکہ ایک ہزار سال پہلے سے رومن لا چلا آرہا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بہت پہلے سے رومن لا چلا آرہا تھا اور قانون روما کے احکام اور مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے۔ لیکن چونکہ جسٹینین نے ان سب کو ایک جگہ جمع کرا کر ایک بڑا مجموعہ مرتب کروایا تھا۔ اس لئے جسٹینین کی حیثیت ایک بڑے مقنن کی سمجھی جاتی ہے۔ جسٹینین روما کا حکمران تھا اور جب

اس کا انتقال ہو تو رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک غالباً چھ سات سال تھی۔ حضور کے بہت بچپن کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔ جناب عبدالمطلب ابھی حیات تھے جب جسٹینین دنیا سے رخصت ہوا۔

لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اہم کام میں جسٹینین کا اپنا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کام میں اپنا ذاتی کارنامہ اس لئے نہیں ہے کہ یہ سارے قوانین پہلے سے موجود تھے۔ ایک ہزار برس سے ان پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ ان کے کئی تحریری مجموعے موجود تھے۔ جسٹینین نے کچھ لوگوں سے کہا اور انہوں نے تمام قوانین کو جمع کر کے ان کی ایک جامع کتاب مرتب کردی۔ زیادہ سے زیادہ اس کارنامے کو اورنگزیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کے برابر کا کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کے کہنے پر تقریباً 200 فقہا نے بیٹھ کر فتاویٰ عالمگیری مرتب کردی۔ اس میں اورنگزیب کا صرف اتنا کارنامہ ہے کہ اس کے حکم سے یہ کام ہوا۔ اس کا کارنامہ سوائے اس کی دلچسپی کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہی جسٹینین کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے از سر نو بنیادی تصورات عطا فرمائے۔ بنیادی تصورات کے بعد جب نظام عطا فرمایا تو اس کے قواعد اور اساسات عطا فرمائے۔ پھر ان اساسات کی بنیاد پر ایک مکمل اور elaborate legal system آپ نے عطا فرمایا۔ پھر اس لیگل سسٹم پر بے شمار لوگوں نے غور کیا ہے۔

دنیا کے قانونی نظاموں اور تصورات پر غور کرنے والوں اور کتابیں لکھنے والوں نے نظری کام تو بہت کیا ہے۔ لیکن آج تک کوئی ایسا قانون دان انسان کی معلوم تاریخ میں روئے زمین پر نہیں ہوا ہے جس نے خود قانون کا کوئی تصور دیا ہو، قانون کے اساسات وضع کئے ہوں اور ان کی بنیاد پر نظام بھی بنا دیا ہو۔ نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا بھی دیا ہو اور دس لاکھ مربع میل رقبہ پر اس نظام کے مطابق ریاست اور معاشرت کا قیام بھی کر کے دکھا دیا ہو۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کو بجا طور بنی نوع انسان کا مقنن اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اور حضور ہی بنی نوع انسان کے مقنن اعظم کہلانے کے مستحق اور حقدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے معجزات میں ایک بہت بڑا معجزہ خود آپ کی شریعت بھی ہے جو اپنے ربط، نظم، تناسق اور تکامل کے اعتبار سے دنیا کے نظاموں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ بیک وقت معلم اخلاق بھی ہیں اور مقنن بھی ہیں۔ آپ کا دیا ہوا قانون اخلاقی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم اور روحانی ہدایات کی روشنی سے مستنیر ہے۔ آپ کے دیئے ہوئے اخلاق محض نظریاتی نعرے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد پر ایک پورا عملی نظام متشکل شدہ موجود ہے جس پر کروڑوں انسان عمل پیرا رہے ہیں۔ آپ کے دیئے ہوئے قانون وشریعت پر اخلاقی اصولوں اور صفات سے متصف ہوئے بغیر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مرحلہ پر جا کر اخلاق اور قانون دونوں اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جیسے آغاز میں جمع ہیں۔ قرآن پاک سے یہ دونوں چیزیں نکلی ہیں اور پوری انسانیت کو اپنے دائرہ میں لے کر بالآخر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ مرکز انسان کا مزاج، طبیعت اور ساخت ہے۔ یہ دونوں اخلاق اور قانون وحی الٰہی کے چشمے سے مستنیر ہیں۔ وحی الٰہی ان دونوں کی اساس اور روح ہے۔

مغرب اور دور جدید کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس نے اپنے نامکمل مذہب سے مایوس ہو کر اور سینٹ پال کی دی ہوئی غیر عملی مذہبیت کی ناکامی کو دیکھ کر مذہب ہی سے ہاتھ دھو لئے، بجائے اس کے کہ اہل مغرب یہ غور کرتے کہ جو مذہب ان تک پہنچا ہے وہ کس حد تک حقیقی اور مکمل ہے، انہوں نے مذہب ہی سے جان چھڑانے میں عافیت سمجھی۔ مذہب سے جان چھوٹی تو اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی۔ اس لئے کہ مذہب کے علاوہ اخلاق کی کوئی اور مکمل اور پائیدار بنیاد آج تک دریافت نہیں ہو سکی۔ جب اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی تو اخلاق اور قانون کا تعلق ختم ہو گیا۔ آج کل مغرب میں ایک بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ہر چیز ان کو positive درکار ہے۔ پازیٹیو سے مراد مثبت اور منفی والا پازیٹیو نہیں۔ بلکہ ان کے ہاں آج کل پازیٹیو سے مراد یہ ہے کہ جو چیز جیسے ہے ویسے ہی اس پر عمل کیا جائے۔ ہر چیز کو amoral ہونا چاہئے۔ قانون کو value-neutral ہونا چاہئے۔ اخلاق، مذہبیات اور روحانیات کا دائرہ محدود کرنا چاہئے۔ ان سب چیزوں کو معاشرتی اور اجتماعی نظام سے دیس نکالا دے دینا چاہئے۔ جب ایک بار اخلاق وروحانیات کو دیس نکالا دے دیا تو پھر قانون کی حقیقی اور پائیدار بنیاد ختم ہو گئی۔ اب قانون کی بنیاد کیا ہو۔ قانون کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہو۔ مذہبی اقدار سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ کسی مذہب کی پرچھائیں تک ان کے دعویٰ کے بموجب قانون پر نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قانون ایک ایک

کرکے آہستہ آہستہ اپنی معنویت کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور اصطلاحات میں ایک تعارض پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ سوشل سائنسز ہوں یا ہیومینیٹیز، ان سب کو ویلیو نیوٹرل ہونا چاہئے۔ یعنی اخلاقی اقدار سے ماورا یا پاک ہونا چاہئے۔ یہ نہ دیکھیں کہ کیا ہونا چاہئے۔ تجربی اور اطلاقی علوم کی طرح انسانی اور معاشرتی علوم میں بھی یہ دیکھیں کہ کیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں، بلکہ دانستہ نظرانداز کرتے ہیں کہ کیا ہے میں تو بہت کچھ ہے۔ بدکرداری بھی ہے، جھوٹ بھی ہے، بداخلاقی اور بددیانتی بھی ہے۔ ان سب مظاہر کا مطالعہ کرو تو سوشل سائنسز کا مطالعہ ہوگا۔ ورنہ وہ معاملہ معروضی اور مقصدی نہ رہے گا۔ اس طرح کی سوشل سائنس کو خوبصورت ناموں سے یاد کرکے سمجھتے ہیں کہ ان کے تصورات اور خیالات بھی خوش نما ہوگئے ہیں۔ **زین لهم الشيطان اعمالهم**، شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کرکے ان کے سامنے پیش کردیا۔ خوبصورت اصطلاحات کے پردے میں مکروہ اور منفی تصورات کو چھپادیا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ قانون وہ نہیں ہوسکتا جو کہے کہ کیا ہے۔ معاشرہ میں تو قتل ہے، چوری ہے۔ اب اگر قانون یہ کہنا چاہے کہ چوری نہیں ہونی چاہئے تو اس کو ایک ویلیو پوزیشن لینی پڑتی ہے۔ ویلیو پوزیشن وہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ویلیو پوزیشن قانون کو نہیں دیتے تو وہ قانون نہیں رہتا، اخلاقیات بن جاتا ہے۔ یا سوشیالوجی بن جاتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ پچھلے پچیس تیس سال سے مغربی قانون دانوں کو درپیش ہے۔ آج کل jurisprudence پر جو کتابیں آرہی ہیں ان میں یہ مسئلہ بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ قانون کو کیسے موثر بنایا جائے۔ اس طرح کا کوئی مسئلہ فقہائے اسلام کے ہاں پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو شریعت عطا فرمائی تھی اس میں قانون، اخلاق، روحانیات اور مذہبی عقائد، یہ چاروں چیزیں اس طرح یکجا ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

وہ سورتیں دیکھیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک ایک کرکے وہ اخلاقی بنیادیں رکھی جارہی ہیں، روحانیات کی وہ اساسات تعمیر ہورہی ہیں جن پر آگے چل کر قانون کی تعمیر ہوگی۔ یہ meta-jurisprudence کی بنیاد ہے۔ پھر جب حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان اخلاقی عمارتوں کی تکمیل بھی ہوئی۔ اس پر قانون کی دیواریں بھی

اٹھائی گئیں۔ اور قانون، شریعت، اخلاقیات، مذہبیات اور روحانیات سب کی بیک وقت تکمیل ہوگئی۔ یہ ایک ایسا برج اور ایسی عمارت ہے جس کی تعمیر میں یہ چاروں چیزیں یکساں طور پر شامل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی شریعت کی اس عمارت سے الگ کیا جائے گا تو پوری عمارت غیر عملی اور non-functional ہو جائے گی۔

اس لئے سیرت کو سمجھنے کے لئے اس پوری حکمت شریعت کو کلی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ اور حکمت شریعت کو سمجھنے کے لئے سیرت کے پورے واقعات کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھر شریعت کے بعض احکام تدریج کے ساتھ آئے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ یہ تھا کہ کسی نئے اور اہم حکم کے لئے پہلے صحابہ کرام کو ذہنی طور پر تیار کرتے تھے۔ پہلے یہ بیان فرماتے تھے کہ اللہ کی شریعت کی نظر میں کیا چیز پسندیدہ ہے اور کیا ناپسندیدہ ہے۔ اس ابتدائی اشارہ سے ہی اکابر صحابہ کرام خود سمجھ جاتے تھے کہ اب شریعت کا کیا حکم آنے والا ہے۔ بعض صحابہ کرام کوئی حکم آنے سے قبل ہی اس بات کا پیشگی اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ اب شریعت کا کیا حکم آئے گا۔ سیدنا عمر فاروق کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ قرآن پاک کی 17 آیات ان کے اندازے کے مطابق نازل ہوئیں۔ یعنی وہ اس حد تک شریعت کے مزاج شناس ہوگئے تھے کہ وہ ایک خاص صورت حال میں اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ اس معاملہ میں شریعت کیا کہے گی اور سترہ مواقع پر ان کا اندازہ درست نکلا۔

اسی طرح نزول احکام اور اصلاحات نبویہ میں تدریج کا معاملہ ہے۔ یہ شریعت کے احکام کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کل ربا کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ ربا کے ناپسندیدہ ہونے کو مکہ مکرمہ میں بیان فرمادیا گیا۔ سورۃ روم مکی سورۃ ہے۔ اس میں ربا کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا ہے۔ وما آتیتم من ربوٰ لیربو فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ، تم یہ سمجھتے ہو کہ ربا سے تمہارے مال میں اضافہ ہوتا ہے تو اللہ کی نظر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی سے صحابہ کرام سمجھ گئے کہ یہ چیز اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ یوں حرمت سود کی یہ اخلاقی بنیاد آپ ﷺ نے قائم فرمادی۔ اس کے بعد جو پہلا حکم آیا وہ یہ آیا کہ مرکب سود یعنی (compound interes یا سود در سود) کی حرمت فرمادی گئی۔ اس کے بعد ایک کرکے ربا سے متعلق احکام کو لیا گیا اور آخر میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ربا کے تمام سابقہ

دعاوی کو ختم کر دیا۔ اب اگر یہ تدریج کسی کے سامنے نہ ہوتی تو اس کے لئے حکمت تشریع کو سمجھنا بڑا دشوار ہوتا۔

کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ احکام میں یہ تدریج ہے، بعض درمیانی یا ابتدائی احکام کو لے کر ہمارے اس دور کے بعض غیر اسلامی رواجات اور غیر شرعی معاملات کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف وہ ربا یا سود حرام ہے جو سود در سود یعنی compound interest کے دائرہ میں آتا ہو۔ حالانکہ کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی حرمت تو سود کی حرمت کا ایک مرحلہ تھا۔ اس کے بعد اور بھی مراحل آئے۔ شراب کی حرمت کئی مراحل میں آئی۔ اسی طرح سے کئی اور احکام ایسے ہیں جن کی حرمت یا وجوب کا نزول مختلف مراحل میں ہوا۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نزول احکام اور اصلاحات نبویہ میں تدریج کو سمجھنے کے لئے سیرت سے واقفیت ضروری ہے۔

بعض معاملات ایسے ہیں جن میں نسخ کا اصول کارفرما رہا۔ پہلے لوگوں کو کسی خاص چیز کے لئے تیار کرنے کی خاطر ایک حکم دیا گیا۔ جب لوگوں کی ذہنی اور مزاجی سطح ایک خاص حد پر آ گئی تو پھر دوسرا اصل اور دوائی حکم دیا گیا۔ قرآن پاک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ نسخ کا یہ تصور قرآن پاک میں کئی جگہ ملتا ہے۔ پانچ چھ آیتوں کے بارے میں تو تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ ان میں نسخ یا تدریج کا یہ عمل ہوا ہے اور احادیث کے کئی احکام کے بارے میں ملتا ہے۔ میں نے ایک گفتگو میں مثال دی تھی کہ جب شراب کی حرمت کا حکم آیا تو حضور ﷺ نے شراب کے بعض برتنوں کے استعمال سے منع کرنے کا حکم بھی دیا کہ میں تمہیں شراب کے فلاں فلاں برتنوں کے استعمال سے بھی روکتا ہوں۔ جب شراب کی پابندی عام ہو گئی اور لوگ شراب کے بغیر زندگی کے عادی ہو گئے اور انہوں نے ان برتنوں کا استعمال بھی ترک کر دیا تو ان کی حرمت بھی ختم کر دی گئی۔ شراب سازی اور شراب داری کے برتنوں کی یہ حرمت ایک وقتی چیز تھی، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی بڑی برائی کو روکنے کے لئے اس برائی کے ذرائع کا راستہ بھی بند کر دے۔ چاہے اس راستہ میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہ ہو، لیکن اگر وہ راستہ کسی برائی کی طرف لے جاتا ہو تو برائی کو روکنے کی خاطر اس راستہ کو بھی روکا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا

اختیار حکومت کو حاصل ہے۔

یہ جوتدریج آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ حکمت تشریع کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہ حکمت تشریع کی ایک بہت اہم بنیاد ہے۔ حکمت تشریع کا ایک اور اہم اصول جس کی طرف مختلف موضوعات کے ضمن میں اور مختلف مواقع پر آپؐ نے بار بار توجہ دلائی وہ تیسیر کا حکم ہے یعنی آسانی پیدا کرنا۔ خود قرآن پاک میں' یرید بکم اللہ الیسر ولا یرید بکم العسر ،اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا۔ پھر آپؐ نے مختلف مواقع پر جب مختلف لوگوں کو مختلف حیثیتوں میں باہر بھیجا، کسی کو قاضی، کسی کو گورنر، کسی کو معلم بنا کر بھیجا، تو ان کو یہ ہدایت دی کہ لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل دونوں کو ایک ذمہ داری پر بھیجا اور ان سے فرمایا کہ 'یسروا ولا تعسروا'، آسانی پیدا کرنا، مشکل پیدا نہ کرنا۔ بشرا ولا تنفرا، لوگوں کو خوش خبری دینا، تنفر نہ کرنا۔ اس لئے تیسیر کے پہلو کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر کچھ فیصلے فرمائے۔ بعض اقدامات کئے۔ اگر تیسیر کا اصول سامنے نہ ہو تو ان معاملات کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی۔

پھر قرآن پاک میں حکمت تشریع کے دو اصول اور بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں پر غیر ضروری قانون سازی کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اس ضمن میں ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے قرآن پاک میں کہا گیا ہے: 'ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم' یعنی یہ پیغمبر لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور جو زنجیریں ان پر لاد دی گئی ہیں وہ دور فرماتے ہیں۔ اس اصول کا صاف الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ عامۃ الناس پر قواعد وضوابط کا بوجھ کم سے کم ڈالا جائے۔

یہ وہی چیز ہے جس کو آج دنیا کچھ حوالوں سے ڈی ریگولیشن قرار دیتی ہے۔ جس کو ونڈو آپریشن کہتے ہیں، یہ کیا ہے؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ قانون کے بوجھ کو حتی الامکان کم کیا جائے اور لوگوں کے لئے آسانی پیدا کی جائے۔ یہی بات حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو۔ غیر ضروری طور پر قوانین کا بوجھ نہ بڑھاؤ۔ پابندیاں کم سے کم کرو۔ بوجھ کو گھٹاؤ اور لوڈ شیڈنگ کرو۔ لوگوں کے لئے حرج یعنی غیر ضروری مشکل اور مشقت پیدا نہ کرو۔ رفع حرج اور دفع مشقت بھی شریعت کی حکمت کا ایک عام اصول ہے۔

ایک اور اہم بات جو حضور نے حکمت تشریع کے حوالہ سے بیان فرمائی۔ وہ بڑی غیر معمولی ہے جس کو نہ جاننے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ کل پرسوں ہماری کسی بہن نے سوال کیا تھا کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے اور وہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ حکمت تشریع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ حکمت تشریع یہ ہے کہ شریعت کے جو بنیادی مقاصد اور اہداف ہیں سب سے پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ اگر بنیادی اہداف اور بعد والی چیزوں میں کوئی تعارض ہے تو اہداف کو ترجیح دی جائے۔ جب اہداف قائم ہو جائیں تو پھر بعد والی چیزوں پر توجہ دی جائے۔ بعد والے احکام اور شریعت کی مندوبات میں کوئی تعارض ہے تو مندوبات کو نظر انداز کر کے واجبات کو ترجیح دی جائے۔ مندوبات اور مباحات میں تعارض ہے تو مباحات کو نظر انداز کر کے مندوبات کو ترجیح دی جائے۔ یہ ترتیب شریعت کی حکمت کا ایک بنیادی اور لازمی حصہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا حکم جو شریعت میں مطلوب ہو، جس کا شریعت حکم دیتی ہو، جس کو شریعت قائم کرنا چاہتی ہو، لیکن آپ یا فیصلہ کرنے والے دیانت داری سے یہ سمجھیں کہ اگر اس حکم پر عمل کیا گیا تو اس کے نتیجے بہت سی ایسی قباحتیں پیدا ہو جائیں گی جو اس حکم پر عمل نہ کرنے کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہوں گی۔ اور اگر فی الحال اس کو نظر انداز کر لیا جائے تو شاید اتنی قباحتیں پیدا نہ ہوں۔ تو اُس حکم پر عمل درآمد کو وقتی طور پر ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کرتا ہوں جو اس معاملہ میں بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور سیرت کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی تو کعبہ کی عمارت مستطیل تھی۔ ایک طرف سے بیضوی تھی اور دوسری اطراف سے مستطیل تھی۔ اس وقت کی کی عمارت کی طرح چوکور نہیں تھی۔ اسی طرح سے یہی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے رسول اللہ ﷺ کے بچپن تک چلی آ رہی تھی۔ جو چوکور نہیں تھی، مستطیل تھی اور آگے سے بیضوی شکل کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی نوجوانی کا زمانہ تھا جب مکہ مکرمہ میں سیلاب آیا جس سے کعبہ کی دیواروں کو نقصان پہنچا اور دیواریں گر گئیں۔ کچھ سامان سیلاب کے ساتھ بہہ گیا۔ اس وقت قریش مکہ نے یہ طے کیا کہ ہم بیت اللہ کی عمارت کی ازسرنو تعمیر کریں گے۔ چونکہ ملت ابراہیمی کے کچھ نہ کچھ آثار اور بقایاجات ان میں موجود تھے۔ اس لئے ان کو یہ احساس تھا کہ ہماری

آمدنی کا خاصا حصہ ناجائز اور ناپاک آمدنی پر مشتمل ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر شخص جائز اور پاکیزہ آمدنی لاکر جمع کرے، اس سے ہم کعبہ کی تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے وہ جائز اور پاکیزہ دولت جمع کی۔ اس سے سامان خریدا۔ مزدور لگائے اور بیت اللہ کی تعمیر نو شروع ہوگئی۔ یہ وہی موقع تھا جب رسول اللہ ﷺ کو حجر اسود کی تنصیب کے لئے متفقہ طور پر چنا گیا تھا اور آپؐ کے صادق و امین ہونے کا اعتراف کیا گیا تھا۔ جب یہ تین اطراف کی دیوار بن گئی اور چوتھی طرف کی دیوار رہ گئی تو پیسے ختم ہوگئے۔ باقی جو پیسہ تھا وہ ناجائز کاروبار، لوٹ مار کا اور چوری کا پیسہ تھا وہ انہوں نے لگایا نہیں۔ اس پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت عمارت کو نامکمل چھوڑ دیا جائے اور آگے نامکمل حصہ کا ایک نشان چھوڑ دیا جائے بعد میں جب جائز وسائل دستیاب ہوں گے تو اس کو مکمل کر دیں گے۔

چند سال کے بعد رسول اللہ ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہوگئے۔ آپ نے اسلام کی دعوت دی اور لوگ دعوت کی موافقت اور مخالفت میں لگ گئے۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں کی توجہ اس طرف ہوگئی اور بیت اللہ کی تعمیر یا نامکمل عمارت کی تکمیل کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ کہ اگر تمہاری قوم اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوئی ہوتی اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ یہ اسلام سے پھر جائے گی تو میں کعبہ کی عمارت کو ڈھا کر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دیواروں پر استوار کرتا۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشہ کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر نو شریعت کا ایک ایک مقصد تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بیت اللہ کی عمارت کو گرانے کی ضرورت تھی اور بیت اللہ کی عمارت گرانے سے یہ خطرہ تھا کہ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں یہ منافقین کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ پہلے تو اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا بڑا پیرو کہتے تھے۔ لیکن کامیابی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کام ہی کو ڈھا دیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ لہٰذا لوگوں کے برگشتہ ہونے کے خطرہ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے یہ کام نہیں کیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ شریعت

کے مقاصد اور احکام میں یہ دیکھنا چاہئے کہ بڑا مقصد کون سا ہے۔ چھوٹا مقصد کون سا ہے۔ کسی چھوٹے مقصد کی خاطر بڑے مقصد کو نظر انداز کر دینا حضور ﷺ کی سیرت، سنت اور حکمت تشریع کے خلاف ہے۔

یہ نہ سمجھئے گا کہ مقصد کے بڑا یا چھوٹا ہونے کا یہ تعین بڑا دشوار کام ہے۔ یہ کام فقہائے اسلام اور محدثین بہت پہلے کر چکے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام اور محدثین نے چودہ سو برس غور کر کے یہ معاملہ صاف کر دیا ہے کہ شریعت کے احکام میں کس حکم کی کیا حیثیت ہے اور کس حکم کو کس درجہ پر رکھنا چاہئے۔ چونکہ بہت سے مواقع پر یہ چیز نظر انداز ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے حضرات اس ترتیب، تدریج اور اس حکمت تشریع کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نظر انداز کر دینے سے ہی یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے مخالفین اور کمزور عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

فقہیات سیرت میں ایک اہم چیز جو ضروری ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک اور آپ کے عہد مبارک کے ماحول سے واقفیت ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں کون سا محاورہ رائج تھا۔ کون سی عادات اور طور طریقے رائج تھے۔ یہ جاننا شریعت کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ پاکیزہ اور طیب چیزیں کھاؤ۔ کئی جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز ہیں اور ناپاک چیز تمہارے لئے ناجائز ہیں۔ **احل لکم الطیبات**، پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز قرار دی گئی ہیں۔ اب فقہا کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ پاکیزہ چیزوں سے کیا مراد ہے۔ جو چیزیں قرآن پاک یا احادیث میں صراحتاً جائز قرار دی گئیں ان کا پاکیزہ ہونا تو معلوم ہے۔ ان کے علاوہ کس کس چیز کو پاکیزہ سمجھا جائے۔ اس پر محدثین اور فقہا کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم یعنی عرب اور قریش اور ملت ابراہیمی، ان کے محاورے اور معاشرہ میں جو چیز طیب سمجھی جاتی تھی وہ طیب سمجھی جائے گی۔ جو چیز ناپاک اور گندی سمجھی جاتی تھی اس کو ناجائز اور حرام سمجھا جائے گا۔ اس اصول کے تحت کچھ جانوروں کا گوشت اور دودھ جائز ہے۔ کچھ جانوروں کا دودھ اور گوشت جائز نہیں ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں گرے ایریا زبھی آتے ہیں جن میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ ان کا شمار پاکیزہ چیزوں میں ہے یا ناپاک چیزوں میں۔ کچھ

چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں نہ تو نصوص میں کوئی صراحت ملتی ہے اور نہ عمومی قواعد کی روشنی میں ان کی حیثیت طے کی جا سکتی ہے۔ایسی چیزوں کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ پاکیزہ ہیں اور یہ ناپاک ہیں۔ایسی چیزوں میں ہر فرد اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق فیصلہ کرے۔چونکہ یہ معاملہ ذوق کا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنا ذاتی اور شخصی ذوق بیان فرمانے میں کوئی تامل نہیں فرمایا، لیکن زبردستی لوگوں کو مجبور بھی نہیں کیا کہ وہ لازماً آپؐ ہی کے ذاتی ذوق کی پیروی کریں۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔اس لئے میں اس کو زیادہ وضاحت سے کہنا چاہتا ہوں۔

کچھ چیزیں ہیں جو شریعت میں واضح طور پر حرام اور ناجائز ہیں۔ وہ حدیث کے ذریعے ناجائز ہوئی ہوں یا قرآن پاک کے ذریعے، ان کے ناجائز ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر حرام یا ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ بالواسطہ طور پر ان کے جائز ہونے ہی کے بارے میں اشارہ فرمایا۔لیکن ذاتی طور پر آپ نے ان کو پسند نہیں فرمایا۔لیکن آپ نے دوسروں سے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ چونکہ یہ چیز مجھے پسند نہیں اس لئے تم بھی اس کو ناپسند کرو۔اس کی ایک نمایاں مثال فتح مکہ کے موقع پر سامنے آئی۔عرب میں ایک جانور ہوتا تھا ضب (گوہ)۔ یہ خرگوش اور بڑے چوہے کے درمیان ایک مخلوق تھی۔ چوہے سے بڑی اور خرگوش سے ذرا چھوٹی قسم کا ایک جانور تھا جس میں چوہے اور خرگوش دونوں کے خصائص پائے جاتے تھے۔خرگوش پاکیزہ ہے۔لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ چوہا ناپاک ہے اور لوگ نہیں کھاتے۔ عرب میں گوہ کا گوشت کھانے کا عام طور پر رواج تھا۔غیر عرب لوگ عربوں پر طعن کیا کرتے تھے کہ تم گوہ کا گوشت کھاتے ہو۔اسلام کے آنے کے تقریباً چار سو سال بعد بھی فردوسی نے عربوں کو یہ طعنہ دیا۔فردوسی نے اپنے مشہور شاہنامہ میں لکھا ہے کہ

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امید ہے کہ یہ فردوسی کے ذاتی جذبات نہیں ہوں گے۔ اس نے کسی اور کے جذبات کی ترجمانی کی ہوگی۔ ایک مسلمان کے جذبات یہ نہیں ہوسکتے۔ گویا گوہ کا گوشت ایک ایسی چیز تھی جس پر طنز وتشنیع بھی کی جاتی رہی۔

فتح مکہ کے موقع پر ایک روز جب رسول اللہ ﷺ دسترخوان پر تشریف فرما تھے تو گوہ کا گوشت بھی دسترخوان پر لایا گیا۔ بہت سے لوگ موجود تھے جن میں عام سپاہی بھی تھے اور کبار صحابہ بھی تھے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ جواب ملا کہ حضور یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے اس برتن کو دور کردیا۔ اس پر صحابہ نے یکدم پوچھا کہ کیا یہ ناجائز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ناجائز نہیں ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ 'لم یکن بارض قومی' یہ چیز میرے علاقہ میں رائج نہیں تھی۔ فانی اجدنی اعافه، اس لئے میں اس کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا۔ مجھے اس کا ذوق نہیں ہے یا یہ میرے ذوق کے خلاف ہے۔ حضرت خالد بن ولید دسترخوان پر موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ میں کھالوں؟، آپؐ نے پلیٹ ان کی طرف کردی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضور کے دسترخوان پر تشریف فرما ہونے کے باجود اور یہ سننے کے باوجود کہ حضور ﷺ شخصی طور پر اس کو پسند نہیں کرتے، حضرت خالد نے گوہ کا یہ گوشت تناول فرمایا۔ ان کے بارے میں تو تصریح ہے اور باقی صحابہ نے بھی لیا ہوگا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ جو چیز حلال وحرام کے بالکل درمیان میں ہوگی اس میں ذوق مختلف ہوسکتا ہے۔ کسی کا ذوق ایک چیز کے کھانے کی اجازت دے گا اور کسی کا ذوق اجازت نہیں دے گا۔ لیکن جب درمیان کا ایریا ہوگا تو وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ چیز طیبات کے قریب ہے یا خبیثات کے۔ یعنی جو طیبات ہوں گی وہ جائز ہوں گی اور جو طیبات نہیں ہوں گی وہ ناجائز ہوں گی۔

اس معاملہ میں اس عربی زبان کا محاورہ، جو رسول اللہ ﷺ بولتے تھے یا جو زبان آپ کے زمانے میں بولی جاتی تھی، اس کو بنیاد قرار دیا جائے گا۔ حضور ﷺ کا رواج اور طور طریقہ اور آپ کی قوم یعنی ملت ابراہیمی کا طریقہ بنیاد قرار دیا جائے گا اور اس کی بنیاد پر چیزوں کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ فقہیات سیرت کا یہ مضمون شروع سے سیرت نگاروں، محدثین اور فقہا کی دلچسپی کا رہا ہے۔

اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل، جامع اور مستند کتاب علامہ ابن قیم کی زادالمعاد

ہے۔ ابن قیم نے سیرت کے تمام پہلوؤں کو ایک ایک کر کے بیان کر دیا ہے۔ پھر ان سے جو فقہی احکام نکلتے ہیں وہ بیان کیے ہیں۔ جو دروس اور عبرتیں کسی سبق میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ غزوات کے بیان کے بعد جنگی قانون کے احکام تو نکالے ہی ہیں، معاہدات اور صلح کے احکام تو یقیناً بیان کیے ہیں۔ لیکن جزوی اور انفرادی معاملات کے بہت سے احکام بھی مختلف غزوات کے دوران جو واقعات پیش آئے ان سے استفادہ کر کے بیان کیے۔ بہت سے اخلاقی پہلو بھی بیان کیے۔

مثال کے طور پر غزوہ احد کے واقعات کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے پہلے غزوہ احد کے احکام اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ پھر سولہ احکام بیان کیے ہیں جو غزوہ احد کے واقعات اور معاملات سے نکلتے ہیں۔ پھر ایک اور فصل میں جو حکم، دروس اور عبرتیں غزوہ احد کے سارے قصہ میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ صلح حدیبیہ کی تفصیلات بیان کر کے 34 فقہی احکام بیان کیے ہیں۔ یہ سارے کے سارے مباحث فقہیات سیرت کا ایک انتہائی اہم اور بنیادی مضمون ہے۔ سورۃ فتح کی روشنی میں صلح حدیبیہ کی حکمتیں، ان کے احکام، اسی طرح سے فتح مکہ اور غزوہ تبوک سے الگ الگ احکام نکالے ہیں۔ بعض جگہ ارباب سیرت میں چونکہ واقعات کی تفصیلات میں اختلاف ہے، اس لیے اس اختلاف کے نتیجہ میں احکام میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر قانون جنگ کا ایک حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شہر کسی جنگ کے نتیجہ میں فتح ہو تو مفتوحہ علاقوں کے احکام اور ہیں۔ اور اگر صلح کے نتیجہ میں فتح ہو تو اس کے احکام وہ ہوں گے جو صلح کی شرائط میں طے کیے گئے ہوں۔ اسلامی تاریخ میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں کہ کچھ علاقے جو صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ ایسے علاقوں پر صلح کے احکام جاری کیے گئے ہیں۔ کچھ علاقہ فتح کے ذریعے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے، ان پر فتح کے احکام جاری کیے گئے۔

اس کی بڑی دلچسپ مثال دمشق کی فتح ہے۔ مسلمان دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید پوری فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ حضرت عمر فاروق ان کے بعض فیصلوں کے بارے میں شرح صدر نہیں

رکھتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ سپریم کمان سے حضرت خالد کو معزول کر دینا چاہیے۔ جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو پہلا کام انہوں نے حضرت خالد کی معزولی کا حکم بھیجنے کا کیا اور کمان حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ سونپنے کی ہدایت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضور کی وفات کے بعد جو دو نام خلافت کے لئے تجویز کئے تھے ان میں سے ایک حضرت ابوعبیدہ کا تھا۔ آپؓ نے فرمایا تھا کہ تم میں حضرت عمر فاروق اور حضرت ابوعبیدہ موجود ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ یعنی وہ اس درجہ کے انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق کے نزدیک ان کا نام حضور کے براہ راست جانشین کے طور پر ایک موزون اور مناسب نام تھا۔

جب حضرت ابوعبیدہ کو اپنے تقرر کا یہ خط ملا تو انہوں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی اور خط اپنے پاس رکھ لیا۔ قاصد کو بتایا کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ خلیفۂ رسولؐ کا انتقال ہو گیا ہے، اور ان کی جگہ نئے خلیفہ منتخب ہو گئے ہیں اور نئے خلیفہ نے سپریم کمان تبدیل کر دی ہے۔ وہ خود بدستور حضرت خالد کی کمان میں جنگ کرتے رہے۔ شہر کے ایک طرف کے دروازے پر حضرت ابوعبیدہ کمان کر رہے تھے۔ دوسری طرف کے دروازے پر حضرت خالد خود کمان کر رہے تھے۔ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ حضرت ابوعبیدہ نے اپنے علاقہ کے دروازہ پر مقرر کردہ دشمن کے کماندار سے مصالحت کر لی۔ اور اس سے طے کرلیا کہ وہ چند طے شدہ شرائط پر شہر کا دروازہ کھول دے اور مسلمان فوجیں صلح کر کے شہر میں داخل ہوں۔ عین اسی وقت جب صلح کی یہ گفتگو مکمل ہوئی، حضرت خالد شہر کا دروازہ توڑ کر شہر میں فاتحانہ داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت خالد کو ابوعبیدہ کی اس کاروائی کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ابوعبیدہ کو حضرت خالد کے فاتحانہ داخل ہو جانے کا علم نہیں تھا۔ حضرت خالد کا خیال یہ تھا کہ وہ ایک طرف سے داخل ہو کر شہر کے دوسرے دروازہ کی طرف سے نکل جائیں گے تو پورا شہر فتح ہو جائے گا۔ لیکن جب فوجیں درمیان میں آئیں تو دیکھا کہ دوسری طرف سے ابوعبیدہ کمان کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حضرت خالد نے پوچھا کہ آپ کیسے داخل ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ صلح کر کے داخل ہوا ہوں۔ اس پر حضرت خالدؓ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ تمہاری وجہ سے اب وہ مراعات دینی پڑیں گی جو صلح میں دی جاتی ہیں۔ آپ نے کیوں

صلح کی اور کسی کی اجازت سے کی؟ حضرت ابوعبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ حضرت خالد کے پاس کمان تھی اس لئے انہوں نے بہت کچھ کہا۔ روایت میں آتا ہے کہ بہت سخت سست کہا۔ حضرت ابوعبیدہؓ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر یہ طے ہوا کہ جہاں دونوں کمانداروں کے گھوڑوں کے سر آپس میں ملے ہیں وہاں ایک لکیر کھینچ دی جائے۔ آدھے شہر پر فتح کے احکام جاری ہوں گے اور آدھے پر صلح کے احکام جاری ہوں گے۔ چنانچہ آدھے دمشق شہر پر وہ احکام جاری ہوئے جو حضرت ابوعبیدہ نے صلح کی شرائط کے ضمن میں طے کئے تھے۔ آدھے پر فتح کے احکام جاری ہوگئے۔ جب یہ سارے معاملات طے ہو گئے اور سب لوگ ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر اپنے کیمپ میں پہنچے تو حضرت خالد نے پوچھا کہ آخر آپ نے اتنا اہم فیصلہ کرنے کے لئے مجھ سے اجازت کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔ اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے وہ خط دکھایا کہ اس لئے نہیں پوچھا۔ خط دیکھ کر حضرت خالد رو پڑے اور کہا کہ مائیں تم جیسا آدمی جننے سے قاصر ہیں۔

اس طرح کا اختلاف فتح مکہ کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں بھی ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو فتح مکہ اور شہر کی حیثیت کیا تھی۔ کیا یہ فتح جنگ کے نتیجہ میں ملی تھی یا صلح کے نتیجہ میں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ صلح کے نتیجہ میں فتح ہوا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے فتح ہوا۔ دونوں میں فرق ہے۔ جو فقہائے کرام سمجھتے تھے کہ مکہ صلح کے نتیجہ میں فتح ہوا ان کے نزدیک مکہ کی زمین اور مکانات کے احکام اور ہیں۔ جو سمجھتے تھے کہ مکہ بزور اور فوج کشی کے ذریعے فتح ہوا ہے ان کے خیال میں مکہ کی جائدادوں کے احکام اور تھے۔ ابن قیم نے بھی اس بارہ میں رائے دی ہے۔

فقہیات سیرت کا بڑا میدان جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، اور ہمارے صدر محفل جسٹس خلیل الرحمٰن خان صاحب نے اس پر ایک کتاب بھی تیار کرائی ہے۔ وہ اقضیۃ الرسول کا میدان ہے، یعنی عدالت نبوی اور دربار رسول کے فیصلے۔ رسول اللہ ﷺ نے بطور قاضی اور سربراہ ریاست کے جو فیصلے کئے تھے وہ کیا تھے۔ ان سب فیصلوں کو الگ الگ موضوع وار یکجا جمع کرنے کی آج سے نہیں بلکہ ایک ہزار سال سے کوششیں ہو رہی ہیں۔ محدثین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں حضور ﷺ کے فیصلے نقل کئے ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی اور کئی ایک دوسرے

محدثین نے ان کے لئے الگ الگ ابواب اپنی اپنی کتابوں میں باندھے ہیں۔ محدثین کے ان ابواب کے علاوہ الگ سے منفرد کتابیں بھی اس موضوع پر لکھی گئیں۔ خود ابن قیم نے زاد المعاد کی پانچویں جلد ساری کی ساری اسی کام کے لئے وقف کی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بیان فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیاوی معاملات کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ 'انتم اعلم بامور دنیاکم'، کہ تم اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو۔ یہ بعض صورتوں میں تو بالکل واضح ہوتا تھا اور صحابہ کرام کو اس بارے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات ان معاملات میں جہاں صحابہ کرام کو شبہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ فیصلہ ان دونوں میں سے کون سی نوعیت کا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال غزوہ بدر کے موقع پر سامنے آئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ طے کرلیا کہ اب قریش کے لشکر سے مقابلہ کرنا ہے اور قریش کی فوجوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوکر رہے گی تو آپ نے ایک جگہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہاں مسلمانوں کی فوج کو کیمپ قائم کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج وہاں کیمپ لگا کر قیام کی تیاری کرنے لگی۔ اس پر ایک انصاری صحابی حضرت حباب بن المنذرؓ نے جو انصار میں ایک بڑے صاحب الرائے سردار تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ یارسول اللہ یہ جگہ جو آپ نے منتخب کی ہے تو کیا اس انتخاب کا حکم اللہ نے دیا ہے؟ اگر وحی کے ذریعے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے تو اس میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ام ھو الرأي والحرب والمکیدۃ، یا یہ آپ کی ذاتی رائے اور جنگی تکنیک اور چال ہے؟ آپ نے فرمایا بل ھو الرأي والحرب والمکیدۃ، بلکہ یہ میری ذاتی رائے، جنگی حکمت عملی اور تکنیک ہے۔ حضرت حباب بن المنذر نے عرض کیا کہ پھر میرا خیال یہ ہے کہ یہ جگہ نہیں بلکہ فلاں جگہ زیادہ موزوں ہے۔ پھر انہوں نے اس جگہ کی خوبیاں بیان کیں۔ تو آپ نے حضرت حباب بن المنذر کی رائے سے اتفاق فرمایا اور اپنی رائے سے رجوع فرمالیا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں بہت سے مباحث اس مضمون سے متعلق بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو کی مثال میں آپ کے سامنے ابھی پیش کرتا ہوں۔

اب میں وہ سوال اٹھاتا ہوں جس کے بارے میں پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ بعد میں اٹھاؤں گا۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے جو مختلف فیصلے یا ارشادات ہیں، ان میں سے کس ارشاد کی کیا نوعیت ہے، اس کا فیصلہ کیسے ہوگا اور ان کی قسمیں کیا ہیں۔ ایک مشہور فقیہ اور اصولی امام ابوالعباس احمد بن ادریس قرافی (متوفی ۶۸۴) ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم الشان اور منفرد کتاب لکھی ہے جس کی مثیل یا نظیر فقہ اسلامی کے پورے لٹریچر میں نہیں ہے۔ یہ چار پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب تو دو جلدوں میں ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ حال ہی میں ہمارے دو فاضل دوستوں نے جن میں سے ایک ہماری اس یونیورسٹی میں ہمارے رفیق کار بھی رہے ہیں۔ اس کو ایڈٹ کر کے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا نام 'کتاب الفروق' ہے۔ اس میں انہوں نے ایسی چیزوں کے درمیان فرق کی نشاندہی کی ہے اور غالباً ساڑھے پانچ سو فرق بیان کئے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں لیکن دراصل ان کے درمیان فرق ہے۔ اس فرق کو سمجھنا اسلامی قوانین کی نزاکتیں سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے چھتیس واں فرق یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف احکام اور تصرفات کے درمیان کیا فرق ہے۔

انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے تصرفات ہیں، یعنی فیصلے، وہ عملی فیصلے ہوں یا زبانی ارشادات ہوں، وہ تین قسموں میں منقسم ہیں۔ کچھ فیصلے تو وہ ہیں جو آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائے۔ آپؐ مدینہ منورہ کی ریاست کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ سارے معاملات کی حتمی اپیل آپ کے روبرو پیش ہوتی تھی۔ کچھ معاملات وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کے طور پر ارشاد فرمائے۔ جس کی تبلیغ بطور نبی اور بطور صاحب شریعت کے آپ نے فرمائی۔ کچھ تصرفات وہ ہیں جو بطور سربراہ ریاست یا انتظامی سربراہ کے آپ نے فرمائے۔

امام قرافی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہر منصب کا مصدر و ماخذ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منصب ایسا نہیں ہے جس میں اصل مصدر اور ماخذ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی نہ ہو۔ جس میں ہدایت اور رہنمائی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے نہ ملتی ہو۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے اکثر فیصلے اور ارشادات بطور تبلیغ شریعت اور ہدایت شریعت کے ہیں۔ آپ کا اصل منصب یہ تھا کہ آپؐ شریعت عطا فرمانے والے ہیں۔ اللہ کی

مرضی کی ترجمانی فرمانے والے ہیں۔قرآن پاک کی تشریح اور وضاحت فرمانے والے ہیں اور آپ کے احکام کا بیشتر حصہ اسی حیثیت میں ہے۔ کچھ احکام وہ ہیں جن کے بارے میں باالاتفاق علما کی رائے ہے کہ وہ آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائے۔حضور کے سامنے ایک مقدمہ آیا۔دو آدمیوں نے اپنی روئداد اور مقدمہ پیش کیا۔آپ نے دونوں کی بات سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیا۔یہ ارشاد بداہتاً بطور قاضی کے ایک عدالتی فیصلہ ہے۔یہ انہی دو حضرات کے درمیان واجب التعمیل ہوگا جو مقدمہ کے فریق تھے۔باقی لوگوں کے ساتھ اس کا براہ راست تعلق نہیں ہوگا۔کچھ فیصلوں کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ فیصلے حضور نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائے۔وہ بھی واضح ہیں۔مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی کو گورنر مقرر کیا۔ ظاہر ہے کہ گورنر کی یہ تقرری نہ بطور قاضی کے تھی نہ بطور نبی کے تھی، بلکہ بطور سربراہ ریاست کے تھی۔حضور نے حضرت اسامہؓ کو لشکر کا کمانڈر مقرر کیا تو یہ بطور سربراہ ریاست کے ایک انتظامی حکم تھا۔اس طرح کے فیصلے جن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ بطور سربراہ ریاست یا بطور قاضی القضاۃ کے تھے معلوم اور متعین ہیں۔لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں اور ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں یہ امر واضح نہ ہو کہ حضور نے یہ فیصلہ کس حیثیت میں فرمایا۔اس طرح کے معاملات میں جن اہل علم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ بطور سربراہ ریاست کے تھا وہ اس پر اس طرح کے احکام منطبق کرتے ہیں جو سربراہ ریاست کے احکام پر منطبق ہوتے ہیں۔جن کے نزدیک وہ فیصلہ بطور رسول کے تھا وہ وہ احکام منطبق کرتے ہیں جو بطور نبی اور رسول کے آپؐ کے ارشادات پر منطبق ہوتے ہیں۔

ان تصرفات کی نوعیت کا تعین کرنے کے لئے کچھ تو بنیادی تصورات ہیں جو ہر ایک کے سامنے واضح ہیں۔مثلاً جو فیصلے یا تصرفات رسول اللہ ﷺ نے بطور امام یا سربراہ ریاست کے فرمائے، مثلاً تقرریاں فرمائیں، کسی کو کوئی زمین عنایت فرمائی، کسی کو مال غنیمت میں کچھ حصہ دیا، کسی کو بیت المال سے کوئی وظیفہ دیا، تو یہ سارے فیصلے وہ ہیں جو آپؐ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائے۔بطور قاضی کے جو فیصلے کئے یہ وہ ہیں جو آپ نے فریقین کے درمیان فرمائے۔جہاں کوئی حکم شرعی بیان فرمایا گیا، کوئی ہدایت قرآن پاک کی روشنی میں آپ نے بیان فرمائی، یہ وہ احکام ہیں جو بطور نبی اور رسول کے آپ نے بیان فرمائے۔

اس واضح تقسیم کے باوجود پھر بھی چند معاملات ایسے ہیں جن کے بارہ میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ یہ فیصلہ آپ نے کس حیثیت میں فرمایا تھا۔ ان میں سے دو مثالیں میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ فرمایا تھا کہ 'من احیا ارض میتة فھی لہ' جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کرلے گا وہ زمین اس کی ملکیت شمار ہوگی۔ یہ حضور کا ارشاد گرامی ہے اور تمام محدثین نے اس کو روایت کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد بطور حکم شریعت تھا، بطور دینی رہنمائی کے تھا۔ لہٰذا یہ شریعت کا عام حکم ہے اور جس شخص کا جب جی چاہے، اسلامی ریاست کی حدود کے اندر جس غیر آباد اور غیر مملوکہ زمین کو وہ آباد کرلے تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ انہوں نے اس کے تفصیلی احکام بھی بیان کئے ہیں کہ مردہ زمین سے کیا مراد ہے۔ اس کو آباد کرنے سے کیا مراد ہے۔ آباد کرنے کے تقاضے کیا ہیں۔ جب وہ آباد کرنے کا ارادہ کرلے تو کب تک اس کو یہ مہلت دی جائے گی کہ وہ اس کو آباد کرلے۔ اس کی پوری تفصیل فقہ شافعی اور فقہ مالکی کی مستند کتابوں میں مدون شدہ موجود ہے اور فقہ کی ہر کتاب میں احیاء الموات سے متعلق ابواب میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔

اس کے برعکس حضرت امام ابوحنیفہ کا ارشاد یہ ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائی تھی۔ یعنی حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے شہریوں کو بطور سربراہ ریاست کے اجازت دی تھی کہ جس کا جی چاہے عرب میں کوئی غیر آباد زمین آباد کرلے، اور جب وہ اس زمین کو آباد کرلے گا تو وہ اس کی ملکیت قرار پا جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ حکم ہر وقت کے لئے اور ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ اگر کوئی حکومت کسی خاص موقع پر اس کی اجازت دے تو اس اجازت کے مطابق عمل ہوسکتا ہے ورنہ نہیں ہوسکتا۔ حکومت کی واضح اور صریح اجازت کے بغیر یہ نہیں ہوسکتا کہ جب جس کا جی چاہے غیر آباد سرکاری زمین اپنے قبضہ میں لے کر اس کو آباد کرلے اور اپنی ملکیت قرار دے لے۔ اس لئے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائی تھی۔ جید فقہائے اسلام کے درمیان اس مسئلہ پر گزشتہ بارہ سو سال سے بحثیں ہو رہی ہیں۔

شافعی اور مالکی فقہا نے بہت شد ومد سے امام ابوحنیفہ کی اس رائے پر تنقید فرمائی۔ اور اس

پر حیرت کا اظہار کیا کہ امام ابوحنیفہ کس طرح اور کس بنیاد پر اتنے کھلے اور واضح حکم کو بطور سربراہ ریاست کے ایک فیصلہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آج نہیں بلکہ کئی سو سال سے دنیا میں امام ابوحنیفہ ہی کے نقطہ نظر پر عمل ہو رہا ہے۔ جن ممالک میں فقہ مالکی اور فقہ شافعی رائج ہے وہ بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ مراکش میں فقہ مالکی کی حکومت ہے۔ وہاں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں کہ حکومت کی مرضی کے بغیر جس غیر آباد زمین کو چاہے، آباد کر کے اپنی ملکیت میں شامل کر لے، حکومت کی اجازت وہاں بھی ضروری ہے۔ مصر میں جہاں فقہ شافعی کی اکثریت ہے، وہاں بھی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی مصری کاشت کار غیر آباد زمین کو آباد نہیں کر سکتا۔ وہاں بھی حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ گویا عملاً دنیا نے امام ابوحنیفہ کے نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بطور بیان شریعت کے نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک اجازت تھی جو بطور سربراہ ریاست کے حضور نے دی تھی اور آئندہ جب کوئی سربراہ ریاست یہ اجازت دے گا یا حکومت کا متعلقہ محکمہ اس کی اجازت دے گا تو اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ ایک مثال ہے اس اختلاف کی جو رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے بارے میں سامنے آیا۔

ایک اور مثال۔ جنگ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ سپاہیوں کو جوش دلانے کے لئے کبھی کبھی یہ اعلان فرمایا کرتے تھے: من قتل قتیلا فله سلبه۔ کہ اگر کسی دشمن کو قتل کر دو گے تو اس کا ساز و سامان قتل کرنے والے کا ہو جائے گا۔ **من قتل قتیلاً فله سلبه**، سلب اس ذاتی ساز و سامان کو کہتے ہیں جو کسی سپاہی کے اپنے تصرف میں ہو۔ مثلاً اس کے جسم پر کوئی کپڑے ہیں، زیور ہے، زرہ ہے، تلوار اور دیگر ہتھیار ہیں، یہ چیزیں مال غنیمت میں شمار نہیں ہوں گی اور قتل کرنے والے مجاہد کی ہوں گی۔ اب من قتل قتیلاً فله سلبه، کے بارے میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے درمیان وہی اختلاف ہے جو مردہ زمین کی آباد کاری کے بارہ میں تھا۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ یہ بات حضور نے بطور فوج کے کمانڈر کے فرمائی تھی۔ غالباً غزوہ بدر میں یہ بات ارشاد فرمائی۔ اس لئے جب اسلامی فوج کا کمانڈر میدان جنگ میں مناسب سمجھے تو ایسا حکم دے سکتا ہے۔ اور اس جنگ میں شرکت کرنے والے سپاہیوں کو اجازت ہو گی کہ اگر اسلامی فوج کا کوئی سپاہی دشمن فوج کے کسی سپاہی کو قتل کر دے تو اس کا ذاتی سامان قتل

کرنے والے سپاہی کو دے دیا جائے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ فوج کے کمانڈر کا صوابدیدی اختیار ہے یا اس وقت کے سربراہ ریاست کا اختیار ہے۔ اگر وہ اس طرح کا کوئی عام حکم دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔

اس کے برعکس امام شافعی کے نزدیک یہاں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات بیان شریعت کے طور پر ارشاد فرمائی تھی۔ لہٰذا ہمیشہ ہر اسلامی جنگ میں، جہاں بھی مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ ہو رہی ہو اور جب کوئی غیر مسلم قتل کیا جائے گا تو جس مسلمان سپاہی کے ہاتھوں قتل کیا جائے گا اس کا ذاتی سامان اس مسلمان سپاہی کا حق ہے جس کی گولی یا تلوار سے وہ قتل ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں اگر امام شافعی اس زمانے میں ہوتے تو وہ کیا فرماتے کہ اگر کوئی پائلٹ ایک بم مار کر دشمن کے پانچ سو سپاہیوں کو مار دے تو کیا ان تمام سپاہیوں کا سلب اس پائلٹ کو دے دیا جائے؟ یہ مجھے نہیں معلوم کہ آج کے شافعی فقہا اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے البتہ آج بھی قابل عمل ہے کہ فوج کا کمانڈر جب بھی اور جہاں بھی اور جس حد تک مناسب سمجھے تو وہ یہ اجازت دے سکتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ امام مالک نے یہاں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام مالک کا اصول اگر وہ ہے جو 'من احیا ارضا میتۃ' میں تھا تو یہاں ان کی رائے امام شافعی کے ساتھ ہونی چاہئے تھی۔ اگر یہاں ان کی رائے امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہے تو وہاں بھی امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہونی چاہئے تھی۔ یہ بات مالکی فقہا نے نوٹ کی اور امام مالک کے اس نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لئے بہت لمبے چوڑے دلائل دیئے۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ امام مالک نے ایک جیسی بات میں دو رائیں کیوں اختیار فرمائیں۔

ایک اور چھوٹی سی مثال میرے ذہن میں ابھی آئی۔ جب فتح مکہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ تو اسلام لانے والوں میں حضرت معاویہؓ کی والدہ ہند بنت عتبہ بھی شامل تھیں۔ ہند بنت عتبہ نے بہت سی دوسری خواتین کی معیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں حاضری دی۔ مختلف خواتین نے مختلف معاملات پر حضور سے مسائل اور سوالات پوچھے اور رہنمائی لی۔ ہند بنت عتبہ نے کہا کہ یارسول اللہ! ان ابا سفیان رجل شحیح مسیک، یہ بات ابوسفیان کی اہلیہ کہہ رہی

ہیں اس لئے اس میں کسی صحابی کی غیبت کا پہلو نہیں ہے۔ میں اس کا لفظی ترجمہ کرتا ہوں کہ ابوسفیان انتہائی بخیل اور کنجوس آدمی ہیں۔ پیسہ پیسہ کو بہت روک کر رکھتے ہیں۔ مجھے اور میرے بچوں کے ضروری اخراجات کے لئے بھی پورے پیسے نہیں دیتے تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضور نے فرمایا 'خذی من ماله مایکفیک وولدک بالمعروف' ، ان کے مال میں سے جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو وہ لے لیا کرو۔ یعنی شوہر کو بتائے بغیر ان کی جیب سے نکال لیا کرو۔ اس کی تمہیں اجازت ہے۔

اس موضوع پر فقہائے کرام کے درمیان طویل بحثیں ہوئیں۔ کچھ فقہائے کرام نے یہاں بھی یہ رائے قائم کی کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور بیان شریعت کے ارشاد فرمائی ہے۔ ابن حزم کی رائے یہی ہے کہ یہ بات بطور بیان شریعت کے ہے۔ اس لئے دنیا میں ہر بیوی کو بلکہ ہر اس شخص کے لئے جائز ہے کہ جس کا نفقہ کسی اور کے ذمہ ہو اور وہ نفقہ نہ دیتا ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اپنا حق اس کے مال میں سے لے لے۔ مثلاً ایک ادارہ کسی ملازم کو تنخواہ نہ دے اور ملازم اپنے طور پر لینا شروع کر دے تو یہ بہت خطرناک بات ہو جائے گی۔ ابن حزم کی رائے میں بیویوں کو عام اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ شوہر کے مال میں سے اپنی ضروریات کے لئے ناگزیر اخراجات بغیر اجازت کے لے لیا کریں۔

کچھ حضرات کا اس بارے میں خیال ہے کہ یہ بات حضور نے بطور ایک قاضی کے ارشاد فرمائی ہے۔ آپؐ نے ایک شکایت سنی اور اس کی بنیاد پر آپؐ نے فیصلہ کیا۔ یہ رائے امام شافعی اور امام مالک کی ہے۔ لیکن اس پر احناف کی طرف سے پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے فریق کا موقف سنے بغیر کیسے فیصلہ فرما دیا۔ شافعی اور مالکی فقہا نے اس اعتراض کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ذاتی طور پر ابوسفیان سے واقف تھے۔ اس لئے ان کا موقف سننے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ کیا قاضی اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک قاضی اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ اگر قاضی کو ذاتی طور پر معلوم ہو تو بھی وہ اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا۔ اس پر لمبی بحثیں ہیں۔

پھر اس پر فقہائے شافعیہ اور مالکیہ نے ایک اصول نکالا 'ظفر بالحق'۔ فقہائے احناف

اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی حق کسی کے ذمہ واجب الادا ہو اور وہ دیتا نہ ہو اور اتفاق سے حقدار کو وہ رقم مل جائے، تو امام مالک کے نزدیک جائز ہے کہ وہ اپنا حق وصول کرے۔ امام مالک کے پورے احترام کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ آج اگر اس پر عمل درآمد ہونے لگے تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ امام ابوحنیفہ اس پورے واقعہ کی تعبیر اور تفسیر یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک عام مشورہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے خاندان کے ایک بزرگ کے طور پر دیا۔ ابوسفیان کے خاندان سے حضور کی رشتہ داریاں تھیں، اور آپؐ اس خاندان کے لوگوں سے فرداً فرداً ذاتی طور پر واقف تھے۔ خاندان کا بزرگ ہی ایسے ذاتی امور میں مشورہ دے سکتا ہے۔ حضور کو یقین تھا کہ ابوسفیان اس کو محسوس نہیں کریں گے۔ جب ان کو پتہ چلے گا کہ حضور نے یہ مشورہ دیا ہے تو وہ خوشی سے اس کو قبول کریں گے۔ اس لئے یہ ایک بزرگانہ اور خاندانی مشورہ تھا۔ جس طرح ایک بھائی بہن سے کہے کہ تم بقدر ضرورت لے لیا کرو، اور اس کو یقین ہو کہ بہن کا شوہر اس پر اعتراض نہیں کرے گا۔

یہ چند وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ ان پر کیسے عمل درآمد کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں 'ملت ابراہیمی کے بقایاجات' کے نام سے فقہیات سیرت کے ایک نئے پہلو پر توجہ دی ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کو روحانی باپ کہا گیا ہے۔ ملت ابیکم ابراھیم، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیشہ اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا ہے۔ ملت ابراہیمی کے پیروکار ہونے سے کیا مراد ہے؟۔ اس پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ بحث قابل دید ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یوں تو تمام انبیا علیہم السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک تمہید تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے ایک فوری مقدمہ یا فوری ارہاص یا تمہید کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ ایک بین الاقوامی ملت پیدا کی۔ وہ پہلے پیغمبر تھے جنہوں نے مختلف اقوام میں دین کی تعلیم دی۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ واحد نبی ہیں جن کی بعثت مختلف اقوام کے لئے ہوئی۔ جنہوں نے عراق، شام، فلسطین، مصر اور جزیرہ عرب میں تبلیغ کے فرائض سرانجام دیئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روم بھی تشریف لے گئے۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آپ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ لیکن یہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مشن رکھنے والے پہلے پیغمبر ہیں اور اس بین الاقوامیت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی ملت بعض ایسے اساسات پر قائم ہو جو انسانی فطرت کے قریب تر ہوں۔ انسانی فطرت سلیمہ ان کو تسلیم کرتی ہو۔ ان اساسات کا اعتراف کرتی ہو اور ان کی بنیاد پر جو عالمگیر تہذیب قائم کی جائے وہ تمام انسانوں کے درمیان ایک مشترک تہذیب کے طور پر پنپ سکتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا۔ ملت ابراہیمی کا مرکز بیت اللہ روز اول سے ہی چلا آرہا تھا۔ حج حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع کیا۔ حج کے تمام احکام اور طریقے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اور حضور کے زمانے تک چلے آرہے تھے اور ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بیت اللہ کا طواف، بیت اللہ کی حرمت، حجاج کرام اور عمرہ کے لئے آنے والوں کا اللہ کے نام پر قربانی دینا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی، منیٰ کا قیام، عرفات کا اجتماع، یہ ساری وہ عبادات تھیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو جاہلیت کے زمانے میں کچھ عربوں نے چھوڑ دی تھیں تو ان کو رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ بحال کرادیا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں جو بعض لوگوں نے جاہلیت کے دور میں شرارت یا جہالت سے حج میں شامل کر دی تھیں وہ حضور نے نکال دیں، اور حج کی عبادت کو پاکیزہ اور منقح کر کے دوبارہ ملت ابراہیمی کے مطابق قائم کر دیا۔ یہ ساری تفصیل جاننا اس لئے ضروری ہے کہ جب شریعت کے احکام کی بنیاد پر کوئی عالمگیر ملت یا معاشرہ قائم کیا جائے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوڑے ہوئے اصول اور آپ کی دی ہوئی ملت کے آثار و بقایا جات اس کی بنیاد ہوں گے اور ان کی بنیاد پر ہی یہ تہذیب قائم کی جائے گی۔

جو چیزیں عرب لوگ ناپسند کرنے لگے تھے ان کی ناپسندیدگی کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ مثال کے طور پر منیٰ میں شروع سے میلہ اور بازار لگا کرتا تھا۔ باہر سے آنے والے قبائل اپنا سامان لاکر وہاں بیچا کرتے تھے۔ یہ چیز قریش اور طائف کی تجارت کو نقصان پہنچاتی تھی۔ قریش کے بعض بڑے بڑے ساہوکاروں کا خیال تھا کہ منیٰ کے

بازار سے قریش کے تجارتی مفاد پر زد پڑتی ہے۔ بجائے اس کے کہ تجارت قریش کے ہاتھ میں ہو، منیٰ کے بازار کے ذریعہ ایک بڑا حصہ تجارت کا ان قبائل کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا جو اپنا سامان لا کر منیٰ میں بیچا کرتے تھے۔ اس لئے قریش نے یہ چاہا کہ دوسرے قبائل کو تجارتی سرگرمیوں سے روکنے کی خاطر یہ تصور پیدا کریں کہ حج تو ایک خالص روحانی عبادت اور پاکیزہ چیز ہے۔ اس میں دنیاوی تجارت اور مادیات کی آلائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے قبائل کو تجارت سے روکنا چاہا۔ رسول اللہ ﷺ نے تجارت کی نہ صرف اجازت دی بلکہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی کہ اللہ کی عبادت بھی کرو اور اس کا فضل بھی تلاش کرو۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان حج کے موقع پر تجارت کرنا چاہتا ہے تو یہ حضورؐ کے لائے ہوئے دین کے بالکل مطابق ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ دینی سرگرمیوں کے دوران دنیاوی سرگرمیاں ہوسکتی ہیں اور دنیاوی سرگرمیوں کو دین کی رہنمائی میں کرنا نہ صرف جائز بلکہ عبادت ہے، اس لئے حضور نے ان سرگرمیوں کو بحال کر دیا۔

قریش مکہ نے اپنے آپ کو عرب کے دوسرے حجاج سے ممیز کرنے کے لئے یہ طے کیا کہ ہم حج کے فلاں اور فلاں مناسک میں شریک نہیں ہوں گے۔ مثلاً ہم مزدلفہ میں رات نہیں گزاریں گے۔ آخر عرب کے بدوؤں اور عام لوگوں کے ساتھ ہم کیسے رات گزاریں۔ یوں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے خود مزدلفہ سے مستثنیٰ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کے قیام کو نہ صرف دوبارہ بحال کر دیا بلکہ مزدلفہ کے قیام کو ضروری قرار دیا۔

اسی طرح سے قربانی اور دوسری کئی عبادات کے بارے میں جو غلط فہمیاں رائج تھیں وہ حضور نے دور فرمائیں اور ایک ایک کر کے دوبارہ ملت ابراہیمی کے احکام کو زندہ کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے ایک اور اہم چیز بیان کی ہے کہ شریعت کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ احکام الٰہی کی اطاعت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں جو رکاوٹیں ہوں ان کو دور کیا جائے۔ اسی طرح جو رسوم و رواج کسی قوم میں مروج ہیں ان رسوم و رواج کے مثبت پہلوؤں کو اسلام کی تہذیب میں سمویا جائے اور ان میں جو منفی پہلو ہیں ان کو پاک صاف کیا جائے اور اس طرح ایک ایسی عالمگیر اور بین الاقوامی برادری قائم کی جائے جس میں ہر قوم کے احساسات، پسند ناپسند اور انسانی اقدار کی ترجمانی ہو۔ بشرطیکہ کہ ان کی اساس ملت ابراہیمی پر ہو اور وہ شریعت

کے احکام کی روشنی میں طے کی گئی ہوں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب نے جاہلیت کی عادات کا بھی مطالعہ کیا اور یہ ہدایت کی کہ سیرت کے ہر طالب علم کو اور حکمت شریعت کے جویا کو عہد جاہلیت کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں بنو اسماعیل میں ملت ابراہیمی کی جو وراثت چلی آرہی تھی اس کے بنیادی عناصر کیا تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں ان میں کون کون سی چیزیں بطور بدعات کی شامل کی گئیں۔ کون کون سی خرافات شامل ہوئیں اور کس طرح سے ملت ابراہیمی کے احکام میں تحریفات شامل ہوئیں۔

فقہیات سیرت پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ایک دو مزید چھوٹی چھوٹی چیزیں مثال کے طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شریعت کا ایک اصول ہے جس کو احراز اور استیلاء کے نام سے بعض فقہا نے بیان کیا ہے۔ اس معاملہ میں بھی امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر کئی دوسرے فقہا کے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ میدان جنگ میں اگر دشمن فوج کا سپاہی مسلمانوں کی کسی چیز پر قابض ہو جائے اور اس کو کامیابی کے ساتھ میدان جنگ اور مسلمانوں کے علاقوں سے نکال کر اپنے علاقہ میں لے جائے تو وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا اور مسلمان کی ملکیت اس پر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی مسلمان سپاہی دشمن کی کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر کامیابی کے ساتھ اس کو اسلامی ریاست کی حدود میں لے آئے تو اس چیز پر سے اس غیر مسلم کا قبضہ بھی ختم ہو جائے گا اور ملکیت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ اصول امام ابوحنیفہ نے سب سے پہلے دریافت فرمایا جس کو فقہائے احناف نے احراز کے نام سے بیان کیا۔

امام ابوحنیفہ اس اصول کو سیرت کے کئی واقعات سے ثابت کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا استدلال فتح مکہ کے واقعات سے ہے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ اپنے سابقہ دولت کدے پر قیام فرما نہ ہوئے۔ نہ آپؐ نے اپنی جائداد کا قبضہ دوبارہ لینے کی کوشش کی۔ جو جائداد جس کے قبضہ میں تھی اسی کے قبضہ میں رہی۔ حضور نے اپنا مکان مبارک جو حضرت علیؓ کے بھائی جناب عقیل ابن ابی طالب نے بلا اجازت فروخت کر دیا تھا، نہ صرف واپس نہیں لیا، بلکہ حضور ﷺ نے حضرت عقیل سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم نے میرا مکان کیوں فروخت کیا۔ جس کے ہاتھ فروخت کیا تھا اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے ایک ناجائز طریقے سے میرا مکان کیوں خریدا۔ غرض جو جائیداد جس کے پاس تھی اسی کے پاس رہی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

پیروی میں بقیہ صحابہ کرام نے بھی اپنی اپنی جائدادوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ وہ جائداد پھر انہی لوگوں کی قرار پائی جو اس پر قابض تھے۔ مورخین اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس نے کس کی جائداد پر قبضہ کیا تھا۔ میں نے بعض تفصیلات نوٹ کی ہیں لیکن ان کو بیان کرنے کا اب وقت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مہاجر صحابہ کرام میں سے کچھ صحابہ کرام تو اپنی جائداد کی چابیاں اپنے کسی دوست کو دے آئے تھے۔ ان دوست نے جایداد پر خود قبضہ کر لیا یا اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اکادکا صورتوں میں امانت کی حفاظت بھی کی گئی اور جب اصل مالکان مکہ آئے تو ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔ لیکن یہ واقعات بہت شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں۔ اکثر صورتوں میں وہ جائدادیں ہاتھ سے چلی گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس لینے کی کوشش نہیں کی۔ امام ابوحنیفہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر کسی دشمن ملک کا شہری کسی اسلامی ملک کے مسلمان شہری کی جائداد پر قبضہ کر لے تو وہ جائداد اس قابض ہی کی سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ جائدادیں ان غیر مسلموں کی نہ ہوگئی ہوتیں جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے تو رسول اللہ ﷺ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ناجائز جائداد کا برقرار رہنا پسند نہ فرماتے اور اس کو تلقین فرماتے کہ تمہارے قبضہ میں یہ جائداد ناجائز ہے۔ حضور کا اس پر اعتراض نہ کرنا اور مسلمان ہونے کے باوجود انہی ہاتھوں میں اس جائیداد کا رہنا اور بعد میں ان کا اس میں اپنی جائداد کی طرح تصرف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور نے ان کی اس ملکیت کو درست تسلیم کیا۔ جب حضور نے ملکیت کو درست تسلیم کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احراز کی بنیاد پر ملکیت مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ غیر مسلم دشمن کے لئے ہے جو حالت جنگ میں ہو۔

دوسرے فقہا بالخصوص امام شافعی اور امام مالک اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اس اصول پر عملدرآمد سے بہت قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مالکی اور شافعی فقہاء نے بہت شد و مد سے ان قباحتوں کا ذکر کیا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ احراز کا اصول ہے جس سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کر کے اس اصول کو بیان کیا ہے۔

ایک اور اہم بات جو فقہیات سیرت سے متعلق ہے جس کے بارے میں فقہائے اسلام نے بڑی بحثیں کی ہیں وہ جزیہ کا حکم ہے۔ ان بحثوں میں کئی چیزیں ایسی بھی آ گئیں جن کی

وجہ سے غیر مسلموں کو مسلمان امت کے بارے میں بہت سی منفی اور بے سروپا باتیں کہنے کا موقع ملا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اس شرط پر کیا جاسکتا ہے کہ وہ جزیہ اور ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں، **'حتی یعطوا الجزیة عن یدوھم صاغرون'**۔ جزیہ کے لفظی معنی بدلہ اور consideration کے ہیں، یعنی غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب وہ حفاظتی ٹیکس یا شہریت کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جس طرح مسلمان زکوٰۃ یا عشر ادا کرتا ہے، اسی طرح غیر مسلم خراج ادا کرتا ہے۔ مسلمان سے زکوٰۃ لی جاتی ہے جو نا قابل تغیر اور تبدل ہے۔ غیر مسلم سے جزیہ لیا جاتا ہے جس کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے اور کمی بھی کی جاسکتی ہے۔ مسلمان سے زرعی پیداوار پر عشر لیا جاتا ہے جبکہ غیر مسلم سے خراج لیا جاتا ہے۔ خراج معاف بھی ہوسکتا ہے لیکن عشر معاف نہیں ہوسکتا۔ بقول ڈاکٹر حمیداللہ عشر، زکوٰۃ، خراج اور جزیہ کے معاملہ میں غیر مسلموں کی حالت مسلمانوں کی نسبت بہتر ہے، کیونکہ بعض صورتوں میں وہ اس سے مستثنیٰ بھی ہیں اور بعض صورتوں میں مکمل معافی اور کمی کے بھی مستحق ہیں۔ جبکہ مسلمان نہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہے اور نہ ہی اس کی تخفیف ہوسکتی ہے۔

اس سیاق وسباق میں قرآن میں آیا ہے کہ **حتی یعطوا الجزیة وھم صاغرون**، یہاں صاغرون سے کیا مراد ہے۔ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ وہ چھوٹے ہوکر جزیہ دیں۔ چھوٹے ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں اور بعض فقہا نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کی وجہ سے بعض غیر مسلموں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم دوسرے درجہ کے شہری ہوتے ہیں۔ امام شافعی نے اس کی بڑی فاضلانہ اور معقول تعبیر کی ہے اور کتاب الام میں لکھا ہے کہ **والصغاران یجری علیھم حکم اللہ** صغار سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم یعنی قانون کی بالادستی قبول کرلیں۔ شریعت کی بالادستی قبول کرنے کے بعد، یعنی اسلامی ریاست کے دستور کو برتر قانون ماننے کے بعد، وہ ریاست میں برابر کے شہری کے طور پر قبول کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ وہ ریاست کے مالی تقاضے اور ضروریات اسی طرح ادا کریں جیسے مسلمان ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے غیر مسلموں کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جائے۔

یہ وہ چند مسائل تھے جو فقہیات سیرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض چیزیں ضروری تھیں لیکن میں نے چھوڑ دی ہیں، کیونکہ وہ تفصیلات سے متعلق تھیں۔ فقہیات سیرت میں فقہائے اسلام نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ اجتہاد فرماتے تھے؟ بعض فقہا کا خیال ہے کہ حضور اجتہاد نہیں فرماتے تھے۔ ان حضرات کی رائے میں اجتہاد کا حکم غیر نبی کے لئے ہے۔ نبی تو صاحب شریعت اور حامل وحی ہے، اس لئے نبی کو اجتہاد کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس بعض فقہا کا خیال ہے کہ جن معاملات میں واضح رہنمائی نہیں ہوتی تھی حضور ﷺ ان معاملات میں اجتہاد فرماتے تھے۔ چونکہ آپ کا اجتہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے محفوظ و مامون تھا اس لئے وہ بھی وحی کی ایک قسم تھا۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے اجتہاد کے بجائے ملکہ نبوت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بعض افراد نے اس کے لئے فہم نبوی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ اجتہاد نبوی ہو، فہم نبوی ہو یا فہم رسالت ہو، بہر صورت یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ اپنی دانست اور بصیرت سے ارشاد فرماتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شریعت کی فہم میں جو غیر معمولی ملکہ حاصل ہوگا اس کا اندازہ ہم سب کر سکتے ہیں۔ اس کی روشنی میں حضور بعض معاملات کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دو مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور نے ایک چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا اور قرآن پاک میں اس کے بارے میں تھوڑا سا اختلافی حکم آ گیا۔ اس حد تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بعد میں بدل گیا، لیکن اکثر و بیشتر - ایک آدھ مواقع کے علاوہ - حضور نے جو فیصلہ کیا، قرآن پاک نے اسی کی تائید کی اور اسی کے مطابق قوانین شریعت بعد میں مرتب ہوئے اور تیار ہوئے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

-☆-

سوال و جواب

رسول پاک ﷺ کے وہ فیصلے جو آپ نے بطور قاضی کیے، صرف فریقین مقدمہ پر نافذ ہوتے تھے۔ جبکہ آج سپریم کورٹ کا فیصلہ پورے ملک میں نافذ العمل ہوتا ہے اور اس وقت تک نافذ العمل ہوتا ہے جب تک اسے برعکس فیصلہ نہیں آتا۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جہاں سپریم کورٹ نے قانون کے کسی پہلو کی وضاحت کی ہو یا کوئی نیا قانون enunciate کیا ہو۔ یہ حصہ تو ہر شخص کے لئے واجب التعمیل ہے اور تمام ماتحت عدالتیں اس کی پابند ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور فیصلوں کا ہر مسلمان پابند ہے جو حضور نے بطور نبی کے ارشاد فرمائے۔ لیکن سپریم کورٹ کے فیصلہ میں ججمنٹ کا جو خاص حصہ ہوتا ہے جس میں متعلقہ عرضداشت یا اپیل کے بارے میں رائے دی ہوتی ہے وہ صرف فریقین پر نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے جو میں نے عرض کیا اُس میں اور اِس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

☆

کسی مصلحت کے پیش نظر حاکم وقت جب فیصلہ کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کو موجودہ صورت حال پر برقرار رکھا حالانکہ آپ کی خواہش تھی کہ حضرت ابراہیم کے طریقے کے مطابق بنایا جائے جبکہ اس سے پہلے تحویل قبلہ ہوا۔ اعتراض موجود تھا۔ مسلمان دنیا پر قابض بھی ہو گئے۔ پھر بھی قبلہ موجود ہے؟

میں آپ کے اس سوال کو صحیح طرح سے سمجھا نہیں۔ غالباً آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ

جب مسلمان دنیا کے حاکم ہو گئے اور یہ خطرہ ختم ہو گیا کہ لوگ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے تو بعد کے حکمرانوں نے بیت اللہ کو اس بنیاد پر کیوں نہیں بنا دیا جس طرح حضور ﷺ بنانا چاہتے تھے۔ اگر یہ سوال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ خلفائے راشدین نے بھی نہیں کیا۔ خلافت راشدہ کا پورا زمانہ گزر گیا۔ بنی امیہ کے ابتدائی خلفاء نے بھی نہیں کیا، کیونکہ خلفائے راشدین نے نہیں کیا تھا۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت حجاز میں کچھ دن کے لئے قائم ہوئی تو انہوں نے بیت اللہ کو اس بنیاد پر بنایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھی اور موجودہ حطیم کو بیت اللہ میں شامل کر دیا۔ لیکن جب حضرت عبداللہ بن زبیر کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہو گئے اور بنو امیہ کا اقتدار دوبارہ بحال ہو گیا تو عبدالملک بن مروان نے کچھ فقہائے کرام کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کا یہ عمل ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے کہ یہ کام اگر اتنا ہی ضروری ہوتا تو خود رسول اللہ ﷺ یا خلفائے راشدین کرتے۔ اس لئے عبدالملک نے دوبارہ بیت اللہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور کی صورت میں بحال کر دیا۔

☆

آپ نے مضاربہ کی مسنونیت کے متعلق دلائل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعثت سے قبل حضور علیہ السلام کی حضرت خدیجہ کا مال مضاربت پر لے جایا کرتے تھے۔ کیا نبوت سے پہلے کے اعمال وافعال شریعت کا حصہ ہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پہلے کے تمام کاروباری معاملات، عادات اور تجارتی طور طریقوں کو اس حد تک جائز قرار دیا جس حد تک وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہ ہوں۔ ان میں جو چیز شریعت سے متعارض تھی وہ آپ نے واضح فرما دی اور اس کی ممانعت فرما دی۔ باقی معاملات اسی طرح جاری رہے اور آج بھی اسی طرح جاری ہیں جس طرح ہمیشہ سے جاری رہے۔

معاملات کے بارے میں میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ اگر ان میں کوئی چیز شریعت سے

متعارض نہیں ہے تو وہ جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ شریعت کے احکام واضح ہیں۔ محرمات بھی واضح ہیں۔ واجبات اور فرائض سب واضح ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ شریعت کی رو سے کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

رہا نبوت سے پہلے کا رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل تو وہ ملّت ابراہیمی کے مطابق تھا، اس میں کوئی چیز ملت حنیفیہ سے متعارض نہیں تھی۔ لیکن ایسے کسی عمل کی بنیاد پر حلال وحرام کے احکام مرتب نہیں کیے گئے۔

☆

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیرت اور فقہ کے درمیان وہی نسبت وہی ہے جس کو اہل منطق عموم خصوص من وجہ کہتے ہیں؟

جی ہاں بالکل وہی نسبت ہے۔

☆

فردوسی کے فارسی اشعار کا ترجمہ بیان کر دیجیے۔

فردوسی کے اشعار تو ضمناً آ گئے تھے۔ میں صرف یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ عربوں کے ماحول میں گوہ کا گوشت کھانے کا رواج تھا۔ عرب قبائل گوہ کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ چونکہ ایران کی قوم نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن تھی اس لئے ایرانی عربوں کو کم مہذب سمجھتے تھے اور عربوں کے ساتھ جب استہزا کیا کرتے تھے تو اور باتوں کے علاوہ اس ضمن میں اونٹ کے دودھ اور گوہ کے گوشت کا حوالہ بھی دیتے تھے۔ فردوسی نے کسی قدیم ایرانی سردار کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور کہا ہے کہ

اونٹ کا دودھ پینے اور سوسمار یا گوہ کا گوشت کھانے سے،
عربوں کی ہمت اب اتنی ہو گئی ہے
کہ وہ کیکاؤس کے تخت کی آرزو کرنے لگے ہیں
تفو برتو اے چرخ گرداں تفو

زادالمعاد کے علاوہ فقہیات سیرت پر چند مستند کتابوں کے نام بتادیں۔

فقہیات سیرت پر تمام بڑے سیرت نگاروں نے لکھا ہے اور یہ مواد سیرت کی تمام بڑی کتابوں میں منتشر موجود ہے۔ فقہ کی کتابوں میں بھی منتشر طور پر موجود ہے۔ فقہیات سیرت پر اگر زادالمعاد کے علاوہ کوئی قابل ذکر کتاب ہے تو وہ ہمارے شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ جس کو آپ فقہیات سیرت کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سیرت اور احادیث کے بے شمار مسائل پر شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔

☆

جیسا کہ آپ نے چیزوں کے پاک اور ناپاک ہونے کے بارے میں بتایا، براہ کرم اس بات کی بھی وضاحت کردیں کہ جانوروں کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں فقہ میں کیا حکم ہے؟ یعنی مثلاً گھوڑا کیوں حرام ہے اور اونٹ کیوں حلال ہے؟ پانی میں مچھلی حلال اور مینڈک کیوں حرام ہے؟

آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ گھوڑا بھی شریعت میں حلال ہے۔ تمام فقہا گھوڑے کے گوشت کو جائز کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ مکروہ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ اگر گھوڑے کے گوشت کو کھانا شروع کردیا جائے تو جہاد کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہوجائے گا۔ جہاد کے ذرائع کے تحفظ کی خاطر امام صاحب نے اس کو مکروہ قرار دیا تھا ورنہ وہ جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دریائی اور سمندری جانوروں میں وہ جانور حلال ہیں جس کو عرب پاکیزہ اور جائز سمجھتے تھے۔ امام صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ عرب صرف مچھلی کو پاکیزہ سمجھتے تھے۔ مچھلی کے علاوہ بقیہ جانوروں کو ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک سمندری جانوروں میں مچھلی کے علاوہ کوئی اور جانور حلال نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر سمندری جانور جائز ہے اس لئے کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'اُحِلَّ لکم صید البحر وطعامہ'،

تمہارے لئے سمندر کا شکار اور کھانا حلال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سمندر میں پلنے والی جو چیز کھانے کے قابل ہے وہ آپ کھا سکتے ہیں۔

بعض اوقات امام مالک کا نقطہ نظر بڑا ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ میں آج سے بارہ پندرہ سال پہلے اسپین گیا۔ میں امریکہ سے ایک طویل سفر کر کے اسپین پہنچا تھا۔ کئی وقت سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ سوئے اتفاق سے میرے جو میزبان استقبال کے لئے آنے والے تھے، وہ موجود نہیں تھے۔ ایک صاحب ملے جو اسپینش کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے اسپینش کے دو ایک چھوٹے موٹے الفاظ میں کہا کہ مجھے کھانا کھانا ہے۔ وہ مجھے ہوٹل لے گئے۔ لیکن جو کچھ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور جو میں بتانا چاہتا تھا وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی میں نے اتنی سی بات ان کو سمجھادی کہ مجھے کوئی بھی sea food منگوادیں۔

وہ تو ہوٹل کے بیرے کو سمجھا کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوٹل کا بیرا سی فوڈ لے آیا۔ میں شدید بھوک کے عالم میں منتظر تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بڑی پلیٹ میں کچھ لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں بیسیوں قسم کے سمندری جانور اور کیڑے تھے، کچھ رینگ رہے تھے، کچھ پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہے تھے، کچھ تلے ہوئے تھے۔ کچھ نیم تلے ہوئے۔ اب اگر عام حالات ہوتے تو شاید اس کو دیکھ کر مجھے الٹی ہو جاتی۔ لیکن میں نے بہت احتیاط سے اس انبار میں وہ کیڑے تلاش کر کر کے پہلے الگ الگ کئے جو تلے جا چکے تھے۔ پھر دل ہی دل میں امام مالک کو دعائیں دیتے ہوئے میں نے وہ چیزیں کھالیں۔

☆

آپ نے معاملات اور عادات کے بارے میں بتایا کہ غیبیات صرف حضور کے بتانے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام علم غیب جانتے تھے؟

آپ بار بار یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جتنا علم غیب دیا تھا وہ آپ جانتے تھے۔ جو غیبیات حضور نے ہمیں بتائے ہیں وہ اللہ کے

بتانے سے ہی بتائے ہیں۔ جنت، دوزخ، حیات بعد الممات، فرشتے، آسمانی کتابیں، معراج کی کیفیات، یہ سب باتیں حضور ہی کے بتانے سے ہمیں معلوم ہوئیں۔ یہ سب باتیں حضور کو معلوم تھیں تب ہی آپ نے ہمیں بتائی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ اللہ نے حضور کو کتنی غیبیات بتائیں، یہ ہمیں نہیں معلوم۔ اللہ تعالیٰ نے ساری غیبیات بتادیں، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بتائیں۔ اور بہت سی باتیں نہیں بتائیں۔ اس کا کوئی پیمانہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ کوئی آپ کو نہیں بتا سکتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس غیب کا کتنا علم تھا۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے پاس غیب کا اتنا علم تھا جتنا اللہ نے دیا تھا۔

کتنا علم دیا تھا۔ یہ ایک غیر ضروری سوال ہے۔ اس میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ آپ یہ دیکھیں کہ حضور کی سیرت کا کون سا عمل میرے لئے اور آپ کے لئے واجب التعمیل ہے۔ پھر اس پر عمل کریں۔ حضور کے پاس غیب کا جتنا علم تھا اس کی کوانٹٹی کے بارے میں قیامت کے دن مجھ سے یا آپ سے کوئی سوال نہیں پوچھا جائے گا۔ جس چیز کے بارے میں دنیا و آخرت میں کوئی سوال نہیں پوچھا جائے گا اس کے بارے میں بحث کرنے کا کیا فائدہ۔

☆

جن معاملات میں فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں کس کی بات کو صحیح مانیں اور کس بنیاد پر؟

بنیادی بات تو یہ ہے کہ جس بات کو آپ دلیل کی بنیاد پر زیادہ صحیح سمجھیں اس کی پیروی کریں۔ جو چیز قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہو اس پر عمل کریں۔ اور جو چیز قرآن وسنت کے حکم سے ہم آہنگ نہ ہو اس پر عمل نہ کریں۔ لیکن اس کام کے لئے بڑے گہرے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا تو وہ گہرا اور عمیق علم ہمارے پاس ہو۔ اور اگر ہمارے پاس اس درجہ کا علم نہ ہو تو جس کے علم پر ہمیں اعتماد ہو اس سے پوچھ کر عمل کریں۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے: 'فأسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون'، یا تو میرے پاس اپنا علم ہو یا میں کسی دوسرے صاحب علم کی بات پر عمل کروں۔ ان دو کے علاوہ ہمارے پاس اور تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

☆

ہند بنت عتبہ کا آپ نے ذکر کیا۔ کیا یہ وہی ہند ہیں
جنہوں نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا؟

یہ وہی ہند ہیں جن سے یہ منسوب ہے کہ انہوں نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا۔ بعض مورخین نے یہ بات لکھی ہے۔ اور سب سے پہلے جن مورخ نے یہ بات لکھی ہے ان کے بارے میں محدثین بہت متردد اور متامل ہیں اور محدثین کو ان کے بیانات کی صحت کے بارہ میں بڑے تحفظات ہیں۔ یعنی واقدی نے یہ بات کی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ واقدی کی اس روایت کو تو لوگوں نے بڑے زور وشور سے بیان کیا ہے، لیکن ویسے جب واقدی کا نام آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ واقدی کے بارے میں محدثین نے یہ کہا ہے۔ محدثین نے اگر تامل کا اظہار کیا ہے تو اس بات پر بھی تامل کا اظہار کیا ہوتا۔

☆

آپ نے فقہ کے بارے میں بیان کیا کہ اگر دوران وضو کسی کا
بٹوہ گم ہو جائے تو جس کو مل جائے اس کا ہو گیا؟

نہیں میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ آپ نے غلط سمجھا۔ دیکھیں شریعت کے معاملات بڑی ذمہ داری کے معاملات ہیں۔ ان میں اچھی طرح سمجھے بغیر کوئی بات نہیں کہنی چاہئے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ امام مالک کا نقطہ نظر ہند بنت عتبہ کے سوال اور حضور علیہ السلام کے اس جواب کی روشنی میں یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے پر کوئی حق ہو اور وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے، ادا نہ کرتا ہو تو جس آدمی کا حق ہے اگر اس کو موقع مل جائے اور وہ اپنا جائز حق کسی عدالتی کاروائی کے بغیر وصول کر لے تو امام مالک کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔ ان کے نزدیک صاحب حق اپنا حق خود وصول کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کی گھڑی گم ہو گئی اور آپ کے تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملی۔ بعد میں وہی گھڑی آپ کو کسی شخص کے گھر میں پڑی ہوئی ملی۔ یہاں امام مالک کے نزدیک آپ اس کو لے سکتے ہیں کیونکہ یہ آپ کا حق ہے اور اس کے لئے آپ کو کسی قانونی طریقہ کار کی

ضرورت نہیں ہے۔امام ابوحنیفہ کا کہنا ہے کہ نہیں اس کے لئے باقاعدہ جوڈیشل پروسیس درکار ہوگا۔اور فریق متعلق کو نوٹس دیئے بغیر اور اس کے علم میں لائے بغیر آپ یہ کام نہیں کر سکتے۔

☆

کیا دور حاضر کا عدالتی نظام جائز ہے؟

عدالتوں کا نظام تو جائز ہے۔طریقہ کار میں اصلاح کی البتہ بہت گنجائش ہے۔آج کے دور میں پندرہ بیس سال تک مقدمات چلتے ہیں۔ داوا کے دور میں مقدمہ دائر ہوتا ہے تو پوتے کے دور میں انصاف ملتا ہے۔انصاف ملنے کے لئے ہمارے ملک میں صبر ایوب، عمر نوح اور دولت قارون کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ Justice delayed justice denied. انصاف میں تاخیر بے انصافی کے مترادف ہے۔فی نفسہ عدالتی نظام میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆

یہ فرق کیسے کیا جائے گا کہ کوئی حکم نبی ﷺ نے بطور نبی، بطور سربراہ یا بطور قاضی فرمایا ہے؟

اس کی میں نے تھوڑی سی وضاحت تو کی ہے کہ اگر حضور علیہ السلام نے کسی مقدمہ کو سننے کے بعد فیصلہ دیا ہے وہ بطور قاضی کے ہے۔جو سربراہ ریاست کے طور پر انتظامات کے بارے میں احکام دیئے وہ بطور سربراہ ریاست کے ہیں اور بقیہ چیزیں بطور نبی کے ہیں۔صرف آٹھ دس معاملات ہیں جس میں اختلاف ہے۔ان میں سے تین کی مثال میں نے آپ کے سامنے رکھی۔اس پر فقہا نے بہت بحث کی ہے اور اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

☆

حضور کی عادات میں کھانے پینے اور لباس کے علاوہ اور کون سی چیزیں مراد ہیں؟ کیا داڑھی عادات میں ہے کہ نہیں؟ سنن زوائد کس کو کہتے ہیں؟

میرے خیال میں داڑھی کا شمار محض عادات میں نہیں ہے۔ داڑھی عادات میں بھی ہے، لیکن یہ سنت بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی اور اس کو اپنی اور دوسرے انبیا کی سنت قرار دیا۔ سنت زوائد سے مراد وہ سنت ہے جو حضور کا اپنا طرز عمل تھا لیکن اس کا حضور نے دوسروں کو تاکیدی حکم نہیں دیا۔ حضور کا لباس ایک خاص طریقے کا تھا وہ سنن زوائد میں سے ہے۔ حضور کے دعائیں مانگنے کے کچھ خاص طریقے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ حضور بعض نوافل ادا کرتے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ وہ چیزیں جن کی حضور نے دوسروں کو تاکید نہیں فرمائی اور ان پر عمل نہ کرنے پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ وہ سنن زوائد میں سے ہیں۔

☆

آپ نے مقاصد شریعت کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کو بیان کیا۔ کیا کسی ایک مقصد کی تکمیل کے لئے دوسرے مقصد کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟

جی بالکل کیا جاسکتا ہے۔ ان مقاصد میں ایک ترتیب ہے جس کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوگا۔ آپ پہلے مقصد کی خاطر دوسرے مقصد کو قربان کر سکتے ہیں۔ ایک فرق کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسان جان قربان کرنے کے لئے مشکل سے آمادہ ہوتا ہے ۔ اس لئے اگر جان بچانے کے لئے صرف زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا جائے، بشرطیکہ دل و جان ایمان پر مطمئن ہوں، تو قرآن نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس ایک اجازت کے علاوہ بقیہ تمام مقاصد میں اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اس میں تحفظ جان سب سے پہلے اور تحفظ مال سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے اگر مال قربان کر کے جان بچائی جاسکتی ہے تو بچائی چاہئے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ صحابہ آپؐ کے اشارے کے منتظر ہوتے تھے۔ جب آپ نے گوہ کا گوشت پسند نہیں کیا تو صحابہ نے

کیوں کھایا؟

رسول اللہ ﷺ ساتھ ساتھ صحابہ کی تربیت بھی کرتے تھے اور صحابہ کو یہ بات بتاتے تھے کہ کچھ معاملات میں شریعت کا حکم کیا ہے اور حضور کا ذاتی ذوق کیا ہے۔ صحابہ کرام کے مختلف مدارج تھے۔ بعض صحابہ کرام کا رویہ بڑا عاقلانہ تھا۔ بعض کا بڑا عاشقانہ تھا۔ ہر ایک اپنے طرز کے مطابق حضور کی پیروی کرتا تھا۔

☆

مدینہ منورہ مکہ مکرمہ کے شمال میں ہے اور غار ثور جنوب میں ہے۔ تو آپ نے جنوب کی طرف کیوں ہجرت فرمائی؟

بظاہر تو فقہیات سیرت کے ساتھ اس سوال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ظاہر ہے کہ کفار مکہ کو یہ سوچنے سے باز رکھنے کے لئے کہ حضور مدینہ کی طرف گئے ہوں گے، اس لئے شمال کی طرف تعاقب کرنے امکان زیادہ تھا اور جنوب کی طرف کم تھا۔ اس لئے حضور نے ابتدائی تین دن جنوب کے ایک غار میں قیام فرمایا۔ جب کفار مکہ شمال میں تلاش کر کر کے مایوس ہو گئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دوبارہ اصل راستہ اختیار فرمایا اور سفر جاری رکھا۔ بظاہر یہ ایک حکمت عملی تھی۔

قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ اپنی زبان سے کہتے ہیں وہ ہماری طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ لیکن بعض مواقع پر آپؐ نے اپنی رائے کو پس پشت ڈال کر کسی صحابی کی رائے کو ترجیح دی، کیا اس طرح کے اقوال جو آپ سے منسوب ہیں وہ بھی وحی تصور کئے جائیں گے؟

قرآن پاک کی یہ آیت کہ 'وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیی یوحی' یہ آیت

بنیادی طور پر قرآن پاک کے بارے میں ہے کہ قرآن پاک کے نام سے حضور جو کچھ بیان کررہے ہیں یہ اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ہماری طرف سے وحی ہے۔ اپنے عام ارشادات کے بارے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں اور جو بات کہتا ہوں وہ تمہاری مصلحت کے لئے ہوتی ہے۔ اپنے دنیاوی معاملات کو تم بہتر جانتے ہو۔

☆

اخلاق کی ایک جامع تعریف ارشاد فرمائیں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے اخلاق کا ہر پہلو یکساں ہونا چاہیے؟

اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح تو وہ بنیادی اخلاق یا مکارم اخلاق کی سطح ہے جو قرآن پاک میں یا حدیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً سچ بولنے کا حکم ہے، لوگوں کی مدد کرنے کا حکم ہے۔ اچھائیوں کو فروغ دینے کا حکم ہے۔ برائیوں کو مٹانے کا حکم ہے۔ یہ ہر جگہ یکساں ہے۔ لیکن ان سطحوں کے مظاہر یا ظاہری پہلو، وہ ایک دوسری سطح ہے جو مختلف علاقوں میں مختلف ہوگی۔ مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک صاحب ایمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ 'من کان یومن اللہ و الیوم الاخر فلیکرم ضیفه'، جو شخص اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔

اب دیہات میں مہمان کی تکریم کا اور مفہوم ہوگا، بڑے شہروں میں اور مفہوم ہوگا۔ دیہات میں کوئی جائے تو اس کو لسی بھی پلائیں گے، مکھن بھی کھلائیں گے اور درخت کے سائے میں بٹھا کر سبزی روٹی بھی کھلائیں گے۔ شہروں میں اگر کسی مہمان کو لسی پلا دیں تو ممکن ہے کہ وہ شکایت ہی کرے کہ مجھے لسی پر ہی ٹرخا دیا۔ لہٰذا مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔ مشرق و مغرب، متمدن اور غیر متمدن میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

☆

حضرت ابوعبیدہ نے کس مصلحت کی خاطر خط میں موجود حکم کو وقت پر ظاہر نہ کیا؟ جب کہ بعد میں مسائل کا سامنا بھی ہوا۔

کوئی مسائل کا سامنا نہیں ہوا۔ انہوں نے حکمت یہ سمجھی کہ میدان جنگ میں کمان کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ تو ایک بہت اچھا فیصلہ تھا۔ میدان جنگ میں کمان کی تبدیلی سے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ بعد میں تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شروع میں جو تھوڑی سی ناگواری ہوئی تھی وہ بھی جلد ہی دور ہوگئی۔ بعد میں ان کو بھی محسوس ہوگیا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ درست تھا۔

☆

امام ابوحنیفہ کی جو آرا حکومت کے بارہ میں ہیں ان پر عمل کیا جارہا ہے۔ اسی طرح امام شافعی اور امام احمد کی آرا پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن لوگ امام ابوحنیفہ کی رائے کو کیوں ترجیح دیتے ہیں جبکہ وہ اتنی authentic نہیں ہیں؟

یہ آپ نے کیسے کہا کہ امام ابوحنیفہ کی آرا authentic نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے جو آرا ظاہر کی ہیں وہ ان کے براہ راست شاگردوں کے قلم سے مدون ہوکر ہم تک پہنچی ہیں۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کی کتابوں میں موجود ہیں۔ امام شافعی کی اپنی کتاب 'کتاب الام' میں موجود ہیں۔ authenticity کا جہاں تک تعلق ہے تو دونوں آرا یکساں ہیں۔ دلائل سے بعض فقہا امام ابوحنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض حضرات امام مالک اور بعض امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابھی آپ نے احیاء موات کی مثال میں سنا کہ امام ابوحنیفہ کا موقف زیادہ مبنی بر حکمت معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے معاملات میں کسی اور فقیہ کا نقطہ نظر درست ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی علاقہ میں کسی انتظامی سہولت کی خاطر کسی ایک فقیہ کے اجتہادات کو ترجیح دی جائے تو یہ ایک انتظامی فیصلہ ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

-☆-

دسواں خطبہ

مطالعہ سیرت ۔ پاک و ہند میں

دسواں خطبہ

مطالعہ سیرت۔ پاک و ہند میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

محترم جناب ڈاکٹر وقار مسعود صاحب،
قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
برادران محترم،
خواہران مکرم

برصغیر پاک وہند میں مطالعہ سیرت ایک ایسا مضمون ہے جس پر بہت تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، گزشتہ دوسو سال کے دوران برصغیر میں سیرت پاک کے موضوع پر کماً اور کیفاً اتنا وقیع کام ہوا ہے کہ اس پر برصغیر کے مسلمان باشندوں کو نہ صرف بارگاہ رب العلیٰ میں سجدہ تشکر ادا کرنا چاہئے بلکہ برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس پر ہمیں کسی حد تک احساس تفاخر بھی ہونا چاہئے۔ برصغیر میں آغاز اسلام سے لے کر ایک طویل عرصہ تک سیرت پر کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ یہاں کی علمی روایت ایک طویل عرصہ تک عقلیات اور لفظیات کے گرد گھومتی رہی ہے، جس کی کچھ جھلکیاں میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ لیکن ماضی کی دوصدیوں میں برصغیر کے اہل علم نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا اور اس کوتاہی کی کما حقہ تلافی

کردی جو ابتدائی ایک ہزار یا گیارہ سو سالوں میں واقع ہوئی تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں نے علوم سیرت اور علوم نبوت پر گزشتہ دو اڑھائی سو سال کے دوران جو کام کیا ہے اس کی عظمت کا اعتراف دنیائے عرب کے بڑے بڑے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ علوم حدیث کا صرف برصغیر میں چرچا تھا اور ان پر صرف برصغیر میں کام ہو رہا تھا۔ برصغیر کا گوشہ گوشہ قال قال رسول اللہ ﷺ کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ یہاں کے چپہ چپہ پر حدیث اور علوم حدیث کی تدریس، تحقیق اور تصنیف و تالیف کا بازار گرم تھا۔ اس کے برعکس اور دنیائے اسلام کے بیشتر حصے یا تو علم حدیث سے غافل تھے یا وہاں اس سطح کا کام نہیں تھا جس سطح کا کام برصغیر میں ہو رہا تھا۔

یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ خود دنیائے عرب کے بڑے بڑے جید اہل علم نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے۔ دنیائے عرب کے ایک مشہور صاحب علم، مفسر قرآن، مفکر، متکلم اور ادیب علامہ سید رشید رضا بیسویں صدی کے آغاز میں دنیائے اسلام کے سفر پر گئے تھے۔ علامہ سید رشید رضا مفتی اعظم مصر مفتی عبدہ کے نامور ترین شاگردوں میں سے تھے۔ وہ اپنے زمانے میں مصر کے صف اول کے مفسرین اور مفکرین قرآن پاک میں سے تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام کے بیشتر حصوں کا دورہ کیا۔ اخیر میں وہ برصغیر آئے۔ یہاں کی مختلف دینی درسگاہوں کا دورہ کیا۔ یہاں کے محدثین اور اساتذہ حدیث سے ملے۔ یہاں کے اہل علم نے حدیث پر جو کام کیا تھا اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس بات کا تحریری اعتراف کیا کہ اگر برصغیر کے ہمارے مسلمان بھائی نہ ہوتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آج علم حدیث کا کیا حال ہوتا، آج علم حدیث باقی ہوتا یا نہ ہوتا۔ یہی معاملہ علوم سیرت کا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے مطالعہ سیرت کی جو غیر معمولی سرگرمی برصغیر میں دیکھنے میں آئی، اس کی مثالیں دنیائے اسلام میں کم ملتی ہیں۔ آج بھی عرب دنیا میں انتہائی وسیع پیمانہ پر علمی اور بڑے اونچے معیار کی تحقیقی سرگرمیوں کے باوجود سیرت اور علوم سیرت کے موضوع پر برصغیر کے گزشتہ ڈھائی سو سال کا کام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبارات سے پوری عرب دنیا کے کام پر بھاری ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ برصغیر کی تاریخ کے ابتدائی دور میں بارہ سو سال تک یا کم از کم گیارہ سو سال تک علوم سیرت میں وہ دلچسپی نہیں رہی جو ہر مسلمان معاشرہ میں ہونی چاہئے۔ یہ وہ

زمانہ تھا کہ جب عرب دنیا میں علوم سیرت پر بڑا قابل ذکر کام ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بڑی کتابیں جن میں سے چند کتابوں کا تذکرہ آپ نے سماعت فرمایا، وہ سب دنیائے عرب میں، مصر، شام اور اندلس میں لکھی گئیں۔ مراکش سے لے کر ایران تک، ترکی اور مشرقی یورپ سے لے کر سوڈان تک پورے علاقہ میں مطالعہ سیرت میں غیر معمولی سرگرمی نظر آتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب برصغیر سیرت کے ذکر سے تقریباً خالی محسوس ہوتا ہے۔

برصغیر کا مطالعہ کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے۔ وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تاریخ ہے۔ اتنی منفرد کہ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں میں اس انفرادیت کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس ایک ہزار سالہ حکومت کے باوجود یہاں مسلمانوں کی تعداد کبھی بھی پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ میں بلکہ دیگر مذاہب کی تاریخ میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے کسی ملک میں پندرہ فیصد ہونے کے باوجود پچاسی فیصد آبادی پر کامیابی کے ساتھ ایک ہزار سال تک حکومت کی ہو۔ اگر ان کی آپس کی کمزوریاں، باہمی اختلافات، انتظامی کوتاہیاں اور دوسرے عوامل ان کو شکست سے دوچار نہ کرتے تو کم از کم یہاں کی مقامی آبادی کے لئے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ مسلمانوں کی بالادستی کو آئندہ کئی سو سال تک کوئی زک پہنچا سکے۔

اس بارہ سو سالہ دور میں برصغیر کے لوگوں نے مختلف علوم وفنون پر کام کیا۔ علم فقہ اور اصول فقہ، ادبیات، عقلیات، حدیث اور علم تفسیر پر قابل ذکر کام یہاں نظر آتا ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ علوم سیرت سے دلچسپی اور اعتنا نسبتاً کمزور رہا ہے۔ برصغیر کی تاریخ کو علمی اور فکری اعتبار سے، دور جدید کو نکالنے کے بعد، جس پر کل گفتگو ہوگی، ہم تین حصوں یا ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ تین حصے وہ ہیں جن میں سے پہلا حصہ دور سندھ کو قرار دیا جا سکتا ہے جب مسلمانوں نے سندھ میں دعوت اور تبلیغ کا کام شروع کیا۔ پھر محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کا بڑا حصہ فتح ہوا اور موجودہ پاکستان کے بیشتر علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب یہاں کے مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب کے بڑے بڑے علمی مراکز، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بغداد، دمشق، کوفہ اور بصرہ سے قائم تھے۔ یہاں

کے اہل علم وہاں جاتے تھے اور وہاں کے اہل علم یہاں آتے تھے۔ عربی زبان برصغیر یعنی سندھ اور موجودہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی علمی زبان تھی۔ یہاں جو لوگ لکھ رہے تھے وہ عربی میں لکھ رہے تھے۔ کچھ کام فارسی میں ہو رہا تھا۔ اس دور میں یہاں کے سیرت نگاروں میں کئی نام نمایاں طور پر سامنے آئے۔ ابو معشر نجیح السندی کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ ہمارے سندھ کے رہنے والے تھے اور سندھ کے نام کو انہوں نے اس طرح روشن کیا کہ صدر اول کے، دوسری صدی ہجری کے، نامور ترین سیرت نگاروں میں شمار ہوئے، جنہوں نے اپنا اور اپنے علاقے کا نام نہ صرف سیرت اور علوم سیرت کے میدان میں، بلکہ عربی زبان اور شعر وادب کے میدان میں بھی، عرب دنیا میں روشن کرایا، وہ علامہ ابو معشر نجیح السندی تھے۔ افسوس کہ ابو معشر السندی کی کوئی کتاب یا تحریر آج اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔ ان کی بیان کردہ روایات مختلف کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے سیرت کے علم کو محفوظ کرنے میں جو کارنامے انجام دیئے، ان اہل علم، بالخصوص مؤرخین سیرت نے اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن ان کی اپنی کوئی تحریر آج موجود نہیں ہے۔ ان کا سارا علمی کام برصغیر اور سندھ سے باہر ہوا۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے یہ کام نہیں کیا، اور نہ غالباً سندھ کے اہل علم کو ان کی زندگی میں ان کے کام سے زیادہ واقفیت ہوئی۔

ایک اور بڑا نام جو سیرت نگاری اور سیر کے باب میں یعنی سیرت کے اس شعبہ یا علم کے باب میں نمایاں تھا جس کا تعلق جنگ اور مغازی سے تھا، اور جس کو قانون جنگ کی شکل میں مرتب کیا جا رہا تھا اور علم سیر کے نام سے وہ ایک الگ فن کی صورت میں سامنے آ رہا تھا۔ اس فن میں انہوں نے مہارت اور امامت کا درجہ حاصل کیا۔ میری مراد امام اہل الشام امام عبدالرحمٰن الاوزاعی سے ہے۔ امام عبدالرحمٰن الاوزاعی امام ابوحنیفہ کے معاصر تھے۔ امام ابوحنیفہ کا انتقال 150 ہجری میں اور امام اوزاعی کا انتقال 157 ہجری میں ہوا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے۔ دونوں نے اسلام کے بین الاقوامی قانون یعنی علم سیر کو اپنی دلچسپی کا موضوع قرار دیا۔ ان موضوعات پر ان دونوں حضرات نے کتابیں چھوڑیں۔ ان موضوعات پر ان دونوں حضرات کے خیالات اور اجتہادات پر مبنی کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ امام اوزاعی کی اپنی کتاب 'سیر الاوزاعی' بھی موجود ہے اور اس پر امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد امام ابو یوسف کی

طرف لکھی جانے والی سے تردید یعنی Rejoinder 'الرد علی سیر الاوزاعی' بھی موجود ہے۔ امام اوزاعی کی بات ذرا لمبی ہوگئی۔ ان کے بارے میں صرف یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ ان کا میدان بھی سیر و مغازی تھا اور ان کا تعلق بھی سندھ سے تھا۔

ایک زمانے میں سندھ سے بڑی تعداد میں لوگ لے جائے گئے اور وہ عرب کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ امام اوزاعی بھی ان لوگوں میں تھے۔ اگر چہ امام اوزاعی جب سندھ سے گئے تو بہت کم سن ہوں گے اور ان کی جو بھی تعلیم و تدریس اور تربیت ہوئی وہ دنیائے عرب میں ہوئی۔ دنیائے عرب ہی میں وہ رہے اور اس بیرت کو انھوں نے اپنا وطن بنایا جو آج لہولہان ہے۔ بیروت کے جس محلّہ میں امام اوزاعی کی قبر مبارک ہے، وہ آج بھی محلّہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ جو مختصر ہو کر امام اوزاعی اور اب امام ہو گیا ہے۔ بیروت کے عام لوگ اسے امام اوزاعی کہتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہیں کہ امام جانا ہے تو وہ آپ کو محلّہ امام اوزاعی پہنچا دے گا۔ یہ روایات جن میں چند مثالوں کا مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سندھ کے دور کی ہیں۔ لیکن ابو معشر سندھی کی طرح امام اوزاعی کا سارا کام بھی سندھ سے بہت دور شام میں پایۂ تکمیل پہنچا۔ سندھ کے اہل علم کو ان کے کام کی صدیوں تک خبر ہو سکی اور نہ اس بات کی کہ امام اہل الشام کا لقب پانے والے مایۂ ناز فقیہ کا تعلق اصلاً سرزمین سندھ سے تھا۔ ان حالات میں ان دونوں بزرگوں کے کام کو سندھ کا کام قرار دینا مشکل ہے۔

جب سندھ کا دور ختم ہو گیا اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے سیاسی اور انتظامی روابط افغانستان اور وسط ایشیا سے قائم ہو گئے تو برصغیر کی علمی اور فکری تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں یہاں کے مسلمانوں اور حکمرانوں کے سیاسی روابط عرب دنیا سے پہلے کمزور ہوئے اور پھر ہوتے ہوتے بالکل ہی کٹ گئے کیونکہ بنو عباس کی سلطنت کمزور ہو گئی۔ درمیان میں مختلف علاقوں کے حاکم خود مختار ہو گئے اور صوبہ سندھ کا براہ راست رابطہ دنیائے عرب سے کٹ گیا۔ جب انتظامی اور سیاسی روابط کٹ گئے تو علمی روابط پر بھی اثر پڑا۔ علماء اور طلبہ کی جو براہ راست آمد و رفت تھی اور یہاں کے طلبہ وہاں جا کر کسب فیض کیا کرتے تھے، وہ روایت کمزور پڑ گئی۔ اس کے باجود سندھ کے بعض علاقوں اور خاص طور پر ٹھٹھہ میں اور ہندوستان کے مغربی صوبہ گجرات میں عرب دنیا میں جا کر کسب فیض کرنے کی روایت قائم

رہی۔ بہت سے لوگ گجرات اور ٹھٹھ سے حرمین اور دوسرے عرب مراکز آتے جاتے رہے۔ وہاں سے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روشنی حاصل کرتے رہے اور وہ روشنی برصغیر میں ٹھٹھ اور گجرات کے راستے پھیلتی رہی۔

جتنے اہل علم علم حدیث اور سیرت پر کام کرنے والے ٹھٹھ میں پیدا ہوئے شاید اتنے پورے پانچ سو سالہ دور میں پورے سندھ میں پیدا نہیں ہوئے۔ بعد کے دور میں بھی ٹھٹھ کے اہل علم سندھ کی علمی تاریخ کا بہت اہم اور درخشاں باب ہے۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مولانا ابوالحسن سندھی دونوں کی کتابیں بہت مشہور و معروف ہیں۔ سیرت کے موضوع پر علامہ محمد ہاشم ٹھٹوی نے ایک کتاب لکھی تھی جو عرب دنیا میں بھی بہت مقبول ہے۔ اس کا عربی اور اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی پوری سیرت کو سامنے رکھ کر ایک ایسا نقشہ مرتب کیا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ پورے سال کے بارہ مہینوں کے باون ہفتوں اور باون ہفتوں کے 354 دنوں میں رسول اللہ ﷺ کے معمولات کیا ہوتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک ایک دن کے حساب سے جو جو معلومات ملی ہیں وہ جمع کر کے ایک ایسا نقشہ بنا دیا ہے جو اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ ترجمہ ایک بڑی ضخیم کتاب کی صورت میں کراچی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کا عنوان ہے 'عہد نبوت کے ماہ و سال'۔ اس کتاب کی اصل تحقیق ٹھٹھ کے ایک عالم علامہ شیخ محمد ہاشم ٹھٹوی سندھی نے کی تھی۔ انہوں نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں اور علم حدیث اور علوم نبوت پر ان کا کام بہت نمایاں اور قابل ذکر ہے۔

آخری دو صدیوں میں جو دو نام سندھ کی شہرت، عظمت اور احترام کا باعث بنے وہ ٹھٹھ ہی کے ایک بزرگ علامہ ابوالحسن سندھی ہیں جن کو ایک بڑی خصوصیت یہ حاصل ہے کہ وہ صحاح ستہ میں سے ہر کتاب کے شارح ہیں۔ جزوی طور پر علامہ جلال الدین سیوطی کے علاوہ کسی اور محدث کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ وہ صحاح ستہ کی تمام کتابوں کے شارح رہے ہوں۔ علامہ ابوالحسن نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور ابن ماجہ میں سے ہر کتاب کی شرح لکھی ہے جو مطبوعہ بھی ہے اور دستیاب بھی ہے۔

سندھ کے ان علما اور محققین کا کام بقیہ برصغیر میں زیادہ عام اور متعارف نہیں ہوا۔ یا تو اس لئے کہ ان میں سے بیشتر حضرات کی زیادہ تر آمد و رفت عرب دنیا میں رہی۔ وہاں ان

کا کام ہندوستان اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ معروف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب دنیا میں شیخ ابوالحسن ٹھٹوی، شیخ محمد عابد سندھی، علامہ محمد ہاشم سندھی اور دوسرے سندھی اہل علم خاصے معروف رہے ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ کتابیں عرب دنیا میں شائع ہوئی ہیں۔ ابھی حال ہی میں غالباً پی ایچ ڈی یا ایم فل کا ایک مقالہ کتابی صورت میں شیخ محمد عابد سندھی پر شائع ہوا ہے جو مکہ مکرمہ کے ایک فاضل نے لکھا ہے۔ مکہ مکرمہ ہی میں چھپا ہے۔ برصغیر کے اکثر اہل علم شیخ محمد عابد سندھی سے واقف نہیں ہیں۔ عرب دنیا میں ان کا نام مشہور ومعروف ہے اور ان کے بارے میں چیزیں آتی رہتی ہیں۔

ان جزوی کاوشوں کے علاوہ جن کا دائرہ سندھ اور کسی حد تک گجرات تک محدود تھا۔ برصغیر کے بقیہ حصے علم سیرت کی روشنی سے بڑی حد تک محروم رہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز بھی ہے اور افسوس ناک بھی ہے کہ علم سیرت برصغیر میں ایک طویل عرصہ تک نصاب کا حصہ نہیں رہا۔ (بلکہ اب بھی ساری تعلّیوں اور دعاوی کے باوجود بیشتر دینی مدارس کے نصاب میں سیرت پاک کا موضوع الگ سے نصاب میں شامل نہیں ہے)۔

محمود غزنوی نے جب شمال کی طرف سے حملے شروع کئے اور ہندوستان کا بیشتر حصہ محمود غزنوی کی سلطنت کا جز بن گیا اور موجودہ پاکستان کا بڑا حصہ ان کے انتظام میں آگیا۔ تو ان کے جانشینوں کے زمانے میں شمالی ہندوستان مسلمانوں کا سیاسی اور ثقافتی مرکز بنا، اور ایک طویل عرصہ کے بعد شہاب الدین غوری اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں شمالی ہندوستان میں یہ مرکز قائم ہوا۔

قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک خودمختار حکومت قائم کی۔ وہاں ایک نیا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم سامنے آیا۔ یہ نظام اور نصاب افغانستان اور وسطی ایشیا کی روایات سے مستفید تھا۔ اس نصاب کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں یہ بات بڑی حیرت انگیز اور افسوس ناک ہے کہ اس نصاب میں نہ صرف سیرت پر کوئی کتاب شامل نہیں تھی بلکہ علم حدیث اور علوم نبوت کا حصہ بھی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام تھا۔ تفسیر قرآن کا حصہ بھی بہت کم تھا اور علوم نبوت کا حصہ بھی بہت کم۔ حدیث پر ایک آدھ اور جزوی کتاب کے علاوہ جو علم حدیث کے ذخائر میں قطرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھی، علم حدیث کا مطالعہ براہ راست اور علوم حدیث میں تخصص

اس نصاب کا حصہ نہیں تھا۔ یقیناً اس کے منفی روحانی اثرات تو ضرور ہوئے ہوں گے، لیکن اس کمزوری یا کوتاہی کے اجتماعی اثرات بھی ہوئے اور مسلمان اہل علم میں وہ مسائل نمایاں ہوتے چلے گئے اور اہل علم کی دلچسپی کا مرکز بنتے گئے جو اسلامی نقطۂ نظر سے ہرگز بنیادی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ بہت سے حضرات کی دلچسپی عربی زبان وقواعد کے صرف اس پہلو پر رہی جس کا تعلق لفظی چیستانوں اور صرفی نحوی بازی گری سے ہے۔ صرف ونحو کی وہ کتابیں جو صرف ونحو تو نہیں سکھاتیں لیکن لفظی بازیگری میں ضرور طلبہ کو طاق کر دیتی ہیں وہ برصغیر میں خوب رائج رہیں۔ اور ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کی علمی روایت کی انتہا یہی سمجھی گئی کہ کس نے کتنے متون یاد کیے ہیں، کس کو کس متن کے کتنے حاشیے یاد ہیں۔ کتنے حاشیوں کے ذیلی حواشی یاد ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور علمی سرگرمی ایک طویل عرصہ تک یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔

سلطنت کا پورا دور ایسا ہی گزرا۔ علم حدیث سے ناواقفیت کا یہ عالم تھا۔ ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ ایک سلطان کے دربار میں (میں نام نہیں لوں گا) دو اہم دینی شخصیات کے درمیان مناظرہ ہوا۔ یہ مناظرہ برصغیر کی تاریخ کے ایک بہت ہی نمایاں دور کی بہت اہم مثال ہے۔ یہ انتہائی اہمیت کی حامل بات ہے۔ مناظرہ اس موضوع پر ہوا کہ صوفیا کے حلقہ میں جو سماع ہوتا ہے، نعتیں، غزلیں یا اس طرح کے جو عشقیہ مضامین سنے جاتے ہیں، یہ جائز ہیں کہ ناجائز ہیں۔ دونوں بڑی دینی شخصیات نے اپنا اپنا موقف پیش کیا۔

ایک بڑی دینی شخصیت جن کا علم وفضل قابل احترام اور جن کا دینی مقام بہت اونچا ہے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ سماع کو جائز سمجھتے ہیں تو آپ کی دلیل کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ' السماع مباح لاھله '۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ایسی کوئی حدیث موجود ہے۔ نہ سماع کا لفظ ان معنوں میں حضور علیہ کے زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ معلوم نہیں کس کا قول ہے لیکن بہرحال یہ کسی متأخر صوفی کا قول ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ برصغیر میں علم حدیث سے ناواقفیت کتنی عام تھی۔ اور برصغیر کے شمالی علاقوں کے لوگوں میں جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کا مرکز تھا، وہاں علم حدیث سے کتنی دوری تھی۔

اس کے بعد دور سلطنت ختم ہوگیا اور مغل سلطنت قائم ہوگئی۔ مغل بھی وسطی ایشیا سے آئے تھے۔ اس لئے دور سلطنت میں جو علمی روایت وسطی ایشیا اور افغانستان سے آئی تھی اس پر

مغلوں کی آمد سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔ وہی لفظی بازیگری، ظواہر پر زور، جزئیات پر بحث و تمحیص اور کتابوں کے حواشی، شرحیں اور الفاظ کی چھان بین کہ کسی مصنف نے کوئی خاص لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہی لاحاصل اور فضول بحثیں علم کی معراج سمجھی جاتی تھیں۔ علم نحو کی ایک کتاب کافیہ طویل عرصہ سے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ نحو کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی طالب علم کو کسی زبان کے قواعد سے واقفیت ہو جائے۔ وہ زبان لکھنے، پڑھنے اور بولنے کے قابل ہو جائے۔ عربی نحو و صرف کا مقصد بنیادی طور پر قرآن مجید، حدیث رسول اور عربی ادب کے ذخائر کو سمجھنا ہے۔ اگر اس کے علاوہ نحو کا کوئی مقصد قرار دیا جاتا ہے تو وہ فضول اور لغو ہے، کیونکہ مطالعہ نحو کا ان دو مقاصد کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہے۔ لیکن یہ کتاب جو پڑھائی جاتی ہے۔ آج بھی بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے یعنی کافیہ۔ اس میں یہ بحث سب سے اہم سمجھی جاتی ہے کہ مصنف نے کتاب کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی۔ کیوں نہیں لکھی۔ ممکن ہے غلطی ہو گئی ہو۔ بھول گیا ہو یا جو بھی وجہ ہو، تو اس پر ہفتہ ہفتہ بھر بحث ہوتی تھی کہ مصنف نے بسم اللہ کیوں نہیں لکھی۔ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی ہے وہ مقصد ابھی پیش نظر نہیں ہے۔ پھر جملہ شروع ہوتا ہے، یعنی کتاب یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ 'الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد'، اب اس پر بحث ہوتی ہے کہ مفردِ ہے، مفردُ ہے یا مفردٌ' ہے۔ اس پر لمبی لمبی تقریریں استاد بھی کرتے ہیں اور طلبہ بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ طلبہ جوان بحثوں کو یاد کرتے ہیں اور وہ اساتذہ جو یہ بحثیں یاد کرواتے ہیں، اگر ان سے آپ کہیں کہ عربی زبان میں ایک پیراگراف ایسا لکھیں جس میں صرف و نحو کی کوئی غلطی نہ ہو تو نحو کے وہی ماہرین جو کافیہ کی ان لفظی جزئیات کے حافظ ہیں ان میں سے نوے فیصد حافظ اور نحوی عربی زبان کا ایک پیراگراف بھی غلطیوں سے پاک نہیں لکھ سکتے۔ بہرحال یہ وہ روایت تھی جو وسطی ایشیا سے آئی تھی۔ یہی ہمارے ہاں علم سمجھا جاتا تھا۔ اس میں علم حدیث کا کتنا مقام تھا، قرآن کا کتنا مقام تھا، اس کی ناگفتہ بہ تفصیل میں اگر جائیں گے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

اس کے بعد جب شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں ہمایوں کو شکست ہو گئی اور اس کی جگہ سوریوں نے لے لی۔ تو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہمایوں کو ہندوستان سے نکلنا پڑا۔ ہمایوں نے جا کر ایران میں پناہ لے لی۔ جب ایک عرصہ کے بعد ہمایوں واپس آیا تو یہ کہا جاتا ہے کہ

ایرانیوں نے ہمایوں کو بعض شرائط پر سوریوں کے خلاف مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور اس سے کہا کہ آپ ہمارے اہل علم کو ساتھ لے کر جائیں اور فلاں فلاں مراعات ہمارے لوگوں کو دیں تو ہم سوریوں کے مقابلہ میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمایوں نے ایسا ہی کیا اور جب ایرانیوں کی مدد سے دوبارہ اپنا تخت حاصل کیا تو بہت سے ایرانی اہل علم ہمایوں کے ہمراہ آئے۔ جو لوگ ایران سے ہمایوں کے ساتھ آئے ان میں سے بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ایرانی فلسفی بھی آئے۔ شیخ فتح اللہ شیرازی کا نام ان لوگوں میں سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے دور متاخر کا فلسفہ اور عقلیات کے بہت سے مباحث کو بھی یہاں متعارف کرایا۔ اب یک نہ شد دو شد۔ پہلے بحثیں صرف عربی صرف ونحو پر ہوتی تھیں۔ اب لفظی بحثیں متاخرین کی کتابوں کے حاشیوں پر، حاشیوں کے حاشیوں پر بھی ہونے لگیں۔ لوگ دس دس سال تک ایک ایک کتاب کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔ پہلے متن، پھر متن کی شرح، پھر شرح کی شرح، پھر شرح کا حاشیہ، پھر حاشیہ کی شرح، پھر شرح کا خلاصہ، پھر خلاصے کا حاشیہ۔ پورے دس دس بارہ بارہ سال اس میں گزر جاتے تھے۔ اس سارے عمل میں طالب علم کو لفظی بازی گری تو خوب آجاتی تھی، ہر چیز میں فضول اور لایعنی اعتراضات پیدا کرنا خوب آجاتا تھا۔ لیکن اس طرز تعلیم سے نہ عربی آتی تھی، نہ فلسفہ آتا تھا۔ جزدی بازیگریاں اور لفظ سے کھیلنے کا فن خوب آجاتا تھا۔ لیکن جس کو علم دین کہتے ہیں، یعنی حضور ﷺ نے کیا فرمایا۔ آپ کیا ہدایت لے کر آئے تھے۔ قرآن پاک کس انقلاب کی بات کرتا ہے۔ وہ کیا تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ اس سے کوئی تعلق نہ اساتذہ کو تھا نہ طلبہ کو تھا۔ یہ تھی بڑی حد تک برصغیر کی علمی روایت۔ اس روایت میں علم سیرت کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔ اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔ کسی بڑی کتاب میں جزوی یا ضمنی طور پر سیرت کے کسی پہلو پر کوئی اکا دکا تبصرہ مل جائے تو مل جائے۔ بعض کتابوں میں ضمناً تذکرہ مل جاتا ہے۔ لیکن سیرت باقاعدہ علم کے طور پر کبھی بھی نصاب میں شامل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے دور میں کوئی قابل ذکر کتاب ہندوستان میں یعنی شمالی ہندوستان اور موجودہ مغربی پاکستان کے بیشتر حصہ میں سندھ کو چھوڑ کر، نہیں لکھی گئی۔

علم حدیث سے تعلق کی ایک مثال میں نے آپ کو بتادی۔ علم حدیث کی کوئی کتاب

با قاعدہ نصاب کا حصہ نہیں تھیں۔ تفسیر کی کچھ کتابوں کے بعض اجزا پڑھائے جاتے تھے۔ مثلاً کہیں صرف سورۃ فاتحہ، کہیں صرف سورۃ بقرہ شامل درس تھی، اور وہ بھی ان متاخرین کی تفسیریں، جن کو یہ غرض نہیں تھی کہ قرآن پاک کیا کہتا ہے۔ ان کتابوں کے فاضل مصنفین کو صرف اس سے غرض تھی کہ میرے کلامی پیش رو نے کیا کہا تھا۔ جن امام کا علم کلام میں میں پیرو ہوں وہ قرآن کے بارے میں نہیں، کلامی مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ تفسیر اور علم قرآن کے نام پر علم کلام کی تعلیم ہو رہی تھی۔ کہیں معتزلہ پر رد ہو رہا تھا، کہیں اشاعرہ پر ہو رہا تھا۔ کہیں ماتریدیہ پر رد ہو رہا تھا۔ وہ تفسیر پڑھنے والا متکلم تو شاید اچھا بن جاتا ہو۔ اگر چہ مجھے اس میں بھی تامل ہے، لیکن قرآن پاک کے حقیقی طالب علم اور قرآن پاک کی رہنمائی سے مستنیز وہ لوگ نہیں ہو سکتے تھے جو قرآن پاک کو کسی کلامی مسلک کی عینک سے دیکھتے تھے۔ قرآن پاک تو اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس کے چشمے سے باقی تمام کائنات کو دیکھا جائے اور جو چیز اس کے معیار پر پوری نہ اترے اس کو کھوٹا سمجھا جائے۔ جو قرآن کے چوکھٹے میں جتنا چھوٹا ہے وہ اتنا کھوٹا سمجھا جائے۔ اگر کوئی قرآن کے چوکھٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ الحاد و زندقہ ہے۔ یہ معیار قرآن پاک، سیرت پاک اور حدیث کے مطالعہ کا ہونا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معیار برصغیر میں ایک طویل عرصہ تک نہیں رہا۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس کا شاید برصغیر کی اجتماعی نفسیات کو آگے چل کر احساس ہوا۔ اور جب احساس ہوا تو انہوں نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا۔ اور حدیث و سیرت پر وہ کام کر کے دکھایا جو ان علوم کی تاریخ میں بہت روشن مقام رکھتا ہے۔ اس میں سے کچھ کا تذکرہ تو میں آج کروں گا اور کچھ کا کل کروں گا۔

برصغیر میں جب مسلمانوں کی حکومت کو تقریباً آٹھ نو سو سال ہو گئے۔ اور یہاں اس پورے سلسلہ تعلیم کے نتیجہ میں جو کوتاہی ہوئی تھی، اس کے اثرات بھی سامنے آنا شروع ہوئے۔ یہ اتنی بڑی کوتاہی ہے کہ قرآن، حدیث اور سیرت کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کوتاہی کے نتائج اور ثمرات تو سامنے آنے ہی تھے۔ وہ ثمرات سامنے آئے اور ایسی ایسی گمراہیاں سامنے آئیں جن کی مثال دوسرے مسلم ممالک میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نے با قاعدہ اٹھ کر یہ کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا دین تو نعوذ باللہ ایک ہزار سال کے لئے آیا تھا۔ اب ایک ہزار سال کے بعد حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب ایک نئے دین کی ضرورت

ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو تحریک الفی کہتے ہیں۔ تحریک الفی پر لوگوں نے کتابوں کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ یہ ساری المیہ داستان تاریخ میں تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تحریک چونکہ سرکاری سرپرستی میں شروع ہوئی اس لئے اس کے اثرات بھی خاصے قوی تھے۔

اس تحریک کا اصل ہدف اور مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دین کو اب غیر متعلق قرار دے دیا جائے۔ اور 'دور جدید' کے لئے ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالی جائے۔ پھر ایک ایک کر کے اس کے لئے کاوشیں بھی شروع ہوئیں۔ سرکاری سرپرستی میں اسلام کی ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ اسلام کے ہر پہلو کو محل نظر اور محل اختلاف قرار دیا گیا۔ بہت سے معاملات میں سرکاری فیصلے ایسے آنے لگے جو شریعت سے صراحتاً متعارض تھے۔ غرض ملت اسلامیہ ایک ایسے مشکل مرحلہ میں گرفتار تھی جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک شخصیت کو بروقت خبردار نہ کرتا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ملت کا کیا حال ہوتا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

دو شخصیتوں نے کھڑے ہو کر اس پوری تحریک کے اثرات کو مٹا دیا۔ ایک شخصیت حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ کی ہے جو مجدد الف ثانی کہلاتے ہیں۔ الف ثانی کا لقب کی اہمیت اور معنویت اس الفی تحریک کی وجہ سے ہے جس میں کہنے والے کہتے تھے کہ ایک ہزار سال پورے ہونے پر حضور ﷺ کی نبوت ختم ہو گئی۔ اس غلط فہمی کی تردید کرنے کے لئے اس عظیم شخصیت نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا، اس کی وجہ سے اس شخصیت کو مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیا گیا۔ یہ بات ہمارے اہل پاکستان کے لئے بڑی خوشی کی ہے کہ جس شخصیت نے ان کو سب سے پہلے مجدد الف ثانی کا لقب دیا تھا وہ ہمارے سیالکوٹ کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے۔ عرب دنیا میں سیالکوٹ کے دو نام بہت مشہور ہیں جن میں ایک علامہ اقبال اور دوسرے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ نے براہ راست سیرت پر تو کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن انہوں نے مکمل طور پر ان غلط فہمیوں کی تردید کر دی جو علوم سیرت اور علوم نبوت کے انکار پر مبنی تھیں۔ حضرت مجدد نے مقام نبوت اور مرتبہ نبوت کو لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے جاگزیں کر دیا۔

دوسری شخصیت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تھی جن کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شمالی ہندوستان میں پہلی بار علم حدیث کو متعارف کروایا۔ علم سیرت کو متعارف کرایا اور اس طرح متعارف کرایا کہ اگر ان کو ہندوستان میں علم سیرت کا جدامجد قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ حضرت شیخ عبدالحق برصغیر اور شمالی ہندوستان کے پہلے سیرت نگار ہیں۔ وہ بہت اونچے درجہ کے محدث اور بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ علم حدیث میں ان کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ محدث ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ ان کا عشق رسولؐ اور ذات رسالت مآب سے وابستگی ان کی کتابوں کے صفحے صفحے اور سطر سطر سے نمایاں ہے۔ انہوں نے حجاز میں چار سال تک قیام کیا۔ علم حدیث دنیائے اسلام اور حرمین کے بڑے بڑے علما سے حاصل کیا اور پھر واپس اپنے وطن دہلی تشریف لے آئے۔ آپ نے بہت سے دہلویوں کے ناموں کے ساتھ حقی کا لفظ سنا ہوگا۔ یہ حقی مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد ہونے کا اشارہ ہے۔

حجاز سے واپسی کے بعد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے پچاس سال تک یہاں درس حدیث دیا۔ پورے شمالی ہندوستان، بالخصوص ممالک متحدہ اور پنجاب میں اور قرب و جوار کے علاقوں میں علم حدیث کی شمع روشن کر دی۔ انہوں نے حدیث، سیرت اور علوم نبوت اور ان سے متعلقہ مسائل پر سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ علم حدیث کے لئے انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کو، جو حدیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے، درسی کتاب کے طور پر منتخب کیا۔ اس کتاب کو یہاں متعارف کرایا اور ان کے زمانے سے لے کر آج تک مشکوٰۃ المصابیح برصغیر، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان کے تقریباً تمام دینی اداروں میں درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

جنوبی ایشیاء اور افغانستان کے جو لوگ مشکوٰۃ المصابیح سے علم حدیث حاصل کرتے ہیں وہ سب کے سب بلا استثنا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ممنون احسان ہیں۔ شیخ عبدالحق نے یہاں علم حدیث کو متعارف کرانے کے لئے دو کتابیں لکھیں۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ عربی کتاب علمائے کرام کے لئے، اور فارسی کتاب عامۃ الناس کے لئے۔ فارسی کتاب کا نام 'اشعة اللمعات فی شرح المشکوٰة' ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور چھپی

ہوئی ملتی ہے۔ عربی کتاب کا نام ہے 'لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح'۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ یہ بھی کئی بار چھپی ہے اور مشکوٰۃ کی مقبول ترین شرحوں میں سے ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس نوعیت کی بھی ایک کتاب لکھی جس نوعیت کی کتاب علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی نے لکھی تھی۔ اس کا عنوان ہے 'ماثبت من السنۃ فی ایام السنہ'، کہ سال کے پورے 354 مہینوں میں کون کون سے اعمال کرنے سنت ہیں اور ان کے بارے میں حدیث اور سنت میں کیا کیا معلومات ملتی ہیں۔ انہوں نے علم حدیث اور سنت پر ایک درجن سے زائد کتابیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک کتاب جو دراصل چالیس منتخب احادیث کی بنیاد پر مرتب ہوئی انہوں شاہجہاں کے کہنے پر لکھی تھی۔ شاہجہاں نے ان سے کہا تھا کہ آپ مجھے ایک ایسا کتابچہ لکھ کر دیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ حکمرانوں کے لئے اسلام میں کیا ہدایات ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک، سنت اور اسلامی ادبیات سے ضروری مواد جمع کر کے وہ کتاب لکھی تھی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علم حدیث پر جو کام کیا وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کام تھا۔ حدیث کے علاوہ ان کا کام سیرت پر بھی بہت اونچے پائے کا ہے۔ برصغیر میں سیرت پر جو بہترین کتابیں اور سب سے ابتدائی کتابیں لکھی گئیں وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے قلم سے سامنے آئیں۔ مدارج النبوۃ ان کی دو جلدوں میں 12 سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ یہ برصغیر کی سب سے پہلی اور مستند کتاب سیرت ہے۔ سیرت کے ہر گوشے سے بحث کرتی ہے۔ کئی سو سال تک برصغیر کے دینی حلقوں میں فارسی میں سیرت کی جامع ترین کتاب سمجھی گئی۔ اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں قسم اول یا پہلے حصہ کا عنوان رکھا گیا ہے 'در ذکر فضائل و کمالات و اخلاق وصفات'۔ رسول اللہ ﷺ کے فضائل، کمالات وصفات کا تذکرہ، یعنی سب سے پہلے حضور ﷺ کی شخصیت کی عظمت کو قارئین کے ذہن نشین کرایا۔ اس کے بعد دوسرے حصے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نسب، خاندان، آپ کی ولادت، پیدائش اور بچپن کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اس حصے میں ان کا بیشتر ماخذ کتب حدیث، صحاح ستہ وغیرہ، کے علاوہ المواہب اللدنیۃ اور اس کی شرح علامہ زرقانی کی شرح المواہب اللدنیۃ ہے۔ ان دنوں کتابوں میں آنے والے تمام مضامین خلاصہ کے

طور پر شامل کیئے ہیں۔ تیسرے حصے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کے تمام واقعات نوجوانی سے لے کر وفات تک، نبوت، ہجرت، غزوات تک سب بیان کیئے ہیں۔ یہ اس کتاب کا طویل ترین حصہ ہے اور اس میں پوری سیرت کا خلاصہ آ جاتا ہے۔ چوتھے حصے میں آپ کے مرض الموت اور دنیا سے تشریف لے جانے کا تذکرہ ہے اور پانچویں حصے میں آپ کی اولاد، خاندان، ازواج مطہرات اور بقیہ اہل بیت کا تذکرہ ہے۔

یہ کتاب برصغیر میں کئی بار شائع ہوئی تھی۔ اب کافی عرصہ سے ناپید ہے۔ چونکہ برصغیر میں فارسی کا دور ختم ہو گیا اس لئے اس طرح کی علمی کتابوں کی مانگ بھی ختم یا بہت محدود ہو گئی۔ برصغیر سے باہر جہاں فارسی سمجھی جاتی ہے، وہاں بھی اس کتاب کی اشاعت نہ ہو سکی۔ افغانستان میں گزشتہ پچیس تیس سال سے بدنظمی ہے اور کوئی علمی کام ہو نہیں رہا۔ وسطی ایشیا میں مسلمانوں کے پاس شاید وسائل نہیں ہیں۔ اس لئے اگر شائع ہو سکتی تھی تو برصغیر اور پاکستان ہی میں ہوتی۔ پاکستان کے لوگوں کو شاید اب سنجیدہ دینی اور علمی کاموں سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے کافی عرصہ سے یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اردو ترجمے کئی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کراچی میں دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ان سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن اصل فارسی کتاب میں جو ادبیت ہے اور فارسی زبان کی جو چاشنی ہے اس سے اردو ترجمہ کے قارئین محروم رہتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ۱۸۳۲ء میں نول کشور کانپور سے اور دوسرا ۱۸۸۹ء میں نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صرف سیرت کے کام پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے یہ بھی لیک شعوری کوشش کی کہ برصغیر کے مسلمانوں میں عشق رسول اور حب رسول کا جذبہ بیدار کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک کتاب لکھی 'جذب القلوب الی دیار المحبوب'، یہ کتاب بنیادی طور پر مدینہ منورہ کے بارے میں ہے۔ مدینہ منورہ کے فضائل، مدینہ منورہ کی خوبیاں اور مدینہ منورہ کے بارے میں جو کچھ اس موضوع پر لکھی جانے والی قدیم کتابوں میں ملتا ہے، انہوں نے اس کی بڑی جامع تلخیص کی ہے۔ علامہ نورالدین سمہودی کی وفاء الوفاء ان کا سب سے بڑا ماخذ تھی اور وفاء الوفاء کے بہت سے مضامین کو انہوں نے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

علامہ سمہودی کی کتاب بڑی وقیع اور عالمانہ ہے، لیکن اس میں وہ عاشقانہ اور جذب کی کیفیت نہیں ملتی جو شیخ عبدالحق کی کتاب میں ملتی ہے۔ شیخ عبدالحق نے جس جذبہ سے یہ کتاب لکھی ہے وہ پڑھنے سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ جگہ جگہ فارسی کے اشعار ہیں۔ فارسی کے بڑے بڑے شعرا کے اشعار سے اس کتاب کو مزین کیا ہے۔ ضمناً اس میں سیرت کے بہت سے واقعات بھی آگئے ہیں۔ ہجرت کا واقعہ، بیعت عقبہ، تعمیر مسجد نبوی، صفہ، اصحاب صفہ۔

اس کتاب کا آغاز انہوں نے مدینہ منورہ میں کیا تھا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ چار سال حجاز میں مقیم رہے۔ مدینہ منورہ میں ان کو یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ غالباً انہوں نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران وفاء الوفاء دیکھی ہوگی، جو کہ ہندوستان میں مروج نہیں تھی۔ شاید اس کتاب کو مدینہ منورہ میں دیکھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو خیال ہوا ہوگا کہ اس طرز کی ایک کتاب فارسی میں بھی ہونی چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں بیٹھ کر اس کتاب کا آغاز کیا اور رسول اللہ ﷺ کے قدمین شریفین کی طرف بیٹھ کر اس کتاب کے ابتدائی صفحات تحریر کئے۔ مدینہ ہی میں اس کا پہلا مسودہ تیار کیا۔ ہندوستان آکر اس کو صاف کیا۔ اور یہ کتاب ہندوستان میں متعارف کرائی۔ 998ھ میں اس کا آغاز ہوا تھا اور 1001ھ میں ہندوستان واپسی تک اس کو مکمل کیا۔

مدینہ طیبہ کے اسما اور القاب کہ اس شہر کے کون کون سے نام ہیں، اس سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ نام کی کیا اہمیت اور معنویت کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے تقریباً سو نام آئے ہیں۔ ان سو میں سے چھپن ناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ لغوی تشریح کی ہے۔ فضائل مدینہ منورہ بیان فرمائے ہیں اور ایک بحث یہ کی ہے۔ جو محض ذوقی چیز ہے۔ اس کی کوئی علمی یا عقلی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے یہ بحث اٹھائی ہے کہ مکہ مکرمہ زیادہ افضل ہے یا مدینہ منورہ زیادہ افضل ہے۔ میرے خیال میں یہ بحث عاشقانہ طبعیت کا ایک آدمی ہی اٹھا سکتا ہے۔ اور جس میں عاشقانہ جذبہ نہ ہو وہ یہ بحث نہیں اٹھا سکتا۔ علامہ اقبال نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ارمغان حجاز میں جو ان کا روحانی سفرنامہ حرمین کہا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی ایک مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس روحانی اور تصوراتی سفر میں جب وہ مکہ مکرمہ سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ کے سفر کا آغاز کرنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

خطاب کر کے کہتے ہیں کہ ؎

تو باش ایں جا و با خاصان بیامیز

کہ من دارم ہوائے منزل دوست

سنا ہے کہ علامہ اقبال ایک مرتبہ بستر مرگ پر اپنے تازہ شعر سنا رہے تھے۔ کسی بے تکلف دوست نے پوچھا کہ کوئی نیا کلام ہوا ہے۔ تو انہوں نے یہ رباعی سنائی۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ جب دوست کا لفظ آیا اس پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اسی جذبہ سے شیخ عبدالحق نے بھی مدینہ منورہ کو افضل قرار دیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ایک اور کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو علم حدیث کی کتاب بھی کہی جاسکتی ہے اور علم سیرت کی کتاب بھی کہی جاسکتی ہے۔ وہ کتاب سیرت کی زیادہ ہے۔ میرے علم کی حد تک تو شائع نہیں ہوئی۔ بعض جگہ اس کے مخطوطات موجود ہیں۔ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بارے میں ہے۔ اس کا نام ہے: '**مطلع الانوار البهية في الحلية النبوية**'۔ یہ کتاب کتنی ضخیم ہے اور اس کے مندرجات کیا ہیں۔ میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس لئے کہ مخطوطہ میں نے نہیں دیکھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک ہم عصر اور انتہائی عظیم الشان اور جلیل القدر شخصیت جن کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک جملہ میں پہلے بھی دہرا چکا ہوں کہ The greatest religious genious of Muslim India. یعنی مسلم ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم عبقری یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی۔ انہوں نے ایک دوسرے انداز میں اس مسئلہ کو لیا۔ شیخ عبدالحق نے تو حدیث اور سیرت پر کتابیں لکھیں اور اس فن کو متعارف کرایا۔ خود پچاس سال حدیث اور سیرت کا درس دے کر اس کمی کو پورا کر دیا جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔

شیخ احمد سرہندی نے مقام نبوت اور علوم نبوت کے بارے میں غلط فہمیوں کی تردید فرمائی اور جو گمراہیاں الفی تحریک اور اس سے وابستہ لوگ پھیلا رہے تھے ان کی ایک ایک کر کے تردید کر دی۔ ان کو اپنی نوجوانی میں ہی اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا، جبکہ وہ ابھی مجدد الف ثانی کے لقب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، اور یقیناً ان کا وہ درجہ بھی ابھی تک تسلیم نہیں ہوا

تھا جو بعد میں تسلیم کیا گیا۔ ان کو اپنی نوجوانی میں اس وقت کے دارالحکومت آگرہ جانے کا موقع ملا، جس کو اس وقت اکبر آباد کہتے تھے۔ وہاں جب انہوں نے حکومت کے عمائدین، وزرا اور ذمہ دار لوگوں کو دیکھا تو ان کو اس صورت حال کی سنجیدگی کا احساس ہوا اور انہوں نے وہیں دوران قیام ایک کتاب لکھی۔ جو مکمل نہیں کر پائے لیکن جتنا حصہ لکھا وہ انتہائی جامع اور بہت بروقت اور برمحل اقدام تھا۔ 'رسالہ فی اثباۃ النبوۃ'، رسالہ در اثبات نبوت۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ واضح کیا کہ نبوت کیا ہے۔ ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی تردید کی جو حکومتی سرپرستی میں پھیلائی جا رہی تھی۔ پھر معجزات پر بحث کی کہ معجزات سے کیا مراد ہے۔ انبیاء کی بعثت کیا معنی رکھتی ہے اور انسانی معاشروں کی تعمیر و تشکیل میں بعثت انبیا کا کردار کیا ہے۔ ختم نبوت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کن معنوں میں اور کیسے خاتم الانبیا ہیں۔ آپ کی ختم نبوت کے نتائج اور ثمرات کیا ہیں۔ پھر آپ نے قرآن پاک کو، جو حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی عظمت اور اس کے فضائل بیان کئے اور بتایا کہ یہ حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو ہمیشہ کے لئے ہے۔ نہ کوئی تحریک الفی، نہ دوالفی، نہ سہ الفی اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ زمان و مکان سے ماورا ہے اور حضور کی نبوت اور آپ کا لایا ہوا قرآن پاک اور شریعت ہر دور اور ہر انسان کے لئے ہے۔ یہ اس رسالے کا پیغام تھا جو ان کی زندگی ہی میں بڑا مقبول ہوا۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے یہ محسوس کیا کہ یہ جو گمراہیاں پھیلائی جا رہی ہیں ان میں بعض صوفیائے کرام کی شطحیات کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ صوفیائے کرام میں ہر طرح کے لوگ ہوئے ہیں۔ جہاں امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ جیسے صاحب علم صوفیہ ہوئے ہیں وہاں ایسے صوفیہ بھی کم نہیں تھے جن کا علمی پایہ اتنا بلند نہیں تھا۔ بلاشبہ بعض صوفیہ عقل و فکر کے اونچے مرتبہ پر فائز تھے، جبکہ کچھ حضرت جذب اور بے خودی کی کیفیت سے سرشار رہتے تھے۔ ان آخرالذکر حضرات میں بعض صوفیائے کرام ایسے بھی تھے جو اپنے جذبات اور احساسات کی شدت کی وجہ سے کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کر جاتے تھے جو اپنے عام مفہوم میں نہیں ہوتے تھے۔ ان کا مقصود ظاہری اور لغوی مفہوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان کلمات اور الفاظ کو اسلام اور شریعت کا ترجمان کبھی بھی نہیں سمجھا گیا۔ شریعت کی ترجمانی اور اس کے مزاج کی تعمیر و تشکیل ہمیشہ قرآن و سنت کے مستند شارحین ہی کے کلام سے ہوئی۔ یہ صوفیائے کرام قابل

احترام تو رہے، لیکن ان کی یہ شطحیات کبھی بھی شریعت کی ترجمانی نہیں سمجھی گئیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مجدد الف ثانی نے بہت جرات اور ہمت کے ساتھ ایک اہم خدمت اور بھی انجام دی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کام انہی کے مقام و مرتبہ کا آدمی کرسکتا تھا، یہ واضح کیا کہ علما میں ایک قسم علمائے سوء کی ہے اور دوسری قسم علمائے حق کی ہے۔ یہ اصطلاح پہلی بار انہوں نے ہی استعمال کی۔ علمائے سوء وہ ہیں جو بدکردار، بدعقیدہ اور بدنیت ہیں اور دنیاوی مقاصد اور مفاد کی خاطر اپنے دینی علم کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ایسے علما کی اس طرح سے پردہ دری کی ہے کہ کسی بے دین اور بدکردار کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ علمائے سو دین کے ڈاکو ہیں اور ان کا مطمح نظر صرف جاہ اور دنیوی مناصب اور مال و دولت کا حصول ہے۔ ایسے لوگ دین کے لئے بہت خطرناک ہیں۔ اس موضوع پر حضرت مجدد صاحب کے بعض مکتوبات ایسے ہیں جن کو آج ترجمہ کر کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ بظاہر جو چیزیں انہوں نے اُس زمانے میں لکھی تھیں ایسے لگتا ہے جیسے یہ بالکل آج کے زمانے کے لئے لکھی گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کے اقوال کی جو غلط ترجمانی ہورہی تھی انہوں نے جرات کے ساتھ ان پر اظہار خیال کیا ۔ انہوں نے اتنے اچھے انداز اور عالمانہ اسلوب میں اظہار خیال کیا جس سے بہتر انداز میں اظہار خیال ممکن نہیں تھا۔

شیخ احمد سرہندی کے قریبی لوگوں میں سے ایک صاحب نے ایک سوال اٹھایا۔ یہ صاحب ان کے قریبی لوگوں میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی حکومتی عہدہ بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے کسی صوفی کے قول کا حوالہ دیا اور کہا کہ کیا اس قول سے فلاں بات واضح نہیں ہوتی۔ اس پر آپ نے بڑا سخت جواب لکھا اور فرمایا کہ 'مارا کلام محمد عربیؐ درکار است نہ کلام محی الدین عربیؒ۔ ہمیں محمد عربی کا کلام درکار ہے، محی الدین عربی کا کلام درکار نہیں ہے۔ مارا بہ نص کار است نہ بہ فص، ہمیں نص قرآنی اور حدیث نبوی سے غرض ہے 'فص' (یعنی محی الدین عربی کی کتاب) سے ہمیں دلچسپی نہیں ہے۔ 'فتوحات مدنیہ مارا از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است، یعنی فتوحات مدنیہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات نے ہمیں فتوحات مکیہ سے مستغنی کر دیا ہے۔ فتوحات مکیہ بھی شیخ ابن عربی کی ایک مشہور کتاب ہے۔

یہ بات اسی درجہ کا آدمی کہہ سکتا تھا جس درجہ کے آدمی خود شیخ محی الدین بن عربی تھے یا شیخ احمد سرہندی تھے۔ اگر مجدد الف ثانی کے علاوہ کوئی اور شخص یہ بات کہتا تو شاید گردن نپ جاتی۔ اسی طرح سے بہت سے ایسے معاملات میں کہ جن میں غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی تھیں اور مقام نبوت اور منصب نبوت کے بارے میں لوگوں کو الجھنوں کا شکار کیا جا رہا تھا ان کے بارے میں مجدد صاحب نے لوگوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی مثالیں ان کے درجنوں مکتوبات اور سینکڑوں تحریروں میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ یہ تمام مضامین ان کے مکتوبات میں اتنی کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے حوالے دیئے جائیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

ایک مرتبہ کسی نے ان کو اطلاع دی کہ فلاں صاحب نے یہ کہا ہے۔ یعنی کسی 'بڑے بزرگ' نے اسلامی عقائد سے متعلق کوئی خلاف واقعہ بات کہی تھی۔ شیخ احمد سرہندی نے جواب میں لکھا کہ 'فقیر را تاب استماع امثال ایں سخناں اصلاً نیست'، مجھے اس طرح کی باتیں سننے کی ہرگز تاب نہیں ہے۔ 'بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید'، میری رگ فاروقی بے اختیار حرکت میں آجاتی ہے۔ یاد رہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی نسلاً فاروقی تھے۔ 'فرصت تاویل توجیہ آں نہ می دہد'، مجھے رگ فاروقی کی حرکت کے بعد اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ میں اس کی تاویل یا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کروں یا اس کو سوچوں۔ میں ایسی تمام چیزوں کو بیک قلم مسترد کرتا ہوں۔ اس طرح اپنی حمیت اور جرات فاروقی سے کام لے کر انہوں نے ان تمام غلط فہمیوں کی تردید کی جو نبوت، منصب نبوت اور مقام نبوت کے بارے میں پھیلائی جا رہی تھی۔

ان کی نظر میں اس پوری گمراہی کی ایک وجہ تو وہ تھی جو میں نے ابھی عرض کی کہ ایک تو نبوت کو ایک ہزار سال گزر گئے تھے۔ پھر علوم نبوت کا رواج برائے نام تھا اور جو تھا وہ بہت محدود تھا۔ اس لئے عام اور تعلیم یافتہ دونوں قسم کے لوگ سیرت، حدیث، مقام نبوت اور منصب نبوت کی نزاکتوں سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ مجدد صاحب نے اس کی وضاحت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ 'چوں در نظر مردم بہ واسطہ بعد عہد نبوت کمالات نبوت در جنب کمالات ولایت حقیری درایند لاجرم سخن را در یں باب مبسوط ساخت وشمہ از حقیقت وانموذ۔ عہد نبوت سے دوری کی وجہ سے لوگوں کو کمالات نبوت کا احساس نہیں۔ منصب نبوت کی حقیقت کا اندازہ

نہیں۔ مقام نبوت کی عظمت سے واقفیت نہیں۔ اس لئے وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ولایت تو ہمارے سامنے کی چیز ہے اس کو سمجھتے ہیں۔ نبوت کا مقام بہت بلند و برتر ہے۔ اس کو سمجھانے کا بھی کوئی اہتمام نہیں۔ اس وجہ سے میں نے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی اور جابجا اپنی تحریروں میں ان حقائق کو بیان کیا ہے۔

ان دونوں شخصیات کے کارناموں کی برکت سے برصغیر میں گمراہی کو جو رو چل پڑی تھی، وہ ختم ہوگئی۔ یقیناً یہ ہند میں سرمایہ ملت کا وہ نگہبان تھا جن کو اللہ نے بروقت خبردار کیا۔ میرے خیال میں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بروقت خبردار کیا تھا۔ ایک نے علم اور شریعت کی نشرواشاعت کا کام کیا اور دوسرے نے فکری گمراہیوں کی اور روحانیت کے راستے سے آنے والی غلطیوں کی تردید کی۔ ان دونوں حضرات کے کام کے اثرات برصغیر پر اتنے نمایاں ہیں کہ صدیوں تک محسوس ہوتے رہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اثرات تو اگرچہ ہندوستان اور برصغیر تک محدود رہے، لیکن شیخ احمد سرہندی کے کام کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کئے گئے۔ جہاں جہاں اس طرح کی گمراہی پائی جاتی تھی، وہ وسطی ایشیا ہو، افغانستان ہو اور حتیٰ کہ ترکی ہو، وہاں ان کے مکتوبات سے استفادہ کیا گیا۔ خود مشرق وسطیٰ میں ان کی تحریروں سے کسب فیض کیا گیا۔ ان کے مکتوبات کا عربی ترجمہ ہوا۔ خود بعض عرب اور ترک علما نے ان کی کتابیں عرب دنیا میں شائع کیں۔

مجدد الف ثانی نے ایک ایسی بنیاد قائم فرمادی جس پر ڈیڑھ سو سال کے بعد ایک اور تعمیر ہوئی اور اس تعمیر نے اس غلطی کے راستہ کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔ وہ تعمیر برصغیر میں حدیث کے سب سے بڑے عالم بلکہ امیر المومنین فی الحدیث فی الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کو بھی ایک نصابی متن کے طور پر متعارف کرایا۔ شاہ صاحب سے پہلے تک قرآن مجید خود بطور درسی متن کے نصاب میں شامل نہیں تھا۔ بعض تفسیروں کا انتخاب پڑھا دیا تھا، لیکن یہ بھی وہ تفسیریں تھیں جو کلامی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں یا ادبی اور بلاغتی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ ایسی تفاسیر کے کچھ حصے برائے نام یا برائے نمونہ نصاب میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک براہ راست نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ علم حدیث کی کمی تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کسی حد تک پوری کردی

تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس کمی کو دور کر کے علم حدیث کے مطالعہ کی بنیاد کو مزید پختہ بنایا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سیرت مبارکہ پر پوری امت مسلمہ کو جمع کیا جانا چاہئے۔ ملت مسلمہ کو صرف تین چیزوں کی بنیاد پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور حدیث اور آپ کی سیرت مبارکہ۔ شاہ ولی اللہ نے ان تینوں میدانوں میں کام کیا۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ بھی کیا اور اس کو مقبول بھی بنایا۔ شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے خود برصغیر میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک قدیم ترجمہ مخدوم نوح نے کیا جو ہمارے صوبہ سندھ کے مشہور شہر کے ہالہ کے ایک بزرگ تھے۔ ان کا ترجمہ بھی اب چھپ گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو ترجمے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ترجمہ متعارف اور مقبول نہیں تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ترجمہ ایک بہت مستند اور بڑا فاضلانہ ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب کا جو علمی اور فکری مقام تھا وہ اوروں کا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے پہلی مرتبہ اس ترجمہ قرآن کو متعارف بھی کرایا اور وہ جلد شائع بھی ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے قرآن پاک کو درس و تدریس اور نصابی کتاب کے طور پر متعارف کرایا۔ قرآن پاک کے تفسیری اصولوں پر کتابیں لکھیں۔ اصول تفسیر پر بھی، قرآن پاک کے بعض مشکل الفاظ اور غرائب پر بھی اور اپنی متعدد کتابوں میں، حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں تفسیر قرآن کے بارے میں اتنی کثرت سے اشارات کئے ہیں کہ انہوں نے برصغیر میں علوم قرآنی کو ایک نئی جہت دے دی۔

حدیث کے باب میں جس طرح شیخ عبدالحق نے مشکوٰۃ المصابیح کو منتخب کیا تھا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موطاء امام مالک کو منتخب کیا۔ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ موطاء امام مالک بیک وقت حدیث اور فقہ دونوں کی کتاب ہے، اور جتنے فقہی مسالک ہیں وہ سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ امام مالک کی ذات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام محمد اور امام ابو یوسف نے براہ راست امام مالک سے کسب فیض کیا۔ امام شافعی بھی ان کے براہ راست شاگرد ہیں۔ امام احمد امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ یوں چاروں بڑے ائمہ کی فقہی اور اجتہادی روایتیں امام مالک کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر موطاء امام مالک جو حدیث

کے صحیح ترین مجموعوں میں سے ہے، اور جس کے بارے میں صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی تدوین سے پہلے کہا جاتا تھا کہ قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب یہی ہے، اس کو اگر تمام فقہی مسالک میں ایک بنیادی کتاب کی حیثیت دے دی جائے تو تمام مسالک آسانی سے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔اس لئے شاہ صاحب نے ہندوستان میں علم حدیث کے اعلیٰ اور متخصصانہ مطالعہ کے لئے موطاء امام مالک کو منتخب کیا۔جس طرح شیخ عبدالحق نے مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں لکھی تھیں ایک عوام کے لئے ،اور دوسری خواص کے لئے ،اسی طرح شاہ صاحب نے بھی موطاء امام مالک کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ایک شرح فارسی میں عامۃ الناس کے لئے ہے۔اور دوسری شرح عربی میں اہل علم کے لئے لکھی ہے۔اس کے علاوہ شاہ صاحب نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے اس کے کچھ نمونے حجۃ اللہ البالغۃ کے حوالہ سے میں بیان کر چکا ہوں۔

شاہ صاحب نے سیرت پر بھی ایک رسالہ لکھا۔یہ رسالہ سیرت پر درسی کتاب کے طور پر لکھا گیا تھا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سیرت پر پہلی درسی کتاب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھی۔آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پہلی یا دوسری گفتگو میں ابن سید الناس کی کتاب 'الدر فی تلخیص المغازی والشمائل والسیر' کا ذکر کیا تھا۔ابن سید الناس اسپین کے رہنے والے تھے۔انہوں نے اس دور میں سیرت اور مغازی پر جو کتابیں دستیاب تھیں ان سب کو سامنے رکھ کر ان سب کی ایک مستند اور جامع تلخیص تیار کی تھی۔ابن سید الناس کی یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے۔اس کتاب کی مزید تلخیص ایک اور بزرگ نے بھی کی تھی۔اس کے بعد شاہ صاحب نے اس تلخیص کی تلخیص کی اور اس کا نام انہوں نے 'سرور المحزون' قرار دیا۔ابن سید الناس کی اصل کتاب تھی 'عیون الاثر فی فروع المغازی والشمائل والسیر'،اس کی تلخیص تھی 'نور العیون فی تلخیص سیرت الامین المامون' اور اس کی تلخیص تھی سرور المحزون۔یہ ایک چھوٹی کتاب ہے جو درسی کتاب کے طور پر فارسی میں لکھی گئی تھی۔لیکن ابن سید الناس نے سیرت کے جتنے مضامین بیان کئے تھے ان سب کا خلاصہ شاہ صاحب نے بڑی جامعیت کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیا ہے۔شاہ صاحب نے اس کتاب میں جو مضامین بیان کئے ہیں وہ سیرت کے تمام موضوعات پر محیط

ہیں۔ حضور ﷺ کے سلسلہ نسب سے لے کر ولادت، رضاعت اور ایام طفلی، پھر غزوات، معمولات، حلیہ اور اخلاق، پھر ازواج مطہرات اور وہ تمام مضامین جو سیرت کی کتابوں میں آتے ہیں ان کا خلاصہ۔ سرور المحزون کے موضوعات کی وسعت کا اندزہ ان عنوانات سے کیجیے:

سرور المحزون کے موضوعات

ا۔ سلسلہ نسب	۲۔ ولادت مبارکہ
۳۔ رضاعت اور حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام	۴۔ عہد طفولیت
۵۔ عہد شباب	۶۔ تجارتی سفر
۷۔ شادی	۸۔ بعثت مبارکہ
۹۔ معراج اور اسراء کا واقعہ	۱۰۔ ہجرت مدینہ
۱۱۔ غزوت اور مہمات	۱۲۔ حج
۱۳۔ حلیۂ مبارکہ	۱۴۔ اخلاق
۱۵۔ معمولات	۱۶۔ ملبوسات
۱۷۔ ازواج مطہرات	۱۸۔ اولاد
۱۹۔ اقارب اور رشتہ دار	۲۰۔ خدام، ملازمین اور غلام
۲۱۔ محافظ	۲۲۔ احباب
۲۳۔ سواریاں اور مویشی	۲۴۔ ہتھیار اور آلات
۲۵۔ ترکہ	۲۶۔ معجزات

۲۷۔ وفات اور وصال

شاہ صاحب نے سرور المحزون کو بطور درسی کتاب کے متعارف کرایا اور پہلی مرتبہ ہندوستان میں سیرت کی کوئی کتاب کورس کی کتاب کے طور پر متعارف ہوئی۔ شمالی ہندوستان کے مسلمان طلبہ اب سیرت کو ایک نصابی جز کے طور پر پڑھنے لگے۔ شیخ عبدالحق کی دونوں کتابیں اگر چہ بہت مقبول ہوئیں، لیکن وہ انہوں نے درسی کتاب کے طور پر نہیں لکھی تھیں۔ شاہ

ولی اللہ صاحب نے جو کتاب لکھی وہ درسی کتاب تھی۔ اس کے اردو ترجمے بھی شائع ہوئے۔ پہلا اردو ترجمہ ۱۸۴۲ میں کانپور سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ درِ مکنون کے نام سے شوکت علی شاہ جہاں پوری نے کیا تھا۔ اس کے ہمراہ حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا۔ ایک اور ترجمہ ۱۸۷۹ میں لکھنو میں، ایک اور ۱۳۳۲ھ میں لکھنؤ میں شائع ہوا۔ ایک اردو ترجمہ غالباً سیرت رسول کے نام سے میں نے اپنے بچپن میں پڑھا تھا۔ کئی لوگوں نے اس کی شرحیں بھی لکھیں۔ ایک شرح 'قرۃ العیون' کے نام سے چھ جلدوں میں لکھی اور جو 1371ھ میں یعنی آج سے تقریباً پچاس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد ترجمے اس کتاب کے اور بھی ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب کے بعد برصغیر میں سیرت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں برصغیر کے اہل علم نے پچھلی ساری کمی کو پورا کر دیا۔ مسلمانوں سے ابتدائی ایک ہزار سال میں جو کوتاہیاں ہوئی تھیں ان کوتاہیوں کا ایسا تدارک کر دیا کہ برصغیر کے مسلمان اس میدان میں سب سے آگے نکل گئے۔ اس ضمن میں ایک کتاب جو ہمارے موجودہ پنجاب کے ایک بزرگ علامہ سید جمال الدین الحسینی نے لکھی تھی وہ اس میدان میں اولیت کا شرف رکھتی ہے۔ یہ بزرگ اصل میں نیشاپور کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی کا خاصا حصہ ہمارے موجودہ پنجاب میں گزرا۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو کافی ضخیم اور جامع ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ روایات غیر مستند بھی ہیں۔ کتاب کا نام تھا 'روضۃ الاحباب'۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے قلمی نسخوں میں بعض الحاقات ہو گئے۔ کسی نے نیک نیتی سے یا کسی غلط جذبے سے اس کتاب میں بعض ایسے مضامین کا اضافہ کر دیا جو اصل مصنف نے نہیں لکھے تھے اور شاید یہ اضافے مصنف کی رائے اور مزاج کے خلاف بھی ہوں۔ اسی لئے اہل علم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس کتاب کا اصل نسخہ حاصل کیا جائے اور اسی کو شائع کیا جائے۔ جس زمانے میں مطبوعات کا زیادہ رواج نہیں تھا اور قلمی کتابیں ہی زیادہ چلتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی اس کتاب کے دونوں نسخے مروج تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسی نے پوچھا کہ سیرت کی بہترین کتاب کونسی ہے جس کے پڑھنے کی آپ تلقین کرنا پسند کریں گے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ شیخ جمال الدین کی روضۃ الاحباب بہت عمدہ کتاب ہے بشرطیکہ الحاقات اور غلطیوں سے پاک ہو۔

شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں ایک صاحب علم بزرگ مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا تذکرہ

بھی یہاں ضروری ہے۔ قاضی صاحب نے، جن کو شاہ عبدالعزیز جیسے محدث نے بیہقی وقت کا لقب دیا تھا، سیرت کے موضوعات پر تین کتابچے لکھے جن کا مقصد عوام میں سیرت کو متعارف کرانا تھا۔ یہ رسائل شمائل، اخلاق نبی، نسب مبارک، ازواج مطہرات اور حضور اکرمؐ کے والدین کے مقام و مرتبے کے بارے میں تھے۔

ابھی تک جو کام ہو رہا تھا وہ فارسی میں ہو رہا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا کام بھی فارسی میں تھا۔ شاہ ولی اللہ کا کام بھی فارسی میں تھا۔ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز اگرچہ اردو جانتے تھے اور بولتے بھی تھے کیونکہ ان کے زمانے میں اردو خاصی عام ہو گئی تھی۔ شاہ عبدالعزیز سے کسی موقع پر ان کے والد گرامی شاہ ولی اللہ نے کہا تھا کہ کبھی کبھی خواجہ میر درد کی محفل میں جا کر بیٹھا کرو تاکہ اردو سیکھ سکو۔ لیکن چونکہ عام علمی زبان اردو نہیں بلکہ فارسی تھی اس لئے شاہ عبدالعزیز کی تحریریں بھی فارسی ہی میں تھیں۔ اس لئے شاہ عبدالعزیز گھر میں یقیناً اردو ہی بولتے ہوں گے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی اردو بولتے ہوں گے، یہ بات یقینی طور پر معلوم نہیں۔ لیکن ان کی علمی زبان فارسی اور عربی تھی۔ بہت جلد، یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانے ہی میں اردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا اور دنیا کی ہر زبان کی طرح سیرت پر جو پہلی کتاب اردو میں سامنے آئی وہ نظم میں تھی۔

دنیا کی ہر زبان کی تاریخ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ نظم پہلے لکھی جاتی ہے اور نثر بعد میں لکھی جاتی ہے۔ اس وقت تک اردو نثر کو علمی حلقوں میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے لوگوں نے نظم میں سیرت کے مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ زیادہ تر مثنوی کی صنف استعمال کی گئی کیونکہ اس صنف میں وقائع اور قصص کو بیان کرنا نسبتاً آسان ہے اور اخلاقی مضامین جتنی سہولت کے ساتھ مثنوی میں بیان ہو سکتے ہیں کسی اور صنف میں ان کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اس دور میں سیرت پر جو لٹریچر تیار ہوا اس کو آپ اجازت دیں تو، ہم لوک ادب کہہ سکتے ہیں۔ سیرت کا عوامی یا لوک ادب۔ اس صنف میں معراج نامے، میلاد نامے، وفات نامے، شمائل، نور نامے اور اس طرح کے ناموں سے سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور وہ ہندوستان کے ہر علاقے اور شہر میں لکھی گئیں۔ ان کی فہرستیں متعدد حضرات نے تیار کی ہیں۔ ایک محقق نے سو کتابوں کی فہرست دی ہے۔ ایک نے 63 کتابوں کی، ایک نے 200 کتابوں کی فہرست

دی ہے۔ یہ ساری کی ساری کتابیں منظومات تھیں جو سترہویں صدی کے اواخر سے لے کر اٹھارویں صدی کے اواخر تک لکھی جاتی رہی ہیں۔یعنی ہندوستان میں سو سال کا یہ عرصہ سیرت پر منظومات اور لوک ادب کا زمانہ ہے۔

1857ء سے پہلے اردو میں سیرت پر نثر میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔اندازہ یہی ہے کہ یہ کتابیں بیس پچیس سے کم نہیں ہوں گی۔ 1857 سے پہلے کی کتابوں میں دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ایک 1857 کے زمانے کی سمجھ لیں اور ایک اس سے پہلے کی۔ جو کتاب 1857 سے پہلے کی ہے وہ ایک ایسی شخصیت کی ہے جس کے خاندان میں علم سیرت ہمیشہ سے رہا ہے اور ماضی قریب میں اس خاندان کے ایک قابل ذکر فرزند نے علم سیرت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد دکن میں ایک بزرگ تھے قاضی بدرالدولہ۔ ان کا خاندان بہت مشہور تھا۔ وہ خود بڑے صاحب علم تھے۔ان کی ایک کتاب 'فوائد بدریہ' سیرت کے موضوع پر ہے۔ 404 صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور قدیم اردو زبان یعنی دکنی میں لکھی گئی۔ 1839ء اور 1255ھ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں لکھی گئی۔کئی بار چھپ چکی ہے۔

قاضی بدرالدولہ خود بہت بڑے فقیہ تھے۔ریاست کرناٹک کے قاضی القضاۃ تھے۔مستند ترین مصادر سے کام لے کر انہوں نے کتاب لکھی ہے۔ زادالمعاد، فتح الباری، عیون الاثر اور المواہب اللدنیہ جیسی بڑی کتابیں ان کے سامنے تھیں۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں لکھی گئی یہ کتاب سب سے پہلی مستند کتاب سیرت ہے۔فارسی میں برصغیر میں سیرت پر پہلی کتاب شیخ عبدالحق نے لکھی تھی۔ اردو میں قاضی بدرالدولہ نے لکھی۔ اگرچہ ان کی اردو قدیم ہے لیکن عام فہم ہے اور آج بھی اس کو سمجھنے میں کوئی خاص وقت محسوس نہیں کی جاتی۔ قاضی بدرالدولہ ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کے جدامجد ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں سب علوم سیرت کو نئی جہتیں عطا کیں، جن کی وجہ سے ان کو بجا طور پر مجدد علوم سیرت کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہی ڈاکٹر حمیداللہ ہیں جن کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی کا کتب خانہ موسوم ہے۔

قاضی بدرالدولہ کی اس کتاب کے علاوہ جو کتاب عین 1857ء اور 1858ء کے معرکہ میں شریک عالم مجاہد کے قلم سے ۱۸۵۸ اور ۱۸۵۹ کے سالوں میں لکھی گئی وہ ایک مشہور

مجاہد، فقیہ اور عالم مفتی عنایت احمد کاکوروی کی لکھی ہوئی تھی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی شمالی ہندوستان میں ایک چھوٹا سا شہر کاکوری ہے، وہاں کے رہنے والے ہیں۔ مفتی عنایت احمد 1857 کی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ پہلی مرتبہ جہاد کے وجوب کا فتویٰ جن لوگوں نے دیا ان میں مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی شامل ہیں اور جہاد کے اس تاریخی فتوی پر ان کے دستخط بھی ہیں۔ انہوں نے فتویٰ بھی دیا۔ رائے عامہ کو بھی ہموار کیا اور عملاً جہاد میں حصہ بھی لیا۔ چنانچہ جب انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور مجاہدین کو شکست ہوئی تو بہت سے لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔ کچھ لوگوں کو کالا پانی یعنی جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی ان لوگوں میں شامل تھے جن کو جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ لیکن جزائر انڈیمان میں قید بامشقت کے دوران جو کام ان کے سپرد کیا گیا وہ یہ تھا کہ جزائر میں جتنی گندگی لوگوں کے گھروں میں جمع ہو اس کو اٹھا کر آبادی سے باہر پھینکا کریں۔ اُس زمانے میں غسل خانوں وغیرہ کا یہ نظام نہیں تھا۔ مفتی صاحب لوگوں کے گھروں میں جا کر گندگی صاف کرتے اور اس کو ایک بڑے ٹوکرے میں ڈال کر کندھے پر اٹھاتے اور آبادی سے باہر پھینک آتے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں ان کے پاس نہ وقت ہوتا تھا نہ مطالعہ کے مواقع اور نہ ہی مصادر اور مآخذ کی کتابیں۔ اس کے باوجود اس تکلیف دہ دور اسیری میں انہوں نے تین کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب سیرت پر ہے۔ یہ کتاب 'تواریخ حبیب الٰہ' کے تاریخی نام سے معروف ہے۔ یہ ساری کتاب انہوں نے جزائر انڈیمان میں بیٹھ کر محض یادداشت کی بنیاد پر لکھی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک ان معلومات کو دوبارہ چیک نہ کیا جائے اس کتاب کو شائع کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے مسودہ اپنے پاس رکھ چھوڑا۔ اتفاق کی بات کہ ان کی ملاقات کسی شریف انگریز سے ہوگئی۔ یہ انگریز ان کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا سابق قاضی اور جج رہے ہیں اور یہاں عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں تو اس نے سفارش کر کے مفتی صاحب کو رہائی دلائی۔ مفتی صاحب تینوں مسودے لے کر ہندوستان واپس آئے۔ یہاں انہوں نے تواریخ حبیب الہ کے مندرجات کو مصادر و مآخذ سے چیک کیا اور کہیں ایک حوالہ بھی غلط نہیں پایا تو اس کو شائع کر دیا۔

اس کتاب میں تین ابواب ہیں۔ باب اول 'نور مبارک اور ولادت سے ہجرت تک' ہے۔باب دوم ہجرت سے لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دنیا سے تشریف لے جانے تک کے واقعات پر مبنی ہے اور یہ کتاب کا طویل ترین باب ہے۔تیسرا باب حلیہ مبارکہ اور آپؐ اخلاق، عادات اور معجزات کے بارے میں ہے۔کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جو حضور ﷺ کی شفاعت کبریٰ کے بارے میں ہے۔

یہ دو کتابیں جن میں سے ایک 1857 سے پہلے لکھی گئی اردو زبان میں سیرت پاک پر قدیم اور مستند کتابیں ہیں۔ایک 1857 کے واقعات کے دوران لکھی گئی۔تواریخ حبیب الہ بھی مستند اور بلند پایہ علمی کتاب ہے۔لیکن فوائد بدریہ استناد کے اعتبار سے زیادہ اونچا درجہ رکھتی ہے۔جامعیت بھی اس میں زیادہ ہے اور یہ ضخیم بھی زیادہ ہے۔تواریخ حبیب الہ نسبتاً مختصر ہے۔میرے پاس اس کا تیرہویں صدی ہجری کا چھپا ہوا ایک نسخہ موجود تھا جو سوا ایک سو میں صفحات پر مشتمل تھا، لیکن بعد میں جب شائع ہوا تو میں نے سنا ہے کہ کوئی 200 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔فوائد بدریہ پرانے انداز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اگر اس کو آج کی کتابت اور کمپیوٹر سے چھاپا جائے تو شائد چھ سو صفحات بن جائیں گے۔یہ قدیم ترین دو کتابیں ہیں جو اردو میں سیرت پر لکھی گئیں۔

اسی اثنا میں ایک اور کام بھی ہوتا رہا۔وہ یہ کہ جب اردو میں نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت سی قدیم کتابیں بھی اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔چنانچہ سیرت ابن ہشام اور دوسری کتابیں ایک ایک کر کے ترجمہ ہوئیں۔ایک کتاب جو برصغیر میں بڑی مشہور اور معروف رہی، اگرچہ وہ براہ راست سیرت پر نہیں ہے لیکن سیرت کے واقعات کا تتمہ ضرور ہے۔صحابہ کرام کی فتوحات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔یہ ایک کتاب ہے جو فتوح الشام کے نام سے مشہور ہے اور غلط طور پر واقدی سے منسوب ہے۔یہ واقدی کی کتاب فتوح الشام نہیں ہے۔واقدی کے کھاتے میں لوگوں نے ایسی بہت سی غلطیاں ڈال دی ہیں جو واقدی نے نہیں کی تھیں۔فتوح الشام بھی واقدی کے کھاتے میں ڈال دی گئی حالانکہ یہ کسی اور کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شام کے جو علاقے صحابہ کرام کے ہاتھوں فتح ہوئے اس کی تفصیل ہے۔شام کے علاقے میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے ہی مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی

تھی۔شام کی حدود کے قریب واقع تبوک کے علاقہ میں رسول اللہ ﷺ خود تشریف لے گئے تھے۔غزوہ موتہ شام ہی کے علاقہ میں پیش آیا، اور جیش اسامہ حضورؐ ہی کے ارشاد پر بھیجا گیا تھا اس لئے فتوح الشام کے مؤلف نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے آخری زمانے سے شروع کیا ہے۔تو گویا سیرت کا بھی ایک حصہ اس میں شامل ہے۔پھر صحابہ کرام کی جو مہمات شام میں ہوئیں وہ حضور ﷺ ہی کی ان مہمات کا تتمہ تھیں۔لہٰذا ان کتابوں میں فتوح الشام کے جتنے واقعات ہیں وہ ایک اعتبار سے سیرت ہی کے واقعات کا تتمہ ہیں۔فتوح الشام کا ترجمہ 1284 میں ایک بزرگ مولوی سید عنایت حسین نے کیا جو نول کشور لکھنؤ سے طبع ہوا۔

اسی زمانے میں یا غالباً اس سے تھوڑا سا پہلے ایک اور بزرگ عبدالرزاق کلامی لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے۔انہوں نے صمصام الاسلام کے نام سے اس کتاب کا ایک منظوم ترجمہ تیار کیا۔یہ نظم جو اصل کے ترجمہ کا منظوم ایڈیشن ہے، جس کو دیکھ کر انہوں نے غالباً یہ کام کیا ہوگا، اس منثور ترجمہ سے کہیں زیادہ موثر اور کہیں زیادہ دلنشین یہ منظوم ترجمہ ہے۔اس کا زور بیان غیر معمولی ہے، ایک تو فتوحات کے ذکر میں ویسے ہی زور بیان پیدا ہو جاتا ہے، پھر صحابہ کرام کے لئے جو احترام اور عقیدت ہر مسلمان کے دل میں پائی جاتی ہے۔اس کا اپنا اثر ہوتا ہے۔پھر نظم میں جو بات کہی جائے وہ نثر کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔اس لئے یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور ایک طویل عرصہ تک گھروں میں، خاندانوں میں اور علمی حلقوں میں پڑھا جاتا رہا۔اب بھی یہ ترجمہ موجود ہے۔اوپر (ادارہ تحقیقات اسلامی کے) کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو تقریباً سوا ایک سو بیس سال پہلے کا چھپا ہوا ہے۔

فتوح الشام کے علاوہ جن کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے ہیں ان میں سیرت کی ایک قدیم ترین کتاب امام ترمذیؒ کی شمائل نبوی کا ترجمہ بھی کئی بار شائع ہوا ہے۔یہ ترجمہ ایک ایسے شخص نے کیا ہے جس کے اصلاحی اور جہادی کارناموں سے برصغیر کی تاریخ کا ایک باب روشن ہوتا ہے، یعنی مولانا کرامت علی جون پوری۔حضرت مولانا کرامت علی جون پوری سید احمد شہیدؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔وہ سیّد صاحب کے خاص شاگردوں اور مریدوں میں سے تھے۔انہوں نے مشرقی ہندوستان یعنی بہار، اڑیسہ اور بنگال کے علاقوں میں جہاد اور اصلاح کی شمع روشن کی اور سیرت اور حدیث کے مضامین کو مقبول بنایا۔مولانا کرامت علی جونپوری نے سب

سے پہلے اردو میں شمائل نبوی کا ترجمہ کیا تھا جو انوار محمدی کے نام سے 1212 ہجری میں مکمل ہوا تھا۔

زاد المعاد کا ایک نامکمل ترجمہ انہی دنوں ایک ایسے ادیب نے کیا جو اردو تنقید کی تاریخ میں بہت نمایاں درجہ کے حامل ہیں۔ وہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں اتنا اونچا مقام رکھتے ہیں کہ مرزا غالب بھی ان کی عظمت اور استاذی فن کو مانتے تھے۔ میری مراد ہے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ نواب شیفتہ مرزا غالب کے بہت قریبی دوست تھے۔ جب مرزا غالب نے اپنا اردو دیوان مرتب کیا تو نواب شیفتہ کے مشورہ سے کیا۔ جس شعر کو نواب شیفتہ نے ساقط از اعتبار قرار دیا اس کو مرزا غالب نے نکال دیا۔ جس غزل کو نواب شیفتہ نے کہا کہ یہ غیر معیاری ہے غالب نے اس کو بھی نکال دیا۔ یوں غالب نے اپنے اردو کلام کا انتخاب نواب شیفتہ سے کرایا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خود بھی عربی دان اور فارسی زبان کے بڑے ادیب تھے۔ ان کا اردو دیوان بھی ہے، فارسی دیوان بھی ہے۔ انہوں نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی فارسی زبان میں لکھا ہے۔ یہ تذکرہ گلشن بے خار کے نام سے مشہور ہے۔ کئی بار چھپا ہے۔ انہی نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے قلم سے زاد المعاد کا ترجمہ ہوا، اگرچہ نامکمل تھا۔

سیرت ابن ہشام کا ترجمہ بھی ہندوستان میں ہوا۔ 1857 سے پہلے بھی ہوا، بعد میں بھی ہوا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں ایک مشہور صحافی، ادیب اور وطن اخبار کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں نے سیرت ابن ہشام کا اردو ترجمہ کیا جو 13-1912 میں لاہور میں چھپا تھا۔ اس ترجمہ مین مولوی انشاء اللہ خان نے بعض مفید حواشی اور تشریحات کا بھی اضافہ کیا۔ قاضی عیاض کی شفاء کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ وہ ایک ایسے بزرگ کا کیا ہوا تھا جن کے خاندان سے میرا بھی تعلق ہے۔ یہ بزرگ تھے مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی جو مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے والد تھے۔ انہوں نے الشفا کا ترجمہ 'شمیم الریاض' کے نام سے کیا تھا جو لکھنؤ کے نول کشور پریس میں 1913 میں چھپا تھا۔ طبقات ابن سعد کا ترجمہ بھی ہوا۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان میں مشہور ومعروف ہوتی گئیں۔ ایک ایک کر کے ترجمہ ہوتی گئیں اور چھپتی گئیں۔ اس سے سیرت کے علم کو عام کرنے میں بہت مدد ملی۔

اب میں سیرت کے ایک ایسے دور کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو 19 ویں صدی کے

آواخر میں شروع ہوا اور 20 صدی کے ایک تہائی تک چلا۔ اس کا جو حصہ بیسویں صدی میں ہے اس کا تذکرہ دورِ جدید کے موضوع کے تحت کل ہونے والی بحث میں آئے گا۔ جو کام انیسویں صدی میں ہوا اس کا تذکرہ آج کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں پورے طور پر قائم ہوگئی اور دہلی پر بھی 1806 میں ان کا قبضہ لارڈ لیک کے ہاتھوں مکمل ہوگیا اس وقت عیسائی پادریوں نے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی۔ یہ عیسائی پادری انگریز بھی تھے جو اردو سیکھ کر آئے تھے۔ ان پادریوں میں کچھ مقامی مرتدین بھی شامل تھے جو اسلام چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے۔ کئی ہندو بھی تھے جنہوں نے عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ وہ بھی پادری ہوگئے تھے۔ ان کی ساری کاوشوں کا اصل ہدف اور مرکز ہندو، سکھ یا بدھ مذہب والے نہیں تھے، بلکہ اسلام ان کا اصل ہدف تھا۔ اسلامی عقائد پر، رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر اور ہر چیز پر ایک ایک کرکے انہوں نے تنقیدیں شروع کردیں۔ ایک پادری عماد الدین ان دنوں بہت مشہور ہوا۔ یہ شخص بھی مرتد ہوگیا تھا۔ اس نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ عیسائی بن جانے کے بعد اس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب ذات رسالت مآب کے بارے میں بڑی گستاخانہ لکھی۔ اس کتاب کا جواب بہت سے لوگوں نے دیا۔ لیکن ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ ایک مولانا الطاف حسین حالی جو برصغیر کے مشہور ادیب، شاعر، ناقد اور تاریخ کی مشہور شخصیت ہیں۔ دوسرے مولوی چراغ علی ہیں جو سرسید کے دوستوں میں سے تھے اور اردو اور انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

لیکن یہ سلسلہ ابھی اپنے آغاز ہی میں تھا کہ ہندوستان میں مقیم ایک اہم اور مشہور انگریز شخصیت سر ولیم میور نے جو یوپی کا لفٹیننٹ گورنر تھا، اس میدان میں قدم رکھا۔ اس نے Life of Muhammad کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا چرچا چھپنے سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا۔ ایک تو انگریزی حکومت کا جاہ وجلال، انگریزوں میں بھی اتنا بڑا آدمی جو یوپی جیسے بڑے صوبہ کا لفٹیننٹ گورنر ہو۔ یوپی رقبہ اور آبادی دونوں میں پاکستان سے بڑا علاقہ ہے۔ یہ شخص عربی اور فارسی بھی جانتا تھا اور اسلامی علوم وفنون کا اس نے خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے چار جلدوں میں یہ کتاب لکھی جو 64-1860 میں شائع ہوئی۔ اس

کتاب میں، جس کا بڑے عرصہ سے انتظار تھا، مسلمانوں کے دلوں کو بہت دکھایا۔ سرسید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جوں جوں کتاب کو دیکھتا ہوں دل کباب ہوتا جاتا ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر سب سے پہلے سرسید احمد خان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس کتاب کا ایک عالمانہ جواب لکھنا چاہئے۔

یوں سیرت نگاری کا ایک نیا دبستان وجود میں آیا جس کو میں آپ کی اجازت سے دبستان سرسید کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی سیرت نگاری کا دبستان سرسید۔ سرسید احمد خان نے ان کتابوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جو اس کتاب سے پہلے لکھی گئیں تھیں اور پے در پے لکھی جارہی تھیں۔ واقعی یہ ہے کہ ولیم میور سے پہلے بھی سیرت کے موضوع پر پادریوں کے قلم سے بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ انگریزوں نے بھی لکھی تھیں اور مقامی پادریوں نے بھی لکھی تھیں۔ لیکن وہ کوئی عالمانہ کتابیں نہیں تھیں، بلکہ مناظرانہ قسم کی کتابیں تھیں۔ ان کی کتابوں میں جو مواد استعمال کیا گیا تھا وہ بھی کوئی مستند مواد نہیں تھا۔ انگریزوں نے جو لکھا اسی کو مقامی پادریوں نے دہرادیا۔ ایک پادری نے دوسرے سے نقل کیا، اور دوسرے نے تیسرے سے۔ یوں کتابوں کی تعداد تو خاصی تھی، لیکن مواد میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ اس لئے ایسی کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ سرولیم میور نے جو کتاب لکھی تھی وہ براہ راست اسلامی ماٰخذ کو سامنے رکھ لکھی گئی۔ مصنف عربی جانتا تھا اور اس نے خاصی محنت سے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس نے اسلامی مصادر کا گہرائی سے مطالعہ کیا، جگہ جگہ سے مواد جمع کیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس کو چھانٹا، جس جس چیز کی وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق تعبیر کرسکتا تھا اس کی منفی تعبیر کی۔

یہ کتاب جب شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس پر ردعمل کا اظہار کیا لیکن سب سے مثبت اور تعمیری ردعمل سرسید احمد خاں کا تھا۔ سرسید کو بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں جو اوروں کو حاصل نہیں تھی۔ سرسید کی شہرت انگریزوں کے ہمدرد کے طور پر ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی۔ 1857 میں انہوں نے تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کئی انگریزوں کی ذاتی طور پر مدد کی تھی اور ان کی جان بچائی تھی۔ وہ اس بات کے داعی تھے کہ مسلمانوں کو انگریزی علوم وفنون سیکھنے چاہئیں۔ انگریز سے دشمنی ختم کرنی چاہئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ اس لئے جب انہوں نے سرولیم میور کا جواب دینے کے لئے قلم اٹھایا تو ان

کی نیت کے بارے میں کوئی انگریز یہ شک نہیں کرسکتا تھا کہ محض انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ان کو جاننے والے ہر شخص کو معلوم تھا کہ وہ کس نیت سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ پھر کسی اور کے لئے ایسی جرات کرنا شاید ممکن نہیں تھا کہ ایک حاضر سروس گورنر کی کتاب کے جواب میں کتاب لکھنے اور اس کی تردید کرنے کی جسارت کرے۔

سرسید نے یہ طے کیا کہ وہ اس کتاب کا بہت معروضی انداز میں جواب دیں گے اور جس طرح کے دلائل ولیم میور نے اپنے بیانات اور دعاوی کی تائید میں دیئے ہیں اسی طرح کے استدلالی اور جوابی دلائل سے کام لیں گے۔ جب انہوں نے یہاں ہندوستان میں اس منصوبہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں جو اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہیں یہاں کے کتب خانوں میں نہیں مل رہی ہیں۔ جب یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ بڑے بڑے کتب خانے انگریز لوٹ کر کتابیں لے گئے ہیں۔ پورا انڈیا آفس اور برٹش میوزم کی لائبریری اور انگلستان کی درجنوں لائبریریاں ہندوستان اور برصغیر کی مسروقہ کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔خود ہمارے خاندان یعنی میرے خاندان کی کئی کتابیں وہاں موجود ہیں، جس پر میرے آباواجداد کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔اس لئے مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ انگریز کس طرح کی کتابیں لوٹ لوٹ کر لے گئے ہیں۔

جن دنوں یہ کتاب نئی نئی آئی تھی اور سرسید اس کے مضامین ومندرجات سے باخبر ہوتے جاتے تھے،ان کی بے چینی اور کرب بڑھتا جاتا تھا۔مولانا حالی کا بیان ہے کہ ان دنوں سرسید کی زبان پر یہی تذکرہ رہتا تھا۔اس زمانہ کے خطوط اور مقالات میں بھی یہ مضمون بہت کثرت سے آیا ہے۔لکھا ہے کہ ولیم میور کی کتاب پڑھ پڑھ کر عیسائی سر دھنتے اور مسلمان سر پیٹتے تھے۔

جب ۱۸۶۹ میں سرسید انگلستان گئے تو وہاں سے بھی اپنے احباب کو، بالخصوص نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان کو، جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی بہت سے خطوط کا موضوع یہی کتاب ہے۔ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے جو بس میں ہے وہ سب کردوں گا۔حتیٰ کہ میں نقد جان صرف کرنے کے لئے بھی آمادہ ہوں۔

چنانچہ سرسید نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کام کی انجام دہی کے لئے لندن جائیں گے اور وہاں بیٹھ کر یہ کتاب لکھیں گے۔وہاں سے انہوں نے اپنے دوستوں اور خاص طور پر نواب محسن

الملک کے ساتھ جو خط و کتابت کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس انداز سے یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ کل میں انڈیا آفس کا کتب خانہ دیکھنے گیا تھا۔ دیکھ کر ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ کیا ہے کہ کتابوں کا ایک شہر ہے۔ جس کتاب کا نام لو، وہ کتاب موجود ہے۔ مجھے وہاں بیٹھنے، پڑھنے، کتابیں لینے اور نقل کرنے کی بھی اجازت مل گئی ہے۔ یوں وہاں بیٹھ کر سرسیّد نے کتاب لکھنا شروع کر دی۔ لیکن انگلستان میں قیام کے اخراجات سرسید کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہاں سے وہ اپنے دوستوں اور مختلف لوگوں کو لکھ لکھ کر قرض مانگتے رہے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ قرض دینے کے لئے بھی لوگ تیار نہ ہوئے تو انہوں نے نواب محسن الملک کو لکھا کہ میرا فلاں مکان فروخت کر دو اور مجھے رقم بھیج دو۔ پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے فلاں مکان میں تانبے اور پیتل کے بہت سے برتن ہیں، وہ سارے فروخت کر کے رقم مجھے بھیج دو۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ میں اس کام میں بے گھر اور بے سہارا ہونے کو تیار ہوں۔ جب قیامت میں کہا جائے گا کہ لاؤ اور حاضر کرو اس فقیر اور مسکین سید احمد کو جو میرے نام پر گھر بار لٹا بیٹھا، تو میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے۔

ما را آں تمغۂ شاہی بس است

اسی مصرعہ پر انہوں نے یہ خط ختم کیا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں انگلستان میں قیام کر کے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ مزید وسائل ان کے پاس تھے نہیں۔ ایک جلد کا جواب لکھنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے اور بقیہ تین جلدوں کا جواب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے اس ارادہ کو پورا نہیں کر سکے۔

جب انہوں نے یہ کتاب لکھی تو اس میں پہلے دس ابواب جن کو وہ خطبہ کہتے ہیں شامل تھے۔ بعد میں دو مزید خطبات کا اضافہ کیا۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے لندن میں انہوں نے ایک اردو جاننے والے انگریز کو مامور کیا جو انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر کے ان کو مواد فراہم کرتا جاتا تھا۔ ظاہر ہے بغیر تنخواہ کے کام نہیں کرتا تھا۔ ایک اور اردو جاننے والے انگریز کو مامور کیا جو تیار شدہ ابواب یا خطبات کا انگریزی ترجمہ کیا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے قیام کے دوران اردو میں کتاب چھپنے سے پہلے اسی انگریز سے اس کا انگریزی میں ترجمہ مکمل کرا لیا۔ 1870 میں لندن اس کو شائع کیا۔

یہ سیرت کی تاریخ میں پہلی کتاب ہے جو ایک مسلمان دانشور نے غیر مسلم ملک میں جا کر، غیر مسلم ماحول میں، غیر مسلموں کے اسلوب اور استدلال سے کام لے کر ایک غیر مسلم مصنف کی تردید میں لکھی اور سیرت کے بارے میں جو نقطہ نظر ان کی رائے اور تحقیق میں درست تھا اس کو بیان کیا۔ یہ کتاب ایک ضخیم کتاب تھی۔ کئی سو صفحات پر مشتمل تھی لیکن پھر بھی یہ ایک نامکمل کتاب ہے۔ اس کی تکمیل سرسید نہیں کر سکے۔ اس کے بارہ ابواب یا بارہ خطبات تیار کیے گئے۔ ان بارہ خطبات میں سرسید نے ایک نیا انداز اپنایا۔ مغربی تحقیقات اور تصانیف سے استفادہ کیا۔ مستشرقین کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ مستشرقین نے بالعموم اور ولیم میور نے بالخصوص جو اعتراضات کئے تھے ان کا جواب دیا۔ قدیم سیرت کے مآخذ کے بارے میں سرسید نے ایک نیا رویہ اختیار کیا جس کی بعد میں تقریباً ہر سیرت نگار نے پیروی کی ہے۔ وہ یہ کہ قدیم مآخذ کے مستند ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں از سر نو غور کیا جائے اور تمام اہم دستیاب مآخذ کا ناقدانہ جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ کون سے مآخذ قابل اعتماد ہیں اور کون سے ناقابل اعتماد ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بعض مآخذ کے بارے میں شروع میں ہی محدثین نے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً ابن اسحاق، واقدی، اور دیگر کئی لوگ غیر مستند سمجھے جاتے تھے، اور محدثین ان کے بیانات کو قبول کرنے میں تامل کرتے تھے۔ بعد میں جب ان حضرات کی کتابیں مرتب ہوگئیں تو ان کی حسن ترتیب، جامعیت اور دوسری خوبیوں نے ان کو جلد ہی قبول عام عطا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کتابیں اتنی عام ہوگئیں کہ بیشتر لوگوں نے محدثین کے اس تحفظ کو بھی فراموش کر دیا اور یہ کتابیں سیرت نگاری کے میدان میں رائج ہوگئیں۔ بعد میں تقریباً ایک ہزار بلکہ گیارہ سو سال تک کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ واقدی کے بارے میں محدثین کیا کہتے تھے۔ ابن اسحاق کے بارے میں محدثین کو کیا تامل تھا۔ فلاں اور فلاں کے بارے میں محدثین کو کیوں تامل تھا۔ جب سر ولیم میور نے یہ کتاب لکھی اور اس میں ان تمام مآخذ کی کمزور باتوں کو جمع کیا اور ان کی وہ تعبیریں کیں جو مسلمانوں کے لئے دل آزار تھیں تو بہت سے مسلمان اہل علم کو ان قدیم سیرت نگاروں کے بارہ میں محدثین کے تحفظات ایک بار پھر یاد آئے۔ دوسرے متعدد سیرت نگاروں کی طرح سرسید کو بھی دوبارہ یہ خیال ہوا کہ اس پورے ذخیرے کا اب

از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور یہ طے کرنا چاہئے کہ سیرت کے ان قدیم مصادر میں کون کون سی چیزیں قابل اعتماد ہیں اور کون سی چیزیں نا قابل اعتماد ہیں۔جو قدیم مضامین محل نظر سمجھے جاتے تھے اور نسبتاً مبالغہ آمیز تھے ان کو دہرانے سے اجتناب کیا جائے اور اب سیرت کی کتابوں میں صرف وہ مضامین شامل کئے جائیں جو قابل اعتماد ہیں اور جن پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اردو خطبات جو 1872 کے لگ بھگ سرسید کی انگلستان سے واپسی کے بعد شائع ہوئے۔ان کا انگریزی ترجمہ 1870 میں سرسید کی موجودگی میں لندن میں ہی چھپ گیا تھا۔ یہ بارہ خطبات ہیں جن میں انہوں نے سر ولیم میور کی کتاب کی پہلی جلد کا جواب دیا ہے۔ولیم میور نے کئی ایسی باتیں دہرائی تھیں جو پہلے مستشرقین ایک عرصہ سے کہتے چلے آرہے تھے۔ لیکن سر ولیم میور نے پہلی مرتبہ ان کے لئے کچھ شواہد اور دلائل بھی فراہم کئے تھے۔ایک بڑی بات یہ کہی تھی کہ عربوں کا یہ جو دعویٰ ہے کہ حضورﷺ حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں سے ہیں، یہ دعویٰ غلط ہے۔قریش کا کوئی تعلق حضرت اسماعیل سے نہیں ہے اور یہ دعویٰ انہوں نے محض اپنی سیادت قائم کرنے کے لئے کر دیا تھا۔سرسید کا پہلا خطبہ اسی مضمون کے بارے میں ہے۔انہوں نے ایسے دلائل اور شواہد سے جو غیر مسلموں کو مطمئن کر سکیں، یہ ثابت کیا کہ عربوں میں سے قریش کا تعلق بنی اسماعیل سے ہے اور بنی اسماعیل ہی کی اولاد ہے جس کو قریش اور دوسرے قبائل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک خطبہ انہوں نے مصادر سیرت پر لکھا اور اس اہم مسئلہ پر بحث کر کے بتایا کہ مصادر سیرت کیا کیا ہیں۔ان میں سے کون سے مصادر قابل اعتماد ہیں اور کیوں قابل اعتماد ہیں۔کون سے مصادر مسلمانوں میں نا قابل اعتماد سمجھے گئے اور کیوں۔اس گفتگو میں انہوں نے محدثین کی آرا کا حوالہ نہیں دیا۔اس لئے کہ محدثین کی آرا کا حوالہ تو مسلمانوں کے لئے قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔غیر مسلموں کے لئے محدثین کی آرا کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ایک غیر مسلم کے لئے امام بخاری اور واقدی دونوں ایک ہی سطح کے لوگ ہیں۔ایک ناواقف کی نظر میں امام احمد بن حنبل اور ہشام کلبی ایک ہی درجہ کے آدمی ہیں۔ایک کمزور اور بے اعتبار اور ایک قوی ترین اور مستند ترین راوی دونوں برابر ہیں۔اس لئے انہوں نے محدثین کی رائے کے بجائے واقعاتی دلائل کے ساتھ اور ان کی تحریروں کی اندرونی شہادتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

کہ یہ یہ شواہد اور مصادر قابل اعتماد ہیں اور یہ نا قابل اعتماد ہیں۔

سر ولیم میور نے یہ بھی لکھا تھا کہ جو بیت اللہ مکہ میں بنایا گیا ہے یہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جب آدمی انکار پر اتر آتا ہے تو پھر ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے دعویٰ کیا کہ مکہ میں موجود بیت اللہ حضرت ابراہیم کے بہت بعد میں بنایا گیا تھا جس کو بعد میں قریش اور عربوں نے حضرت ابراہیم و اسمٰعیلؑ سے منسوب کر دیا۔ چنانچہ اس بے بنیاد اور فضول دعویٰ کی تردید کی خاطر سر سیّد نے ایک باب بیت اللہ پر لکھا ہے اور بہت تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ اس کے بارے میں دلائل اور شواہد انہوں قدیم کتابوں سے، مغربی مصنفین کی تحریروں سے، جغرافیہ کی کتابوں، قدیم مذہبی کتابوں اور قدیم ادب کی کتابوں سے جمع کئے۔ ان سب کو ایک منطقی ترتیب سے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے ایک ایک کر کے بارہ خطبات لکھے اور ان غلط فہمیوں کی تردید کر دی جو سر ولیم میور نے پھیلائی تھیں۔

ایک بڑی اہم بات جو سر ولیم میور نے لکھی تھی اور جس کی تردید کے لئے سر سید نے ایک پورا باب لکھا وہ عرب کے جغرافیہ کے بارے میں تھا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ عرب کا جغرافیہ سیرت کا ایک حصہ بنتا ہے، لیکن ولیم میور کی اس کتاب کے حوالے سے اس کی اہمیت یہ تھی کہ ولیم میور نے بعض واضح جغرافیائی حقائق کو بھی جھٹلایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے بارہ میں تورات میں ایک جملہ آیا ہے۔ قدیم تورات اور عبرانی زبان میں کیا ہے یہ تو مجھے علم نہیں لیکن تورات کے عربی ترجمہ میں وہ جملہ اس طرح نقل ہوا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ وہ جملہ اس طرح ہے کہ 'جاء الرب من سينا وطلع لهم من ساعير وتلألأ لهم من جبال فاران' کہ تمہارا پروردگار کوہ سینا سے ظاہر ہوا اور ساعیر کی پہاڑیوں پر وہ طلوع ہوا اور بالآخر فاران کی پہاڑیوں سے اس کا جلوہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ اب یہ صراحتاً رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیشین گوئی ہے۔ فاران ہی پر حضور پر نزول وحی ہوا۔ فاران ہی پر حضور تشریف فرما تھے جب وحی کا آغاز ہوا۔ یہ ایک ایسی واضح اور دوٹوک بات تھی جس کا انکار کرنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن سر ولیم میور نے اس کا بھی انکار کیا۔ اس نے کہا کہ جو فاران مکہ میں بتایا جاتا ہے، تورات کے فاران سے وہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ تورات کے فاران سے شام کی فلاں پہاڑی مراد ہے۔ کہنے کو

آپ جو چاہیں کہہ لیں۔ ہر چور اور جھوٹا آدمی بھی اپنی موقف کو بظاہر مدلل انداز میں بیان کرتا ہے، آپ عدالتوں میں جا کر دیکھیں ہر شخص اپنے موقف کو ایسے بیان کرتا ہے جیسے اس سے بڑھ کر دلائل نہیں ہو سکتے۔

اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے سرسید نے شام کے جغرافیہ کا جائزہ لیا۔ قدیم مآخذ میں شام کے جغرافیہ کا جو ذکر آیا ہے اس کو تلاش کیا۔ وہ خود انگریزی سمیت کوئی یورپی زبان نہیں جانتے تھے۔ لوگوں سے کام لیتے تھے۔ ترجمہ کرواتے تھے اور اس کے پیسے دیتے تھے۔ پیسے ان کے پاس ہوتے نہیں تھے۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری باقاعدہ فنڈ نہیں تھے۔ ذاتی قرضے لے لے کر اور اپنی جائداد فروخت کر کے یہ کام کر رہے تھے۔ اب آپ اُس مشکل کا اندازہ کریں جس سے سرسید گزر رہے ہوں گے۔ ان حالات کے باوجود وہ تحقیق کا یہ سارا کام کرتے رہے۔ پھر دلائل سے انہوں نے ثابت کیا کہ تورات میں جس فاران کا تذکرہ ہے یہ وہی فاران ہے جو مکہ میں ہے۔ جب یہ باب مکمل کیا تو خوشی کے مارے گویا بے حال ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دوست نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا کہ اگر تم ہوتے تو اس کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے اور پھر اپنے زمانے کے بعض لوگوں پر تنقید کی ہے کہ فلاں فلاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ یہ کام کر سکتے۔ پھر شکایت آمیز انداز میں لکھا: لیکن پھر بھی میں کافر کا کافر ہی رہوں گا اور یہاں کے مولوی مجھے پھر بھی کافر ہی کہیں گے۔

یہ کتاب انہوں نے انگلستان میں اپنے خرچ پر شائع کرائی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک دو کتابیں اور بھی جو انگریز مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اور اسلام کے حق میں تھیں یا سیرت پر نسبتاً معتدل اور موافقانہ نقطہ نظر کے مطابق تھیں وہ بھی اپنی دلچسپی اور اہتمام سے شائع کرائیں۔ ان میں سے ایک کتاب ہے Apology for Muhammad and the Quran۔ یہ کتاب عام ملتی ہے۔ لاہور میں اس کا ترجمہ بھی چھپا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کسی نے ان سے کہا کہ یہ کتاب ایک انگریز نے لکھی ہے اور بہت ہمدردانہ نقطہ نظر سے لکھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی دوست کی مدد سے اس کے مضامین پڑھوا کر سنے۔ جب سنے تو ان کو پسند آئے اور اپنے خرچ پر اس کتاب شائع کرایا۔ اس کے چار سو نسخے ہندوستان بھیجے اور اپنے ایک دوست کو لکھا کہ تمام بڑے بڑے انگریز افسران اور انگریزی خواں

مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس کا ایک ایک نسخہ میری طرف سے تحفے میں بھیج دو۔

سرسید یہ چاہتے تھے کہ سرولیم میور کے جواب میں لکھی جانے والی یہ کتاب بھی چار حصوں میں ہو اور ولیم میور کی کتاب کے چاروں حصوں کا جواب ہو۔ لیکن جیسے لکھنا چاہتے تھے ویسے نہیں لکھ سکے۔ وسائل کی کمی تھی۔ معاونین کا فقدان تھا۔ اس لئے چند مسائل پر تو لکھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک بارہ سال ہوئی۔ اس وقت تک کے واقعات پر ولیم میور کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ سرسید نے بھی حضور کی بارہ سال تک کے بارے میں جو کچھ ولیم میور نے لکھا تھا اس کا جواب دیا۔ ایک جگہ ایک خط میں لکھا ہے کہ لکھنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں، لیکن یہ یہ مشکلات ہیں۔ اور پھر مشکلات کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا لیکن روپیہ کہاں سے آئے گا۔ یوں خدا خدا کر کے ایک جلد مکمل ہوئی، مزید لکھ نہ پائے اور واپس آ گئے۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد وہ شاید اس کتاب کو مکمل کر سکتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد بھی وہ ستائیس سال زندہ رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں اس کتاب کو مکمل نہیں کر سکے۔ شاید وہ کتابیں اور مآخذ یہاں دستیاب نہیں تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے بہت سے لوگوں سے مدد لی۔ نواب محسن الملک کو بھی لکھا۔ مولوی چراغ علی کو بھی لکھا۔ کئی مضامین کے بارے میں ان سے مواد منگوایا۔ مثلاً ایک جگہ لکھا کہ معجزات کے بارے میں فلاں فلاں کتاب میں جو کچھ ہے اس کی ایک مکمل فہرست بنا کر مجھے بھیج دیں۔ محدثین نے کن روایات کو قابل قبول کہا اور کیوں کہا، کن روایات کو ناقابل قبول کہا اور کیوں، یہ دونوں الگ الگ فہرستوں کی شکل میں مجھے بھیج دو۔ اس طرح کا کام وہ اپنے دوستوں سے لیا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ شق صدر کے بارے میں جو کچھ قدیم کتابوں میں ہے وہ سارا نقل کروا کر مجھے بھیج دو۔ اس زمانے میں آپ کو پتہ ہے کہ فوٹو اسٹیٹ نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارا کام دستی کرنا ہوتا تھا۔ پورا پورا دن آٹھ دس صفحات کی نقل میں لگ جاتا تھا۔ اب تو یہ کام ایک منٹ میں ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے بارہ ابواب مکمل کر لئے۔ ان بارہ ابواب کی الگ الگ تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ تاہم ان کے عنوانات کی فہرست دینا شاید مفید ہوگا:

خطبات احمدیہ کے اہم مندرجات

۱۔ عرب کا جغرافیہ، اس بات کا ثبوت کہ فاران مکہ ہی کے پہاڑ ہیں۔

۲۔ عربوں کے رسوم ورواج: اسلام کی اصلاحات

۳۔ مذاہب عرب قبل از اسلام

۴۔ یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام سے فائدہ ہوا یا نقصان

۵۔ قدیم مصادر سیرت کا جائزہ

۶۔ روایات مذہبی کا معتبر اور غیر معتبر ہونا

۷۔ قرآن مجید

۸۔ تاریخ مکہ و اجداد آں حضرتؐ

۹۔ نسب نامہ آن حضرت

۱۰۔ بشارات در تورات و زبور

۱۱۔ شق صدر اور معراج

۱۲۔ بارہ سال کی عمر تک حضورؐ کے حالات

ایک چیز جو سر سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ کی اور ان سے پہلے کسی نے اس انداز سے نہیں کی۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے قدیم کتابوں کا خاص طور پر تورات اور زبور کا براہ راست مطالعہ کیا اور ان کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بشارات تھیں ان کو جمع کیا اور اس مواد کو ایک مرتب انداز میں پیش کیا۔ اس کتاب کے بڑے اثرات ہوئے۔ لوگوں نے اس اسلوب کو اپنایا۔۔ سیرت کے مآخذ کی تنقید ہر سیرت نگار نے کی۔ مغربی اہل علم کے حوالے اب ہر سیرت نگار دیتا ہے۔ مغربی اہل علم کے حوالے اب مستند سیرت نگاروں کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ تورات اور انجیل جیسی قدیم کتابوں سے سیرت کے مضامین کی تائید اب سب کرتے ہیں۔ عرب کے جغرافیہ کی تحقیق سب نے شروع کر دی ہے۔ اسلامی تمدن کو سیرت کا حصہ سب سے پہلے سر سید نے قرار دیا تھا۔ اب ہر سیرت نگار اسلامی تمدن کا تذکرہ کرتا ہے۔ مشرقی علوم کا مغربی اسلوب سے مطالعہ اب ایک عام رواج ہو گیا ہے۔ سر سید سے پہلے یہ انداز کسی نے نہیں اپنایا تھا۔ یہ وہ کام ہے جو سر سید احمد خاں نے کیا اور اس کے گہرے اثرات ہوئے۔ دبستان سر سید کے دو بڑے نام بہت مشہور ہیں جن کا تذکرہ کل ہوگا۔ ایک علامہ شبلی نعمانی جو کافی عرصہ تک سر سید

کے ساتھ علی گڑھ میں رہے اور دوسرے قاضی سلیمان منصور پوری جنہوں نے رحمت للعالمین کے نام سے کتاب لکھی تھی۔

یہ بات نامکمل رہے گی اگر ایک اور بڑی شخصیت کا تذکرہ نہ ہو جنہوں نے سرسید سے غالباً ذرا پہلے یا اسی زمانے میں یہ محسوس کیا کہ ان کی ذمہ داری بھی اس ضمن میں آگے بڑھ کر پیش کرنے کی ہے۔ انہوں نے بھی آگے بڑھ کر قدم اٹھایا۔ کم از کم اس وقت نتائج کے لحاظ سے ان کا کام بڑا نمایاں اور بہت موثر ثابت ہوا۔ وہ بھی سرسید تھے۔ میری مراد ہے سرسید امیر علی۔ سرسید امیر علی بنگال کے رہنے والے تھے۔ عربی فارسی اچھی طرح جانتے تھے۔ وکیل تھے۔ وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے پہلے مسلمان جج اور پریوی کونسل کے بھی پہلے مسلمان جج تھے جو انگلستان بلکہ سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ سرسید امیر علی انگلستان میں رہتے تھے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان کو بھی بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی A Critical Appraisal of the Life and Achievments of Muhammad، یہ کتاب ایک ہی جلد میں دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصہ میں سیرت کا بیان تھا اور دوسرے حصہ میں رسول اللہ ﷺ کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ اسلامی تمدن، شریعت اور حضور علیہ السلام کی تعلیم اور آپؐ کے کارناموں کی تفصیل دی گئی تھی۔ یہ کتاب انہوں نے انگلستان میں بیٹھ کر لکھی۔

سرسید امیر علی خود انگریزی قانون کے اتنے بڑے ماہر تھے کہ کلکتہ ہائی کورٹ بلکہ کسی بھی ہائی کورٹ کے پہلے مسلمان جج تھے۔ انگریزی زبان کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی زبان بڑی عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔ انہوں نے وہی طرز استدلال اپنایا جو مغربی دنیا میں رائج تھا۔ مغربی مآخذ تک ان کی براہ راست رسائی تھی جو کہ سرسید کی نہیں تھی۔ سرسید احمد خان کو اگر کوئی مترجم غلط ترجمہ کر کے دیتا تو ان کو غالباً احساس بھی نہ ہوتا کہ کہاں کہاں مترجم نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ ایسا ہوا بھی ہو۔ یہ تو تحقیق کرنے سے ہی پتہ چلے گا۔ سرسید کو بہت سی صورتوں میں شاید اس کا اندازہ نہ ہوا ہو کہ مترجم نے سرسید کو صحیح بات پہنچائی کہ نہیں پہنچائی۔ سرسید امیر علی کو یہ مشکل درپیش نہیں تھی۔ ان کو براہ راست انگریزی مآخذ اور مغربی مصنفین کی کتابوں تک رسائی حاصل تھی اور انہوں نے ان کتابوں کی رہنمائی میں یہ

کتاب لکھی۔ سرسید احمد خان اور سید امیر علی دونوں کا کام انتہائی عقیدت اور عشق رسول پر مبنی ہے۔ ذات رسالت مآب سے وابستگی دونوں کے کام میں نظر آتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے جو کچھ صلہ ملے گا وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

لیکن بطور سیرت کے ایک ادنیٰ طالب علم کے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ سرسید کے بہت سے بیانات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کئی جگہ انہوں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو اسلامی نقطہ نظر کے مطابق نہیں ہیں۔ پھر مرعوبیت کی جو فضا ہے وہ سرسید کے ہاں سید امیر علی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ سید امیر علی ایک اعلیٰ عدالت کے جج تھے۔ قانون دانی میں ان کا مقابلہ انگریزوں کے صف اول کے قانون دانوں سے رہتا تھا۔ سرسید ایک عام شہری تھے۔ اس لئے جو اعتماد اور confidence سید امیر علی کی تحریروں میں ہے وہ خطبات احمدیہ کے قلم میں نظر نہیں آتا۔ یہ ایک ناچیز طالب علم کا ایک احساس ہے جس سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے سرسید امیر علی کی کتاب میں بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن سے اتفاق کرنا بڑا دشوار ہے۔ سید امیر علی کی یہ کتاب 1873 میں قائداعظم اور علامہ اقبال کی پیدائش سے بھی پہلے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے کئی ایڈیشن انہوں نے مرتب کیے۔ ہر ایڈیشن میں مزید اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ آخری ایڈیشن جو سید امیر علی کی زندگی میں شائع ہوا وہ غالباً 1909 میں Spirit of Islam کے نام سے شائع ہوا۔ اور اب یہ کتاب اسی نام سے مشہور ہے۔ اور بار ہا طبع ہو چکی ہے۔

یہ دو بڑے کام تو وہ تھے جو انیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں سیرت کا کوئی تذکرہ یا تاریخ علم سیرت پر کوئی کام ان دونوں کتابوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ سرسید کے خطبات اور سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام دونوں کا تقابل ایک اہم اور دلچسپ مضمون ہے جو کسی محقق کی توجہ کا مستحق ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میرا تاثر یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی سید امیر علی کی کتاب زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوئی۔ یہ کتاب یورپ میں اسلام کا سب سے پہلا، سب سے زیادہ موثر اور سب سے کامیاب دفاع تھا۔

سرسید کی کتاب کے برعکس یہ ایک مکمل کتاب تھی۔ سرسید کا سارا زور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دینے پر رہا۔ مثبت طور پر اسلام کا موقف مدلل انداز میں بیان کرنے کا

فریضہ سید امیر علی نے انجام دیا۔

پھر سرسید نے اصل کتاب اردو میں لکھی، اور کسی سے اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ لیکن ترجمہ ترجمہ ہی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سید امیر علی کی کتاب براہ راست انگریزی میں لکھی گئی، اور انگریزی قارئین کے مزاج اور نفسیات کا پورا لحاظ کر کے لکھی گئی۔ مزید برآں سرسید کی کتاب میں بہت سی معلومات بالواسطہ نقل کی گئیں، جبکہ سید امیر علی کا سارمواد ان کے اپنے اور براہ راست مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا خطبات احمدیہ کا سارا زور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دینے پر ہے جس بات کا جواب نہیں بنتا وہاں سرسید متعلقہ حدیث یا روات کو غیر مستند کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ چنانچہ آغاز ہی میں ابن اسحاق، ابن ہشام، واقدی، طبری کو رطب و یابس کا انبار قرار دے کر مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس سب کے باوجود سرسید کے نزدیک ولیم میور کی کتاب 'عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ' ہے۔

ان دو اہم کتابوں کے علاوہ اور بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے کتابچے سیرت اور متعلقات سیرت پر برصغیر کے مختلف علاقوں اور یہاں کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے۔ ان میں سے معراج ناموں اور میلاد ناموں کی طرف مختصر اشارہ میں کر چکا ہوں۔ جو کتابیں عربی سے ترجمہ ہوئیں ان کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ خصائص نبوت پر بھی برصغیر میں بہت سا کام ہوا۔ معجزات پر بہت سی چیزیں لکھی گئیں۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی جن کا پہلے تذکرہ آچکا ہے، انہوں نے بھی معجزات پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے تین سو معجزات کا ذکر کیا تھا۔ کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضور کے معجزات کی تعداد تین ہزار ہے۔ ان میں سے وہ صرف تین سو معجزات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں، میرے علم میں نہیں۔ کم از کم میں نے شائع شدہ نہیں دیکھی۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے رسائل اردو اور متعدد علاقائی زبانوں میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے۔ خود سرسید نے قبل ازیں سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی جس کو بعد میں انہوں نے ایک اعتبار سے disown کیا اور اس سے لاتعلقی ظاہر کی۔ یہ کتاب انہوں نے 1857 سے پہلے لکھی تھی جس میں معجزات وغیرہ کی تفصیل بہت اہتمام

سے بیان کی تھی۔ یہ کتاب جس کا نام جلاء القلوب بذکر المحبوب تھا ۱۸۴۲ (۱۲۵۸ھ) میں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک طرح کا مولود نامہ تھا جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوت سے بھر پور استفادہ کیا گیا تھا۔ بعد میں جب انہوں نے مآخذ پر تحقیق اور تنقید کی، اور ان کے سامنے مآخذ سیرت کی تنقید کا سوال آیا تو ان کو غالباً یہ احساس ہوا کہ ان کی اس کتاب میں بہت سے مآخذ کمزور ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے اس کتاب سے لاتعلقی ظاہر کی اور اس سے برات کا اظہار کیا۔ اُسی زمانہ میں اسی طرح کی ایک کتاب مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی تھی جس کو مولانا حالی بعد میں بھی own کرتے رہے۔ اس میں نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مستند بیان تھا بلکہ پادری عمادالدین کی کئی گمراہیوں کی تذکرہ بھی تھا۔

پادری عمادالدین اور دوسرے غیر مسلم مؤلفین نے جو کتابیں لکھیں ان کے جواب میں بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے رسائل لکھے گئے۔ ایک زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے زمانے میں ایک قوامیس کتب تیار کرائی تھی جو کئی جلدوں میں تھی۔ اس میں اُس زمانے تک چھپی ہوئی اردو کی مطبوعہ کتب کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اس فہرست میں سیرت پر تقریباً چار سو کتابوں کا تذکرہ تھا جن میں دو سو کتابیں معجزات وغیرہ پر تھیں اور دو سوا دو سو کے قریب میلاد نامے تھے۔ ان میں سے بہت سے میلاد نامے اسی دور میں لکھے گئے جو اٹھارویں صدی کے اواخر سے انیسویں صدی کے اواخر تک کا زمانہ تھا۔

پھر انیسویں صدی کے اواخر میں سید امیر علی اور سر سید احمد خان اور ایسے حضرات کی کتابوں نے ہمارے سامنے سیرت نگاری کا ایک نیا اسلوب رکھا جو زبان کے اعتبار سے سادہ، اسلوب کے اعتبار سے دلنشین، دلائل کے اعتبار سے موثر اور اپنی پیشکش کے اعتبار سے انتہائی عالمانہ اور ادیبانہ تھا۔ یہ اسلوب جب متعارف ہوا، اور پھر شبلی نے اس اسلوب کو غیر معمولی بلندیوں تک پہنچادیا، جس کا تذکرہ اگلے خطبہ میں آرہا ہے، تو اس سے وہ قدیم اسلوب متروک ہوگیا جس پر لوگ پہلے سیرت لکھا کرتے تھے۔ جس میں زیادہ بیان معجزات کا اور ان امور کا ہوتا تھا جن کا تعلق روحانیات سیرت سے ہے۔ جس کا سیرت اور تاریخی واقعات سے نسبتاً کم تعلق ہوتا تھا۔

اس گفتگو کی تکمیل کل ہوگی ان شاء اللہ۔

☆

سوال و جواب

جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ ابن اسحاق اور واقدی کے بارے میں محدثین نے کلام کیا ہے اور ان مآخذ کو مشکوک گردانا ہے تو اس کے بعد علما اور تاریخ دان حضرات کن مآخذ سے استفادہ کرتے رہے؟ کیا ان حضرات کے کام کو مشکوک قرار دینے سے مسلمانوں کے علمی کام کا بڑا حصہ مشکوک نہیں ہو جائے گا؟

اصل میں بات یہ ہے کہ سیرت کا جو بنیادی ذخیرہ ہے وہ تو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے پوری طرح ثابت ہے۔ واقدی اور ابن اسحاق نے جزوی تفصیلات بہت کثرت سے دی ہیں۔ ان تفصیلات کے بارے میں ہر صاحب علم اپنی تحقیق کے بعد رائے قائم کرتا ہے۔ آپ نے تحقیق سے ایک بیان کو درست سمجھا اور اس کو قبول کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ لیکن ممکن ہے کہ دوسرا محقق اس بیان کو درست نہ سمجھے۔ یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔ اس سے ابن اسحاق اور واقدی کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوگی۔ واقدی نے جو بڑا اور اصل کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے غزوات نبوی کے مقامات کو خود جا کر دیکھا۔ خود جا کر ان غزوات کے مقامات کا نقشہ بنایا۔ اس کام کو آج تک کسی نے مشکوک قرار نہیں دیا۔ یہ کام آج تک مستند مانا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جزوی طور پر اختلاف رائے رہا ہے وہ آئندہ بھی رہے گا۔

میں ذاتی طور پر نہ تو واقدی کے سارے کام کو بے اعتبار قرار دے کر دریا برد کرنے کے حق میں ہوں اور نہ ہی واقدی کے سارے کام کے درجہ استناد کو امام بخاری کے کام کے برابر سمجھتا ہوں۔ امام بخاری اور ان جیسے دوسرے اکابر محدثین کا کام استناد کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اونچا ہے۔ کوئی بھی بیان اگر اس کے مقابلہ میں آتا ہے اور بخاری اور مستند محدثین کی روایات سے متعارض ہے تو اس پر بار بار غور کرنا پڑے گا۔ اس لئے واقدی

اور دوسرے سیرت نگاروں کے بارہ میں توازن سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نہ کلی طور پر رد کرنا مناسب ہے اور نہ ہی کلی طور پر اس کو سو فیصد مستند سمجھنا درست ہے۔

☆

یہ کیا وجہ ہے کہ برصغیر میں سیرت پر جو کام ہوا ہے وہ سندھ اور ایک دو علاقوں تک محدود رہا؟

شروع شروع میں سیرت نگاری کا کام سندھ تک اس لئے محدود رہا کہ اس زمانے میں سندھ کے لوگ تعلیم وتدریس کے لئے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مشرق وسطیٰ کے علمی مراکز میں آیا جایا کرتے تھے اور یہاں کی علمی زبان بھی ایک طویل عرصہ تک عربی رہی۔ اس لئے اہل سندھ کے لئے نسبتاً علمی اور تحقیقی کام آسان تھا۔ وہاں عرب دنیا سے کتابیں بھی آیا کرتی تھیں اور اہل علم بھی آیا کرتے تھے۔ جب برصغیر کے مسلمانوں کا مشرق وسطیٰ سے سیاسی اور انتظامی تعلق کٹ گیا اور افغانستان اور وسط ایشیا سے یہ تعلق قائم ہوگیا تو پھر سابقہ علمی روابط کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ پھر وہ مضامین زیادہ آنے لگے جن سے افغانستان اور وسطی ایشیا کے اہل علم کو زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ ان جغرافیائی اور سیاسی اسباب کا نتیجہ تھا۔

☆

آپ نے برصغیر میں سیرت نگاروں کی کاوشوں کا ذکر کیا تو اس میں کتنا فیصد ایسا ہے جس کو عرب دنیا میں بھی سراہا گیا؟

عرب دنیا میں برصغیر کے کئی کاموں کو سراہا گیا۔ ان میں سے دو کا تذکرہ میں کل کروں گا جس میں ایک تو علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی ہے اور دوسرا کام قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب 'رحمت للعلمین' ہے۔ ان دونوں کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر کے کئی اہل علم کے کام کا عرب دنیا میں اعتراف ہوا ہے۔ ابھی میں نے شیخ رشید رضا کی مثال دی تھی جنہوں نے علم حدیث میں برصغیر کے علما کے کام کو قابل قدر اور قابل احترام قرار دیا ہے۔

آپ نے سرسید کا بہت اچھا ڈھانچہ پیش کیا ہے......ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ منکر حدیث ہیں تو یہ بات کس حد تک ٹھیک ہے؟

میں نے سرسید کا ڈھانچہ پیش نہیں کیا، سرسید کے کام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ بات کہ وہ منکر حدیث تھے یا نہیں تھے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے اہل علم کی بڑی تعداد حتی کہ ان کے اپنے رفقاء کو بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مذہبی خیالات کمزور دلائل کی بنیاد پر اختیار کئے گئے تھے۔ ان خیالات سے مجھے بھی اتفاق نہیں ہے۔ سرسید کے بہت سے مذہبی خیالات ایسے تھے جو صرف مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ تھے۔ اس لئے ایک حد تک ان کو معذور بھی سمجھا جانا چاہئے۔ بہر حال میری ذاتی رائے میں سرسید ہوں، سید امیر علی ہوں یا انیسویں صدی کے دوسرے اہل علم، ان کے بارے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ان کے کام کے جو مثبت پہلو ہیں ان کو سراہنے میں کسی بخل اور تامل سے کام نہیں لینا چاہئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ سیرت نگاری اور دفاع سیرت کے سلسلہ میں ان کا یہ کام بڑے نیک جذبے پر مبنی تھا۔ اس کا اعتراف ہونا چاہئے۔

☆

سر ولیم میور کی کتاب کی بقیہ تین جلدوں کا جواب کیوں نہیں دیا جا سکا؟ اب اگر کوئی ان کا جواب دینا چاہے تو آپ اور جناب وقار مسعود صاحب کس کس نوعیت کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں؟

اگر کوئی اس کا جواب دینا چاہے تو وقار مسعود صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس کام میں تعاون کے لئے تیار ہیں تو بسم اللہ۔ میں اپنی سطح پر علمی مشورہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس کام کے لئے خاصے وسیع مادی وسائل اور انتظامی سہولتوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ وسائل اور سہولتیں اگر دستیاب ہوں تو آج بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ، جس طرح کہ اردو ترجمہ میں ہے، لکھا ہے کہ میں متوجہ الی اللہ بیٹھا ہوا تھا کہ حضور ﷺ کی روح تشریف لے آئی اور مجھ پر چادر ڈال دی اور کہا کہ حسن حسین آئے ہیں، مجھ کو خواب میں قلم عطا کیا۔ کیا یہ باتیں صحیح ہیں؟

یہ تو خواب کا ذکر ہے اور خواب کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ اگر شاہ ولی اللہؒ نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور حضرات حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے آپ کو قلم عطا کیا تو یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے۔

☆

ایک عرصہ تک مجدد صاحب اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درمیان غلط فہمی رہی۔ وہ کون سا معاملہ تھا؟

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے ایک مرتبہ اپنے صوفیانہ تجربات کو ضبط تحریر میں لا کر اپنے شیخ خواجہ باقی باللہ کو بھیجا تھا۔ حضرت مجدد کا یہ خط اپنے شیخ اور مربی سے رہنمائی اور کسب فیض کے لئے تھا۔ ان بیانات کو، جن میں انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات بیان کئے تھے، بعض لوگوں نے غلط انداز سے تعبیر کر کے شیخ احمد سرہندی کے خلاف رائے عامہ بنانے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں حکمرانوں کے بعض قریبی لوگوں کو بھی چٹھیاں لکھ لکھ کر بھیجیں۔ جہانگیر کو بھی یہ بات پہنچائی گئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو بھی یہ بات پہنچا دی گئی۔ بعد میں جب مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زبان سے اپنا موقف بیان کیا اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ساتھ براہ راست ملاقات ہوئی تو غلط فہمی دور ہو گئی۔

☆

بابا رتن ہندی کون تھے؟ کیا انہوں نے سیرت پر کوئی کام کیا ہے؟

بابا رتن ہندی کے نام سے ساتویں صدی ہجری میں ایک شخص سامنے آیا۔ یہ شخص جنوبی ہندوستان کے کسی علاقے غالباً مدراس وغیرہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کی عمر سات سو سال ہے اور اس نے اپنی نوجوانی میں عرب جا کر رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اس لئے وہ صحابی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے بہت سے خوش گمان اور خوش عقیدہ لوگ اس شخص کے عقیدت مند ہو گئے۔ علامہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

جب بابا رتن ہندی نے یہ دعویٰ کیا تو بہت سے لوگ اس کے عقیدت مند ہو گئے۔ اس نے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کرنی شروع کر دیں جو لغویات کے زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن محدثین نے ان سب اغویات کی تردید کی اور سب اہل علم نے بالاتفاق کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس کا کوئی تعلق رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ یا صحابیت سے نہیں ہے۔

ایک اور سوال عربی میں آیا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ سوال اردو میں لکھیں۔ محفل اردو کی ہے تو عربی اور دوسری زبانوں میں سوال پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پوچھا ہے کہ جن سرسید کا آپ نے ذکر کیا ہے کیا یہ وہی سرسید ہیں جن کا ذکر پاکستان اسٹڈیز کی کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے۔ جی ہاں! یہ وہی سرسید ہیں۔

☆

سید امیر علی کی انگریزی کتاب کا نام بتائیں؟

ان کی انگریزی کتاب اب Spirit of Islam کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی کئی بار ہوا ہے۔ اس کتاب سے استفادہ کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ یہ کتاب آج سے سو، سوا سو سال پہلے کے ماحول میں لکھی گئی تھی، بلکہ سوا سو سال سے بھی زیادہ، 1873ء میں یہ پہلی بار چھپی تھی۔ اُس زمانے کے لحاظ سے جو خیالات مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے ان خیالات کا اظہار ہے۔ بعض چیزیں صحیح ہیں اور اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہیں۔ بعض بعض بیانات قابل غور ہیں اور محل نظر ہیں۔ سید امیر علی کی ہر بات سے

اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی یہ کاوش اور جذبہ قابل قدر ہے اور یقیناً اللہ کی بارگاہ میں ان کو اس کا اجر ملے گا۔

☆

فتوح الشام کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ واقدی کی کتاب نہیں ہے۔ وضاحت فرمائیے کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں؟

یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا مصنف کون ہے۔ لیکن شروع سے یہ واقدی سے منسوب چلی آرہی ہے حالانکہ یہ واقدی کی نہیں ہے۔ اصل مصنف معلوم ہوتا تو واقدی سے کیوں منسوب ہوتی۔

☆

محترم غازی صاحب آپ نے مولانا مودودی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

آپ کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ مولانا مودودی 1903 میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے آج کی گفتگو میں انیسویں صدی کے آخر تک کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ مولانا مودودی کو انیسویں یا اٹھارویں صدی میں لے جاسکتے تو میں ضرور ان کا ذکر کرتا۔

مولانا مودودی کا ذکر کل دور جدید میں آئے گا۔ وہ بیسویں صدی کے آدمی ہیں۔

☆

کیا ہندوستان میں کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کو ہم زاد المعادِ ہند کہہ سکیں۔

میرے علم میں نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لکھی گئی ہو، لیکن میرے علم میں نہیں۔

☆

برصغیر یا پوری دنیا میں کوئی تنظیم، کوئی تحریک یا جماعت سیرت کی دفاع کے لئے بنی ہے؟

جی ہاں، ہمارے پاکستان کو یہ شرف بھی حاصل ہے۔ لاہور کے قریب پٹی نام کا ایک گاؤں تھا جہاں ایک سیرت کمیٹی بنی تھی۔ اس نے سیرت کے دفاع کا بیڑا اٹھایا تھا اور سیرت کے لئے بہت کام کیا تھا۔ ایسی کوئی تنظیم یا تحریک میرے علم میں نہیں کہ کسی عرب ملک میں قائم ہوئی ہو۔ البتہ آج کے حالات میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ سیرت اور صاحب سیرت کے دفاع کے لئے ادارے قائم کئے جائیں۔

☆

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شاہجہاں کے کہنے پر جو کتاب لکھی تھی اس کا نام کیا تھا؟

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ تھا جو چہل حدیث اور پند نامہ کی طرز کا تھا۔ اس میں بادشاہ کو بتایا گیا تھا کہ شریعت کی رو سے بادشاہ کے اختیارات اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یہ مطبوعہ موجود ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زندگی پر جو فاضلانہ کام پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کیا ہے اس میں انہوں نے اس کا خلاصہ دے دیا ہے۔

☆

آپ نے الفی تحریک کا تذکرہ کیا۔ اس کی ذرا مزید وضاحت کریں کہ یہ کیا ہے؟

الفی یعنی ہزار سالہ تحریک ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ بعض گمراہ لوگوں نے بادشاہ کے ذہن میں ڈال دیا تھا کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا دور ختم ہوگیا۔ آپ کی نبوت بھی نعوذ باللہ ختم ہوگئی۔ اب بادشاہ نیا دین اور نئی شریعت لے کر آئے گا۔ چنانچہ اس گمراہی سے متاثر ہوکر اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کے نام سے ایک ملغوبہ تجویز کیا تھا جس کو کچھ لوگ مانتے رہے۔ جب تک اکبر زندہ رہا اس وقت اس کا چرچا رہا اور حکومت کے چاپلوس اور خوشامدی اس ملغوبہ کا پرچم اٹھائے رہے۔ اکبر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا چرچا بھی ختم ہوگیا۔

آپ نے سرسید کے بارے میں اچھی باتیں کہیں، لیکن وہ جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ کیا وہ مسلمانوں کو انگریز کے خلاف جہاد سے منع کرتے تھے۔

بھئی میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اگر سرسید نے سیرت پر کتاب لکھی ہے تو ان کی ہر بات سے میں متفق ہوں۔ انہوں نے سیرت پر کتاب لکھی۔ بہت جذبے سے لکھی۔ اس جذبہ کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ باقی سرسید نے بہت سے ایسے کام بھی کیے جن سے مجھے اور بہت سے دوسرے حضرات کو اتفاق نہیں ہے۔ مجھے جہاد کے بارہ میں سرسید کے خیالات سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال یہ سرسید کی زندگی اور خیالات کا ایک متنازعہ پہلو ہے کہ سرسید نے جہاد کی مخالفت کی تھی۔ لیکن یہ ان کی شخصی رائے تھی۔ آپ قیامت کے دن اُن سے پوچھ لیجئے گا کہ ان کی یہ رائے کیوں تھی؟

☆

سر ولیم میور کے چند بڑے بڑے اعتراضات جو انہوں نے حضورؐ کے بارے میں کیے ہیں ان میں سے چند ایک کی وضاحت کر دیں۔

اس نے چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے اور حضور کے بارے میں ہر چیز کو منفی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تین چار اعتراضات کا میں نے اپنی گفتگو میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق بنی اسماعیل سے نہیں تھا۔ بلکہ جزیرہ عرب میں آباد قبیلہ قریش کا بھی بنی اسماعیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی سرسید نے تردید کی ہے اور جواب دیا ہے۔ ایک اعتراض یہ تھا کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس پر بھی سرسید نے مفید کلام کیا ہے۔ مزید یہ کہ جس فاران کا ذکر تورات میں ہے وہ حجاز کا فاران نہیں بلکہ شام میں کوئی علاقہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ رسول اللہ کا خاندان عرب میں نعوذ باللہ معمولی خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کے دوسرے اعتراضات ہیں۔

سر سید احمد خان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جہاں وہ مغرب نواز تھے وہاں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی بھی کی۔ لیکن کیا یہ مدرسہ اور سکول کا الگ الگ تصور پیش کر کے انہوں نے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا؟

جہاں تک علی گڑھ کا تعلق ہے اس نے تو مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا۔ انگریزی تعلیم کا چرچا تو علی گڑھ سے بہت پہلے تقریباً پچاس سال پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے کام لے کر مغربی پادریوں کی شرانگیزیوں کا جواب دینے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ آپ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سنا ہوگا۔ جنہوں نے پادری سی پی فنڈر کی تردید میں بڑا کام کیا۔ یہ کہنا میں بھول گیا کہ فنڈر ہی کے کہنے پر ولیم میور نے یہ کتاب لکھی تھی۔ پادری فنڈر ایک بہت بڑا پادری تھا جو مسلمان علما سے مناظرہ کے لئے آیا تھا۔ مسلمان علماء سے مناظرہ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ علمائے اسلام کو شکست دے کر عیسائیت کی تبلیغ کے لئے راہ ہموار کر دے گا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہندوستان کے مشہور عالم، مناظر اور بزرگ تھے۔ انہوں نے مغربی مذاہب یعنی عیسائیت اور یہودی مذہب کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ فنڈر کا مناظرہ ہوا۔ مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکست ہوئی اور وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کے فرار کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے کئی کتابیں لکھیں۔ فارسی میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب عربی میں لکھی۔ عربی کتاب کا نام اظہار الحق ہے اور مسیحیت کی تنقید پر مسلمانوں کی طرف سے لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

بعد میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے 1857 کے جہاد میں حصہ لیا۔ جہاد کی ناکامی کے بعد وہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں جب لوگوں کو پتہ چلا کہ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو ان کی شہرت ہوئی اور دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں ان کا نام معروف ہو گیا۔ ترکی کے عثمانی خلیفہ نے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے انہی دنوں پادری فنڈر بھی استنبول میں تھا اور وہاں وہ یہ کہتا پھر رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے علما کو شکست دے دی ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی آ رہے ہیں تو وہ راتوں رات وہاں

سے فرار ہو گیا اور پھر استنبول واپس نہیں آیا۔ عثمانی خلیفہ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی یہ کتاب اپنے خرچ پر شائع کرائی۔ عرب دنیا میں اور عرب دنیا سے باہر درجنوں مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مشہور معروف کتاب ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا یہ تذکرہ اس لئے بھی آیا کہ ان کے معاونین میں ایک صاحب علم اور انگریزی داں شخص ڈاکٹر وزیر خان تھے جو سر سید کی پیدائش سے بھی شاید پہلے انگلستان گئے تھے۔ وہاں سے انگریزی پڑھ کر آئے تھے۔ سر سید کا لڑکپن تھا جب سے ڈاکٹر وزیر خان نے انگریزی زبان، مغربی علوم اور بائبل کا مطالعہ شروع کر رکھا تھا اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو انگریزی زبان میں مسیحیت کا لٹریچر اور حوالے دینا ان کا کام تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ سر سید نے پہلی بار انگریزی تعلیم کو فروغ دیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ نہ انہوں نے مدرسہ اور جدید تعلیم کو الگ الگ کرنے کی کوئی بات کی۔

☆

سر سید کا تعلیمی پس منظر مذہبی تھا یا نہیں؟

اُس زمانے میں ہر شخص کا تعلیمی پس منظر مذہبی ہوا کرتا تھا۔ سر سید نے وہی روایتی تعلیم حاصل کی تھی جو بقیہ لوگ حاصل کرتے تھے۔ سر سید عربی فارسی جانتے تھے۔ فارسی میں ان کی غزلیں اور نعتیں مشہور ہیں۔ فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ سر سید اور بانی دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک ہی استاذ کے شاگرد اور ایک ہی درس گاہ کے پڑھے ہوئے تھے۔

ہمارے ہاں روایت یہ بن گئی ہے کہ یا تو ہر چیز کو آپ بالکل منفی انداز میں دیکھیں گے یا بالکل عقیدت مندانہ انداز میں دیکھیں گے۔ ضروری نہیں کہ کسی شخص کی ایک بات سے اگر آپ متفق ہوں تو اس کی بقیہ تمام باتوں سے بھی آپ اتفاق کریں۔ یا اگر آپ کو ایک بات سے اختلاف ہے تو اس کی باقی تمام باتوں سے بھی اختلاف کریں۔ سر سید کی بہت سی باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ لیکن ان کی جو باتیں قابل تعریف ہیں ان کی تعریف کرنی چاہئے۔ یہ رویہ مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ اگر آپ کسی کی ایک بات سے اختلاف کرتے ہوں تو آپ اس کی ہر بات کا انکار کر دیں۔ اور اگر کسی کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں تو اس کی

ہر بات سے اتفاق کرلیں اور اس کے ہر رطب و یابس کو درست مان لیں۔ اسلامی رویہ ہے کہ 'خذ ماصفادع ماکدر' جو اچھا ہے وہ لے لو اور جو برا ہے اس رد کردو۔

☆

کیا وجہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے باوجود آبادی کا پندرہ فیصد ہی مسلمان ہوسکا۔ بعض آرا یہ ہیں کہ اس کی وجہ ہے کہ یہاں اسلام براہ راست صحابہ کرام کی توسط سے نہیں پہنچا۔ بلکہ صوفیائے کرام اور مبلغ اس کا سبب بنے۔

اس کا جواب دینا تو بڑا دشوار ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد سے کیوں نہ بڑھ سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں وہاں آج تک مسلمان آبادی سو فیصد ہے۔ جہاں صحابہ کرام تشریف نہیں لے جاسکے وہاں مسلمان آبادیاں کہیں سو فیصد ہیں اور کہیں نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ مسلمان مبلغین نے اس معاملہ میں کوتاہی کی اور تبلیغ کا فریضہ خاص طور پر جنوب میں انجام نہیں دیا۔ محمد خان تغلق نے جو جنوب میں تبلیغ کا کام کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملہ پر توجہ دی تھی اور وہ بہت سے کام کرنا چاہتا تھا۔ یاد نہیں شہر کا نام کیا تھا، وہ دارالحکومت بھی وہاں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ محمد تغلق نے بعض علما اور صوفیا کو بھی وہاں بھیجا۔ لیکن دینی حلقوں میں اس کو ناپسند کیا گیا اور اس کے انتقال کے بعد یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو ممکن ہے آج حالات مختلف ہوتے۔

☆

سرسید کے دور کے اُس کمبخت انگریز کا پورا نام، اس کی کتاب کا نام بتادیں اور یہ کہ وہ کس صوبہ کا گورنر تھا؟

میرے خیال میں اس طرح کے غیر ثقہ الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ مصنف کا نام تھا سر ولیم میور۔ کتاب کا نام تھا Life of Muhammad۔ ۱۸۵۸ سے لے کر ۱۸۶۱

کے سالوں میں غالباً چھپی تھی۔ وہ صوبی یو پی کا لفٹیننٹ گورنر تھا۔

☆

کیا یہ بات صحیح ہے کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا کہ نہیں تھا۔ البتہ ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔

☆

آپ یہ محاضرات انٹرنیٹ پر کیوں نہیں دیتے، اپنا ویب سائٹ کیوں نہیں بناتے؟

میرے پاس ان محاضرات کو انٹرنیٹ پر دینے کے وسائل نہیں ہیں۔ پھر میرے ملفوظات اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کو انٹرنیٹ پر دیا جائے۔ یا ان کی ویب سائٹ بنائی جائے۔

☆

ایک صاحب نے پھر سرسید کے بارے میں پوچھا ہے کہ ان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے؟

میں ان کو انگریزوں کا ایجنٹ نہیں سمجھتا۔ میری ناچیز رائے میں سرسید کے خیالات سے اور ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن کسی کو انگریز کا ایجنٹ کہنا بری بات ہے۔ اس طرح کی رائے دینے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ انہوں نے ممکن ہے دیانت داری سے یہ سمجھا ہو کہ مسلمان ان حالات میں انگریز سے نہیں لڑ سکتے۔ لڑیں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے وجود اور قبضہ کو حقیقت کو مانتے ہوئے اپنے لئے راستہ تلاش کرنا چاہئے۔

☆

حضرت شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی کی سوانح عمری لکھنے

والے کسی اچھے مصنف کے بارے میں بتا دیں۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے خود ان دونوں بزرگوں کے بارہ میں کتابیں لکھی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری کتابیں پڑھیں۔ کراچی کے ایک بہت اچھے عالم، محقق اور ثقہ بزرگ مولانا سید زوّار حسین شاہ نے مجدد الف ثانی پر ایک بہت اچھی اور ضخیم کتاب لکھی ہے۔ وہ آپ ضرور دیکھیں۔

شاہ ولی اللہ کی سوانح عمری پر بہت اچھی کتابیں اردو میں چھپی ہیں؛ لیکن مجھے اس وقت ان کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔ انگریزی میں بھی شاہ صاحب پر کئی اچھی کتابیں موجود ہیں۔

☆

شاہجہاں کے لئے شیخ عبدالحق نے جو کتاب لکھی تھی کیا اس کو آج کے حکمرانوں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

آپ ڈاکٹر وقار مسعود کو اس کا ایک نسخہ بھجوا دیجئے وہ آگے دے دیں گے۔

☆

آپ نے علامہ اقبال کا فارسی شعر بیان کیا تھا، اس کا ترجمہ بیان کیجئے۔

کون سا شعر تھا؟

وہ جو مدینہ جانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

مجھے تو اپنے دوست کی منزل کی خوشبو آرہی ہے۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔

۔☆۔

گیارہواں خطبہ

مطالعہ سیرت دورِ جدید میں

گیارہواں خطبہ

مطالعہ سیرت دورِ جدید میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام صدر جلسہ محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،

سربراہ، ادارہ تحقیقات اسلامی،

محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،

برادران مکرم،

خواہران مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے 'مطالعہ سیرت دورجدید میں'۔ دورجدید سے مراد بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک کا زمانہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں کمی اور کیفی دونوں اعتبار سے سیرت النبی کے مختلف پہلوؤں پر بہت عمیق، وسیع النوع اور مختلف الاطراف کام ہوا ہے۔ برصغیر میں سیرت پر بیسویں صدی میں جن حضرات نے قلم اٹھایا، انہوں نے سیرت پاک کے ایسے ایسے نئے پہلو روشن کئے ہیں جو صرف برصغیر کے اہل علم ہی کا خاصہ تھا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں میں سیرت پاک کے اتنے عمیق، گہرے اور وسیع مطالعہ کی مثالیں نہیں ملتیں۔ شاید ابتدائی صدیوں میں برصغیر کے مسلمانوں سے جو تقصیر سرزد ہوئی تھی، اللہ کی مشیت نے اس کی تلافی کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور برصغیر کے لوگوں نے انیسویں صدی میں، اور اس سے کہیں زیادہ بیسویں صدی میں اس تقصیر کی تلافی کی، اور سیرت پاک کے

ایسے ایسے پہلو قارئین کے سامنے رکھے جن کی طرف گزشتہ تیرہ سو سال میں محققین اور سیرت نگاروں کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔

دور جدید میں مطالعۂ سیرت کے بہت سے ایسے پہلو سامنے آئے جن کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ دراصل سیرت پر کام کا آغاز تو اب ہوا ہے۔ اور اب تحقیق کی ایک نئی دنیا، تحقیق کا ایک نیا سمندر اور تحقیق کا ایک نیا عالم دریافت ہوا ہے۔ ان نئی نئی کاوشوں کو دیکھ کر بے اختیار علامہ اقبال کا وہ مشہور شعر یاد آتا ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ ۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بیسویں صدی کے اس دور میں عسکریات سیرت پر، یعنی سیرت النبی کے عسکری پہلو پر، رسول اللہ ﷺ کی حکمت حربی پر اور مختلف جنگوں میں استعمال کئے گئے طریقوں پر جو وسیع تحقیق ہوئی ہے وہ ماضی میں نہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ عسکریات سیرت پر، جس کا ابھی تذکرہ آئے گا، جن حضرات نے قلم اٹھایا ہے وہ عسکریات کے میدان کے شہسوار ہیں۔ جن کی پوری زندگیاں اسی میدان میں گزری ہیں۔ اور جس مہارت اور بصیرت کے ساتھ وہ عسکریات سیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں، وہ اوروں کے لئے بڑا دشوار ہے۔

اسی طرح سے اداریات سیرت، یعنی سیرت کے ادارتی اور انتظامی پہلوؤں پر ماضی کے محققین نے یقیناً قابل قدر کام کیا ہے۔ ان میں سے دو بڑی کتابوں کا تذکرہ پہلے تفصیل سے ہو چکا ہے۔ خزاعی کی 'تخریج الدلالات السمعیۃ' اور عبدالحیٔ کتانی کی 'التراتیب الاداریہ'۔ ان دونوں کتابوں کی خوبی یا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے سیرت، حدیث، تفسیر، اسلامی تاریخ اور متعلقہ موضوع پر دستیاب تمام لٹریچر کا جائزہ لے کر وہ معلومات یکجا کر دی تھیں جو ان مصادر میں بکھری ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کون کون سے انتظامی فیصلے فرمائے۔ آپؐ نے اپنے مبارک دور میں انتظامی طور پر کیا کیا اقدامات فرمائے۔ ان کے بارے میں معلومات بکھری پڑی تھیں۔ ان دونوں مصنفین نے یہ معلومات یکجا کر دیں۔ لیکن یہ بات کہ ان تمام چیزوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہو۔ ان کی روشنی میں نئے انتظامی اصول دریافت کئے گئے ہوں اور دور جدید کی اصطلاحات میں انتظامیات اور سیاسیات کا ایسا نقشہ مرتب کر دیا گیا ہو کہ عہد نبوی

کا پورا نظام سامنے آجائے، یہ کام بیسویں صدی میں ہوا ہے۔

اسی طرح سے سیاسیات سیرت، یعنی رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے جو فیصلے کیے، ان میں سے کون کون سی حکمتیں پنہاں تھیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف قوموں اور قبائل سے جو معاہدے کیے، ان میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ یہ تمام معاملات ایک نئے انداز اور نئے اسلوب سے بیسویں صدی کے محققین نے پیش کیے ہیں۔

بیسویں صدی کا ایک اور اہم پہلو جس کی طرف کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہوگی، وہ استشراقیات کا پہلو ہے۔ مستشرقین اور استشراق کی تاریخ تو خاصی پرانی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کے بارے میں لکھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مصنفین نے بھی سیرت پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دوسری مغربی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے صرف ایک یعنی سر ولیم میور کی کتاب کا تذکرہ گزشتہ گفتگو میں تفصیل سے آیا ہے۔ بیسیوں صدی میں بڑے پیمانے پر مغرب میں سیرت پر کام ہوا۔ بلاشبہ اس کام کے بہت سے پہلو مثبت ہیں۔ ان پہلوؤں کا اعتراف کرنا چاہیے۔ بعض پہلو یقیناً عالمانہ انداز میں بیان ہوئے۔ لیکن مستشرقین کے کام سے کئی اعتبار سے اختلاف رائے کی گنجائش بھی بہر حال موجود ہے۔ مسلمانوں کو حق ہے کہ اپنے اختلاف اور رائے کا دلیل کے ساتھ اظہار کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ بعض مغربی مصنفین نے اس انداز سے کام کیا ہے کہ ان کی نیت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور ان کو نیک نیت ماننا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں بعض بالکل بدیہی معاملات کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعض ایسی صاف اور واضح چیزوں کی انتہائی غلط تعبیر کی گئی ہے جو عقل سلیم کے بھی خلاف ہے اور علمی اصولوں سے بھی متعارض ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں ان کا تفصیلی جواب موجود ہے۔ اس کے باوجود کسی چیز کی منفی تعبیر کرتے رہنا اور رکیک اور کمزور دلائل سے کام لے کر زبردستی ایک منفی نقشہ پیش کرتے رہنا ایک ایسی ناپسندیدہ کاوش ہے جس کی وجہ سے لکھنے والے کی نیت پر شک ہونے لگتا ہے۔

بیسویں صدی میں مطالعہ سیرت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ یہ پہلو بیسویں صدی سے پہلے بہت سے محققین کے سامنے نہیں تھا۔ جب تک طباعت کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا تو بہت سی

کتابیں مخطوطات کی شکل میں تھیں۔ مخطوطات کی ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں آمد و رفت کوئی آسان اور سہل کام نہیں تھا۔ اگر مراکش اور اسپین میں کوئی علمی اور تحقیقی کام ہوا ہے۔ قرطبہ اور غرناطہ میں کسی نے کوئی کتاب لکھی ہے۔ تو اس زمانہ اور ان حالات میں لاہور، دہلی اور ملتان کے کسی سیرت نگار کے پاس اس کتاب یا اس کے قلمی نسخہ کا علم ہونا ایک مشکل بات تھی۔ اگر کسی نے لاہور میں بیٹھ کر کوئی کتاب لکھی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دہلی میں بیٹھ کوئی کام کیا ہے تو تلمسان اور فاس کے محققین کو وہ کام دستیاب ہو جائے، یہ بہت مشکل بات تھی۔ عموماً یہ مسودات اور مخطوطات حجاج کرام کے ذریعے پہنچتے تھے۔ اگر کوئی شخص حج کے لئے جاتے وقت یہاں کی کتابیں یا مخطوطات لے کر حجاز چلا گیا اور مراکش سے آنے والے کسی حاجی کو اس کا علم ہو گیا تو یہ محض اتفاقیہ بات تھی۔ اس طرح اگر اتفاقاً کوئی چیز ایک ملک سے دوسرے ملک چلی جاتی تھی تو دوسرے ممالک کے لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی، ورنہ عموماً یہ مخطوطات اسی علاقے تک محدود رہتے تھے۔ جس علاقہ میں وہ لکھے گئے ہوں یا دستیاب ہوں۔ اس وجہ سے بہت سی اہم اور قدیم کتابیں سیرت نگاروں کے لئے دستیاب نہیں تھیں۔

اب جب طباعت کا زمانہ آیا تو بڑے پیمانے پر پرانے مخطوطات ایک ایک کر کے چھپنے شروع ہوئے۔ اور دنیا کے تمام سیرت نگاروں کو وہ تمام مآخذ دستیاب ہو گئے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔ خود بیسویں صدی کے آغاز تک بہت سی کتابیں موجود نہیں تھیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ جن کا ابھی تذکرہ آتا ہے، انہوں نے کئی مرتبہ دکھ کے ساتھ یہ اظہار کیا کہ تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی۔ اگر مل جاتی تو میرے بہت سے عقدے حل ہو جاتے۔ تاریخ ابن کثیر یعنی البدایہ والنہایہ، اب دنیا کے ہر بڑے اسلامی کتب خانے میں اور لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں موجود ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا اور اہم اسلامی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جہاں البدایہ والنہایہ موجود نہ ہو۔ لیکن مولانا شبلی کو ہمارے اسی علاقہ میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اس طرح کی اور بہت سی کتابیں تھیں جو مورخین کے سامنے نہیں تھیں۔ اس لئے سیرت پر ان کا کام نسبتاً محدود تھا۔

بیسویں صدی میں ایک اور مثبت فرق بھی واقع ہوا۔ بیسویں صدی سے قبل ایک آدھ کے استثنا کے علاوہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تمام مسلم سیرت نگار مغربی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ سرسید کے بارے میں ہم نے دیکھا کہ انہوں نے دو انگریزوں کو ملازم

رکھا تھا۔ ان کی مدد سے وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ مغربی مصنفین نے کیا لکھا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ مترجم کی مدد سے کتنا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ جبکہ مترجم کو نہ اس موضوع سے کوئی ہمدردی ہو، نہ وہ اس فن کا ماہر ہو۔ اس کے برعکس آج سینکڑوں بلکہ ہزاروں سیرت نگار ہیں جو انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور تقریباً تمام مغربی زبانوں سے واقف ہیں۔ مغربی زبانوں میں سیرت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا آج لکھا جارہا ہے وہ براہ راست آج کے سیرت نگاروں کے علم میں ہے۔ ان کے لئے ان اعتراضات اور شبہات کا براہ راست جواب دینا نہایت آسان ہے۔ جو مغربی سیرت نگاروں کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔

دورِ جدید میں سیرت نگاری کے کئی نئے پہلو یا اسالیب سامنے آئے۔ کچھ حضرات نے قدیم روایتی انداز سے سیرت پر کتابیں لکھیں۔ بعض بہت وقیع کتابیں قدیم محدثانہ انداز میں ہی بیسویں صدی میں لکھی گئی۔ لیکن ایک نیا رجحان سیرت النبی کے تجزیاتی مطالعہ کا شروع ہوا جو ماضی میں کم تھا۔ رسول اللہ ﷺ بطور سربراہ ریاست، بطور سپہ سالار افواج، بطور تاجر، اس طرح سے سیرت کے الگ الگ پہلوؤں پر سیرت نگاروں نے معلومات کو جمع کیا اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ منقح کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح سے موضوعاتی انداز میں سیرت پر کام ہوا۔ سیرت کے مختلف موضوعات پر جہاں ایک کتاب لکھی جاتی تھی، اب درجنوں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

سیرت پر کلامی اور مناظراتی انداز کی کتابیں پہلے بھی تھیں۔ لیکن اب اس میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی۔ مستشرقین نے سیرت پر اتنا وسیع لٹریچر تیار کیا ہے جس کا جواب دینے کا سلسلہ سرسید احمد خان اور سید امیر علی جیسے مشاہیر نے شروع کیا۔ ان حضرات کے بعد آنے والا ہر سیرت نگار اب مستشرقین کی تحریروں کا نوٹس بھی لیتا ہے۔ ان کے کام کا جائزہ بھی لیتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی پیدا کی ہوئی دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح کی غلط فہمیوں کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ سیرت کا مناظراتی ادب اہل مغرب کے جواب میں بھی تیار ہوا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے آپس کے فرقہ ورانہ مباحث میں بھی سیرت کا حوالہ کثرت سے دیا گیا اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف مسلمان مسلکوں اور مکاتب فکر نے اپنی اپنی تائید اور مسلک

کے نقطہ نظر کی حمایت میں پیش کیا۔اس طرح سیرت کا ایک داخلی مناظراتی یا داخلی کلامی ادب بھی پیدا ہوا۔

پھر یہ دور یعنی بیسویں صدی مسلمانوں میں تجدید اور احیا کی تحریکات کا دور ہے۔ بہت سی اسلامی اور دینی تحریکات مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں سامنے آئیں جن کی کوشش یہ تھی کہ اسلامی روایات کو زندہ کر کے مسلمانوں کا احیا کیا جائے۔ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا احیا کیا جائے اور قدیم اسلامی آئیڈیل کے مطابق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کی جائے۔ پاکستان خود ایک تجدیدی اور احیائی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا۔تحریک پاکستان خود ایک تجدیدی اور احیائی تحریک تھی جس میں سے اہم، سب سے قوی اور پُر زور حوالہ اسلام اور اسلامی روایات کا تھا۔ یہ بات قائداعظم کی تقریروں اور علامہ اقبال کے بیانات سے واضح ہے۔اس تجدیدی اور احیائی ماحول میں سیرت النبی پر ایک نئے انداز سے غور وخوض شروع ہوا۔سیرت النبی کے رول ماڈل ہونے کو نمایاں کیا گیا۔اس سے کام لے کر تجدیدی اور احیائی ادب نے سیرت میں ایک نئی معنویت پیدا کی۔

ماضی کے بیشتر سیرت نگار سیرت کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، شخصیت اور آپؐ کے غزوات اور مہمات تک محدود سمجھتے تھے۔اگرچہ سیرت کی ابتدا ایک جامع انداز میں ہوئی تھی، لیکن درمیان میں جب سیرت کا علم ایک الگ فن بن گیا تو وہ تاریخ اسلام یا تاریخ صدر اسلام کا ایک مقدمہ یا تمہید قرار پائی۔لیکن انیسویں صدی کے اواخر اور خاص طور پر بیسویں صدی کے اوائل کے مصنفین نے سیرت اور پیغام سیرت دونوں کو یکجا کر کے سیرت کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا اور پیغام سیرت کو بھی علم سیرت ہی کا حصہ بنا دیا۔علامہ شبلی نعمانی، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور ان سے پہلے سر سید امیر علی نے سیرت اور پیغام سیرت دونوں کو یکجا بیان کیا۔اس طرح ایک انتہائی مثبت اور قابل ذکر رجحان پوری شریعت اور پیغام سیرت کو سیرت کا حصہ سمجھنے کا سامنے آیا۔گویا کوشش یہ ہوئی کہ پیغام سیرت کی روشنی میں سیرت کو سمجھا جائے اور سیرت کی روشنی میں پیغام سیرت کی تعبیر وتشریح کی جائے۔

دور جدید کے مصنفین نے مغربی اسلوب استدلال سے بھی کام لیا۔بہت سے سیرت نگاروں کی تعلیم و تربیت مغربی یونیورسٹیوں اور مشرقی یونیورسٹیوں میں مغربی انداز کے مطابق

ہوئی۔ بالخصوص مسلمانوں میں جن حضرات نے انگریزی اور فرانسیسی اور جرمن زبان میں سیرت پر لکھا ہے، وہ جدید ترین مغربی معیار اور اسلوب استدلال کے مطابق ہے۔ سرسید امیر علی کی مثال اس باب میں سب سے اولین اور سب سے نمایاں ہے۔ ہمارے دور کے ڈاکٹر حمیداللہ کی مثال بھی اس ضمن میں بہت نمایاں ہے۔ عرب دنیا کے کئی سیرت نگار بھی اس معاملہ میں انتہائی نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ انہوں نے مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے مغربی انداز استدلال اور اسلوب کلام کے مطابق سیرت کو بیان کیا۔

پھر سیرت کے مطالعہ کا ایک اور رجحان بیسویں صدی میں بہت اہتمام اور اہمیت کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ سیرت کا مطالعہ قرآن پاک کی روشنی میں ہے۔ جس کا میں نے سرسری تذکرہ پہلے بھی کیا تھا اور اگر چہ میں نے عرض کیا تھا کہ واقدی کے ہاں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں، ابن ہشام کے ہاں بھی ملتے ہیں کہ سیرت کو قرآن پاک کی روشنی میں سمجھا جائے۔ یوں تو ہر دور میں اہل علم کسی نہ کسی حد تک اس رجحان کے مطابق کام کرتے رہے، لیکن خاص طور پر ہمارے اس دور میں درجنوں کتابیں قرآن پاک کی روشنی میں سیرت پر تیار گئی ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن پاک میں سیرت کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔

دور جدید میں سیرت نگاروں کی جھلکیاں دیکھنے سے پہلے ایک نظر ذرا اجمال سے ان رجحانات یا اسالیب پر بھی ایک بار پھر ڈال لیں جو بیسویں صدی کی سیرت نگاری میں نمایاں ہیں۔

۱۔ سیرت نگاری کا روایتی اسلوب
۲۔ سیرت نگاری کا تجزیاتی اسلوب
۳۔ سیرت نگاری کا موضوعاتی اسلوب
۴۔ سیرت نگاری کا عسکری پہلو
۵۔ سیرت نگاری کا انتظامی پہلو
۶۔ سیرت نگاری کا جدید تاریخی رجحان
۷۔ سیرت نگاری کا کلامی اسلوب
۸۔ سیرت نگاری کا مناظرانہ اسلوب

۹۔ سیرت نگاری میں تجدیدی اور احیائی رجحانات

۱۰۔ سیرت کے جامع تر مطالعہ کا رجحان

۱۱۔ سیرت نگاری اور مغربی اسلوب استدلال

۱۲۔ سیرت نبوی قرآن پاک کی روشنی میں

۱۳۔ سیرت کانفرنسیں اور مسند ہائے سیرت

۱۴۔ مجلّہ ہائے سیرت

۱۵۔ مراکز مطالعہ سیرت

آج کی گفتگو میں ان سب اسالیب اور رجحانات پر مفصل بحث تو ممکن نہیں۔ تاہم ان میں سے اہم اسالیب اور رجحانات کا ابتدائی اور ضروری تعارف پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ بیسویں صدی کا پہلا نصف برصغیر میں دو سیرت نگاروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس میدان کے شہسوار ہیں۔ صرف برصغیر نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں میدان سیرت کے شہسوار اور اس فضائے بے کراں کے شہباز دو شخصیات ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ۔ بیسویں صدی کا پہلا نصف ان دونوں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا نصف بھی ہمارے برصغیر اور پاکستان کی ایک شخصیت کے ہاتھ میں ہے جن کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ بیسویں صدی میں مجدد علوم سیرت ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ان تینوں شخصیات کا کام ایک بے مثال اور رجحان ساز کام ہے، سیرت کے جن گوشوں کو انہوں نے نمایاں کیا۔ جس انداز سے سیرت پر لکھا۔ اس کی مثال عرب دنیا میں نہیں ملتی۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ جس کی تفصیل کے لئے میں ابھی واپس اس موضوع کی طرف آتا ہوں، سیرت پر دو ایک اور پہلو بھی ہمارے سامنے آئے۔ ایک یہ کہ قدیم عربی کتابیں جو سیرت کے مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں اور عام انسانوں کو براہ راست سیرت کے مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔

سیرت ابن اسحاق جو سیرت کی سب سے پہلی مکمل کتاب ہے۔ اس کے جو اجزا موجود ہیں وہ آج سب کے سامنے ہیں۔ اس کا اردو، انگریزی، فرانسیسی اور غالباً جرمن ترجمہ بھی

دستیاب ہے۔ ترکی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ سیرت ابن ہشام دنیا کی ہر بڑی زبان میں دستیا ب ہے۔ طبقات ابن سعد، سیرت حلبیہ، واقدی کی کتاب المغازی، ان کتابوں کے تراجم دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں موجود ہیں۔ خود ہمارے برصغیر میں بعض ایسی کتابیں شائع ہوئیں جو ابھی تک مخطوطات کی شکل میں تھیں اور دنیا کو ان کی خبر نہیں تھی۔ اس معاملہ میں اگر دو اداروں کا نام لیا جائے تو حق بجانب ہوگا۔ ایک ادارہ مسلمانوں کا تھا، یعنی حیدرآباد دکن کا دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ اس ادارہ نے سیرت، حدیث اور صدر اسلام کے اسلامی ادبیات پر سینکڑوں کتابیں شائع کیں اور پہلی مرتبہ دنیا کو سیرت اور حدیث کی درجنوں کتابوں سے واقف کرایا۔ فن رجال پر، سیرت پر، ابتدائے اسلام کے ادب پر، کئی احادیث کے مجموعے اس ادارہ کے زیر اہتمام حیدرآباد دکن میں شائع ہوئے۔

دوسرا بڑا ادارہ، بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ، ایک ہندو نول کشور نام کا قائم کردہ تھا۔ اس نے لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا۔ جس کی ہندوستان کے کئی شہروں میں شاخیں قائم تھیں۔ اس نے اسلامی موضوعات پر سینکڑوں اچھی کتابیں شائع کیں۔ جس اچھی کتاب کو پڑھیں وہ نول کشور نے شائع کی۔ نول کشور ایک ہندو تھا۔ اس کے ہاں قرآن پاک کی طباعت کا کام ہوتا تھا۔ لیکن لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اتنے ادب اور احترام کے ساتھ قرآن پاک کی طباعت کا اہتمام کرتا تھا کہ اس نے اس کام کے لئے الگ حفاظ رکھے ہوئے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ قرآن پاک کی طباعت کے عمل میں باوضو ہو کر شریک ہوں۔ جو تختیاں دھوئی جاتی تھیں ان کے لئے ایک الگ حوض بنایا گیا تھا۔ تاکہ دھلی ہوئی تختیوں کا پانی ضائع نہ ہو۔ ایک الگ حوض میں یہ پانی جمع ہو اور وہیں خشک ہو جائے۔ اس نے کارندے مقرر کئے ہوئے تھے جو بغداد اور مصر وشام جا کر نئی نئی کتابیں لایا کرتے تھے۔ جن کو وہ شائع کراتا تھا۔ اپنے دور کے جید ترین علمائے اسلام سے رابطہ رکھتا تھا۔ ان کے مشورے سے وہ کتابوں کی طباعت کرتا تھا۔ پتہ نہیں دل سے مسلمان تھا کہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے۔ لیکن ضمناً ایک 'قصہ معترضہ' عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

نول کشور کا بیٹا نئی نئی کتابیں حاصل کرنے کی غرض سے عرب ممالک خاص طور پر عراق اور مصر جایا کرتا تھا۔ 1935-36 میں وہ عراق گیا ہوا تھا۔ وہاں مکتبۃ المثنیٰ بہت مشہور کتب

خانہ تھا۔ وہاں کتابیں خریدنے گیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک دو دن میں تو وہاں نہیں جایا جاسکتا تھا۔ بحری جہاز میں پندرہ بیس دن لگتے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ مہینہ دو مہینے قیام کر کے کتابیں خریدیں اور پھر بحری جہاز سے واپس آگئے۔ نول کشور کے اس بیٹے نے یہ سنا کہ کسی سیلاب کی وجہ سے دو صحابہ کرام کی قبریں کھل گئی ہیں۔ ایک حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور دوسرے حضرت جابر بن عبداللہؓ۔ حکومت عراق کی سطح پر یہ طے ہوا کہ ان دونوں صحابہ کی میتوں کو نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ جب حکومت عراق نے یہ فیصلہ کیا تو بعض ملکوں سے مطالبہ ہوا کہ ہمیں بھی شرکت کا موقع دیں۔ بعض حجاج کرام جو حج کرنے جارہے تھے انہوں نے بھی شرکت کی خواہش کی اور مطالبہ کیا کہ حج کے بعد تک اس کو ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ معاملہ ملتوی کر دیا گیا۔

حج کے بعد ہزاروں افراد کے مجمع میں دونوں صحابہ کی قبریں کھولی گئیں۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ایک فلم بنانے والی جرمن کمپنی بھی وہاں موجود تھی۔ مشرق ومغرب کے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی حاضر تھے۔ انگریزی فوجیں اُس زمانے میں وہاں موجود تھیں، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بہت سے انگریز بھی آئے ہوں گے۔ جب دونوں صحابہ کی میتیں کھولی گئیں۔ تو دونوں کی میتیں تر وتازہ تھیں۔ دونوں چونکہ شہدا تھے اس لئے ان کی میتوں پر تازہ خون موجود تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کچھ ڈاکٹروں نے یہ دیکھ کر کہا کہ ان آنکھوں میں ابھی تک روشنی موجود ہے۔ اس موقع پر بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ اسی موقع پر نول کشور کا وہ بیٹا بھی مسلمان ہوگیا اور باپ کی ناراضگی کے خوف سے واپس نہیں گیا۔ عراق ہی میں رہا۔ جب پاکستان بن گیا تو وہ کراچی آگیا۔

مجھے 1980 میں کسی نے بتایا کہ نول کشور کا جو بیٹا اس واقعہ سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگیا تھا وہ کراچی میں ہے۔ میں 82-81-1980 میں تین چار مرتبہ اس سے ملنے اس کے مکان پر گیا لیکن اتفاق سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ صاحب ظاہر ہے کہ اس وقت خاصے بوڑھے ہو چکے تھے۔ اتفاق سے ہماری ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ ایک صاحب نے ان کا انٹرویو بہت تفصیلی کیا تھا جو کراچی کے کئی

جرائد جن میں ہفت روزہ تکبیر بھی تھا، شائع ہوا تھا۔ میرے پاس اس کی نقل موجود ہے اور اس میں انہوں نے یہ سارا واقعہ چشم دید بیان کیا ہے اور کہا کہ میں نے یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہ بات نول کشور کے حوالے سے آئی۔ نول کشور نے اتنا کام کیا ہے کہ سیرت پر گفتگو ہو اور نول کشور کی خدمات کا تذکرہ نہ ہو، یہ بڑا مشکل ہے۔ سیرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اور بہت سی اصل کتابیں نول کشور کے مطبع میں شائع ہوئیں اور پہلی مرتبہ اس کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں، جو بڑا کام ہوا میں اس کی طرف ابھی آتا ہوں، دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ایک ایسی شخصیت کی ہے جن کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ وہ بہت مختلف فیہ رہے ہیں۔ بہت غیر معمولی ادیب تھے۔ قلم ان کا بہت رواں تھا۔ انہوں نے بہت سی موضوعات پر کتابیں لکھیں اور بعض اختلافی موضوعات پر بھی لکھا۔ اور ان ہی اختلافی موضوعات پر لکھنے کی وجہ سے وہ ایک مختلف فیہ شخصیت بن گئے، مرزا حیرت دہلوی۔ مرزا حیرت دہلوی ایک زمانے میں انگریزوں کے معتوب رہے۔ انگریزوں نے ان کو سزا بھی دی۔ انہوں نے قید بھی کاٹی، لیکن قید کاٹ کر وہ واپس آ گئے اور علمی اور ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بڑے صاحب طرز ادیب تھے۔ انہوں نے سیرت رسول پر ۱۹۰۲ء میں چھ جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے بعض حوالے میں نے کہیں کہیں پڑھے ہیں۔ یہ کتاب قدیم اسلوب سے جدید اسلوب کی طرف پیشقدمی کے سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان بڑی ادیبانہ، بڑی عالمانہ ہے۔ لیکن مندرجات کے بارے میں اکثر اہل علم کو تامل تھا۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ مصنف نے ادبیت پر تاریخیت کو قربان کیا ہے۔ ادیب کے قلم میں جب زور بیان جوش دکھاتا ہے تو وہ احتیاط ملحوظ نہیں رہتی جو محدث یا سیرت نگار کے مزاج میں ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں، یعنی ۱۹۰۵ء میں لکھی جانے والی دوسری کتاب مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی سیرت النبی ہے جو عام قارئین کے لئے لکھی گئی تھی۔

بیسویں صدی میں سیرت نگاری کا سب سے اہم پہلو مستشرقین کی سیرت نگاری کا مطالعہ اور ان کے اعتراضات کا جواب ہے۔ مستشرقین نے کب سے کام شروع کیا۔ اس پر

بڑی لمبی بحث ہوسکتی ہے۔ ایک بڑی مشہور کتاب ہے 'المستشر قون فی الاسلام' ہے۔ نجیب العقیقی غالباً لبنان کے ایک بزرگ تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ہے۔ خود لبنان کے ایک مسیحی عالم نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھی ہے Orientalism کے نام سے۔ اور بڑے عالمانہ اور تحقیقی انداز میں یہ کتاب لکھی ہے اور مستشرقین کے مختلف ادوار کو بیان کیا ہے۔ ابتدائی مستشرقین یعنی وہ مغربی علما جو اسلامی علوم کو تحقیق کا موضوع بناتے تھے۔ وہ پادری تھے۔ اور ایک مذہبی اور مشنری جذبے سے اسلام کی کمزوریوں کو تلاش کرنا اور اسلامی تعلیمات کے منفی پہلوؤں کو بیان کرنا اپنا مشن سمجھتے تھے۔ انہوں نے سیرت کے بارے میں اتنی عجیب وغریب اور اتنی غیر علمی اور فضول باتیں کی ہیں کہ جن کو دہرانا بھی ایک سلیم الطبع انسان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان خرافات کو دہرانے کی ضرورت نہیں، صرف ایک چھوٹی سی مثال میں دیتا ہوں جس سے یہ اندازہ ہوجائے گا کہ جب انسان کی عقل ماری جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے تو انسان کتنا گر جاتا ہے۔ تعصبات انسان کو اندھا کردیتے ہیں تو وہ کتنی بے بنیاد باتیں کرتا ہے۔ یہ قصہ یا حکایت یا فضول گوئی کئی سوسال تک مغربی مصنفین کے ہاں مقبول رہی۔

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کبوتر کو سدھا رکھا تھا۔ اس کبوتر کو بلا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیتے تھے اور اپنے کان میں کچھ دانے ڈال لیا کرتے تھے۔ کبوتر تھوڑی تھوڑی دیر میں دانے چگنے کے لئے کان میں چونچ ڈالتا تو آپؐ فرماتے تھے کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ اللہ کا فرشتہ ہے جو میرے کان میں پیغام وحی ڈال رہا ہے۔ یہ بات کہاں سے آئی۔ کس نے گھڑی، کسی کو اس کا علم نہیں۔ کسی تاریخ سے، کسی کتاب سے، کسی افسانے سے، کسی جھوٹ سے ،کسی لطیفے سے بھی اس طرح کی کوئی بات نکلتی ہوتی تو اس کو دہرانے کا جواز ہوسکتا تھا۔ لیکن اسی طرح کی فضول باتیں یہ لوگ بیان بھی کرتے تھے اور پھر بار بار دہراتے بھی رہتے تھے جن کا جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اول تو مسلمان اہل علم کو اس کا علم نہیں ہوا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ یورپ اور دنیائے اسلام کے درمیان کوئی آمد ورفت بھی خاص نہیں تھی اس لئے نہ ان خرافات کا علم ہوسکا اور نہ لوگوں نے اس کا نوٹس لیا۔

اس کے بعد جب استعماری قوتیں دنیائے اسلام پر قابض ہوئیں۔ فرانسیسی استعمار شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ پر، ولندیزی استعمار مشرق بعید پر اور انگریزی استعمار برصغیر پر قابض ہوا

تو استعماری ضروریات کی خاطر ان کو دنیائے مشرق کے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مغربی قومیں جب کوئی فیصلہ کرتی ہیں تو بہت غور وخوض کے بعد کرتی ہیں۔ وہ لوگ فیصلہ کرنے سے پہلے بہت سوچتے ہیں، کارروائی کرنے سے پہلے دشمن کی ہر چیز کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لئے دنیائے اسلام کا مطالعہ کرنا، مسلمانوں کے رجحان اور مزاج کو سمجھنا، مسلمانوں کی کمزوریوں کو تلاش کرنا ان کی سیاسی اور استعماری ضرورت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے بڑے پیمانے پر ادارے قائم کئے۔ اہل علم کو مقرر کیا۔ ان اہل علم میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ خالص علمی ذوق رکھنے والے بھی تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے علمی کام بھی کئے۔ تاہم سنجیدہ اہل علم کے پہلو بہ پہلو مغربی استعمار کے مفاد کی نگہداشت کرنے والے بھی تھے۔ بہت سے 'اہل علم' اور 'محققین' ایسے تھے جو مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے باقاعدہ کارکن تھے۔ پادری تو بہت تھے جو مشنری جذبہ سے مسلمانوں کے علوم وفنون کا مطالعہ کرتے تھے۔ ہمارے دور میں بھی کئی پادری مستشرق ہوئے ہیں۔ یہ سب مل کر مشرقی علوم وفنون پر کام کرتے تھے۔

اس ضمن میں قرآن پاک، حدیث، سیرت اور فقہ سے لے مسلمانوں کی ادبیات، شاعری، قدیم شاعری، جدید شاعری، تاریخ اور ان سب موضوعات پر انہوں نے کام کیا ہے۔ اچھا کام بھی کیا ہے، بعض بڑے قیمتی کام بھی کئے ہیں۔ فارسی ادب کی بڑی عالمانہ تاریخ جس نے لکھی ہے وہ ایک انگریز مصنف ہے۔ عربی زبان کی ایک بہت اچھی تاریخ بھی ایک انگریز نے لکھی ہے۔ یہ کام بھی ہوئے ہیں۔ اگر چہ پروفیسر براؤن جنھوں نے فارسی ادب پر بہت اچھی کتاب لکھی ہے اس کے ہر قریب قریب ہر صفحے پر مولانا شبلی کا حوالہ ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ایسا ہو جس پر مولانا شبلی کا حوالہ نہ ہو اور شبلی نعمانی پر بہت زیادہ بھروسہ نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے اور عالمانہ کتاب ہے۔

یہ لوگ جب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قلم اٹھاتے تھے تو شروع شروع میں تو ان کا رجحان انتہائی منفی اور گستاخانہ ہوا کرتا تھا جس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس ایک چھوٹے سے جھوٹ سے آپ اندازہ کرلیں کہ کس انداز کے بیانات ہوتے تھے۔ جو جس کے دل میں آتا تھا بغیر کسی جوابدہی کے احساس کے بیان کردیا کرتا تھا اور لکھ دیتا تھا۔ جان بوجھ کر بے بنیاد الزامات لگانا مستشرقین کے کام کا دور اول ہے۔

جب اٹھارویں صدی میں یہ تحقیقی ادارے بننے شروع ہوئے۔ مختلف ملکوں میں ایشیاٹک سوسائیٹیاں بنیں۔ فرانس اور انگلستان میں بھی اور ہندوستان میں اس کے شعبے قائم ہوئے۔ کالجز بنے۔ انگریزوں اور دوسرے مغربی لوگوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ براہ راست اسلامی ورثہ سے واقف ہوئے تو ان کے کام میں تھوڑا سا ایک علمی رنگ آنا شروع ہوا۔ اس علمی رنگ کی وجہ سے بہت سی قدیم کتابوں انہوں نے شائع کیں۔ سب سے پہلے الاصابہ فی تمیز الصحابہ اسپرنگر نے شائع کی جو صحابہ کے تذکرہ پر ہے۔ کتاب المغازی سب سے پہلے ایک جرمن نے 1904 میں شائع کی۔ اس طرح ایک ایک کر کے یہ ساری کتابیں آنی شروع ہوئیں۔ لیکن جو کچھ پہلے لکھا گیا تھا ایک حد تک اس کا اثر موجود تھا۔ جو لوگ متخصص نہیں تھے وہ انہیں باتوں کو دہراتے تھے۔ گبن بڑا ادیب اور مشہور مورخ ہے۔ اس کی کتاب بڑی عالمانہ کتاب ہے اور کلاسکس میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں میں نے بڑے اشتیاق سے اس کو پڑھا تھا۔ اس کا بڑا چرچا سنا کرتا تھا۔ درسی کتابوں میں اس کے بہت چرچے تھے۔ کتاب بہت اچھی اور عالمانہ ہے۔ لیکن جب وہ رومنز اور اسلام کے تصادم پر بات کرتا ہے اور بات رسول اللہ ﷺ پر آتی ہے تو وہ ساری علمیت، ساری ادبیت اور سارا توازن گم ہو جاتا ہے اور وہی باتیں جو پہلے سے لوگ لکھتے چلے آرہے تھے انہی کو دہراتا ہے۔ اس میں بڑے گستاخانہ بیانات ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی گبن ہے۔ اس نے رومن ایمپائر کو اتنا چڑھایا اور بڑھایا ہے کہ آج تک لوگ اس کے بیانات اور دعووں کو دہراتے چلے آرہے ہیں۔

یہ سلسلہ اٹھارویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ انیسویں صدی کے وسط تک اس میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مستشرقین نے باقاعدہ سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ سیرت کا مطالعہ شروع کیا۔ بہت سے مستشرقین نے عربی زبان سیکھی۔ بہت سی کتابوں کا عربی سے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انہوں نے اسلامی مآخذ سے کام لے کر اور اسلامی مصادر کی بنیاد پر وہی بات کہنی شروع کی جو وہ پہلے سے کہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک کے بارے میں جو کچھ انہوں نے اس دوران میں کہا۔ حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا۔ سیرت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

حدیث کے بارہ میں ان کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث کے ذخائر جیسا کہ مسلمانوں کے پاس موجود ہیں، یہ سب کے سب غیر مستند ہیں۔ سب کے سب کہی سنی باتوں پر مبنی ہیں اور جو قصے کہانیاں مسلمانوں میں مشہور تھیں انہی قصوں کہانیوں کو چوتھی صدی کے مصنفین اور محدثین نے جمع کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے منسوب کر دیا۔ کچھ اور حضرات نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے اتنی بڑی دو متمدن حکومتوں کو ختم کر کے ایسا نظام قائم کیا کہ خود ان ملکوں کے رہنے والوں نے تسلیم کیا کہ ہمیں جو عدل وانصاف اب ملا ہے پہلے نہیں ملتا تھا۔ تو یہ بات ان کے مستعمرانہ پندار نے قبول نہیں کی کہ ان کے آباؤ اجداد کو مسلمانوں سے کمتر سمجھا جائے اور ان کے نظام پر مسلمانوں کے نظام کو ترجیح دی جائے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ جو نظام مسلمانوں نے شریعت کے نام پر بنایا ہے، یہ تو ہمارے ہی رومن لا سے ماخوذ ہے۔ رومن لا کو عربی میں لکھ دیا اور وہ شریعت بن گئی۔ یہ بات انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر سے لکھنا شروع کر دی۔ مسلمان اہل علم نے اس کا اتنا مدلل جواب دیا کہ اس کے بعد انہوں نے یہ کہنا چھوڑ دیا۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں نے مختلف علاقوں سے کہاوتوں اور حکمت کی باتوں کو جمع کیا۔ ان کو عربی میں لکھ دیا اور حدیث کے طور پر حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ سے منسوب کر دیا۔ مسلمان علما نے اس کا بھی جواب دیا اور ایسا مدلل جواب دیا کہ اب یہ بات بھی کوئی نہیں کہتا۔ لیکن حدیث اور سیرت کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کئے جانا مستشرقین کی ایک پرانی عادت ہے اور وہ اور ان کے مشرقی تلامذہ طرح طرح سے آئے دن اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے اسرائیل کے شہر تل ابیب میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں سیرت کے مآخذ کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں جس بنیادی سوال پر بحث کی گئی وہ یہ تھا کہ سیرت کے مآخذ اور مصادر کی تاریخی حیثیت کیا ہے، اس پر بڑے بڑے مستشرقین نے تحقیقی مقالات پیش کئے اور مآخذ سیرت کے بارہ میں وہی پرانی باتیں دہرانے پر اکتفاء کیا اور انہی شکوک کا اظہار کیا جو گزشتہ کئی سو سال سے دہرائے جا رہے ہیں۔ یہ وہ شکوک ہیں جن کا جواب درجنوں مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ جن کا جواب مسلمان اہل علم کثرت سے دے چکے ہیں۔ اب یہ بات کہ حدیث کے جتنے مآخذ تھے یہ چوتھی صدی ہجری میں لکھے گئے اس لئے ذخیرۂ

حدیث ناقابل قبول ہے۔اس کا جواب کم وبیش ستر سال سے دیا جا رہا ہے۔سب سے پہلے مولانا مناظر حسن گیلانی نے اس کا جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ احادیث کے ذخائر کی تدوین وتحریر کا کام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ان میں سے بعض کی مثالیں میں نے بھی دی تھیں۔پھر صحابہ کرام کے مرتب کیے ہوئے مجموعے تابعین تک پہنچے اور تابعین نے ان کو بڑے مجموعوں کی شکل دے دی۔لیکن یہ ساری باتیں نظر انداز کر کے مستشرقین اپنی اسی بات کو دہراتے چلے آرہے ہیں۔اب صحابہ اور تابعین کے مجموعے مرتب ہو کر چھپ چکے ہیں۔حضرت ہمام بن منبہ جو حضرت ابو ہریرہؓ کے براہ راست شاگرد ہیں،ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔عبداللہ بن عمرو بن العاص کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ڈاکٹر حمیداللہ نے ایک کتاب میں سات چھوٹے مجموعے جمع کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے Methodology in Early Hadith Literature کے نام سے کتاب لکھی ہے۔اس میں انہوں نے صحابہ کرام کے ۴۸ اور تابعین کے اڑھائی سو تحریری مجموعوں کا ذکر کیا ہے،جو صحابہ اور تابعین کے دور میں تیار کیے گئے اور ان تمام مشہور اور متداول مجموعوں سے پہلے مرتب ہو چکے تھے اور یہ سارا ذخیرہ ان حضرات کے پاس تھا۔واقدی کی مثال میں دے چکا ہوں کہ جب ان سے کہا گیا کہ غزوہ احد کے بارے میں تمام روایات ہمیں الگ الگ پڑھائیں تو وہ بیس جلدوں پر مشتمل مجموعہ لے کر آئے کہ آئیں پڑھاتا ہوں۔حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں عرض کر چکا ہوں جب خلیفہ وقت نے تامل کیا کہ آپ یادداشت سے اس کو کیسے بیان کر رہے ہیں تو ان کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے مجموعے دکھا کر کہا کہ یہ حضورؐ کے زمانے کے لکھی ہوئی یادداشتیں ہیں۔میں روز اس ذخیرہ کو یاد کرتا ہوں۔یہ بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امام زین العابدین کے پاس تحریری مجموعے تھے وہ اس کو روزانہ زبانی یاد کیا کرتے تھے۔جس طرح کی قرآن کی منزل پڑھتے ہیں اس طرح وہ حدیث پڑھتے تھے۔

اصل میں مستشرقین کو اس غیر معمولی محبت اور عقیدت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا جو مسلمانوں کو ذات رسالت مآب سے رہی ہے اور ہے۔مستشرقین کے کچھ حوالہ جات جو میں نے نقل کیے ہیں ان کو میں چھوڑ دیتا ہوں،کیونکہ یہ سارے حوالہ جات بیان کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ ایک طرف مستشرقین مصادر سیرت کے اس

سارے مواد کو غیر تاریخی اور غیر معتبر قرار دے رہے ہیں۔ جس سیمینار کا میں نے ذکر کیا اس کے دس مقالے مجھے ملے ہیں۔ ان میں ان مآخذ کو ایک ایک کر کے مشکوک قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انہی مآخذ میں اگر کوئی ایسی چیز ہے جس کو اسلام کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اس کو استعمال کرنے میں ان مغربی مسیحی اور یہودی محققین کو کوئی تامل نہیں ہے۔ تمام مستشرقین اس کو استعمال کرتے ہیں۔

مثلاً یہ بات ایک ضعیف راوی نے لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بچپن میں تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا کے ساتھ شام گئے تھے اور وہاں بُصریٰ میں جو اس وقت اردن کا ایک شہر ہے، ایک راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس راہب نے حضور کو دیکھا اور آپؐ کے چچا سے کہا کہ آپ اس بچے کو لے جائیں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ یہودی اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ چنانچہ ابوطالب نے حضور کو فوراً واپس بھیج دیا۔ یہ واقعہ مستند محدثین کی نظر میں درست نہیں ہے۔ تمام معتبر علمائے حدیث اصول حدیث اور قواعد حدیث کی بنیاد پر اس روایت کو غیر معتبر قرار دیتے آ رہے ہیں۔ خود اس روایت میں ایک داخلی گواہی اس بات کی موجود ہے کہ یہ واقعہ کمزور بلکہ بے بنیاد ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت ابوطالب خود تو سفر پر آگے چلے گئے اور حضرت بلال اور حضرت ابوبکر کے ساتھ حضور کو واپس بھیج دیا۔ حضرت بلال امیہ بن خلف کے غلام تھے اور شاید اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کیونکہ جب حضور تیرہ سال کے تھے تو حضرت بلال شاید ہی پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ عمر میں حضور سے بہت کم تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور سے دو سال چھوٹے تھے۔ جب حضور تیرہ سال کے تھے تو وہ گیارہ سال کے ہوں گے۔ لہٰذا یہ بات کسی طرح بھی معقول اور قرین قیاس نہیں ہو سکتی کہ ایک تیرہ سال کے بچے کو گیارہ سال کے بچے کی نگرانی میں بصری سے واپس کر دیا کہ ریگستانوں میں دو ہزار میل سے زائد کا سفر کر کے اس کو واپس لے جاؤ۔ یہ اور اس طرح کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ درست نہیں ہے۔ محدثین نے پہلے ہی اس کو کمزور قرار دیتے چلے آ رہے ہیں۔ محدثین کی نظر میں یہ مستند نہیں ہے۔

لیکن جن مآخذ کو وہ خود بھی غیر مستند قرار دیتے ہیں ان مآخذ کی یہ بات انہوں نے پکڑ لی اور کہنا شروع کر دیا کہ بس حضور کو یہ ساری مذہبی معلومات اسی راہب نے دی تھیں۔ حضور نے

تیرہ سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک ان تمام مذہبی معلومات اور حقائق معارف کو چھپائے رکھا۔ شاید دل ہی دل میں سوچتے ہوں گے کہ اس کو کیسے اور کب دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کو خاموشی سے اندر ہی اندر مرتب کرتے ہوں گے اور چالیس سال کی عمر میں علوم وفنون کا ایک دریا یکا یک کھل گیا۔ اب وہ ساری رہنمائی اور علوم وفنون آپ نے بیان فرمانا شروع کردیئے۔ بالفرض اگر ایسا صحیح بھی ہو تو یہ خود ایک معجزہ ہے کہ ایک تیرہ سال کا بچہ ایک گھنٹے میں اتنے علوم وفنون سیکھ لے کہ بعد میں قرآن اور حدیث اور ان تمام مآخذ کی شکل میں جن پر آج تک غور وخوض ہورہا ہے، انسانوں تک پہنچادے اور اس پیغام کے ذریعہ ان میں ایک تبدیلی لاکر ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کردے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو یہ بھی معجزہ سے کم نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک مثال اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ مستشرقین واقعی اس ذخیرہ کے معتبر یا غیر معتبر ہونے میں کوئی حقیقی دلچسپی نہیں رکھتے، بلکہ ان کی دلچسپی کا مقصد صرف اسلامی مآخذ ومصادر کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔

ایک اور مشغلہ کچھ دنوں سے مستشرقین نے اختیار کیا ہے اور کہتے ہیں کہ Our task should be to unearth the unorthodox sourses. ہمارا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں جو مصادر غیر مستند یا غیر معتبر ہیں ان کا سراغ لگایا جائے۔ یعنی وہ قصے کہانیاں اور غیر مستند واقعات جن کو مسلمان غیر مستند قرار دیتے چلے آرہے ہیں، ان واقعات سے سیرت کو بیان کیا جائے۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بیانات اور مندرجات تو ان تمام دلائل کے باوجود قابل قبول نہیں ہیں جو مسلمان دے رہے ہیں۔ لیکن ابوالفرج اصفہانی کی کتاب جو گویوں کی تاریخ اور ادبی قصوں کہانیوں پر ہے، اس کو مستند مان کر اس سے سیرت کے واقعات کو مرتب کیا جائے۔ ابوالفرج ایک ادیب تھا اس نے عرب کے گویوں پر ایک کتاب 'کتاب الاغانی' لکھی تھی۔ اس کتاب میں بہت سارے قصے کہانیاں ہیں۔ اس کتاب میں بعض جزوی اشارات سیرت کے مختلف واقعات کے بارہ میں بھی ملتے ہیں۔ اس کو وہ سمجھتے ہیں کہ سیرت کے اصل مآخذ یہ ہیں اور سیرت یہاں سے بیان ہونی چاہئے۔ ان مآخذ ومصادر کے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔ کس نے لکھی ہے۔ یادداشت کی بنیاد پر لکھی ہے۔ آج تک میں نے کوئی تحریر کتاب الاغانی کے غیر مستند ہونے کے بارے میں نہیں دیکھی۔

صحیح بخاری اور قرآن پاک کے غیر مستند ہونے کے بارے میں تو بیسیوں کتابیں ہیں۔ جن کتابوں کو پہلے دن سے لاکھوں لوگ یاد کررہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں قلمی نسخے ہر دور کے لکھے ہوئے آج بھی جگہ جگہ دستیاب ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت کو ماننے میں تو تامل ہے۔ لیکن جن ادبی لطائف اور قصے کہانیوں کا کوئی آگا پیچھا نہیں ان کو بلا چون وچرا ماننے پر اصرار ہے، بشرطیکہ ان میں کوئی منفی بات نکل آئے۔ قرآن پاک کو اتنے لوگوں نے حفظ کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر قرآن کے تمام نسخے ختم ہوجاتے تو قرآن پاک کو حافظہ سے بیان کرنے والے ہزاروں آدمی موجود ہوتے۔ یہودیوں نے تو ایک بزرگ کو اس بنیاد پر اللہ کا بیٹا مان لیا کہ انہوں نے توراۃ زبانی یادداشت کی بنیاد پر لکھوادی تھی۔ اگر کتاب اللہ کا زبانی یاد کرلینا اللہ کا بیٹا ہونے کے لئے کافی ہے تو مسلمانوں کو کیا قرار دینا چاہیے، میں نہیں جانتا۔

یہ ساری چیزیں ہیں جن کا انیسویں صدی سے جواب دیا جاتا رہا ہے۔ سرسید امیر علی اور سرسید احمد خان کے زمانے سے لوگ اس کا جواب دے رہے ہیں۔ آج تک کسی مستشرق نے ان جوابات کا نوٹس نہیں لیا۔ آپ بڑے سے بڑے مستشرقین کی کتابیں دیکھیں۔ ان کے مآخذ میں آپ کو ڈاکٹر حمید اللہ نظر نہیں آئیں گے۔ سید امیر علی، ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور ایسے بزرگوں کا کوئی حوالہ نظر نہیں آئے گا۔ وہ ہمیں objectivity اور معروضیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ یقیناً ہمارا کام ہے کہ ہم objective اور معروضی انداز میں چیزوں کو لیں۔ یہ عجیب objectivity کہ جن کے بارے میں آپ منفی باتیں کہہ رہے ہیں ان کی کسی دلیل کا سرے سے نوٹس ہی نہ لیا جائے، نہ یہ دیکھا اور سنا جائے کہ وہ آپ کی ان تحقیقات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دلائل سے آپ کی بات کو کمزور ثابت کیا ہے لیکن اس کا کوئی نوٹس آج تک کسی مستشرق نے نہیں لیا۔

مارگولیتھ کی صرفی، نحوی اور لغوی غلطیاں علامہ سید سلیمان ندوی نے ثابت کیں۔ ایک عربی عبارت کو اس نے غلط سمجھا۔ جان بوجھ کر غلط سمجھا یا غلط فہمی سے غلط سمجھا، یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ لیکن آج تک کسی مستشرق نے یہ نوٹس نہیں لیا کہ سید سلیمان ندوی نے سیرت پر کیا کہا تھا یا ڈاکٹر حمید اللہ یا کسی اور اسلامی مصنف نے ان کی کس غلط فہمی کا کیا جواب دیا۔ یہ لوگ ہیں جو ہمیں معروضیت سکھاتے ہیں۔ ہمارے بہت سے لوگ معروضیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں

کہ جب تک مغربی مصنفین کی بات کو سرآنکھوں پر نہ رکھا جائے آپ objectivity کا تقاضا پورا نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ان کی objectivity یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تردید میں لکھی ہوئی کسی بات کا آج تک نوٹس نہیں لیا۔ پچھلے سو برس میں جو کچھ لکھا گیا ہے آج تک کسی مغربی آدمی نے اس کا نوٹس نہیں لیا ہے۔ لیکن اس کا ایک یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ مستشرقین کا رویہ گزشتہ ایک سو سال کے دوران کچھ بدلا ہے۔ نئی کتابیں آنے اور مسلمانوں کا جواب دینے کے بعد ان کے منفی بیانات میں کافی کمی آئی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔ بعض لوگوں نے اسلام کے بارے میں خاصی ہمدردانہ تحریریں لکھیں اور اسلام کے نقطہ نظر کو زیادہ ہمدردانہ انداز میں پیش کیا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں بیسویں صدی میں کام کا آغاز ہوا۔ کل میں نے دبستان سرسید کا ذکر کیا تھا۔ دبستان سرسید سے میری مراد یہ تھی کہ سیرت النبی پر مغربی مستشرقین کے اعتراضات کے پس منظر میں مغربی طرز استدلال اور اسلوب تحقیق سے کام لے کر اسلام کے موقف کو مغربی انداز میں بیان کیا جائے۔ اس کے سب سے بڑے نمائندہ تو خود سرسید ہی تھے۔ لیکن وہ یہ کام مکمل نہیں کر پائے۔ چار جلدوں میں سے ایک جلد ہی کا جواب دے پائے اور جو جلد انہوں نے لکھی ان میں بھی بہت سی باتوں کے بارے میں اہل علم نے تامل کا اظہار کیا۔ ان کے بہت سے نتائج سے خود مسلمان اہل علم متفق نہیں۔ اس لئے ان کے کام کا اثر بڑا محدود رہا۔ لیکن سرسید کے حلقہ کے دو قابل ذکر حضرات نے سیرت کے موضوع پر کام کیا اور زیادہ موثر کام کیا۔

ان میں سے ایک پروفیسر سید نواب علی تھے۔ یہ علی گڑھ میں استاد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی علی گڑھ میں گزری تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مغربی مستشرقین اور ان سب کے کاموں کا جائزہ لے کر سیرت پر ایک بڑی جامع کتاب 'سیرت رسول اللہ' تیار کی تھی۔ وہ عبرانی زبان بھی جانتے تھے۔ قدیم آسمانی کتابیں ان کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ مستشرقین کا انہوں نے اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے اور بھی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ چونکہ ان کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا اس لئے شمالی ہندوستان، پنجاب اور موجود پاکستان کے علاقوں میں ان کی کتابیں زیادہ مقبول اور متعارف نہیں ہوئیں۔ لیکن یہ ایک پہلی،

مکمل اور کامیاب کوشش تھی جو سیرت کے سارے ہی موضوعات پر محیط تھی۔ انہوں نے بچوں، نوجوانوں اور زیادہ عمر کے قارئین کے لئے سیرت پر تین الگ الگ کتابیں تیار کیں۔

سید نواب علی کے بعد جس شخصیت کو بھرپور کام کرنے کا موقع ملا وہ شمالی ہندوستان کے مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری تھے۔ قاضی سلیمان منصور پوری عربی اور فارسی کے عالم بھی تھے۔ انگریزی قانون کے ماہر بھی تھے۔ انگریزی عدلیہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے جب یہ سارا منظر دیکھا اور مستشرقین کی غلط فہمیوں کا ان کو علم ہوا تو انہوں نے تین کتابیں لکھنے کا پروگرام بنایا۔ ایک مختصر کتاب، ایک متوسط کتاب اور ایک بہت مفصل اور جامع کتاب۔ مختصر کتاب 'مہر نبوت' کے نام سے مشہور ہوئی۔ متوسط کتاب تین جلدوں میں 'رحمت للعلمین' کے نام سے لکھی۔ تینوں جلدیں 18 یا 19 سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ پہلی دو جلدیں انہوں نے اپنی زندگی میں لکھ کر شائع کر دی تھیں۔ تیسری جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

یہ اپنی نوعیت کی بڑی منفرد کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جو پہلے سیرت نگار بیان نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ان تمام اعتراضات کا یہ کہے بغیر کہ مستشرقین یہ اعتراض کرتے ہیں، مدلل اور عالمانہ جواب دینے کی کوشش کی۔ ایک مقدمہ لکھا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ولادت تک پوری تفصیل بیان کی ہے اس مقدمہ میں آپ کا نسب نامہ اور قریش کا بنی اسماعیل سے ہونا بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ گویا پس منظر میں ولیم میور کا یہ اعتراض ہے کہ عربوں کا تعلق خاندان بنی اسماعیل سے نہیں تھا۔ اس کی تردید خود بخود ہوگئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد کا جو مقام و مرتبہ مکہ مکرمہ اور قبیلہ قریش میں تھا اس کو بیان کیا۔ اس سے مارگولیتھ کے اس اعتراض کا جواب دینا مقصود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان کوئی معمولی یا چھوٹا خاندان تھا، نعوذ باللہ۔

اسی طرح سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یعنی شریعت کو حضور ﷺ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ جو کام سید امیر علی نے کیا تھا کہ سیرت، صاحب سیرت اور پیغام سیرت ان تینوں کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا۔ اسی طرح سے قاضی سلیمان منصور پوری نے رسول اللہ کے دین اور آپ کی تعلیم کے خصائص، آپ کی تعلیمات کی جامعیت اور کاملیت دونوں چیزوں کو آپ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ پھر سیرت کے بقیہ واقعات کو پہلی

جلد میں بیان کیا۔ خصائص دین محمد انہوں نے تلاش و جستجو سے جمع کیے۔

جلد دوم میں حضور کے غزوات، ازواج، امہات اور بقیہ تفصیلات بڑی محنت سے جمع کیں۔ خاص طور پر غزوات کی تفصیلات پر جس انداز سے انہوں نے تحقیق کی ہے وہ بڑے خاصے کی چیزیں ہیں۔ قدیم مصنفین میں اتنا تفصیل سے اور اتنی باریک بینی سے جستجو کرنے کا کسی کو اتفاق نہیں ہوا۔ ایک ایک غزوہ کی جزوی تفصیلات جمع کی ہیں۔ کون سے غزوہ میں کتنے مسلمان شہید ہوئے، یہ تفصیل کم از کم بعد کے سیرت نگاروں میں سب سے پہلے انہوں نے جمع کی۔ کتنے کفار مارے گئے، یہ تفصیل ایک ایک واقعہ کی چھان بین کرکے مرتب کی۔ اس طرح سے انہوں نے دلائل اور اعداد و شمار کی بنیاد پر غزوات کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کی تردید کی۔ اعداد و شمار سامنے آئے تو بہت سی غلط فہمیاں خود ہی دور ہوگئیں۔

ایک عجیب و غریب چیز انہوں نے لکھی جو پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے دن جوڑے۔ انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں 22 ہزار 3 سو 30 دن چھ گھنٹے قیام فرمایا۔ ان میں سے 1856 دن آپؐ نے تبلیغ و رسالت کا فریضہ انجام دیا۔ یوں حضور کی زندگی کے ایک ایک گھنٹے اور ایک ایک منٹ کو انہوں نے جوڑ لیا۔ یہ کسی اور کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ پھر انہوں نے فضیلت انبیا اور رسول اللہ کی صفت رحمت للعٰلمینی پر روشنی ڈالی اور حضور کے پورے پیغام اور سیرت کو رحمت للعٰلمینی کے وصف کی روشنی میں دیکھا اور دکھایا۔

تیسری جلد جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ وہ تین موضوعات پر ہے۔ ایک خصائص النبی، یعنی حضور کی امتیازی خصوصیات جو آپ کو بقیہ انبیا سے ممیز کرتی ہیں۔ قرآن پاک کے خصائص جو آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس میں انہوں نے اعجاز قرآن کو نئے انداز اور نئے زاویہ سے دیکھا ہے جو پہلے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسلام کے خصائص یعنی حضور کی تعلیم کے خصائص کیا ہیں اور یہ خصائص کس طرح حضور کی رسالت کی دلیل ہیں۔

یہاں اس رجحان ساز کتاب کے مندرجات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مفید ہوگا:

رحمۃ للعالمین

جلد اوّل

مقدمہ:

حضرت ابراہیم تا اجداد النبی، عصر جاہلیت، قبیلہ قریش، خصائص دین محمدی، ولادت مبارکہ سے ہجرت مدینہ تک،

پہلا باب: میثاق مدینہ تا خطبہ تبوک

باب دوم: تبلیغی نامہ ہائے مبارک جو معاصر حکمرانوں اور فرمانرواؤں کو لکھے گئے۔

باب سوم: وفود جنہوں نے حاضر خدمت ہو کر اسلام قبول کیا۔

باب چہارم: اہم وقائع عہد نبوی پر ایک عمومی نظر

باب پنجم: خلق نبوی

جلد دوم

بعض مہتم بالشان مسائل پر مشتمل ہے

۱۔ نسب نبوی، اباء و امہات، اعمام و عمات، اولاد و بنات،

۲۔ امہات المومنین، تعدد ازواج، فضائل ازواج نبی،

۳۔ غزوات و سرایا پر ایک عمومی تبصرہ اور دیگر تفصیلات۔ یہ حصہ ادب مغازی میں خاصے کی چیز ہے۔

۴۔ قصص القرآن، فضیلت انبیاء، صفت رحمت

۵۔ حب رسول

۶۔ تقویم اور ہجری کیلنڈر

جلد سوم

تین طویل ابواب

۱۔ خصائص نبوی

۲۔ خصائص القرآن،

۳۔ خصائص الاسلام

یوں اس کتاب کی تین جلدیں قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھیں۔ قاضی صاحبؒ کے ہاں تحقیق، تجزیہ اور عشق رسول کا جو امتزاج ہے یہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ تحقیق کا بھی حق ادا

کر دیا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو گنا اور تولا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو پرکھا ہے۔ تجزیہ جس طرح سے کیا ہے وہ ان کی خاص امتیازی نشان اور اپنی مثال آپ ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق رسول کے بغیر تو یہ کام ہو نہیں سکتا تھا۔ واقعات کو مستند ترین انداز سے پیش کرنے کا جو التزام انہوں نے کیا تھا اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔ کوئی واقعہ کسی غیر مستند کتاب سے نہیں لیا۔ تمام واقعات کو مستند کتابوں، حدیث کی کتابوں اور قرآن پاک سے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی تو بہت جلد مقبول ہوگئی۔ اس وقت بھی اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ چند سال پہلے عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے جو میرے فاضل مصری دوست ڈاکٹر سمیر عبدالحمید نے کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ برصغیر کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی یہ کتاب اپنی اہمیت کے باوجود ایک دوسری کتاب کی چمک دمک کے سامنے ماند پڑ گئی۔ قاضی صاحب کی یہ کتاب یقیناً آسمان تحقیق کا بہت چمکتا ہوا ستارہ تھا، لیکن جب آفتاب تحقیق سامنے آیا تو اس ستارے کی چمک ماند پڑ گئی۔ وہ آفتاب تحقیق مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شاگرد رشید اور جانشین علامہ سید سلیمان ندوی دونوں بنیادی طور پر مورخ اور متکلم تھے۔ ان کی جتنی کتابیں ہیں وہ بیشتر تاریخ اور علم کلام پر ہیں۔ حتیٰ کی جو تاریخ لکھی ہے اس کو بھی انہوں نے کلام بنا دیا۔ ان کی تاریخ بھی کلامی ہے۔ تاریخ لکھنے کا مقصد منکرین اسلام کی تردید، غلط فہمیوں کا جواب اور مسلمانوں کے اندر ایک اعتماد پیدا کرنا ان کی تاریخ نویسی کا مقصد تھا۔

علامہ شبلی کو جب پہلی مرتبہ مستشرقین کے ان خیالات کا اندازہ ہوا تو ان کے دل میں خیال ہوا کہ ان سب اعتراضات اور شبہات کا ایک مفصل جواب لکھا جائے۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ ایک وقت میں سب کام چھوڑ کر صرف اس کام کو کروں گا۔ چنانچہ وہ تمام کاموں سے بے فکر ہو کر اس کام کے لئے وقف ہو گئے۔ ایک ادارہ اسی کام کے لئے انہوں نے قائم کیا۔ اپنا مکان، اپنی جائداد، اپنا باغ اور کتب خانہ اور پیسہ وقف کر کے دائرۃ المعارف النبویہ لکھنے کا منصوبہ بنایا یعنی Encyclopedea of Prophetic Sciences۔ ان کا خیال تھا کہ ابتدائی طور پر یہ انسائکلو پیڈیا چار جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ اس میں سیرت سے متعلق

ہر قسم کے مطالب اور مضامین بیان ہوں گے۔خود ان کے اپنے الفاظ میں 'امہات مسائل پر ریویو، قرآن پاک پر ایک نظر، غرض سیرت نہ ہو، بلکہ انسائکلو پیڈیا ہو۔ان کے ذہن میں یہ تھا کہ مستشرقین کے سارے کام کا جائزہ لیا جائے۔ان کا علمی اور مدلل جواب دیا جائے۔

یہ سب تفصیل علامہ شبلی نعمانی نے کتاب کے مقدمہ میں بیان کی ہے۔سیرت النبی کا یہ مقدمہ بہت عالمانہ ہے۔سیرت کی کتابوں میں بہت کم کتابوں کا مقدمہ اتنا غیر معمولی عالمانہ ہے۔اس میں انہوں نے اپنے ان ارادوں کا اظہار بھی کیا ہے۔استشراق کی تاریخ کا بھی جائزہ لیا ہے۔استشراق کے محرکات کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس پورے کام کا جائزہ لیں گے۔عجیب اتفاق ہے کہ علامہ شبلی نعمانی بھی سرسید کی طرح سے انگریزی یا کوئی مغربی اور زبان نہیں جانتے تھے۔ان کو بھی ضرورت تھی کہ کوئی ان کا معاون ہو اور مغربی کتابوں سے ضروری مواد کا ترجمہ کر کران کو دیتا رہے۔چنانچہ انہوں نے کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے متعین کیا۔ان کے اپنے تلامذہ میں سے کئی لوگ انگریزی جاننے والے تھے۔ جس زمانے میں علامہ شبلی یہ کام کرر ہے تھے،اس زمانے میں ان کے لکھے ہوئے خطوط موجود ہیں۔ایک جگہ لکھا ہے'یورپ کی غلط بیانیوں کی ایک دفتر ہے،ان کے ایک ایک حرف کے لئے سینکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔کم بخت جھوٹ لکھتے ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے۔ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے خود بہت سی بے احتیاطیاں کی ہیں'۔ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہورہے ہیں ان سے کذب وافترا کا عجب منظر سامنے آرہا ہے'۔پھر اس کی مثالیں انہوں نے دی ہیں۔

مارگولیتھ دنیائے استشراق کا بہت بڑا آدمی مانا جاتا ہے۔مستشرقین اس کو اپنا امام سمجھتے ہیں۔سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ اپنی تحریر میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عبدالمطلب مطلب کے غلام تھے بھتیجے نہیں تھے۔یہ ایک بہت بے بنیاد بات اس نے کہی ہے۔اور یہ جو اس نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ low birth سے تعلق رکھتے تھے۔ایک نیچ اور معمولی خاندان سے نعوذ باللہ تعلق رکھتے تھے۔اس کی بنیاد ایک تو یہ بنائی کہ آپ کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔دادا کے چچا کا نام مطلب تھا اس لئے یہ ان کے بھتیجے نہیں تھے بلکہ ان کے غلام تھے۔اور انہوں نے غلام کو اتنی محبت سے رکھا کہ وہ ان کے بھتیجے کے طور پر

مشہور ہوگئے ،اس لئے رسول اللہﷺ کے والد نعوذ باللہ ایک غلام زادے تھے۔ یہ بات مارگولیتھ نے کہی ہے۔ یہ بات بھی اس نے کہی ہے کہ کعبہ رسول اللہﷺ کی ولادت مبارکہ سے صرف سو سال پہلے بنا تھا اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔

ایک اور بات اس امام استشراق نے بڑی عجیب وغریب ، بلکہ بہت فضول اور مضحکہ خیز یہ لکھی ہے کہ رسول اللہﷺ اور حضرت خدیجہؓ لات وعزیٰ کی نعوذ باللہ پوجا کیا کرتے تھے۔ جو الفاظ وہ بیان کرتا ہے وہ یہ ہیں کہ ایک شخص یہ بیان کرتا ہے، اور وہ حضورﷺ کا پڑوسی ہے۔ حضور کا مکان ابولہب کے مکان کے برابر میں تھا۔ یہ تو سب کو معلوم ہوگا۔اسی لئے ابولہب کی بیوی حمالۃ الحطب حضور کے راستے میں کانٹے بکھیرا کرتی تھی۔ابولہب کا کوئی بیٹا یا بھتیجا بیان کرتا ہے کہ ایک رات رسول اللہﷺ اور حضرت خدیجہ عبادت کرر ہے تھے کہ ہم نے آواز سنی۔ یہ دونوں تبصرہ کرر ہے تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ لات وعزیٰ کو پوجتے ہیں۔حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تو لات وعزیٰ پر لعنت بھیجتا ہوں ۔اس طرح کے الفاظ آپؐ نے ارشاد فرمائے۔پھر راوی کہتا ہے کہ لات وعزیٰ وہ بت تھے جن کو یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔یعنی عرب لوگ پوجا کرتے تھے۔مارگولیتھ نے یہ سمجھا کہ یہ شاید رسول اللہﷺ اور حضرت خدیجہ کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ یہ صیغہ جمع ہے اور عربی زبان میں دو کے لئے جمع نہیں بلکہ صیغہ تثنیہ آتا ہے۔ یہ دو حضرات کی بات ہورہی ہے۔مزید برآں اس جملہ کا اگر بالفرض یہی مفہوم ہو جو یہ یہودی فاضل سمجھ رہا ہے تو پھر پہلے دو جملوں کا مفہوم کیا ہوگا جن میں لات وعزیٰ پر لعنت بھیجی گئی ہے۔اب سوائے اس کے کہ یا تو یہ بہت مضحکہ خیز قسم کی جہالت ہے، یا محض زبردستی اور دھاندلی ہے۔

اس طرح کی چیزیں جب کثرت سے مولانا شبلی کے سامنے آئیں تو ان کا جذبہ اور ارادہ اسی طرح پختہ ہوگیا جس طرح سرسید کا ہوا تھا۔ایک جگہ ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر مرنہ گیا ،اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی ،(آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا شبلی کو شدید قسم کی شوگر تھی ،ذیابیطس تھا، جس کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ بھی کٹ گئی تھی اور ایک آنکھ کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی۔تقریباً جواب دے گئی تھی۔اس کی طرف اشارہ کیا ہے) کہا ہے کہ اگر ایک آنکھ بھی سلامت رہی،

تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع دنیا کو کوئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کام وہ تھے جو سیرت کے تعلق سے مولانا شبلی کرنا چاہتے تھے۔ بہت سی کتابیں جو آج عام دستیاب ہیں وہ اس وقت موجود نہیں تھیں۔ البدایہ والنہایہ کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ الروض الانف موجود نہیں تھی۔ ان کی کتابوں کے علاوہ بھی مولانا شبلی اور ان کے زمانہ کے سیرت نگاروں کو بہت سی بنیادی کتابیں دستیاب نہ تھی۔ ان کتابوں کے مخطوطات مصر، استنبول اور یورپ کے کتب خانوں میں بند تھے جہاں جا کر رہنے اور کام کرنے کے لئے بڑی رقم اور وسائل درکار تھے۔ سر سید نے تو جوں توں کر کے ایک سفر لندن کا کر لیا تھا، مولانا شبلی کے لئے یہ بھی شاید اب مشکل تھا۔ وہ ابن کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ کے شدت سے مشتاق اور قائل تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے: 'افسوس! تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں'۔

مستشرقین اور دوسرے مغربی اہل علم کے اعتراضات کا مدلل جواب دینا مولانا شبلی کے پیش نظر روز اول ہی سے تھا۔ ان اعتراضات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

'مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبرؐ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے'۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل مغرب کو یہی بات آج تک ہضم نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کی کوئی دینی یا مذہبی شخصیت اس معیار پر ثابت نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی نے بہر حال یہ کام شروع کر دیا۔ جلد اول کا تمام کام مکمل کیا۔ جلد دوم کا بیشتر حصہ انہوں نے مواد اور یادداشتوں کی صورت میں جمع کر لیا۔ اس کے بعد ان کا وقت موعود آ گیا۔ جب بستر مرگ پر تھے تو انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے تین نمایاں حضرات کو تار دیئے اور ان کو بلا کے یہ سارا کام سپرد کرنا چاہا۔ تین شاگردوں میں ایک نے تو جواب ہی نہیں دیا۔ پتہ نہیں ان کو تار پہنچا کہ نہیں پہنچا۔ انہوں نے نہ کوئی جواب دیا، نہ آئے۔ یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ دوسرے شاگرد تھے مولانا حمید الدین فراہی، جن کو پیغام یا تو دیر سے ملا، یا خود دیر سے پہنچے۔ تیسرے شاگرد

مولانا سید سلیمان ندوی بروقت پہنچ گئے۔ اس وقت استاد زندہ تھے۔ استاد نے ہاتھ کے اشارے سے فقط اتنا کہا 'سیرت، سیرت، سیرت'۔ یہ کہہ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور گویا ان سے وعدہ لیا کہ سیرت پر کام کریں گے۔

سید سلیمان ندوی وسطی ہندوستان میں کسی جگہ ملازمت کرتے تھے، غالباً پونا میں کسی کالج میں استاد تھے۔ انہوں نے استاد کی خواہش کے احترام میں اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ وہیں آ کر بیٹھ گئے پھر مسلسل تیس سال تک استاذ کے بنائے ہوئے مرکز میں بیٹھ کر سیرت النبی کی چھ جلدیں مکمل کر دیں۔ اور اس شان سے مکمل کر دیں کہ استاد چار جلدوں میں کتاب مکمل کرنا چاہتے تھے، شاگرد نے سات جلدیں لکھ دیں۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی دونوں برصغیر کی تاریخ میں جو مقام رکھتے تھے، اس کی وجہ سے سیرت النبی کا چرچا پورے ہندوستان میں اس کے سامنے آنے سے پہلے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ سیرت النبی کے جلد اول کے دیباچے کا پہلا ہی جملہ ہے 'سیرت النبی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے'، اور واقعی گونج رہا تھا۔ پہلی جلد ظاہر ہے کہ استاد کے انتقال کے بعد ہی شائع ہوئی۔ پھر چار چار پانچ پانچ سال کے وقفے سے مزید پانچ جلدیں شائع ہوئیں۔ ساتویں جلد کا مسودہ تیار تھا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے آئے۔ اگرچہ یہ جلد نامکمل ہے، لیکن شائع شدہ موجود ہے۔

شبلی نعمانی کا انداز کیا تھا وہ کس طرح سے سیرت لکھنا چاہتے تھے۔ وہ شبلی کے پہلے ہی جملے سے واضح ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: 'عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے'۔ گویا وہ پوری سیرت کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی شرح بنانا چاہتے تھے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ پھر انہوں نے لکھا کہ 'پہلے فضائل اخلاق کے اصول قائم کئے جائیں، پھر ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔ عملی تعلیم، شبلی کے بقول، وعظ و پند کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے ہو سکتی ہے اور قانون کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سارے طریقے جزوی طور پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں، مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مکمل اثر پذیری اور اثر اندازی کے لئے ضروری ہے کہ فضائل اخلاق کا عملی نمونہ پیش کیا جائے جو انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔ جب عملی نمونہ سامنے آ گیا تو اس کے ذریعے وعظ و پند بھی ہو گیا۔

تصنیف کتب بھی ہوئی اور قوانین بھی آئے۔ گویا ان تین ذرائع نے پہلے ذریعے کی تکمیل کی اور اس طرح فضائل اخلاق کی تکمیل ہوئی۔

سیرت النبی کی جلد اول میں پہلے دو مقدمے لکھے ہیں۔ پہلا مقدمہ ذرا طویل ہے۔103 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ادبیات سیرت میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ بہت سے مسلمان مصنفین نے اس مقدمہ کو بہت وقیع، عالمانہ کام کا شاہکار، مدلل اور گہرے غور وفکر پر مبنی قرار دیا ہے۔ سیرت النبی اس مقدمہ کے بعد ظہور قدسی سے شروع ہوتی ہے جو اردو نثر کی ظہور قدسی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی ظہور قدسی اردو نثر میں ظہور قدسی ہے۔

یہ کتاب بیسویں صدی کیا معنی، بلکہ گزشتہ کئی صدیوں کی ادبیات سیرت کی ممتاز ترین کتابوں میں سے ہے۔ جس طرح سرسید ولیم میور کی کتاب دیکھ کر بے چین ہو گئے تھے اسی طرح مولانا شبلی بھی مارگولیتھ کی کتاب دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ اس کتاب سے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔ حتی کہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک جگہ اس دردمندی کا اظہار کیا ہے۔ یہ کام جو دو انتہائی عالم فاضل انسانوں کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے، اپنے ادبیانہ شکوہ اور زورِ بیان میں اور بیانیہ جمال میں، دلیل کی قوت، تحریر وتجزیہ کی بلندی، روایات کا محدثانہ جائزہ بھی، مورخانہ جائزہ بھی اور متکلمانہ جائزہ بھی، یہ سب پہلو اس کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ شبلی متکلم بھی تھے اور مورخ بھی تھے۔ ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی مؤرخ ومتکلم ہونے کے ساتھ ساتھ علم تفسیر اور علم حدیث کے بہت بڑے فاضل بھی تھے۔ ان دونوں کے قلم سے یہ کتاب مکمل ہوئی۔

لیکن کمال صرف اللہ کے لئے ہے۔ کسی بھی انسانی کاوش کو کمال نہیں ہوسکتا۔ شبلی کے ہاں بھی کمزوریاں ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ شبلی کے ہاں کہیں کہیں ایک معذرت خواہانہ سا انداز پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جو ابتدائی معرکے ہیں ان کے بارے میں مستشرقین لکھا کرتے ہیں کہ یہ مال غنیمت کی خاطر کئے گئے۔ شبلی اس اعتراض سے شاید متاثر ہوئے۔ اب شبلی نے ان غزوات کی اس طرح تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کئی جگہ مسلمانوں کے متفق علیہ نقطہ نظر سے جس کی قرآن پاک سے بھی تائید ہوتی ہے، انحراف سا آ گیا ہے۔ اس میں ان کا قلم تھوڑا سا پھسل گیا ہے۔ غزوہ بدر کے بارے میں خاص طور پر شبلی

کی تحقیق سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔حتیٰ کہ ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اتفاق نہیں کیا۔

یہ تو وہ بڑا کام تھا جو شبلی اور سید سلیمان ندوی کے قلم سے انجام پایا اور آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں یہ کتاب شاید سینکڑوں مرتبہ چھپی ہو۔ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ کتنی مرتبہ چھپی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک اور چھوٹی سی کتاب نکلی جو بیسویں صدی کے ادب سیرت میں نہیں بلکہ پورے ادب سیرت میں ایک بڑا منفرد مقام رکھتی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں بقامت کہتر بقیمت بہتر۔ حجم میں بہت چھوٹی سی لیکن قیمت میں بہت بہتر۔ یہ ان کی کتاب 'خطبات مدراس' ہے۔ اس میں آٹھ مضامین یا آٹھ خطبے ہیں۔ مدراس میں ایک بزرگ تھے شیخ جمال۔ انہوں نے ایک ادارہ بنایا تھا جس کے تحت برصغیر کے مشاہیر کو بلا کر سالانہ کچھ لیکچرز کرایا کرتے تھے۔ اس میں پہلی مرتبہ جو لیکچر ہوئے وہ سیرت پر سید سلیمان ندوی کے آٹھ لیکچرز تھے۔ علامہ اقبال کے جو خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ پر ہیں وہ بھی اسی سیریز کا ایک حصہ ہیں۔ پکتھال کے چھ سات لیکچرز Cultural Side of Islam بھی اسی سلسلہ میں ہوئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے یہ خطبات 1925 میں ہوئے تھے۔ یہ خطبات ادب سیرت میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ پہلے خطبہ میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کی محتاج ہے۔ یہ پہلے خطبے کا عنوان ہے جس کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ بغیر کسی نبی کے حوالے کے انسانیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ انسانیت کے اخلاق، انسان کی روحانیات، انسان کی دینی ضروریات، انسان کی دنیاوی ضروریات، انسان کی فکری ضروریات ان سب کی تکمیل انبیا کی سیرت ہی سے ہوسکتی ہے۔

پھر انہوں نے فرمایا ہے کہ اس ہمہ گیر تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ایک دائمی اور عالمگیر نمونہ موجود ہو۔ جب تک عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل موجود نہ ہو تو سیرت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ پھر انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دائمی اور عالمگیر نمونہ وہی ہوسکتا ہے جو تاریخی طور پر ثابت ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کامل نمونہ بھی ہو۔ زندگی کے ہر گوشے کے لئے نمونہ ہو۔ جامع ہو۔ عملی ہو۔

نظری اور غیر عملی نہ ہو۔ پھر انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ساری صفات رسول اللہ ﷺ پر پوری اترتی ہیں۔ حضور کے علاوہ کسی اور شخصیت کا اسوہ ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ پھر انہوں نے پیغام نبوی کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کیا ہے۔ اسلام کی تعلیم کیا کہتی ہے۔ یہ آٹھ خطبات ہیں جو سیرت کے لٹریچر میں مختصر ہونے کے باجود ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کا دوسرا حصہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر حمید اللہ کا زمانہ ہے جو اس دور کے مجدد علوم سیرت کہے جاسکتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ علم سیرت کا جب آغاز ہوا تو جلد ہی اس کے تین حصے یا شعبے ہوگئے۔ ایک حصہ خاص سیرت کے واقعات اور حوادث پر مبنی تھا۔ دوسرا حصہ غزدات کی تحقیق پر، اور تیسرا حصہ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان تینوں موضوعات پر بہت تفصیل سے نہایت محققانہ انداز میں لکھا ہے اور ان تینوں موضوعات پر ان کی کتابیں بڑی خاصے کی چیزیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر تھے۔ وہ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون، اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کے استاد تھے۔ جب حیدرآباد دکن پر ہندوستان کا حملہ ہوا تو حیدرآباد دکن پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور حملہ شروع تھا۔ کہ وہاں کے وزیر اعظم میر لائق علی خان نے ایک وفد اقوام متحدہ بھیجا تھا۔ حیدرآباد اقوام متحدہ کا رکن تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ بطور انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر کے اس وفد کے رکن تھے۔ وہ حیدرآباد کے پاسپورٹ پر سفر کررہے تھے۔ جب وہ پیرس پہنچے تو حیدرآباد پر بھارت کا قبضہ مکمل ہوگیا۔ یہ قبضہ مکمل ہوتے ہی اقوام متحدہ کی یہ تنظیم بھی سوگئی اور یہ نام نہاد عالمی برادری بھی سوگئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس وقت سے لے کر اور اپنے انتقال تک یعنی 1948 سے لے کر 2000 تک اپنے حیدرآبادی پاسپورٹ کو برقرار رکھا۔ وہ اپنے آپ کو حیدرآباد ہی کا شہری لکھتے تھے اور فرانس میں بطور پناہ گزیں کے مقیم تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ میرے ملک پر ایک غیر ملکی طاقت نے قبضہ کرلیا ہے۔ میں اپنے ملک واپس نہیں جاسکتا۔ جب تک میرا ملک آزاد ہو، اس وقت تک مجھے فرانس میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہر سال وہ پناہ گزینی کے سرٹیفکیٹ کی تجدید کراتے تھے اور انہی سفری دستاویزات پر وہ سفر کرتے تھے۔ میں نے وہ دستاویز خود دیکھی

ہے جس پر شہریت حیدرآباد کی لکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآباد کے آخری شہری تھے جو 2000ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کو خود حیدرآباد اور وہاں کے حکمرانوں نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ پاکستان نے بھی اپنی اور بہت سی اہم ذمہ داریوں کی طرح مجرمانہ طور پر حیدرآباد کو بھی بھلا دیا۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے حیدرآباد کو نہیں بھلایا۔

انٹرنیشنل لا کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کو مسلم انٹرنیشنل لاء میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے مسلم انٹرنیشنل لا کا مطالعہ شروع کیا۔ جب مسلم انٹرنیشنل لا کا مطالعہ شروع کیا تو پتہ چلا کہ آغاز میں مسلم انٹرنیشنل لا اور علم مغازی دونوں ایک فن تھے۔ اس وجہ سے ان کو مغازی سے دلچسپی ہوئی۔ مغازی سے دلچسپی ہوئی تو پتا چلا کہ مغازی اور سیرت رسول دونوں ایک ہی میدان علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں ان کو سیرت سے دلچسپی ہوئی۔ یوں آخر تک یہ تینوں موضوعات ان کی دلچسپی کے موضوعات رہے۔ انہوں نے جتنا کام کیا وہ یا تو مسلم انٹرنیشنل لا پر تھا یا سیرت اور یا مغازی پر تھا۔ انہوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلو نمایاں کیے جو پہلے کسی سیرت نگار کے سامنے نہیں تھے اور کسی سیرت نگار نے ان کو یکجا کر کے بیان نہیں کیا تھا۔ یہ دریافت کہ مکہ ایک شہری ریاست یعنی سٹی اسٹیٹ تھا، ڈاکٹر حمید اللہ کی دریافت تھی۔ انہوں نے قدیم مآخذ سے یہ ساری معلومات جمع کیں۔ اس پر اردو، انگریزی، فرانسیسی، عربی اور جرمن زبانوں میں متعدد تحقیقی مقالات لکھے۔ وہ سات زبانوں میں لکھتے تھے۔ بقیہ زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوتا تھا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے ہی مکہ مکرمہ کے بارے میں سٹی اسٹیٹ ہونے کی بات کی۔ پھر انہوں نے ہی پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں سٹی اسٹیٹ کے آغاز کی بات کی۔ وہ پہلے مسلمان محقق اور سیرت نگار تھے جنہوں نے میثاق مدینہ پر اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ اسلام کی تاریخ تو کیا بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ کا پہلا تحریری دستور ہے۔ انہوں نے اس پر کتاب لکھی The First Written Constitution of the World۔ یہ انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اس کے بعد سیرت کے بعض بنیادی مآخذ کی انہوں نے ایڈیٹنگ کی۔ واقدی کی کتاب الردۃ کی انہوں نے ایڈیٹنگ کی۔ بلاذری کی انساب الاشراف انہوں نے ایڈٹ کی۔ سیرت ابن اسحاق انہوں نے ایڈٹ کی۔ یہ سیرت کے تین قدیم ترین مآخذ ہیں جو پہلی مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ کے ذریعے لوگوں کے سامنے آئے۔

ڈاکٹر حمیداللہ کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عہدِ نبوی کی ڈپلومیسی اور سفارت کاری پر اتنا وقیع اور قابلِ ذکر کام کیا کہ اتنا کام نہ ماضی میں کسی نے کیا ہے، نہ ان کے معاصرین میں کسی نے کیا ہے اور نہ بعد میں آنے والوں نے کیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے مسلم انٹرنیشنل لا پر ایک کتاب لکھی۔ یہ انگریزی زبان میں اس موضوع پر چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ The Muslim Conduct of State۔ اس کے بعد انہوں نے فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو 1933-34 میں پیرس میں چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا Diplomacy During the Days of the Prophet and the Orthodox Caliphs۔ یہ فرانسیسی کتاب کے عنوان کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے جرمنی کی بون یونیورسٹی میں ایک دوسرا تحقیقی مقالہ لکھا جس میں انہوں نے صدرِ اسلام کی ڈپلومیسی میں غیر جانبداری کا تصور کے موضوع پر تحقیق کی۔ ان سے پہلے کسی نے اس کو ایک الگ تصور کے طور پر بیان نہیں کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ 1933 میں جرمنی میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔

انہوں نے اس تحقیق کے دوران یہ محسوس کیا کہ ایسی بے شمار دستاویزات ہیں جو عہدِ نبوی کی سفارت کاری سے متعلق ہیں اور ان کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ساڑھے چار سو کے قریب یہ دستاویزات، وثائق اور معاہدہ جات جمع کئے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے وثیقہ جات کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑا مجموعہ نہ پہلے کوئی مرتب ہوا تھا، نہ ان کے معاصرین میں کسی نے مرتب کیا، نہ ان کے بعد اب تک کسی نے کیا۔

اس کے بعد ان کو خیال ہوا کہ عہدِ نبوی کے میدانہائے جنگ پر ایک کتاب لکھی جائے۔ چنانچہ انہوں نے جب حجاز کا سفر کیا تو مختلف غزوات کے مقامات کو خود جا کر دیکھا اور یہ دیکھا کہ جو تفصیلات واقدی نے بیان کی ہیں وہ موجودہ نقشہ کے مطابق کس حد تک پوری اترتی ہیں۔ واقدی کے بعد غالباً ڈاکٹر حمیداللہ دوسرے آدمی ہیں جنہوں نے خود جا جا کر ان سب مقامات کو دیکھا اور وہاں کئی کئی مہینے رہ کر یہ کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود مجھے بتایا کہ میں نے فیتہ لے کر ناپ ناپ کر ان جگہوں کا تعین کیا اور نقشے بنائے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے ان غزوات کے مقامات کے نقشے بنائے بہت مقبول ہوئے اور مختلف کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ بہت سے مصنفین نے وہ نقشے جوں کے توں اپنی کتابوں میں شامل کر لئے ہیں اور یہ اعتراف نہیں کیا ہے کہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب پہلی بار 1944 میں حیدر آباد دکن میں چھپی جس میں انہوں نے نقشے خود ڈیزائن کئے۔ بعد میں بہت سے مصنفین ان نقشوں کو نقل کرتے آئے ہیں، لیکن اصل کام ان کا تھا۔ ان نقشوں سے غزوہ احد اور غزوہ بدر کی اہمیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

قرآن پاک میں غزوہ بدر کے بارے میں آیا ہے کہ 'اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم' تم نچلی گھاٹی پر تھے، وہ اونچی گھاٹی پر تھے اور قافلہ تمہارے نیچے سے گزر رہا تھا۔ جب تک نقشہ سامنے نہ ہو تو اس کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے نقشہ بنایا۔ اس میں یہی لکھا 'اذ انتم بالعدوۃ الدنیا' تم اِدھر کے ناکے پر تھے، 'وھم بالعدوۃ القصویٰ' وہ پرلے ناکے پر تھے، 'والرکب اسفل منکم' اور قافلہ نیچے سے گزر رہا تھا۔ نقشہ ہو تو پوری بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں کیا بتایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ پوری زندگی اس موضوع پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے یہ تمام تحقیقات تقریباً ایک ہزار مقالات میں بیان کی ہیں۔ ان ایک ہزار مقالات کی فہرست انہوں نے اپنی زندگی میں مرتب کرائی تھی۔ میرے پاس بھی اس فہرست کی ایک نقل موجود ہے۔ لیکن ان ایک ہزار مقالات کے علاوہ ان کی سب سے جامع کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔ اس کا عنوان انگریزی میں ہوگا The Prophet of Islam: His Life and Work۔ ان دونوں جلدوں میں سے جلد اول کا انگریزی ترجمہ ہو گیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس انگریزی ترجمہ سے اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ میں نے دیکھا نہیں۔ جلد دوم کا ابھی انگریزی ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ دونوں جلدیں انتہائی ٹھوس اور جامع معلومات پر مبنی ہیں اور سیرت کے انتظامی، اداراتی، سفارتی، سیاسی اور دوسرے پہلوؤں پر بہت وسیع اور اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔ سیرت کے ان پہلوؤں پر اتنی وسیع معلومات اور کہیں نہیں ملتیں۔

سیرت پر معلومات جمع کرنے کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک ایک چیز حتیٰ کہ لغت اور

ڈکشنریز اور تاریخ و جغرافیہ تک کی کتابوں کو کنگھالا ہے۔ لغت کی قدیم کتابوں میں کوئی لفظ اگر سیرت کے کسی واقعہ سے متعلق آیا ہے تو کس مفہوم میں آیا ہے۔ کسی گاؤں کا نام ہے جواثا۔ وہاں ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ آپؐ اپنی جوانی میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ بات کہ حضور واقعی جوانی میں وہاں تشریف لے گئے تھے؟ اس کا پتہ چلانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جغرافیہ پر جتنی کتابیں تھیں سب دیکھیں۔ لغت پر جتنی کتابیں تھیں وہ سب دیکھیں۔ آخر ایک جگہ یہ مل گیا کہ رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ بظاہر اس تحقیق سے معلومات سیرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ وہاں نہ بھی گئے ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن یہ تعیّن کرنے کے لئے کہ حضور وہاں تشریف لے گئے تھے کہ نہیں، وہ سالہا سال اس تحقیق میں لگے رہے اور ایک ایک چیز پر غور کرتے رہے اور دیکھتے رہے۔

اسی طرح سے انہوں نے بہت سی ایسی چیزوں پر نظر رکھی جو پہلے سیرت نگاروں نے زیادہ اہمیت کی مستحق نہ سمجھی تھیں۔ جغرافیہ سیرت، وثائق سیرت، اداریات سیرت، عسکریات سیرت، سفارت اور سیاسیات سیرت اور سیرت کے بے شمار انتظامی پہلوؤں کے بارے میں ان کے ہاں ایسی ایسی جزوی تفصیلات ملتی ہیں جو دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے ایسے منتشر مضامین ہیں کہ جو اگر یکجا ہو جائیں تو کتابیں شکل میں وہ سارا نقشہ سامنے آجائے گا۔ ایک مضمون انہوں نے مجھے خود بھیجا تھا جو انہوں نے غالباً 1954-55 میں لکھا تھا۔ Military Intelligence during the time of the Prophet of Islam. اس میں انہوں نے حضور کے زمانے میں انٹیلی جنس کے نظام کی تفصیل بیان کی تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے علاوہ سیرت نگاروں کی بڑی تعداد نے برصغیر میں اور برصغیر سے باہر سیرت پر اتنا قابل ذکر اور وقیع کام کیا ہے جس کی فہرست بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ فہرست بیان کرنے میں ایک مشکل یہ ہے کہ بہت سی محترم اور نہایت مقبول و محبوب شخصیات نے سیرت پر کام کیا ہے۔ میں ان میں سے دس بیس کا نام لوں اور بقیہ کو چھوڑ دوں تو کسی کو خیال ہوگا کہ فلاں کا نام نہیں لیا، ان سے کیا کوئی مخالفت ہے؟، بیس کا نام لے لوں تو اکیسویں اور

بائیسویں کے بارے میں یہ خیال ہوگا۔ جتنوں کے نام بھی لوں گا وہ فہرست نامکمل ہی رہے گی اور مکمل نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے صرف نمونہ کے طور پر چند کتابوں کے نام پیش کرتا ہوں جو برصغیر اور عرب دنیا میں لکھی گئیں۔ انڈونیشیا، ملائشیا میں کیا کام ہوا، اس کا مجھے علم نہیں۔ ترکی میں کیا کام ہوا مجھے اس کا بھی زیادہ علم نہیں۔ بعض کتابوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ترجمہ ہوئی ہیں۔ جتنی مشہور کتابوں کا میں نے نام لیا ہے تقریباً یہ سب ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ لیکن ترکی زبان میں خود کون کونسی کتابیں لکھی گئیں، میں نہیں جانتا۔ میری واقفیت انگریزی، فارسی، عربی اور اردو اور جزوی طور پر فرانسیسی تک محدود ہے۔

ایک قابل ذکر کتاب جو اردو میں لکھی گئی۔ مصنف اس کو دو جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ایک ہی جلد لکھ پائے، تاہم جو لکھا وہ بہت قابل ذکر اور انتہائی مستند ہے۔ اس کتاب کا نام ہے اصح السیر۔ مولانا عبدالروف ابوالبرکات داناپوری ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مستشرقین جو اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت کے مآخذ غیر مستند یا غیر معتبر ہیں، اس اعتراض سے نبٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو مستند ترین مآخذ ہیں، یعنی قرآن پاک اور حدیث، ان سے کام لے کر مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا کام محض اعتراض کرنا ہے۔ اعتراض کے جواب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ ایک اعتراض کا جواب دیں گے وہ دس مزید اعتراض کر دیں گے۔ آپ دس کا جواب دے دیں گے وہ بیس اعتراض اور کر دیں گے۔

مولانا عبدالروف ابوالبرکات داناپوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلہ میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا داناپوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی فقہیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں فقہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے،

یعنی نبوت، معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔

ایک اور کتاب جو قدیم محدثانہ انداز کی ہے وہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت المصطفیٰ ہے۔ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ کتاب تمام قدیم کتب سیرت کا نچوڑ ہے۔ جدید سیرت نگاروں سے جہاں جہاں غلطیاں ہوئیں یا کمزوریاں سرزد ہوئیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ معجزات اور بشارات پر خاص زور دیا ہے۔ لیکن مستشرقین کا مولانا کاندھلوی نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ہے۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ کس مستشرق نے کیا کہا ہے۔ نہ انہوں نے ذکر کیا اور نہ ہی غالباً ان کو مستشرقین کے اعتراضات کا علم تھا۔ نہ انہوں نے ان کا جواب دیا۔

اسی زمانے میں جب مستشرقین مآخذ پر اعتراضات کر رہے تھے تو بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ قرآن پاک سے سیرت کا ایک نقشہ پیش کیا جائے۔ جس کے مستند ماخذ ہونے میں ان کا خیال تھا کہ مستشرقین کو تامل نہیں ہوگا۔ یہ کام بہت سے حضرات نے کیا۔ برصغیر میں سب پہلے اس کام سے دلچسپی علامہ اقبال کو ہوئی۔ انہوں نے اپنے بعض اہل علم دوستوں کو توجہ دلائی کہ قرآن پاک کی روشنی میں سیرت کا ایک نقشہ تیار کیا جائے۔ ان کے خطوط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، کئی لوگوں سے انہوں نے کہا۔ غالباً کسی کو فرصت نہیں ملی۔ ان کے انتقال کے کافی عرصہ بعد مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے یہ کام کیا اور وہیں مدراس میں جہاں پہلی بار علامہ سید سلیمان ندوی خطبات مدراس کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ 1957ء میں سیرت پر کچھ لیکچرز دیئے جو قرآن پاک کو سامنے رکھ کر سیرت کے واقعات کو سمجھنے کی پہلی سنجیدہ کوشش تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی خود بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ قرآن پاک پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے قرآن پاک کا ایک ترجمہ اور تفسیر اردو میں لکھی ہے، ایک ترجمہ وتفسیر انگریزی میں لکھی ہے۔ انگریزی کے بڑے اچھے فاضل تھے۔ مغربی مستشرقین کی کتابوں کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ مغربی مصنفین سے مانوس تھے۔ اس لئے انہوں نے ان تمام چیزوں کو پس منظر میں رکھتے ہوئے یہ کتاب تیار کی ہے۔ اردو زبان میں مہارت تو ان پر ختم ہے۔ اردو کے بہت بڑے صاحب طرز ادیب ہیں۔ عالمانہ شان بھی ہے۔ ادیبانہ انداز بھی

ہے۔قرآن پاک پر گہری نظر بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ کتاب ایک منفرد کتاب ہے کہ ایک مفسر قرآن، ایک مفکر، ایک متکلم اور ایک فلسفی کے قلم سے نکلی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے پس منظر میں سیرت کا ایک نیا نقشہ پیش کرتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے کچھ پہلے لیکن ان کے ہم عصر ایک عرب بزرگ محمد عزت دروزہ نے قرآن پاک کی روشنی میں سیرت پاک پر دو کتابیں لکھیں۔ ایک کا نام ہے 'عصر النبی'، پیغمبر کا زمانہ۔ اس میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی جو نقشہ کشی قرآن نے کی ہے اس سب کو یکجا کیا ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کے عقائد، طور طریقے، لوگوں کی عادات، مزاج، انداز، نفسیات اور طور طریقوں سے بحث کی ہے۔ گویا اس ماحول کو انہوں نے قرآن کی روشنی میں re-construct کیا ہے جس ماحول میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔

دوسری کتاب استاذ محمد عزت دروزہ نے سیرت رسول کے عنوان سے لکھی جس میں انہوں نے قرآن پاک سے وہ ساری آیات یکجا کر کے ان کو مرتب کیا ہے۔ ان پر تبصرے کیے ہیں اور ان سے سبق نکالے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن میں آئی ہیں۔ اس میں آپ کی شخصیت، فضائل، امتیازات، مکی عہد، مدنی عہد، دعوت اسلامی کا فروغ، مدینہ کے یہودیوں سے تعلق اور روابط، مغازی، عیسائیوں سے تعلق، منافقین کے بارے میں قرآن پاک میں جو احکام نازل ہوئے، شریعت جو نازل ہوئی، ان سب کی تفصیل انہوں نے قرآن پاک کی روشنی میں دی ہے اور یہ بڑی عالمانہ کتاب ہے۔

عرب دنیا کے ایک اور صاحب علم اور محدث ڈاکٹر محمد محمد ابوشہبہ نے بھی دو ضخیم جلدوں میں قرآن وسنت کی روشنی میں سیرت پر ایک کتاب مرتب کی۔ یہ بھی ایک اچھی کوشش ہے جس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور قرآن مجید کو معیار قرار دے کر روایات سیرت کا محاکمہ کیا ہے اور مستندترین واقعات کے ساتھ ساتھ ان میں پوشیدہ دروس اور عبرتیں بھی بیان کی ہیں۔

ایک اور کتاب جس میں قرآن پاک کی روشنی میں سیرت کو بیان کیا گیا وہ بھی ہمارے برصغیر اور پاکستان کے معاصر بزرگ علامہ عبدالعزیز عرفی کی کتاب ہے۔ وہ شیخ طریقت بھی ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے طریقہ قادریہ سے ان کا تعلق ہے۔ انہوں نے چار جلدوں میں

جمال مصطفیٰ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔اس کتاب میں انہوں نے قرآن پاک کی آیات کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سیرت کے واقعات کو reconstruct کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے متعلقہ آیت کی وضاحت۔ پھر اس میں جس واقعہ کا تذکرہ ہے کتب سیرت کے حوالوں کے ساتھ وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر جہاں جہاں اس واقعہ کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے وہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ کتاب قرآن، حدیث اور سیرت تینوں کا ایک یکجا مجموعہ ہے۔

عسکریات سیرت پر جو کام بیسویں صدی میں ہوا ہے اس کے بارہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ماضی کے کاموں سے بہت مختلف اور منفرد ہے۔ ماضی میں بہت سے لوگوں نے یہ تو کیا کہ سیرت اور غزوات پر مواد جمع کر دیا۔ جزوی تفصیلات بھی جہاں جہاں ملیں وہ جمع کر دیں۔ غزوات میں کن صحابہ نے شرکت کی، کون پرچم بردار تھا اور کون کس ذمہ داری پر مامور تھا۔ یہ ساری چیزیں تو آ گئیں۔ لیکن فنی اعتبار سے جو حکمت عملی حضور نے یا آپ کے صحابہ نے استعمال فرمائی، اس پر متقدمین کے ہاں مواد کم ملتا ہے۔ یہ مطالعہ بہت بہتر اور جامع انداز میں بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ اس کا آغاز بھی برصغیر سے ہوا۔ ہمارے پاکستان کے قابل احترام جنرل محمد اکبر خان نے سب سے پہلے اس پر توجہ کی اور حدیث دفاع کے نام سے اس پر ایک کتاب لکھی۔ حدیث دفاع اردو زبان میں ایک تربیت یافتہ اور تجربہ کار جنرل کے قلم سے رسول اللہ ﷺ کی حکمت حربی کا مطالعہ کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔

اس کے بعد عراق کی ایک مشہور شخصیت بریگیڈیئر جنرل محمود شیث خطاب نے اس موضوع پر بہت کام کیا اور سچی بات یہ ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ پر 'الرسول القائد' کے نام سے کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے حضور کی ماہرانہ قیادت، حربی صلاحیت، حکمت عملی پر فنی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ جتنے صحابہ کرام حضور کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے جو جو کارنامے انجام دیئے، ان سب پر الگ الگ ایک کتاب لکھی ہے۔ ان کی سب کتابیں ملا کر ایک درجن کے قریب ہوں گی۔ ان میں انہوں نے ایک ایک صحابی جنرل کی حربی مہارت کو اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ایک مکمل نقشہ انہوں نے پیش کر دیا ہے۔ اس کے بعد شام کے ایک جنرل مصطفیٰ طلاس تھے، جو شام کے وزیر دفاع بھی

رہے۔ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی حربیات پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ ایک اور ماہر کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور ہدیہ عقیدت تھا۔

برصغیر میں جس شخصیت نے بہت جامعیت کے ساتھ حربیات یا عسکریات سیرت کے موضوع پر کام کیا اور دس جلدوں میں کتاب لکھی، وہ پاکستان کے بریگیڈیئر گلزار احمد مرحوم تھے۔ کتاب کا نام غزوات نبوی ہے۔ خود بریگیڈیئر گلزار حربی تاریخ کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے 1965 کی جنگ پر بھی کتاب لکھی تھی، اور بھی کئی موضوعات پر انہوں نے کتابیں لکھیں۔ آخر میں انہوں نے غزوات نبوی پر قلم اٹھایا۔ دس جلدوں میں اس کتاب کو مکمل کیا ہے اور ہر غزوہ کی تفصیل الگ الگ بیان کی ہے۔ جنرل آغا ابراہیم علی اکرم پاکستان آرمی کے ایک اور جنرل تھے۔ ان کی اصل دلچسپی تو حضرت خالد بن ولیدؓ سے تھی۔ حضرت خالد حضور کے مقرر کئے ہوئے کمانڈر تھے۔ حضور نے ہی ان کو سیف اللہ کا لقب دیا تھا۔ سیف من سیوف اللہ۔ جنرل اکرم کی کتاب کا عنوان بھی Sword of Allah ہے۔ لیکن جنرل صاحب کے بعض مضامین غزوات نبوی پر بھی تھے اور انہوں نے سیرت کے عسکری پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی تھی۔

جنرل اکبر کی جو کتاب حدیث دفاع ہے اس میں انہوں نے حضور علیہ السلام کی حربی حکمت عملی اور طریقہ جنگ، اہم غزوات کا تجزیہ، ہجرت اور یثرب کی دفاعی پوزیشن، اسلام کے اصول جنگ، مقامات جنگ، نتائج جنگ ان سب چیزوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا۔ یہ کتاب کئی بار پاکستان میں شائع ہوئی۔ اور اس قابل ہے کہ کم از کم پاکستان میں عسکری تربیت کے اداروں میں پڑھائی جائے۔

سیرت میں ایک اور قابل ذکر کتاب جو بیسویں صدی کے نصف آخر کیا بلکہ شاید ثلث آخر میں لکھی گئی، نامکمل رہی، وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ہے سیرت سرور عالم۔ مولانا نے اپنی زندگی میں سیرت پر براہ راست تو کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ لیکن سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اپنی مختلف تحریروں میں بہت کثرت سے روشنی ڈالی تھی۔ خاص طور پر تفسیر تفہیم القرآن میں۔ جب تفسیر تفہیم القرآن مکمل ہوگئی تو ان کے بعض رفقا کو یہ خیال ہوا کہ اب تفہیم القرآن کے انداز اور اسلوب کے مطابق سیرت پر بھی کام ہونا چاہئے۔ اس خیال کے تحت

مولانا مودودی کے چند رفقاء نے ان کی کتابوں میں سیرت سے متعلق سارا مواد جمع کر کے دو جلدوں میں مرتب کیا۔ ان میں جلد اول تو ایک تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مضامین اگرچہ بڑے عالمانہ اور مفید ہیں لیکن وہ براہ راست سیرت نبوی پر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سارا مواد ایک پہلو سے سیرت کی تمہید ہے جس میں نبوت، مقام نبوت اور آپ کہہ سکتے ہیں کلامیات سیرت، ماحولیات سیرت، عربوں کے عادات و خصائل جیسے مضامین بیان کئے ہیں۔

جلد دوم اس اعتبار سے بہت قیمتی ہے کہ اس میں مولانا مودودی نے بہت سے وقیع اور گراں قدر اضافے کئے ہیں اور جہاں جہاں خلا محسوس کیا ہے اس کو نئی تحقیق اور نئے مطالعہ سے پورا کیا ہے۔ یہ ولادت سے لے کر ہجرت تک کے واقعات ہیں جو سات آٹھ سو صفحات کی ایک ضخیم جلد میں آئے ہیں۔ مولانا کی یہ کتاب سیرت کے مکمل نقشے کو سمجھنے کے لئے اردو میں چند جید ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بعد مولانا کی عمر میں اللہ نے مزید گنجائش نہیں رکھی تھی، اس لئے وہ آخری حصہ مکمل نہیں کر سکے جس کے بارے میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ مدنی دور ایک بحر ناپیدکنار ہے۔ مولانا کا خیال اس کو ایک الگ جلد میں مکمل کرنے کا تھا، لیکن غالباً اگر وہ لکھتے تو ایک جلد میں مدنی دور کا یہ کام مکمل نہ ہوتا۔ مدنی دور کے لئے کم سے کم دو جلدیں درکار ہوتیں۔ اس لئے کہ اس وقت بھی جو مواد مولانا کی کتابوں میں بکھرا ہوا ملتا ہے، مثلاً تفہیم القرآن میں اور خاص طور پر تفہیم القرآن کی آخری دو جلدوں میں، وہ مدنی دور کے بارے میں اتنا ہے کہ ایک جلد تو صرف اسی مواد سے بن سکتی ہے۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی اب بھی گفتگو طلب ہیں جن کے بارے میں اگر مولانا از سر نو قلم اٹھاتے تو اس میں ایک جلد شاید کفایت نہ کرتی۔

مستشرقین کی علمی خیانتیں بھی مولانا نے جابجا بیان کی ہیں۔ اس کا مقصد مستشرقین کا جواب دینا نہیں، بلکہ مسلمان قارئین کو ان کی گمراہیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ مزید برآں مولانا چونکہ ایک دینی تحریک کے قائد بھی تھے، اور اس دینی تحریک کا مقصد اسلام کا احیا اور اسلامی حکومت کا قیام تھا، اس لئے اس پس منظر میں انہوں نے سیرت کو بیان کیا ہے کہ جب اسلام کا احیا ہو تو کن خطوط پر اور کس انداز پر ہونا چاہئے۔ اس لئے پوری کتاب میں جو ماحول اور اسپرٹ ہے وہ علمی یا تحقیقی کی بجائے تحریکی ہے۔ کتاب میں روح اُس تحریک کی کارفرما ہے

جس کے مولانا قائد تھے۔

ایک اور کتاب جو ہماری یونیورسٹی کے انتہائی فاضل رفیق اور بزرگ ڈاکٹر خالد علوی کی لکھی ہوئی ہے وہ 'انسان کامل' ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور آخری ایڈیشن خاصا ضخیم ہے۔ اس کا انداز بڑا عالمانہ اور تجزیاتی، استدلال قوی اور زبان بڑی رواں ہے۔ اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام بطور شہری، حضور بطور تاجر، حضور بطور حاکم، بطور قاضی، بطور فاتح، بطور ایک شوہر، بطور ایک باپ اور یہ سارے پہلو الگ الگ لے کر ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بطور تاجر حضور کی شخصیت کا نقشہ سامنے آجائے۔ بطور فاتح حضور کی شخصیت کا نقشہ سامنے آجائے۔ یہ سب پہلو انہوں نے بیان کئے ہیں۔

اب میں تھوڑی دیر کے لئے آپ کو عرب دنیا میں لے کر چلتا ہوں۔ تاکہ ایک سرسری نظر وہاں کے کام پر بھی ڈالی جاسکے کہ عرب دنیا میں قابل ذکر کام کیا ہوا۔ عرب ممالک میں سیرت النبی پر یقیناً بہت قابل ذکر کام ہوا ہے۔ درجنوں اور سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ بات میں پھر دہراؤں گا کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے وہ کام (کم ازکم میری ناچیز رائے میں) برصغیر میں ہونے والے کام کے برابر نہیں ہے۔ جتنی جدت اور تنوع یہاں کے کام میں ہے اتنی جدت اور تنوع وہاں نہیں ہے۔

سیرت پر براہ راست تو نہیں لیکن سیرت کے مآخذ اور مصادر پر مستند ترین کام عرب دنیا میں ہوا ہے۔ سیرت کے تاریخی پس منظر یعنی تاریخ عرب قبل از اسلام پر عرب دنیا میں بیسویں صدی میں ہونے والے کام میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں۔ عراق کے ایک مورخ تھے ڈاکٹر جواد علی۔ انہوں سات آٹھ ضخیم جلدوں میں اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے: تاریخ العرب قبل الاسلام۔ یہ ایک انسائکلوپیڈیا ہے جس میں اسلام سے پہلے عرب میں موجود مذاہب، رواج، طریقے، رسوم، تمدن، ریاستیں، حکومتیں، قبائل غرض جو چیز بھی اسلام سے پہلے عربوں سے متعلق تھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ مستند، جامع اور فاضلانہ کتاب روئے زمین پر اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اگر میری رائے پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ اس موضوع پر دنیا کی بہترین کتاب ہے۔

دوسرا کام عرب دنیا میں وہی ہے جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا۔ محمد عزت دروزہ کی عصر النبی۔ اس کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ کا عنوان ہے 'فی الاقلیم والسکان'، جزیرہ عرب کا جغرافیہ اور وہاں کے لوگ، وہاں کا علاقہ اور باشندے۔ دوسرا حصہ ہے 'فی الحیاۃ الاجتماعیۃ' وہاں کی اجتماعی زندگی، یعنی سوشل لائف۔ ثقافت، تہذیب، تمدن، عبادات، مذہب ہر چیز کا تذکرہ ہے۔ تیسرا ہے فی الحیاۃ العقلیہ، ان کی فکری زندگی۔

ایک اور بڑی عالمانہ کتاب جو شاید عرب دنیا کی بہترین کتابوں میں سے ہے اور سیرت اور فقہیات سیرت کے موضوع پر دور جدید کے ایک انتہائی معتبر اور محترم عالم اور فقیہ کی آخری کتاب ہے۔ یہ تین جلدوں میں شیخ محمد ابوزہرہ کی آخری تصنیف 'خاتم النبیین' ہے۔ شیخ محمد ابوزہرہ مصر کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے فقیہ تھے۔ بیسویں صدی میں مصر کے چار پانچ صف اول کے فقہا میں سے ایک تھے۔ فقہ پر ان کی کتابیں انتہائی امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ ان کی آخری کتاب خاتم النبیین 1972 میں شائع ہوئی۔ 1974 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کتاب میں، چونکہ وہ خود فقیہ تھے اس لئے فقہیات سیرت پر بہت زور ہے اور سیرت سے جتنے فقہی احکام نکلتے ہیں یا سیرت کے سیاق وسباق میں جو فقہی امور اہم ہیں وہ انہوں نے بڑی کثرت سے بیان کئے ہیں۔

عرب دنیا میں ایک اور قابل ذکر کام جو سیرت پر ہوا جس کی وجہ سے تین بڑی کتابیں وجود میں آئیں، مقابلۂ سیرت ہے۔ یہ آپ کو یاد ہوگا 1974 میں پاکستان میں ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس ہوئی تھی اور پہلی مرتبہ حکومت پاکستان کے انتظام میں اتنے بڑے پیمانے پر سیرت کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس سیرت کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی کے اس وقت کے سیکریٹری جنرل بھی آئے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال رابطہ کی طرف سے سیرت پر تین بہترین کتابوں پر مصنفین کو انعامات دیئے جائیں گے۔ وہ بہت بڑا انعام تھا، یہ مجھے یاد نہیں کہ کتنی رقم تھی، اس دور کے لحاظ سے خاصی خطیر رقم کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے دنیائے اسلام کی پانچ بڑی شخصیات کی ایک کمیٹی بنائی۔ برصغیر سے مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی، عرب دنیا شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ بن باز اور افریقی ممالک سے نائجیریا کے مفتی اعظم شیخ ابوبکر جومی۔ ان پانچ

آدمیوں پر مشتمل کمیٹی کو تین بہترین کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ تینوں کتابیں جو منتخب ہوئیں وہ برصغیر کے لوگوں کی تھیں۔ پوری دنیا سے کتابیں آئیں لیکن بہترین کتب برصغیر کی قرار پائیں۔ صف اول کی کتاب الرحیق المختوم تھی جس کے بارے میں کل پرسوں ایک دوست نے پوچھا تھا، الرحیق المختوم ہندوستان کے ایک بزرگ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے لکھی تھی۔ دوسرا انعام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر ماجد علی خان کی انگریزی کتاب نے حاصل کیا اور تیسرے انعام کی مستحق کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب تھی، جن کو تیسرا انعام ملا تھا۔ اس کے بعد پاکستان کی وزارت مذہبی امور نے بھی انعامات کا سلسلہ شروع کیا اور ہر سال انعامات مضامین اور کتابوں پر دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سی نئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے لئے ہمیں وزارت مذہبی امور کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

سیرت نگاری میں ایک نیا اسلوب جو بیسویں صدی میں پیدا ہوا وہ سیرت کا ادیبانہ اسلوب تھا۔ ادیبانہ اسلوب کا ذکر سن کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر پہلی صدی میں کوئی اس اسلوب پر کتاب لکھتا تو شاید محدثین اس کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اس لئے کہ اگر ادیبانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کے پس منظر میں کوئی افسانہ، کسی ڈرامہ کی شکل میں یا ادیبانہ شکل میں بیان کی جائے۔ تو یہ چیز تو اسلامی نقطہ نظر سے محدثین کے لئے بالکل ناقابل تصور تھی کہ سیرت کے پس منظر میں واقعات، کہانیاں اور افسانے بیان کئے جائیں۔

لیکن ہمارے دور میں یہ انداز شروع ہوا اور اردو کے علاوہ خود عربی میں بھی اس انداز کی کتابیں لکھی گئیں۔ عربی میں طہٰ حسین کی کتاب علیٰ ہامش السیرۃ اس کا ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ پرانے زمانے میں بھی فتوحات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کو ادبیات کا نمونہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ ایک اعتبار سے ابن اسحاق اور ابن ہشام کی کتابوں میں چونکہ ادب اور قصائد کا بہت ذکر ہے اس لئے اس حصہ یا مواد کو ہم سیرت کا ادبی نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں جس ادیبانہ انداز کا ذکر کر رہا ہوں وہ اور ہے۔ ادیبانہ انداز سے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اردو میں ان میں سے میں صرف دو ایک کا ذکر کروں گا۔

ایک کتاب لکھی گئی آفتاب نبوت۔ یہ ایک مشہور ادیب سید ایوب احمد شاہجہاں پوری

نے لکھی ہے۔ بظاہر یہ کتاب سیرت پر ہے لیکن یہ ایک ادیبانہ کتاب ہے جو کسی حد تک افسانوی رنگ بھی لئے ہوئے ہے۔ ایک دوسری کتاب جو خواتین کے لئے لکھی گئی وہ مولانا راشد الخیری ایک مشہور مصنف نے 'آمنہ کا لعل' کے نام سے لکھی اور برصغیر میں بہت مقبول ہوئی۔ آمنہ کا لال دراصل خواتین اور بچوں کے لئے ہے۔ اس کا انداز میلاد ناموں کا سا ہے۔ لیکن زبان غیر معمولی تھی۔ اس انداز کو بعد میں اور لوگوں نے بھی اپنایا۔ ہمارے برصغیر میں ملا واحدی بڑے مشہور ادیب تھے۔ ان کی کتاب 'سرور کائنات' دو جلدوں میں آئی۔ مولانا ماہر القادری نے 'دُرِّ یتیم' ایک افسانوی انداز میں لکھی ہے۔ 'معراج انسانیت' پرویز صاحب نے لکھی ہے۔ اس کو بھی ادبیات کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ عرب دنیا میں 'علی ہامش السیرۃ' طٰہٰ حسین نے ناول یا افسانہ کے انداز میں لکھی۔ عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی کے کئی ناول سیرت اور خلافت راشدہ کے پس منظر میں ہیں۔ زمانہ اور ماحول وہ ہے لیکن انداز افسانے اور ناول کا ہے۔

لیکن اس موضوع پر سب سے دلچسپ اور البیلی کتاب جو ادبی انداز سیرت کا بہت عمدہ نمونہ ہے وہ برصغیر کے ایک بزرگ مولانا مناظر حسن گیلانی کی ایک کتاب ہے۔ مولانا نے 'النبی الخاتم' کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی۔ اس میں نہ واقعات میں کوئی ترتیب ہے۔ نہ بظاہر اس میں کوئی نئی تحقیق ہے۔ لیکن پڑھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتا ہے گویا لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے۔ میں اس کتاب کا ایک جملہ سنا کر بات ختم کر دیتا ہوں۔ مسجد نبوی کے فرش پر رسول اللہ کے سونے یعنی آرام فرمانے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں کہ: 'وہ فرش خاک پر سویا۔ کیا کہنے اس سونے کے! کہ خاک کو سونا کر دیا'۔

وقت ختم ہو چکا ہے۔ میری فہرست میں تقریباً اتنی ہی کتابیں اور ہیں جتنی کتابوں کا آج کی اس نشست میں تذکرہ ہوا ہے۔ ان میں سے ہر کتاب ایک خاص انفرادیت رکھتی ہے۔ اب ان کتابوں پر تفصیلی تبصرہ تو ممکن نہیں۔ صرف فہرست دینے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔

ضیاء النبی مرحوم جسٹس پیر کرم شاہ کی فاضلانہ تصنیف ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں بیسویں صدی کی آخری قابل ذکر اور اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد تمہیدی مباحث پر مشتمل ہے اور مورخانہ تحقیق کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ آخری دو جلدوں کا موضوع مستشرقین کا تعاقب ہے۔

اسوۂ رسول اکرم اپنے موضوع پر اردو بلکہ شاید تمام اسلامی زبانوں میں ایک منفرد سی کتاب ہے۔ بارہا چھپی ہے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر عبدالحیٔ مشہور شیخ طریقت اور مربی تھے۔ کتاب میں بھی تزکیہ نفس اور تربیتی روح نمایاں ہے۔

سیرت کبریٰ مولانا ابوالقاسم رفقی دلاوری کی مشہور کتاب ہے۔ انداز ادیبانہ اور مواد مستند ہے۔

فقہ السیرۃ کے نام سے عرب دنیا میں کئی اچھی اور مفید کتابیں بھی بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئیں۔ استاذ محمد الغزالی مصری اور ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی نے اس موضوع پر فاضلانہ کتابیں لکھیں۔ آخرالذکر کی کتاب عالمانہ شان بھی رکھتی ہے اور درس سیرت کو بھی موثر انداز میں نمایاں کرتی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے جہاں اور بہت سی مفید اور وقیع کتابیں نکلیں وہاں ان کے قلم گوہر بار نے سیرت کے گوشوں کو بھی سیراب کیا۔ منصب نبوت پر ان کی کتاب اردو زبان میں ایک بہت وقیع اضافہ ہے۔ نبی رحمت سیرت کے ادب میں ایک قابل ذکر کتاب ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب اگرچہ مختصر ہے لیکن استناد میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ یہ کتاب مولانا نے عوام الناس کے لئے لکھی تھی اور ایک دور میں بہت مقبول بھی رہی۔ اب دوسری بہت سی آسان تر کتابوں نے اس کی مقبولیت کم کر دی۔

محمد رفیق ڈوگر کی الامین تین یا چار جلدوں میں اپنی نوعیت کی ایک اچھی کتاب ہے۔ زبان رواں، حوالہ جات مستند اور انداز متوازن ہے۔ بیسویں صدی کی آخری اہم کتاب ہے۔

مقالات کے مجموعے اور رسائل کے سیرت نمبر بھی بیسیوں صدی کی ایک خاص سوغات ہے۔ ایسے مجموعے اور خاص نمبر سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں میں ہیں۔ ان لاتعداد درہائے تابندہ میں نقوش کا سیرت نمبر دور سے چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

غیر مسلم، بالخصوص ہندو اور سکھ مصنفین میں جی ایس دارا کی رسول عربی اور سوامی لکشمن پرشاد کی عرب کا چاند قابل ذکر ہیں۔ دارا کی کتاب بہت جامع، متوازن اور غیر متعصبانہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے دیباچہ نے اس کے اعتبار میں اضافہ کر دیا ہے۔ سوامی لکشمن پرشاد کی

زبان بہت ادبی اور انداز وارفتہ ہے۔ انگریز اور فرانسیسی مصنفین نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں متوازن کتابیں اکادکا مل جاتی ہیں۔

محبوب خدا چوہدری افضل حق کے قلم سے مختصر کتاب ہے۔ انداز بہت ادیبانہ اور البیلا سا ہے۔ چوہدری صاحب مرحوم احرار کے ایک قائد اور مشہور خطیب تھے۔ کتاب میں بھی خطیبانہ انداز جھلکتا ہے۔

بلاغ المبین تین حصوں پر مشتمل ایک کتاب دراصل مکاتیب سید المرسلین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے مرتب کی تھی جو تحریک آزادئ ہند کے ایک اہم رہنما تھے۔ اس کتاب میں اصول تبلیغ ودعوت، فرامین سید المرسلین اور ان سے نکلنے والے نتائج وعبر کو بیان کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول جویائے حق اور معروف مصری ادیب طہ حسین کی الوعد الحق اپنے اپنے زمانہ میں بہت مقبول رہی ہیں۔ یہ سیرت کے ادبی اسلوب کا نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ دونوں کا اسلوب ناول کا سا ہے۔ پس منظر زمانہ نبوی کا ہے۔

پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا ذکر کرکے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ یہ کتاب سیرت منظوم کا اردو میں بہترین نمونہ ہے۔

۔☆۔

سوال وجواب

آپ نے مغرب میں سیرت پر ہونے والے مثبت کام کا ذکر نہیں کیا۔ کیا مغرب میں ایسا کام سرے سے ہوا ہی نہیں؟ کسی نومسلم اسکالر نے مستشرقین کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے یا نہیں؟

میں تو کئی بار یہ اشارہ کر چکا ہوں کہ مستشرقین نے بعض مثبت کام بھی کیے ہیں۔ بعض قابل تعریف اور قابل ذکر کام بھی کیے ہیں جن کا اعتراف کرنا چاہئے۔ بہت سی کتابیں جو پہلے شائع شدہ نہیں تھیں وہ انہوں نے ایڈٹ کر کے شائع کی ہیں۔ اب بعض مستشرقین نے نسبتاً بہت مثبت انداز اختیار کیا ہے۔ بعض مستشرقین نے بہت مثبت انداز میں کتابیں لکھی ہیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ہر کتاب کا الگ الگ تذکرہ ہو تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت کی ایک ببلیوگرافی میں 29 ہزار سے زائد کتابوں کا اندراج ہے، اگر ہر کتاب کا الگ تذکرہ ہو تو بارہ دنوں میں تو اس کی فہرست بھی بیان نہیں ہو سکتی۔

☆

: جناب آپ کا تصنیف ضیاء النبی کی علمی اور تحقیقی حیثیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ضیاالنبی بہت فاضلانہ اور اچھی کتاب ہے۔ اردو کی جن منتخب کتب سیرت کا ذرا تفصیلی تذکرہ کرنا تھا ان میں ضیا النبی بھی شامل تھی لیکن وقت ختم ہو گیا تھا اور کئی اہم باتیں کہنے سے رہ گئیں۔

ضیاء النبی بہت جامع اور محققانہ کتاب ہے۔ اردو میں مبسوط اور مفصل کتب سیرت میں

اس کا ایک اہم مقام ہے۔ضیاء النبی میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں۔ان میں دو خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔ایک تو اس کی زبان بہت اچھی، بڑی عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔مصنف کی نظر بہت وسیع ہے۔ وہ فقیہ بھی ہیں۔ متکلم بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور محدث بھی ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایسا انداز اپنانے کی کوشش کی ہے کہ ان تمام علوم وفنون کے تقاضے اس کتاب میں پورے ہو جائیں۔سات جلدوں کی اس کتاب میں جامعیت بہت ہے۔دوسری اہم خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں وہ کلامی مسائل جو مسلمانوں میں مختلف فیہ رہے ہیں، ان کا بڑا معتدل جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ان کا انداز بیان یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلافات کو کم سے کم کیا جائے۔پیر صاحب بہت مدلل اور ٹھنڈے انداز میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں، لیکن دوسرے نقطۂ نظر کا پورا احترام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

☆

سنا ہے مولانا طاہر القادری نے بارہ جلدوں میں لکھی ہے، کیا وہ آپ نے دیکھی ہے؟

افسوس ہے کہ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔میرے علم میں نہیں۔ یقیناً یہ ایک بہت اچھی کتاب ہوگی۔ڈاکٹر قادری صاحب کی کتابیں بہت فاضلانہ ہوتی ہیں۔لیکن میں پھر یہ عرض کروں گا کہ اس مختصر فرصت میں سیرت کی سب کتابوں کا تذکرہ ممکن نہیں ہے۔

☆

مطالعہ سیرت دور جدید میں آپ نے زیادہ تر توجہ برصغیر اور عرب دنیا پر دی ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ مختصر سے وقت میں دنیائے اسلام کے دیگر خطوں کا ذکر بھی کیا جائے؟

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ برصغیر، عرب دنیا اور چند مغربی ممالک کے علاوہ باقی خطوں کے بارے میں میرے پاس معلومات نہیں ہیں۔انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش وغیرہ میں کیا کام ہوا، اس سے میں واقف نہیں ہوں۔ان تینوں علاقوں کی زبانیں میں نہیں

جاتا تھا۔ وسط ایشیا میں کوئی نیا قابل ذکر کام پچھلے کم از کم سو سال میں نہیں ہوا۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں کئی بار وسط ایشیا جانا ہوا۔ وہاں سیرت پر کسی نئے کام کی کوئی سن گن نہیں ملی۔ ایران میں واقعی قابل ذکر کام ہوا ہے اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ایک بڑا فرق ہے کہ شیعہ مصنفین کے بہت سے مآخذ الگ ہیں اور سنی مصنفین کے الگ ہیں۔ کئی مآخذ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ قابل اعتماد ہیں کہ نہیں۔ ان کا تذکرہ کرنے سے ایک نئی بحث شروع ہو سکتی تھی اس لئے میں ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں چند اصلاحی اداروں نے جنم لیا۔ جامعہ ملیہ، جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ دارالعلوم دیوبند، ان کا سیرت اور مغازی کے میدان میں کوئی اثر و نفوذ ہے کہ نہیں۔

دیکھئے ادارہ جامعہ ملیہ نے تو بطور ادارہ کوئی کام نہیں کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں بطور دیوبند کے سیرت پر کوئی کام نہیں ہوا۔ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ اہل علم نے کام کیا جن میں سے کچھ کا میں نے نام لیا ہے۔ ندوۃ العلما سے وابستہ علما کا میں نے ذکر کیا ہے جن میں سے ایک دو نام تفصیل سے بیان کئے۔ جامعہ ملیہ کے استاذ ڈاکٹر ماجد علی خان کی کتاب کو رابطہ عالم اسلامی کا دوسرا انعام ملا تھا۔ جامعہ ملیہ کے اور لوگوں نے بھی کام کیا ہوگا۔ اس لئے کہ سیرت پر جب کام کا ذکر آئے گا تو افراد کا تذکرہ ہوگا جنہوں نے وہ کام کیا ہے۔ جن اداروں سے وہ وابستہ ہیں ان اداروں کا اس کام میں کیا contribution ہے، یہ کہنا تو بہت دشوار ہے۔

آپ نے ڈاکٹر حمیداللہ کی دو کتابوں کے ترجمے کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک کتاب فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ دوسری کتاب کا انگریزی سے اردو ترجمہ نہیں ہوسکا۔ کیا آپ یہ کمی پوری نہیں کر سکتے؟

میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں کتاب لکھی ہے۔ اس کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ ہوا ہے۔ اس انگریزی سے اردو ترجمہ ہو گیا ہے۔ جلد دوم کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق ارزانی کرے۔

☆

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب کا نام بتادیں۔

سیرت نبوی قرآنی۔

☆

ماجد علی خان اور نصیر احمد ناصر کی کتب کا نام بتادیں۔

۱۔ Muhammad: The Final Messenger

۲۔ پیغمبر اعظم و آخر

یہ دونوں کتابیں لاہور میں بھی چھپ چکی ہیں۔

☆

سیرت النبی، میں کتنی جلدیں علامہ شبلی نے تحریر فرمائیں۔

علامہ شبلی نے دو جلدیں تحریر فرمائیں تھیں۔ پہلی جلد مکمل تھی۔ دوسری کا بہت تھوڑا حصہ رہ گیا تھا۔ جو ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ بقیہ جلدیں علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔

☆

غزوہ بدر کے بارے میں آپ نے جو آیت تلاوت فرمائی وہ کون سی سورۃ میں مذکور ہے؟

غزوہ بدر پر قرآن پاک میں جو بھی تبصرے آئے ہیں وہ سورۃ انفال میں ہیں۔

آپ نے باقی علمائے اسلام کے کارنامے بیان فرمائے، اپنی
کتب کی بھی نشاندہی کریں۔

سیرت اور علوم سیرت کے باب میں میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔

☆

نول کشور جو کہ ہندو تھا، مسلمانوں کی کتب چھپوانے سے اس کا
کیا مقصد تھا؟

وہ کتابوں کا ایک تاجر تھا۔ بظاہر اس نے یہ کام تجارتی اغراض سے شروع کیا تھا۔ اس کا
بظاہر اور کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔

☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں مستشرقین کی کتابیں
بظاہر مسلمانوں کی ایذاء کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رنگیلے
رسول، Satanic verses، ان کا منہج کیا دیگر
مستشرقین سے مختلف ہے؟

مستشرقین نسبتاً زیادہ سنجیدہ ہیں۔ وہ اس انداز کی کتابیں پہلے کبھی لکھتے ہوں گے۔ اب
ان کا انداز نسبتاً عالمانہ ہوتا ہے اور جو بات لکھتے ہیں وہ شواہد اور حوالہ جات کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔

☆

چودہویں صدی کے عظیم مجدد پیر سید مہر علی شاہ چشتی گولڑوی کی
شہرہ آفاق کتاب جو رد قادیانیت پر لکھی گئی تھی، کیا اس کو بھی
سیرت کی کتابوں میں شامل کیا جائے گا؟

میرے خیال میں وہ مناظرہ کی کتاب ہے سیرت کی کتاب نہیں ہے۔ سیف چشتیائی

میں نے دیکھی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد کی تردید میں ہے۔ اگر آپ اس کو سیرت کی کتاب قرار دیں گے تو پھر قادیانیت کی تردید میں جو بھی کتاب لکھی جائے گی وہ سیرت کی کتابوں میں شمار کی جانی چاہئے۔ تو یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا۔

☆

مولانا ولی رازی کی کتاب سیرت پر ایک منفرد کتاب ہے۔

جی ہاں، وہ ایک منفرد کتاب ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر کتاب کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر پچاس کا تذکرہ ہو گا تو مزید پچاس کا ہونا چاہئے۔ سو کا ہو گا تو مزید سو تبصرہ کے لئے موجود ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ بہت سی کتابوں کا تذکرہ نہیں ہو سکا۔

☆

مستشرقین کے علاوہ بعض اہل اسلام بھی حضور کے والدین کو اہل توحید وایمان نہیں سمجھتے۔

میں دوسروں کی رائے کے بارہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو آپ ان سے پوچھیں جن کی یہ رائے ہے۔

☆

دور جدید میں سیرت کے حوالے سے اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی اور پیر کرم شاہ صاحب کی کتاب کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

پیر کرم شاہ صاحب کی کتاب کے بارے میں بیان کر چکا ہوں۔ بہت اچھی عالمانہ اور فاضلانہ کتاب ہے۔ مولانا احمد رضا صاحب کی سیرت پر لکھی جانے والی کسی کتاب سے میں واقف نہیں ہوں۔

☆

غزوہ بدر کے بارے میں شبلی نعمانیؒ کا طرزِ عمل مستشرقین کے سبب شاید نہ ہو۔ کیونکہ حالیہ دور میں شائع ہونے والی اور سعودی عرب سے اول انعام پانے والی کتاب الرحیق المختوم میں بھی غزوہ بدر کے واقعات کو پڑھ کر وہی تاثر ابھرتا ہے جو مستشرقین نے تحریر کیا ہے۔ براہ کرم غزوہ بدر کے پس منظر پر اجمالاً روشنی ڈالئے جو آپ کے خیال میں مستند بھی ہو۔

اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے اختصار سے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اصل میں واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ کفارِ مکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بہت بڑا لشکر تشکیل دینا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لئے انہوں نے فنڈ ریزنگ کا کام شروع کیا ہے اور ایک تجارتی قافلہ اسی کام کے لئے شام بھیجا ہے کہ جب وہ تجارت کر کے آئے تو اس سے آنے والے منافع کا ایک حصہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے استعمال کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تجارتی قافلہ کو روکنا چاہا۔ ایسا کرنا حالتِ جنگ میں بالکل جائز ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں ہے کہ حالتِ جنگ میں آپ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالیں اور دشمن فوج تک ایسے وسائل کی آمد اور رسائی روکیں جو آپ کے خلاف استعمال ہو سکتے ہوں۔ دنیا کا ہر قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ آج کا بین الاقوامی قانون بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنا جائز دفاع کرنے کی خاطر اس کو روکنا چاہا۔

جب آپ اس کو روکنے کے ارادے سے مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے لیکن قریش کی ایک فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آن پہنچی ہے۔ دراصل جونہی قریش کو یہ اطلاع ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ لشکر لے کر نکلے ہیں تو قریش بھی ایک ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس فوج کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی تیاری اور بے سروسامانی کے اس کا مقابلہ کیا۔ حضور تو چونکہ کسی فوجی لشکر کا مقابلہ کرنے نہیں آئے

تھے۔ اس لئے آپ کے پاس عسکری تیاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہت سے صحابہ جو آ سکتے تھے وہ موجود نہیں تھے۔ صحابہ کرام کے پاس اسلحہ بھی پورا نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے جرات اور ہمت سے مقابلہ کیا اور انہیں کامیابی ہوئی۔

یہ غزوہ بدر کی تفصیل ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے۔ یہی تفسیر ہے جو سیرت کی کتابوں میں بھی آئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے یہ چاہا کہ وہ یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ ﷺ قافلہ کو روکنے کے ارادے سے نہیں نکلے تھے۔ اس کے لئے انہیں بہت سے واقعات کی تاویل اور توجیہ کرنی پڑی جو بہت کمزور ہے۔

☆

رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ایک تاریخی واقعہ کے بارے میں میری یا کسی اور کی رائے کا کیا تعلق۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ صحابہ کرام نے انفرادی طور پر پڑھی۔ آپؐ کی نماز جنازہ باجماعت نہیں ہوئی تھی۔ صحابہ کرام تین تین اور چار چار کی تعداد میں حجرہ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اور نماز جنازہ پڑھ کر واپس آجاتے تھے۔ حضورؐ کی نماز جنازہ جماعت سے نہیں ہوئی۔ حضور کی میت مبارکہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی گئی۔ اسی کمرے میں رہے جس میں انتقال ہوا تھا۔ جس بستر پر انتقال ہوا اسی کی جگہ پر قبر مبارک بنائی گئی۔

آپ نے فرمایا کہ عیسائی پادری اسلام کے منفی پہلو تلاش کرکے اعتراضات کرتے ہیں۔ کیا اسلام کے منفی پہلو بھی ہیں؟

منفی پہلو تو ہر چیز میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ایک بزرگ جو بڑے صاحب کرامت تھے لیکن ان کی بیگم صاحبہ ان کو صاحب کرامت نہیں مانتی تھیں اور اعتراضات کرتی رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ بیگم نے کہا کہ رات میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نیک بخت وہ میں ہی تو تھا۔ بیگم نے کہا کہ پھر اسی لئے تو تم ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔

اعتراض تو ہر چیز پر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں الحمدللہ کوئی منفی پہلو نہیں ہے۔ لیکن دشمن جس چیز کو چاہیں قابل اعتراض قرار دے دیں۔ عربی کا ایک شعر ہے

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ

کماأنّ عین سخط تبدی المساویا

جب انسان کی آنکھ یا دماغ میں کجی ہو تو ہر چیز ٹیڑھی نظر آتی ہے۔

☆

اورینٹلزم کے رائٹر کا نام بتا دیں۔

اورینٹلزم کے نام سے کتاب لکھنے والے مصنف کا نام ایڈورڈ سعید تھا۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

☆

مستشرقین جیسے گبن وغیرہ کے نام دہرا دیں۔

گبن مستشرق نہیں تھا۔ گبن تو ایک مورخ اور ایک ادیب تھا جس نے سلطنت روما کے عروج وزوال پر کتاب لکھی ہے۔ جب وہ رومن ایمپائر کے فال کا ذکر کرتا ہے تو ضمناً مسلمانوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرقی رومن ایمپائر کا زوال مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس سیاق وسباق میں اس نے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہاں اس نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں وہی باتیں دہرائی ہیں جو مغربی مستشرقین لکھا کرتے تھے۔ لیکن گبن کو میں اس لئے معذور سمجھتا ہوں کہ گبن اسلام یا اسلامی تاریخ کا ماہر نہیں تھا۔ مغربی تاریخ کا ماہر تھا۔ جب اس نے اسلامی تاریخ کے بارے میں جاننا چاہا ہوگا تو اس کو اپنی زبان میں وہی زہر آلود کتابیں ملی ہوں گی جنہیں پڑھ کر اس نے اپنا متعلقہ باب لکھ دیا۔

برطانوی مصنفین نے ایک معترضانہ کتاب لکھی ہے جس کا نام غالباً Hengress ہے۔ کیا اس کے جواب میں کوئی کتاب لکھی گئی ہے؟

مجھے اس کتاب کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

☆

کیا مستشرقین ہمیشہ سے غیر مسلم ہی رہے ہیں؟

مستشرق تو کہتے ہی اس مغربی پادری یا صاحب علم کو جو مشرقی علوم سے دلچسپی رکھتا ہو۔ مسلمان کو مستشرق نہیں کہتے۔

☆

نعیم صدیقی صاحب کی محسن انسانیت اور محمد عربی دونوں کتابیں کس حد تک مفید اور مستند ہیں؟

بہت مفید ہیں اور بہت مستند ہیں۔ میں نے یہ کتاب اس لئے نہیں چھوڑی کہ میں ان میں سے کسی کتاب کے بارے میں منفی رائے رکھتا ہوں۔ بلکہ انتخاب کی اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

☆

دورِ جدید اور دورِ قدیم میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھی گئی کتابوں میں افغانستان کی contribution کا آپ نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔

میں افغانستان کی contribution سے واقف نہیں ہوں اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں۔ مولانا جامی کی ایک کتاب کا حوالہ کلامیات سیرت کے ضمن میں دے چکا ہوں۔

مولانا جامی کا تعلق افغانستان سے تھا۔ مولانا روم بھی اصلاً بلخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تذکرہ بھی ہوا ہے۔ زیادہ تفصیل میرے علم میں نہیں ہے۔

☆

زرینہ شمیم عالم صاحبہ کی مدد سے بتایا جائے کہ ہمارے سکول اور کالج کے نصابوں میں سیرت النبی پر لکھی گئی کوئی کتاب شامل کرنے کے لئے حکومت کیا کچھ کر رہی ہے؟

میرے علم کی حد تک سیرت کا بہت سے مواد نصابی کتابوں میں شامل ہے۔ اردو، اسلامیات، تاریخ میں سیرت کا خاصا مواد شامل ہے۔ یوں سیرت کا خاصا حصہ نصاب میں کور ہو جاتا ہے۔

☆

ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب جو فرانسیسی میں ہے اور جس کی ایک جلد کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے تو ادارہ تحقیقات اسلامی والے اس کا اردو میں ترجمہ کریں اور جلد دوم کا ترجمہ انگریزی میں کریں۔

واقعی کرنا چاہیے، ادارہ تحقیقات اسلامی کے ذمہ دار حضرات بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے سن لیا ہے۔

☆

آپ کا لیکچر یقیناً فائدہ مند ہے لیکن یہ مطالعہ جو دوسری صدی میں کیا گیا، اس کے باوجود مسلمان اتنی ابتری کا شکار کیوں ہیں؟ آپ یقیناً کہیں گے کہ مسلمان عمل نہیں کرتے۔ لیکن مطالعہ سے عمل کا سبق ملتا ہے تو مسلمان سیرت کی اتنی کتابوں کے باوجود اتنے کمزور کیوں ہیں۔

میرے خیال میں وہی بات ہے جو آپ نے کہی ہے کہ مسلمان عمل نہیں کرتے۔ عمل کرنا چاہئے۔

☆

شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کشمیری کی کتاب خاتم النبیین کس حد تک مستند ہے؟

پہلی بات تو آپ کے علم کے لئے یہ ہے کہ ان کی کتاب خاتم النبیین سیرت پر نہیں ہے، بلکہ ختم النبوت پر ہے۔ بہت مستند کتاب ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری غیر معمولی مستند اور نامور محدث تھے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے محدث تھے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب بھی بڑی مستند تھی۔

☆

آپ نے تمام مرد سیرت نگاروں کے نام بتائے ہیں۔ سیرت نگاری میں کیا کسی عورت نے کام نہیں کیا؟

سیرت کے سب سے بڑے ذخائر حضرت عروہ بن زبیر کو حضرت عائشہ سے ملے ہیں۔ اپنی والدہ حضرت اسما بنت ابی بکر سے ملے ہیں۔ سیرت کا تو آغاز ہی خواتین سے ہوا ہے۔ سیرت کے بارے میں بنیادی معلومات حضرت عائشہ صدیقہ اور بعد میں حضرت اسماء نے دی ہیں۔ ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی نے ایک کتاب سیرت پر لکھی تھی۔ یہ مصر میں صف اول کی ایک خاتون تھیں۔ ایک اور خاتون ہیں جو الجزائر کی ہیں انہوں نے مجھے اپنی کتاب دی تھی لیکن نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ خواتین نے کافی کتابیں لکھی ہیں۔

☆

آپ ولیم میور کی کتاب کا جواب دینے کا بیڑا اٹھائیں تو کیسا رہے گا؟

ضرور بیڑا اٹھانا چاہئے لیکن ولیم میور کی کتاب اب پرانی ہو چکی ہے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی گئی تھی۔ وہ اعتراضات بھی ختم ہو گئے۔ مستشرقین نے وہ باتیں دہرانی چھوڑ دیں۔ اب مستشرقین نئے اعتراضات کرتے ہیں، اب ان نئے اعتراضات کا جواب دینا چاہئے۔

☆

ہم نومسلم اسکالر علامہ اسد کو کس نقطہ نظر سے دیکھیں۔

اسد بہت فاضل انسان تھے۔ بہت مخلص انسان تھے۔ ان کی کتابیں بڑی عالمانہ ہیں آپ ان سے ضرور استفادہ کریں۔ لیکن میرے علم کی حد تک انہوں نے سیرت پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔

-☆-

بارہواں خطبہ

مطالعہ سیرت

مستقبل کی ممکنہ جہتیں

بارہواں خطبہ

مطالعہ سیرت
مستقبل کی ممکنہ جہتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری

جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب

محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی

محترم جناب ڈاکٹر ایم ایم قریشی

برادران محترم،

خواہران معظم

آج اس سلسلہ کی آخری گفتگو ہے۔ اس کا عنوان ہے 'مطالعہ سیرت' مستقبل کی ممکنہ جہتیں۔ لیکن اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان گزارشات پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے جو گزشتہ گیارہ دنوں میں پیش کی گئی ہیں۔ گزشتہ گیارہ دنوں کی ان گفتگوؤں میں ہمارے سامنے تین بنیادی حقیقتیں آئی ہیں جن کو میں اختصار کے ساتھ دہرانا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی حقیقت جو ابتدائی تین چار گفتگوؤں میں پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ کا ہر پہلو، آپ کی زندگی کا ہر گوشہ اور آپ کی سنت اور طرز عمل کا ہر ذرہ اور ہر شمہ مکمل طور پر اس طرح سے محفوظ ہے کہ ہزار ہا لوگوں نے اس کو دیکھا۔ سینکڑوں نے اس کو قلمبند کیا۔ یاد کیا۔ اور انتہائی اعتماد، ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ اسے آئندہ آنے والی نسل یعنی ہزاروں تابعین تک پہنچایا۔ پھر ان ہزاروں تابعین میں سے سینکڑوں تابعین نے اس کو قلمبند کیا۔ سینکڑوں تابعین نے اس کو زبانی یاد کیا اور اسی اعتماد، محبت، دیانت داری اور جذبہ اشتیاق سے اس کو آئندہ نسل تک پہنچایا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور سے یہ سارا ذخیرہ جو پہلے ہی زبانی یاد بھی کیا جاچکا تھا اور ضبط تحریر میں بھی لایا جاچکا تھا باقاعدہ مدوّن اور کتابی صورت میں مرتب کرلیا گیا۔ صحابہ کرام نے جو ذخیرہ تابعین تک پہنچایا تھا اور تابعین نے جس طرح اس کو قلم بند کیا تھا اس کا بڑا حصہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

دوسری حقیقت میں نے یہ پیش کی تھی کہ سیرت مبارکہ کے بارے میں جو کچھ معلومات اس وقت موجود ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ، ان کا بنیادی حصہ اور ان سے متعلق معلومات کا اساسی حصہ قطعی اور یقینی طور پر محفوظ ہے۔ قرآن مجید اور سنت ثابتہ کی حامل کتابوں کے ذریعے، صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری مستند کتابوں کے ذریعے وہ ہم تک پہنچا ہے۔ واقعات سیرت کے جس تفصیلاتی اور فروعی حصہ کے بارے میں بعض احتیاط پسند مسلمان اہل علم تحفظات رکھتے ہیں، یعنی وہ فروعی امور جن کی بنیاد مورخین کی دی ہوئی تفصیلات اور بعض دوسرے حضرات کی جمع کی ہوئی معلومات پر ہے۔ وہ سیرت النبی کی کسی اساسی پہلو پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اگر یہ ساری معلومات موجود نہ بھی ہوتیں تو بھی سیرت النبی پر کوئی فرق نہ پڑتا۔ سیرت النبی کے تمام واقعات، اس کے تمام احکام، اس کی تمام اساسات، قرآن مجید کے علاوہ کتب حدیث کی مستند ترین کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان سے جو احکام نکلتے ہیں۔ ان سے جو رہنمائی ہمارے سامنے آتی ہے، وہ فقہائے اسلام نے پہلی صدی کے اواخر سے مرتب کرنا شروع کردی تھی۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں بڑے بڑے اور جید فقہائے اسلام نے ان تمام احکام کو مجموعوں کی شکل میں محفوظ کردیا تھا۔ ان میں سے بہت سے مجموعے آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو انتہائی اعتماد، انتہائی بصیرت اور احساس افتخار کے ساتھ اور اس اعتماد وافتخار اور بصیرت کے ساتھ ساتھ اللہ کے حضور احساس تشکر اور امتنان کے ساتھ اس پورے ذخیرے پر

مکمل اطمینان قلبی کے ساتھ اعتماد کرنا چاہئے۔

یہ ذخیرہ مذاہب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ مذاہب کی تاریخ میں کسی اور شخصیت، دوسری تہذیبوں کی تاریخ میں کسی اور قائد یا رہنما کے بارے میں اتنے تیقن کے ساتھ اتنی تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو خود مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ایک مغربی مصنف فلپ کے حتی نے لکھا ہے کہ Muhammd (ASW) was born in full light of history. حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں آپ کا بڑے سے بڑا مخالف اور بڑے سے بڑا دشمن اور گستاخ بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ آپ کی ذات تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ آپ کی ذات مبارکہ کے علاوہ تمام انبیا علیہم السلام کے اپنے ماننے والوں نے ان کی اپنی تاریخی حیثیت کے بارے میں تامل کا اظہار کیا ہے۔ برٹرینڈ رسل جیسا آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کو غیر حقیقی اور افسانوی مانتا ہے۔

تیسری اہم حقیقت جو اس گفتگو میں ہمارے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جس امت کی تشکیل فرمائی تھی اور جس امت کے تحفظ کے لئے مدینہ منورہ میں ایک مثالی ریاست کی بنیادیں ڈالی تھیں وہ امت آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ امت مسلمہ میں کمزوریاں پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں در آئی ہیں۔ اس سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ لیکن اس حقیقتِ واقعہ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ جس اساس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام امت مسلمہ کو قائم فرما کر گئے تھے، امت مسلمہ میں وہ اساسات بڑی حد تک موجود ہیں۔ نظری اعتبار سے تو سب کی سب موجود ہیں۔ بہت سی اساسات عمل کے اعتبار سے بھی موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ سابقہ مذہبی شخصیات میں سے کسی کو دوبارہ زندگی عطا کر کے دنیا میں واپس بھیج دے تو اس میں سے کسی کے لئے بھی اپنی قوم اور اپنی امت کو پہچاننا ممکن نہیں ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی بھی عیسائی ملک میں جا کر شاید یہ اندازہ نہ کرسکیں کہ یہ میرے ماننے والے لوگ ہیں۔ ان کی تعلیم، ان کے نظریات، ان کے احساسات، ان کا طرز عمل ہر چیز سے مسیحی دنیا اتنی دور ہوگئی ہے کہ شاید چند افراد جو بعض عبادت

گاہوں میں محدود ہوں، ان کے علاوہ آپ کی تعلیم کی چھاپ، آپ کی شخصیت کی پرچھائیں عیسائی دنیا میں کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔ یہ بات تقریباً تمام مذہبی شخصیات کے پیروکاروں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ آج اگر دنیا میں تشریف فرما ہوں اور مسلمانوں کے کسی بھی ملک یا علاقہ کو اپنے وجود مبارک سے عزت بخشیں تو حضور ﷺ کو یہ پہچاننے میں ایک لحہ کا تامل بھی نہیں ہوگا کہ یہ آپ ہی کی قائم کردہ امت ہے۔ اذانیں، نمازیں، قرآن مجید کی درس وتدریس، تلاوت، لوگوں کے رہن سہن کے عادات، حرام وحلال کی بڑی حد تک پابندی، لوگوں کے اخلاق، لوگوں کے لباس، خواتین اور مردوں کے میل جول کے آداب اور طرز عمل، شادی کی تقریب ہو یا غمی کا موقع، ان مواقع کے آداب، ان میں بیشتر امور اب تک آپؐ کی عطا فرمودہ شریعت کے مطابق چل رہے ہیں۔ بلاشبہ اس میں بہت سی خرافات بھی مسلمانوں نے شامل کرلی ہیں، بہت سی چیزیں غیر مسلموں کی بھی اپنالی ہیں، لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے پہلو ابھی تک موجود ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی سنت پر مبنی ہیں۔ یہ بات ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے کوئی غیر مسلم بھی انکار نہیں کرسکتا۔

ایک اور اہم حقیقت جو گزشتہ گیارہ روز کی گفتگو سے ہمارے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں پر ان کی چودہ سو ستائیس سالہ تاریخ کے کسی بھی دور میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا۔ ان چودہ صدیوں میں کوئی پوری صدی تو درکنار، کسی صدی کا ایک عشرہ، کسی عشرہ کا کوئی ایک سال، کسی ایک سال کا کوئی ایک مہینہ ایسا نہیں گزرا کہ دنیائے اسلام کے کسی نہ کسی گوشہ میں مسلمان سیرت اور سنت کے ذخائر سے اعتنا نہ کررہے ہوں یا سنت رسول کے بارے میں پڑھنے پڑھانے اور درس وتدریس کا کام جاری نہ ہو۔ یہ کام اتنے تسلسل اور تواتر سے ہوا ہے کہ خود برصغیر جیسے علاقے میں جہاں ابتدائی صدیوں میں خاصی کوتاہیاں ہوئی ہیں، گزشتہ دو صدیوں میں ہزارہا کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان ہزارہا کتابوں میں سینکڑوں کتابیں اس کی مستحق ہے کہ ان کا الگ الگ تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ پھر یہ تو وہ کتابیں ہیں جو مصنفین نے بطور سیرت کی کتابوں کے تصنیف کی ہیں۔ جو مقالات کے مجموعے، رسائل میں شائع ہونے والے مضامین، اخبارات میں نکلنے والی تحریریں اگر جمع کی جائیں تو اس کام کے لئے ایک پورے دفتر

کی ضرورت ہوگی۔ یہ گزشتہ گیارہ دنوں میں ہونے والی گفتگو کا خلاصہ تھا۔

آج کی گفتگو میں چار بنیادی باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات رسالت مآب کے کے حوالے سے ہماری اور آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ جو قوم جتنی بڑی امانت کی حامل ہوتی ہے، اتنی ہی بڑی ذمہ داری کی حامل بھی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا منصب ہو، اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ اگر منصب خیر الامم کا ہے تو ذمہ داری بھی اسی کے حساب سے ہوگی۔

دوسری بات آج کی گفتگو میں یہ دیکھنی ہے کہ علم سیرت کے حوالے سے اہل مغرب کا اس وقت کیا رویہ ہے۔ دنیائے مغرب میں سیرت کے حوالہ سے کیا کام ہو رہا ہے۔ سیرت کے باب میں بنیادی باتیں کیا کہی جارہی ہیں اور ہمیں اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہئے۔

تیسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اہل مغرب سے قطع نظر خود مسلمان اہل علم اور مسلمان دانشوروں کو اور مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کو سیرت کے باب میں کئی اہم امور اور ضروریات کو محسوس کرنا چاہئے اور ان کے بارہ میں کیا کچھ کرنا چاہئے۔ کن کن جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور کون سے ایسے موضوعات ہیں جو ابھی تشنۂ تحقیق ہیں۔

گفتگو کا آخری حصہ بعض تجاویز کے بارے میں ہے جو جناب وزیر محترم کے تشریف لانے پر عرض کروں گا۔

ذمہ داریوں کے حوالہ سے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ امت کی اساس توحید کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی بلکہ رسالت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ توحید کے علمبردار یہودی بھی اپنے کو کہتے ہیں۔ توحید کے علمبردار ماضی میں بھی بہت رہے ہیں لیکن جو چیز رسول اللہ ﷺ کی امت کو یہودیوں اور دوسرے مدعیان توحید سے ممتاز کرتی ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ پر ایمان اور توحید کی اس تعلیم اور ان تفصیلات کے ساتھ ایمان ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمائی ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو وہاں یہودی موجود تھے۔ وہ توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ کسی شرک میں بھی مبتلا نہیں تھے۔ ان میں بت پرستی کا بھی کوئی رجحان نہیں تھا۔ بلکہ توحید کے بارے میں بڑی حد تک وہ انہی عقائد پر قائم تھے جو یہودیوں میں روز اول سے چلے آرہے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں مـــــن دون

المومنین، (یعنی مسلمانوں سے الگ) ایک امت قرار دیا۔ ان کو مسلمانوں کے علاوہ ایک مستقل بالذات امت قرار دیا۔ مسلمانوں کا جز قرار نہیں دیا۔ اس لئے کہ امت مسلمہ میں شمولیت کے لئے توحید کے ساتھ ساتھ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ جو آپ نے توحید کے بارے میں دی، خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات بابرکات اور آپ کی رسالت اور نبوت پر ایمان شرط ہے۔ اب اگر امت کی اساس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ پر ایمان ہے تو آپ کی ذات سے وابستگی مضبوط بنانے کے لئے امت کو کیا کرنا چاہئے؟

عربی زبان میں امت کے دو مفاہیم آتے ہیں۔ ایک مفہوم میں امت وہ گروہ یا برادری ہے جو ایک ماں اور اس کی اولاد کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ یہ تو لغوی معنی ہوئے۔ امت کے ایک اور لغوی معنی کے اعتبار سے وہ شخص بھی امت ہے جس کی طرف لوگ رہنمائی کے لئے رجوع کرتے ہوں۔ من یقصد الیه الناس ۔ من یؤم الیه الناس ۔ فُعلة کا وزن اس شخص کے لئے آتا ہے جس کی طرف لوگ وہ فعل کرتے ہیں۔ رُحلہ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ سفر کر کے آتے ہوں۔ محدثین میں سے بعض کا لقب رحلہ بتایا جاتا ہے۔ امام نسائی کو رحلہ کہا جاتا تھا۔ ان کی طرف لوگ سفر کر کے آتے تھے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے اُمّہ کے معنی ہوں گے جس کی طرف لوگ قصد کریں۔ یعنی امت مسلمہ کو اپنی ذات اور طرز عمل سے ایسا ہونا چاہئے کہ لوگ رہنمائی کے لئے اس طرف رجوع کریں۔ لوگ اس کی طرف مائل ہوں۔ اس طرز عمل اور رویہ سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں۔

لیکن اصطلاحی اعتبار سے امت سے مراد وہ گروہ یا جماعت ہے جس کی اساس اور بنیاد ایک ہو۔ جس کے اہداف اور مقاصد ایک ہوں، جس کی منزل مقصود ایک ہو۔ جو ایک ماں کی اولاد کی طرح متحد ہو۔ جو ایک ہدف کی طرف گامزن ہو۔ جس میں وحدت کی ساری اقسام موجود ہوں۔ ایسے گروہ یا قوم کو امت کہا جائے گا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی فرد امت کہلایا۔ اس لئے کہ وہ تنہا تھا انجمن میں۔ اِنّ ابراہیم کان امۃً قانتاً للّٰہ حنیفاً، ابراہیم تن تنہا ایک امت تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور توحید کا علمبردار نہیں تھا۔ توحید کی تعلیم کے لئے لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعد میں دوسرے لوگ شامل ہوتے چلے گئے اور امت بنتی گئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بچپن میں اور بعد میں بعض ایسے افراد عرب میں موجود تھے جو توحید پر کاربند تھے۔ ملت ابراہیمی کی اپنی فہم وبصیرت کے مطابق پیروی کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچا بھی تھے۔ جن کو ان کے رشتہ داروں نے پریشان کر کے مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کی دعوت کو حضرت عمر فاروقؓ نے قبول کیا تو انہوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ جس طرح کی تعلیم آپ دیتے ہیں، میرے چچا بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ تو قیامت کے دن میرے چچا کا کیا مقام ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا 'یُبعَثُ امۃً وحدہ'، ان کو تن تنہا ایک امت کے طور پر اٹھایا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی ذات میں تن تنہا ایک انجمن تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور اس نظریے اور اس ہدف، اس طرز عمل اور رویہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کو ایک برادری قرار دیا گیا، مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دیا گیا۔ امہات المومنین کو مسلمانوں کی روحانی مائیں قرار دیا گیا۔ 'وازواجہ امھاتھم'۔ رسول اللہ ﷺ کا روحانی باپ ہونا اس سے خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر حضور کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں تو حضور مسلمانوں کے روحانی باپ ہیں اور عربی زبان مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ اگر مادری زبان وہ ہوتی ہے جو ماں بولتی ہو، تو مسلمانوں کی روحانی مائیں تو عربی بولتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان سے تین اسباب کی وجہ سے محبت کی تلقین کی گئی۔

اَحِبوا العرب لثلاث: تین چیزوں کی وجہ عربوں اور عربی سے محبت کرو۔ قرآن عربی میں ہے۔ میری زبان عربی ہے۔ گویا تمہاری مادری زبان عربی ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ لیکن امت جو ایک مرکز یعنی ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وابستگی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ یہ تین چیزوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ قرآن پاک کا علم، سنت کا علم اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور طرز عمل کا علم جو سنت کا ہی ایک بڑا شعبہ ہے۔ تسمیۃ الجزء باسم الکل۔ یہ عربی کا ایک اسلوب ہے۔ اس لئے سیرت کو الگ بھی بیان کیا جاتا ہے۔

یہ علم جب تک عشق یعنی ایک گہرے قلبی احساس اور روحانی وابستگی کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو، اس وقت تک کارگر نہیں ہے۔ اگر علم اس عشق یعنی قلبی احساس اور دلی وابستگی کے بغیر ہے،

تو علامہ اقبال نے اس کو ابلہی کہا ہے۔ ایک ایسا علم جس میں قلبی واردات شامل نہ ہوں، علامہ اقبال اس کو بے بصری قرار دیتے ہیں۔

وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و واردات حکیم

حکمت اور کلیمی دونوں کو یکجا کئے بغیر وہ جذبہ ایمان پیدا نہیں ہوسکتا جو ملت مسلمہ اور امت اسلامیہ کی وحدت اور تحفظ کے لئے ضروری ہے۔ اگر عشق کے بغیر علم ہو تو وہ گمراہی ہے۔ علم کے بغیر عشق ہو تو ابلہی ہے۔ یہ مسلمانوں کا طرز عمل اور رویہ سیرت کے بارے میں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے اس کو میں ابھی عرض کرتا ہوں۔

اہل مغرب نے سیرت کے بارے میں گزشتہ دو سو سال کے دوران جو لکھا ہے، اس کا ہم نے ان گیارہ دنوں میں ایک سرسری جائزہ لیا۔ لیکن اگر استشراق کی پوری تاریخ سامنے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک کر کے مغربی مستشرقین اور دانشور اسلام کی بنیادوں کو ہدف بناتے رہے۔ میں یہاں ان حضرات کو شامل نہیں کرتا جنہوں نے خالص علمی جذبے سے مثبت تحقیقی کام کیا اور جن کے مثبت کام کا اعتراف ہر مسلمان کو کرنا چاہئے۔ یہاں اہل استشراق کا وہ بدنصیب گروہ موضوع گفتگو ہے جو پوری زندگی اس ماحول میں گزارنے کے باوجود، پوری زندگی قرآن وسنت کی ورق گردانی کے باوجود، پوری زندگی سیرت کے ذخائر پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود اس سے اثر پذیر نہ ہوا۔ جس کے دل تک اس نور کی روشنی نہیں پہنچی، وہ بدنصیب مراد ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ انہوں نے ذات رسالت مآب پر اخلاقی حملے کئے۔ کوئی مسلمان ان گستاخیوں کو نہ دہرا سکتا ہے اور نہ ان کی کوئی مثال بیان کرسکتا ہے۔ ان سب کا مقدور بھر جواب دینے کی کوشش کی جاتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود کئی سو سال تک گستاخیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد میں انہوں نے خود ہی اس کو بے نتیجہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ شاید ایک مسلمان بھی ایسا نہیں نکلا جس نے ان کتابوں یا تحریروں کے نتیجے میں ذات رسالت مآب سے وابستگی چھوڑ دی ہو یا اس کے دل میں آپ کی ذات مبارکہ سے عقیدت میں کمی آئی ہو۔

اس کے بعد قرآن پاک اعتراضات کا ہدف بنا۔ قرآن پاک کے بارے میں یہ کہا گیا

کہ یہ اہل کتاب کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔قدیم مذہبی ادب اور کتابوں سے سرقہ کی ہوئی چیزیں ہیں۔وقتاً فوقتاً قرآن پاک کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا رہا۔اب مستشرقین کے ہاں اس نوعیت کی باتیں ختم ہوگئی ہیں۔اس لئے کہ ان کو یہ محسوس ہوا کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔قرآن پاک اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔اپنے ثبوت اور ثقاہت کے اعتبار سے، اپنے معانی اور مطالب کے اعتبار سے۔کہ اب اس کے بارے میں اس نوعیت کی بات کرنے کو خود انہوں نے غیر علمی اور غیر عقلی سمجھا۔اب قرآن مجید پر اور انداز کی بات کرتے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے چار پانچ جلدوں میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔اس میں قرآن پاک کے بارے میں دور جدید کے صف اول کے مستشرقین کے منتخب مضامین شائع ہوئے ہیں۔ان مضامین میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ایک عجیب وغریب بات یہ کہی گئی ہے کہ قرآن پاک میں صرفی نحوی اغلاط ہیں۔اس بات کو بہت زور وشور سے بیان کیا گیا۔کئی سال پہلے جب یہ کتاب نئی نئی شائع ہوئی تھی تو مجھے ایک مغربی ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔وہاں ایک صاحب جو مسلمانوں کے ساتھ دوسروں کے مقابلہ میں قدرے ہمدردی رکھتے تھے، ان سے کئی روز گفتگو رہی۔انہوں نے ایک دن اس کتاب کا ذکر کیا اور زور دے کر کہا کہ قرآن پاک میں صرفی ونحوی اغلاط پائی جاتی ہیں۔یہ بڑی عجیب بات ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ انگریزی زبان کی قدیم ترین گرامر کی کتاب کب لکھی گئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔میں نے کہا چلیں کسی اور سے معلوم کر لیتے ہیں۔کسی سے پوچھا تو بتایا گیا کہ دوسو یا سوا دوسو سال پہلے لکھی گئی تھی۔میں نے کہا کہ اگر اس کتاب میں، یا انگریزی گرامر کی کسی کتاب میں، (پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش میں بہت سے لوگوں نے انگریزی گرامر کی کتابیں لکھی ہیں)، اگر انگریزی گرامر کی کسی کتاب میں اور شکسپیئر کے کلام میں کوئی تناقض ہو تو آپ شیکسپیئر کو نحوی غلطی کا مرتکب کہیں گے یا اس کتاب کے مصنف کو غلطی کا مرتکب اور اس کے بیان کو غلط قرار دیں گے جس نے گرامر کی کتاب لکھی ہے۔کہنے لگا کہ یقیناً مصنف نے غلط لکھا ہوگا۔میں نے کہا کہ عربی زبان میں گرامر کی جو قدیم ترین کتابیں لکھی گئی وہ نزول قرآن کے دوسو برس بعد لکھی گئیں اور غیر عربوں نے لکھیں۔اگر قرآن مجید میں گرامیٹکل مسٹیک ہوتی تو کفار مکہ اور مشرکین اور پوری عرب دنیا خاموش نہ رہتی اور اس

غلطی کا بتنگڑ بنادیتی۔ وہ عرب فصحاء جو قرآن کے چیلنج کے جواب میں خاموش تھے، وہ اس غلطی کی نشاندہی کرتے۔ لیکن کبھی بھی کسی بڑے سے بڑے ادیب اور عرب کے بڑے سے بڑے شاعر نے قرآن مجید کے کسی اسلوب یا انداز کو عربی زبان اور گرامر سے متعارض نہیں کہا۔ پھر میں نے ان سے عرض کیا کہ اردو زبان میں قدیم ترین گرامر ایک مغربی مصنف ڈاکٹر گل کرائسٹ نے لکھی تھی۔ گل کرائسٹ کی گرائمر اردو کی قدیم ترین گرامر ہے۔ میں نے کہا کہ اردو وہ ہے جو مرزا غالب نے لکھی ہے، خواہ گل کرائسٹ کچھ بھی کہے۔ مرزا غالب کی کوئی تحریر اگر ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سارے قواعد کے خلاف بھی ہوگی تو یہی کہا جائے گا کہ گل کرائسٹ کی کتاب غلط ہے، اس نے اردو زبان کے قواعد کو غلط سمجھا ہے۔ گل کرائسٹ کے کسی بیان سے مرزا اسداللہ غالب کا کلام غلط نہیں ہوگا۔ اردو وہ ہے جو مرزا غالب نے لکھی، جو ابراہیم ذوق نے لکھی۔ اردو وہ ہے جو میر تقی میر نے لکھی۔ اگر ان اساطین اردو کے برخلاف اردو کے کسی بڑے سے بڑے ماہر صرف نے کوئی بات لکھی ہے تو وہ غلط ہے۔

لہٰذا عربی زبان وہ ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے۔ عربی زبان وہ ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے نکلی۔ جس کو دشمنوں نے، اپنوں پرایوں دونوں نے عربی زبان کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیا۔ جنہوں نے قرآن مجید کے ادبی اعجاز کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ لہٰذا اس اصول کی رو سے قرآن مجید اور حدیث رسول کی زبان ہی اصل، معیاری اور ٹکسالی عربی زبان ہوگی اور اگر گرامر کی کسی کتاب میں اس کے خلاف لکھا گیا ہے تو غلط لکھا گیا ہے۔ بہر حال یہ وہ باتیں ہیں جو آج کل قرآن پاک کے بارے میں تلاش کر کر کے لائی جارہی ہیں۔

کچھ دن پہلے یمن کی ایک قدیم مسجد کی چھت گر گئی تھی۔ اس کی چھت کے اندر سے قرآن پاک کے بعض نسخے دریافت ہوئے تھے۔ یہ بات عربی زبان کا ہر طالب علم اور خاص طور پر دینی مدارس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ پرانی کتابوں میں سطور کے درمیان الفاظ کے معنی لکھے ہوتے تھے۔ بین السطور معانی اور تشریحات لکھ لینے کا یہ رواج صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ بعد میں دور طباعت کے آجانے پر بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ بین السطور حواشی چھپے بھی ہوتے تھے اور لوگ خود بھی لکھا کرتے تھے۔ یمن کے ان پرانے نسخوں

میں سے قرآن پاک کے ایک نسخے میں نسخہ مرتب کرنے والے نے کچھ معانی اور مفاہیم لکھے ہوئے تھے۔ یہ شاید ان مغربی ماہر کو یہ طرز حاشیہ نویسی معلوم نہیں تھا جنہوں نے اس کو دیکھا۔ انہوں نے پوری دنیا میں ایک شور مچا دیا کہ قرآن پاک کا ایک نیا نسخہ دریافت ہوا ہے۔ وہ موجودہ نسخہ سے مختلف ہے اور مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوگیا کہ قرآن اُسی انداز سے چلا آرہا ہے۔ اور یہ دیکھو قرآن کا ایک نیا version سامنے آگیا ہے۔ یہ ویسا ہی ایک ورژن ہے، جیسے بائبل کے ورژن ہوتے ہیں، یا گوسپل کے ورژن ہوتے ہیں اسی طرح قرآن کا ایک نیا ورژن ہے۔

ڈاکٹر زماں صاحب نے مجھے اس مضمون کی کاپی دی۔ پڑھا تو اس میں واقعی وہی باتیں تھیں اور مثالیں بھی دی گئی تھیں۔ میں نے وہ مضمون لے لیا۔ اور ایک بین الاقوامی اجتماع میں ایک جگہ جانا تھا وہاں وہ مضمون بھی ساتھ لیتا گیا۔ وہاں یمن کے وزیر اوقاف تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے میں نے اس نسخہ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ آج کل میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ مجھ سے یہی سوال پوچھتے ہیں۔ میں اس قدیم نسخہ کی فوٹو کاپیاں کروا کر لایا ہوں۔ انہوں نے ایک فوٹو کاپی مجھے بھی دی۔ بین السطور میں معنی اور مفاہیم لکھے ہوئے تھے۔ حاشیہ پر بھی لکھے ہوئے تھے۔ انگریز یا وہ مغربی مصنف جس نے مضمون لکھا تھا، اس نے یہ سمجھا کہ یہ قرآن پاک کا کوئی نیا ورژن ہے اور حاشیہ پر جیسے نسخہ کے ویریئیشنز یا اختلافات لکھے ہوتے ہیں یہ وہ اختلافات ہیں، وہ جو وضاحتی کلمات تھے وہ ان کو نسخہ کے ویریئیشنز سمجھا۔

قرآن پاک پر ناکام توجہ دینے کے بعد انہوں نے حدیث پر توجہ دینی شروع کردی۔ حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے بارے میں کچھ اشارے میں گزشتہ گفتگوؤں میں عرض کرچکا ہوں۔ فقہ پر اعتراضات ہوئے۔ ان میں سے بعض کی میں نے نشاندہی بھی کی ہے۔ مآخذ سیرت کے بارے میں جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ آپ کے سامنے تفصیل سے آچکا ہے۔ آج کل مستشرقین کے ہاں ایک عام رجحان یہ ہے کہ اب اسلام میں اچھائیوں کا اعتراف تو کیا جانے لگا ہے لیکن دو اعتبارات سے۔ ایک تو یہ کہ جو اچھائیاں تھیں وہ اسلام میں کسی سابقہ دور میں تھیں۔ The Magesty That Was Islam. کے نام سے ایک بڑے مستشرق نے کتاب لکھی کہ وہ عظمت جو اسلام کی شکل میں تھی۔ یعنی وہ ماضی کا ایک

قصہ پارینہ تھا، اب نہیں ہے۔ اس لئے کہ ماضی کی چیز کا اعتراف کرنے میں فوری طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے اب ماضی کے حوالے سے بعض خوبیوں اور یورپ پر اسلام کے احسانات کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ دوسری چیز یہ کہ اگر اسلام میں کوئی اچھائی ہے تو وہ ہم سے ماخوذ ہے۔ اسلامی قانون میں بہت ارتقا ہوا ہے تو وہ رومن لا سے ماخوذ ہے۔ مذہبیات میں ہوا ہے تو وہ عیسائی مذہب سے ماخوذ ہے۔ تہذیب وتمدن میں ہوا ہے تو وہ ایران اور روما سے ماخوذ ہے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی چیز اپنی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ باہر سے حاصل ہوا ہے۔

تاریخ اسلام کے بارہ میں مستشرقین کی تحریروں سے جو بے شمار غلط فہمیاں پھیلی ہیں ان کا ایک مجموعی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عام تعلیم یافتہ (مغرب زدہ) طبقہ میں اسلامی تاریخ پر سے اعتماد روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ جو لوگ مغربی مآخذ سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے پورے چودہ سو سالہ دور کو لوٹ مار اور قتل وغارت اور اسلام سے مسلسل اور اجتماعی انحراف کا دور سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں اسلام کا معیاری اور مثالی نظام (جس کو بہت سے محض عقیدتاً اور روایتاً ہی معیاری اور مثالی مانتے ہیں) محض چند سال چلا اور بعد کی ساری صدیاں اسلام کی نہیں، اسلام سے انحراف کی تاریخ ہیں۔ یہ عقیدہ صرف اسلام کے بارہ میں بے اعتقادی اور بے یقینی پیدا نہیں کرتا بلکہ خود ذات رسالت مآب اور آپ کے عالی مقام جانشینوں کی کارکردگی کے بارہ میں منفی تاثر کو جنم دیتا ہے۔ سیرت وپیغام رسول کی معنویت، اثر خیزی اور دوام کو عامۃ الناس کے ذہن نشین کرنے کے لئے تاریخ اسلام کی نئی تدوین بھی ناگزیر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں وہ چیزیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارے موجود ہیں۔ مستند ترین احادیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے بارے میں آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں نے اس زمانے میں حضور کی ذات سے منسوب کی تھیں جب مسلمان محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آئیڈیلائز (idealize) کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک مستشرق نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ کی زندگی پر تین سطحیں یا تین ردّے (Layers) بٹھائے گئے ہیں۔ ایک تو اصل محمد ہے۔ اس کے اوپر

آئیڈیلائیزیشن کی لیر (Layer) ہے۔اس آئیڈیلائزیشن کی لیئر کو ہٹانے میں یا اس ردے کو پڑھانے میں یہودی اور مسیحی لٹریچر میں انبیا کے بارے میں جو کچھ تھا وہ سب کچھ لے کر حضور کی ذات سے منسوب کردیا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے سو سے زائد حکمرانوں کو تبلیغی خطوط لکھے، اس بات سے اانکار کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی نقل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا تھا اس لئے یہ بات حضور سے بھی منسوب کردی گئی ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان صحابہ کا انتخاب کیا جو ان ممالک کی زبانوں اور طور طریقوں سے واقف تھے، اور ان اقوام کے ذمہ دار لوگوں کو جانتے تھے۔انہوں نے کہا کہ یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے نقل کیا گیا ہے۔اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن apostles کو بھیجا تھا وہ متعلقہ زبانیں جاننے والے تھے۔

یہاں تک کہ غزوہ بدر کے بارے میں جب صحابہ سے حضور نے مشورہ کیا اور حضرت حباب المنذر نے کہا کہ یا رسول اللہ، آپ چلیں اور اگر آپ ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ جائیں گے اور ہم ان یہودیوں کی طرح نہیں کہیں گے جنہوں نے کہا تھا کہ 'اذھب انت وربک فقاتلاانا ھاھناقاعدون' ۔اس پر ایک فاضل مستشرق نے باقاعدہ مضمون لکھا ہے جو ایک کتاب کی شکل میں شائع بھی ہوا ہے۔اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دراصل اس بات کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کو یہودیوں سے برتر ثابت کیا جائے اور مسلمانوں کے پیغمبر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اونچا ثابت کیا جائے۔ اس لئے کہ یہودیوں نے اپنے پیغمبر کا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا اور صحابہ کی زبان سے یہ کہلوایا جارہا ہے کہ یہ اپنے پیغمبر کا ساتھ دیں گے۔

اس کے بعد ایک اور دلچسپ بات جو اسی مصنف نے لکھی ہے، وہ یہ لکھی ہے کہ انصاری صحابہ اور مہاجر صحابہ میں اور پھر انصاری تابعین اور مہاجر تابعین میں، پھر انصاری پارٹی کے حامیوں اور مہاجر پارٹی کے حامی سیرت نگاروں میں مقابلہ تھا۔ مہاجر پارٹی کے سیرت نگار چاہتے تھے کہ مہاجر صحابہ کی عظمت ثابت کریں اور انصاری پارٹی کے سیرت نگار چاہتے تھے کہ انصاری صحابہ کی عظمت ثابت کریں۔ چنانچہ بدر کے موقع پر جو شوریٰ ہوئی تھی اس میں مختلف

صحابہ نے اظہار خیال کیا۔ بعض روایات میں ایک صحابی کا ذکر ہے۔ بعض روایات میں دوسرے صحابی کا ذکر ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محدثین کا طریقہ ہے کہ وہ الگ الگ راوی اور الگ الگ استاد کے واقعات کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ یہ بات حدیث کا ہر ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت تھی جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بات ارشاد فرمائی۔ اس کے راوی اتفاق سے حضرت عروہ بن زبیر ہیں۔ اس پر ان مستشرق صاحب کی رگ تحقیق پھڑکی۔ انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ اپنے نانا کی عظمت کے لئے عروہ بن زبیر نے ان سے منسوب کیا ہے۔ ایک اور روایت کسی اور تابعی یا تبع تابعی سے ہے، اس میں حباب بن المنذر کا ذکر ہے۔ اس بارہ میں مستشرق صاحب فرماتے ہیں کہ یہ انصاریوں کی عظمت کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اب اس طرح کے اعتراضات کا جواب دینا میرے خیال میں ایک کارلا حاصل ہے۔ جب کسی شخص کے دل میں پہلے سے بدنیتی بیٹھی ہوئی ہو اور وہ صحابہ کرام اور تابعین کے بارے میں یہ رویہ رکھتا ہو کہ انصاری صحابہ اپنا نام آگے لانا چاہتے تھے اور مہاجر صحابی اپنی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے، اور ساری احادیث کو اس نقطہ نظر سے دیکھ کر بیان کرنا چاہے، تو اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہوسکتا۔

یہ ایک عجیب اور افسوس ناک امر ہے کہ بہت سے مغربی اہل علم اور مستشرقین بے جھجک صحابہ کرام، تابعین اور دوسرے اکابر اسلام کی نیتوں پر حملے کرتے ہیں، ان کے اندرونی عزائم اور محرکات تک کا علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی مادی اور دنیوی خواہشات کو ان کی تمام علمی اور دینی کاوشوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی تمام ''تحقیقات'' اسی نقطہ کے گرد گھومتی ہیں۔ لیکن اگر ہم اہل مشرق میں سے کوئی ان کی نیتوں اور عزائم کے بارہ میں (جن کو وہ خود چھپانے کی ذرا کوشش نہیں کرتے) اظہار خیال کرے تو ہمارے اپنے ''محققین'' تک کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اس کو معروضی اور مقصدی تحقیق کے تقاضوں کے خلاف قرار دیتے کر اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔

اس ماحول اور اس ذہنی رویہ کی موجودگی میں علمی جواب جتنا بھی دلائل اور معقولیت سے دیا جائے گا، وہ بے اثر ہی رہے گا۔ اگر پہلے سے یہ بدگمانی اور بدنیتی بیٹھی ہو اور صحابہ کرام میں

دنیاداروں کی طرح کے محرکات تلاش کرنے کے لئے کوئی پہلے ہی سے بھرا بیٹھا ہو۔ تو اس طرح کے محرکات تو ہر شخص کی ذات اور ہر شخص کے ارادوں میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کا ایک ہی ہدف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ہدف نہیں ہوسکتا۔ وہ ہدف یہ ہے کہ مسلمانوں میں ذات رسالت مآب کے ساتھ جو وابستگی موجود ہے، اس کو کمزور کیا جائے۔ اس وابستگی کی علمی بنیادوں کو مشکوک ٹھہرایا جائے۔ اس وابستگی کی علمی بنیادوں کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلا دیئے جائیں تاکہ مسلمان ایک ایک کرکے اس لڑی سے نکلتے جائیں جس میں ان کو پرویا گیا ہے۔

اس وابستگی کو کمزور کرنے کے لئے ہمارے ہاں بھی بہت سے عناصر موجود ہیں۔ خود علم کی کمی ایک بہت بڑا سبب یا عنصر ہے۔ اس کی وجہ سے ان کوششوں کو اپنے اثرات پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سیرت کے بارے میں بعض بنیادی معلومات کی کمی ہے۔ سنت کے بارے میں بعض بنیادی حقائق سے متعلق انتہائی ضروری باتوں کے بارے میں واقفیت عام نہیں ہے۔ قرآن پاک کے معانی اور مطالب کے بارے میں بعض بنیادی امور لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی اثرات سے جو چیزیں آرہی ہیں۔ وہ کتابوں کے ذریعے، صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے لحہ لحہ لوگوں کے دماغوں میں اتر رہی ہیں۔ لوگ اس کو سن بھی رہے ہیں، پڑھ بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جو چیز مسلمانوں کے پاس ایک دفاعی لائن کی حیثیت رکھتی تھی، وہ سیرت رسول سے وابستگی، علم کی بنیاد پر اور ذات رسالت مآب سے گہری وابستگی کی بنیاد پر تھی جو خاصی کمزور ہوچکی ہے اور دن بدن تیزی سے مزید کمزور بلکہ ناپید ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے ہماری سب سے پہلی ذمہ داری علم کی اس کمی کو دور کرنا ہے جو ذات رسالت مآب، آپ کی سیرت، آپ کی سنت اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے بارے میں پائی جاتی ہے۔

دوسرا بڑا سبب یا عامل وہ لامذہبیت اور سیکولرزم ہے جس کا فروغ مغربی دنیا اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ مغربی دنیا نے ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد سیکولرزم کے ہدف کو حاصل کیا ہے۔ سیکولرزم کے ظہور کے اسباب اور اس کے آغاز وارتقاء کی تاریخ بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن ایک غیر معمولی نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد اور اہل مذہب کے ہاتھوں

لاتعداد مظالم اٹھانے کے بعد اہل مغرب نے واحد راہ عافیت یہی سمجھی کہ مذہب کے لبادے کو اتار پھینکیں۔ مذہب کی جو شکل ان کے ہاں مروج تھی وہ دنیاوی معاملات میں رہنمائی دینے کے قابل نہیں تھی۔ ان کے ہاں مذہب کا استحصال صرف ایک طبقہ کی بالادستی کے لئے کیا گیا۔ وہ طبقہ کم وبیش ایک ہزار برس تک انسانوں کی گردنوں پر مسلط رہا۔ اس طبقہ کی غلامی سے نکلنے کے لئے ان کو اہل مذہب کے خلاف بغاوت کرنی پڑی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں مذہب اور اجتماعی زندگی الگ الگ ہوگئے۔ اب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جہاں بھی مذہب کے نام پر کوئی اجتماعی نظم قائم کیا جائے گا تو وہ اسی نمونے کا ہوگا جس نمونے کا ان کے ہاں قائم تھا۔ ان کے خیال میں جب دین کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں گے تو وہ اسی انداز کے قوانین ہوں گے جس انداز کے مغرب میں بنائے گئے۔ جن کو زبردستی نافذ کرنے کے لئے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا۔

دنیائے اسلام کا نہ یہ پس منظر ہے۔ نہ یہاں وہ صورت حال ہے جو مغرب کے دور تاریک میں پیدا ہوئی۔ نہ ہمارا کوئی دور الحمدللہ دور تاریک ہے۔ لیکن آج ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے لوگوں کے ذہن ضرور تاریک ہیں۔ ان میں علم وہنر کا لوازمہ تو بہت بھر دیا گیا ہے، دین واخلاقیات اور روحانیات کی روشنی سے وہ البتہ محروم ہیں۔ اپنی تاریخ اور ثقافت وروایت سے ناواقفی کی وجہ سے وہ مغرب کی لااخلاقی اور لاروحانی اقدار سے متاثر ہورہے ہیں۔ سیکولر معاشرت دنیائے اسلام میں علم کی کمی کی وجہ سے مقبول ہورہی ہے۔ دینی پابندیوں سے جو لوگ نالاں ہیں وہ اس صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کو یہ منظر بہت پسند آتا ہے کہ مذہب سے برائے نام وابستگی بھی برقرار رہے اور مذہب کے دائرے کو گھر اور مسجد تک محدود کردیا جائے۔ مذہب کے دائرے کو محدود کرکے زندگی کے باقی تمام گوشوں سے نکال دیا جائے۔ اخلاق اور روحانیات کو ملک بدر کیا جائے اور اس کو چند عمارتوں یا عبادت گاہوں میں محدود کردیا جائے۔ جیسے جیسے یہ ہوتا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مسلمانوں کے لئے بے معنی ہوتی جائے گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کا تو بنیادی سبق فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ ہے۔ اگر دنیاوی حسنہ دین کی رہنمائی سے خارج ہے تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا دو تہائی حصہ تو irrelevant ہوجاتا ہے۔

پھر مختلف علوم وفنون کی شکل میں، سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز کی شکل میں، جو عام مغربی گمراہیاں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہی ہیں وہ گمراہیاں مسلمانوں میں بھی آئے دن پیدا ہورہی ہیں۔ مسلمان ان سے متاثر ہورہے ہیں اور ان عقائد اور نظریات کو دہراتے رہتے ہیں جو مغرب میں ایک طویل عرصہ سے گمراہیوں کی ذریعہ بن رہے ہیں۔ ذرائع علم کے بارے میں جو مغربی تصور ہے وہ مسلمانوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہورہا ہے۔ جیسے جیسے ذہن مسموم ہوتے جائیں گے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایت اور رہنمائی مسلمانوں کے لئے بے معنی ہوتی جائے گی۔ یا اس کی معنویت گھٹتی چلی جائے گی۔

ان ساری باتوں کے باوجود اہل مغرب کو شاید یہ اندازہ ہوچکا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے مسلمانوں کی وابستگی اتنی گہری اور مضبوط ہے کہ اس طرح کی جزوی کاوشوں سے اس کو کم کرنا یا ختم کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً یہ توہین کے واقعات کا ارتکاب جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ کبھی فضول کتابیں لکھوائی جاتی ہیں، کبھی کارٹون چھاپے جاتے ہیں، یہ سب مظاہر جان بوجھ کر ایک ایک کرکے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے دل میں جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے اور آہستہ آہستہ لوگ ان چیزوں کو دیکھنے کے عادی ہوجائیں۔ برائی اگر بار بار ہوتی رہے تو لوگوں کی نظروں میں پھر وہ برائی نہیں رہتی۔

چچ نامے میں لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کے آنے سے پہلے ہندوستان کا جو حکمران تھا، اس کو کسی نجومی نے مشورہ دیا کہ تم فلاں لغو اور غیر اخلاقی حرکت کرو تو بادشاہت پر قائم رہو گے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جو شخص فلاں غیر اخلاقی حرکت کرے گا وہ بادشاہت حاصل کرے گا۔ یہاں نجومی نے بادشاہ کو ایک بہت مکروہ اخلاقی حرکت کا سبق دیا کہ تم اگر یہ حرکت کر گزرو گے تو تمہاری حکومت قائم رہے گی۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ میں اگر ایسی حرکت کروں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ نجومی یا وزیر نے جواباً کہا کہ لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن بادشاہ کو تامل تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں لوگ بہت سخت ردعمل کا اظہار کریں گے۔ کہا گیا کہ اچھا ایک دن انتظار کریں۔ مشورہ دینے والے وزیر بدھیمن نے ایک بھیڑ منگوائی جس کے بال بہت بڑے بڑے تھے۔ اس کے بالوں میں ایک خاص مصالحہ لگایا جس سے بال بہت لمبے ہوگئے اور اس کی کمر ہاتھی کے سائز کی ہوگئی۔ بادشاہ سے کہا گیا کہ

اس بھیڑ کو شہر میں لوگوں کو دکھانے کے لئے نکالیں۔ چنانچہ اس عجیب وغریب بھیڑ کو دیکھنے کے لئے پورا شہر امڈ آیا۔ سارے شہر میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ پورے شہر میں چرچا ہو گیا کہ ایک عجیب طرح کی بھیڑ آئی ہے جو ہاتھی کے سائز کی ہے۔ تمام دن سب لوگ اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ شہر میں اور کوئی کام نہیں ہوا۔ بازار بند ہو گئے۔ دوسرے دن پھر بھیڑ کو شہر کی گلیوں میں پھرانے کے لئے نکالا تو آدھے لوگ آئے۔ تیسرے دن کوئی نہیں آیا۔ جس وزیر نے یہ مشورہ دیا تھا اس کا نام بدھیمن تھا۔ بدھیمن نے کہا کہ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ پہلے دن لوگ بہت تذکرہ کریں گے۔ دوسرے دن تھوڑا سا ذکر کریں گے۔ تیسرے دن کچھ نہیں کہیں گے۔

شاید اہل مغرب نے بدھیمن نجومی کا مشورہ پڑھا ہوا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس طرح کی بھیڑیں نکالتے رہتے ہیں۔ توہین رسالت کے جو واقعات وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں یہ کوئی اتفاقی واقعات نہیں۔ یہ واقعات بڑے غور وخوض اور سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔ جو قومیں دنیا پر حکومت کر رہی ہیں۔ جو دنیا کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ جو مسلمانوں کے اندرونی احساسات کا پتہ چلانے کے لئے ادارے بناتے ہیں۔ اس کام پر کروڑوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے آئندہ عزائم کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔ ان کو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ ذات رسالت مآب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات جب ایک ایک کرکے پیش آتے جائیں گے تو جو مسلمانوں کے اندر کے جذبات ہیں وہ نکلتے جائیں گے۔ ایک مرحلہ خدانخواستہ ایسا آ سکتا ہے اور ان کا اندازہ یہی ہے کہ ایسا مرحلہ آنے والا ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب ہو اور مسلمان کسی ردعمل کا اظہار نہ کریں۔ جب وہ مرحلہ خدانخواستہ آ جائے تو پھر وہ اگلے مرحلے کا آغاز کریں گے جس میں اس وابستگی کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے جو اقدامات انہوں نے سوچ رکھے ہیں وہ کریں گے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ گزشتہ دو سو برس سے یہ کام بھی ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کی توجہات کو ایسے غیر عملی مسائل میں الجھا دیا جائے جو مسلمانوں کو تقسیم در تقسیم بھی کرتے رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی قوت عمل کو بھی ختم کرتے رہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت کے بارے میں بعض ایسے سوالات جو مسلمانوں میں کبھی نہیں اٹھے تھے۔ انیسویں صدی میں

اٹھے۔ آخر انیسویں صدی میں کیا نئی بات ہوئی تھی۔ انیسویں صدی میں ہی وہ مسائل کیوں اٹھائے گئے۔ وجہ صرف ایک ہی سمجھ میں آتی ہے۔ یہ مسائل مسلمانوں میں اس لئے اٹھ سکے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی حاکم ہوگئی تھی۔ اس لئے اٹھ سکے کہ عیسائی پادریوں کا ایک سیلاب آ گیا تھا۔ اس لئے اٹھے کہ ہندوؤں میں سے بہت سے طبقات کو انگریزوں نے کھڑا کر کے اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے عقائد پر حملے کریں۔ یہ آریہ سماجی اور برہمو سماجی ازخود تو کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ یہ کسی خاص ہدف کی خاطر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ یہ مسلمانوں پر حملے کرنے پر انیسویں صدی ہی میں کیوں آمادہ ہوئے۔ اس لئے کہ کسی نے ان کو آمادہ کیا تھا ورنہ یہ حملے بہت پہلے بھی ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں پر دور زوال کئی بار آیا۔ برصغیر میں کئی بار مسلمان سیاسی طور پر کمزور ہوئے اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت یہاں ختم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن کبھی اس طرح کی تحریکات اور اعتراضات نہیں اٹھائے گئے جو انگریزوں کے آنے کے بعد اٹھائے گئے۔ اس لئے قوی امکان یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات اور مظاہر ایک منصوبے کا حصہ تھے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی کمزور کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

ان حالات میں کرنے کا بنیادی کام علم سیرت کا فروغ، علم سنت سے واقفیت اور قرآن مجید سے تعلق کو مضبوط بنانے کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس صورت حال کا اس ایک کے علاوہ کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ قوت سے آپ ان کو روک نہیں سکتے۔ وسائل میں ہم ان سے کم ہیں۔ ان کے وسائل ہم سے بہت زیادہ ہیں۔ مسلمان مغربی میڈیا کی آئی ہوئی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ غیر مغربی میڈیا سے آئی ہوئی باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ یہ عام مسلمانوں کا رویہ ہے۔ ہمارے حاکم اور بااثر طبقہ کی نظر میں جنگ اور نوائے وقت میں جو بات چھپتی ہے وہ جھوٹ ہے، ڈان میں جو چھپتی ہے وہ سچ ہے۔ اور جو بات نیویارک ٹائمز میں چھپتی ہے وہ تو سچائی کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ یہ ایک افسوس ناک امر واقعہ ہے کہ اب یہی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نظر میں حق وصداقت کا معیار ہے۔ عام مسلمان کا اب دنیا بھر میں یہی رویہ ہے۔

پھر لامذہبیت کو جو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس تحریک کو کون چلا رہا ہے۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں کون کون لوگ ذمہ دار

ہیں۔ میرے خیال میں اس کے بہت سے اسباب ہیں جن کی تفصیل میں ابھی نہیں جاتا۔ لیکن امت کو بحیثیت مجموعی اور اہل پاکستان کو خاص طور پر غور کرنا چاہئے کہ دنیا میں سیکولرزم کو جو فروغ دیا جا رہا ہے یہ کیوں دیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اگر کچھ لوگ سیکولرزم کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور زور وشور سے ایک لامذہبی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں وہ یہ نظام کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس پر اچھی طرح غور کر کے اس کا سدباب نہیں کیا جائے گا اور ان گمراہیوں کو دور نہیں کیا جائے گا تو بہت جلد وہ وقت بھی آ جائے گا کہ اس آفت سے نبٹنا بڑا دشوار ہو جائے گا۔ مغربی گمراہیوں کا سدباب ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان گمراہیوں کا سدباب محض فتویٰ جاری کرنے سے نہیں ہوسکتا۔ قرآن وحدیث کے کسی حوالے سے نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ ان گمراہیوں سے متاثر ہیں وہ دراصل مغرب کی تہذیبی عظمت اور فکری بالادستی سے متاثر ہیں۔ ان کی گمراہیوں کا سدباب مغربی طرز استدلال اور مغرب کے انداز تحریر وتحقیق ہی سے ہوسکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ اسلامی نقطہ نظر کو مغرب کے اسلوب بیان اور طرز استدلال کے مطابق بیان کر سکتے ہیں اور مغربی فکر کی کمزوریوں کو عقلی اور منطقی دلائل کی بنیاد پر واضح کر سکتے ہیں۔

توہین انبیا کے قوانین دنیا کے کئی ممالک میں رائج ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے اور بہت دکھ کی بات ہے کہ اول تو کئی مسلم ممالک میں توہین رسالت جرم نہیں ہے۔ ایسے مسلم ممالک بھی ہیں جہاں توہین رسالت کے قوانین تو موجود ہیں لیکن ان ممالک کے حکمران ہی ان قوانین کے مخالف ہیں۔ ان ممالک کے بااثر طبقات ہی ان قوانین کے مؤید اور قائل نہیں ہیں۔ جہاں قانون بنانے والے اور قانون نافذ کرنے والے ہی اپنے قانون کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوں وہاں وہ قانون کیسے موثر ہوسکتا ہے۔ اسی لئے ہمارے ہاں بہت سے قوانین موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔

ان حالات میں سیرت کے حوالے سے ہمیں جو کام کرنا چاہئے، وہ ایک نئے اسلوب سے، نئے مواد کی روشنی میں زیادہ جامع اور زیادہ موثر مطالعہ کا کام ہے۔ جب سیرت کی ابتدائی کتابیں لکھی گئیں جن کی عظمت اور جن کے کارنامے کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل کسی کو نہیں کرنا چاہئے اور نہ ان میں کوئی تامل ہوسکتا ہے۔ لیکن ان عظیم الشان مصنفین کو بہت سے ایسے

بنیادی مصادر دستیاب نہیں تھے جو بعد میں دستیاب ہوئے۔کل پرسوں میں نے مولانا شبلی کے بارے میں یہ تذکرہ کیا تھا کہ وہ بار بار اس پر دکھ کا اظہار کرتے تھے کہ تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی۔ تاریخ ابن کثیر مولانا شبلی کو دستیاب نہیں تھی۔لیکن آج تاریخ ابن کثیر چھپی ہوئی دنیا کے ہر کونے میں موجود ہے۔مولانا شبلی کو ابن ہشام کی شرح الروض الانف دستیاب نہیں تھی۔اس زمانے تک یہ کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔اور بھی بہت سی ایسی بنیادی کتابیں ہیں جو آج چھپ کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہیں، لیکن اُس زمانے کے مصنفین کے سامنے نہیں تھیں۔آج وہ ساری کتابیں دستیاب ہوگئی ہیں۔آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔اگر اس سارے مواد کو جو آج دستیاب ہے، مخطوطات ہر جگہ دستیاب ہیں۔دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کے مخطوطات کی سافٹ کاپیاں آنے لگی ہیں۔سی ڈیز پر بے شمار مخطوطات آرہے ہیں۔ہر شخص کو بیٹھے بیٹھے دستیاب ہیں۔بہت سے مخطوطات ہیں جو لوگوں نے ویب سائٹ پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ آپ یہاں بیٹھ کر جرمنی اور فرانس میں موجود مخطوطات کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔یہ بات پہلے نہیں تھی۔آج مسلمان اہل علم اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر سیرت پر ایک نئے انداز سے کام کریں اور مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو سامنے رکھیں۔مستشرقین نے جن معاملات کو اعتراض کا نشانہ بنایا ہے وہ مسلمانوں کے سامنے ہوں تو ان کا جواب بہت آسانی کے ساتھ دیا جاسکتا ہے۔جواب کے لئے کسی مناظرانہ یا متکلمانہ انداز کی ضرورت نہیں ہے۔جواب کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقائق یا اعتراضات مسلمانوں کے سامنے ہوں اور مسلمان اپنی تحریر میں حضور کی سیرت کو ایسے انداز میں پیش کریں کہ اعتراض کرنے والے کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملے۔

مختلف اسلامی زبانوں میں سیرت پر کام ہوا ہے۔کل اردو، انگریزی اور کچھ دیگر زبانوں کی کتابوں کا ہم نے تذکرہ کیا۔یقیناً اور زبانوں میں بھی بہت کام ہوا ہوگا۔ترکی اور فارسی میں بھی ہوا ہے۔افریقی زبانوں میں بھی کام ہوا ہوگا۔انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں کام ہوا ہوگا۔ ملے زبان چار پانچ سو سال سے ایک علمی زبان ہے۔اس کی ادبیات کی ایک تاریخ ہے۔ان میں کیا کام ہوا ہے اور ان میں کیا چیز ایسی نمایاں ہے جو اہل پاکستان یا اردو داں قارئین کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔ہمارے کام اور تحقیق میں کیا چیز ہے جو دوسروں کے لئے مفید ہوسکتی

ہے۔اس پر پوری دنیائے اسلام کے لوگوں کو مل کر ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہئے جو سیرت کے اس پورے کام کو یکجا کر کے اجتماعی طور پر سیرت کا ایک ایسا نمونہ سامنے لائے جو دنیائے اسلام کی طرف سے متفقہ نمونہ ہو۔اس وقت سیرت کی بے شمار کتابیں دنیا کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ ایک اونچا مقام رکھتی ہے۔کسی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سب سے بہتر ہے۔یا فلاں کتاب سب سے بہتر ہے۔ یہ کہنا بڑا دشوار ہے۔ ہر کتاب میں بے شمار ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ اور کتابوں سے ممتاز اور نمایاں ہے۔لیکن کوئی ایسی کتاب انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں میں ابھی تک موجود نہیں ہے، جو پوری امت مسلمہ کی طرف سے سیرت کو دنیائے مغرب کے سامنے پیش کرتی ہو، بعض مصنفین کی انفرادی کاوشیں ضرور ہیں۔ مارٹن لنکس کی کتاب کو لوگ بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔کئی اور کتابیں بھی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کی طرف سے ایک مستند جامع اور متفقہ کتاب سیرت کی ضرورت اپنی جگہ قائم رہے۔

ایک ٹیم جو تیس چالیس افراد پر مشتمل ہو اور پوری دنیائے اسلام کے ہر علاقے، ہر ثقافت اور ہر فقہی مسلک کی نمائندگی کرتی ہو، وہ سیرت پر ایک جامع کتاب تیار کرے۔اس کتاب کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کام اہل مغرب وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔اس طرح کے کام UNESCO یونیسکو نے کروائے ہیں۔ مغربی یونیورسٹیاں اس طرح کے کام بڑے پیمانے پر کرواتی رہتی ہیں۔کچھ دن پہلے ایک امریکی یونیورسٹی اور تل ابیب یونیورسٹی نے مل کر اسلام پر چالیس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب کی تیاری کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔دنیا کے نامور مستشرقین اس کام میں حصہ لے رہے ہیں۔ایسی کوئی چیز دنیائے اسلام کی طرف سے نہیں آرہی ہے۔اگر وہ یہ کام کر سکتے ہیں تو دنیائے اسلام بھی کر سکتی ہے۔لیکن دنیائے اسلام نے ابھی تک اتفاق رائے سے اور اجتماعی سطح پر کام کرنا شاید سیکھا نہیں۔

ایک اور اہم اور ضروری بحث جو مصادر سیرت کے بارے میں وقتاً فوقتاً اہل علم و تحقیق اٹھاتے رہتے ہیں۔وہ مختلف مآخذ و مصادر اور راویں کی درجہ بندی ہے۔مستشرقین نے بھی راویوں کو زیادہ ہدف بنایا ہے۔مسلمانوں میں بھی ابھی اس پر کوئی طے شدہ رائے سامنے نہیں آئی۔وہ مختلف راویوں کے بارے میں معلومات کی یکجائی کا پہلا مرحلہ ہے۔مسلمانوں کا عام

مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی مغربی مصنف کسی بات پر اعتراض کرتا ہے تو ہم اس راوی کو فوراً بے اعتبار اور نا قابل قبول قرار دینے اور اس کی روایت کو غیر معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر واقدی نے کوئی بات قابل اعتراض لکھی ہے تو واقدی کمزور ہے۔ اگر واقدی کی کوئی بات ہمیں پسند ہے تو واقدی قابل قبول ہے۔ یہ طرز عمل غیر محقق کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ اگر مغربی مصنفین واقدی پر اعتراض کرتے ہیں تو ہمیں برا لگتا ہے۔ واقدی کے حوالے سے کوئی مغربی فاضل کمزور بات کرتا ہے تو ہمیں برا لگتا ہے۔ جو بات ہمیں اچھی لگتی ہے اس میں ہم راوی کو نظر انداز کر کے اس کی وہ بات قبول کر لیتے ہیں۔ جو بات اچھی نہیں لگتی اس کو ہم قبول نہیں کرتے۔ اس کی بجائے اگر آج تمام روات کو کمپیوٹرائز کر دیا جائے اور اس کمپیوٹرائزیشن کی مدد سے راویوں کے درجے متعین کر دیئے جائیں جو تقریباً وہی ہوں گے جو محدثین نے متعین کیے ہیں۔ محدثین کے دماغ بھی کمپیوٹر سے کم نہیں تھے۔ لیکن کمپیوٹر سے اس میں ایک نئی جہت پیدا ہو جائے گی۔ ثقاہت کا ایک نیا پہلو اس میں آ جائے گا۔ کمپیوٹر کی مدد سے یہ طے کیا جائے گا کہ کونسی روایت کسی راوی نے تنہا کہی ہو تو قابل قبول ہے۔ تنہا نہ کہی ہو تو کب قابل قبول ہے۔ دوسرے کن راویوں سے اس کو corroborate کیا جائے تو قابل قبول ہے۔ اس طرح یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ اگر اس کو انفرادی طور پر کرنے کی بجائے اجتماعی طور پر کیا جائے تو اس کے اعتماد اور ثقاہت میں اضافہ ہوگا، اور credibility بہت بڑھ جائے گی۔

انیسویں صدی میں جو کام ہوا ہے، اس کا خاصا حصہ یا تو محض روایتی انداز کا ہے یا پھر معذرت خواہانہ انداز کا ہے۔ اس دور میں جو کتابیں سیرت پر لکھی گئیں ان میں قدیم انداز کی کتابوں میں تو صرف اصول روایت اور صحت سند پر ہی سارا زور ہے۔ اس کی اہمیت اور بنیادی حیثیت سے انکار نہیں۔ لیکن بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کی گتھیوں اصول درایت اور اصول نقد تاریخی سے کام لئے بغیر سلجھایا نہیں جا سکتا۔

یہی حال جدید سیرت نگاروں کا ہے۔ انہوں نے۔ سب نے نہیں تو بہت سوں نے۔ مغربی معیارات ہی کو اصول قرار دیا اور غفلت پرستی کی رد میں معجزات کا عملاً انکار کیا۔ سرسید کے بارے میں کل میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تمام تر غیر معمولی عظمت کے باوجود ان کے کام میں ایسے ایسے مقامات بار بار آتے ہیں جن سے اتفاق کرنا دشوار ہے۔ ان کے ہاں کئی جگہ معذرت

خواہانہ رویہ ملتا ہے۔ بڑے بڑے مصنفین کے ہاں معذرت خواہانہ رویئے ملتے ہیں۔ علامہ شبلی کا میں نے ذکر کیا کہ ان کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خود برصغیر کے علماء نے تامل کیا ہے۔ بعض محتاط اور مستند اہل علم نے ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں معذرت خواہانہ رویہ جھلکتا ہے۔ یہ مغربی عروج کے ابتدا کا زمانہ تھا۔ مسلمان مغربی طاقتوں کے براہ راست قبضہ میں تھے اور ان کی تہذیب وثقافت کے زیر اثر تھے۔ اس کی چکا چوند سے آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ آج اس کیفیت میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ آج خود مسلمان اہل علم میں ایسے فضلاء موجود ہیں اور کثرت سے موجود ہیں جو مغربی تصورات سے اتنے ہی واقف ہیں جتنا کہ کوئی مغربی عالم ہوسکتا ہے۔ اس لئے آج ہم ایک بہتر پوزیشن میں ہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اس معذرت خواہانہ ادب کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیں۔

ہمارے جن مصنفین نے مستشرقین یا مغربی مصنفین کا جواب دینا چاہا، ان میں سے کئی حضرات مغربی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ سرسید انگریزی یا کسی اور مغربی زبان سے واقف نہیں تھے۔ مولانا شبلی واقف نہیں تھے۔ اس لئے ان تک جو معلومات آتی تھیں وہ ترجمہ کے ذریعے آتی تھیں۔ کچھ حضرات تھے جو براہ راست مغربی تصورات سے واقف تھے لیکن ان کی اسلامی بنیاد کمزور تھی۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے اس صحیح نقطہ نظر کی ترجمانی نہ کر سکے جو مسلمانوں کی گزشتہ تیرہ سوسالہ علمی روایت کے مطابق ہو۔ کچھ حضرات جو یہ کام کر سکتے لیکن ان کو شاید وقت نہیں ملا۔ مثلاً مولانا مودودی اس کام کو شاید نسبتۃً بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ وہ سیرت کے کام کے لئے وقت نہیں نکال پائے۔ کچھ اور حضرات بھی اس کام کے لئے وقت نکال سکتے تھے لیکن ان کی مصروفیات دوسرے انداز کی رہیں۔ مستشرقین کی سیرت نگاری کا باقاعدہ علمی جائزہ لینے کا کام ایک زمانہ میں لاہور کے پروفیسر ظفر علی قریشی مرحوم نے بھی شروع کیا تھا۔ انہوں نے سالہا سال لگا کر بہت سے نوٹس تیار کئے تھے۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں ان کا یہ کام دیکھا تھا۔ اس کا ایک بہت مختصر حصہ ہی وہ تیار کر کے شائع کر پائے۔ بقیہ ساری زندگی کی کاوش پر مبنی کام ابھی تک نوٹس اور یادداشتوں کی شکل میں ہے۔ یہ سارا کام بھی از سر نو غور وخوض کا محتاج اور تشنۂ تکمیل ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو قدیم اسلامی روایت پر

گہری اور ٹھوس نظر رکھتے ہوں۔ مغربی انداز استدلال اور اسلوب نگارش سے واقف ہوں۔ مغربی مصنفین نے گزشتہ تین چار سو سال میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر گہری نظر رکھتے ہوں اور یہ پورا ذخیرہ سیرت وسنت جو اب دستیاب ہوا ہے اور پہلے سو فیصد دستیاب نہیں تھا۔ اس کی بنیاد پر سیرت کا ایک دائرۃ المعارف تیار کریں۔ ایسا دائرۃ المعارف، کہ علامہ شبلی جس انداز کا لکھنا چاہتے تھے، آج اس انداز کا کام کرنے کے لئے مواقع شاید زیادہ موجود ہیں۔ وسائل بھی بلاشبہ پہلے سے بہت بہتر ہیں۔

اس کام کے لئے مغربی اہل علم کے کام اور تحریروں سے واقفیت درکار ہے۔ جہاں واقعتاً کوئی علمی غلط فہمی ہے اس کا نوٹس لینا چاہئے۔ لیکن مستشرقین کی غلط فہمیوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن سے فراموش نہ ہونی چاہئے کہ وہ قرآن مجید کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے۔ حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے۔ اس پر ہمیں شکایت کرنے کا حق نہیں۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق سوچنے، لکھنے اور کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن اگر اس فرق کی وجہ سے ان کے نقطہ نظر میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کا نقطہ نظر مختلف ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کو یہ حق تو ہونا چاہئے کہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق انہی کے دلائل اور انہی کے اسالیب سے کام لے کر سیرت کا صحیح پہلو سامنے لائیں اور سیرت کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اہل مغرب کے مزاج میں شاید یہ بات شامل ہے کہ وہ لوگوں کے عزائم اور نیتوں کے بارے میں فیصلے کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں، اس لئے ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ کرام کے دل میں کیا تھا۔ وہ یہ بھی جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ تابعین کے عزائم اور محرکات کیا تھے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ امام بخاری نے کن عزائم سے صحیح بخاری مرتب کی۔ ان چیزوں کا ظاہر بات ہے کہ کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی اگر کسی کے دل میں ایمان اور صحیح عقیدے کی جڑ بٹھا دے تو عقیدہ درست ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ جو چیزیں کوئی علمی یا تحقیقی بنیاد رکھتی ہیں اور واقعتاً کسی غلط فہمی کا ذریعہ اور سبب بن سکتی ہے ان اسباب کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

مسلمان علما میں سیرت نگاروں اور محدثین نے دو بڑے اسالیب سے کام لیا ہے۔ ایک اسلوب روایت ہے اور دوسرا اسلوب درایت ہے۔ محدثین عموماً اسلوب روایت پر زیادہ زور

دیتے ہیں۔ یعنی کسی روایت کے خارجی اسباب اور خارجی دلائل۔ یعنی اس کا راوی کون ہے۔ راویوں کا سلسلہ متصل ہے کہ نہیں ہے۔ راویوں کا کردار کیا ہے۔ راویوں کی سمجھ بوجھ کیسی ہے۔ ہر راوی کی ملاقات اپنے پچھلے راوی سے ہوئی ہیں ہے کہ نہیں ہوئی۔ اگر یہ ساری چیزیں محدثین کے قاعدے کے مطابق ہوں تو محدثین اس روایت کو روایتی اعتبار سے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اصول درایت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اصول درایت سے زیادہ کام یا تو مورخین نے لیا ہے یا فقہا نے۔ وہ روایت اور واقعہ کے داخلی شواہد پر بھی غور کرتے ہیں کہ کیا داخلی شواہد کے رو سے بھی یہ روایت قابل قبول ہوسکتی ہے کہ نہیں۔ بعض محدثین نے ان دونوں اسالیب سے کام لیا ہے۔ محدثین کے ان دو اہم اسالیب نقد کے ساتھ ساتھ ہمیں علمائے اصول کے منہج کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو نہ صرف عقل ونقل کا جامع ہے بلکہ اسلامی منہاجیات کا اصل اور سب سے نمایاں مظہر اور نمائندہ ہے۔

آج ان دونوں بلکہ تینوں اسالیب کے علاوہ مغربی اسلوب تحقیق بھی ہمارے سامنے ہے۔ بہت سے لوگ مغربی دنیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز کی تربیت لے کر آئے ہیں۔ تاریخی تحقیق کا جو مغربی اسلوب ہے اس سے لوگوں نے واقفیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی تربیت حاصل کر لی ہے۔ اگر ان تینوں اسلامی اسالیب کو مغربی اسلوب تاریخ سے ملایا جائے، یعنی محدثین کے اصول روایت، مورخین کے اصول درایت، علمائے اصول کا منہج اور جدید اجتماعی اور انسانی علوم کا اسلوب تحقیق، پھر ان سب سے کام لے کر سیرت کے نو دستیاب شدہ ذخیرے پر کام کیا جائے اور اس کو از سر نو مرتب کیا جائے تو ان شاء اللہ سیرت کا وہی نقشہ سامنے آئے گا جو محدثین کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔ محدثین نے سیرت کا جو نقشہ ہمارے سامنے رکھا ہے، اس تحقیق کا نتیجہ محدثین کے ان نتائج سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ لیکن جو حضرات اس اسلوب سے مانوس ہیں، اس اسلوب کی کارکردگی اور افادیت کے قائل ہیں، ان کو ایک ایسی بنیاد مل جائے گی جس کی وجہ وہ سیرت کے ذخائر کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

جب ایسا ہوگا اور یہ نئی تحقیق دنیا سامنے آجائے گی اور قدیم مورخین اور مستند سیرت نگاروں کی قدیم تحقیقات کی نئے اسلوب تحقیق سے تائید ہوگی تو یہ قرآن مجید کے اس اعلان کا

ایک مظہر ہوگی کہ 'لیتبین لهم انه الحق'، اللہ تعالیٰ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ان کے لئے ثابت کردے گا کہ یہی پیغام حق ہے۔'سنیریهم آیاتنافی الافاق وفی انفسهیم حتی یتبین لهم انه الحق'۔اس آیت کی تصدیق کا ایک ذریعہ سامنے آجائے گا۔

اس کام کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید، سنت ثابتہ اور متواترہ سے سیرت کی معلومات کا جو بنیادی چوکھٹا ملتا ہے وہ ہمارے سامنے ہو۔ اس کو ہم معیار، حوالہ اور سند قرار دیں۔ جو بیان شان نبوت سے ہم آہنگ ہو، اس کو قبول کیا جائے۔ جو روایت شان نبوت سے ہم آہنگ نہ ہو، اس کو قبول نہ کیا جائے۔ تاریخی تحقیق کے وہ قواعد ضوابط اور معیارات جو محدثین کے اصول کے مطابق ہیں اور جدید تاریخی تنقید اور تحقیق کی بارگاہ میں بھی قابل قبول ہیں ان دونوں کو پیش نظر رکھا جائے اور سیرت نگاروں کی متفقہ آراء سے کام لیا جائے۔ کچھ معاملات ایسے ہیں جن پر سیرت نگار اتفاق کرتے ہیں۔ مورخین، مفسرین اور سیرت نگار بھی ان تمام تفصیلات سے اتفاق رکھتے ہیں۔ آج اگر کچھ محققین بعض معاملات پر کوئی نئی رائے دینا چاہتے ہیں تو وہ کسی کی انفرادی رائے تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی بنیاد پر سیرت کی مسلسل اور متواتر روایت کو مشکوک ٹھہرانا درست نہیں ہوگا۔

جن لوگوں نے مغربی اصول تنقید سے کام لیا، یا لینا چاہا، ان میں پہلا نام تو سرسید کا ہے۔ مولانا شبلی کا ہے۔ ابھی ماضی قریب میں اکرم ضیا العمری جو عراق کے بڑے محقق تھے۔ شیخ ابو زہرہ، مولانا مودودی، ان حضرات نے مغربی اصول تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی۔ اخیر میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس سے کام لیا۔ لیکن یہ ساری کی ساری انفرادی اور جزوی کاوشیں ہیں۔ ان میں سے ہر کاوش کے بعض پہلو بہت نمایاں اور بہت قابل قدر ہیں۔ لیکن بعض پہلو ایسے ہیں جن پر مزید نظر ثانی اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ مثلاً سرسید اور شبلی کا کہیں کہیں معذرت خواہانہ رویہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اکرم ضیاء اور ابوزہرہ کی واقفیت مغربی منہاجات سے براہ راست نہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے ہاں اصول روایت سے کہیں کہیں انحراف پایا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے سیرت پر باقاعدہ کام نہیں کیا۔ سیرت پر مواد ان کی پچاس سالہ تحریروں میں بکھرا ہوا ہے۔ ایسے میں منہاج اور اسلوب کی یکسانی برقرار کیسے رہ سکتی ہے۔ اس لئے اجتماعی کام کی ضرورت اب بھی موجود ہے اور مسلمان امت کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے کہ

وہ سیرت کا ایک ایسا اجتماعی کام سامنے لائیں جس میں ان تمام حقائق اور نتائج سے کام لیا گیا ہو۔

کل کی گفتگو میں میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت کے بعض نئے میدان اور نئے موضوعات بیسویں صدی میں سامنے آئے ہیں اور وہ میدان اور موضوعات ایسے ہیں جن پر ابھی کام کا آغاز ہوا ہے۔ ان نئے موضوعات پر کام کرنے کے لئے سیرت کا دستیاب مواد اور قدیم سیرت نگاروں کا پورا کام، وہ ایک ماخذ اور مصدر کے طور پر تو کام دے سکتا ہے لیکن اس مواد میں معلومات کی وہ ترتیب نہیں ہے جس سے ان نئے موضوعات پر کام لیا جا سکے۔ مثال کے طور پر میں نے سیاسیات سیرت کا حوالہ دیا تھا۔ عسکریات سیرت کی مثال دی تھی۔ سیرت کی سفارت کاری اور ڈپلومیسی کی مثال دی تھی۔ وثائق سیرت کی مثال دی تھی۔ اجتماعیات سیرت اور نفسیات سیرت کا ذکر کیا تھا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن پر آج کام کا آغاز ہوا ہے اور بیسویں صدی کے کام میں ان امور کے مفید اشارے پائے جاتے ہیں اور ان کاموں کے ابتدائی خطوط ملتے ہیں جن پر آج کام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کی ہے۔ میں نے دس مقالات پر مشتمل سیمینار کا ذکر کیا تھا ، اس سیمینار کے منتظمین نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے اور لکھا ہے کہ Muhammad's biography is about to set off to new horizons. حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری اب نئے آفاق کی طرف سفر کرنے کے لئے تیار ہے۔ اُن کی نظر میں نئے آفاق کیا ہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن ہمارے سامنے جو نئے آفاق ہونے چاہئیں ان میں سے بعض کی نشاندہی میں نے کل اور پرسوں کی تھی۔

ماضی میں علمائے اسلام نے مشکل القران کے نام سے ایک فن مرتب کیا۔ قرآن پاک کی تفسیر کے وہ معرکۃ الآرا مسائل جن کے بارے میں اختلاف رائے رہا۔ اور اس اختلاف رائے کو رفع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ان خاص مسائل کو الگ سے یکجا کر کے مشکل القران کے نام سے ایک الگ فن مفسرین قرآن نے مرتب کیا۔ اس پر بہت سے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ ہمارے برصغیر کے مولانا انور شاہ کشمیری کی بھی ایک کتاب ہے۔ اسی طرح سے محدثین نے مشکل الحدیث کے نام سے ایک فن مرتب کیا اور احادیث کے ذخائر میں وہ مسائل جو بہت

معرکۃ الآرا ہیں اور ان اختلافات کو رفع کرنا بہت مشکل ہے، ان کو ایک الگ فن کے طور پر مرتب کیا اور اس کا خصوصی مطالعہ کیا۔ یہ فن مشکل الحدیث کہلایا۔

اس طرح کے علوم وفنون کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مشکل السیرۃ کے نام سے بھی اس طرح کا ایک فن ہونا چاہئے۔ مشکل السیرت کے فن میں وہ معاملات ومشکلات کہ جن میں بہت سا اختلاف رائے ہے، اس کو حل کرنے کی کیا تدبیر ہونی چاہئے اور اس مشکل کو کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بہت اجتماعی غور وفکر کی ضرورت ہے۔ میں اس فن کا آدمی نہیں ہوں لیکن اس سے متعلق ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ سیرت کے ایک محقق اور طالب کو جو مسائل پیش آتے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ تقویم کا ہے۔ بگوی صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ وہ اس فن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے پروفیسر ظفر احمد اور ہندوستان کے مولانا اسحاق النبی علوی نے ان مسائل پر فاضلانہ مقالات لکھے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو مکہ مکرمہ میں، مدینہ منورہ اور عرب کے مختلف مقامات میں مختلف تقویمیں رائج تھیں۔ ہر بڑے قبیلے نے ایک الگ کیلنڈر یا تقویم رائج کر رکھی تھی۔ ہر بڑے واقعے سے ایک نیا کیلینڈر شروع ہو جاتا تھا اور اس کے حساب سے سن کا شمار ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں جب ابرہہ کا واقعہ عام الفیل میں واقع ہوا تو مکہ میں عام الفیل کے نام سے ایک نیا کیلنڈر شروع ہو گیا۔ کچھ کیلنڈر پہلے سے چلے آرہے تھے۔ اسی طرح بعض وہ قبائل جو اپنی جگہ بہت انفرادیت رکھتے تھے ان کے اپنے اپنے کیلینڈر تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ شمسی تقویم کی پیروی کرتے تھے کچھ قمری تقویم کی پیروی کرتے تھے۔ شمسی اور قمری کیلینڈروں میں ہر سال بارہ دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس طرح عرب کے مختلف مقامات پر مختلف تاریخیں اور مختلف کیلینڈر چل رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں بھی دو کیلینڈر تھے۔ مکہ مکرمہ میں بھی دو کیلینڈر تھے۔ اب جب ایک صحابی یا کوئی راوی کوئی بات بیان کرتا ہے کہ فلاں واقعہ فلاں سن کے فلاں مہینے میں پیش آیا، تو وہ صحابی یا راوی ان میں سے ایک متعین تقویم کے مطابق تاریخ کا تعین کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرے صحابی یا دوسرے راوی جو اسی یا کسی اور واقعہ کو بیان کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں سال کے فلاں مہینے میں یہ واقعہ ہوا تو وہ کسی اور تقویم کے حوالے سے بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں درحقیقت بہت کم تعارض ہوتا ہے۔

لیکن بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اس تعارض کو کیسے حل کیا جائے۔

اس تقویمی تعارض کو حل کرنے کا ایک طریقہ تو روایت کا تھا۔ اصول روایت کا طریقہ جس کو محدثین نے اپنایا کہ جس روایت کے راوی مضبوط ہیں اس روایت کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ مسئلہ محض راویوں کے حفظ اور کردار سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ اگر ایک روایت کے سارے راوی بہت مضبوط ہیں۔ کردار اور حفظ میں بھی مضبوط ہیں، لیکن وہ ایک خاص تقویم اور کیلنڈر کے لحاظ سے تاریخ متعین کر رہے ہیں۔ اسی طرح دوسری روایت کے راوی بھی اسی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک دوسری تقویم کے حوالے سے واقعہ بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ان دو متعارض تاریخوں کو محض راویوں کی ترجیح سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاملہ محض علم روایت سے حل نہیں ہوگا۔ علم درایت کی رو سے بھی حل نہیں ہوگا۔ علم درایت کی رو سے زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ داخلی شہادت لیں گے کہ جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے اندرونی شواہد کون کونسے ہیں۔ اندرونی شواہد سے تقویم کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ علم تقویم کے ماہرین اور سیرت نگار مل کر پہلے اُس دور کی تقویموں کا جائزہ لیں کہ اُس دور میں کون کون سی تقویمیں رائج تھیں۔

کچھ حضرات نے جن میں ترکی کے محمود پاشا فلکی، جرمن مستشرق اوسٹنفلڈ اور مغربی مستشرق زمباور کا نام مشہور ہے، اسلامی وقائع کی تقویمیں بنائی تھیں۔ وہ تقویمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے مختلف ہیں کہ ایک راوی ایک تقویم کے لحاظ سے سن بتاتا ہے، دوسرا راوی دوسری تقویم کے لحاظ سے سن بتاتا ہے۔ ان دونوں کو محض حساب سے بھی حل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض اہم واقعات کے سنوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تاثر یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ 21 اپریل 570ء میں ہوئی۔ بعض لوگ کہتے کہ نہیں جون 571 میں ہوئی۔ بعض کہتے ہیں 572 میں ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کہنا ہے کہ 569 میں ہوئی۔ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ 568ء میں ہوئی۔ اب یہ اختلافات سب کے سب گریگورین کیلنڈر کے حساب سے ہوئے ہیں۔ ہجری کیلنڈر جو مسلمانوں میں بعد میں مروج ہوا، اس کی رو سے اختلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ عام الفیل کے واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے۔

جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ کی عمر مبارک کتنی تھی۔ وہ دنوں، مہینوں اور سالوں کے حساب سے متعین ہے۔ اب یا تو اس حساب سے گریگورین کیلنڈر کو project back کر کے دیکھ لیا جائے۔ یہ ایک شکل تو یہ ہے۔ ایک شکل یہ ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ جن صحابہ نے حضور کی عمر مبارک یہ بیان کی ہے، انہوں نے کس تقویم کے اعتبار سے بیان کی ہے۔ مکی تقویم کے اعتبار سے یا مدنی تقویم کے اعتبار سے۔ اس کا تعین ہونے کے بعد اس کو گریگورین کیلنڈر سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

دو تقویموں کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم مسئلہ جو توقیت کے ضمن میں پیش آیا کرتا تھا۔ وہ کبیسہ یا نسی کا ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں ہے کہ 'انما النسی زیادة فی الکفر' کہ نسی کفر کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے۔ نسی کی شکل یہ ہوتی تھی کہ قریش اور بعض دوسرے بااثر قبائل نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا کہ مہینوں اور تاریخوں کا تعین وہ کریں۔ اس میں بہت سارے محرکات تھے۔ ایک تو تقویموں کا مختلف ہونا بھی ہے۔ ایک شمسی اور قمری دونوں تقویموں کا ایک ساتھ چلنا بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ جب ان کے تجارتی قافلے گزرا کریں تو وہ مقدس اور محفوظ مہینوں میں گزریں۔ محفوظ مہینے چار تھے۔ رجب، شوال، ذوالقعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ ان کی کوشش اور خواہش یہ ہوتی تھی کہ جب ان کے قافلے گزریں تو یہ مہینے ہوں تا کہ ان کے اپنے قافلے محفوظ و مامون رہیں۔ لیکن جب دوسروں کے قافلے گزریں تو یہ مہینے نہ ہوں تا کہ ان کو لوٹ مار کی آزادی ہو۔ اب اگر یہ اختیار ان کو دے دیا جائے کہ وہ یہ طے کریں کہ اس سال ذوالحجہ یا محرم چالیس دن کا ہوگا تا کہ ان کا وہ قافلہ جو ابھی راستے میں ہے، اور ابھی پہنچ نہیں پایا ہے، اس کو دس دن مزید مل جائیں اور وہ حفاظت کے ساتھ پہنچ جائے۔ اسی طرح سے جب محرم کا آغاز ہو تو وہ یہ کہیں کہ اس سال محرم تیس دن کے بجائے صرف بیس دن ہوگا۔ اس میں دس دن کی کمی کر دی جائے تا کہ محرم ختم ہوتے ہی ہم دوسرے کے قافلہ کو لوٹ سکیں۔ مہینوں اور تاریخوں میں کمی بیشی کرنے کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔ یہ ساری چیز پیش نظر ہو تو پھر مشکل السیرت کے اس جیسے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور کام جو اس دور میں ہمیں کرنا چاہئے وہ بیسویں اور انیسویں صدی میں شروع

کئے جانے والے کاموں کی تکمیل ہے۔ ماضی کے کئی ایسے کام ہیں جو کسی وجہ سے نامکمل رہ گئے اور آج اس کی تکمیل کے اسباب اور وسائل پہلے سے بہتر انداز میں موجود ہیں۔ پرسوں ایک دوست نے یہ سوال پوچھا بھی تھا کہ سرسید جس کتاب کو چار جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے اور جس کی وہ صرف ایک ہی جلد لکھ پائے اس کی بقیہ تین جلدیں آپ کیوں نہیں لکھتے۔ اس کا جواب میں نے عرض کیا تھا کہ سرسید نے جن حالات میں وہ کتاب لکھی آج وہ حالات نہیں رہے۔ وہ اعتراضات اب لوگوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب وہ پرانے ہوگئے ہیں۔ از کار رفتہ ہوگئے۔ اب وہ اعتراضات مغربی دنیا میں لوگ نہیں دہراتے۔ وہ اعتراضات چونکہ ختم ہوگئے اس لئے ان کا جواب دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوگی۔ لیکن بعض کام ایسے ہیں جو واقعتاً بہت مفید اور ضروری تھے لیکن نامکمل رہ گئے اور ہمیں کرنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے سیرت کے بعض ایسے نئے پہلو تلاش کئے اور اس کے مماثل اور متقابل حالات سے تقابل کیا اور سیرت کی عظمت کے بعض نئے پہلو انہوں نے ہمارے سامنے رکھے۔

ایک جگہ انہوں نے بہت تفصیل سے ان لوگوں کے بارے میں اعداد وشمار جمع کئے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں غزوات میں کام آئے۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی اور غیر مسلموں کی طرف سے بھی۔ ایک ایک غزوہ کے اعداد وشمار قدیم کتابوں سے جمع کر کے یہ ثابت کیا کہ جو مسلمان اس میں کام آئے ان کی تعداد 200 سے زائد نہیں۔ جو مسلمان دھوکے سے شہید کر دیئے گئے ان کی تعداد بھی سو کے قریب ہے۔ دشمن کے جو مقتولین میدان جنگ میں کام آئے، ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس ڈھائی سو میں بنو قریظہ کے مقتول شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے جو قابل غور ہے۔ یہ سارے لوگ دشمن کے مقتولین تھے جن کی تعداد مشکل سے پانچ ساڑھے پانچ سو بنتی ہے۔

اس محدود اور معمولی قربانی سے جو تبدیلی آئی جس کی طرف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ دس مربع میل چوڑی اور پندرہ مربع میل لمبی ریاست سے اس کام کا آغاز ہوا۔ پھر تین پونے تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے اس ریاست میں توسیع ہوئی اور جب

رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو دس لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت قائم تھی۔ اتنی بڑی حکومت کو قائم کرنے میں اور ایسی غیر معمولی تبدیلی لانے اور اتنے غیر معمولی انقلاب کو قائم کرنے میں، اگرچہ انقلاب کا لفظ کوئی خوشگوار لفظ نہیں ہے، لیکن ایک ہمہ گیر تبدیلی کو لانے میں اتنی معمولی قربانی کہ پانچ سو آدمی کام آئے ہوں، یہ کوئی قابل ذکر قربانی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں نے جنگوں کے اعداد وشمار جمع کیے ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کو سامنے رکھا جائے تو بڑی ہوش ربا تفصیلات سامنے آتی ہیں۔

قاضی سلیمان منصور پوری کے زمانے میں دوسری جنگ عظیم تو نہیں ہوئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں جو لوگ مارے گئے تھے ان کی تعداد 73 لاکھ 38 ہزار تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں انسانی آبادی کو قتل کر کے حاصل کیا ہوا؟ کوئی مثبت نتیجہ کیا نکلا، سوائے اس کے کہ دنیائے اسلام کو غلام بنایا گیا۔ دینائے اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک بڑی سلطنت کے درجنوں ٹکڑے کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد حاصل نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر اس طرح سے تمام واقعات کو جمع کیا جائے اور جو جو ریاستیں ان علاقوں میں قائم ہوئیں۔ یا جو انقلابات مختلف علاقوں میں آئے ہیں، ان کا تقابل اس تبدیلی سے کیا جائے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں انجام پائی تو تحقیق کا ایک نیا موضوع ہوگا اور ایک نئے انداز سے اسلام کے انداز انسانیت کو اور اسلام کے متمدن اور مہذب ہونے کے پہلو کو ہم زیادہ کامیابی سے نمایاں کر سکیں گے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ غزوہ بدر سے لے کر آج افغانستان اور عراق تک مسلمانوں کے ہاتھوں اتنے غیر مسلم نہیں مارے گئے جتنے لوگ صرف دوسری جنگ عظیم میں مار ڈالے گئے تو شاید یہ درست ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میدان جنگ میں کام آنے والے غیر مسلم اس کا پانچ فیصد بھی نہیں ہوں گے۔ دو فیصد بھی نہیں ہوں گے۔

جن موضوعات پر آج نیا کام کرنے کی ضرورت ہے ان میں اداریات سیرت یا سیاسیات سیرت کا ایک نیا پہلو ہے جس پر بیسویں صدی میں ایک نئے کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے دو کتابیں، جن کا میں تفصیلی تذکرہ کر چکا ہوں، خزاعی کی تخریج الدلالات السمعیۃ اور عبدالحیٔ کتانی کی التراتیب الاداریہ، ان کتابوں میں وہ معلومات موجود ہیں لیکن ان معلومات کی حیثیت ایک متفرق ڈیٹا کی ہے۔ ایک متکامل اور مربوط تصویر کی نہیں ہے۔ یہ کام

بیسویں صدی میں شروع کیا گیا لیکن پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے کوشش کی تھی کہ سیرت النبی کی ساتویں جلد عہد نبوی کے نظام حکومت اور نظام ریاست پر مرتب کریں، لیکن وہ کتاب کی تکمیل سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ مولانا مودودی کے ذہن میں تھا کہ اپنی سیرت کی تیسری چوتھی جلد میں اس کام کو کریں گے۔ وہ اس کا آغاز بھی نہیں کر پائے۔ کچھ اور حضرات نے اس موضوع پر کام کیا ہے، لیکن وہ ابتدائی خطوط کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر نثار احمد نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔ لیکن یہ کام کا آغاز ہے۔ اب اس کام کے لئے اتنی فراوانی سے مواد دستیاب ہوتے لگا ہے کہ اس مواد کو سامنے رکھ کر عہد نبوی کے نظام ریاست کا ایک مربوط اور مکمل نقشہ ہم پیش کر سکتے ہیں۔

ایک اور چیز جس کے بارے میں مستشرقین نے بھی بہت کچھ کہا ہے اور ابھی مسلمانوں کو اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن جن حکمرانوں کو رسول اللہ ﷺ نے دعوتی خطوط تحریر فرمائے۔ یقیناً یہ ان ممالک کی تاریخ میں بھی ایک اہم واقعہ ہوگا کہ عرب کے ایک گوشے سے ایک شخص دنیا کے ایک بہت بڑے فرمانروا کو ایک تبلیغی خط لکھتا ہے۔ ان کی تاریخ میں ان واقعات کو کس انداز سے دیکھا گیا اور کس انداز سے بیان کیا گیا۔ اس پر کچھ مواد سامنے آیا ہے۔ بعض لوگوں نے معلومات کو جمع کیا ہے لیکن ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس دور کے اگر کوئی مصادر موجود ہیں تو ان سے کام لے کر اس نقشے کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔

اداریات سیرت یا سیاسیات سیرت کے ساتھ ساتھ ایک اہم موضوع معاشیات سیرت بھی ہے۔ معاشیات سیرت کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ جس کی طرف ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ دوسرا اور نسبۃً زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی میں مدینہ منورہ میں اور مکہ مکرمہ میں صحابہ کرام کی معاشی زندگی کیسی تھی۔ جو معاشی اصلاحات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم فرمائیں وہ کن ترتیبات کے ساتھ اور کس تدریج کے ساتھ قائم فرمائی اور ماضی میں اس کی شکل کیا تھی اور آخر میں کیا ہوئی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو اس دور کے لحاظ سے ناگزیر ہے۔ آج کل کا دور معاشیات کا دور ہے۔ آج ہر چیز معاشیات کے نقطہ نظر سے

دیکھی جا رہی ہے۔ کسی بھی نظام، کسی بھی تعلیم اور کسی بھی تصور کا قابل عمل ہونا یا نا قابل عمل ہونا اس کے معاشی نظام کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم عربوں کے مالی نظام پر غور کریں کہ ان کے ہاں مالی نظام کیا تھا۔ اسلام کی اصلاحات اور معاشی تعلیمات کی اہمیت اور معنویت کو سمجھنے کے لئے اس دور کے معاشی معاملات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

آج بعض لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام نے جس ربا کو حرام قرار دیا تھا یہ تو وہ ربا تھا جو عربوں میں اسلام سے قبل رائج تھا۔ گویا وہ کوئی ایسا ربا تھا جو آج نہیں پایا جاتا۔ اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت ہونا چاہئے۔ اگر یہ وہی ربا تھا جو آج کے دور میں پایا جاتا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ یہ خود دنیائے اسلام کے عملی مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات پچھلے چند سالوں میں اتنی کثرت سے کہی گئی اور اتنی اعلیٰ سطحوں پر کہی گئی کہ اس کا نوٹس لیا جانا ضروری ہے۔ سیرت کے علما اور سیرت کے طلبہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر تحقیق کر کے بتائیں کہ عہد نبوی میں مالی نظام کیسے قائم کیا گیا۔ یہ مالی نظام اسلام سے پہلے کیا تھا۔ حضور کے آنے سے کیا اصلاحات آئیں اور جس ربا کی حضور نے ممانعت فرمائی اس کی نوعیت اور طریقہ کار کیا تھا۔ جب ترمیم اور اصلاح فرمائی تو اس کے بعد کیا شکل سامنے آئی۔ پھر مکہ مکرمہ اور طائف میں جو تجارتی سرگرمیاں تھیں۔ جس کا بڑا حصہ اسلام سے پہلے سود کی بنیاد پر ہوتا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اسی سود کو بالآخر حرام قرار دیا اور ان تمام دعاوی کو خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر کالعدم قرار دیا، اس کی پوری تفصیل اور پورا نقشہ ہمارے سامنے ہونا چاہئے۔ یہ بات نہ صرف اس دور میں سود کی حرمت کی معنویت کو جاننے کے لئے ضروری ہے بلکہ دور جدید میں بلا سودی تجارت اور معیشت کا جو بھی نقشہ مرتب کیا جائے گا، اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس دور میں جب ان تبدیلیوں کا آغاز ہوا، اس کے بارے میں ایک مکمل اور مفصل نقشہ ہمارے سامنے ہو جو ہر قسم کے شک وشبہ اور تامل سے بالاتر ہو۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کی سرگرمیوں کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا اور یہ عرض کیا تھا کہ یہودیوں نے مدینہ منورہ میں اپنی تجارتی بالادستی قائم کر رکھی تھی۔ تجارت اور بازار ان کے کنٹرول میں تھے۔ مدینہ کی پوری معیشت بالآخر ان کے کنٹرول میں آ گئی تھی۔ اسی سود کی وجہ

سے وہ مدینہ منورہ کی بہت سی زمینوں کے مالک بن گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب سود کو حرام قرار دیا تو یہودیوں کی بالادستی کو ختم کرنے کے لئے آپ نے ربا الفضل کو بھی حرام قرار دے دیا۔ ربا الفضل کی نوعیت کیا تھی۔ اس کی حکمتیں کیا تھیں۔ اس کی حرمت کے نتائج اور اثرات کیا تھے۔ اس پر آج کل کے معاشی نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسیات سیرت کے ضمن میں میں نے ایک اہم مضمون کی طرف مختصر اشارہ کیا تھا وہ قبائل سے تعلقات تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل کے ساتھ تعلقات قائم فرمائے۔ ان تعلقات کو تبلیغ اسلام اور دعوت اسلام کے فروغ کے لئے آپ نے استعمال فرمایا۔ لیکن ان تعلقات کا پس منظر کیا تھا۔ ان میں سے ایک کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو امیہ الضمری ہی کو کیوں نجاشی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ پس منظر سامنے ہو تو ان کے انتخاب کی معنویت اور حکمت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس طرح سے بعض واقعات ہیں جو جس انداز سے بیان ہوئے ہیں ان سے ان کی حقیقی حکمت کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

عام طور سے مشہور ہے کہ ہجرت حبشہ کفار مکہ کے مظالم سے بچنے کے لئے ہوئی۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے۔ ہجرت حبشہ میں یہ پہلو یقیناً اہمیت کا حامل تھا کہ مسلمانوں کو کفار مکہ کے مظالم سے بچایا جائے۔ لیکن ہجرت حبشہ کے اس واقعہ میں بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے جو حضرات ہجرت کر کے حبشہ گئے ان میں سے ایسے بہت سے حضرات شامل نہیں تھے جو مکہ مکرمہ میں ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ جن پر دن رات مظالم ہو رہے تھے۔ حضرت بلال حبشی کو حضرت ابوبکر آزاد کر چکے تھے۔ وہ حبشہ ہجرت کر کے نہیں گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی نہیں گئے۔ عمار بن یاسر مدینہ منورہ کے مظلومین میں شمار تھے۔ کسی کے غلام نہیں تھے لیکن وہ بھی ہجرت کر کے نہیں گئے۔ اس کے برعکس بعض ایسے صحابہ کرام ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جو عرب میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ، عبدالمطلب کے پوتے اور ابوطالب کے صاحبزادے، اور قبیلہ بنی ہاشم کے بہت نمایاں افراد میں تھے وہ یقیناً مظلومین میں نہیں تھے۔ ان کے والد محترم جناب ابوطالب تو خود ریاست مکہ کے سربراہ اور مسلمانوں کے مؤید تھے۔ اس لئے حضرت جعفر کا شمار

مظلومین مکہ میں کبھی نہیں تھا۔

مہاجرین حبشہ کے اس انتخاب پر غور کیا جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت سے ہی ایک متبادل دارالہجرت کی تلاش شروع کر رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں شاید یہ آیا کہ حبشہ کو دارالہجرت کے طور پر explore کیا جائے کہ وہاں کیا امکانات ہیں۔ اس لئے اس ہجرت میں کچھ صحابہ تو وہ گئے جو واقعتاً مظلوم تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ صف اول کے کچھ ایسے جید صحابہ بھی تشریف لے گئے جو اس مختصری مسلمان کمیونٹی میں قائدانہ مقام رکھتے تھے۔ وہ وہاں جا کر ذمہ داروں سے بات چیت کر سکتے تھے۔ اس بات کا جائزہ لے سکتے تھے کہ ہجرت کے لئے حبشہ ایک موزوں جگہ ہے کہ نہیں۔ آپ دیکھیں کہ ان میں عشرہ مبشرہ کے تین صحابی شامل ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف۔ قریش کے ایک اور بڑے سردار حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ ان میں شامل تھے۔ یہ چاروہ حضرات تھے جو اس طرح مظالم کا شکار نہیں تھے جس طرح کے مظالم کا اور بہت سے لوگ شکار تھے۔ حضرت خالد بن سعید بن العاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، ابوجہل کے بھائی عیاش بن ابی ربیعہ، فاتح شام حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، یہ سب حضرت کر کے ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ ایک fact finding mission تھا جس کا ہدف یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ جا کر وہاں صورت حال کو بغور دیکھیں۔ بہت سے حضرات اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہاں گئے۔ طویل عرصہ تک وہاں رہے۔ ان میں سے بہت سے ہجرت مدینہ کے کئی سال بعد واپس آئے۔ بعض کی زندگی میں ذوی الہجرتین کا لقب ملتا ہے جنہوں نے دو مرتبہ ہجرت کی اور یہ دونوں ہجرتیں حضرت ابوطالب کی زندگی میں ہوئیں۔ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مربی اور سرپرست تھے۔ جن کی موجودگی اس بات کی ضامن تھی کہ قریش کی طرف سے کوئی اتنا بڑا اقدام نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض اُس انداز کی چیز نہیں تھی جس انداز سے یہ چیز بیان ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے نئے پہلو سے اس کو دیکھنا چاہئے۔

اسی طرح سے سیاسیات یا قبائلیات سیرت میں اور جغرافیہ سیرت میں بعض غزوات کے محل وقوع اہم ہیں۔ صلح حدیبیہ کے بارے میں قرآن میں آیا کہ فتح مبین ہے۔ صلح حدیبیہ فتح

مبین کیسے ہے اور کیوں ہے۔ اس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ صلح حدیبیہ فتح خیبر کا مقدمہ ثابت ہوئی۔ فتح خیبر فتح مکہ کا مقدمہ ثابت ہوئی۔ صلح حدیبیہ کے بغیر فتح خیبر نہیں ہوسکتی تھی اور فتح خیبر کے بغیر فتح مکہ ممکن نہیں تھی۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے ملی ہوئی کڑیاں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی اس غیر معمولی مبصرانہ اور مدبرانہ حکمت عملی اور قیادت کو بتاتی ہیں جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کام لیا۔

اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلے کفار مکہ کو کر کے غیر جانبدار کر کے خیبر کے یہودیوں کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ فتح مکہ کی تمہید ثابت ہوئی۔ فتح مکہ کی تمہید اس طرح ثابت ہوئی کہ اب initiative قریش کے ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو جو یہ اعتماد تھا کہ مسلمان مدینہ کو خالی چھوڑ کر ان پر حملہ آور نہیں ہوں گے وہ ختم ہوگیا۔ خیبر کے یہودیوں کا زور توڑ دیا گیا۔ اور ایک قدیم اور روایتی دشمن کو محفوظ اور باعزت راستہ دے کر اپنے مقصود کو حاصل کر لیا گیا۔

یہ بھی سیرت کا ایک بنیادی ہدف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی جنگ میں دشمن کو کلی طور پر اور جسمانی طور پر ختم کر دینے کا فیصلہ نہیں کیا۔ کئی مواقع ایسے آئے کہ دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا تھا اور صحابہ نے اس کا مشورہ بھی دیا لیکن آپ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی اولادوں میں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں۔ گویا دشمن کا صرف زور توڑنے پر اکتفا کیا گیا اور اصل توجہ دعوت اور تبلیغ کے مقصد پر رہی۔ اس میں صرف ایک استثنا بنی قریظہ کا ملتا ہے۔ اس میں دشمن کے فوجیوں کو بڑی تعداد میں سزائے موت دی گئی۔ وہ سزائے موت کتنے لوگوں کو دی گئی۔ اس کے بارے میں ایک قدیم سیرت نگار نے 34 تعداد بتائی ہے۔ ایک نے 43، ایک نے 200 اور ایک نے 400 بتائی ہے۔ اب صحیح تعداد ان میں سے کیا ہے اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس پر آخری عدد پر کچھ حضرات نے شک کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی کہ بتائی گئی۔ یہ تعداد تھوڑی تھی۔ اس کا صحیح پتہ چلانے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ سیاسیات سیرت اور قبائلیات سیرت کے بعض پہلو ہیں۔ ان پر بہت کام ہوسکتا ہے۔

ایک اور پہلو جس پر کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کام ہونا چاہئے۔ وہ مستقبلیات سیرت کا

ہے۔ صحیح مسلم کی ایک بہت غیر معمولی روایت ہے۔ حضور کا ہر ارشاد بہت غیر معمولی ہے۔ لیکن یہ اس اعتبار سے غیر معمولی ہے کہ اس میں بعض بہت عجیب باتیں بیان فرمائی گئی ہیں جو پہلے لوگوں کے علم میں نہیں تھیں اور آج بھی بہت سے لوگوں کی توجہ اس پر نہیں ہے۔ بعض احادیث میں اہل مغرب پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ اُس زمانے میں اہل مغرب کو یا تو اہل روم کہا جاتا تھا یا بنی الاصفر کہا جاتا تھا۔ عام اسلامی اصطلاح ان کے لئے بنی الاصفر تھی یعنی زرد قوم کی اولاد۔ بنی الاصفر سے مراد ہوتی تھی اہل یورپ اور خاص طور سے رومنز۔ یہ اصطلاح احادیث میں ملتی ہے۔

امام مسلم نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ حضور کے ایک اور صحابی آپ کے پاس تشریف لے آئے۔ دوران گفتگو انہوں نے یہ بیان فرمایا کہ 'سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ 'تقوم الساعۃ والروم اکثر الناس' کہ جب قیامت قائم ہوگی تو دنیا میں رومیوں کی کثرت ہو جائے گی یعنی اہل یورپ کی کثرت ہو جائے گی۔ یہ کثرت تعداد کی بھی ہو سکتی ہے اور وسائل کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ کثرت وسائل کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے اور کمیت کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ اثر رسوخ کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے اور زور اور طاقت کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں سب کی گنجائش ہے۔ کس طرح کی کثرت ہوگی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن کثرت کے بعض نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ بعض شواہد اور مظاہر ہم دیکھ بھی رہے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص نے حدیث سن کر فرمایا کہ 'ابصر ماتقول'، دیکھو، کیا کہہ رہے ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ 'اقول ماسمعت من رسول اللہ ﷺ' میں وہی بات کہہ رہا ہوں جو میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنی۔ انہوں نے دوبارہ اس بات کو دہرایا۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ اچھا اگر تم نے یہ کہا ہے تو پھر میری بات بھی سنو۔ یاد رہے کہ حضرت عمرو بن العاص کا شمار عرب کے چار عقلمند ترین انسانوں میں ہوتا تھا۔ چار آدمیوں کو دہاۃ العرب کہا جاتا تھا کہ عرب کے داہیہ ہیں۔ داہیہ بڑے غیر معمولی عقلمند اور ذہین انسان کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 'لان قلت ذالک، اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو یاد

رکھو، 'ان فیھم لخصالاً اربعا'، اہل روم میں چار خصوصیات ہیں۔اس لئے وہ اکثر الناس ہوجائیں گے۔'انھم احلم الناس عند فتنۃ' جب وہ کسی فتنہ کا شکار ہوتے ہیں تو بہت ٹھہراؤ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔حوصلہ نہیں ہارتے۔ واسرعھم افاقۃ بعد مصیبۃ ، جب کسی مصیبت کا شکار ہوتے ہیں تو بہت جلدی اس کے اثر سے نکل آتے ہیں۔ واوشکھم کرۃ بعد فرۃ ، اور اگر کسی جنگ میں شکست ہوجائے تو بہت جلد دوبارہ حملہ کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ وخیرھم لمسکین و یتیم وضعیف، اور اپنے مسکین، ضعیف اور یتیم کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وخامسھم حسنۃ جمیلۃ، پانچویں ایک بڑی خوبی یہ ہے' وامنھم من ظلم الملوک ' اور بادشاہوں کو ظلم سے روکنے کے لئے ہروقت آمادہ رہتے ہیں۔ یہ حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا ہے اور صحیح مسلم میں روایت ہوا ہے۔اس طرح کے بے شمار تبصرے ہیں جو احادیث میں اہل یورپ اور مغرب کے بارے میں ملتے ہیں۔ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام بھی اور رسول اللہ ﷺ بھی اہل مغرب کی اس اہمیت سے واقف تھے اور اس سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً متنبہ بھی کرتے رہتے تھے۔

سیدنا عمر فاروق کے بارے میں ایک روایت میں آتا ہے کہ ان کو مشورہ دیا گیا کہ بحر متوسط اور بحر قلزم کے درمیان نہر سویز کی طرح کا ایک بحری راستہ بنوالیں۔آپ نے سختی سے اس سے منع کیا۔اور کہا کہ تم یہ نہ کرو۔وجہ یہ بیان کی کہ اگر تم ایسا کرو گے تو بنی الاصفر تمہارے گھروں کے صحنوں سے تمہاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔یعنی یورپ کے اثرات تمہارے گھروں کے اندر پہنچ جائیں گے۔یہ نہر سویز کی پیش رو نہر کے بارے میں حضرت عمر نے فرمایا تھا۔اب اگر یہ دیکھیں کہ نہر سویز کے بننے سے پہلے کیا حالات تھے اور بعد میں کیا تبدیلیاں آئیں تو سیدنا عمر فاروق کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ جو حقائق اور واقعات سیرت اور حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو جمع کرکے ایک نئے انداز سے موجودہ دور کی سیاست کا مطالعہ کرنا چاہئے۔اسلامی امت کے مستقبل کو سمجھنے کے لئے ایسا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

ایک اور چیز جس کی طرف مختصر سا اشارہ کرکے بات ختم کردیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سی احادیث اور سیرت کی کتابوں میں قدیم مذہبی اور آسمانی کتابوں کے حوالے بیان ہوئے

ہیں کہ تورات میں یہ آیا ہے۔ انجیل میں یہ آیا ہے۔ فلاں فلاں آسمانی کتابوں میں یہ آیا ہے۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو مستند احادیث میں آئی ہیں اور کچھ روایات وہ ہیں جو تابعین کے ذریعے آئی ہیں۔ ایسی روایات کا بڑا حصہ ان تابعین کے ذریعے آیا ہے جو اسرائیلیات کی روایت کیا کرتے تھے۔ اگر اسرائیلیات کی روایت کو فی الحال چھوڑ دیا جائے اور ان روایات کو لیا جائے جو احادیث صحیحہ میں آئی ہیں اور صحابہ اور مستند تابعین نے بیان کی ہیں تو ان کا حوالہ قدیم کتابوں میں آج کس حد تک دستیاب ہے اور ان بیانات کی اپنی تاریخی حیثیت کیا ہے، اس پر ابھی تک کوئی مناسب تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ یہ موضوع ابھی تشنہ تحقیق ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ ہوں جو قدیم زبانوں کو جاننے والے ہوں۔ عبرانی، سریانی اور آرامی زبانیں سمجھنے والے ہوں۔ قدیم لٹریچر تک ان کی رسائی ہو۔ اس کے بعد وہ اس لٹریچر کا مطالعہ کرکے ان بیانات سے جو احادیث میں آئے ہیں ان کا مقابلہ کرسکیں۔

اس مواد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تو طوامیر بحرمیت کا ہے۔ طوامیر بحرمیت سے مراد وہ ذخیرہ ہے جو Dead Sea کے قریب ایک غار سے برآمد ہوا تھا۔ آج اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ حالانکہ یہ ذخیرہ اردن میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن مغربی طاقتوں نے اس ذخیرے کا بڑا حصہ اسرائیل منتقل کردیا۔ آج یہ اسرائیل میں ہے اور مسلمان محققین کو اس سے استفادہ کی اجازت کافی عرصہ سے نہیں ہے۔ یہ ایک بہت قدیم کتب خانہ تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی کتابوں پر بھی مشتمل ہے اور بیشتر کتابیں آپ سے بعد کی ہیں۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی تک کی کتابیں اس میں شامل ہیں۔ یہ طوامیر یعنی scrolls کی شکل میں دستیاب ہوئی تھیں۔ ان میں بہت سا ایسا مواد موجود ہے جن سے قرآن پاک اور احادیث کے بیانات کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن جب تک اس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے اور قرآن پاک اور احادیث کے بیانات سے اس کا تقابل نہ کیا جائے، اس وقت تک کوئی قطعی اور حتمی بات کہنا بڑا دشوار ہے۔

بعض مستشرقین نے جن میں سے ایک دو کی میں نے کل مثال دی تھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خانوادے کے بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں جو بڑی غلط اور غیر تاریخی ہیں۔ لیکن ان کو غلط اور غیر تاریخی کہنے کے لئے ضروری ہے کہ اس انداز کی تحقیق کو آگے بڑھایا جائے

جو سر سید نے حضور کے خانوادے اور عرب کے جغرافیہ پر کی تھی۔ یہ موضوع نہ قدیم ہوا ہے اور نہ ہی outdated ہو گیا ہے۔ یہ آج بھی تازہ اور زندہ موضوع ہے۔ انساب پر اب بہت سا نیا مواد سامنے آیا ہے جو اس وقت سر سید وغیرہ کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس مواد کو سامنے رکھ کر علم انساب کی نئی تحقیق اور اس کی تدوین نو کی ضرورت ہے۔ مختلف قبائل میں حضور کی جو رشتہ داریاں تھیں خاص طور پر آبائے نبی اور امہات نبی کے بارے میں جو کچھ مواد سیرت نگاروں اور انساب نویسوں نے جمع کیا ہے، وہ بڑی آسانی سے کمپیوٹرائز کیا جا سکتا ہے۔

نفسیات سیرت کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ نفسیات سیرت میں کون کون سے پہلو ہیں۔ دعوت و تبلیغ میں نفسیات کے کیا پہلو ہیں۔ حکمت دعوت و تبلیغ کیا ہے۔ مکالمہ مع الغیر میں سیرت کی رہنمائی کیا ہے۔ پھر دوسرے علوم پر سیرت کے اثرات۔ اسلام کا بین الاقوامی قانون تو براہ راست سیرت سے متاثر ہے۔ لیکن تاریخ نویسی پر، علم رجال پر، فقہ اسلامی پر، تفسیر پر، تصوف پر، ان تمام علوم وفنون پر سیرت کے براہ راست اثرات ہوئے ہیں۔ وہ کیا اثرات ہیں۔ یہ چیزیں ایک نئی تحقیق کی متقاضی ہیں۔

قدیم کتب کے مغربی زبانوں میں تراجم درکار ہیں۔ آج مسلمانوں میں مغربی زبانیں جاننے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ قدیم کتابیں ترجمہ ہو بھی رہی ہیں۔ لیکن مزید ترجمہ کی ضرورت ہے۔

اجتماعیات سیرت یعنی Sociology of Sirah، اس کے بعض ضروری پہلوؤں کی طرف میں نے اشارے کئے تھے اور عرض کیا تھا کہ شاہ ولی اللہ ایک اعتبار سے اس فن کے موسس ہیں کہ انہوں نے السیاسیات الملیہ اور الاجتماعیات الملیہ کے نام سے اس مضمون سے بحث کی ہے اور اس کی طرف بعض اشارے کئے ہیں۔

طب نبوی کے نام سے بھی ایک شعبہ علم سیرت کے دفتروں میں پنہاں ہے۔ حافظ ابن قیم کی زاد المعاد میں اس موضوع پر وقیع سرمایہ موجود ہے۔ ان کی کتاب الگ سے بھی چھپی ہے۔ اس مواد کا فنی جائزہ لیا جانا چاہئے۔ آج کل کے ماہرین طب فنی تحقیق کے بعد ہی اس پر کوئی رائے دے سکتے ہیں۔

مخطوطات سیرت کا سروے کرنے کی ضرورت ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور ترکی زبانوں

میں بے شمار غیر مطبوعہ مخطوطات موجود ہیں۔ بہت سے مقالات یونیورسٹیوں میں ابھی غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ان کا ابھی سروے نہیں ہوا۔ یہ سب یک جا نہیں ہوئے۔

سیرت کی کمپیوٹرائزیشن ہونی چاہئے۔ اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ آج کی گفتگو کی مدد سے سب سے پہلے روایات معجزات کا جائزہ لیا جائے تو شاید بہت سی الجھنیں صاف کرنے میں مدد ملے۔ پہلے مرحلہ میں ان تمام راویوں کی درجہ بند کمپیوٹرائزیشن کی جائے جن سے معجزات کی روایات نقل ہوئی ہیں۔ پھر ان سب روایات کا آپس میں مقابلہ کر کے تکرار کو دور کیا جائے اور اصل اور مستند معجزات کو منقح کیا جائے۔ معجزات کے بعد دوسرے راویوں کا اسی طرح الگ الگ جائزہ لینے سے بہت سے مسائل حل ہو سکیں گے۔

سیرت چیئرز ہمارے ہاں مختلف یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ کافی عرصہ سے میرا خیال ہے، میں نے یہ گزارش ایک دو مرتبہ پہلے بھی بعض یونیورسٹیوں میں کی کہ اگر ان میں سے ہر چیئر کا نام کسی نامور سیرت نگار کے نام پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً پنجاب یونیورسٹی میں سیرت چیئر کا نام مسند ابن ہشام ہو جائے۔ بہاولپور میں مسند عروہ بن زبیر ہو جائے۔ برصغیر کے سیرت نگاروں میں سے مسند شبلی، مسند سلیمان منصور پوری یا قدیم سیرت نگاروں میں سے مسند واقدی، مسند ابن ہشام وغیرہ اس طرح سے نام ہو جائے تو ان شخصیات کے کام اور نام کا ایک اعتراف ہوگا۔

سیرت نگاری کے آج مختلف درجات ہیں۔ عامۃ الناس کے لئے، تعلیم یافتہ حضرات، متخصصین اور متشککین ان سب کے لئے سیرت کے کام کی الگ الگ ضرورت ہے۔

قدیم کتب سیرت میں تہذیب وتمدن، تجارت ومعیشت، رسوم ورواج، قبائلی تعلقات ،رشتہ داریاں وغیرہ پر مواد بکھرا ہوا ہے۔ اس پر الگ سے تحقیق بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے ایسی تحقیق کی ہے۔ ان میں سے ایک بڑا مفید کام اکرم ضیا عمری نے کیا ہے۔ اس کا انگریزی، اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک جامع کتابیات کی ضرورت ہے۔ جو اردو انگریزی اور اس طرح کی تمام کتابوں کی جامع ہو جس طرح کہ رفاعی کی کتاب کا میں نے ذکر کیا تھا۔ اس میں صرف عربی کتابوں کا ذکر ہے جو 29 ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔ اگر تمام کتابوں کا ایک نیا انسائیکلو پیڈیا اور

ببلیوگرافی بنائی جائے تو یقیناً اس کا عدد ایک ڈیڑھ لاکھ سے اوپر چلا جائے گا۔ اس لئے کوئی خود اردو زبان میں پچیس تیس ہزار کے قریب اندراجات اس میں ہوں گے۔ انگریزی اور بقیہ زبانوں کو اس میں شامل کرلیں تو یہ عدد بہت اوپر چلا جائے گا۔ یہ کام کوئی بڑا حکومتی ادارہ ہی کرسکتا ہے، افراد نہیں کرسکتے۔ اس طرح کے ایک دو کام اور بھی ہیں جو میں تجویز کرنا چاہتا تھا، لیکن وزیر صاحب تشریف نہیں لائے ، مصروف ہوں گے۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں ان سے کہوں گا کہ وزارت کے تحت ان میں سے بعض کام شروع کرائے جاسکتے ہیں۔ یہ کام حکومت پاکستان ہی کرسکتی ہے۔ حکومت پاکستان خود نہ کرے تو کسی ادارہ کو وسائل فراہم کرکے یہ کام سپرد کردے۔ لیکن یہ کام جب ہوسکتا ہے جب انسان کے دل میں عزم وارادہ ہو۔ نیت صاف ہو۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ دے۔ قسمت تب ساتھ دے گی جب وہ قسمت کو بنانا چاہے گا۔

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

-☆-

سوال و جواب

جب آپ اپنی کتاب محاضرات سیرت مرتب کریں تو وہ معلومات جو تنگی وقت کی وجہ سے پیش نہیں کر سکے یا وہ معلومات جو آپ کو بعد میں یاد آئیں براہ کرام ان کو اپنی کتاب میں شامل کریں۔

ان شاء اللہ۔ جب کتاب مرتب ہوگی تو میں وہ چیزیں ضرور شامل کروں گا جو رہ گئیں۔

☆

آپ نے علم سیرت کی تحقیق پر زور دیا۔ نبی علیہ السلام نے جو سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کا عملی نمونہ پیش کیا، اس عملی نمونہ کی پاکستان اور بقیہ اسلامی ممالک میں ضرورت واہمیت واضح کریں۔

یہ ساری بارہ دن کی گفتگو اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے تھی۔ مسلمانوں کی بقا اسی نمونہ کی پیروی میں ہے۔ مسلمانوں کو اگر عزت وآبرو کے ساتھ بطور مسلمان زندہ رہنا ہے تو ان کو اس نمونہ کی پیروی کرنا ہوگی۔ اگر وہ اس نمونہ کی پیروی نہیں کریں گے تو ان کا ملی وجود باقی نہیں رہے گا۔

علامہ اقبال نے الہ آباد کے خطبہ میں ایک غیر معمولی جملہ کہا ہے۔ Islam is itself a destiny, it does not suffer a destiny.

☆

آپ نے دور قدیم میں مختلف تقویموں کے رائج ہونے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ قریش بھی چار مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ اس وقت یہ کس تقویم کے تحت تھے؟ کیا یہ وہی مہینے ہیں جو آج بھی اسلام میں رائج ہیں؟

یہی مہینے عرب میں بھی رائج تھے۔ یہ اسلامی مہینے ہیں اور یہ بہت طویل زمانے سے، غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن عربوں نے ان مہینوں کے احترام کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی خاطر نسی اور کبیسہ کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کے پیش نظر وہ اس میں کمی بیشی کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو اس وقت یہ دونوں کیلینڈر coinscide کر گئے تھے۔ حقیقت کے اعتبار سے اس دن 9 ذی الحجہ تھی اور قریش کے جعلی کیلینڈر کے حساب سے بھی نو ذی الحجہ تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ **ان الزمان قداستدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض**، آج زمانہ اسی ہیئت میں واپس آگیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا۔ آج کے بعد نہ نسی ہوگی نہ کبیسہ ہوگا۔

☆

آپ نے انتہائی اہم پہلو کی نشاندہی کی کہ اجتماعی طور پر مغربی پروپیگنڈے کے خلاف تنظیمی کام کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف اخبارات وجرائد میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے کام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ کس حد تک مثبت کام ہے؟

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کو جہاں تک میں جانتا ہوں یہ ختم نبوت کے میدان میں کام کرتی ہے اور جہاں جہاں دنیا میں قادیانی اپنے غلط خیالات اور عقائد کو پھیلاتے ہیں یہ ان کو جواب دینے کے لئے وہاں کام کرتی ہے۔ اچھا کام ہے۔

مشہور مغربی مستشرق جارج ڈبلیو بش کی کتاب کے بارہ میں کچھ بتائیے۔

اگر آپ کا اشارہ صدر امریکہ جارج بش کی طرف ہے تو جارج ڈبلیو بش تو مستشرق نہیں ہیں۔ سیاستدان ہیں۔ مستشرق اس مغربی عالم کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم وفنون کو حاصل کر کے ان میں مہارت پیدا کرے۔ میں نہیں جانتا کہ جارج ڈبلیو بش مشرقی علوم وفنون کے ماہر ہیں کہ نہیں۔ میرے علم کی حد تک انہوں نے کسی مشرقی موضوع پر کوئی کتاب بھی نہیں لکھی۔ نہ مقالہ لکھا۔ ہاں آج سے غالباً سوسوا سو سال پہلے اس نام کے ایک صاحب گزرے ہیں۔ انہوں نے سنا ہے کہ سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی جو اب دوبارہ چھپی ہے۔ لیکن میں نے نہیں دیکھی۔

☆

اسلامیات کے نصاب میں مسلکی اختلافات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل تجویز فرمائیں۔

مسلکی اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ حقیقی علمی اختلاف ہے جس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اگر آپ تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ تو آپ کو اختیار ہے کہ اس نتیجہ پر قائم رہیں۔ لیکن دوسروں کی تحقیق میں بھی صحیح اور غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کریں۔ اس میں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن اگر مسلکی اختلاف کی بنیاد پر مسلمانوں میں اختلاف اور تشتت اور تحزب پیدا ہو اور ایک دوسرے کی تغلیط ہو تو یہ درست نہیں ہے۔ امت کی وحدت تو قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ ان ہذہ امتکم امۃ واحدۃ۔ امت کی وحدت کی تاکید قرآن پاک اور حدیث پاک میں ہوئی ہے۔ لہٰذا کسی کی ذاتی رائے، ذاتی ذوق یا ذاتی اجتہاد امت کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہونا چاہئے۔ جب تک مسلمان قرآن پاک اور حدیث کے قطعی علم سے وابستہ رہیں گے، مسلکی اختلاف اپنی حدود میں رہے گا۔ جب اس کو نظر انداز کر کے مسلکی کتابوں اور اختلافات کو بنیاد بنائیں گے تو اختلافات مزید شدید ہوں گے۔

آپ نے بجا طور پر کہا کہ مختلف جامعات میں سیرت کی مختلف شعبہ جات کو مختلف شخصیتوں کے محترم ناموں سے منسوب کرنا چاہئے۔ حال ہی میں یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کا افتتاح ہوا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ اس کو کسی علمی اور تاریخی شخصیت سے منسوب کیا جاتا؟

یہ بالکل بہتر ہوتا۔ ہم نے یونیورسٹی کی لائبریری کا نام اس لئے نہیں رکھا کہ پاکستان کے ایک مشہور قانون دان اور ہماری یونیورسٹی کے پہلے بورڈ آف ٹرسٹیز کے رکن جناب خالد اسحاق صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ، جو پاکستان کا سب سے بڑا ذاتی کتب خانہ ہے اور جس میں ڈھائی لاکھ کے قریب کتابیں ہیں حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ وہ کتابیں ہماری لائبریری کو مل جائیں۔ وہ اپنی زندگی میں یہ کتابیں کسی ادارے کو دینا چاہتے تھے۔ میں ان سے ملا تھا۔ یونیورسٹی کے سابق ریکٹر جسٹس خلیل الرحمٰن خاں صاحب بھی ان سے ملے تھے۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اس پر غور کریں گے۔ ہم نے اس پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر آپ نے یہ کتابیں ہماری لائبریری کو دے دیں تو ہم مرکزی لائبریری کا نام خالد اسحاق لائبریری رکھ دیں گے۔ ابھی تک وہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ ان کے پس ماندگان نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہم نے لائبریری کا نام بھی نہیں رکھا۔ جب یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو جو حضرات اُس وقت یونیورسٹی کے ذمہ دار ہوں گے، وہ جو نام مناسب سمجھیں گے وہ رکھ دیں گے۔

☆

حضرت عمر بن العاص عرب کے چار انتہائی دانا اور عقلمند شخصیات میں سے تھے، دیگر تین حضرات کے اسمائے گرامی بتائیں۔

ایک کا نام تھا حضرت مغیرہ بن شعبہ، دوسرے تھے زیاد بن ابی سفیان اور چوتھے تھے

حضرت معاویہ، ان کے بھائی۔

☆

جنگ عظیم اول میں جو 73 لاکھ افراد مارے گئے ان میں سے کتنے مسلمان تھے؟

یہ مجھے معلوم نہیں۔ برطانوی فوج میں خاصے مسلمان تھے جو برصغیر کے سپاہیوں پر مشتمل تھے لیکن ان کی صحیح تعداد کا مجھے علم نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ لاکھوں میں ہوں گے۔

☆

لفظ عشق جو اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ بہت زیادہ پیار ہونے کے باجود ہم استعمال نہیں کرتے، تو حضور کے ساتھ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔؟

اصل میں لفظ عشق کے معنی بہت زیادہ اور شدید محبت کے ہیں۔ اردو میں یہ لفظ کسی اچھے یا مثبت معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فارسی اور صوفیانہ ادبیات میں یہ اصطلاح ذات رسالت مآب اور اللہ تعالیٰ سے محبت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ صوفیا اس کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ مولانا رومی نے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے، علامہ اقبال نے استعمال کیا ہے۔ اور بھی بہت سے اکابر صوفیہ اس لفظ کو استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس لئے اس سیاق وسباق میں اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں محسوس نہیں ہونی چاہئے۔

☆

اگر حکومت پاکستان موجودہ اکیسویں صدی میں سیرت کو اجاگر کرنے کے لئے کچھ نہیں کررہی، تو کیا مذہبی پارٹیاں مل کر ایسا نہیں کرپائیں گی؟

یہ مذہبی پارٹیوں سے پوچھئے۔ ان کی طرف سے میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔

☆

کیا سیرت النبی پر تمام کتب کی ویب سائٹ اور کتب کے کمپیوٹرائز ریکارڈ کے لئے کوئی الگ سے لائبریری قائم نہیں ہوسکتی۔

کیوں قائم نہیں ہوسکتی، بالکل ہوسکتی ہے۔ میں نے یہی عرض کیا ہے کہ اگر تمام مسلم ممالک کوئی ایسی بڑی لائبریری بنائیں جس میں ان تمام کتابوں کو ویب پر منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو یہ بڑا مفید ہوگا۔

☆

حضرت عمر فاروقؓ نے نہر سویز کو بنانے سے منع کیا۔ اس کی وجوہات کو تھوڑا سا واضح کردیں۔ عورتوں کو اٹھالے جانے سے کیا مراد ہے؟

آپؓ نے غالباً اس لئے منع فرمایا تھا کہ جو اسلام کا دل ہے، یعنی حجاز کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ، یہ براہ راست ان کی زد اوران کے اثر میں آجائے گا۔ اس لئے حضرت عمر فاروق نے اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔ تجربہ نے ثابت کیا کہ جب سے نہر سویز بنی ہے یہ علاقہ براہ راست ان کی بحری طاقت کی زد میں آگیا۔ وہ جس آسانی سے مشرقی ممالک پر قبضہ کرسکے اس میں نہر سویز کی بڑی اہمیت ہے۔ نہر سویز سے پہلے ان کو بہت دور سے آنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے وسائل اتنی آسانی سے دستیاب نہ ہوتے تھے۔ بظاہر یہی چیزیں حضرت عمر کے پیش نظر ہوں گی۔

عورتوں کے اٹھالے جانے سے مراد یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا وطن اور داخلی پہلو ان کے سامنے کھل جائے گا تو پھر مسلمانوں کی خاندانی زندگی اور پرائیویسی محفوظ نہیں رہے گی۔ یہ مراد ہے۔

آپ نے جو فارسی شعر پڑھا، اس کا ترجمہ بتادیں۔

فارسی شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں طلب صادق نہ ہو تو اگر خضر کی ہمراہی میں بھی آب حیات کے چشمے تک پہنچ جائے گا تو اس کو آب حیات حاصل نہیں ہوگا۔ آب حیات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اپنے دل میں بھی طلب صادق اور سچا جذبہ موجود ہو۔

☆

سیرت کے حوالے سے جو کام ہوا ہے کیا مستقبل میں اس سے بہتر کام ہوسکتا ہے؟

یقیناً ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف نبوت کا دروازہ بند کیا ہے۔ باقی کوئی دروازہ بند نہیں کیا۔ آنے والے پچھلوں سے بہترین کام کرسکتے ہیں۔

☆

نبی کریم ﷺ کے غزوات کے تناظر میں آپ نے مقتولین کی تعداد 550 بتاتے ہوئے اشارہ کیا تھا کہ بنوقریظہ کے بارے میں اہم نکتہ کی وضاحت بعد میں کروں گا لیکن نکتہ تشنہ رہ گیا۔

وہ نکتہ یہ تھا کہ بنوقریظہ ایک اہم یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ منورہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ یہودیوں کے قبائل میں مسجد نبوی سے سب سے بعید مسافت پر یہی تھا۔ ان سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ یہ بیرونی دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور ان کو وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو مدینہ کے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ لیکن جب غزوہ خندق ہوا اور کفار مکہ نے دیگر کفار سے مل کر بڑی تعداد میں لشکر بنا کر مسلمانوں پر حملہ کیا تو بنی قریظہ کے یہودیوں نے اندر سے ان کے ساتھ مل کر سازش کی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی

کوشش کی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی جس کی وجہ سے یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ جتنی فوجیں آئی تھیں وہ بغیر کسی کامیابی کے واپس چلی گئیں۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے یہودیوں کو سبق سکھانے کا اور سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ان کا محاصرہ کرنے کا حکم کیا۔ بنو قریظہ کے یہودی پندرہ دن تک محاصرہ کی مزاحمت کرتے رہے۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انہوں نے پیغام دیا کہ وہ کسی حکم کے فیصلہ پر surrender کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے اپنے مطالبہ پر حضرت سعد بن معاذ کو جو اوس قبائل کے سربراہ تھے، حکم بنایا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ بیماری کی حالت میں مدینہ سے تشریف لائے اور تورات کے حکم کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ یہ حکم آج بھی تورات میں لکھا ہوا ہے۔

بقیہ روایات میں یہ ہے کہ ان کی جو جائدادیں تھیں وہ فاتحین میں تقسیم کر دی گئیں۔ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات میں تو یہ آتا ہے۔ لیکن بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ان کے 43 سرداروں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض میں آتا ہے کہ ان کے 200 آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات کے مطابق ان کے 400 آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں کے ہاں اتفاق رائے نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی کتابوں میں آیا ہے کہ اس قبیلہ کے بعض مرد بعد میں بھی مدینہ منورہ میں رہے۔ وہ یہودی تھے اور اس کے باوجود مدینہ میں رہے۔ ان میں سے بعض نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ اگر ان کے سارے مردوں کو قتل کیا گیا ہوتا تو مدینہ میں پھر قرظی یہودیوں کا موجود ہونا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

اس بنیاد پر بعض لوگوں نے تحقیق کی ہے جن میں سے ایک صاحب کے کام کا میں نے حوالہ دیا تھا، یعنی جناب ابوالبرکات احمد۔ یہ صاحب مسلکاً قادیانی ہیں لیکن انہوں نے Muhammad and the Jews of Madinah کے نام سے ایک اچھی اور محققانہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے اور شواہد بھی دیئے ہیں کہ بنی قریظہ کے صرف جنگی مجرموں کو سزا دی گئی۔ ان کی تعداد تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ بقیہ لوگوں کو سزا نہیں دی گئی۔ ممکن ہے یہ بات درست ہو۔ اس لئے اس پر ابھی مزید غور ہونا باقی ہے۔

قدیم سیرت نگاروں نے اس کو خاص تحقیق کے قابل نہیں سمجھا۔ تحقیق تو تب ہوتی ہے جب کسی مسئلہ پر سوال اٹھایا جائے۔ بقیہ روایتیں جو چلی آرہی تھیں لوگ اس کو بیان کرتے رہے اور کسی نے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ لیکن اب چونکہ ایک صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کے مضبوط شواہد بھی دیئے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر از سر نو تحقیق کی جائے۔

ایک مزید اہم بات جو بظاہر توجہ مبذول کراتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں بہت سے غزوات پر بڑی تفصیل کے ساتھ تبصرے کئے گئے ہیں، وہاں غزوہ بدر میں جو 70 مکی مارے گئے ان پر تبصرہ بہت تفصیل کے ساتھ ہے۔ احد میں شہید ہونے والے 70 صحابہ کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ہے۔ اگر بنی قریظہ کے آدمی اتنی بڑی تعداد میں مارے گئے ہوتے تو قرآن پاک میں تفصیل سے ان کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن قرآن پاک میں صرف ایک ہی جملہ ہے کہ 'تقتلون فریقا وتاسرون فریقا' تم نے ان میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کر لیا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ قتل کی وہ نوعیت نہیں تھی جو بعض روایات میں بیان کی گئی ہے۔

☆

توہین رسالت کا قانون موجودہ صورت حال کس حد تک موثر ہوسکتا ہے جب کہ علما حضرات توہین کی تعریف پر ہی متفق نہیں۔ بریلوی حضرات دیوبندیوں کے اور دیوبندی بریلویوں کے بارے میں توہین رسالت اور گستاخی کا فتویٰ دیتے ہیں۔ کیا اس طرح امت کا بڑا حصہ توہین رسالت قانون کی زد میں نہیں آئے گا؟

نہیں، میرے خیال میں نہیں آئے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دیوبندی اور بریلوی حضرات توہین کی تعریف پر مختلف الرائے نہیں ہیں۔ توہین کی تعریف تو پاکستان پینل کوڈ میں پہلے سے ہوگئی ہے۔ یہ کام نہ تو کوئی دیوبندی کرے گا نہ کوئی بریلوی کرے گا۔ توہین کی قانونی تعریف کے بارہ میں یہ لفظ پہلے ہی قانون میں موجود ہے اور یہ دفعہ 1926 سے موجود ہے۔

1926 سے پہلے یہ دفعہ 298 موجود تھی۔ 1926 میں دفعہ 298 اے کا اضافہ ہوا۔ پھر بعد میں 1940 وغیرہ میں 298 بی کا اضافہ ہوا اور پاکستان بننے کے بعد 1984 میں 298 سی کا اضافہ ہوا۔ لیکن جو اصل الفاظ ہیں insult, put into disrepute وغیرہ، یہ سارے پہلے سے قانون میں موجود ہیں اور ان کی تعریف ہو چکی ہے۔ جو کوئی ان الفاظ کے مطابق توہین کا مرتکب ہو گا وہ قانون کی زد میں آئے گا۔ کسی دیوبندی یا بریلوی عالم کی رائے یا ذاتی خیال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پھر اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو وہ اس معاملہ میں ہے کہ کیا کوئی خاص بات جو کسی دیوبندی عالم نے کہی ہے وہ اس نے کہی ہے؟ یا اس سے غلط منسوب ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس سے غلط منسوب ہے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ آئے گا بھی تو حقائق اور واقعات کی بنیاد پر اس پر غور ہو جائے گا۔

☆

سیاسیات سیرت کے حوالہ سے کوئی اچھی کتاب اور کسی معروف مصنف کا نام بتا دیں۔

سیاسیات سیرت پر دو کتابیں تو اردو میں ہیں۔ ایک ڈاکٹر نثار احمد کی ہے۔ اس کا نام غالباً عہد نبوی کا نظام حکومت ہے۔ دوسری کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی کی ہے۔ دو کتابیں ڈاکٹر حمید اللہ کے مقالات کے مجموعے ہیں۔ ایک ہے عہد نبوی میں نظام حکمرانی اور دوسری ہے رسول اکرم کی سیاسی زندگی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے جدید سیرت نگاروں نے یہ پہلو بیان کئے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ایک لائبریری اسرائیل کے قبضہ میں ہے اور مسلمان اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کا پس منظر اور مقام دریافت بیان کریں۔

اس لائبریری کا پس منظر یہ ہے کہ بحر میت (بحر مردار) جس کو کہتے ہیں۔ اس کا مغربی کنارہ پہلے اردن کے قبضے میں تھا اور 1968 میں اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ وہاں ایک غار میں 1947 میں ایک لائبریری دریافت ہوئی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد تک کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ کچھ کتابیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی بھی بتائی جاتی ہیں کچھ بعد کی ہیں۔ یہ سب اسکرول کی شکل میں مٹی کے مٹکوں میں رکھی ہوئی تھیں اور بظاہر اندازہ یہ ہے کہ جب عیسائیوں پر مظالم ہو رہے تھے اور یہودی ان پر سختیاں کر رہے تھے تو کوئی عیسائی عالم ان کو محفوظ کرنے کی خاطر ان کو غار میں رکھ کر اپنی جان بچا کر کہیں چلے گئے۔ شاید اس نیت سے کہ بعد میں جب حالات بہتر ہوں گے تو آکر اپنا کتب خانہ لے لیں گے۔ وہ بعد میں نہیں آسکے۔ یہ کتب خانہ وہیں رہا اور 1947 میں دریافت ہوا۔ جب ماہرین نے اس کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس میں بہت قیمتی مذہبی کتابیں ہیں۔ اس میں یہودیت کے بارے میں بھی کتابیں ہیں اور عیسائیوں کے بارے میں بھی۔ مختلف اہل علم کی یادداشتیں ہیں۔ بعض قدیم کتابوں کے قدیم نسخے ہیں۔ یہ کتابیں اس وقت دریافت ہوئی تھیں جب وہاں اُس وقت فلسطین پر یہودیوں کا باقاعدہ قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اسرائیل کی ریاست بننے کے بعد اس کا بڑا حصہ تو مغربی ملکوں میں منتقل کر دیا گیا۔ بعض حصے بیت المقدس میں اردن کے قبضے میں رہے۔ بعد میں جب اسرائیل کا قبضہ مغربی کنارے پر بھی ہو گیا تو وہ سارا ذخیرہ بھی اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے کچھ اجزا شائع ہوئے ہیں۔ میں نے خود اس کی کوئی چیز پڑھی نہیں۔ Dead Sea Scrolls کے بارے میں ایک دو کتابیں پڑھی ہیں۔ لیکن جو اجزا شائع ہوئے ہیں اور عربی یا انگریزی میں ترجمہ ہوئے وہ میں نے دیکھے نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس میں بعض ایسی چیزیں ہیں جن سے قرآن پاک کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے کہ سیرت اور حدیث اور قرآن پاک میں جو بیانات پچھلی قوموں کے بارے میں آئے ہیں، کیا اس ذخیرہ میں ایسی کوئی چیز ہے جس سے ان کی تصدیق ہوتی ہو۔

آپ کے علاوہ اسلامی یونیورسٹی کے اکابرین موجود ہیں۔ کیا
یونیورسٹی دوسری اسلامی یونیورسٹیوں کے تعاون سے سیرت
کے ممکنہ پروجیکٹ پر کام کرے گی؟

میں تو یونیورسٹی کے اکابرین میں سے نہیں ہوں۔ اکابرین یہ موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔ اگر ایسا کوئی کام کیا جائے گا تو میں خوشی سے اس میں حصہ لوں گا۔

☆

کیا یہ سیمینار یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں عربی زبان میں
ہونا مفید نہ ہوتا؟

ضرور ہوتا۔ آئندہ جب موقعہ ہوگا تو ان شاء اللہ عربی زبان میں بھی کریں گے۔ لیکن یہ اردو پروگرام ایک سلسلہ کا حصہ ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا اور اگر نہیں ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ میری مرحومہ بہن ایک بہت ہی مخلص اور صاحب علم خاتون تھیں۔ ان کو دینی علوم کی نشر واشاعت سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں۔ تصنیف بھی کیں اور ترجمہ بھی کیا۔ انہوں نے چاہا کہ پانچ کتابوں پر مشتمل ایک سیریز تیار ہو جس میں علوم قرآن، علوم حدیث، علوم فقہ، علوم سیرت اور علوم عقیدہ پر آسان زبان میں عام لوگوں کے لئے مواد کو بیان کیا گیا ہو۔

میں نے اس کی تائید کی کہ ایسا ہونا چاہئے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ہی اس کام کو کروں۔ میں بہت عرصہ تک معذرت کرتا رہا کہ اور اہل علم موجود ہیں۔ جو مجھ سے بہت بہتر انداز میں اس کام کو کر سکتے ہیں۔ ان کے اصرار پر میں نے اس کام کو شروع کیا۔ اس کے دو حصے میں نے اپنی بہن کی زندگی میں مکمل کئے۔ محاضرات قرآن اور محاضرات حدیث۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا سے اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔

مجھے یہ خیال ہوا کہ میں ان کی اس خواہش کی تکمیل کروں۔ تو ایک سیریز میں نے ان کے انتقال کے بعد محاضرات فقہ کے نام سے کی۔ یہ تینوں چھپ چکی ہیں۔ چوتھی یہ محاضرات

سیرت ہے اور پانچویں اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور عمر باقی رہی تو وہ محاضرات فکر وعقیدہ کے نام سے اسی طرح سے بارہ خطبات ہوں گے۔ اس کے بعد میری بہن کا یہ منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ اس کے بعد انگریزی اور عربی جس زبان میں بھی موقع ہوگا دیکھیں گے۔

☆

مورخین اسلام نے خلافت راشدہ کے زمانے کو Golden Era کہا ہے۔ اس کے ساتھ یورپ کو اس اعتبار سے تاریک زمانے کا نام دیا ہے۔ Dark age۔ لیکن آپ کے کلام سے استقبالیات سیرت کے نام سے جو حدیث مسلم شریف سے ارشاد ہوئی تو اس حدیث سے اہل یورپ کی ہنرمندی اور کمال ظاہر ہوتا ہے۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے یا تاریخ اسلام جو قدیم زمانے سے ہم پڑھتے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں یورپ کی تاریخ کے ادوار کی روشنی میں اسلامی تاریخ کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو دیکھنا چاہئے کہ اس کی implications کیا ہیں، اس پر اہل علم کو غور کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کے بعض محاضرات سیرت پر سنے۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک صحیح الخیال انسان اور مخلص مسلمان ہیں۔ ان کے لیکچر بھی اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک دو لیکچر ان کے سنے ہیں۔ مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ میں ان سے ملا بھی ہوں۔ مجھے بہت اچھے آدمی لگے ہیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔

☆

ذرا وضاحت کیجئے کہ مسلمانوں کی جتنی خلافتیں گزری ہیں ان میں سے کیا کسی نے حکومتی سطح پر سیرت کا کام کیا؟

سیرت پر کام کرنا تو علما کا کام ہے۔ یہ حکومتوں کا کام نہیں ہے۔ حکومتیں وسائل فراہم کر سکتی ہیں لیکن کام تو اہل علم ہی کریں گے، سیرت نگار اور مورخین کریں گے۔ ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ حکومتوں نے وسائل فراہم کئے ہیں۔ عبدالملک کا میں نے حوالہ دیا۔ عبدالملک نے عروہ بن زبیر اور کئی دوسرے سیرت نگاروں کو آمادہ کیا کہ وہ سیرت پر مواد جمع کریں۔ آج کل کے لوگوں کو بھی یہ کام کرنا چاہئے۔

☆

کیا وجہ ہے کہ ہمارا کوئی بھی پروگرام ہو تو حکومت کے اہل کار ہمیشہ آنے سے کتراتے ہیں؟

ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار آئے ہیں۔ وزیراعظم صاحب دو تین بار تشریف لائے ہیں۔ صدر صاحب دو بار اسی ہال میں تشریف لائے ہیں۔ کئی وزرا آ چکے ہیں۔ میرے خیال میں کسی ایک یا دو واقعات کی روشنی میں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔

☆

اس قسم کے پروگرام آپ مزید کرتے رہیں گے تو عام لوگ بھی مستفید ہوں گے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گے۔

☆

سیرت کے حوالہ سے ابلاغ عامہ پر کام کس طرح ممکن ہے؟

سیرت کے حوالہ سے ابلاغ عامہ تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ آپ سیرت پر دستاویزی فلمیں

بھی دکھا سکتے ہیں۔ اہم کتب سیرت کا تعارف بھی کروا سکتے ہیں۔ اہم مورخین سیرت کے بارے میں پروگرام ہو سکتے ہیں۔ لیکچرز ہو سکتے ہیں۔ اہم مقامات سیرت کے بارے میں دستاویزات تیار ہو سکتی ہیں۔ جنگوں کے مقامات کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب ہے عہد نبوی کے میدان جنگ۔ ان پر آپ ایک سیریز شروع کر سکتے ہیں۔ جنرل اکبر خان کی کتاب پر ایک سیریز آ سکتی ہے۔ جنرل محمود شیث خطاب کی کتابوں پر ایک سیریز آ سکتی ہے۔

☆

سیرت پر جدید کام کے سلسلہ میں مصر میں ایک فلم الرسالہ بنائی گئی ہے۔ سنا ہے مصری فقہا نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس طرح کے کام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

یہ فلم مصر میں نہیں لیبیا میں بنی تھی اور کرنل معمر قذافی نے بنوائی تھی۔ شروع میں مصر کے علمائے کرام نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا۔ یہ بنی بھی 1975-76 وغیرہ میں تھی۔ اب انہوں نے اگر کوئی نئی بات کہی ہے تو میرے علم میں نہیں۔ لیکن عام طور پر علمائے کرام کہتے ہیں کہ سیرت کو فلموں کا موضوع بنانا احتیاط اور تقدس کے خلاف ہے۔ اس رائے کا احترام ہونا چاہئے۔

☆

توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت کے خلاف احتجاج کے دوران مسلمانوں کا اپنے ہی املاک کو نقصان پہنچانا کیسا ہے؟

یہ تو غلط بات ہے۔ ہر شخص کا جان و مال محفوظ ہے۔ جن لوگوں نے کسی کے املاک کو نقصان پہنچایا انہوں نے قرآن کریم کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا ارتکاب کیا۔ اگر کسی نے ڈنمارک میں توہین رسالت کا جرم کیا ہے تو لاہور میں رہنے والے کسی شخص کی موٹر کار کو ضائع

کرنا یا کسی کے مکان اور دکان کو آگ لگانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ یہ شریعت کی رو سے جرم ہے۔ اگر یہاں اسلامی قانون نافذ العمل ہوتا تو اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے کو کڑی سزا دی جاتی۔

☆

نفسیات سیرت پر اردو یا انگریزی میں لکھی گئی کسی کتاب کا نام بتادیں۔

میرے علم کی حد تک تو غالباً نفسیات سیرت پر الگ سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ بعض مضامین لوگوں نے البتہ لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں اور سیرت نمبروں میں شائع ہوئے ہیں۔

☆

غزوہ بدر، احد اور حنین سے لے کر آج تک کبھی مسلمان اللہ کی معیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ خداوند قدوس کی نصرت کبھی نافرمانوں کے ساتھ نہیں رہتی۔ قول و فعل کے تضاد کو کم کرنے کے لئے آج کے دور میں عملی صورت کیا اختیار کی جائے؟

لوگوں کو دعوت دی جائے۔ تبلیغ کی جائے۔ دین کی تعلیم دی جائے۔ بس یہی ہے، اس کے علاوہ تو کوئی چارہ نہیں۔

☆

نورالدین زنگی کا جو واقعہ سیرت کی کتابوں میں نقل ہے اس کی تفصیلات بیان کریں۔

نورالدین زنگی کا واقعہ یہ ہے کہ یہ شام کے حکمران تھے۔ یہ اس عظیم بادشاہ کے پیش رو ہیں جنھوں نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضہ سے آزاد کرالیا تھا۔ جس کی نظیر اور مثیل کے مسلمان طویل عرصہ سے منتظر ہیں اور ان شاء اللہ نیا صلاح الدین ایوبی بھی آئے گا اور نیا

نورالدین زنگی بھی آئے گا۔

نورالدین زنگی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ حضور نے دو آدمیوں کی طرف خواب میں اشارہ کر کے نورالدین سے کہا کہ ان سے میری حفاظت کرو۔ نورالدین زنگی پریشان ہوئے، بہت سوچا، لیکن اس کی تعبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ دوبارہ یہ خواب دیکھا۔ غالباً تین چار مرتبہ یہ خواب دیکھا تو پھر لوگوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً مدینہ منورہ چلیں۔ وہاں دیکھیں گے کہ اس خواب کی کوئی تعبیر ہو سکتی ہے کہ نہیں ہے۔ مدینہ منورہ چلے گئے۔ ظاہر ہے ان کا مدینہ منورہ چلے جانا ایک اہم واقعہ تھا۔ بہت بڑے حکمرانوں میں سے تھے۔ وہاں انہوں نے یہ چاہا کہ ان دو آدمیوں کی نشاندہی کریں جن کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ کیا تھا۔ نورالدین نے کہا کہ مدینہ کے رہنے والے تمام لوگوں کے اعزاز میں میری طرف سے دعوت ہے اور میں ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے انعام دوں گا۔

انہوں نے پورے اہل مدینہ کی دعوت کی۔ ایک ایک آدمی کو چلتے ہوئے انعام دیا لیکن وہ دو آدمی نظر نہیں آئے۔ اگلے دن انہوں نے پھر دعوت کی اور کہا کہ مدینہ کا رہنے والا کوئی بھی باشندہ غیر حاضر نہ رہے۔ اس بار بھی وہ دو آدمی نظر نہ آئے۔ تیسرے دن انہوں نے اصرار سے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ سب آ گئے ہیں صرف دو بزرگ ہیں جو باہر کہیں سے آئے ہیں اور وہ تمام دن رات عبادت میں گزارتے ہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین زنگی نے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین نے کہا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ وہ ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہی دو لوگ ہیں جن کی طرف حضور نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ نورالدین زنگی نے تھوڑی سی سختی کی تو اہل مدینہ ناراض ہونے لگے کہ یہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔ نورالدین نے کہا کہ آپ حضرات تشریف رکھئے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں مجھے وہ کرنے دیجئے۔

'بزرگوں' سے جب باز پرس کی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ نورالدین زنگی نے حکم دیا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ گھر کی تلاشی لی گئی تو جہاں ان کا مصلی بچھایا گیا تھا وہاں سے پتھر کی ایک سل نکلی۔ پتھر کی سل کے نیچے ایک سرنگ روضہ اطہر تک نکالی ہوئی تھی۔ انہوں نے مکان روضہ اطہر کے قریب لیا ہوا تھا۔ نورالدین نے مزید سختی کی تو انہوں نے بتایا کہ ہم آرمینیا

کے یہودی ہیں اور ہمیں فلاں حکمراں نے بھیجا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک کو چرا کر لے جائیں۔ اس غرض کے لئے ہم نے یہ سرنگ بنانی شروع کی ہے۔ تمام دن کھدائی کرتے ہیں اور رات کو بقیع کے قبرستان میں یہ مٹی پھینک آتے ہیں۔ نورالدین نے ان کو سزائے موت دی۔ دو رکعات نماز شکرانہ ادا کیا۔ کہ اللہ کی ذات کی مہربانی سے ان کو یہ توفیق ہوئی۔ پھر نورالدین زنگی نے روضہ اطہر کے چاروں طرف خندق کھدوائی جو گہرے پانی تک چلی گئی۔ اس میں خندق میں سیسہ پگھلا کر بھروادیا۔ اور اس کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی جرات نہ کر سکے۔ وفاء الوفا جس کا میں کئی بار حوالہ دے چکا ہوں، اس میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

☆

سیرت رسول کے نفسیاتی پہلو پر اوپن یونیورسٹی کے ایک اسکالر نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔

جس دوست نے سوال کیا تھا وہ نوٹ کرلیں۔

-☆-